



اولڈ راویٹز کی جانب سے اسیران علم و ادب کے لئے تو شہ خاص

سہ ماہی

روح

مدیر : ممتاز احمد شیخ

آغاز اُس ذاتِ بابرکات کے نام سے کہ تمام تعریفی اور بڑھائیاں اُسی کے لیے مختص ہیں
جو رحمان بھی ہے رحیم بھی۔ اور ہم سب اُسی کے جو دستِ بابرکات کے محتاج ہیں
اور وہی ذاتِ بالاصفات ہیں جو قوتِ کار کی ارزانی عطا فرماتی ہے۔

Hasnain Sialvi

کتابی سلسلہ

لوح

سہ ماہی

راولپنڈی

شمارہ اول، جون تا دسمبر ۲۰۱۲ء

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شائع دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے ویس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پیسل

مبراہہ حق : 03478848884

مدیرہ ظہر : 03340120123

حسین سیالوی : 03056406067

ضابطہ:

شمارہ اول : جون تا دسمبر ۲۰۱۳ء

کمپوزنگ و لے آؤٹ: ندیم صدیقی

قانونی مشیر: عمران صفدر ملک

حسن پبلشرز: ۲۷-ای، لین-۲، نیشنل پارک روڈ،

گلستان کالونی، راولپنڈی۔ فون 051-4493270-71

قیمت : ۵۰۰ روپے بیرون ملک 25 ڈالر

طباعت: ماریہ پرنٹرز پرائیویٹ لمیٹڈ، ٹرانسنگل انڈسٹریل ایریا، کھوش روڈ، اسلام آباد

email:

toraisb@yahoo.com,

lowh.lowh@yahoo.com

جملہ حقوق محفوظ

مدیر: ممتاز احمد شیخ

مدیر کا مصنفین کی آراء اور مندرجات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ حالات و واقعات، مقامات اور ناموں میں کسی قسم کی مماثلت محض اتفاق ہوگی جس کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں ہوگا

فہرست

		• ہم بھی لفظوں کے شناسا ہیں بہت
17	ممتاز احمد شیخ	حرف لوح (اداریہ)
		• اک صدا کی نغمگی ہے چار دوا نگ
21	افتخار عارف	لبیک اللہ لبیک
22	ڈاکٹر فاطمہ حسن	حمد باری تعالیٰ
23	سلمان باسط	مناجات
24	نورین طلعت عروہ	حمد باری تعالیٰ
		• گلہائے عقیدت سے چمن مہکا ہے
27	افتخار عارف	نعت نبیؐ
28	احسان اکبر	نعت نبیؐ
29	جلیل عالی	نعت نبیؐ
30	سلیم کوثر	نعت نبیؐ
		• علم کی شمع سدا جلتی ہے
33	افضل توصیف	دیوار پہ لکھا تھا
43	مسعود مفتی	دواہیوں کی کہانی
		• رفتگاں کی یاد سے روشن ہے قندیلِ حروف
53	عشش الرحمن فاروقی	منظر سلیم کی بازیافت
60	عشش الرحمن فاروقی	محسن زیدی کی غزل
66	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	فریب نظر۔۔۔ ایک نظر انداز شدہ کتاب
75	زوار حسین	تصویر شناسی
78	ارشاد معراج	نظموں کی چھاگل

80	ارشاد معراج	نظم گہری نیند سونگنی
		● زندگی سرخ تبا اپنی شہادت سے ہوئی
85	سلمان باسط	شہر سہاکی ملکہ..... شمیمہ راجہ
89	شمیمہ راجہ	وہ ستارہ ساز آنکھیں
90	شمیمہ راجہ	سدا بہار آگ
91	شمیمہ راجہ	یہ ترک تعلق تو
92	شمیمہ راجہ	آشوب
95	شمیمہ راجہ	نیند میں اس طرح سفر ہوتا
95	شمیمہ راجہ	کون کہتا ہے فقیروں کو خزانے دیجئے
		● یاد آتے ہیں زمانے کیا کیا
99	زاہدہ حنا	ماسکو: یادوں کا سیلاب رواں
111	اعتراف احسن	بیٹے ہوئے دن یاد آتے ہیں
		● نظمیں زندہ رہتی ہیں
117	آفتاب اقبال شمیم	امر آمر
118	گلزار	تہنہ
118	گلزار	میں نے ایک سایہ اپنا پال رکھا ہے
119	گلزار	سوئیاں گھڑی کی پھر پریڈ کرتے کرتے.....
119	گلزار	نہ آمد کی آہٹ.....
120	ریاض مجید	رحمۃ دیوار آنکھیں
122	ریاض مجید	دیران ایئر پورٹ
123	ریاض مجید	رفتگان کی منازل کی تکریم کر
124	سرد صہبائی	موسم
124	سرد صہبائی	پہلا دھیان
125	سرد صہبائی	کہاں لے چلے گی مجھے
126	نصیر احمد ناصر	ہمیں اور کتنا گزارے گی تو زندگی؟
127	نصیر احمد ناصر	ناور آف سائینس

- 128 نصیر احمد ناصر کسی دن ملیں گے
- 129 نصیر احمد ناصر خطاب کہو، اب کیا چو گے؟
- 130 ایوب خاور نظم لکھتی ہے تجھے
- 131 ایوب خاور دو وقتوں کی ایک نظم
- 132 ایوب خاور محبت کا ایک سال
- 133 ایوب خاور کسی
- 135 سعادت سعید آدمی
- 136 سعادت سعید زبانِ خلق
- 137 سعادت سعید نئے منظر
- 138 سعادت سعید نام کی بات
- 139 ڈاکٹر فاطمہ حسن نئی زندگی چاہیے
- 140 ابرار احمد یاد گرد
- 141 ابرار احمد منزلِ صبح
- 142 انوار فطرت مگر یہ خواب ہیں میرے
- 143 انوار فطرت یہ اپنی سو ڈکب مکمل کراؤ گی
- 143 انوار فطرت کہمینی بات
- 144 انوار فطرت تن ہا کا قضیہ
- 145 علی محمد فرشی چار دنوں کا قاتل
- 146 وحید احمد دہلیزی
- 147 وحید احمد خاک بھری
- 147 وحید احمد سرابِ پوش
- 148 وحید احمد اجنبی
- 148 مقصود وفا ایک لوری
- 149 فرخ یار بے خوابی
- 151 فرخ یار مجھے اُس نے جٹا شب کی کہانی میں
- 152 فرخ یار وسطیٰ عمروں کی ڈھارس
- 153 فرخ یار زنجیر بستی رہتی ہے
- 155 پروین طاہر سوا میرے

- 155 پروین طاہر مرسوں کنارے
 156 سعید احمد میں آگئی وہ
 157 ستود عثمانی جل پری
 158 افتد ار جاوید جھیل
 159 افتد ار جاوید درمیان آسمان اصل
 160 افتد ار جاوید یدہ
 161 ابرار عمر محبت خواب محبت
 162 عابدہ تقی خیر مقدم
 162 کوثر محمود تلی کی تقویم میں
 163 فہیم شناس کاظمی الف لیلہ یہ نہیں.....
 164 فہیم شناس کاظمی زمانہ تم کو بلا رہا ہے
 165 شکیلہ رفیق نظم
 166 احفاظ الرحمن محبت کم نہ ہونے دو
 167 یامین پرانی پوٹی
 168 یامین چھٹی کا دن
 168 یامین جنگل میں شام
 169 شاہین عباس فرشتہ پھر نہیں آیا
 170 دانیال طریر صدا کار کا لوح
 171 دانیال طریر سپیرے کی نظم
 172 فاضل جمیلی سرحدیں
 173 سلمان باسط اظہار محبت اک پہاڑی راستہ ہے
 174 عمرین صلاح الدین کہانی نہیں تھی
 175 زاہد امروزی دنیا تم کو جیسے بھی دیکھے
 176 زاہد امروزی تم وہی رہو، جو ہو
 177 الیاس بابراعوان ہا پیر پٹیلی
 177 الیاس بابراعوان اسکچرم
 178 احمد شہریار خود تو جنت میں ہے
 179 ذی شان حیدر آبائی مکانوں پر ستارہ

180	ذی شان حیدر	Gladiator
181	یشبِ حرمنا	دعویٰ
181	سیمائے غزل	کچھ خواب بُنتے ہیں
182	عارفہ شہزاد	یہ راہداریاں
183	عائشہ جاوید	پرانی گڑیا
184	عائشہ جاوید	مجھے نظمیں بلاتی ہیں
184	عائشہ جاوید	آدھی چارپائی میں گم عورت
185	نازہٹ	مجھے کچھ دیر سونے دو
186	نایاب	دہمبر
186	نایاب	دیوتا
186	نایاب	گر تم چاہو

● ترستے ہیں سدا تازہ ہوا کو

189	جلیل عالی	ست پرستی
-----	-----------	----------

● بننے رہتے ہیں فسانے کیا کیا

193	اسد محمد خان	آتش فشاں اور مدفن شہر
201	رشید امجد	وقت کے کوڑے دان میں
203	سمیع آہوجا	بغلی گلی کے جا بجا پھیلے نقش
212	نجم الحسن رضوی	کئے سر کی حکایت
218	پروین عاطف	انتہائی نگہداشت
224	انور زاہدی	کچے شہوت
228	مشرف عالم فوقی	چھپکلی اور چائے کی بیانی کے درمیان
234	محمد الیاس	بچ گئے ٹھکڑے
239	عبدالصمد	سبز باب
252	محمد حمید شاہد	کونہ میں کھلاک
264	مبین مرزا	تھہرے ہوئے وقت میں
278	زیب ازکار حسین	ایک غیر معروف راستے سے مدد بھیڑ

283	بشری اعجاز	کارڈیلیا
305	زین سالک	تیسری مخلوق کی ایک کھٹا
310	اجمل اعجاز	نئے رشتے
314	فاطمہ زہرا جمین	ادھوری
322	سائرہ غلام نبی	یہ کہانی تو نہیں
327	سمیں کرن	مولوی صاحب کی ڈاک
		● داستاں درواستاں ہے زندگی
335	نحیہ عارف	گرد کے بگوئے
		● نظم جب حد سے گزر جاتی ہے
345	کشورناہید	شریعت کونسل، محورت تم سے مخاطب ہے
345	کشورناہید	آمنہ بی بی۔ مظفر گڑھ/جنوئی میں میری بیٹی
347	کشورناہید	میرے گھونگھٹ میری بھوک
348	نصیر احمد ناصر	گلوریا جینز میں شام
350	نصیر احمد ناصر	مفت خدا
351	نصیر احمد ناصر	حالت التوا میں لکھی گئی نظم
352	نصیر احمد ناصر	روح کے پاؤں نہیں ہوتے
353	نصیر احمد ناصر	دنیا آب و گل کے ذخیروں میں غنی ہوئی ہے
354	عذرا عباس	دوسرا کہتا ہے
355	عذرا عباس	دکھ
356	عذرا عباس	یہ خواب
357	ابرار احمد	سیلو یا پلا تھ کے لیے
358	اشفاق سلیم مرزا	بیا کل لڑکی
358	اشفاق سلیم مرزا	خامشی کی زبان
359	تنویر انجم	واپس لانا ہے انہیں
360	تنویر انجم	ایک زخمی دن
361	تنویر انجم	نا قابل انتظام

362	تنویر انجم	یہ کوئی قیامت تو نہیں
363	تنویر انجم	شاید انتظار ختم ہوا
364	انوار فطرت	یقیناً انہوں نے مجھ پر شک کیا ہوگا
364	انوار فطرت	ظرف
365	انوار فطرت	میں دبیر میں خوش رہتا ہوں
365	انوار فطرت	گمان آباد کے باشندے
366	مصطفیٰ ارباب	عورت اور مرد
366	مصطفیٰ ارباب	وہ اور میں
367	مصطفیٰ ارباب	خوابوں کا چھکڑا
367	مصطفیٰ ارباب	محبت
368	مصطفیٰ ارباب	ہنستا ہوا آدمی
369	مصطفیٰ ارباب	میں رو رہا تھا
370	زاہد امروزی	کائی جسے سینے کا خواب
370	زاہد امروزی	آسمانی سمندر کا خواب
371	سعید احمد	موچے کے پھول
371	سعید احمد	لفظ
372	سعید احمد	اس سے پہلے کہ ہم پھر سے محبت کرنے لگیں
373	ثنا اللہ	زندگی
373	ثنا اللہ	سرد خاک
374	ثنا اللہ	ہوائے لوٹ جاتے ہیں!
374	ثنا اللہ	وقت
375	ثنا اللہ	رُباب
375	ثنا اللہ	آؤ ذکیہ گھر بنائیں!
		● ایک انبارِ مضامین لگا رہتا ہے
379	پروفیسر سحر انصاری	سراج الدین ظفر... شخص اور شاعر
383	ڈاکٹر معین الدین عقیل	عزیز احمد کا سفرِ ناروے
392	گلزار	نصیر احمد ناصر

397	ڈاکٹر تقیہ کاشمیری	اُردو غزل اکیسویں صدی میں
411	ڈاکٹر نجیب جمال	یکانہ کی مثالی آنا ایک تجربہ
420	ناصر عباس نیر	مجید امجد کی نظم کی جمالیات
436	ڈاکٹر عظمیٰ قرمان	فیض کی شاعری میں تلازماتِ عشق
456	محمد حمید شاہد	اُردو افسانے کا نیا تناظر
462	ڈاکٹر عابد سیال	اُردو غزل کی ہنیت: تجربات و امکانات
472	ڈاکٹر ارشد محمود شاہد	اُردو ادب پر پنجابی ثقافت کے اثرات
478	ڈاکٹر طارق ہاشمی	نظیر اکبر آبادی کا شعریات
484	ڈاکٹر ناہیدہ قمر	تہذیب مغرب اور احیائے اسلامی کے امکانات
497	سید کامران عباس کاظمی	ناول: عصری آگہی کی یافت کا بنیادی ماخذ
507	ڈاکٹر رحمت علی شاہ	ہندوستان کی تہذیبی تاریخ اور قرۃ العین حیدر
513	نیاز سواتی	جدیدیت: مباحث و مسائل کا ایک تحقیقی تناظر

● حسن لیلیٰ ہے دوستِ مجنوں ہے

525	ظفر اقبال	اُگ عمر ہوئی جس میں خسارے سے لگا ہوں
525	ظفر اقبال	ہوتا رہتا ہے گزارہ کہ ابھی کافی ہے
526	ظفر اقبال	اپنا نہیں کچھ بھی تو پرایا ہی بہت ہے
526	ظفر اقبال	آئینے پہ اتنا جو غبار آ یا ہوا ہے
527	احسان اکبر	ہر اک کا ظرف جدا ہے مرا سہو مرادل
527	احسان اکبر	زمین پہچانے کا اپنا ہی فیصلہ نہیں تھا
528	انور شعور	بالآخر اسے ہم نے پایا ضرور
528	انور شعور	کام آئی عشق ماہِ وصال کی
529	سرمد صہبائی	بناتی ہے نظر تصویرِ آب آہستہ آہستہ
529	سرمد صہبائی	گھٹلا ہے سینہ نکل، ہے چراغِ مشکبویاں
530	محمد اظہار الحق	تلازمے شاعری کے سب رفتگاں سے لیں گے
530	محمد اظہار الحق	چہار جانب سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں
531	صابر ظفر	وہ زور و گئے نکل ہے ڈی ماورائے نکل
531	نصیر احمد ناصر	ہجر میں بھی وصال ہیں مجھ میں

534	خالد قبال یاسر	کچڑ کے ہاتھ قدم قدم مجھے لے گیا
535	شعیب بن عزیز	دل آباد کا بردبار بھی ہونا ضروری ہے
535	شعیب بن عزیز	مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے
536	حمیدہ شاہین	میرے جوتے مرے اپنے ہی لہو سے تر ہیں
536	حمیدہ شاہین	بچے ہاکن رہے ہیں خدو خال اب وجد
537	نسیم سحر	کیسی خوشبو مرے وجود میں ہے
537	نسیم سحر	کیسی پیغام رسانی سائیں
538	انجم ضیق	بس کہ مرنے پر نہیں تیار ہم
538	طارق نعیم	میں کائنات سے پہلے جہاں جہاں گیا تھا
539	شاہین عباس	ہم اپنے غیب کا غوغا ہی جا بجا کریں گے
539	شاہین عباس	سب جانتے ہوئے بھی میں امتحان کب ہوا
540	خاور اعجاز	ہر جگہ قتل و قاتل کرتا ہوں
540	احمد حسین مجاہد	برف پر آگ جلاتا ہوں الجھ جاتا ہوں
541	ناصر علی سید	بدا کی دھوپ ہے، شاید نہ تاب لائے ہوا
541	انجم بارہ بٹکوی	جھوٹی باتیں جھوٹے لوگ
542	رجس فروز زیدی	میری آنکھوں سے جو بیزار ہوا چاہتا ہے
542	عبدہ تقی	نہ تھا ممکن جو اس امکان سے آئی ہوئی ہوں
543	صائمہ علی زیدی	مجھ سے بھی سوا ہیں غم ہوا گے
543	صائمہ علی زیدی	زخم سحر کا رنگ اور
544	صدف مرزا	فضائیں رقص گناں، اور تے وہی اب تک
545	جنید آذر	اٹھ کوچہ خمار سے رخت سفاٹھا
546	کاشف حسین غائر	ٹھیک کہتے ہیں سبھی عشق پریشانی ہے
546	کاشف حسین غائر	ہوا کا رنگ سر رہ گزار پہا ہوا
547	اختر رضا سلیمی	بروئے کار سب امکان لایا
547	شاہد ذکی	بس روح سچ ہے باقی کہانی فریب ہے
548	غہنا پروین سحر	کسی کتاب پرانی میں رکھ کے آتے ہیں
548	عنبریں حبیب عنبر	دل کو دنیا کا آسرا بھی نہیں
549	شہزاد نیر	آپ دل جوئی کی زحمت نہ اٹھائیں، جائیں

- 549 شہزاد نیر جمال کم سخن سے ایسا کمال کیسے ہو گیا
- 550 کلیم احسان بٹ سنت و خنجر و تلوار بست
- 550 شمشیر حیدر پیر بن وقت بدلتا ہوا رہ جاتا ہے
- 551 عبد اللہ بن ہمدان خانزادہ اُن کی جبین ناز پے ایسے لکھا ہوں میں
- 551 تنویر سیٹھی گھنے شجر کی طرح آسمان ہوتا ہے

● قرطاس پہ جہانِ دگر ہیں۔۔۔۔۔

- 555 صدف مرزا نوئل انعام یافتہ مصنف ہنرک پھون چھو پی تین
- 557 ہنرک پھون چھو پی تین / صدف مرزا ایک خوابناک دیہاتی زندگی
- 558 رحیم ڈیشین / احمد صغیر صدیقی پتھر
- 570 نور الہدی شاہ / شاہد حسنی پاتال
- 575 لی پو / یونس خان قدیم چینی شاعری سے انتخاب

● زخم بھرنے کو غزل چاہیے ہے

- 587 سحر انصاری تھی دھوپ مری، سایہ دیوار سے پہلے
- 588 افتخار عرف مہک رہے ہیں جو یہ پھول لب بہ لب مری جان!
- 588 افتخار عرف محفظہ روش رفتگاں کوئی نہیں ہے
- 589 توصیف تبسم دشتِ غم! ہے کوئی رہگیر یہاں
- 589 خورشید رضوی نگاہ سے نہیں ہٹتے ترے درودِ یار
- 590 جمیل عالی رُتوں کی زد میں گزند ہوئے آشیاں ہمارے
- 590 جمیل عالی کچھ خبر آمد ہجراں کی تو تھی پہلے سے
- 591 سیم کوثر وصل کے خواب دکھاتا ہے ترا عشق مجھے
- 592 احمد صغیر صدیقی پردہ جواٹھا دیا گیا ہے
- 592 سید انور جاوید ہاشمی خوش آئے گی پھر علم کیں گے
- 593 ابرار احمد قصے سے ترے، میری کہانی سے زیادہ
- 593 ابرار احمد جوار خواب سے، اس رنجِ رازِ نگاہ سے بھل
- 594 یاسر سلطان کاظمی دل لگا لیتے ہیں اہل دل وطن کوئی بھی ہو
- 594 یاسر سلطان کاظمی یہ نہیں ہے کہ تجھے میں نے پکارا کم ہے

- 595 سجاد باہر کوئی نہ ہو تو گھر جائیں ہم
- 595 اجمل سراج کسی کے بھر میں جین محال ہو گیا ہے
- 596 حسن عباس رضا قرض پر تیند لیے کل سے جو سو یا ہوا ہے
- 596 حسن عباس رضا عشق اول کبھی اس دل سے نہیں نکلے گا
- 597 لیاقت علی عاصم ان تجھے سنسان دنوں سے وہ دن اچھے تھے
- 597 لیاقت علی عاصم مژدہ تر کے سہارے سے اٹھا سکتا ہوں
- 598 سعود عثمانی اپنا سمجھیں نہ پرایا سمجھیں
- 598 مقصود وفا کار بے کار سے آگے کا قدم لیتا ہوں
- 599 قمر رضا شہزاد اپنے ہاتھوں میں ہوں خنجر سا اٹھایا ہوا میں
- 599 قمر رضا شہزاد نہ اپنے آپ کو اس طرح در بدر رکھتے
- 600 نوشی گیدانی عشق دربار سجاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں
- 600 سعید خان رنگ وحشت سے نہ اور اک سے وابستہ ہے
- 601 جاوید احمد رکھ گیا جو خاک میں جا اس یقیں سے پوچھ
- 601 حسن عباسی جب کوئی شخص پریشان بہت ہوتا ہے
- 602 رحمان حفیظ سب کا پیرایہ و اظہار بدل جاتا ہے
- 602 فاضل جمیلی مینے کا بھی آخر کوئی امکان بناتے
- 603 نزہت عباسی لفظ چنتے ہوئے ترتیب نئی لگتی ہے
- 603 شہناز منزل زندگی تیرے سوال سے ڈر لگتا ہے
- 604 فکیل جاذب سب خواب ہیں اشکوں کی روانی کے حوالے
- 604 خالد ملک ساحل کھڑکیں کھول دو احساس زیاں اڑنے دو
- 605 سلمان باسط تعمیر کا سمندر ہر طرف ہے
- 605 جاوید صبا کیا خاک سمیٹیں کہ سمیٹتے ہیں کہیں ہم
- 606 ڈاکٹر جاوید منقر ہم نے سوچا ہے کہ لچوں کی نوالے جائیں
- 606 نصرت صدیقی ادب کی کوئی بھی پوری نہ کی گئی میں نے
- 607 نسیم شناس کاظمی ہر ایک ہمت ہے ٹو اور نگار خانہ وی
- 607 نسیم شناس کاظمی کہ بلا بھی فرات ہم نے کی
- 608 ماز بٹ کچھ اس اول سے ہمیں غم گسارتے ہیں
- 608 آنت تھ کنول پہلے اپنی چاہتوں سے دل کا دامن بھر گیا
- 609 ممتاز احمد شیخ ہر چند سمندر مری آنکھوں میں چھپا ہے

● اب دو عالم سے صدائے ساز آتی ہے مجھے

613

سرمد صہبائی

اوس گلی نہ جاویں (ڈرامہ)

620

علی عثمان باجوہ

موسیقار نوشتہ دی

● یہی تو ٹوٹے دلوں کا علاج ہے.....

631

ڈاکٹر انیس ایم معین قریشی

گھر پیٹھے دانشور بنے

● دیر آید .

637

ڈاکٹر ممتاز احمد حان

اُردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب و لہجہ

639

ڈاکٹر عظمیٰ سلیم

پاکستانی زبانیں اور موجودہ تقاضے

643

حیدر بیوم

ہوا میں گرہ

646

سلطان باسط

نکتہ ور .. غنیمت ہاشمی

650

شکیرہ رفیق

نظم

ہم بھی لفظوں کے شناسا ہیں بہت

(اداریہ)

حرفِ لوح

بہت دن اس سوچ بچار میں گزر گئے کہ کیا ضروری ہے ادارہ یہ بھی لکھا جائے اور اس میں اپنی دانت کی تکرار بھی کی جائے۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جو کچھ بن پڑا حاضر کر دیا ویسے بھی کچھ لکھنا ہی صورت میں جائز اور مستحسن سمجھا جائے گا جب امیرانِ دب ”لوح“ کے مواد اور اس کے معیار کو سراہیں گے تب کہیں ”لوح“ کی کامیابی کی کوششیں رنگ لائیں گی۔ کچھ جداگانہ مگر خیر پر مبنی سرگرمیوں کی خواہش ہمیشہ میری ترجیحات میں نمایاں رہی ہیں۔ مگر مجھ ایسے ناتواں شخص کیسے جس کے پیچھے مجموعہ ہائے شعروں کا نثار تھا نہ ماحول ایسا مہربان تھا کہ اس سے سوا کچھ ممکن ہو سکتا۔ کوشش یہی رہی ہے کہ اعلیٰ درجے کا معیاری اور غیر مطبوعہ مواد ضروری کیا جائے جو دراصل بہت ہی کڑا مرحلہ تھا۔ تحریروں کے معیار کا پیمانہ اگر بہتر سے بہترین کی تلاش ہو تو اس جان لیوا جدوجہد میں کیسے کیسے مرحلے درپیش آئے ہوں گے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بہترین تحریروں کے حصول نے مجھے مسلسل ہلکان رکھا اور دیر ہوتی چلی گئی۔ کبھی کسی سود کے کسی دوسرے جریدے میں چھپنے کی اطلاع ملی تو دوبارہ سے دوڑ پڑے کہ اس کا متبادا حاصل کیا جائے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ادبی رسالے کا اجراء اور اس کا تسلسل برقرار رکھنا نقد جان اور زرقند کو آگ دکھانے کے مترادف ہے مگر دروین جاں کسایا جا رہا تھا، ایک تو کچھ اچھا کرنے کی لگن، دوسرا لگن کی شدت۔۔۔ پھر شدت اور حدت کا قصا کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ یہ سب کچھ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ ”لوح“ کے عنوان سے کام لکھ رہا تھا تو کسی عزیز نے سواں کیا کہ ”لوح“ ادبی نام ہے، آپ سیاسی کام لکھ رہے ہیں تو ان سے عرض کیا کہ ”لوح“ میرے آئینہء تمثال کی تختی ہے جس پر نثر بھی ہے اور شعر بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کارِ لا حاصل اس وقت تک نقطہ آغاز تک نہیں پہنچنے دیتا جب تک اندر کے خاکستر میں دہلی کوئی چنگاری پھر سے سلگنا نہ شروع کرے۔ ”لوح“ کے اجراء میں بساط سے زیادہ حوصلے اور مصمم ارادے کی ضرورت تھی۔ وہ ایک اضطرابی اور بیجانی کیفیت کا عالم تھا جب ”لوح“ کے اجراء کا سوچا حالانکہ علمی اعتبار سے میرا دامن دریدہ بھی ہے ور قامت کوتاہ بھی، مجھے اس کے سودوریاں کے تمام پہلوؤں کا مکمل

ادراک بھی ہے، مگر میرے پیش نظر تو، درہمی گورنمنٹ کالج، ہور کا مجلہ ”راوی“ اور ”ہفتہ وار گزٹ“ تھے جن سے وابستگی نے ہمیشہ سوختن رکھا اور اس سے وابستگی و تعلق سے چند تو ہوئی کم نہیں ہوئی، حرف و لفظ سے وابستگی اور تعلق کا احساس اس عالم میں بھی کہیں موجود۔ ہا جب کارہائے زمانہ میں یہ گم ہوا کہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ بڑی حد تک ٹوٹ ہی گیا تھا کہ کسی ایک ہی میدان عمل کو مسکن و مسند بنایا جاسکتا تھا۔ ”راوی“ میرے اندر حرزِ جاں کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ سرکاری اور بے پناہ وسائل کے حامل عظیم تعلیمی ادارے کا مجلہ تھا۔ ”لوح“ کے اجراء کی خواہش دراصل، درہمی کے اسی مجلہ ”راوی“ سے عشق کی طویل داستان ہے جو پختہ ارادوں سے بھری پڑی ہے۔ لوح اسی داستان اور انہیں ارادوں کی تقسیم ہے۔ زیادہ کہنا اور لکھنا کا رہباش ہوگا بس یوں سمجھ بیٹھے کہ دنیائے ادب کیلئے یہ یک بے ادب کا تحفہ ہے جو بے سرو سامان اور علمی درہمندی کا شکار تو ہے ہی مگر ترویجِ علم و ادب کی آباہری کے شاخص نے شاید اس سے زیادہ کسی میں کم کم ہی پھوٹتے ہوں گے۔ میں حرف و غلط کا بیوپار نہیں کرتا مگر یہ میرے اندر کی کوئی سرکشی تھی جو مجھے اس تخلیقی کام کی طرف لے گئی۔ میں الفاظ کے قطرہ اندر قطرہ ضرر پہنے کو لفظ کی توہین سمجھتا ہوں یہ تو وہ قیمتی لالہ و گوہر کے مانند ہیں جنہیں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے وجود کا حصہ بنانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر ”لوح“ کی صورت میں مرتب کرنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اصل امتحان ابھی باقی ہے کامیابی اور سرحدی کا جس کا معائنہ میں نہیں آپ میں۔ مجھ پر واجب و لازم ہے کہ میں ان تمام مہربان ہستیوں کا شکر یہ ادا کروں جو پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں مجھے محبت کے لائق جانتے ہیں اور انہوں نے اپنی تحریریں اور تراجم بچھوائے۔ اگر مجھ سے تقدیم و تاخیر کی کہیں کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہے تو میں اس کے لیے احباب سے دلی طور پر معذرت خواہ ہوں۔

وہم علیہا الابلغ

ممتاز احمد شیخ

عفی عنہ

اک صدا کی نغمگی ہے چاروانگ

(حمید باری تعالیٰ)

لبیک اللہم لبیک

افتخار عارف

ربّ کعبہ کی طرف اذن و عنایت سے گیا
شکرِ نعمت کو گیا، قصدِ زیارت سے گیا
وادی شہرِ مکرم سے مدینہ کی طرف
وادی شہرِ مدینہ کی اجازت سے گیا
سارے اسباب تو پہلے سے بہم ہو چکے تھے
حکم کی دیر تھی، حکم آیا تو غلّت سے گیا
جدہ ریزی کی مری مشق پرانی تھی، سو میں
جدے کرتا ہوا ہر منزل طاعت سے گیا
میں غلاموں کی قطاروں میں کھڑا آخری شخص
بابِ رحمت کی طرف بابِ امانت سے گیا
کہیں گریہ کیا پیہم ادبِ آداب کے ساتھ
کہیں وارفتگی شوق کی شدت سے گیا
چمن دیتا ہے بہت دل کو قیومِ حرمین
دل کو آرام کی حاجت تھی، ضرورت سے گیا
کتنے دُشوار مراحل تھے وہ جب گزرے تھے
میں بہت سہل اُسی جادۂ ہجرت سے گیا
وہ مدینے میں جو دو باغ ہیں جنت کے، ادھر
بیعتِ سلسلہ ثور کی نیت سے گیا
ایسا میں کون سا شاعر ہوں مگر میرے نصیب
مدحتِ مرورِ کونین کی نسبت سے گیا

حمید باری تعالیٰ

ڈاکٹر فاطمہ حسن

یہ شعور بھی ہے عطائری
مگر اضطرابِ جودل میں ہے
وہ طلب ہے راہِ وصال کی
کہیں رائیگاں یہ سفر نہ ہو
کہہ جو فاصلہ من و ثوکا ہے
یہ ازل ابد کا ہے سلسلہ

مری جستجو مری آگہی
کسی اک مقام پر متصل تری ذات ہے
مجھے ہے خبر
تو قریب تر رگِ جاں سے ہے
تو یہ فاصلہ
جو نہ طے ہوا

وہی میں کہ مجھ پہ ہے آشکار
فقط اپنی ذات
وہی تُو کہ سارِ حجب ہے
وہی میں کہ جس کو مٹاؤں بھی تو نہ مٹ سکے
وہی تُو کہ شکل بناؤں بھی تو نہ بن سکے
عجب اک حصار کہ توڑنا بھی محال ہے
بھدا کس طرح تجھے پاسکوں
تُو کہاں اسیرِ مقام ہے

مناجات

سلمان باسط

خداوند!

تری اقلیم میں رہتے ہوئے اک عمر گزری ہے
مگر اب تک طریق بندگی مجھ کو نہیں آیا
مرے جذبوں نے اب تک جذب کے معنی نہیں سیکھے
ابھی تک خواہشوں کے پاس دل کو رہن رکھا ہے
ابھی تک نیم شب کی ساعتوں کی برکتیں مجھ پر نہیں اتریں
مری آنکھوں میں تیری روشنی کے خدو خال اب تک نہیں ابھرے
مری آنکھیں ابھی تک بے بصر ہیں
اور ستم یہ ہے

بصیرت کے درپے وا نہیں ہوتے

خداے لم یزل!

تھک کوڑ والی آدمیت کی قسم

مجھ سے مری یہ بے بسی لے لے

تجھے تو یہ خبر ہے

اس جہین شوق میں سجدے تڑپتے ہیں

مگر میں راندہ درگاہ

جب مسجد میں جاتا ہوں

تو اپنی سب توجہ

صحن کے محفوظ سے گونے میں رکھی جوتیوں میں

چھوڑا تا ہوں

حمد باری تعالیٰ

نورین طلعت عربہ

شاہ و گدا سبھی ہیں نگوں سار، سجدہ ریز
سکھول سجدہ ریز ہیں، دربار سجدہ ریز
ہر پھول شاخ پر ہے ثنا خواں بنا ہوا
باو صبا کے ساتھ چمن زار سجدہ ریز
کتنی تختیاں نظر آئیں جھکی ہوئی
کتنے دکھائی دیتے ہیں الوار سجدہ ریز
صحرا عقیدتوں سے اٹھتا نہیں ہے سر
اور دوسری طرف گل و گلزار سجدہ ریز
ذڑے زمین پر تری تعریف میں لگن
وہ و نجوم چرخ کے اُس پار سجدہ ریز
جتنا جھکا ہے اتنا ہی اونچا ہوا ہے وہ
رکھتا ہے رفعتوں کے جو معیار سجدہ ریز
عجز و نیاز ایک، قرینہ ہے مختلف
عابد جھکا ہوا ہے، گنہ گار سجدہ ریز

گلہائے عقیدت سے چمن مہرکا ہے

(نعتِ نبیؐ)

نعتِ نبیؐ

افتخارِ عارف

جو تری رضا ہو مرے کریم عروج دے کہ تروال دے
نگر اک دُعا ہے کہ دل سے خوفِ فسادِ رزق نکال دے
وہ جو اسمِ اعظمِ عشق ہے تجھے اس کے نور کا واسطہ
مجھے اس کے رنگ میں رنگ دے، مجھے اس کی راہ پہ ڈال دے
یہ زمینِ دل جو چھلک رہی ہے بہت غبارِ سیاہ سے
کوئی آئے اور انھی فضاؤں میں آفتاب اچھا دے
کھلے آسمانوں میں خوش کلام طیورِ نغمہ سرا رہیں
جو اسیرِ دانہ و دام ہیں انھیں وحشتِ پر و بال دے
مجھے جامِ جم ہی عطا ہوئے ہیں تمام عمر، سوا اب بھی ہوں
وہ جنہوں نے جامِ سفال مانگے ہیں ان کو جامِ سفال دے

نعتِ نبیؐ

احسان اکبر

مشہیر عرب میں گرچہ تھے ہاشم بھی خاتم بھی
 نبی پاکؐ اک ہوئے بس ظلم کے ہارم بھی خاتم بھی
 اوامر اور نواہی انؐ سے جو عازم بھی جازم بھی
 سب اہل دل کے دل میں ان کی حب قائم بھی دائم بھی
 وہ جن کے جاں سپاروں میں کئی طلحہ، اپنی طلحہ
 وہی نور و دیدہ ابو القاسم بھی قاسم بھی
 کبھی اچھوں سے اسم اور عرف و لقب اُن کے
 محمدؐ، مجتبیٰ، قاج بھی خاتم بھی عالم بھی
 ستانے والے خود تھک ہار بیٹھے وہ نہیں ہارے
 مربی انؐ کا رب کعبہ خود حاکم بھی، ناظم بھی
 اسی ماحول کی میں کیے کردار یوں صیقل
 بنے آہن مفت ہوتے جو تھے ناظم بھی، ناظم بھی
 اسی در پر ہے راحت رفت و نعت، شفاعت سب
 سوالی صائم و دائم یہاں ناظم بھی راقم بھی
 درود اُنؐ پر ہوا حساں جو ہر اک دنیا کی رحمت تھے
 رہے پھر انؐ کے حاسد آج تک شاتم بھی ظالم بھی

نعتِ نبیؐ

جلیل عالی

وہ مشق ہے عرفاں ہے وہ عقل ہے یہاں ہے
 ہر فکر و عمل اس کا آئینہ قرآن ہے
 سب چاند بھی سورج پاتے ہیں ضیا اس سے
 وہ رحمت عالم ہے وہ خواجہ دوراں ہے
 وصفوں میں کمالوں میں سوچوں کے اجاوں میں
 سب خیر خواہوں میں فیض اس کا فردزاں ہے
 کوئی بھی زمانہ ہو وہ خلق کا پیانہ
 اللہ کا بندوں پر کتنا بڑا احساں ہے
 سانس ہیں رواں اس سے سینے میں ڈال اس سے
 وہ روز و شب دل ہے وہ تاب و تاب جاں ہے
 ذکر اس شہر والا کا دیتا ہے سکون دل کو
 یاد اس در دولت کی ہر درد کا درماں ہے
 ہے دھیان مدام اس کا ہونٹوں پہ ہے نام اس کا
 جو کچھ ہے تمام اس کا اپنا تو یہ ایماں ہے

نعتِ نبیؐ

سلیم کوثر

آپؐ کی رہ گزر زندگی	جا بجا ہم سفر زندگی
موت کی وادیوں میں ملی	آپؐ کے نام پر زندگی
اُس طرف اس کی منزل نہ تھی	جا رہی تھی جدھر زندگی
آپؐ نے آ کے ترتیب دی	ورنہ تھی در بدر زندگی
آپؐ ہی نے کیا باخبر	ورنہ تھی بے خبر زندگی
آپؐ نے پا بٹھ کر دیا	ورنہ تھی بے بٹھ زندگی
بااثر کر دیا آپؐ نے	ورنہ تھی بے اثر زندگی
میں حرم سے مدینے چلا	ہو گئی معتبر زندگی
آپؐ کی پیروی کیجئے	چاہتے ہو اگر زندگی

خاک طیبہ ہی گھر ہے مرا
آ چلیں اپنے گھر زندگی

علم کی شمع سدا جلتی ہے
(گورنمنٹ کالج کے لیے دوا فسانے)

دیوار پہ لکھا تھا

افضل توصیف

گورنمنٹ کالج کی وولڈن جوہلی تھی۔ پرانے طالب علم دور نزدیک سے بلائے گئے تھے۔ بھارت سے لے کر یورپ، امریکا، کینیڈا سارے میں اولڈ راوین بکھرے پڑے ہیں۔ انیسویں صدی میں قائم ہونے والے اس ادارے نے اپنی شاندار روایات بنائیں اور سیکڑوں ہزاروں طلبائے علم کو اپنے رنگ میں سجا کر دنیا بھر میں بھیجا۔ ہائی انگلش عنابی بینرز Courage to Know کا مشعل، نو مگر اکیلا اکیلا کہاں بچتا ہے۔ جانے کون کہاں کس بھیڑ میں جا کر رہا، کہاں کھویا گیا۔

اور اب پوری ایک صدی کے بعد کالج نے اپنے گود کھلائے بچوں کو آواز دے کر بلایا۔ ”آؤ کہ جشن کریں“ سبھی نام رجسٹروں میں لکھے رکھے ہیں۔ اُن کے نام جو یہاں داخل ہونے کو آئے تو وہ کیسے شرمیلے اور دھورے لڑکے تھے اور جب گئے تو اعتماد سے پر خوابوں سے لدے پورے جوان۔ جشن صد سالہ کا بلاوا گیا تو بہت سے چلے آئے۔ عجب حالتوں اور کیفیتوں میں آئے مگر سب کہاں۔ رجسٹروں کے اندر لکھے ناموں والے کتے تو وہ ہیں کہ جن کی قبروں پہ لمبی لمبی گھاس اُگ چکی اور بہت سارے وہ جن کی راکھ دریاؤں میں بہائی جا چکی۔ راوی چناب سے لے کر گنگا جمنائیک پنجاب کے ہندو سکھ اپنی راکھ بہاتے تھے لیکن جب کوئی راوین مرتا تو اُس کی خواہش موجب صرف روی میں اُس کی راکھ ڈال دی جاتی۔ پرانے داخلہ رجسٹر کھلے تو ہوتا چلا کہ G.C میں ہندو سکھ طلبہ زیادہ تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ اُن میں سے وہ جو زندہ تھے وہ 1947ء میں، سٹیٹ کر گئے۔ کہاں کہاں جا کر بس گئے کچھ پتا نہیں۔ مگر اُن کے پرانے پتے رجسٹروں میں لکھے محفوظ رکھے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے۔ یہیں اس شہر کی جانی بچنی گلیوں میں اُن کے گھر تھے۔ کتنی عورتیں اب تک کھڑی ہیں، بعض مکانوں کی پیشانیوں پر تو نام بھی لکھے ہیں۔ وہ نام جو سینٹ میں منجھ ہو گئے مگر شہر کے حافضے سے اتر گئے۔ پتا نہیں دعوت نامے بھیجنے والوں نے کتنے جتن سے اُن کے نئے پتے تلاش کیے اور پھر اخباروں کے ذریعے بھی تو جوہلی کی تشہیر کی گئی تھی۔ اولڈ بوائز دور دور سے آئے اور کشش کشاں آئے۔

اونچے نو کیے میناروں والے گورنمنٹ کالج اُس روز بہت ہی پراسرار لگنے لگا جب پوری دنیا سے سفید بالوں اور عینکوں والے اولڈ بوائز یہاں اترے۔ اُن سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ انوکھا، اور اپنا تھا مگر ایک بات سب کی ایک جیسی کہ وہ راوین تھے۔ اُن میں کون کون تھا؟ ایک گریس فل بوڑھا عنابی کوٹ گرے نائی کے ساتھ آیا۔ وہ اندھا تھا۔ عمر ہوگی اسی سال۔ کالج کا پہلا طالب تو نہیں، مگر سٹنس کے پہلے بیچ کا ستارہ جو بعد میں ڈکٹر بنا۔ اُس نے کالج گیسٹ کے قریب آ کر ہاتھ جوڑے اور جھک کر مادر علمی کی چوکھٹ کو پر نام کیا۔ مہمانوں کی کتاب پر دستخط کرنے سے پہلے اُس نے یہ جملہ لکھا۔ ”میرے کالج! میں تیرے میناروں کو سلام کرتا ہوں۔“

براج سہنی تو خیر فنکار تھا، اُس کی تقدیر کا کیا کہنا مگر وہ شدت سے جذباتی ہو رہا تھا۔ باہر سے آنے والے بھی مہمان بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ انہوں نے ٹھک ٹھک کر پرانے درختوں کو سلام کیا۔ سکالرز گارڈن کے سامنے آ کر ہر

کسی کی چٹکیں بھیک گئیں۔ یادوں کا ایک میلا ہر کسی کی آنکھوں میں اور دل میں اُٹ آیا۔ خود کالج کے درو یوار پر ہر کسی کے لیے ایک جدا قسم چل رہی تھی۔ زندگی کی وہ روشن صبح جب وہ فارم ہاتھوں میں لیے داخلہ لینے کو آئے تھے۔ پھر وہ شاندار زمانے جو یہاں گزرے۔ وہ جلسے، وہ کھیلیں، وہ مقابلے اور وہ دوستیاں جو یہاں رہ کر مستحکم ہوئیں۔ پھر وہ خواب اور غرور جس کے ساتھ گاؤں پہن کر کانو، کیشن کے جلوس میں چسے تھے اور رخصت کا الوداعی تقریب کا گہرا اُتھیرا جیسا رنگ۔ آخری گروپ فوٹو۔ ہر کسی کا اپنا ہی تاثر تھا۔ مگر اس دارے کا اسرار، اس کے لان، اس کے زینے۔ گلاس روم اور مینار سے اور وہ، اور وہ روشنی کے مینار جیسے نام۔ سو نہ تھی، پطرس، سراج۔ کیسے کیسے بچھڑ کیسے ایسے نام، بھدے نہ بھولیں۔

پرانے لڑکوں کی زبانی پرانی داستانیں جب لڑکوں نے سنیں تو حیران ہوئے۔ عالم حیرت میں انہوں نے کالج کے دروازے کو نئے سرے سے دیکھا۔ کیا یہی وہ جگہ ہے "Is this the face" جہاں شہریاروں کی شہر ز اور متی ہے۔ ہزاروں دستاویزیں بیرا کرتی ہیں کیا واقعی اس عمارت کی اینٹ اینٹ سے یادوں کی پریاں ابھی تک بائیں لپٹے کھڑی ہیں۔ آج وہ نہیں جو کل تھا۔ آج وہ نہیں۔ مگر اس کے لیے جو بچھڑ کے ملے، آج کے دن میں بھی بہت کچھ تھا۔ کئی بچھڑے ساتھی ملے۔ کئی شناسا، کلاس فیلو، ہوسٹل کے روم میٹ، کھیلوں کے ساتھی، کتابوں کے کیڑے اور کئی پرانے رقیب۔ مگر اب وہ فقط ایک جیسے ہو گئے تھے۔ اولڈ بوائز، اولڈ بوائز ایک دوسرے کے بوڑھے چہرے پر جواں آنکھوں کی وہ چمک ڈھونڈ رہے تھے جو وقت کی دھند میں کہیں کھو چکی تھی اور کہیں تو بہت سی ہو چکی تھی۔ پرانی یادوں کا خزانہ ہر کسی کے پاس اپنا پنا تھا۔ اب ہر کوئی اس خزانے کو بانٹ لینا چاہتا تھا مگر وقت۔ وقت تو خود ان کے شکار پہ نکلا ہوا تھا۔ دیر، صرف ایک دن کا مل اور جوہلی پر وگرام بے چوڑے۔ "فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی۔" مگر یادوں کے ماتھے چھوٹے چھوٹے بچے بن گئے۔ آنکھ بچ کر، وقت چرا کر باہر نکلے۔ کالج کی حدود میں رہنے پر پابندی تھی، اُس سب پر جواں گلیوں میں کھیل کر جون ہوئے، مگر اب غیر ملکی ہو چکے تھے۔ اپنے دیں میں غیر ملکی؟ حکومتوں کے اپنے ہی معاملات تھے۔ حکومتیں مشین ہوتی ہیں۔ جانے کیا چسپا ہونا چاہتی تھیں۔ اُن سے جو چشم تصور میں ہزاروں بار شہر گھوم لیتے ہیں۔ گلی گلی کوچہ کوچہ پہنچتے ہیں۔ اُن کے آگے پابندی کی زنجیر لگی تھی مگر پابندی کی زنجیر سے آگے دل کا زور بڑا منہ زور نکلا۔ کیسے ہو سکتا ہے، مدتوں بعد کوئی رہو آئے اور اتار گلی نہ دیکھے۔ ہال روڈ پہ نہ گھوسے۔ سو گورنمنٹ کالج کے اولڈ بوائز پہلی فرصت کا انتظار کیے بغیر اتار گلی جا نکلے۔ خریدنا تو کیا تھا، وہاں اپنی خوبصورت جوانیاں تلاش کرتے پھرے۔ کہاں گئیں وہ پریاں جو یہاں متی تھیں۔ سچ کے نکلا کرتی تھیں۔ پرے کے پرے، غول کے غول، اُن کی تین قسمیں ہوتی تھیں۔ سادہ نو پیازی رنگت والی ہندو سکھ لڑکیاں، ساریاں سینڈل پہنے ہنس کی چال چلتی ہوئیں، اور وہ گوری گلڈی جو نیاں سکرٹ کے سایے میں خالص اور اصلی انگریز۔ پھر نغا لہن میمیں اور مسی بابا لوگ۔ اور حال حال ترقی برقعوں میں لپٹی منی جالی کے جھروکوں سے آنکھیں نیچتی مسلم خواتین جن کے رنگ روپ صرف اُن کے عم زاوی دیکھ سکتے تھے۔ اُن میں سے کوئی بھی نہ ملی۔ اب تو صرف شلو رقبہ پہنے لڑکیاں تھیں۔ یہ سب نئے دور کی محزن لڑکیاں ہوں گی۔ انہوں نے یہ فتنے اتار دیے ہیں مگر ن میں بھی ممتاز بیگم اور عفت۔ راجیسی کوئی نہ تھی۔ وہ جن کی گاڑیوں پر پردے لگے رہتے تھے مگر وہ اُس دور میں بھی ساریاں اور سیلو لیس پہن سکتی تھیں مگر وہ اپنی پریتی، موہنا، اوفدیا اور پریم کہاں گئیں؟

بخشی سانیال حیران ہوتا رہا۔ وہ لندن سے تقریب میں شرکت کرنے آیا تھا۔ وہ جو کالج میں کیا، شہر میں وہ اپنے وقت کا دل ڈارک اور پیٹسم مشہور تھا۔ بڑا امیر زادہ بھی تھا۔ ہوتا کیسے نہ، وہ تھا بھی تو رائے بہادر بخشی چیت رام کا، میر سترکا

پوتا۔ بڑی زمینداری تھی اور برف کا خانے، اس کا پتا کالج کی جوہی کمیٹی کو کہیں سے نہ ملا۔ کسی کلاس فیلو کو معلوم نہیں تھا، وہ کہاں رہتا ہے۔ پھر جب جشن کی تیاریاں زوروں پہ آئیں تو ایک میلہ کچید بوڑھا دیویشن کمیٹی کے چیئرمین کے پاس آیا۔ ”صاحب آپ اس کالج کے پڑھے ہوئے لڑکوں کو بلانا چاہتے ہیں تو ہمارے چھوٹے صاحب کو بھی بدئیے۔ یہ ان کا پتہ ہے۔“ اس نے ایک خط آگے بڑھایا۔ یہ خط سنڈن سے پاکستان کے کسی غلام رسول کے نام لکھا گیا تھا۔ بھیجنے والے کے نام کی جگہ صرف راولین (Rawian) درج تھا۔ یہی ایک غلط فہمی کے کوئے پر چھپا تھا اور خط والے کاغذ کے کوئے پر بھی۔ مگر لفظ فہمی کے پچھلی طرف خوشخط لہڈن کا پتا لکھا تھا اور پورا نام۔ ایں، یہ کون صاحب ہیں؟“ یہ ہمارے چھوٹے صاحب ہیں، بخش سانیال صاحب، بخش دانیال بیرسٹر کے بیٹے۔ آپ انھیں جوہلی پر ضرور بلادے۔ وہ لاہور کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی کوٹھی بھی دیکھ جائیں گے اور میں بھی ان کے مل لوں گا۔ ورنہ وہ کب آئیں گے، پتا چلا کہ وہ بوڑھا آدمی بخش خاندان کا پرانا ملازم تھا۔ اور اب بھی تب ان کو بھول نہیں۔ بلکہ خط و کتابت باقاعدہ کرتا رہا ہوگا۔ جیسی تو وہ خط لے کر چلا آیا تھا جس پر سانیال بخش کا پورا پتا درج تھا۔ وہی سانیال بخش جس کا نام کالج کے رول آف آئرز پر لکھا تھا اور رجسٹر میں لاہور کا پورا پتا۔ لیکن تقسیم کے بعد وہ کہاں چلا گیا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

یہ بخش خاندان 1947ء میں لاہور سے نکل گیا مگر ہندوستان میں انھیں کوئی شہر بھی اچھا نہ لگا۔ کوئی جگہ یا علاقہ لاہور جیسا نہ مل سکا جسے وہ اپنا دوسرا وطن بناتے دن نہ مہمئی۔ انہوں نے اپنے، کھوں کی بنیاد کے کلیم چھوڑ دیے۔ جب لاہور چھوڑنا ہے تو کبھی کبھار چھوڑ دینا ہے لہذا وہ کبھی لندن جا رہے۔ ویسے بھی دانیال بخش بڑے پائے کے بیرسٹر تھے اور بیٹا سانیال بخش ایک برس پہلے گورنمنٹ کالج لاہور سے اعزازوں کے ساتھ لدا ہوا تھا۔ بی اے آرٹس ریکارڈ توڑ پاس کیا تھا۔ ۲ کی ایون کا کیمپن، سٹیج کارومیو، والدین اسے بیرسٹری کے لیے انگلینڈ تو بھیجنا ہی چاہتے تھے اگرچہ سانیال کا دل لاہور میں گورنمنٹ کالج میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ یہیں سے ایم اے انگریزی کر کے P.H.D کے لیے جانا چاہتا تھا تاکہ ویسی ہی معرکے کا پروفیسر بن جائے جیسے اس کالج میں تھے۔ پارٹیشن میں اپنے شاندار خوابوں کو پیچھے چھوڑ کر اسے جان اور عزت کے لیے بھاگنا پڑا۔ اسے تو اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ اپنے ڈیریمینڈ سے رفعت لے کر جاتا۔ اپنے شہر کو پیار بھی کرتے ہیں لیکن سانیال کے لیے لاہور و فیس تھا، روم، ورلڈن بھی کچھ تھا۔

اب جو چوبیس برس کے بعد آیا تو ایک سٹانس کی حالت میں کھڑا کالج کے خردھی میناروں کو بکتا رہا۔ اس کی کل یادیں گورنمنٹ کالج تک بھی نہ تھیں۔ وہ تو یہاں پیدا ہوا تھا۔ اس کی پشتیں اس شہر میں آباد رہی تھیں۔ اسے کیا کچھ نہیں دیکھنا تھا۔ ویزا بھارت سے آنے والوں کے لیے ایک دن کا تھا مگر اسے لندن کی وجہ سے دو دن رہنے کی اجازت ملی۔ اس وقت جب حبش کی تقریباً تہال کے اندر چل رہی تھیں، اس کے زمانے کے کئی رادیں وہاں موجود تھے۔ وہ ہر نکل آیا اور پوری دوپہر پرانی دیواروں کی اینٹوں اور پرانے درختوں کو ہاتھ لگا کر اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنے کلاس روم میں گیا اور پہلی تھار کے تیسرے ڈیک کو چھو کر دیکھا۔ جھک کر اس کی خوشبو سونگھی اور پھر لاہوریری کے فیلڈ سے کتاب کھینچ کر ورق اٹے تو دیکھا جگہ جگہ حاشیے میں اس کے ہاتھ کے نوٹس لکھے ہوئے تھے۔ میں بھی یہاں ہوں، پھر وہ سیدھا سکا لریز گاڑوں میں اتر گیا۔ وہاں پتھر کے بیچ پر تک کر اس نے جانے کیا کچھ یاد کیا۔ امتحان کی تیاری کے لیے وہ گھنٹوں یہاں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ پریمیا کا انتظار اور کھلی آنکھوں کے خواب یہیں تو دیکھے تھے۔ ڈیٹ کے لیے اچھے اچھے جسے وہ یہیں بیٹھ کر تراشا کرتا۔ دھارے وقت تو نے کیس رنگ بدلا۔ لیکن ہری گھاس کا رنگ نہیں بدلا۔ کیا یہ دی گھاس نہیں۔ اس کی

جزیرے تو وہی ہوں گی۔ اور میری جزیں؟ ایک منہ می گھاس کی پتیاں توڑ کر اس نے اپنے بریف کیس میں رکھ لیں۔ پھر اپنے اوپر جھکے ہوئے درخت کا ایک پتا توڑ کر کوٹ کی جیب میں دل کے پاس رکھ لیا۔ ”دیس رے دیس!“ سے یاد آیا۔ اس کے باپ نے کہا تھا، جب بھی موقع ملے لاہور ضرور جانا اور اپنی آنکھوں سے میرے لیے لاہور کو دیکھنا۔ اگر میری زندگی میں گئے تو گورنمنٹ کانٹے کے سکارلز گارڈن کے درختوں کے پتے لے کر آنا۔ میں انہیں اپنی آنکھوں پر رکھوں گا۔ کتنی دیر وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اتنے ادھیز سانیاں بخشی و نو جوان بخشی کی باتیں سنا تا رہا۔ وہ دونوں الگ الگ دنیا کے باشندے تھے، تقسیم شدہ نسل کے افراد۔ سو کھے پتوں کی طرح جو آندھی کے دوش پر اڑ کے چائے کہاں کہاں جا کرے۔ لاہور چھوڑنے کی کتنی اس قدر تھی کہ، ماضی کی ہر بات بھول جانے میں اپنی عافیت لگتی تھی۔ اس نے کبھی کانٹے کی یادوں کو پریم کے ساتھ مل کر بھی اس طرح نہیں دہرایا تھا، جس طرح آج کے یہ چند گھنٹے اس پر ایک بیتائیک اتار لائے تھے۔

یہ ایک بے حد جذباتی سفر تھا جو پچاس باون برس کے پیرسٹر نے 22 برس کے اس نو جوان کی طرف کیا جو بڑے شوق سے کانٹے کی سٹیج پر رومیو، ہیمسٹ اور سینٹر کے کردار کھیلا کرتا تھا اور زندگی کو ایک خواب کی طرح دیکھتا تھا۔ وہ خود اپنی ذات میں خوابوں کا شہزادہ تھا بلکہ کتنے اور لوگوں کے خوب بھی اس کے خوابوں کا ہالہ کرتے تھے۔ ان میں لاہور کے باغوں کی ہوا بھی، ملبوں کے گیت، پریم گل کا شباب سب سے خوب صورت چیزیں تھیں۔ پریم اس کی کلاس فیلو تھی اور محبوبہ۔ بی چوٹی اور شہری رنگت والی حسینہ۔ اس کی بلی آنکھوں میں وہی اسرار تھا جو کانٹے کی عورت کے طرز تعمیر میں تھا۔ وہی تو پہلی لڑکی تھی جو کانٹے کے ڈراموں میں سٹیج پر آئی۔ وہ نور جہاں بنی تو بیچ مغل ملکہ گئے گی۔ کتنی کھپ چکی تھی اس روز، جب ملکہ عالیہ نے شرط لگا دی کہ جہانگیر کا کردار سانیال ہی کرے گا۔ سانیاں کو ڈرامائی لہجے کی اردو کہاں آتی تھی۔ اسے تو اپنی ماں بولی اچھی لگتی۔ یا انگریزی، جسے وہ فرائے سے بولتا تھا، کبھی چار سرائے لہجے میں، کبھی ٹیکسیپیڑ کی طرح۔ ایسے کاموں میں اس کی نگہن دیکھ کر اس کے پیرسٹر باپ کو فکری مگ جاتی۔ کہیں ان کا کھوتا لڑکا اپنے آبائی پروفیشن سے ہٹ ہی نہ جائے۔ خاندان میں پشتوں کی وکالت تھی۔ ایک شاندار، ہیریئر، بھاری کانٹے اور ملکی پھلکی سیاست۔ ایک زمانے میں اس خاندان پہ لالہ لچیت رائے والی لائن کا اثر بھی رہا تھا۔ اپنی برٹش، دیس کی زاوی، وغیرہ وغیرہ۔

کانٹے کے گوشے گوشے کو آنکھوں میں سجاتے ہوئے، سانیاں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس کے بعد وہ کبھی لاہور نہیں آ سکے گا۔ ویزا منے کی بات نہیں، زندگی کی بات تھی۔ اس کی بیوی نے تو اب بھی منع کیا تھا۔ ”مت جاؤ۔ چھوڑی ہوئی جہد جا کر ڈرگ کرتا ہے اور جب آدمی اپنی ہی جگہوں سے ڈرنے لگے تو“ پریم شاید، زیادہ سمجھدار تھی یا کمزور تھی۔ اسی لیے آئی نہیں۔ ورنہ راوین تو وہ بھی تھی۔ چلتے وقت اس نے کہا تھا، جا رہے ہو تو بس کانٹے تک ہی رہنا۔ ادھر ادھر مت جانا۔ پتا نہیں اس کا کیا مطلب تھا۔ شاید وہ آگ اور خون کا کھیل اس کے ذہن پہ بھی تک مسند تھا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ لاہور آئے اور لاہور کو دیکھے بنا واپس چل جائے۔

اگلے دن صبح سویرے جب وہ شہر کی دیواروں سے باتیں کرنے نکلا تو ڈرگیا۔ شہر بہت اجنبی لگا۔ راہ چلتے لوگ لاہوری نہیں تھے۔ کوٹ پتلون کچھ زیادہ ہی ہو گئے تھے اور کاریں کس قدر دھوئی، کرتا اور پگڑی تو کہیں نہ تھی۔ تانے والے تک اردو بول رہے تھے۔ مال روڈ پر اس نے جھک لگائے۔ چیرنگ کر اس سے اوپر کانٹے کچھ بدل گیا تھا۔ لیکن رینگل تک بہت کچھ ویسا ہی تھا۔ اولڈ رینگل، کیسی کیسی فلمیں دیکھی تھیں وہاں۔ اس کے بعد تو کبھی فلم دیکھنے کا مزہ ہی نہ آیا۔ سوچتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ ہائی کورٹ جس کے مین پیچھے اس کی اپنی کونھی تھی۔ مگر اس نے اس طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا۔ G P O

کی سرخ عمارت، وائی ایم سی اے، ریزرو بینک آف انڈیا، اب سٹیٹ بینک آف پاکستان بن گیا تھا۔ ہینپل کے بھاری درخت وہی تھے اور اُن پر گاتے پرندے بھی شاید وہی تھے۔ پرندے سیاست نہیں کرتے۔ ناؤن ہال یا لکل اسی طرح اور یونیورسٹی، شکر ہے انفر ڈوولپمنٹ کے بت کو دیس نکالا نہیں ملا۔

چلتا چلتا وہ لوڑ مارا پہنچ گیا۔ لیڈی سیکلنگ ہائی سکول، اُس کی بہنوں کا سکول اور پریر کا بھی تو۔ مگر سانیوں کو تو اپنا سکول دیکھنا تھا۔ ریواڑ گارڈن کے درختوں کو دیکھنا ہوا وہ آگے بڑھا مگر اُسے ڈر لگنے لگا۔ یہ تو وہی جگہ تھی جہاں اُس کی چھپھی کا کنبہ مارا گیا تھا۔ کیوں نہ کسی کو ساتھ لے کر چلے۔ شیخ نصیر، اسے یاد آیا۔ اس کا کلاس فیکل کانٹ میں ملا تھا اور شیراز میں لٹچ کی دعوت دے رہا تھا۔ اسی وقت سانیل مڑا اور شیخ نصیر کے گھر چلا گیا۔ ”دعوت وغیرہ کی بات چھوڑو۔ چومیرے ساتھ سڑکوں پر گھومو اور اگر کچھ کھانا ہی ہوا تو پرانی انارکلی سے پوری کچوری کھائیں گے اور پیڑے کی سی اُس دکان سے کیا نام تھا لالہ سوئی مل۔“ وہ رُک گیا۔ وہ دکان اب چاندھروالوں کی ہو گئی۔ خیر لسی اب بھی ٹھیک مل جاتی ہے مگر کچوریاں وہی نہیں بنتیں۔ شیخ اسے بتانے لگا۔

”اور سوہن لال سکول کس کو ملا۔ میرا مطلب ہے۔ اب اسے کون چلاتا ہے؟“

”وہ بھی چاندھروالوں کے قبضے میں چلا گیا۔ وہاں اب عربی شرابی، اردو شراب پڑھائی جاتی ہے۔“ باتیں کرتے کرتے وہ بیک روڈ پہنچا۔

چھن چھن چھن۔ سانیوں کے ذہن میں بہت پرانی یادیں بج اٹھیں اور وہ گھنٹی جو پہلی بار بجتی تو اندر کو دوڑ لگاتا، آخری بار بجتی تو باہر کو۔ میرا سکول! سوہن لال سکول بھی تک عمارت کی پیشانی پر لکھا تھا۔ یادوں کا ریلا اسی کے گرد بھنور بنانے لگا۔ وہ پہلا دن جب اس کا دھندہ ہوا۔ نیا قدم، نئی یونیفارم، نیا بستہ، گھبراہٹ بھرا دل۔ ادھر ساری ولی خوب صورت مس کا دلاسا۔ مگر غینک والی بڑی مس کا رعب۔ دھوتی کے اوپر کوٹ پہنے ہوئے پرنسپل صاحب، وہ اپریل کا مہینہ تھا۔ سکول کے کمپاؤنڈ میں اناروں کے پھول بہت کھلے تھے لیکن اب یہ اتنا تنگ کیوں لگ رہا ہے۔ باغ باغ تو رہا نہیں۔ کہاں چد گیا؟ اس نے شیخ سے پوچھا۔

”دیکھتے نہیں لوگوں نے کوٹھیاں ڈال رکھی ہیں!“

”سکول کی جگہ؟“

ہاں۔ اب تو ہر جگہ کوٹھیاں بن رہی ہیں۔“

سانیوں کی نظریں سکول کی دیوار پر جم گئیں۔ سڑک کے ساتھ ساتھ کتنی لمبی دیوار چلی گئی تھی۔

وہ اُس کے سامنے ہی تو بنی تھی۔ سرخ سرخ اینٹیں بڑی نفست سے باریک نیپ کر کے ساتھ ایک بوڑھے راج نے بنائی تھی۔ سکول کی عمارت کو یوں بھی لوگ مندر سمجھ کر ہی بناتے تھے۔ سکول والوں نے تو حفاظت کے لیے دیوار بنوائی تھی مگر دوسرے ہی دن وہاں کسی نے فلم کا بڑا سا پوسٹر لگا دیا۔ کتنی غصہ آیا تھا مس راؤ کو۔ کسی فلم کا سین تھا۔ ہیرو ہیروئن ایک دوسرے کے آگے سامنے کھڑے تھے مگر خرابی کی بات یہ تھی کہ ہیروئن کی چھاتیوں کو بند کے سردوں جیسی بڑی بڑی اور نوکیلی تھیں۔ سیکنڈ مسٹرس نے اپنی نگرانی میں پوسٹر صاف کر دیا مگر دوسرے دن کئی اور لگ گئے۔ ”خروہ تہنتی لگوائی گئی جس پر لکھا تھا“ اس دیوار پر پوسٹر لگانے والا حوالہ پوچس کیا جائے گا۔“ اب پوسٹر لگنے بند ہو گئے، مگر سیاسی نعرے لکھے جانے لگے۔

دور ہٹو دور ہٹو! اے دنیا والو سرفروشی کی تمنا اب ہمارے بھارت، تاتا کی بے بن کے رہے گا،

لے کے رہیں گے پاکستان!!

یہ سب کچھ کالی سیاہی سے لکھا گیا تھا۔ کوری اینٹوں نے سیاہی جذب کر لی۔ دھونے کھرچنے کا اثر کیا ہوتا۔ اب تو میڈم رے کو طیش آ گیا۔ سیاہی نعرے! نو، نو۔ سکوں میں سبھی طرح کے بچے پڑھتے ہیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور انہوں نے ساری دیوار پہ چونا پھر دیا۔ بس پھر کیا تھا، لکھنے والوں کے مزے ہو گئے۔ ساری دیوار جیسے اخبار بن گئی۔ نعرے، اعلان، گامدھی جی کا جلسہ، چھوٹا رام کی تقریر، مسلم لیگ کی مینٹگ، موچی دروازہ منٹو پارک، دیو رہر گئی تو مس راؤ نے اوپر سے پیلا رنگ پھر دیا۔ وقت گزرتا رہا، رنگ بدلتے رہے۔ نعرے تیز تر ہوتے رہے اور پھر کئی سال بعد ایک دن وہ آیا۔ شہر کے سارے رنگ اڑ گئے۔ خبریں آئیں، پنڈی میں ہوا کھلی میں، کلکتے میں لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر جلد دیئے۔ پیٹ پھاڑ دیے اور گردنیں کاٹ دیں، انہی خردوں کے لیے۔ "ہور کو بھی خمرہ، حق تھا۔ شہر بھر کی دیو روں پہ خطرناک باتیں جانے کون لکھے چاہا تھا۔ اُن دنوں سکول بند تھا اور مس راؤ امن کمیٹی کی ممبر بنی چپل تھینتی دن رات کام کرتی پھر رہی تھی۔ وہ ایک چمچر تھی نا۔ اسے بڑا حوصلہ تھا۔ ہر ایک مذہب کے بچے کو اپنا بچہ سمجھ کے تعلیم دی تھی۔ وہ سب کو سمجھا لے گی۔ یہ نفرت کی آگ برٹش ایجنٹوں نے بھڑکائی ہے۔ شہر کی دیواریں صاف رکھو۔ اچانک اس کی تحریر کاٹ کر کسی نے کہا مس راؤ اپنے سکول کی دیو۔۔۔ تو دیکھو جا کر۔" انتقام، انتقام! خون کا بدلہ خون، ہار دو، جلا دو۔" لکھ لکھ کر دیو رکاں کر دی تھی۔ پریشان ہو کر مس راؤ نے سارے کالے لفظوں پہ تار کول پھیر دیا اور خود سفید جھنڈا اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ "س کالی رات کو کالی دیوار پہ پہرا دی جی مس راؤ اپنی سفید ساڑھی اور سفید جھنڈے کے ساتھ لگی ہوگی۔ وہی مس راؤ جسے دو ہفتہ بعد ہوائیوں نے قتل کر دیا۔ کوئی کہتا تھا سفید جھنڈے کے لیے، کوئی کہتا تھا ان کے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی چین کے لیے۔

سفید روماں سے آنسو پونچھ کر سانیال نے ایک ہر پھر دیوار پر نظر ڈالی۔ اب وہ کالی تو نہیں تھی، مگر کالے لفظوں سے بھری ہوئی تھی۔ انتقام! خون کا بدلہ خون۔ یہ نئی فلموں کے نام تھے اور اشتہاری بڑی بڑی چھاتیوں، موٹی موٹی رنوں والی عورتیں لاپے پن کر بھنگڑا ناچ رہی تھیں اور مرد شہوت بھری آنکھوں سے انھیں تنک رہے تھے۔

"تم لنڈن میں رہتے ہو۔ پنجاب کی سیاریں دیکھ لو۔" شیخ نے سانیال کو جھیرا ٹکڑا کر سانیال کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔ آج چوتھی صدی گزرنے کے بعد جب خود اس کی آنکھوں پر مس راؤ سے بھی موٹے موٹے شیشوں کی بینک لگی تھی۔ سکول کی دیوار پہ کیسے کیسے منظر ہیں۔ شاید اب وہاں کوئی مس راؤ نہیں رہتی لیکن وہ سیاہی خمرے بھی تو ویسے ہی ہیں۔

مردہ باد، زندہ باد، سامراج! ظلم بند کرو، قتل عام بند کرو، نہیں چھپے گی لاشیں گولی کی سرکار، وغیرہ وغیرہ۔

"اب کس بات کا ظلم؟ اور کون سا سامراج؟" سانیال نے شیخ سے پوچھا۔ "یہ امریکی سامراج ہے اور ظلم بنگال میں ہو رہا ہے۔ انتقام کی بات عوامی لیگ کے ورکروں نے لکھ دی ہوگی۔" شیخ اسے بتانے لگا۔

"عوامی لیگ؟"

"بنگال کے مجیب الرحمن کی پارٹی۔ یہاں بھی اس کا کچھ اثر ہے۔ یہ بنگالی بڑے غدار ہیں۔"

"کس کے ساتھ غداری کرتے ہیں یہ؟"

شیخ نے سیدھا جواب دینے کے بجائے بات بدل دی۔ "یار ہم آپس میں پنجابی ہی اچھے تھے۔ یہ سارے بنگال، بہاری اور ہندوستانی پنجابیوں کو برا سمجھتے ہیں۔ ویسے تو تمہاری طرف بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔" شیخ کو افغان کی فکر ہوئی۔

مگر اسی بات پر سناں تلخ ہو گیا 'For your king information' میری طرف کوئی نہیں ہے۔ میں ہندوستان میں نہیں آیا۔ نہ ہی میرا ملک ہے۔ میں کوئی مقابلہ بھی نہیں کر رہا۔ میں تو صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ مس راؤ کے مارے جانے کے بعد اس دیوار پر کتنے کوٹ ہوئے اور کس کس رنگ کے۔ شیخ ہنسے گا۔ تو تم اب تک دیوار کے لیے ہی سوچے جا رہے ہو۔

میں اپنے سکوں کے سامنے کھڑے ہو کر اور کیا سوچ سکتا ہوں؟ اور پھر وہ جیسے پھوٹ پڑا ہو۔ کہنے لگا "میرے پاس وقت کم ہے۔ میرا بڑا مجھے ایک سڑک سے آگے جانے کی اجازت نہیں دینا۔ میں یہاں کا شہری تھا۔ اس شہر میں میرا گھر تھا اور میری جڑیں پنجاب اہرتی میں کتنی گہری تھیں۔ مجھے کھود کر نکال دیا گیا لیکن میں جاتے جاتے بھی تھوڑا سا لاہور اپنے دل میں چھپا کر لے گیا۔ وہاں لندن میں میرے تعارف کا حوالہ آج بھی یہی ہے۔" سناں نال بخشی فراسلا ہوا "اس جڑ کو میرے دل سے کھود ڈالنا ممکن نہیں لیکن آج یہ شہر مجھے اتنا ہی اجنبی لگ رہا ہے۔ جتن کوئی، کوئی ورشہر۔ وقت نے میرا شکار کھیلایا اور اس دیوار نے میرے ساتھ کیا کیا؟ میری تاریخ نہ چھوڑی۔ میری کوئی جگہ نہیں، جہاں میں پلٹ کر جاؤں، میں ایک جلاوطن ہوں۔ لیکن پھر بھی بچوں کے دل میں اس دیس کی پہچان کے بیج بوتارہا ہوں۔ میرا بیٹا لندن میں پیدا ہوا لیکن وہ لندن کو اپنا وطن نہیں مانتا۔ وہ اپنی روئس تلاش کرتا چاہتا ہے۔ میں اسے کیا سناؤں گا جا کر کتنے سوال پوچھے گا وہ۔" یہی کہ تم لاہور شہر کی ایک دیوار کے سامنے گھنٹا بھر بیکار کھڑے رہے۔" شیخ نصیر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں میں بیکار نہیں کھڑا رہا۔ میں ایک زلی سواں کے لیے سوچتا رہا۔ آدم جنت سے یوں نکلا۔ گیاہ کیا بیج مچ اس نے گندم کا دانہ چکھا تھا؟ یا کسی دیوار پہ کھے لفظوں کے لیے ہی نکالے گئے تھے۔ دیکھتے ہی یہ دیوار کتنے گناہوں کے دھبے اپنے جسم پر پہنے کھڑی ہے ور مس راؤ کا خون، ایک پاکیزہ ٹیچر کا خون بھی۔ ویسے مس راؤ کی غلطی تھی کہ اس نے گارڈینا کی باڑ کٹوا کر دیوار بنا دی۔" مس راؤ کی غلطی تھی یا نہیں۔ اب تم غلطی ضرور کر رہے ہو۔ اتنے قیمتی وقت کو دیوار پڑھنے پر خرچ کر رہے ہو۔ ہوتا ہے ہو چلو چل کر کسی سے مل لو۔" شیخ نے ہاتھ پکڑ کر اسے آگے چلایا۔

"ہاں میں بسو کے کنبے سے منا چاہتا ہوں۔ وہ ہمارے ہاں صفائی کرتے تھے اور برکت مالی سے۔ رحما سائیں ہمارے ہاں بگھی چلاتا تھا۔ پتا نہیں وہ لوگ کہاں کہاں رہتے ہیں۔ خیر غلام رسول بتا دے گا۔"

"غلام رسول؟"

"ہاں۔ وہ ہمارا رسویا تھا۔ اُسے میں عہد لکھتا رہتا ہوں۔"

"تمہارا رسویا مسلمان تھا؟" شیخ نصیر نے اس کے جذباتی تاؤ کو کم کرنے کے لیے یہ بات پوچھی۔ ورنہ اُسے معصوم تھا کہ مغلوں کے وقت سے بڑے بڑے ہندو سکھ گھرانوں میں باورچی مسلمان ہی رکھے جاتے تھے۔ سوسناں بخشی اُسے بتانے لگا۔ "ہماری بیک گراؤنڈ زمینداروں کی رہی ہے۔ صدیوں سے ہمارا خاندان زمینوں سے جڑا ہوا ہے۔ کبھی بڑے زمینداروں سے مراسم تھے۔ روز ہی دعوتیں ہوتیں، جن میں گوشت کے کھانے زیادہ پکتے۔ مرغ دوست اور بیڑے بھوننے کا کام کوئی ہندو رسویا تو کر نہیں سکتا تھا۔

"تو اس زمیندار دوستوں سے ملنے نہیں جاؤ گے۔ کم از کم وہ جولاہور میں ہیں۔" شیخ نے سے ٹوٹا۔

"نہیں، ان میں سے کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟"

”وقت پہ سب نے دعا دیا۔ سبھی چاہتے تھے ہم یہاں سے نکال دیے جائیں۔ مذہب کو یہاں سے لپیٹ لیا گیا تھا۔“ شیخ نے معذرت خواہی کے انداز میں کہا۔

”مذہب نہ سیاست، پنجاب کے مسلمان زمیندار کا اور ہی معاملہ تھا؟“

”چلو بتاؤ۔“

”ان میں سے اکثر ہمارے مقروض تھے۔“

”مقروض تھے؟ تمہاری فکر کے لوگ۔“ سانیال کو لگا شیخ پٹر بالکل ہی پیدل تھا۔ سودہ بتاتا رہا۔ ”میرے باپ دادا کی لاکھوں کی پرنکس تھی۔ اپنی زمینداری کو انہوں نے ترقی دی۔ مزارع کی حالت کو بگڑنے سے بچایا۔ کاشت کے نئے تجربے کئے، باغات لگوائے اور ساتھ ہی کارخانے۔ جب کہ دوسری طرف پس ماندگی تھی اور عیاشی۔ کتنے بڑے بڑے زمینداروں کی زمینیں گروی پڑی تھیں۔“

”تو ان سے تمہارے مراسم؟“

”ختم ہو چکے۔“

”اور وہ جو خاندانیں بھنگی اور سائیں وغیرہ سے ملنے کی بات کر رہے ہیں؟“

”وہ بات پکی ہے۔ ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ وہی تو لوگ تھے جن کی وجہ سے ہم قتل ہونے سے بچ گئے۔ ہماری بڑیاں غور نہیں ہوئیں۔ کوٹھی لوٹ نہیں گئی۔ کم از کم ہمارے سامنے نہیں۔“

”اور یہ سب مسلمان تھے؟ بلاشبہ۔ میں کہہ چکا ہوں جھگڑا ہندو مسلمان کا نہیں تھا۔ جھگڑا تو ان کا تھا جنہوں نے بعد میں کوٹھیوں اور جائیدادوں پر قبضے کئے۔“

”تم کہہ سکتے ہو تمہاری کوٹھی تمہارے نوکروں چاکروں نے نہیں لوٹی؟“

”میں چھی طرح جانتا ہوں بھائی۔ انہوں نے پوری نگرانی کی۔ کتے گھوڑے تک سنبھالے رکھے، تاوقتیکہ کسٹوڈین واؤں نے اور لگی لیڈروں نے مل کر سب کچھ لوٹا۔ سوائے سونا چاندی اور کرنسی کے۔“

”سوائے سونا چاندی اور کرنسی کے؟“

”ہاں۔ ان نوکروں کی وجہ۔ اس وقت کوٹھی کے اندر تین مسلمان کتبے آباد تھے۔ ایک بھنگی کنبہ اور نکلنے سے پہلے پناہی نے تجوریوں کا مال اور عورتوں کے زیورات اُتر کر چار کنستروں میں بھرا اور ایک کنستر ہر ایک کو ارڈر کے کنبے کو دے دیا۔ اس خیال سے کہ اگر یہ لوگ مار بھی لیں تو بھی مٹ جانے سے اچھا ہے۔ آخر کو انہوں نے برسوں خدمت کی ہے۔ بعد میں اچھی زندگی گزاریں گے۔ ایک کنستر میں کم از کم پانچ لاکھ کا مال تھا Imagine اس زمانے میں۔“

”تب تو وہ لکھتی ہو گئے ہوں گے۔“

”نہیں، انہوں نے وہ کنستر زمین میں گاڑ دیے۔ کسی نے کھول کر آنکھوں سے بھی اس دولت کو دیکھا تک نہیں۔ فسادات کے ختم ہونے پر جب پناہی ایک دن کے لیے یہاں آئے، اپنے کاغذات اور کتابیں لے جانے کی اجازت لے کر تو ان چاروں نے وہ کنستر نکال کر حوالے کر دیے۔ ہلکے سر پہ اٹھ کر سرحد تک چھوڑ آئے۔ وہی دوست تھی جس کی مدد سے ہم انگلستان جا کر اچھی طرح سیٹل ہو سکے۔“

پھر اپنی فائٹ سے دو گھنٹے پہلے بخشی سانیال، دھوبی منڈی کی ایک غلیظ گلی میں غلام رسول کے گھر کھانا کھانے

گیا۔ کتنا بوڑھا اور جھکا ہوا ہو گیا تھا ان کا ڈشکراخانہ، جس کی چمکی لٹکتی جدتھی اور کالی گھٹ موچیں جنہیں وہ ہر وقت دیکھنے لگی کا ہاتھ لگاتا ہی رہتا تھا مگر خیر اس نے بھنے بیڑے، اپنے چھوٹے صاحب کے آگے رکھے اور چٹکھ جھلٹے ہوئے بتانے لگا صاحب آپ کی کوٹھی کا برا حال کر دیا ہے، پناہ گیروں نے۔ ابھی تک آپ کے سامنے کارنگ سفیدی چل رہی ہے۔ کوئی ذرا سی مرمت نہیں کرتا اور باغ تو بالکل اُجاڑ دیا ہے۔ پھل دار درخت کنو کر لکڑی جد دی۔ مجھ سے تو دیکھ نہیں گیا۔ کوارٹر چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ ویسے بھی وہ لوگ کرایہ مانگتے تھے۔ کسی گھٹیا خاندان کے آگئے ہیں وہاں۔ خود غلام رسول کے حالات کیا تھے۔ ایک لڑکا تو آوارہ نکل گیا تھا۔ دوسرا سٹیشن پر قلی ہو گیا۔ تیسرا جو کچھ پڑھ گیا تھا وہ کسی سیاسی پارٹی کا رکن بنا۔ زندہ باد، مردہ باد کرتا پھرتا ہے، اس امید پر کہ اقتدار میں آکر شاید اچھی نوکری دلا دیں۔

”اور رہا سہ نہیں؟ بسو کا کنبہ، وہ اب کیا کرتے ہیں؟ سائیں نے دریافت کیا۔“

رحمہ تو ہنڈ چلا گیا تھا۔ سائیں کو وہ گاؤں یاد آیا جہاں ان کی زمین تھی، باغ تھے۔ رحمان کے مزار سے کا بیٹا ہی تو تھا۔ کبھی کے لیے یہاں لایا گیا تھا۔ سو بھنگن پچاری کب کی مریچکی اور اس کا کنبہ وہی کوٹھی کے کوارٹر میں رہتا ہے۔ وہی کام کرتا ہے جھاڑوٹا کی کا۔

شام کو ایئر پورٹ جانے کے لیے وہ اپنے بیگ میں چیزیں رکھتے ہوئے سوچتا رہا۔ زندگی کے یہ دونوں کتنے اہم رہے۔ ایک بار میں نے وہی چیل کے شاندار درخت دیکھے تھے۔ وہی کیسر کے پھول، وہی ٹاہلیاں، وہی بیاں پالیاں۔ اسی ہوا میں سانس لی، راوی دیس کی ہوا۔ انہی سڑکوں پہ قدم رکھے جن پر اس کے بڑے چلتے رہتے تھے۔ دیس لگائے کا دروول سے کبھی گیا نہیں۔ لیکن یہ تجربہ! دیس میں آکر اپنے پیارے شہر میں بے پوچن پھرنا۔ اب وہ واپس جا رہا تھا۔ کسی کو اپنے دس کا سوز سمجھائے بغیر ہی۔ دل کیسے خاں خالی لگ رہا ہے۔ واپسی کے سفر میں۔ کتنی تمنہی یہاں لوٹ کر آنے کی۔ اب جدی سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ پھر کبھی نہ آنے کے لیے لاہور، ندن سے اجنبی کیا ہوگا؟

لیکن سنیال بخشی کے اندر اس جذباتی سوز و ساز سے آگے بھی ایک جھنجھٹ تھی۔ وہ نئی سوچ کا انسان تھا۔ دنیا کے اسٹ پیس سمجھ سکتا تھا۔ اسی لیے سنجیدہ اور بغیر جذبات کے بھی سوچ رہا تھا۔ تاریخ نے کیسی کروٹ لی تھی۔ کروڑوں لوگ اپنی جگہ سے اکھاڑ پھوڑ دیے گئے۔ ایک بے دردی کے ساتھ اپنی زمینوں سے جد کر کے بے ٹھکانا کر دیے گئے لیکن کس لیے؟ سنی ہوئی باتیں۔ پڑھی ہوئی باتیں اسے یاد آتی رہیں۔ اس خطے کے لوگوں کی لڑائی کلونیل، سٹریٹ کے ساتھ تھی، انہی کو نکالنا تھا۔ لوگوں کا خواب تو یہی تھا مگر پرانے سیاست دان کچھ بھی سمجھ نہ سکے۔ کتنے کٹر نکلے عقل میں Foresight میں۔ مگر کس قدر طاقتور تھے فیصے کرانے میں انہوں نے اپنے فیصلے کر دیے۔ وہی جو کاغذ پہ لکھ رہے تھے۔ امیر ہندوؤں کو نکال دینے سے کس غریب کو فائدہ پہنچا؟ وہی جو پہلے تھا آج بھی ہے۔ اسے دھوبی منڈی کی مفسس آبادی یاد آتی رہی، جہاں وہ غلام رسول سے ملنے گیا تھا اور رنجے کے حالات۔ ان لوگوں نے نئی پرانی دوست سے کچھ بھی نہیں سنا۔ یہ چار کنبے، جوان کی کوٹھی کے خدمت گار تھے، کم از کم وہ دولت تو لوٹ لیتے جو ان کے ہاتھوں میں تھی۔ بے وقوف کہیں کے دیانت داری، نمک خواری۔ لیکن مزار سے جو ان کی چھوڑی ہوئی زمین کے مالک بننا چاہتے تھے، وہ بھی خان ہاتھ رہ گئے۔ مربیعہ تو مہاجر نوابوں نے لے لیے۔ سوچیں۔ سوچیں۔ اس کی نیکی ایئر پورٹ کی طرف بھاگی جا رہی تھی اور وہ بے وقت کا سوچ رہا تھا۔

تبھی اس نے باہر دیکھنا شروع کیا، اس پاس کی چیزوں کو۔ اس خوب صورت راستے کو سرسری دیکھا۔ دل کی

اب وہ حالت نہ تھی جو آتے وقت ہوئی تھی لیکن پھر بھی اس کے اندر سے کوئی پکارتا رہا۔ یہ میرا شہر تھا۔ یہاں میری گلیاں تھیں۔ میرا اسکول تھا۔ میری انا کی تھی۔ میرا 'جی سی' تھا۔ نہیں 'جی سی' تو اب بھی میرا ہے۔ انہوں نے میرا نام رول آف آنرز پر اسی طرح لکھا رہے دیا ہے۔ یہ نام تو رہے گا۔

پھر جب جہاز اونچا اٹھا تو اس نے کھڑکی سے شہر کے عظیم منظر کو دیکھا۔ مکان بے شمار مکان! مینار سے مقبرے۔ اور وہ رہے کالج کے گاتھک طرز کے مخروطی مینار۔ اُد پر اٹھتے ہوئے جیسے اپنے ہاتھ، ٹھکرا سے الوداعی ویو کر رہے ہوں۔ سنیال کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ "G C" تیرا شکر یہ۔ تو نے مجھے بہت کچھ دیا اور آج اتنی دور سے آواز دے کر بلایا تو بڑا کرم کیا۔ کتنے دنوں کے بعد تیرے صدمے پر پھر دانش ملی۔ یہ سمجھ سکا کہ میں اکیلا ہی تقسیم نہیں ہوا۔ خود لاہور کے دل میں بھی دراڑ پڑی ہے۔

کبھی کچھ دو گھن ایک وہ جو کل تھا، آج نہیں ہے ایک وہ جو آج ہے کل نہیں تھا اس سے پہلے اس سے دور تک ماضی پر نظر ڈالی۔ شاید کسی شہر کی تاریخ اس طرح تقسیم نہیں ہوئی ہوگی۔

سانیاں کشی کا جہاز لاہور کی حدود سے نکل گیا تو اس نے باہر دیکھنا بند کر دیا اور اپنے بیگ میں مٹی کے وہ پیالے سنبھال لئے گا، جو پریمیا کی فرمائش پر وہ چوبرجی چوک والے کپہار کی دکان سے خرید کر لے جا رہا تھا۔ کورے پیالے میں جھانکی ہوئی فرنی لندن میں اس کے دہائی دوستوں کے باب متی ہے۔ بڑی شان سے وہ بتاتے ہیں۔ یہ پیالے ہمارے آگرے کی مٹی کے ہیں۔ اب کم از کم ایک دعوت میں تو وہ بھی کہہ سکے گا "یہ پیالے میرے لاہور کی مٹی کے ہیں۔"

☆...☆...☆

دوائیٹوں کی کہانی

مسعود مفتی

میں اس بات کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور کی پرانی چار دیواری از سر نو بنائی گئی تھی کیونکہ ان دنوں میں خود اس کالج میں پڑھتا تھا۔ مگر ساری کہانی کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ ویسے عام تاثر یہی ہے کہ اس دیوار میں چنی ہوئی دوائیٹوں کی یہ کہانی بالکل سچ ہے۔ اب ساکنس سے ہریز اکیسویں صدی میں آپ سچائی کی سند مانگیں گے مگر میرے پاس صرف وہی سند ہے جو چار صدیاں پیشتر ولیم شیکسپیر نے اپنے ڈرامے ہمٹ میں دی تھی کہ ہمارے مبلغ علم کے ملکہ بھی کائنات کی وسعتوں میں بہت کچھ ہے۔

(THERE ARE MORE THINGS IN HEAVEN AND EARTH THAN ARE

DRAMT IN YOUR PHILPSPYHY)

کالج کی یہ چار دیواری بھلے وقتوں میں بنائی گئی تھی۔ بھلے وقتوں سے مراد یہ کہ ۱۹۵۵ء کا پاکستان واقعی بہت اچھا ملک تھا۔ آج کے تاریک حالات سے اتنا مختلف کہ آج کا طالب علم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نہ مہنگائی، نہ ڈاکے، نہ غبن، نہ ماحول سے بیزاری۔ یعنی جواب ہے وہ تب نہ تھا اور جو تب تھا، وہ اب نہیں ہے۔ باغیظ دیگر یوں سمجھ لیں کہ جاگیرداری نظام و پرہی اوپر تھا مگر ابھی ہمارے پاؤں کی رنجیر نہ بنا تھا اور اسے مضبوط تر کرنے والے فوجی آمروں سے ابھی قوم کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس لیے وہ دن ملک کے لیے بھی بڑے بھلے تھے اور یہ کالج بھی بڑا استعین اور رہا تھا۔

اس کا ایک واضح ثبوت تو یہ بھی ہے کہ ۱۹۵۵ء کی عمدہ تعمیر کے بعد یہ چار دیواری پینتالیس برس بعد بھی قائم ہے۔ یہ نہیں کہ ان دنوں ہوانے والوں اور بنانے والوں میں کمیشن نہیں چلتی تھی مگر اس زمانے میں وہ صرف اتنی رشوت یا کمیشن لیتے تھے جیسے کوئی سیر بھر دودھ کے اوپر سے ملائی کی پتلی جھلی اتار کر چپکے سے کھا جائے۔ آج کل کی طرح نہیں تھا کہ ملائی کھا کر دودھ بھی پیا، برتن بھی سرعام نیلہ کیا اور ساتھ اقتساب کی خوبیوں پر لیکچر بھی دینے لگے۔

اسی فرق کی وجہ سے چار دیواری کا کام اتنا اچھا ہوا تھا کہ بیسویں صدی مکمل ہونے تک وہ قائم تھی۔ ۳۱ دسمبر، ۱۹۹۹ء کو ساری دنیا کے ساتھ اس کالج میں بھی نئی صدی اور نئے ہزارے کا جشن منایا گیا۔ اس شام کسی من چلے نے ترنگ میں آکر اپنی کار کی ٹکر چار دیواری کے مین گیٹ سے مار دی خوش قسمتی سے زیادہ نقصان نہیں ہوا لوہے کے گیٹ کا تھوڑا سا حصہ ٹیڑھا ہو گیا اور لال اینٹوں کے جس چوکور ستون میں اس کی چوبیس نصب تھیں اس کی چند اینٹیں اکھڑ کر نیچے گر پڑیں۔

کالج کی فرض شناس انتظامیہ نے اگلے ہی دن ایک مستری کو بلایا جس نے معمولی اور چھوٹا کام ہونے کی وجہ سے ناک بھوں چڑھایا۔ پہلے تو بالکل راضی ہی نہ ہوا۔ پھر چھوٹے کام کی بڑی جرات، گلی۔ کام سرکاری ہونے کی وجہ سے وہ فوراً قبول ہو گئی۔ اس نے پٹ من کے تھیلے میں سے اوزر نکالے۔ انہی پرانی اینٹوں کی نامہوار سطح پر تیشی کی مسلسل دھیمی ضربیں لگائیں جن سے پرانی سیمنٹ کے پھوڑے ایسے جھڑتے گئے جیسے پرانے سکول کا گھن چھٹی کے فوراً بعد بچوں سے خالی ہو جاتا ہے پھر اس نے حلوہ بنانے کے انداز میں کانڈی سے نگاری میں ریت ور سیمنٹ ملائی۔ گیلہ مصاد جمایا اور

پرانی اینٹوں کو بھگو کر رگڑ کر اور جوڑ کر چوکور ستون دوبارہ کھڑا کر دیا۔

مستری کا کام تو بہت، چھ تھا۔ اینٹیں بھی موتیوں کی طرح جڑی گئی تھیں۔ مگر انسان کا عمر، لیاقت اور نظر بعد کو اکب تک کب پہنچی ہے۔ اس لیے گو مستری کی روایتی ہنرمندی کے مطابق کوئی بھی غلط چیز نہ ہوئی تھی مگر وہ اینٹوں کے ادل بدل ہونے کی وجہ سے ساوی ورنہیں، اجزا کی ترتیب میں گڑبڑ ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ جو اینٹ پہلے چوکور ستون کے اندر کی طرف لگی تھی وہ اب اس کے باہر کی طرف لگ گئی اور جو پہلے باہر تھی وہ اب اندر کی طرف لگ گئی۔ اس سے ستون کی ساخت، شکل اور جسامت میں تو کوئی فرق نہ پڑا۔ صرف یہ الیہ ہو گیا کہ جس اینٹ کا چہرہ پہلے کالج کی طرف تھا وہ اب باہر سڑک کی طرف ہو گیا اور دوسری اینٹ کا چہرہ باہر سڑک کی بجائے کالج کی طرف ہو گیا۔ یعنی اینٹوں کے سامنے والا پرانا نظارہ بالکل ہی بدل گیا۔

پچھلے چوالیس برس سے اندر والی اینٹ مسلسل ایک ہی منظر دیکھتی رہتی تھی۔ کسی حسینہ کی، نگ کی طرح اٹھتی ہوئی خود اس سڑک کے ابھار کے بعد ایک صحن نمائش دی۔ اس کے درمیان گوتھک طرز تعمیر کی خوبصورت عمارت، پرندوں سے سرگوشیاں کرتا ہو کالج ہال کا فلک بوس مخروطی مینار، اوول کی سرسبز گولائیوں میں رنگارنگ پھولوں کے کہکشائیں، ان میں گھومنے والے طلباء اور طالبات کی ہنستی مسکراتی پرامید جوانیاں، بشاشت سے بریز چھجھاتے ہوئے پرشباب چہرے اور ستاروں پر کندیں ڈالنے والے اونچے اور سہانے خواب۔ امن، سکون اور آشتی میں ڈوبا ہوا یہ منظر اب ایک دم غائب ہو چکا تھا اور اس کی بجائے دوسرا پریشان کن منظر تھا جس میں نیو ہوسٹل (New Hostel) کے ماتھے کے نیچے ٹریفک کا بے قابو سیلاب تھا، چوراہے میں بسوں، کاروں، رکشاؤں اور لوگوں کا شور حشر تھا۔ اضطرابی اور بھونچلی رفتاریں کا طوفان تھا اور ہر طرف سیاسی قسم کی بے معنی حرکت ہی حرکت تھی۔

اسی طرح باہر لگی ہوئی اینٹ کا چہرہ جب چوالیس برس بعد اندر کی طرف مڑا تو اسے یوں لگا جیسے بھرے میلے سے منہ موڑ کر وہ قبرستان میں پہنچ گئی ہو۔

دونوں ہی اینٹیں نئے مناظر سے حیرت اچھبے اور مخمضے میں ڈوب گئیں۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ از حد پریشان تھیں اتنی پریشان کہ قریباً نصف صدی میں پہلی دفعہ دونوں آپس میں گفتگو پر مجبور ہو گئیں۔ پہلے تو ”ہائے اللہ۔“ ”میں مر گئی“ اور ”یہ سب کیا ہے؟“ قسم کے رد عمل کا تبادلہ ہوا۔ پھر کچھ کہنے، کچھ سکوت اور کچھ سوچ کے بعد باہر والی اینٹ (جو پہلے اندر تھی) پوچھنے لگی تم آدھی صدی تک چوراہے میں یہ طوفانی رفتار دیکھ کر پاگل نہیں ہو گئیں؟“

اندر والی اینٹ (جو پہلے باہر تھی) بولی۔ ہمیشہ تو یہ حال نہیں تھا۔ جب میں اس ستون میں نئی نئی نصب ہوئی تھی تو حالات بڑے مختلف تھے۔ مسلسل ٹریفک کے باوجود چوراہے کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا۔ ٹریفک کا بہاؤ دھیمّا تھا اور اس میں ہمواری تھی اور زندگی کی اپنی متوازن سرنگیت تھی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ باہر والی اینٹ نے پوچھا کیونکہ مسلسل اتنے برس کالج کے اندر کے منظر میں وہ ہمیشہ ایک دھیمی یکساں نیت دیکھتی رہی تھی۔ اس یک رنگ تجربے کی محدود روشنی میں وہ سابقہ باہر والی اینٹ کی بات سمجھنے سے قاصر تھی جو گول باغ، نیو ہاسٹل اور ضلع پکھری کے آس پاس بسنے والی بھرپور زندگی کا نچوڑ تھی۔

”اب کیسے سمجھوں تمہیں؟ کس طرح تشریح کروں کہ اس ٹھہری ہوئی مناسب زندگی کی سرنگیت اب شور شراب، ہاؤس، غل غپاڑے اور افراتفری میں بدل گئی ہے۔ دراصل اس وقت زندگی کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا کام

کر رہا تھا مگر اب وہ نہ خود اپنے کام کرتا ہے نہ دوسروں کو ان کا کام کرنے دیتا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتیں تمہاری پہیلیاں۔“ نئی باہروالی نے کہا۔

”ٹھہرو۔ میں تمہیں دو ایک مشابوہ سے سمجھاتی ہوں۔ یہ جو تم چوراہے کے کنارے ٹریفک پولیس والا دیکھ

رہی ہو یہ ان دنوں چوراہے کے بیچ میں کھڑا ہو کر ہاتھ اور بارودوں کے مربوط اشروں سے ٹریفک کنٹرول کرتا تھا مگر اب وہ

چوراہے کے باہر کھڑا رہتا ہے اور ٹیکسی رکش والوں کو تنگ کر کے اپنی جیب بھرتا رہتا ہے۔ ٹریفک کا ناخدا اب کوئی نہیں اور وہ

اپنی بے گام افراٹھری یا انارکی میں ڈھکی رہتی ہے۔ اسی طرح بسوں کاروں اور رکشوں والے اُس زمانے میں اپنی بریک

اور شیئرنگ کا جائز استعمال کرتے تھے مگر اب اس کی بجائے یہ اپنے ایکسی سیٹر اور ہارن کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ اسی

وجہ سے اس چوراہے میں سے لڑکیوں کی رنگین آنچلوں والی اور لڑکوں کی ٹلھیلیوں والی سائیکلیں اب غائب ہو چکی

ہیں۔ اُس زمانے میں سڑک پر آوازیں ہوتی تھیں۔ اب صرف شور ہے۔ اُس زمانے میں میرے سامنے سے گزرنے

والے چہروں پر اطمینان، مسرت اور قناعت کی پھوار چمکتی تھی مگر اب وہی چہرے بے اطمینانی، غیر آسودگی، تشویش، پریشانی

اور نفسانسی میں ڈوبے ہوئے ہیں تم اپنے سامنے جو ضلع کچہری دیکھ رہی ہو، اس میں ان دنوں نصف ملتا تھا۔ مجسٹریٹ

اور وکیل قانون کی بات کرتے تھے۔ مگر اب وہ صرف آپس میں الزام تراشی کرتے ہیں اور انصاف ناپید ہے۔ اب میں

قریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی لمبی فہرست میں سے تمہیں کیا کیا گناؤں ورا گرن بھی دوں تو تم میری بات کہیں مجھ سکو گی

جبکہ اتنا لمبا عرصہ تم کالج کے اندر ایک ہی عمر کے چہرے، ایک ہی جیسے لباس اور ایک ہی جیسی مصروفیات دیکھتی رہی ہو۔“

نئی باہروالی اینٹ سوچ میں پڑ گئی۔ ”یہ جو تم نے آخری فقرہ بولا ہے نا، اس سے میں کچھ کچھ سمجھنے لگی ہوں

کیونکہ اندر بھی اب ہر چیز ایک جیسی نہیں تھی۔“

”وہ کیسے؟“ نئی اندروالی اینٹ نے پوچھا۔

”ہوں اوں اوں۔“ باہروالی سوچ بھرے لہجے میں بولتی گئی۔ ”بات کچھ یوں ہے کہ جب اس ستون

میں لگنے کے بعد میں پسے پہل کالج میں گھومنے والوں کو دیکھتی تھی، تو ان دنوں پڑھانے والے بھی اور پڑھنے والے بھی

اپنی شکل و صورت، چال ڈھال اور بول چال سے ہی پڑھنے پڑھانے والے لگتے تھے۔ مگر اب کچھ فرق فرق لگتا ہے۔ نہ

معلوم کیوں؟“

پھر وہ دونوں آپس میں اپنے اپنے سابقہ تجربات پر تبادلہ خیالات کرتی رہیں۔ مگر بات چیت زیادہ نہ چل سکی

کیونکہ دونوں بار بار اپنے نئے نظروں میں کھوجاتی تھیں اور گرم سم ہو کر اپنی پیشانی کی سیدھ میں دیکھے لگتیں۔

پھر یہ انداز ان کا معمول بن گیا۔ کئی کئی دن بات نہ ہوتی کبھی کبھار ایک ”دھ جیسے“ کا جادو ہو جاتا یا کبھی وقفے

وقفے سے تھوڑی دیر کے لیے گفتگو جاری رہتی۔

ایک دن باہروالی اینٹ اندروالی سے پوچھنے لگی۔ تم جو اتنے برس باہر لگی رہیں اور پھر پور زندگی کا سیلاب دیکھتی

رہیں، تو کوئی ایسی چیز بھی دیکھی جو تمہیں یاد ہو گئی ہو۔“

”مجھے کچھ دیر سوچ لینے دو پھر بتاؤں گی۔“

اس ”کچھ دیر“ میں دو تین ہفتے گزر گئے۔ پھر ایک رات وہ خود ہی بول پڑی۔ ”میں نے اس چوراہے سے کئی

برائیاں جنازے اور سیاہی جوس گزرتے دیکھے ہیں۔ کئی دفعہ قیدیوں کو جھکڑیوں لگائے ضلع کچہری میں اتے جاتے دیکھا

ہے اور ایسے ہر منظر کو چونک کر بڑے تجسس سے دیکھا ہے مگر ہستہ آہستہ سب ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ صرف ایک جلوس ایسا تھا جس کا تاثر میں آج تک نہیں بھول سکی اور وہ خاموش ہو گئی۔

”کیا تھا وہ جلوس؟“ باہروالی اینٹ نے پوچھا۔

”وہ ۱۹۷۱ء کے آخری دن تھے۔ ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بنگلہ دیش بن گیا تھا اور غم و غصے میں بھرے ہوئے لوگ جلے جلوس کر رہے تھے۔ ایک دن نو جوان طالب علموں کا ایک جلوس اس چوراہے سے گزرا۔ ان کے چہروں پر ایسا کرب اور دکھ تھا جو آج تک نہیں بھول سکی۔ وہ بہت سی غصے میں نعرے لگا رہے تھے۔“

”کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں“

”مگر کیوں کچھ نہیں ہوا؟“ ورو غم و غصہ کہاں گیا؟

”اس لیے کہ یہاں کبھی بھی کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ نو جوان جیسے جیسے بڑے ہوتے جاتے ہیں وہ بھی اسی نظام کا حصہ بنتے جاتے ہیں جس کے خلاف وہ ماضی میں نعرے لگایا کرتے تھے۔“

”مگر یہ عجیب بات ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

”اس لیے کہ پاکستانی اذیت پسند لوگ ہیں۔ اپنے نظام کے ہاتھوں مستقل کرب میں رہتے ہیں مگر اس نظام کو بدلنے کی ہمت نہیں کرتے۔ اس کم ہمتی میں نصف صدی گزر گئی ہے۔“

یہ بات سن کر اتنا اچنچا ہوا کہ اس کی سرخ سطح پر سفید شورے کے چند ذرے ابھر آئے پھر دونوں خاموش ہو گئیں جیسے گہری سوچ میں ہوں۔

کئی دن اور گزر گئے۔

ایک دن اندروالی اینٹ نے باہروالی سے پوچھا ”تم سے کافی دنوں سے بات ہی نہیں ہوئی۔ خیریت تو ہے؟“

باہروالی بولی ”پچھلی ملاقات میں تم نے اپنی یادوں کا ذکر کیا تو اس کے بعد میں اپنی یادوں میں کھوئی رہی۔ اندروالی اینٹ طنز سے ہنسی ”اب تو اندر کا منظر دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم اتنا عرصہ کیا کچھ دیکھتی رہی ہو۔ ایسی سپاٹ و رہموار زندگی میں کیا یادیں بن سکتی ہیں۔“

اب باہروالی بھی طعن پر اتر آئی ”تم باہر کے شور، ہنگاموں اور دھول کیچڑ میں اتنی پھنسی رہی ہو کہ تمہیں زندگی کے لطیف پہلوؤں کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ تم بھول رہی ہو کہ وقت جہاں بھی گزرے گا اور جیسے بھی گزرے گا اس گزرگاہ پر یادوں کے نقش پابن جائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آہستہ خرابی اور نرم روی میں دھول تو کبھی نہیں اٹھتی۔ شور بھی نہیں ہوتا مگر نقش پابن اور پکارا جاتا ہے۔“

”مثلاً؟“ اندروالی کے سوال سے بے یقینی چھلک رہی تھی۔

”شاید تمہیں میری بات ماننے میں تامل ہے۔ اس لیے میں کوئی دلیل دے کر تمہیں یور نہیں کرنا چاہتی لیکن اگر کسی طرح اپنی جگہ سے حرکت کر کے باہر آ سکو تو میرے چہرے پر تمہیں دو حرف کھدے ہوئے نظر آئیں گے۔“

”واقعی؟“ اندروالی حیرت سے چلائی۔ ”کیا مطلب ہے ان حروف کا؟“

”سمجھ نہیں آتی کہ کہاں سے بات شروع کروں۔“ باہروالی کہنے لگی اور خاموش ہو گئی۔

پھر وہ کئی گھنٹے خاموش رہی۔

”دراصل تم باہر کی دنیا میں پاکستانی قوم دیکھتی رہی ہو اور میں کالج کے اندر کی دنیا میں افراد دیکھتی رہی ہوں۔ ان دونوں کی دنیا الگ الگ ہوتی ہے۔ جب ۱۹۵۵ء میں مجھے اس ستون میں اندر کی طرف لگایا گیا تھا تو میں نے انہیں پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔ گیٹ کے بالکل پاس ہی اوول کے اوپر والے کمرے پر وہ بیٹھ تھا جہاں وہ روزانہ بیٹھ کرتے تھے۔“

وہ پھر خاموش ہو گئی اور لمبے وقفے بعد بولی ”لڑکا لمبے اور چھریرے بدن والا تھا اور لڑکی بھری بھری گد ز جسم والی تھی۔ کالج کے اندر بے پردہ گھومتی تھی مگر گیٹ سے باہر نکلے لگتی تو کتے ہیں مجھ سے دوائنٹ اوپر اس ستون پر رکھ کر کالہ برقعہ پہنتی اور پھر باہر نکل جاتی۔ اُن دنوں برقعہ بتدریج غائب ہو رہا تھا اور کئی لڑکیاں کالج میں ایسا ہی پردہ کرتی تھیں۔ پھر جب سال ختم ہونے لگا اور وہ کالج چھوڑ کر جانے لگے تو لڑکے نے چاقو کی نوک سے میرے چہرے پر اس لڑکی کے اور اپنے ناسوں کے پسے حروف کندہ کر دیئے۔ پھر وہ دونوں باری باری ان حروف کی نیم گہرائی میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے رہے۔“

ایٹنٹ کی آواز ڈوب گئی۔

”پھر کیا ہوا؟“ اندروالی نے بے صبری سے پوچھا۔

”نہ معلوم کیا ہوا۔ اور کیسے ہوا“ باہروالی دھیرے بول رہی تھی مگر مجھے یوں لگا کہ میں بھی ان کی طرح زندہ ہوں، ذی روح ہوں اور محسوس کرتی ہوں۔ میرے ذرے ذرے میں گویا برقی لہریں سی دوڑنے لگیں جیسے ان میں سے ایک کی رگوں کا خون میرے اندر سے ہو کر دوسرے کی رگوں میں جا رہا ہے۔ یہ بڑی عجیب تجربہ تھا۔ میں تو اسے صحیح انداز میں بیان بھی نہیں کر سکتی اور ابھی میرے جسم کا ہر ذرہ اسی سہانے وجد میں تھا کہ وہ دونوں دھیمے قدموں سے چلتے چلتے موڑ مڑ گئے۔“

”میرا خیال تھا اس نے بات جاری رکھی کہ شاید وہ کچھ دنوں بعد نظر آئیں گے۔ مگر نہیں۔ دن ہفتے اور برس گزرتے گئے مگر وہ نہ آئے۔ ان کی جگہ دوسرے جوڑے اسی انداز میں اوول کی سرسبز حلالان میں ٹینگنوں کی طرح جڑے ہوئے بیجوں پر بیٹھے رہتے مگر مجھے ان سے کوئی غرض نہ تھی۔ کیونکہ وہ میرے اندر کوئی ارتعاش پیدا نہ کرتے تھے۔ جب برس گزرتے گئے اور انتظار بھی زنگ آوے ہونے لگا تو شاید میں بھول ہی جاتی مگر ایک دن اچانک میں نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ اس کے ساتھ تین چار برس کا لڑکا تھا اور وہ میرے قسم کا خاوند تھا۔ وہ تینوں کالج کے دفتر کی طرف جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں؟ پھر خاوند تو دھری رہا۔ مگر لڑکی اپنے بیٹے کے ساتھ میری طرف آتی نظر آئی وہ جیسے جیسے قریب آ رہی تھی۔

میرے جسم کا ہر ذرہ بتدریج زیادہ کانپ رہا تھا۔ وہ آئی رکی مجھے دیکھتی رہی۔ دونوں حروف پر انگلی پھیرتی رہی۔ پھر گیلی آنکھوں اور ڈھیلے قدموں سے چلتی اسی مخصوص بیچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

”پچھلے پینتالیس برسوں میں وہ کئی دفعہ آئی۔ کبھی دو سال بعد۔ کبھی چار سال بعد۔ کبھی اس سے بھی

لمبے وقفوں کے بعد۔ ہر دفعہ اس نے مجھے سوگوار نظروں سے دیکھا۔ بلکہ ایک دفعہ تو دونوں حروف کو چوم بھی لیا جس سے میرے بھی اندر ایک ناقابل بیان بھانپا ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اور کیسے۔ حالانکہ میں سمجھتی تھی کہ اپنی پیدائش کے دوران بھٹے کی آگ نے میرا ظاہر و باطن بھسم کر دیا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ میرے مردہ جسم پر اس دو حروف کے

گھاؤ نے شاید مجھے نئی زندگی دے دی تھی جو بالکل مختلف تھی اور جس کا مجھے پتہ نہ تھا۔ بلکہ کسی کو بھی پتہ نہ تھا۔“
اندروالی اینٹ نے پوچھا ”اور وہ لڑکا کبھی نظر آیا؟“

”نہ۔ بالکل نہیں۔ اسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ نہ معلوم آسمان کھا گیا ہے یا زمین نکل گئی ہے۔“
”دنیا بڑی وسیع ہے“ اندروالی نے کہا۔

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئیں اور کافی دنوں تک ان کی آپس میں گفتگو نہیں ہوئی۔ دریں اثنا باہروالی اینٹ پچھلے چند ماہ میں چوراہے میں بننے والی زندگی کے ریلے سے مانوس ہو گئی تھی بلکہ بعض اوقات اندروالی اینٹ کی اسی دور کرنے کے لیے اسے باہر کے حالات کی جھلکیاں سناتی رہتی اور اندروالی اپنے سابقہ تجربوں کی بنا پر ان پر تبصرے کرتی رہتی۔ پان پر تبصرہ و تشریح کرتی رہتی۔ مگر ایک دن اس نے محسوس کیا کہ باہروالی اینٹ پل پل میں بل رہی ہے جیسے کوئی بہت بے کمل ہو۔

”کیا بات ہے؟ تم بے چین لگتی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

باہروالی اینٹ کی تو خوف سے جیسے ٹھکی بندھ رہی تھی۔ ”آج میں نے اسے دیکھا ہے۔ وہ جو لمبے قد اور چھریرے بدن والا ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جھکڑی تھی تیس سپاہیوں اور چند لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ابھی میرے سامنے والے فٹ پاتھ سے گزر کر وہ سب ضلع کچہری میں گئے ہیں۔ جس سپاہی نے جھکڑی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ بلند آواز سے ہاتھوں کو بتا رہا تھا کہ اس پر دھوکہ دہی، فہن، و قتل کے کئی مقدمے بن گئے ہیں۔“

وہ اتنی خوفزدہ اور سراسیمہ تھی کہ اندروالی اینٹ کے کسی سوال کا بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ مجبوراً دونوں خاموش ہو گئیں اور کئی دن خاموش رہیں اسی خاموشی میں اس برس کا اختتام ہو گیا، اور ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ کا دن آ گیا۔

یہ دن دونوں اینٹوں پر بہت بھاری ثابت ہوا۔

رہور میں سردی کی لہر آئی ہوئی تھی مگر دھوپ چمک رہی تھی۔ کانچ میں سرمائی چھنیاں تھیں مگر دفتر کھلا تھا۔ گیٹ کے پاس ہی دوس کے پاس کنارے جو بیچ تھا اس پر صبح سے شاف کے چند لوگوں نے قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ کبھی دو ایک چلے جاتے۔ پھر دو ایک اور آ جاتے اور دو پہر تک زوردار بحث ہوتی رہی کیونکہ صبح کے تمام اخبارات میں حمود الرحمن کیشن کی رپورٹ کی تفصیلات تھیں جسے حکومت نے گزشتہ روز رازداری سے خارج کر کے بے پردہ کر دیا تھا۔

اس بیچ پر جو زوردار بحث ہوتی رہی وہ اندروالی اینٹ (جو پہلے باہر ہوا کرتی تھی) سختی رہی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں کیا ہوتا رہا۔ تب اسے وہ جہوں یاد آیا، ان لوگوں کا کرب یاد آیا، اس کی وجہ سمجھ آئی اور وہ گم سم ہو گئی ایک دم گم سم۔ پاکستانی جو تھی۔

بیچ قریب ہی تھا۔ وہاں سے کسی نے کہا ”یوں لگتا ہے اس اینٹ میں سے دھواں نکل رہا ہے۔“

دوسرا غور سے دیکھ کر کہنے لگا ”دھواں نہیں گرو ہے۔ بارش جو نہیں ہوئی اس دفعہ بھی تک۔“

سورج کو ملے بادلوں نے ڈھانپ لیا کیونکہ ہوا تیز ہو رہی تھی۔

دو پہر ڈھلنے لگی۔ ایک کار کالج کے دفتر کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے ایک موٹا سا، بھرا سا مچھا بوڑھا ترکر دفتر میں چلا گیا۔ باقی لوگ کچھ دیر تو کار کے اندر بیٹھے رہے۔ پھر ایک سفید سرور خمد کمر والی بوڑھی عورت باہر نکلی۔ اس کے ساتھ گورنمنٹ کالج کا سرخ طیز پہنے ایک طالب علم نکلا۔ بڑھیا نے اترتے ہی کالج کے گیٹ کا رخ کیا۔

”دادی ماں۔ اُدھر کیا کرنے جا رہی ہیں؟“ لڑکے نے روکنے کے انداز میں پوچھا۔
 بڑھیا کی آواز میں سِکپا ہٹ تھی ”گاڑی میں بند کیا رہتے۔ ذرا باہر کی تازہ ہوائے لیں۔“
 ”اتنی سردی میں؟“ لڑکے کی آواز میں حیرت تھی۔
 ”چلتے رہو تو سردی نہیں لگتی۔“

گیٹ کے پاس پہنچ کر بڑھیا نے پہلے آس پاس کے پھولوں کی تعریف کی۔ پھر کیا ریوں کے ڈیزائن پر تبصرہ کرتے کرتے گیٹ کے چوکور ستون کے پاس آ کر رک گئی اور اُس کی سرخ اینٹوں کو دیکھنے لگی۔

”دادی ماں۔ کیا دیکھ رہی ہیں؟“
 وہ خاموشی سے مگر بڑے غور سے دیکھتی رہیں۔

”دادی ماں۔ آپ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں؟“
 ”نہیں بیٹے ڈھونڈنا کیا ہے۔ بس یہ دیکھ رہی تھی کہ ہمارے زمانے میں یہاں اور طرح کی اینٹیں ہوتی تھیں۔“
 لڑکا ہنس۔ ”وراصل دادی ماں پچھلے سال میں نے اپنی گاڑی کی ٹکر سے یہ ستون توڑ دیا تھا۔ اب تو یہ نیا بنا ہے۔“
 بوڑھی عورت جیسے بے اختیاری سے چلائی ”تم نے توڑ دیا تھا؟ تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟“
 لڑکے کے قبضے میں نو عمری کا اعتماد تھا ”بھد یہ بھی کوئی بات تھی آپ کو بتانے کی!“

خاتون سے جواب نہ بن پڑا اور وہ چپ ہو گئی، مگر لڑکا دس ہی دس میں حیران ہو رہا تھا کہ دادی ماں کے چہرے کا رنگ کیسا ہو رہا ہے۔ شاید ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے غائب سردی سے ہی آنکھوں میں پانی آ گیا ہے۔ اس لیے پیار سے کہنے لگا۔ ”دادی ماں سردی ہے نا؟“

چند لمحے خاموش رہی پھر دادی ماں بڑے کجھے ہوئے انداز میں کہنے لگیں۔ ”ہاں تمہیں سردی لگ جائے گی۔ چوگاڑی میں چل بیٹھیں۔“ پھر جیسے انہوں نے بے دھیانی میں ہی ستون کو دیسے تھپتھا دیا اور دونوں واپس مڑنے لگیں۔

ایک دم کچھ چننے کی آواز آئی اور ستون کے باہر دان اینٹ کا کچھ حصہ ٹوٹ کر دادی ماں کے قدموں میں آن گرا۔ انہوں نے ڈر کر ”اوئی اللہ“ کہا اور لڑکے نے انہیں سہرا دیتے ہوئے روڑے کو پاؤں کی ٹھوکر سے دور پھینک دیا۔
 ”یہ کیا ہوا تھا؟“ لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

ہونا کیا ہے بیٹے خشک سالی ہو تو اینٹ روڑے چننے لگتے ہیں۔ ”اور وہ دونوں کار کی طرف چل دیئے۔ آدھی رات کو وہ سال ختم ہو گیا بیسویں صدی ختم ہو گئی دوسرا ہزار یہ ختم ہو گیا۔ یکم جنوری ۲۰۰۱ سے وہ دونوں اینٹیں خاموش ہیں بالکل چپ چاپ۔ گم سم شاید اپنے صدی سے مر گئی ہیں۔ مگر کیا اینٹیں بھی مر سکتی ہیں؟؟؟
 شاید شیکسپیر ہی کچھ بتا سکے اُسے پتہ تھا کہ ہمارے مبلغ علم کے علاوہ کائنات میں اور بھی بہت کچھ ہے

☆...☆...☆

رفتگاں کی یاد سے روشن ہے قندیلِ حروف

(رفتگان)

منظر سلیم کی بازیافت

شمس الرحمن فاروقی

منظر سلیم کے نام اور کام سے میری واقفیت پرانی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ عمدہ ترقی پسند شاعر ہیں، لیکن ان پر ترقی پسندوں جیسی گھن گرج والی غلاموالائی شاعری کا کوئی اثر نہیں۔ وہ انسانی تجربات اور محسوسات کو سادہ لیکن موثر زبان میں بڑی خوبی سے بیان کر سکتے ہیں۔ وہ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند حلقوں کے باہر بھی ان کی قدر و منزلت ہے۔ ان کے کام سے مزید واقفیت اس وقت ہوئی جب میں نے ان کی کتاب ”مجاز، حیات و شاعری“ پڑھی۔ لڑکپن کے چند برس چھوڑ کر میں مجز کی شاعری کا کبھی قائل نہیں رہا۔ مجھے مجاز کی نظم ”آوارہ“ اب بھی تقریباً پوری یاد ہے لیکن میں اسے اب ایک معمولی بلکہ خراب نظم سمجھتا ہوں۔ مجز کی بقیہ شاعری (چند غزلوں کے سوا) میری نظر میں بالکل قابل اعتنا نہیں۔ لہذا میں نے منظر سلیم کی کتاب پر ”شب خون“ میں تبصرہ لکھا (”شب خون“ نمبر ۳۲، بت ۱۰، مئی ۱۹۶۸ء) تو مجاز کی شاعری پر بہت سخت تنقید کی۔ اور اس تنقید کی کچھ پچھتائیاں منظر سلیم کی کتاب پر بھی پڑیں۔ میں نے لکھا کہ منظر سلیم نے مجاز کی تعریف کی تھی اور مبالغہ آمیز اغلاط میں کی ہے اور ان کی ”کسی رائے زنی ایک انتہائی غیر تنقیدی مزاج کی آئینہ دار ہے۔“

جہاں تک مجھے معلوم ہے، منظر سلیم نے اور ندان کے پبلشر عابد سہیل نے میری اس سخت نکتہ چینی کا برامانا یا اسے اپنے اوپر ذاتی حملہ سمجھا۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ وہ زمانہ اور تھا۔ لوگوں میں بردباری تھی، تنقید کو صبر و تحمل سے سنا عام شیوہ تھا۔ ادبی برادری میں، اور خاص کر ادب کے سنجیدہ پڑھنے لکھنے والوں میں نظر کی وسعت بھی تھی کہ کئی طرح کے نقطہ نظر ایک ہی شخص یا ایک ہی طرح کے ادب کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔ اس زمانے میں تن کی طرح کا دستور نہ تھا کہ تنقید سن کر (یا پڑھ کر، اگر چہ آج کل کے لوگ پڑھتے کم ہیں) مصنف چراغ پا ہو جائے، اختلاف کو مخالفت سمجھے اور جس شخص نے تنقید لکھی ہے اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔ اس تبصرے کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد منظر سلیم سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور پھر کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن انھوں نے کبھی حرف شکوہ یا حرف اختلاف کو زبان پر نہ آنے دیا۔ وہ عمر میں مجھ سے دس سال بڑے تھے لیکن انھوں نے مجھے کبھی اس بات کا بھی احساس نہ ہونے دیا اور خود ان کے چہرے پر کچھ ایسی بری اور ملاحظہ تھی کہ وہ بہت بزرگ لگتے بھی نہ تھے۔

لکھنؤ میں میری اور منظر سلیم کی ملاقاتیں کئی بار ہوئیں۔ پھر وہاں سکو چلے گئے اور میں بھی لکھنؤ سے دلی اور پھر پنڈت منتقل ہو گیا۔ جب میں لکھنؤ واپس آیا تو اس وقت بھی وہ بیرون ملک میں قیام پذیر تھے۔ پھر میں نے لکھنؤ جلد ہی چھوڑ دیا اور کچھ برس بعد اچانک خبر سنی کہ وہ اندھ کو پیارے ہو گئے۔ مجھے بہت رنج ہوا کہ ایک اچھے دوست و انسان سے دنیا خالی ہو گئی۔ صحیح تاریخ یا نہیں لیکن ۱۹۹۱ء میں ان کی آخری بار وطن کو مراجعت کے بعد ایک محفل میں ہم دونوں شریک تھے۔ انھوں نے جو غزل سنائی وہ اپنے انداز بیان کی بنا پر مجھے بالکل تازہ محسوس ہوئی۔ غزل انھوں نے تخت میں پڑھی تھی لیکن بہت اچھی طرح پڑھی تھی۔ ان کے انداز میں ایک اعتماد تھا اور ادائیگی میں صلابت و وقار۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شعر ان کے زمانہ جوانی کے تھے۔

مجھ پہ جو گزری اسے سمجھے گی کیا
میری بستی مجھ کو پہچانے گی کیا
جی رہا ہوں دوسروں کے جسم میں
موت جینے سے مجھے روکے گی کیا
زخم سر ہے آپ اپنی داستاں
پتھروں سے زندگی پوچھے گی کیا

منظر سلیم نے اپنا کوئی مجموعہ نہیں چھپوایا۔ اس لیے ان کا پرانا کلام کیا، نیا کلام بھی نظروں سے اکثر اوجھل رہا۔ کئی سال پہلے جب فروغ اردو کونسل کی طرف سے میں نے ”آزادی کے بعد رد و غزل“ کے عنوان سے ایک انتخاب مرتب کیا تو رسالوں میں ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بعد منظر سلیم کی چند ہی غزلیں مل سکیں جو میں نے انتخاب میں شامل کیں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ دیر سے بھی لیکن منظر سلیم کے اخلاف اس کا مجموعہ مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ اس طرح شاعری کے میدان میں منظر سلیم کو وہ جگہ مل سکے گی جس کے وہ مستحق ہیں۔

جیسا کہ میں نے دہرایا، منظر سلیم ترقی پسند تھے لیکن شاعری میں انھوں نے ترقی پسندوں کا بلند آہنگ اور نعرہ نما لہجہ نہیں اختیار کیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ترقی پسند شاعری میں فرد کا فقدان ہے، وہاں وہی بات چل سکتی ہے جو ”عوام“ کے لیے صادق آئے یا ”عوام“ کے لیے فائدہ مند ہو۔ لیکن منظر سلیم نے شروع سے ہی اپنی شاعری کو فرد یا ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ یہ بات صحیح ہے کہ ان کے یہاں جدید شعر کی طرح ذاتی، لکھنوں اور پیچیدگیوں کا ذکر نہیں لیکن انھوں نے شعر کو اپنے ہی تجربات کا اظہار بنا کر اسے ایک داخلیت اور گہرائی بخش دی۔ ترقی پسند شعرا کی عشقیہ نظمیں بھی بنیاتی رنگ رکھتی ہیں۔ منظر سلیم کی عشقیہ نظمیں نہ تو بنیاتی ہیں اور نہ معشوق سے براہ راست مخاطب ہوتی ہیں۔ ان کی نظم ”شراب خانہ“، جس پر اپریل ۱۹۷۸ء کی تاریخ پڑی ہے، بظاہر تو ایک رسیاتی عشقیہ کیفیت کا اظہار ہے کہ عاشق یا شاعر اپنے غم بھلانے کے لیے شراب پیتا ہے۔ لیکن منظر سلیم کی نظم میں غم کے بھولنے کی کوشش کے بجائے غم کا اظہار کرنے یا اس کی جانچ کرنے کا لہجہ ملتا ہے۔

شراب خانے میں بیٹھا ہوں سوچنے کے لئے
نہ جانے کتنے خیالوں کا راز داں بن کر
نہ جانے کتنے خیالوں سے پوچھتا ہوں میں
یہ درد کیا ہے یوں جس میں جلا ہوں میں
یہ کیا غم ہے جو دل کو جلائے جاتا ہے
کبھی شراب جہنم کبھی دھواں بن کر

یہ بات ظاہر ہے کہ استفسار اور چھٹن بین کی یہ کیفیت دروں بینی کے عام سے ہے۔ منظر سلیم کی پختہ عمر کی نظموں میں بھی اسی طرح کی محرومی اور کبھی کبھی اجنبیت کا اظہار نظر آتا ہے۔ انھوں نے جو نظمیں سوویٹ روس کے اس زمانے میں کہیں جسے گلاسٹونسٹ (Glasnost) کا زمانہ کہا جاتا ہے، ان میں تو ذہنی اور روحانی کشمکش بہت ہی نمایاں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ شاعر کو پابندیوں کے ٹوٹنے کی خوشی تو ہے، لیکن وہ ابھی تک اس مسئلے کو حل نہیں کر پایا ہے کہ سوویٹ

روس کے شہری، اور سوویت نظام کے ماننے والے اب تک جو زندگی جی رہے تھے اس میں جھوٹ کتنا تھا اور خود فریبی کتنی تھی؟ روس میں اظہار کی آزادی کے پہلے کی نظموں میں بھی منظر سیم کے یہاں سرکاری اور غیر سرکاری پروپیگنڈے اور ہر ممکن دسیے سے رائے عامہ کو ہموار کرنے یا خاموش رکھنے کے سیاسی ہتھکنڈے کے خلاف نفرت کا احساس ملتا ہے۔ ان کی نظم ”سیاہ الفاظ کی سیاحتی“ کے یہ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

سیاہ الفاظ کے بھیا تک سیاہ کوندے
 پہنچتے ہیں چھوٹے چھوٹے شہروں میں
 قصبوں قریب میں
 ان کے اندر جو رنگ ملتے ہیں زندگی کے
 انھیں جلاتے ہیں
 چھوڑ جاتے ہیں اپنے پیچھے
 دھوئیں کے ریلے
 دھواں جو ہر شے پہ منڈختار ہوتا ہے
 اپنی کالک

منظر سیم کا وہ کلام جو ”گلاسنوسٹ“ (Glasnost) کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے اس میں جگہ جگہ فریب شکنی کا غم اور اس غم سے زیادہ فریب خوردگی پر غصہ نظر آتا ہے۔ ”وہ سب سے اونچی شجر“ عنوان کی نظم جو سوویت روس میں پریس پر سرکاری پابندیوں کے جزوی خاتمے کے بارے میں ہے، اس کی آخری سطریں یوں ہیں

اور تب آندھیاں
 غیر آباد سب و سعتوں سے
 زیادہ ہی نادم ہوئیں
 اتنے برسوں کی یلغار سے جو گرا
 وہ براہِ اروہ غیر مرنی شجر
 جس کی شاخیں محقق نہیں چست کی طرح
 سارے ماحول پر
 صرف کاغذ کا تھا
 صرف نقشوں کی تھیں پتیاں

اسی طرح، ”یہ کیسا سانحہ گزرا“ عنوان کی نظم میں منظر سیم نے لکھا:

ہوا یہ سانحہ کیسا
 یہ اس مستقبلِ زریں پہ کیا جیتی
 رہ منزل قافلوں کی منظر تھی جو

یہ کیسے سوگ میں ڈوبی
ہمیشہ کو
چمے وہ لوگ ماضی کی طرف کیسے
جسے خود ہی ستایا تھا

ان نظموں میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سوویت روس کی سیاست اور ادب کے ح میوں نے سوویت روس کے سقوط کے بعد جو رویہ اختیار کیا، یہ نظمیں ان سے بالکل خالی ہیں۔ ایک رویہ تو ظ۔ انصاری کا تھا، جنہوں نے کہا کہ سوویت نظام کی خرابیاں اور برائیاں وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ یہ نظام باطل ہے، چنے والا نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ اس باتوں کو سوویت روس کے سقوط سے پہلے بھی کئی لوگوں سے کہہ چکے تھے۔ یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن اس کے لیے ظ۔ انصاری کے، اپنے الفاظ کے علاوہ کوئی شہادت نہیں۔ دوسرا رویہ سردار جعفری وغیرہ کا تھا کہ سوویت روس کے سقوط سے کیونزم کے زوال یا کیونزم کے جھوٹے ہوئے کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں بنتا۔ ثبوت اگر بنتا ہے تو صرف اس بات کا کہ سوویت روس نے سوشلزم کا جو تجربہ کیا تھا وہ ناکام رہا۔ یعنی تجربہ ناکام رہا، نظریہ نہیں۔ یہ رد عمل عمومی طور پر ترم دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں کی فکری بنیادوں میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ یعنی یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ جن نظریات کی بنا پر سوشلزم قائم ہے وہ درست تو ہیں لیکن ضرورت کے اعتبار سے ان میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ اور سوشلزم سے کیونزم تک پہنچنے میں وقفہ لگ سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے مارکسزم (Marxism) کو مشعل راہ بنایا گیا۔ پھر مارکسزم + لیننزم (Marxism-Leninism) کی بات کی گئی۔ اس کے بعد پھر لیننزم + اسٹالنزم (Leninism-Stalinism) کو رہنما قرار دیا گیا۔ اس لن کے آخری زمانے میں چھٹیں میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو پہلے اسے مارکسزم + لیننزم (Marxism-Leninism) سے تعبیر کیا گیا۔ اور پھر اس میں ماؤسی تنگ (Mao Tsi Tung) کے خیالات (Thoughts of Chairman Mao) کا اضافہ کر کے بالآخر ماؤسی تنگ کی تعبیر کیونزم کو ہی صحیح قرار دیا گیا۔

مندرجہ بالا مدارج کو قائم کرنے کا اصول یہی تھا کہ سوشلزم اور پھر کیونزم تک پہنچنے کے لیے کئی صورتیں اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لہذا سردار جعفری وغیرہ کا یہ کہنا پارٹی فلسفے کے بالکل موافق تھا کہ سوویت روس میں ایک تجربہ کیا گیا تھا جو ناکام رہا اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ مارکسزم ہی ناکام ہوگئی۔ یہاں منظر سلیم کے رد عمل پر غور کریں تو وہ زیادہ ایماندارانہ اور سچی ذہنی کشمکش اور رنجیدگی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ سچے شاعروں کی طرح وہ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ نظریہ کیا تھا، اور فلسفہ کیا تھا، اور تجربہ کسے کہتے ہیں؟ ان کی نظموں میں صرف رنجیدگی اور ذہنی الجھن ہے کہ یہ کیا ہو گیا اور ہم اب تک کیسے سمجھے تھے؟

منظر سلیم کو عام طور پر غزل کا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نظم میں تو منظر سلیم بہر حال ایک سادہ، غیر استعاراتی، غیر پیچیدہ اور بڑی حد تک بیانیہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اور گزشتہ پچاس سال کی ادبی تاریخ میں نظم کی بنیادیں م۔ راشد، میراجی، اختران بیان اور مجید امجد جیسے شعرا پر رکھی گئی، جن کا ظہار (خواہ وہ ذاتی ہو خواہ غیر ذاتی) ملا متی، استعاراتی اور بالواسطہ بیان سے عبارت ہے۔ لہذا منظر سلیم کی نظم اپنی ترم ذہنی اور روحانی ایمانداری کے باوجود جدید نظم کی روایت میں نہیں بلکہ ترقی پسند نظم کی روایت میں قائم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف

منظر سلیم کی غزل میں شروع سے ہی وہ درد مندی، استفسار اور دروں بینی ہے جسے ہم جدید غزل کی بنیادی صفت مانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ منظر سلیم نے حلقہٴ ارباب ذوق کے شعرا کا کچھ اثر قبول کیا ہو۔ حلقہٴ ارباب ذوق کے مرتب کیے ہوئے ۹۴۵ء اور ۹۴۸ء کی بہترین شاعری کے مجموعوں میں منظر سلیم کی نظمیں شامل تھیں۔ گلاسٹونٹ اور پھر سقوط سوویٹ روس کے پہلے کی غزلوں میں بھی منظر سلیم کے یہاں فرد کے وجود کا شدید احساس ملتا ہے۔ ردیف ”یارو“ اگر چاہ پرانی لگتی ہے اور اس کا استعمال ترقی پسندوں نے بھی خوب کیا تھا، لیکن مندرجہ ذیل اشعار میں یہ ردیف بھی کچھ نہ کچھ معنی رکھتی ہے۔

ہم پہ بھی جیتی ہے اوروں پہ جو جیتی ہے مگر
ہم جو چپ ہیں تو یہ بھینے کی ادا ہے یارو
پوچھئے کس سے غم دل کا سدا کیا ہے
کون اپنوں میں غم دل سے بچا ہے یارو
اسی طرح، یہ اشعار بھی عشقیہ شعرا نہیں بلکہ ان میں ذاتی اور شخصی ذہنی کیفیت کا رنگ نمایاں ہے
رات کتنی ہے کہیں پیار کے افسانوں سے
رات کو جانے دل زار نے سمجھ کیا ہے
زندگی میں نگہ لطف کا احسا کیوں لیں
آگ کے دریا میں جھکے کا سہارا کیا ہے
پہلے شعر کے سامنے مرزا رفیع واعظ کا یہ شعر رکھتے تو نئے پرانے کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔

بیدار نیم پہ ہجر در مرگ می زند
امیں نیست آں شبے کہ بہ افسانہ بگذرد
مرزا رفیع واعظ نے حیات و موت کی بات کی ہے لیکن صاف کہہ دیا ہے کہ ہجر کی رات کہانیاں سننے سے نہیں
کتنی۔ منظر سلیم نے استفسار کا انداز اختیار کر کے بات کو زیادہ برجستہ کر دیا۔ ہر چند کہ ان کے مصرعے میں ”دل زار“ کا فقرہ
بہت اچھا نہیں ہے لیکن استفسار نے بات بنادی ہے۔ اسی طرح ۱۹۵۵ء کی ایک غزل کے دو شعر دیکھئے۔

جانے کس سوچ میں اداس ہے جی
ذہن پر جانے یار سا کیا ہے
کس تغیر کی آرزو ہے ہمیں
ہر گھڑی انتظار سا کیا ہے
دوسرے شعر کے سامنے مومن کے شعر کو ذہن میں لائیے تو پھر نئے پرانے کا فرق زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔
مومن کہتے ہیں۔

اے حشر جلد کر د و بالا جہان کو
یوں کچھ ہو نہ امید تو ہے انقلاب میں
مومن کے شعر میں شک کے باوجود یقین ہے کہ دنیا درہم برہم ہو جائے گی، اور امید ہے کہ شاید نئی دنیا بنے اور

اس دنیا سے اچھی ہے۔ منظر سلیم کے شعر میں ایک روحانی کرب ہے، ایک بے چینی ہے کہ کچھ ہونا چاہئے، لیکن یہ بھی نہیں معصوم کہ کیا ہونا چاہئے۔ ایک وجودی کرب ہے جو زندگی میں اضطراب برپا کر رہا ہے۔
بعد کی غزلوں میں جہاں شکست خواب اور فریب شگستگی کا غم ہے وہاں اس بنیادی لیے کا بھی احساس ہے کہ چاہے نیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، ضروری نہیں کہ انجام اچھا ہو۔

لہو کی جھیل میں اک جاوداں قصر شجاعت تھا
مگر جب جھیل سوکھی آندھیوں میں اڑ گیا وہ بھی
زندگی پاتی ہے دیکھیں کیا بدل اس خواب کا
وہ جو صدیوں میں کہیں ہوتا ہے پیدا مر گیا
وہ آفتاب جو ڈوبا نہیں تھا برسوں سے
بس ایک شب میں چراغ سحر ہوا اب کے

عرفان صدیقی کی طرح منظر سلیم کے یہاں بھی ذہنی عمر نے عشقیہ شاعری کا نیا جلوہ دکھایا۔ منظر سلیم کی ان غزلوں کے اس سلسلے میں وہ زور اور سرشاری تو نہیں ہے جو عرفان صدیقی کی ”عشق نامہ“ والی غزلوں کو ہمارے زمانے میں غزل کے ممتاز ترین مقام پر قائم کرتی ہے لیکن منظر سلیم کی شخصیت کی دل نوازی اور خلوص انھیں عشق پر ایک معصوم سا ایمان ضرور عطا کر دیتی ہے۔ اور یہ خود اس زمانے میں بڑی چیز ہے۔

اس کرم کا جو صلہ ہے تو یہی ہے کچھ کچھ
ہم ترے نام بھی قریہ جاں نکھتے ہیں
خیال و خواب ہیں سب دین اس کی
اسی سے ذہن کی بستی یہی ہے
ہر کشش لہجے میں ہے چشم و لب و رخسار کی
رنگ بھرتا ہے ترا چہرہ تری آواز میں

اس آخری شعر میں مضمون کی ندرت قابل داد ہے۔ بزرگوں کا قول تھا کہ آنکھ سے پہلے کان عاشق ہوتا ہے۔ یہاں منظر سلیم نے اس عشق کی وجہ بیان کر دی ہے کہ آواز محض آواز نہیں بلکہ معشوق کا سراپا بھی ہے۔ اسی تجربے کو منظر سلیم نے مندرجہ ذیل شعر میں ایک اور جہت دے دی ہے۔

مہر سرائی موجِ نغمہ سنی سکوتِ ذہن میں
گن ترے آواز کے گاتی رہی خوشبو تری
دونوں تمھارے روپ ہیں اس آئینے میں جلوہ گر
دریا دلی چہرے میں ہے نقشہ لبی چہرے میں ہے
نہ جانے کس ہو کیا اس بدن کا
تصور جس کا اتنا جاں نزا ہے

لکھا ہے اس کے چہرے پر یہ گیا جو
 مثال خواب فردا جاں فزا ہے
 نہیں آتی جو بات اس کے لبوں پر
 وہی سب سے زیادہ جاں فزا ہے
 ذہن و دل سے پوچھنے کو حال کرب تشنگی
 مہرباں آنکھوں نے بھیجی سورج صہبا دور سے

ان اشعار میں جوش تشنگی ہے اور حسن کا جوا حساس ہے وہ فیض کی یاد دلاتا ہے۔ فارسیت کا ہلکا سا گلابی رنگ ان اشعار کو معاصر شاعری میں امتیاز بخشتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے منظر سلیم کی غزل ایک ایسے متکلم کو ہمارے سامنے راتی ہے جو پر خلوص ہے اور ایک حد تک سادہ مزج بھی۔ وہ دنیا اور اپناے دنیا سے کچھ بہت زیادہ توقع نہیں رکھتا لیکن وہ ان سے جھگڑتا بھی نہیں۔ ان غزلوں میں ایک میانہ رو سا انسان نظر آتا ہے جسے حس کی دولت سے وافر سرمایہ مل رہا ہے مگر وہ اپنے محسوسات کو غیر ضروری طور پر زور دے کر نہیں پیش کرتا بلکہ یوں بیان کرتا ہے گویا وہ ہم آپ جیسا ہی ایک شخص ہو۔ اپنائیت کا یہ احساس میرا خیال ہے کہ منظر سلیم کی غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ منظر سلیم کا یہ مجموعہ معاصر شاعری کے گلشن میں تازہ اور خوشنما پھول قرار دیا جائے گا۔

۲ جولائی ۲۰۱۰ء

☆...☆...☆

محسن زیدی کی غزل

محسن الرحمن فاروقی

ہم معصروں میں محسن زیدی سب سے زیادہ کم آ میز و تقریباً اتنے ہی کم گو بھی تھے۔ کم گوئی سے زیادہ کم آ میزی نے انھیں اپنے زمانے کے ادبی منظر نامے پر اتنا نمایاں نہ ہونے دینے دیا جتنا اس کا حق تھا۔ کوئی پچاس برس کی مشق سخن، اور صرف چار مجموعے، اور وہ بھی بہت ضخیم نہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کہنے، اور شائع کرنے میں کس قدر کنجوس تھے۔ ان کا پانچواں اور آخری مجموعہ ”جوش نوکِ قلم“ اور بھی مختصر ہے اور اسے بیگم محسن زیدی نے ان کے انتقال کے دو سال بعد شائع کیا۔

پچاس ساٹھ برس پہلے کا وہ زمانہ آج کا نہ تھا جب خراب کہنے والوں کی بھرمار ہے اور ان کے مداحوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ اچھا کہنے والے اس وقت لوگوں کی نظر میں بآسانی آ جاتے تھے۔ محسن زیدی کی طرح بانی اور زریب غوری بھی محفل بازی کے شائق نہ تھے لیکن انھیں بخوبی پچی نا اور کثرت سے پڑھا گیا۔ کچھ یہی حال محسن زیدی کا بھی تھا، سوا اس کے کہ وہ بہت کم کہے کے باعث رسالوں میں مسلسل نظر نہ آتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کو ابھی دس ہی برس گزرے ہیں لیکن آج کا ادبی معشرہ غفلت کی کمزوری کے لیے مشہور زمانہ ہو گیا ہے۔ لہذا ان دنوں محسن زیدی کا ذکر بہت کم ہو گیا تھا۔

یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے اور یقین ہے کہ تمام سلیم الطبع قارئین کے لیے بھی مژدہ سرت ہو گا کہ محسن زیدی کا کلیات شائع ہو رہا ہے۔ اس طرح ان کا تمام کلام نہ صرف محفوظ رہے گا بلکہ اس پر مجموعی طور پر قارئین کی نگاہ بھی پڑے گی اور اس طرح ان کے صحیح مرتبے کا حساس سب لوگوں کو ہو سکے گا۔

آج کل ہر غزل گو کے بارے میں یہ بات بے تکلف کہہ دی جاتی ہے کہ اس کے یہاں کلاسیکی ور جہدِ رنگوں کا احتراز نظر آتا ہے۔ یہ فقرہ بے معنی ہے اور ہماری شاعری کے مزاج سے بے خبری کا غرر بھی ہے۔ کیا شاعری کے رنگ ہمارے عام لال، نیلے، پیسے، رنگوں کی طرح ہوتے ہیں جن کے احتراز سے نئے رنگ پیدا ہو جاتے ہیں؟ محسن زیدی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مجھے کوئی استقامت نہیں ملا لیکن میں نے متعدد کلاسیکی شعرا کا پورا مطالعہ کیا اور ان کے کلام سے استفادہ بھی کیا۔ سوا کیا گیا کہ کیا آپ نے ان سے اثر قبول نہیں کیا؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، میں نے اثر قبول کیا۔ انفاظ کے دروبست میں اور کلاسیکی شاعری کے رچے ہوئے انداز اور طرزِ بیان میں میں نے کلاسیکی شعرا کو اپنا مخزن قرار دیا۔

محسن زیدی نے جن کلاسیکی شعرا کا مطالعہ کیا ان میں ایک طرف تو ناسخ ہیں اور دوسری طرف میر درد۔ بقا ہر یہ بات کچھ بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص میر درد اور ناسخ دونوں سے اثر قبول کرے۔ عام طور پر ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ ناسخ شاعر تو نہیں تھے ہاں لفظوں کے طوطا مینا اڑانا جانتے تھے۔ درد کے بارے میں ہم یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ تصوف میں ڈوبے ہوئے نازک اند نیا قسم کے انسان تھے، ناسخ سے بالکل مختلف۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے اوپر اثر انداز ہونے والوں میں درد اور ناسخ کا ذکر کر کے محسن زیدی نے اپنی سیم الصبھی اور شعر شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ ناسخ کے یہاں چاہے وہ کیفیت نہ جو مثلاً ہم ناصرا کلمی کے یہاں دیکھتے ہیں، لیکن ناسخ کو مربوط شعر کہنے اور بات میں بات پیدا کرنے اور زبان میں شستگی

اور روزمرہ کی صفائی کا خیال رکھنے میں جو درک تھا وہ آج ہم سب کے لیے نمونہ بن سکتا ہے۔ ناسخ اور آتش اگر بات کو بہت دھوم دھام سے کہتے ہیں تو درد بہت تمکین اور بہت حزم سے اپنی بات کہتے ہیں۔ مہناخان کے یہاں اتنا ہی ہے جتنا استعارہ اجازت دے۔ ان کی غزل عموماً پانچ سات شعر کی ہوتی ہے۔ درد کے یہاں ایک خود کلامی کی کیفیت ہے اور ان کا کلام پڑھتے ہوئے ہم خود کو خوش نصیب تصور کرتے ہیں کہ درد نے ہمیں اپنی خود کلامی میں شریک کیا، خود درد پریشانی ہوئے سامع کی حیثیت سے ہی سہی۔

محسن زیدی کے یہاں بھی کلاسیکی حزم و ضبط اور قرینہ و تمکین نظر آتے ہیں۔ ان کی کم گوئی کا وصف اس بات میں جھلکتا ہے کہ ان کی غزل بھی عموماً پانچ سات شعر کی ہوتی ہے۔ اور درد کی طرح ان کے یہاں بھی مستفسرانہ خود کلامی کا انداز نمایاں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ درد کے یہاں استفسار کے علاوہ اور بھی طرز ہیں، ان کا شعری تجربہ کم گوئی کے باوجود بہت وسیع ہے۔ محسن زیدی کی درون بینی اور روبرو دنیا اور دنیا و لوں کے قوس و قزح کو سوالیہ نگاہ سے دیکھنے کی جبلت ان کے شعر کو متانت اور دروندگی عطا کرتی ہے۔

میرے دامن کو بھگوتا کون ہے
میں نہیں روتا تو روتا کون ہے
راتے سے کون چن لیتا ہے پھول
راہ میں کانتوں کو پوتا کون ہے
رات بھر ہوتے ہیں اب تو رت جلے
شیر میں راتوں کو سوتا کون ہے

کون اس شہر میں احوال مرا چانتا ہے
مجھ پہ جو بیت رہی ہے وہ خدا جانتا ہے
آگیا کون سا یہ موڑ سفر میں کہ جسے
کوئی دہزن نہ کوئی راہنما جانتا ہے

یہ کیا کہ میں جو کہوں اس کی ہی زباں سے کہوں
مری زباں سے وہ کچھ بھی بیاں نہ ہونے دے

پتہ نہیں کہ بلندی اسے ملی کہ نہیں
نظر تو آیا تھا وہ میڑھیوں پہ چڑھتے ہوئے
یہ کس طرح کا ہے آسیب شہر پر طاری
یہ کیسے سایے ہیں گھٹتے ہوئے نہ بڑھتے ہوئے

مب کو جب شہر میں دعویٰ تھا خدا ہونے کا
سخت مشکل تھا کس کس کو خدا ماننا میں

یہ اشعار محسن زیدی کے آخری مجموعے ”جہش نوکِ قلم“ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور یہ ان تمام باتوں کا ثبوت ہیں جو میں نے اوپر ان کی غزل گوئی کے بارے میں کہی ہیں۔ بیشک محسن زیدی کو مضمون کی تلاش میں دور دور تک بھٹکتا چھٹا نہیں لگتا۔ بیشک وہ اپنے زمانے کے بارے میں اور اپنے بارے میں وہی باتیں کہتے ہیں جو ان کے احساس کی سطح پر نمایاں ہیں۔ لیکن یہی وجہ ہے کہ ان کے شعرا اپنی جدت سے زیادہ اپنی صدق دلی اور متین احساس تہائی کے باعث متاثر کرتے ہیں اور یاد رہ جانے کی صفت بھی رکھتے ہیں۔

محسن زیدی کی دوسری صفت جو انھیں معاصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ زندگی اور دنیا کی رائیگاں جانے کا احساس ہے۔ اس احساس رائیگانی میں خود ترحمی یا شکوے کا انداز نہیں ہے بلکہ ایک کائناتی حقیقت کا اظہار ہے کہ زندگی جیسی بھی ہو بالآخر بے مصرف ہی ثابت ہوتی ہے۔ یہ تجربہ ہمارے یہاں سبک ہندی کے شعرا میں بیش از بیش ملتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہندوستانی مزاج کا خاصہ ہے کیونکہ ایرانی فارسی گو یوں کے یہاں یہ مضمون نہیں ملتا۔ محسن زیدی کے ایک دو شعر دیکھیے۔

تہ جم چکی تھی گمرد زمانہ کی اس قدر
روشن پھر آئینہ نہ کسی آب سے ہوا

یہاں نظیری کا شعر بے اختیار یاد آتا ہے۔

جو ہر بینش من در تہ رنگار بہمانہ
آنکہ آئینہ من ساخت نہ پرداخت ورنہ

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نظیری کا شعر ہر طرح پختہ اور مکمل ہے اور محسن زیدی کا شعر اس کے سامنے کم روشن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ہمارے کسی شاعر کا شعر نظیری کی یاد دلائے۔ غالب نے ایک بار تفتہ کو لکھا تھا کہ تمھارا فلاں مصرع شوکت بخاری کی یاد دلاتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے۔ غالب کے اس بیان کی نزاکت اور گہرائی میری سمجھ میں اس وقت نہ آئی تھی لیکن اب میں شاید اس بات کو کچھ سمجھ گیا ہوں کہ شاعری کا ماخذ شاعری ہی ہے۔ اب بات دیکھنے کی بھی رہ جاتی ہے کہ کس شاعر کا ماخذ کون سی شاعری ہے؟

بیسویں صدی کے اوائل کی درس گاہوں میں ہم لوگوں نے جو سبق سیکھا تھا وہ یہ تھا کہ شاعر وہی اچھا ہے جو اپنا رنگ اختیار کرے۔ یہ اصول شاعر کو پرانی شاعری سے دور لے جانا چاہتا تھا۔ اس وقت کے تنقیدی نظریات کا زور شاعری کی تخلیقی ان پر تھا۔ اس وقت یہ بھی خیال تھا کہ پرانی شاعری میں اب کچھ رکھا نہیں ہے کہ جس کی تقلید کی جائے۔

یہ خیالات بظاہر حالی سے مستفاد معلوم ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن یہاں حالی کے علاوہ کچھ اور تصورات بھی کارفرما ہیں۔ حالی کا زور اس بات پر تھا کہ شعر کو خلاق کا ”نائب مناب“ سمجھا جائے اور شاعری وہی اچھی ہے جو معاشرے کی اصلاح میں سرگرم ہو۔ تخلیقی امیج پر زور دینے والے اپنا رشتہ حالی سے نہیں، بلکہ اپنے خیال میں کلاسیکی روایت سے جوڑتے تھے۔ اس کی سب سے اچھی مثال حسرت موہانی ہیں۔ ان کا سروکار شعر کے ”اخلاقی“ پہلو سے نہیں، بلکہ اس کے ”شعرانہ“ پہلو سے تھا۔ حالی کے خیالات کم و بیش سب کے سب بخیر خود مغرب سے مستعار تھے۔ لیکن

حسرت موہانی بھی درحقیقت مغربی خیالات کے پروردہ تھے، کیونکہ انھوں اس بات پر رو دیا کہ شاعر کو دوسروں کا دیوہ گز نہ ہونا چاہئے، بلکہ سب سے ”اپنی بات“ کہنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ بات اگر ”اپنی“ ہوگی تو اس پر دوسروں کا اثر نہ ہوگا، تقلید تو دور کی بات ہے۔ یہ تصور ہماری شعری روایت کے منافی نہیں، تو اس سے کچھ بہت زیادہ علاقہ بھی نہیں رکھتا۔

میر خسرو نے اپنے معرکہ آرا ”دیباچہ غرۃ الکمل“ میں لکھا ہے کہ میں استاد نہیں ہوں۔ استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے رنگ کا موجد ہوتا ہے۔ باقی ترم شعرا اپنی حیثیت اور توفیق کی حد تک گزشتہ گان کے مرہون منت رہتے ہیں۔ خود اپنے بارے میں انھوں نے کہا کہ میں فداں فداں کا تیغ ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کوئی ضروری نہیں کہ غزل اور قصیدہ میں ایک ہی شعر کا تیغ کیا جائے۔ خسرو نے ازراہ انکسار خود کو استاد نہیں کہا، لیکن وہ بھی اپنے رنگ کے موجد ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بات، کہ میں تقلید کرتا ہوں (مثلاً مثنوی میں نظامی کا مقصد ہوں) ان کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوئی۔ مثلاً وحید مرزا نے لکھا کہ خسرو نے اپنے ”خمسہ“ میں نظامی کی نقل کی ہے اور حق یہ ہے کہ وہ جگہ جگہ ان سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ مگر نقل پھر بھی نقل ہی ہے، اصل کی برتری نہیں کر سکتی۔ انھوں نے یہ خیال نہ کیا کہ جو نقل، اصل سے بڑھ جائے، وہ ”اصل“ کے درجے سے بند ہو جاتی ہے اور اپنا وجود آپ قائم کرتی ہے۔

لیکن یہ صحیح ہے کہ ہم لوگ بد توں تک اس نکتے سے بے خبر، یا بیزار رہے کہ شاعری تو شاعری ہی سے بنتی ہے۔ اسی لیے ہم سب ”اپنی بات“ کہنے کی کوشش میں رہے، حالانکہ بات تو سب کی ایک ہی ہوتی ہے، مذاق و مزاج ہر شخص کا دوسروں سے تھوڑا بہت لگ ہوتا ہے۔ بقول سید محمد خان رند۔

مذاق سب کا جدا ہے سخن تو ایک ہے رند

وہی سمجھتے ہیں جن کو شعور ہوتا ہے

میں نے بات شروع کی تھی نظیری کے شعر سے درمختص زیدی کے اس قول سے، کہ انھوں نے ناسخ اور میر درد کو پڑھا اور ”اسفاظ کا درد بست“ اور ”کلاسیکی رچاؤ“ پرانے لوگوں سے حاصل کیا۔ لیکن دیکھئے میں کہاں کہاں کی باتیں لے آیا۔ خیر، امید ہے کہ میری بات کی معنویت آپ پر مخفی نہ ہوگی۔ مثلاً محسن زیدی کا یہ شعر سنئے۔

اک بار مجھ سے مل کے نہ وہ پھر کبھی مل

دو چار دن کا ساتھ بھی تقدیر میں نہ تھا

اب یہاں غالب کا شعر نہ یاد آئے تو محسن زیدی پر ظلم ہوگا، کیونکہ اس کی خوبصورتی ہی اس بات میں ہے کہ غالب کی بلندی پر پہنچ کر یہ شعر کہا گیا۔

یار در عہد شہباز بہار آمد و رفت

ہم چو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت

لوگ بار بار انفرادیت کی بات کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ”نیا“ اور ”اچھا“ ہم معنی نہیں ہیں۔ اور ”منفرد“ اور ”اچھا“ بھی ہم معنی نہیں۔ ”اچھا“ اور ”عظیم“ بھی ہم معنی نہیں۔ مجھ جیسے بوٹ پہلے ”چھا“ تلاش کرتے ہیں، پھر ”منفرد“ ڈھونڈتے ہیں۔ ذرا محسن زیدی کا یہ شعر سنئے۔

کسی کا ڈوب جانا اس کنارے

کسی کا منتظر اس پار ہونا

تو کیا اس شعر کی قوت اس بات میں نہیں کہ اس کی بنیاد سینکڑوں برس کی بھولی بسری کہانیوں پر استوار ہے؟ ایک بات اور کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کسی شعر، یا کسی بھی فن پارے کو کسی ایک صورت حال، یا کسی ایک سانچے یا کسی ایک واقعے کی حد میں قید کر دینا فن پارے کے ساتھ بے انصافی ہے۔ برتولت بریخت (Bertolt Brecht) کا ڈراما Mother Courage جنگ کے خلاف ہے، لیکن کسی ایک جنگ، یا کسی ایک معرکے کے خلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے ہم میں سے ہر ایک پڑھنے یا دیکھنے والا اس ڈرامے سے، اپنی اپنی معنویت نکالتا ہے اور ڈرامے میں معنی پھر بھی باقی رہتے ہیں۔ اسی بات کو امام عبدالقادر جیلانی نے یوں کہا تھا کہ بہت سے استاد رے ایسے ہوتے ہیں جن کے معنی کی تہہ نہیں ہوتی۔ وہ سدا سوت کنویں کی طرح ہیں، کہ پانی نکالتے جاؤ لیکن ختم نہ ہوگا۔ اسی اصول کا اطلاق ہم شیپسپیئر کے ڈراموں اور برتولت بریخت کے ڈرامے اور غالب اور میر کے شعرا اور میر انیس کے مرثیوں پر کرتے ہیں۔ میر انیس کا مرثیہ صرف کر بلا کے بارے میں نہیں۔ واقعہ کر بلا ن کے مرثیے کے لیے میدان کا کام کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں مسلسل ان لوگوں کے خلاف رہا ہوں جو کسی کے شعر کو کسی ایک سانچے یا واقعے (خواہ وہ واقعہ کر بلا جیسے مہتمم بالشان واقعہ کیوں نہ ہو) پر مبنی بناتے ہیں۔ اچھے شعر میں معنی کی کثرت ہوتی ہے، آپ کو حق ہے کہ اس میں سے اپنی پسند کے معنی نکالیں۔ لیکن آپ کو یہ حق نہیں کہ شعر کو انھیں معنی تک محدود کر دیں۔ میر کہتے ہیں۔

وا اس سے سر حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے

ہم خلق بریدہ سے ہی تقریر کریں گے

وہ شخص نا انصاف ہوگا جسے اس شعر کو پڑھ کر امام حسین کی تقریر نہ یاد آئے جو آپ کے سر مبارک نے یزید کے دربار میں ارشاد فرمائی تھی۔ لیکن وہ شخص بھی نا انصاف ہے جو کہے کہ یہ شعر اس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن اب نظری ہی کو پھر سنئے۔

بریدہ بجائے پر د بالش سر و منتظر

مرغے کہ بلند از سر این شاخ نوا کرد

اس شعر میں تمام جایروں، تمام ظالم حاکموں، آراء کی تقریر پر قدغن لگانے والے ہر نظام کی حکومت کی طرف اشارہ ہے اور امام حسین کے ایسے دور کی قربانی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ اس پس منظر میں محسن زیدی کے چند شعر دیکھئے۔

آئے ہیں سنانے کے لیے ہم یہ کہانی

جو تیرے فدائی تھے ہوئے تجھ پہ فدا سن

کیا زور ہے، کیا اعتماد اور کیا درویشانہ طنز ہے، سبحان اللہ۔ لیکن اب غالب بھی یاد آئیں تو خوب ہوگا۔

حق کہ حق است سمیع است فدائی بشنو

بشنو مگر تو خداوند جہانی بشنو

سوے خود خوان و مخلوق گدہ خالص جادہ

انچہ دانی بشمار انچہ نہ دانی بشنو

شاعری یوں ہی ہوتی رہتی ہے۔ محسن زیدی۔

قافلہ ایک اسیروں کا تھا پیچھے پیچھے
 آگے آگے تھا کوئی نیرے پہ سر راستے بھر
 وہ جو منزل کے دکھاتا رہا ہر گام پہ خواب
 ساتھ تھا ایسا ہی ہر شعبہ گھر راستے بھر
 ردیف کی خوبصورتی قابل داد ہے اور ”راستے“ کی کثیر المعنویت دونوں شعروں میں الگ الگ نوعیت کی

ہے۔

بزرگوں نے بہت پہلے کہا تھا۔
 نام نیک رفتگاں ضائع مکن
 تا کہ باشد نام فیکت یادگار
 مجھے بڑی خوش ہے کہ محسن زیدی نے اپنے باپ کے نام نیک کو اور ان کی بیگم نے اپنے شوہر کی یاد کو قائم رکھنے
 کے لیے ان کا کلیات شائع کرنے کی نیت باندھی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔

☆ ☆ ☆

فریبِ نظر۔۔۔ ایک نظر انداز شدہ کتاب

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

ادب کی دنیا بادی النظر میں کھلی ڈھلی نظر آتی ہے جیسے ہر ہر مصنف اور ہر ہر تحریر تصویر کی، نند صاف صاف نظر آ رہی ہوتا ہم یہ بھی محسوس ہوتا ہے گویا اس کے جسد میں پراسراریت سرایت کر گئی ہو اور جس طرح نسوں اپنے مقدر کے جال میں پھنس نظر آتا ہے اسی طرح آجہ کتہیں اور کچھ مصنفین دونوں ناقابل بیان وجوہ کی بنا پر منظر سے جھٹل رہے ہیں اور تحقیقی اور تنقیدی تحریروں میں عام طور پر ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔

گزشتہ دنوں خیال آیا کہ ہمارے انگریزی ادب کے استاد کے باضابطہ مضامین کی کتاب ”فریبِ نظر“ (۱۹۶۳ء) میں یعنی اکیاون سال قبل منظر عام پر آئی تھی اور آٹھویں دہائی کے دوران سے پڑھا تھا اور جب ڈاکٹر احسن فاروقی سے بحیثیت شاگرد قربت ہوئی تو ان سے گفتگو کے دوران اس کتاب کے مضامین زیر بحث رہے جن کے عنوانات یہ تھے تنقید۔ علم و فن۔ تخلیقی تنقید۔ کلاسیکی اور روایتی تنقید۔ نقاد کا منصب۔ ارسطو کی یوٹیک۔ کولریج کی بائیوگرافی۔ تنقید کے باب میں۔ افسانے کے باب میں۔ فکر و فسانہ، افسانہ اور افسانہ نگاری، مغرب کے بہترین افسانے، مزاح کے باب میں مزاح نگاری، غالب کا مزاح، ڈپٹی نذیر احمد کا مزاح، پطرس کا مزاح، آخری باب میں احسن فاروقی نے ادب اور ادبی مسائل کے دہل میں سٹر اور سٹر نگاری ادب اور دین شیطان اور علامتوں کا روال۔

اس کتاب میں فریبِ نظر کے عنوان سے کوئی مضمون شامل نہیں ہے جیسا کہ مصنف کسی ایک مضمون کو کتاب کا عنوان دے دیتا ہے ابتہ ڈاکٹر صاحب نے اس عنوان کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ وہ اپنے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں کہ ”رہی یہ بات کہ میں نے اس مجموعے کا نام ”فریبِ نظر“ کیوں رکھا ہے تو اس کا جواب سوائے اس کے اور کا ہو سکتا ہے کہ جب تنقید بذاتِ خود فریبِ نظر ہے تو ایک تنقیدی مجموعے کو فریبِ نظر کہنے میں کیا مضائقہ ہے۔“ (ملاحظہ ہو دیباچہ فریبِ نظر، ڈاکٹر احسن فاروقی، مکتبہ اسلوب، کراچی صفحہ ۵)

واضح رہے کہ مکتبہ اسلوب ممتاز محقق و شاعر مشفق خواجہ مرحوم کا پیشنگ ادارہ تھا جو ان کی رحلت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وہ اسی کے تحت ”تحقیقی ادب“ بھی شائع کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر احسن فاروقی سے ”ادبی تخلیق اور ناول“ کا مسودہ لے کر شائع کیا تھا جس میں خاص طور پر فکشن سے متعلق کئی مضامین تھے جن کی فی زمانہ بڑی اہمیت ہے۔ یہ ان کی اردو ناول کی تنقیدی تاریخ (۱۹۸۶ء) کے ساتھ رکھ کر پڑھی جائے تب زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

زیر بحث کتاب نہ معلوم کیوں لوگوں کے حافضے میں نہیں رہی۔ کتب خانوں میں یہ یقیناً موجود ہوگی اگر نہیں تو تعجب ہوگا۔ بہر صورت میں اس اہم کتاب پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں چوں کہ آج کل پی ایچ ڈی کرنے کی ہوابندی ہوئی ہے اس لیے یہ کتاب تحقیق سے متعلق اسکالرز کے لیے افادیت سے بھرپور ہوگی۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے تنقید کو فریبِ نظر سے تعبیر کیا ہے یعنی ایک قسم کے Illusion سے مگر کیوں اور کیسے؟ کیا وہ محسوس کرتے تھے کہ حقیقت ایک فریب ہے مختلف ناقدین یا نقاد ایک ہی تحریر کو مختلف نقطہ نظر کے تحت دیکھتے اور

دکھتے ہیں بس یہی فریب کا پھر ہے۔ تحریر مرعبد میں نئے رنگ بدلتی ہے۔ وقت Time معاشرت، سیاست، تہذیب و ثقافت، اخلاقیات، سماجی رویے پر اثر انداز ہو کر ایک نئے منظر نامے کو تخلیق کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے یوں تنقید کا فریب ان گنت تحریروں اور کتابوں کو وجود میں لاتا ہے۔ نظر کا فریب از بس ضروری ہے ورنہ ادب جمود کا شکار ہو جائے اور تنقید ناقابل مطالعہ بن جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس جملے سے ایک بڑی حقیقت کا اظہار کر دیا ہے جس پر مختلف زاویوں سے مزید روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ خود ان کے متذکرہ مضامین فریب نظر ہی کے مظہر ہیں۔

تنقید علم و فن کے ذیل میں وہ کہتے ہیں تنقید ہمیشہ علم کے تابع رہی اور اسے علمی زبان میں ادا کیا جاتا ہے۔ ارسطو کا فلسفہ منطقی تھا اور ٹریجڈی کامیڈی اور دیگر اصناف مروجہ کی ہیئت کے حوالے سے نتائج نکالے جاتے تھے۔ خاص طور پر نظریہ ڈراموں کے حوالے سے اصول و ضوابط بن گئے۔ انگلینڈ میں ڈرائیڈن Dryden نے سترہویں صدی کے وسط میں اپنی تنقیدی منطق سے ان کو وسعت دی مگر شیکسپیر اور میں جانسن ان کا اتباع کرتے رہے۔

انیسویں صدی میں جون اسٹوارٹ مل نے جدید سائنسی منطق کی بنیاد رکھی، بعد الطبیعیات بھی سائنس بنی اور کہا گیا کہ مصنف کو جانچنے کے لیے اس کی شخصیت کی تفصیل ضروری ہے۔ فرانسیسی نقاد سانت بیواں کا اہم ٹھہرا۔ بات آگے بڑھی تو کہا گیا کہ ”ہر مصنف اپنی قوم، اپنے طبقے اور اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس طرح تنقید سوشل سائنس کا ایک شعبہ ہوگی۔“ (مدحظہ ہوشی ۱۲)

بیسویں صدی میں نہایت وسیع علم نفسیات تنقید کی بنیاد بنا۔ روبرٹسن Robertson نے اس فکر کو آگے بڑھایا۔ آئی اے رچرڈز نے تنقید کو قدروں اور ابلاغ کے ستونوں پر اٹھانا چاہا اور کہا کہ شاعری قاری کے ذہن تک پہنچے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے ادب اور سائنس کے بعد کو توڑا۔ اشتراکی تنقید ادبی کارناموں کو سماجی حالات کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔ لینن Lenin نے بقول ڈاکٹر احسن فاروقی ٹاسٹائی پر مضمون لکھا مگر بتایا کہ ٹاسٹائی عوام کے انقلاب کو نہ سمجھ سکا۔ درحقیقت ٹاسٹائی میں مذہب کی روح زندہ تھی۔ وہ اقتدار کا پرستار تھا۔ ادب ایک وجدانی چیز مانی جاتی ہے۔ اس لیے تنقید کو بھی وجدانی تصور کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب رائے دیتے ہیں کہ نقاد کی انفرادی نگاہ ہونا چاہیے۔ ان کے بقول کولرج کی بائیوگرافی نے سخن کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس نعرے پر یقین نہیں رکھتے کہ ادب زوال پذیر ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اس عام سے اسی وقت نکل سکتے ہیں جب کہ ہر فن کار اپنے فن پر تنقید کرے یہی تنقید لکھے۔

اس کے بعد وہ تخلیقی تنقید کے محسن اور ضروریات کی جانب آتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی تنقید اس طرح وجود میں آتی ہے جب جذبہ کی ایسی دانگی ہو کہ ایک یا عالم وجود میں آجائے اور نئے اصول بھی مرتب ہو جائیں۔ انہوں نے حالی کے غائب کے بارے میں ”حیوان ظریف“ کے تصور کی تعریف کی ہے کہ یہ فقرہ ہمیں غائب کے قریب لے جاتا ہے۔ وہ وہی علم کو تخلیقی تنقید کی بنیاد قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نقاد وہی ہے جو کوئی تخلیقی کارنامہ بھی پیش کر چکا ہو۔ ہنڈیا بنانے والے کسی ہنڈیا کی خوبی اور خرابی سے واقف ہو سکتا ہے۔ (مدحظہ ہوش ۳۱)

کل سیکلی اور رومانی تنقید کے بارے میں وہ کہتے ہیں دل الذکر پابندی کا نام ہے اور رومانی تنقید آزادی پر مبنی ہے۔ انسان کچھ نہ کچھ چیزوں یا اصولوں کا پابند ہونا چاہتا ہے اور ساتھ ہی آزادی بھی چاہتا ہے ارسطو نے بوہیتا Poetics میں جو اصول دیئے وہ کافی عرصے تک چلتے رہے مگر رومانی نقاد کچھ پریشان ہوا مطلب یہ ہے کہ وہ قدما کو پڑھ کر اپنے بھی اصول بنائے تاکہ ادب کی روح سے ہمکنار ہونے کا مذاق پیدا ہو سکے۔ اور تنقید ایک صاحب ذوق شخص کا

اہامی کار کے درمیان نئی راہ نکالی جائے۔ اس کی یہ کوشش ریگاں نہیں مٹی اس لیے کہ ٹی ایس ایلیٹ T S. Eliot جیسے عظیم تخلیقی نقاد نے یہ کام کر دکھایا اس نے جو کچھ لکھا اس سے آج تک مفر ممکن نہیں ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر احسن فاروقی نقاد کی طرف آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر آج بھی ادبی رسائل میں مضامین نظر آتے ہیں۔ یہ گویا گرما گرم اور جاریہ اہمیت کا موضوع ہے اس لیے کہ اگر نقاد اپنے منصب کا احساس نہ کرتے ہوئے تعصبات کا شکار ہو جائے، معاندانہ آراء کا اظہار کریں اور سطحی تحریر اور اس کے مصنف کی شان میں عظمت کے قصیدے گائے تو یہ موضوع زیر بحث آثار ہے گا۔ آج کل بلاشبہ ایسا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اس موقف پر ہمیشہ اٹل رہے ہیں کہ اگر نقاد نے کوئی تخلیق نہ کی ہو تو وہ اس کو تنقید نہیں پڑھتے۔ وہ غالب، انیس، حالی اور اقبال کو نقاد سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خود ارسطو نے ایک ہزار مصرعوں کی ایک نظم کہی تھی جو اب نہیں ملتی۔ وہ میتھو آرسٹو کی منصب کے حوالے سے اس بات کو حمایت کرتے ہیں کہ وہ تنقید میں اصول و ضوابط بھی تشکیل دے تاکہ ان کی بنیاد یا ان کے نظریات کی بنیاد پر تجزیوں کا جائزہ لیا جاسکے۔ وہ یہ سلسلہ چلتا رہنا چاہیے یعنی اصول ضابطے بھی وجود میں آتے رہیں۔ مضمون کا نچوڑ یہ ہے کہ نہ کسی کو خواہ مخواہ اونچائی پر اچھا جائے اور نہ کنویں کی تہ میں پہنچایا جائے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ بتایا اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

”ارسطو کی بوطیقہ“ نامی مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ علم وفن اور تنقید نگاری کا موجد ارسطو ہے۔ تنقید کے سلسلے میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے جو کسی طرح بھی کم نہیں ہو پاتی یعنی اس کے دیئے ہوئے اصولوں یا نظریات میں تبدیلی یا گریز پائی کے باوجود نظر اس کے یہاں جا کر ٹھہرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے استاد پروفیسر سینٹس بری Saintsbury کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس سے اقتباس بھی کریں اور اختلاف بھی یعنی دونوں رویے ضروری ہیں۔ ارسطو افلاطون کی اکادمی میں بیس برس رہا۔ وہ سکندر اعظم کا استاد بھی تھا وہ سکندر اعظم کو ادب اور فلسفہ پڑھاتا رہا۔ وہ اپنی ذہانت اور ریاضت کی بنا پر تمام ہی علوم کا منبع و مخرج بنا بلکہ وہ علوم تا بحر بے کراں تھا جس نے شاعری بھی مگر اس کی اہمیت تنقید کی اصولوں کی بنا پر قائم ہوئی۔ اس نے بوطیقہ Poetics میں تمام فنون کو زندگی کی نقل قرار دیا۔ اس نے ٹریجڈی میں پلٹ اور کرد پر بحث کی۔ یہ آج تک چلی آ رہی ہیں اور متضاد آراء کا سلسلہ تھمنے میں نہیں آتا۔ وہ خراب آدمی کا خراب خاتمہ پسند نہیں کرتا کیوں کہ اس سے اخلاقی اثر ختم ہو جائے گا البتہ وہ محراب آدمی کے خراب انجام کا قائل ہے۔ فنون کو زندگی کی نقل Nemesis قرار دینے کے بعد وہ کہتا ہے کہ زندگی کی نقل واقعی طور پر کی جائے اور جذبات کو عقل کے تابع رکھا جائے۔

روحانی شاعر۔ اس باب کا خاتمہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے کولرج کی بائیوگرافی لکھ کر یہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ بتایا ہے کہ ارسطو کی بوطیقہ کے بعد دوسری تنقیدی تصنیف بائیوگرافی ہے۔ اتفاق سے بقول ڈاکٹر صاحب وہ کوئی بھی مکمل تصنیف نہیں چھوڑ کر گیا کہ لابیالی سا شخص تھا مگر اس کی اہمیت ہے اور بقول آرتھر سمنس Simmons یہ سب سے زیادہ پریشان کن کتاب بھی ہے۔ اس نے دوسرے اہم روحانی شاعر ویمرڈز زوریک کو ۱۸۱۵ء میں لکھا تھا کہ وہ اپنی نظمیوں پر تنقید لکھ رہا ہے۔ یہ ۱۸۱۷ء میں دنیا کے سامنے آگئی جس میں اس کی اپنی نظموں کے بعد وہ یہ جدید فلسفے اور نفسیات پر بھی تنقید ہوگی۔ اس کے چودھویں سے لے کر بیسویں ابواب زیادہ اہم ہیں جس میں جدید شاعری پر وقیع گفتگو کی گئی ہے۔ وہ نظم کو انشا پردازی کی ایسی قسم بتاتا ہے جو مطلق اندوزی کے لیے ہوتی ہے اور اس کی امتیازی صفت یہ ہوتی ہے کہ اپنے مکمل اثر سے

ایک "کیف" پیدا کرے۔ ہمارے یہاں اردو زبان میں جو نظم سے بڑے شاعر میں وہ یہ بھی کیف پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس نے اس میں تخیل کی فراوانی کی بھی تعریف کی ہے اور بین اسطورہ انفرادیت شاعر کو بھی نمایاں کیا ہے اس طرح گویا بانیو گرافہ واقعی ایک اہم تصنیف ہے جس کے اصول دائمی ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کا اصل میدان فکشن ہے۔ ان کے افسانے "افسانہ کر دیا" کے تحت کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کے ناول "شام اودھ"، "سنگم اور شالندہ" سے ایم اے (پانچ ناولوں کا بحث شدہ) اور "سم شانی" آبدل کا منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں شام اودھ اور سنگم (جسے انہوں نے آگ کا دریا کے مقابلے پر لکھا) کی فنی و فکری اہمیت ہے۔ اپنے مضمون "فکر و فسانہ" کا آغاز وہ یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ فسانہ سے ان کی مراد فکشن ہے یعنی تمام قصہ گوئی۔ اس میں داستان Romance علاحدہ ہوتی ہے کہ اس میں بے قید تخیل ہوتا ہے اور ناول اور فسانہ (Short Story) حقیقت نگاری اور واقعیت کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان دونوں نے انگلینڈ میں صنعتی عہد میں روانہ پایا گو کہ اس سے قبل بھی اخلاقی قصے اور حقیقت نمائندگی Fantasy مثلاً ان کیخوئے (اس کو میگزین) کو ملا کر فکشن ہی مانا گیا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی قصہ نگاری میں فکر کو اہمیت دیتے ہیں اس لیے مثال دی ہے کہ نالسنائی کے یہاں فکر اور افسانے کا امتزاج ہے مگر موپساں کے یہاں فسانہ ہی فسانہ ہے یعنی وہ انسانی زندگی کی خاموش گہرائیوں تک پہنچتا ہے وہ بتاتا ہے کہ انسان کی غلطیاں کرے گا، پریشان ہوگا، غلطیوں سے سیکھے گا یعنی دنیا بگڑ بگڑ کر رہتی ہے یعنی انفرادی زندگی ہو سکتا ہے کہ المیہ کی صورت میں یہ اجتماعی زندگی کا کلیہ بھی بن جائے اور پوری قوم یکسوئی اور اتحاد کی صورت میں اچھے راستے پر چل پڑے۔ یعنی فسانے میں اس کے تجربات صد مات المیوں، مشکلات، انسانی نفسیات کی حیرت انگیز کارفرمایوں کا گزر ہوتا ہے۔ اہت وہ افسانہ نگار یا یوں کہیے کہ فکشن نگار پر یہ پابندی عائد کرتے ہیں کہ وہ فکر و فلسفے کو جانتے ہوئے بھی اس کا غلام نہ بن جائے ایک مضمون میں خدیجہ مستور کے آئین پر لکھے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اس کے مجموعے قصے میں سے ایک فکر برآمد ہو رہی ہے یعنی اس کا پرچار کتابی نتائج knowledge کے طور سے نہ ہو بلکہ قصے کے نطن سے وہ تاثر خود برآمد ہو۔

"افسانہ اور افسانہ نگاری" نامی مضمون میں وہ مختصر افسانے کی فنی و فکری خصوصیات بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آغاز ہی میں کچھ سوالات کے جوابات گرکاری کو مل جائیں تو افسانے کی انھن زبردست ہوں یعنی کہاں کا قصہ ہے کب کا قصہ ہے کس کا قصہ ہے یعنی کہاں کب اور کیسے؟ اس کے بعد وہ ایک افسانے کو پورے مضمون میں پھیلا کر اس تاثر کو داگرار کرتے ہیں کہ ہیروئن امین کا چہرہ اس کی روح کا مکمل اشارہ ہے اور افسانے کا ہر غلط اس کی روح سے ہم آہنگ ہو گیا ہے اور وہ تاثر کو ایک اچھے فسانے کا کرشمہ گردانتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیدی، ممتاز مفتی، نیر مسعود، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، طاہرہ اقبال، رشید امجد، عاصم بٹ، عصمت چغتائی، نجم الحسن رضوی، بانو قدسیہ، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، انتظار حسین وغیرہ کے یہاں یہ کرشمہ موجود ہے۔ (جو نام جیسے یاد آتے گئے وہ لکھ دیئے۔ کچھ کرشمہ ساز افسانہ نگار اور بھی ہیں دونوں باتوں کے لیے معذرت خواہ ہوں)

مغرب کے بہترین افسانہ کے تحت انہوں نے ایڈ گرائیلز پو، ہاتھوون، برٹ ہارٹ، اوہنری، جینوف، موپساں، کیترین مینفیلڈ، گور کی کافکا، ہنری جیمس، ڈی ایچ رنس، ٹامس مان، اسٹیون سن وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی خوبیاں بیان کی ہیں اور کہا ہے کہ ان کا نام ہمیشہ لیا جائے گا کیوں کہ یہ نظر انداز نہیں کیے جاسکتے اس لیے انہوں نے دو جواز پیش کیے ہیں فن کا کرشمہ اور حقیقت کے نقشے کا سامنے آنا۔ اس ضمن میں انہوں نے اخلاقی حیرائے

میں حقیقت کے اظہار کو، نا ہے بشرطیکہ گویا ڈپٹی نذیر احمد کی مانند براہ راست تبلیغ نہ کی ہو۔ ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ ”گور کی پوری دنیا کا کلشن نگار ہے“ ڈاکٹر احسن فاروقی نے دوسرے زاویہ سے اس کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔

مزاح نگار کے دہل میں اصولاً انہوں نے مضطرب مطرب کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں انسان کی امتیازی صفات میں ایک اس کا ہنسنا بھی شامل ہے۔ کائنات کہتا ہے کہ مزاح وہ اثر ہے جو کسی سنجیدہ معاشے کے بے مقصد ثابت ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ مزاح کا بہترین ذریعہ ہماری زبان ہے۔ حالات اور واقعات جب مضحکہ خیز ہو جائیں تو مزاح ابھرتا ہے۔ بچے ہمیں مضحکہ خیز حرکتوں سے س قدر ہنساتے ہیں۔ فاسٹ، ڈوں کو بنگر وٹ جاڑوین اور بیکل بری فن (huckel bury finn) امریکی ذہنیت اور اس کی سادگی کا مذاق اڑانے والا کردار) سب ہمیں ہنساتے ہیں۔ شاعری میں بھی اسی انداز کا مزاح ملتا ہے۔ مزاحیہ واقعات اپنے اندر بڑی گہرائیاں رکھتے ہیں۔ مزاح نگار کا مزاح ہماری طبیعت پر بار نہیں گزرتا اور ہماری زندگی سے فسلک ہر قسم کی گہرائی اور ہر قسم کی اونچائی تک پہنچا دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے لیے غائب، پطرس اور ڈپٹی نذیر کے مزاح کی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔

غالب کا مزاح (حیوان ظریف) کے ضمن میں وہ حالی کی جانب سے غالب کو حیوان ظریف کہنے پر بھل گئے ہیں بلکہ بحیثیت نقاد انہیں نشہ آ گیا ہے انہوں نے لکھا ہے ”حیوان ظریف، اردو تنقید نگاری کا سب سے اہم اہل ہی فقرہ ہے کیوں کہ اس کے ذریعے حالی کی تنقیدی نظر میں غالب کی فطرت کے راز سے اس طرح آگاہ کرتی ہے جیسا کہ اردو کا کوئی تنقیدی فقرہ اب تک ہمیں کسی شاعر یا ادیب کی فطرت سے آگاہ نہ کر سکا۔ (ملاحظہ کیجئے صفحہ ۱۸۲)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں ”انہیں مفکر، المیہ نگار، غزل خواں، مدح سرا، تنقید نگار، ورنہ معلوم کیا کچھ نہیں ثابت کیا گیا مگر یہ سب باتیں ان کی ظریف حیوانیت کا حصہ ہیں وہ مکمل حیوان ظریف ہیں جو اپنی ظرافت میں تمام کائنات ہی کو ہیں بلکہ ہر قسم کے جذباتی تاثرات کو لے لیتے ہیں۔“ (ملاحظہ کیجئے صفحہ ۱۸۲)

چوں کہ ڈاکٹر احسن فاروقی کے یہاں تنقید میں مغرب سے تقابلی مطالعہ میں ہیں چلتا ہے اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مغرب کے دو حیوان ظریف کا نام نہ دیتے، ایک ولیم شکسپیر اور دوسرا ڈوئٹے۔ وہ اپنے نقطہ نگاہ کو ثابت کرنے کے لیے منطقی دلائل کا سہارا لیتے ہیں س یہ ہیں السطور ہر جگہ غالب کے حیوان، ظریف ہونے کے معانی کو ثابت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے غائب کے بے تحاشا شعاع پریش کیے ہیں۔ وہ اس مضمون کا ختام یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ ہمارے ادب میں وہ ہی سب سے زیادہ جدید ہیں۔ جدید دور کے انسان، ہر پرانی قدر کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والے اور دیکھ کر مسکرانے والے، مگر ان تمام شکوک کے پس منظر میں فطرت ظریف کا نور دیکھنے والے۔ اس نور کے اوتار، حیوان ظریف!!! مزاح کے بارے میں خاص طور پر شاعر کے مزاح پر پڑنے والے قاری اس مضمون سے بہت معلومات حاصل کرنے کے علاوہ حفا بھی حاصل کریں گے کہ یہی اس مضمون کی خاصیت ہے۔

پھر وہ ”مولوی نذیر احمد کے مزاح“ کی جانب بڑھتے ہیں میر خیال ہے کہ گروہ غائب کے بعد ڈپٹی نذیر احمد اور پھر پطرس کے مزاح کا تذکرہ نہ کرتے تو اس کا مزح نگاری کا یہ باب تشنہ رہ جاتا۔ ڈپٹی نذیر احمد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ان کے مزاح کی خوبیاں اٹل ہیں اور قابل تعریف اور ناقابل یقین بھی کہ وہ بنے بنائے مولوی بھی تھے ڈاکٹر احسن فاروقی کہتے ہیں کہ ”ظاہر ہے کہ مولوی صاحب مبصر اور مبصر حیات ہیں۔ مگر حیات کو پیش کرنے کا جو طریقہ انہوں نے استعمال کیا وہ کتنی ہی کچھ اخلاقی تمثیوں میں جکڑا ہوا کافی کیوں نہ ہو ان کی تخلیقات کو مزاحیہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اس

کے لیے انہوں نے مراۃ اعروص کی اکبری کی مزاحیہ حرکتوں، ماما عظمت کے افعال، توبہ النصوح کے کیم اور پیسے کی حرکتیں اور سب سے بڑھ کر مرزا ظاہر دار بیگ کے جھوٹ، منافقت، ان کی بچ و بچ اور ان کے اصل تناظر، بھانڈوں کے بیان، ابن الوقت کی پھوٹی کی باتیں، روئے صادق کی ماں کے اعمال یہ سب کچھ مزاح کی اچھی مثالیں ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ عام فہم common sense کو مزاح سے گہرا تعلق ہے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابن وقت کا پورا قصہ جدید طریقے کی طنز نگاری کی اہم مثال ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ مولوی صاحب کے طنز میں ایسا مزاح چھپا ہوا ہے جس کا کام سنس سے گہرا تعلق ہے۔ یہ ڈاکٹر احسن فاروقی کا تخلیقی فقرہ ہے اور ہمیں یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ انہیں تحریر کی خصوصیات کو تخلیقی انداز سے ابھارنے کا سلیقہ آتا ہے۔

پطرس کا مزاح کا دوسرے تمام ادیبوں کے مزاح سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے ڈکنس (Dickens) سے اپنی بات کا تذکرہ شروع کیا ہے۔ ڈکنس کے چند ناولوں میں مزاحیہ کردار موجود ہیں جیسے مقبر Macawber، پک وک Pickwick وغیرہ۔ انہوں نے پطرس کے علمی تناظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ وہ گورنمنٹ کانٹریوینوشی میں پڑھاتے تھے اور ضرور جانتے ہوں گے کہ ہیومر (مزاح) کیا چیز ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان کے مزاحیہ مضامین کو علاحدہ علاحدہ برتا ہے جس میں کتے، مہل اور میں، سویرے جوکل آنکھ ٹھکی میری اور دیگر مضامین سے مزاح کو برآء کیا ہے اور اس کی انفرادیت کا اظہار بھی کیا ہے لیکن ثابت یہ کیا ہے کہ ان کی غیر ملکی تعلیم، ان کا اپنا مزاج اور ان کی ادب کی تدوین ان کے منفرد مزاح کو ہمیز لگاتی ہے۔

آخری حصے میں انہوں نے ”ادب اور ادبی مسائل“ پر روشنی ڈالی ہے جس کی ابتداء میں ”نثر اور نثر نگاری“ کا احاطہ کیا ہے اور ذیلی سرخی میں لکھا ہے۔ ”نثر کا طرز ادا“ وہ کہتے ہیں نثر کسی اصوں وقاعدے کی پابند نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنے حساب سے لکھتا ہے البتہ کچھ لوگ اپنے لیظ سے اس میں نفاست پیدا کر دیتے ہیں۔ جو دلکش بن جاتی ہے۔ وہ اس طرز واد کو جس کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں وہ تعمیر اظہار کہتے ہیں جس میں تنظیم، مقصد اور ایک خاص قسم کی ساخت ہوتی ہے۔ جبکہ نظم میں تخلیقی اظہار ہوتا ہے جس میں الفاظ کو خیالات یا جذبات کے ذریعے نئے معانی یا نئی زندگی دینا مقصود ہوتا ہے۔ نثر میں اغاظ کی موزونیت کی اہمیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نثر کی طرز ہر فرد ہی نہیں موضوع کے اعتبار سے بھی بدلتی ہے۔ کچھ مصنفین کے یہاں شاعرانہ نثر کا گزر ہوتا ہے، جب علی، بیگ سرور، حالی، سرسید، ڈپٹی نذیر اور دیگر کئی مصنفین کی نثر کا ڈاکٹر صاحب نے جائزہ لیا ہے اور فرق بھی بتایا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ فلسفے وغیرہ کی نثر خشک ہوتی ہے مگر رائٹر کو چاہیے کہ اسے دلچسپ بنائے۔ یہ کلیتہً ڈاکٹر صاحب ہر رائٹر پر منطبق کرتے ہیں بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس میں انہوں نے کئی جہات کا اضافہ کیا ہے اور اپنے دلائل سے نثر نگاروں خصوصاً آج کے نثر نگاروں کے لیے راہیں متعین کی ہیں اور آخر میں اہم ضروریات یعنی سادگی، صفائی، اختصار، زور اور مزے (دلچسپی کا عنصر) کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید کے لیے کہا ہے کہ ان صفات کا وجود اس میں درجہ کمزور تک پہنچا ہوا ہے۔ اتفاق سے وہ خود بھی تنقید اور تبصروں میں اسی قسم کی نثر کے استعمال کے لیے معروف تھے بلکہ اس میں ان کے فسانوں اور ناولوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

”ادب اور دین“ ان کا ایک اہم مضمون ہے۔ جب ہم دین کی بات کرتے ہیں تو ہمیں بڑی نزاکتوں سے واسطہ پڑتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب اس راہ سے کامیابی سے گزر گئے ہیں۔ دین کے حوالے سے قوت حیات کے استعارے سے انہوں نے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ دین پر عقیدہ تحقیق میں ایک خاص روح پھونک دیتا ہے۔ ملٹن Milton مذہبی آدمی

تھا اس نے آدم اور حوا کے حوالے سے پیراڈائز لوسٹ Paradise lost جیسی لافانی نظم لکھی تھی وہ دین کے حوالے سے شاہکار بن گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے خود ملٹن ہی پر لکھنوی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اقبال کے فلسفے کے ڈاکٹر صاحب عاشق ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اقبال کی برگساں Bergson سے ملاقاتیں تھیں اور انہوں نے اسی حوالے سے اس کو بتایا تھا کہ وہ اپنے خیالات و افکار کے حوالے سے مولانا روم کے قریب آ جاتا ہے۔ مائلسائی کے حوالے سے ہی انہوں نے متذکرہ رائے پیش کی تھی کہ دین پر عقیدہ ادب میں ایک خاص روح پھونک دیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۸) انہوں نے ایک اور سچائی بیان کی ہے کہ کائنات کی جانب سے اشارے اور پوری کائنات سے ہم آہنگ ہونے کے لیے کسی دینی نظریہ پر ادب کا مبنی ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اقبال، غالب و مولانا روم کی مثنوی کو حوالہ بنایا ہے اس مثنوی کو وہ دریائے بے کراں کہتے ہیں کہ جس میں ڈوب کر وہ علم و حکمت بلکہ ہر قسم کے موتی حاصل کر سکتا ہے۔ انہوں نے گوئے اور حافظ کی تحریروں کو بھی اپنے نقطہ نظر کے اثبات کے لیے پیش کیا ہے۔

ادب میں شیطان Satan کو بھی پیش کی گیا ہے۔ خود ہمارے دین و مذہب میں شیطان (ابلیس) کا ذکر ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کی اور راندہ درگاہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ادب میں موجود مختلف شیطانوں کا احاطہ کیا ہے اور اس کے مضمون کا عنوان ہے۔ ”شیطان“ اس سلسلے میں انہوں نے شکسپیر کی ٹریجڈی اوتھیلو Othello کے شیطان کردار ایماگو Iago کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے جس کی شیطنیت کی مختلف روپ ہیں اور ایم اے مگریزی یعنی ڈرامے میں ایماگو پر سوال آتا ہے۔ ایماگو اپنی شیطنی سازشوں سے اوتھیلو کی فطرت میں اتنا زہر بھرتا ہے کہ وہ اپنی نیک نفس بیوی ڈیسنڈی مونا Desdmona کو قتل کر دیتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ملٹن کے شیطان پر بات کی ہے۔ ملٹن زاہد خشک اور خدا اور حضرت عیسیٰ کا پرستار تھا۔ پیراڈائز لوسٹ اس نے قارئین کو خدا کے طریقے سمجھانے کے لیے لکھی تھی۔ شیطان جو تقریریں اس نظم میں کر رہا ہے یوں لگتے ہیں کہ انہیں وہ خود ملٹن سے لکھوا رہا ہے۔ تکبر کا مارا شیطان سمجھتا ہے کہ وہ فرشتوں کے مقابلے میں بندترین ہے۔ وہ سانپ بن کر حضرت آدم کے پاس جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ ان کو بہکا دینے سے اس کی عظمت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے کردار کے لیے ملٹن نے بقول ڈاکٹر صاحب خاصی محنت صرف کی ہے اور اسے شیطان کی صفت کا بڑا کردار بنا دیا ہے۔

مویئر Moliere کا تارتوف بھی شیطان ہے۔ وہ رذیل طبقے کا زبردست ریاکار آدمی ہے وہ آرگن صاحب کا اعتماد حاصل کر رہا ہے جو اسے سب جائیداد دے دیتے ہیں اور اس سے اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا نیرایک دن اس کا بھانڈ پھوڑنے کے لیے اپنے کمرے میں آرگن صاحب کو چھپ دیتی ہے اور وہاں تارتوف آ کر جو گفتگو کرتا ہے اس سے آرگن صاحب کو اس کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے۔ تارتوف بھاگ جاتا ہے مگر اب وہ بے رحم انسان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے کیوں کہ جائیداد اس کے نام ہو چکی ہے۔ یہ بھی شیطان کا ایک گھناؤنا روپ ہے۔

گوئے کا میفسٹوفلش Mephisto Philis بھی شیطان ہے۔ وہ فاؤسٹ Faust کے سامنے آتا ہے۔ بربادی، زوال اور گمناہ اس کے کام ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس تعویذ کو بے اثر کر دے جس نے ڈرامے کے ہیرو فاؤسٹ کی روح کو حفاظت میں لے لیا ہے۔ گوئے نے دکھایا ہے کہ جب انسان مذہب کے معاملے میں متذبذب ہو جائے، مشکوک ہو جائے تب شیطان اسے گمراہی کی جانب دھکیلنے کے لیے آ جاتا ہے لیکن آسمانی محبت کی ایک بہت طاقتور آواز فاؤسٹ کو بچا کر لے جاتی ہے اور شیطان (میفسٹوفلش) شکست کھا جاتا ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب اقبال کے ابھیں یا شیطان کو اس مضمون میں شامل نہ کرتے تو یہ تشنہ رہ جاتا اور بے وقعت۔ ڈاکٹر صاحب چوں کہ اردو، انگریزی، فارسی اور فرانسیسی ادب کے پارکھ تھے اس لیے اقبال کے شیطان کو کامیابی سے پیش کر گئے اور مضمون کو متوازن بنا دیا۔ وہ بڑا چونکا دینے والا جملہ لکھتے ہیں ”ہمارے یہاں نشاۃ الثانیہ حالی سے شروع ہوتی ہے اور اس کا سب سے اہم شاعر اقبال ہے۔ ہماری روایت میں مول ناروم نے شیطان کا ایک نفرادی تصور دیا تھا۔ انہوں نے، سے خواجہ اہل واق کہے۔ اس کے بعد شاید کسی ادیب نے کبھی سے اپنے قصوں اور انفرادی توجہ کا مرکز بنایا ہو۔ اقبال ایسا گو سے بھی واقف تھے اور اس کی چابازی کو خوب سمجھتے تھے۔ مثنیٰ کے مثنیٰ Satan کی عظیم زبردستی ان کے لیے خاص طور پر جاذب تھی۔ تاروف کی ریاکاری سے بھی وہ آگاہ تھے مگر سب سے زیادہ انہیں گوئے کے مفلس فلسفے سے دلچسپی ہے۔“ (ملاحظہ ہو۔ ص ۲۸۳)

اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں کہ آسمان پر اب اس کا گز نہیں ہو سکتا۔ وہ فہم و ادراک رکھتا ہے۔ وہ مثنیٰ اور گوئے کے شیطانوں سے آگے بڑھ گیا ہے اور بالکل ایک نئی چیز بن گیا ہے۔ اس کا جو روپ، اقبال نے ابھیں کی مجلس شوریٰ میں دکھایا وہ خاصے کی چیز ہے۔ اس کی تقریریں ایسی ہیں کہ انہیں بین الاقوامی فکر کو سامن رکھ کر دیکھ اور پرکھ جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے ابھیں کا پورا تصور دیکھنا، تو جو جدید نامہ پڑھا جائے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اپنے نقطہ نظر کے لیے اقبال کی اردو اور فارسی شاعری دونوں سے مثالیں دے رہے ہیں۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ اقبال شیطان کو پریشانی اور تاسف کے عالم میں دیکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔

اس باب کا آخری مضمون بعنوان ”عد متوں کا زوال“ ہے جسے انہوں نے انتظار حسین کے ایک مضمون کے جواب میں تحریر کیا ہے۔ انہوں نے انتظار حسین کے ایک کلیہ کی جانب توجہ مبذول کر رکھی ہے کہ جب کسی زبان سے علامتیں غائب ہونے لگتی ہیں تو وہ اس خطرے کا اعلان ہے کہ وہ معاشرہ اپنی روحانی وارداتوں کو بھول رہا ہے اور جب مجنوں کو لپٹی سے عیحدہ کیا جا رہا ہے تو ادب کی روح ختم ہو رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حقیقت ایسی کسی علامت میں پورے طور پر نہیں آ سکتی۔ ایک اور اپنی علامت اس وہم کے تحت بناتا ہے کہ ساری حقیقت اسی میں ہے مگر بعد میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہم ہی وہم تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سروانٹس cervantes کا ڈون کوئنگر وٹ پن چکیوں سے کچھ اور سمجھ کر لڑ رہا ہے۔ یہ ایک نئی علامت ہوئی۔ سانکو پانزا Sanco Panza حقیقت پسند ہے اسے ہر جگہ ٹوک رہا ہے مگر وہ آدرش پسند ہے اور ”دھن کا پکا“ لہذا سانکو کی بات میں سن رہا ہے۔ ان دونوں کلیوں کی کشمکش میں علامت چھپی ہوئی ہے۔ اقبال نے بقول ان کے کہا ہے:

جہاں ہانی سے ہے دشوار تر کار جہاں جینی
جگر خوں ہو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

آگے پہنچ کر انہوں نے رتن ناتھ سرشار کے ناوں ”فسانہ آراؤ“ کی مثال دی ہے کہ انہوں نے حقیقت کا روگ نہیں پایا۔ ان کے یہاں حقیقت دو سیر بھوسے میں دو دانے گیہوں کی سی ہے مگر انہوں نے خوبی کا کردار تخلیق کر کے علامت تخلیق کر دی۔ یہ ایک زبردست مزاحیہ علامت کی کردار ہے اسی طرح حقیقت پسند مرزا محمد ہادی رسوا کو لکھنؤ میں ایک امر و جان ادا مل ہی گئی جو ایک علامت ہے جس کی دائمی قدر ہے۔ چارلس ڈکنس Dickens جیسا ناول نگار کا چوک Pickwick بھی ایک ایسی ہی مثال ہے پھر وہ، اقبال کی مثال دیتے ہیں کہ انہوں نے پرانی علامتی سرے سے غائب ہی

کردیں اور انہوں نے خدا سے جو گفتگو کی اس کا احساس پرانے شاعر کر ہی نہیں سکتے تھے۔ غرض انہوں نے انتظار حسین کی تحریر پر کافیہ ٹھا کر خاصی اچھی گفتگو کر ڈالی۔

درحقیقت ڈاکٹر احسن فاروقی نے مغرب کا جو ادب پڑھا تھا وہ ان کی گھنٹی میں پڑا تھا۔ وہ بہترین استاد بھی رہے جو شخص بیک وقت مغرب کے فکشن اور شاعری اور فارسی شاعری، حافظ اور مولانا روم کے کلام کی معنویت کو سمجھتا ہو اور تخلیقی تنقید سے مفہوم سے نہ صرف واقف ہو بلکہ تخلیقی تنقید ہی لکھتا ہو وہ مختلف موضوعات میں فکر و دانش کا سمندر بہا دے گا۔ اسی لیے میں نے لکھا ہے کہ اس ۱۹۶۳ء میں چھپنے والی کتاب کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جب کہ پی ایچ ڈی اور تحقیقی جرنلوں کی ہوا بندھی ہوئی ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ میں نے بتایا کہ یہ کتاب مشفق خواجہ نے شائع کی تھی اور انہی کی رہبری کی تحویل میں ہے جسے میں نکلوا کر پڑھا ہے اور خوب خوب عطف کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا مشرق و مغرب کا ادب پڑھ رہا ہوں یا اس کے موٹے موٹے اصول سمجھ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ کراچی سے اس کا دوسرا ایڈیشن چھپ جائے گا۔ آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ اس نظر انداز شدہ کتاب جس میں اہم موضوعات پر مضامین ہیں محض ایک تبصرہ سے نیز یہ کہ حسن ادبی موضوعات پر تن آسانی سے سادہ سی زبان میں باتیں کی گئی ہیں وہ ڈاکٹر احسن فاروقی کے مطالعے اور تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں وہ مشکل موضوعات کو پانی کر دیتے ہیں۔



تصویر شناسی

زوار حسین

بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تصاویر کی قدر و قیمت کا تعین اور حق تعین ادا کرنا تنقیدی علمیت کے ذریعے ممکن ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ ایک ناقابل خیال ہے۔ جس طرح شاعری کی شرح و تعبیر کیلئے تنقیدی علمیت کے علاوہ ایک اور وہی صد حیت یعنی ”شعری مذاق“ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تصویر شناسی کیلئے بھی ایک انتہائی مخصوص قسم کا ”بصری تخیل“ درکار ہوتا ہے۔ مذاق فن کی یہ دو ایسی قسم ہیں جو ایک دوسرے کا متبادل نہیں ہو سکتیں۔ مثال کے طور پر شعری مذاق کیلئے یہ ممکن نہیں کہ اس کی معرفت کسی تصویر کے جزائے ترکیبی اور متعلقہ بصری تصورات کی وضاحت کی جاسکے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ دنیائے تصویر کی اکثر اعلیٰ ترین اقسام غیر ادبی Anti Literary حیثیت رکھتی ہیں۔

بصری وضعوں Visual Forms کے ضمن میں بنی نوع انسان کی عادی میراث کا مطالعہ ایک ایسے بصری تخیل کی نشاندہی کرتا ہے جس کی نوعیت وہی ہے اور وہ بہ اعتبار قدامت ساقی اور اک پراویت رکھتا ہے۔ چنانچہ تصاویر کے پہلو پہ پہلو رت اور ظروف کی صورت گری میں بھی ایسی ریاضیاتی بصیرت کا عمل دخل پایا جاتا ہے جو غیر لسانی حیثیت رکھتی ہے اور جسے بصری تخیل ہی کی جہان آفرین صد حیت خیال کرنا چاہیے۔ یہ نہ فی ذہن کی اپنی داخلی منطق ہے کہ اس نے وسیع تاریخی تناظر میں بصری وضعوں کو کس انداز سے تخلیق کیا۔ اس میں شک نہیں کہ بصری وضعوں کی اپنے طور پر ایک مسلمہ حیثیت ہے لیکن جو نہی وہ انسانی نفسیات سے موٹ ہوتی ہیں ان میں ایک ندرت آفرین تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ بصری تخیل کی اصلاح مجموعی طور پر ایسی ہی تبدیلیوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام بصری فنون میں اس کی وہی اہمیت ہے جو ادب میں شاعرانہ مذاق کو حاصل ہے۔ تصویر شناسی کیلئے بنیادی طور پر اس کے چار جزائے ترکیبی یعنی روشنی، رنگ، شکل اور سطح سے متعلق مناسب واقفیت حاصل کرنا لازم آتا ہے۔ عالمی روایت کے پیش نظر ان چاروں میں سے ہر ایک عنصر اپنے طور پر بحر ذخار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تصویر شناسی کے ضمن میں تنقیدی علمیت سے مراد زیادہ تر نہیں عناصر کا علم ہے کہ ان کا اظہار زمان و مکان کے اختدقات میں کس انداز سے ہوا۔ جب کوئی خدق مصور جس کے بارے میں یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کا فن بصری تخیل اور آزمودہ کاری کا مظہر ہے تو یہ آزمودہ کاری متذکرہ عناصر کی باہمی تنظیم ہی سے متعلق اس مصور کی وہی اور اکتسابی صلاحیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ عالمی سطح پر انسان کی تخلیقی رویت کا یہی وہ شعور برتر ہے جس میں آفاقیت کے جملہ امکانات پائے جاتے ہیں۔

گراہر تنقیدی علمیت اور دانشور نہ انہماک کے پہلو پہ پہلو لہجہ فنی انداز نظر کی اپنی جداگانہ مشکلات ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس مرکب فوری احساس ہوگا کہ انسانی فن میں فطری اشکال Natural Forms کے علاوہ کچھ ایسی مابعد الطبیعیاتی خصوصیت بھی پائی جاتی ہیں جو علم و ادراک کے مسلمہ پیمانوں کی زد میں نہیں آتیں۔ ہدایں ہمہ ان کی ہمہ گیر متکشفانہ اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ فن کے بارے میں یہ نقطہ نظر کہ وہ فطرت پر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اضافے سے مراد ایک خاص قسم کی نفس کشش قفل یا انسانی اصلیت ہے جو فنی طریقہ کار میں شامل ہو جاتی ہے۔

اصلی ترین سنجیدگی Seriousness۔ جس تخیل اور فنی پختگی۔ یہ تین ایسی اہم ترین صفات ہیں جن کا طلاق تمام فنون پر ممکن ہے۔ یہ امر بہت واضح ہے کہ جو فنی سنجیدگی کا مظہر نہ ہو۔ وہ بالآخر ابتدائی کاشکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تخیل کی بلند پروازی دوسری اہم صفت ہے جس کے باعث فنی عمل میں انسانی معنویت کا حسن پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو فن متعلقہ ذرائع اور طریقہ کار Method کی رُو سے آزمودہ کاری کا نتیجہ نہ ہو، وہ خام کاری کے علاوہ کچھ اور ثابت نہیں کر سکتا۔ اصلی ترین سنجیدگی سے کیا مراد ہے؟ اس کی تصدیق مختلف فنون میں ان کے مخصوص اسالیب، نگاہ سے مشروط ہے جہاں تک دنیائے تصویر کا تعلق ہے یہاں سنجیدگی کی صفت کو زیادہ امتزاج رنگ اور ہیئت آفرینی کے عمل میں دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ رنگوں میں نزد و دور کے عدد وہ سرد و گرم کی تفریق پائی جاتی ہے اور اس تفریق کو رنگ کے درجہ شدت Colour Temperature کا عنوان دیا گیا ہے۔ ایک بنیادی تفریق اولین اور ثانوی رنگوں کی ہے۔ اولین رنگ خلقی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی امتزاج کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ اگر رنگ اپنی اولین خلقی حالت درخشاں میں ہوں تو ان سے ایک عامیہ نہ قسم کی ناتراشیدہ وحشت جھلکتی رہے گی لیکن اس صورت میں کہ مقررہ فنی طریقہ کار کے ذریعے اُس کی قلب ماہیت کر دی جائے تو یہ وحشی رنگ مہذب قرار پائیں گے اور ان کا وحشیانہ اضطراب شستہ قسم کے سکون میں تبدیل ہو جائے گا۔ عمل کی اس نوعیت کو تعدیل رنگ Colour Neuterlization کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس سے مراد رنگوں کے امتزاج میں سنجیدگی کا حصول ہے۔

بالعموم سیاہ و سفید کو بھی رنگ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں، اس لیے کہ ان کا اور اک حواس رنگ کے ذریعے نہیں بلکہ جداگانہ طور پر حسن درخشاں Brightness Sensation کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ فنی حقیقت سیاہ و سفید دو ایسی بصری توہمیں ہیں جو مخالف سمت پر موجود رہ کر مختلف انداز سے رنگوں کو متعین Detrmined کرتی ہیں۔ روشنی رنگ کی رونمائی کا ذریعہ ہے جبکہ سیاہی کو رنگ کی موت قرار دیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک سنجیدگی کا تعلق ہے، وہ ان دونوں بصری عناصر کے باہمی روابط ہی سے منکشف ہوتی ہے۔

روشنی اور رنگ کے نظاموں سے قطع نظر، جہاں تک ہیئت آفرینی کا سوال ہے۔ یہاں سنجیدگی کی صفت کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہیئت کا عمل محض فطرت کی نامیاتی اشکال سے متعلق ہو تو اس میں ایک مانوس قسم کا عامیہ پن پایا جائے گا لیکن اس صورت میں کہ مصور نے کسی حد تک Geometrical Abstractions سے کام لیا ہو۔ جیسا کہ میزان، پکاسو، ریاضیاتی تجزیہ اور براک کا نقطہ نظر ہے۔ ایسی خاکہ سازی جس میں ڈیزائن کے عمل کو اہمیت دی گئی ہو یا کوئی ایسا اسلوب خاص جو ملکی نظم Cubical Discipline کو ظاہر کرے۔ اسے فطرت میں شامل کی گئی انسانی مزاج کی ایک انتہائی قابل قدر صفت ”سنجیدگی“ کا عنوان دیا جائے گا۔

اگر رنگوں اور صورتوں کو ان کے باہمی رشتوں کی رُو سے کسی سطح پر اس انداز سے مرتب کیا جائے کہ وہ یک جمع الصفات وحدت کو ظاہر کریں تو یہ نتیجہ خاص ہم آہنگی کا عنوان پائے گا۔ ہم آہنگی ایک ایسا اصول خاص ہے جس کے بغیر کوئی فنی عمل اپنے نقطہ عروج یعنی سنجیدگی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ صراحت بیان، ہم گوئی اور بردباری۔ یہ سب بھی سنجیدگی ہی کی ضمنی صفات ہیں۔ دنیائے تصویر میں کم گوئی اور قوت اختصار Abbridgment کا تعلق تخلیقی عمل میں پائی جانے والی ریاضیاتی بصیرت سے ہے۔ مبالغہ آمیز رنگینی سے احتراز اور صرفہ خط Economy of Line اس کے معروف تصورات ہیں۔ بالعموم کوئی ایسا فنی عمل جس میں آرائشی و طیرے ضرورت سے زیادہ استعمال کیے گئے ہوں۔ اس حد

تک کہ وہ کسی سطح پر کاملتا متصرف دکھائی دینے لگیں تو یہ صورت حال اپنے رد عمل میں سادگی کے تصور کو ابھارے گی۔ سادگی کا شمار بھی سنجیدگی کی ضمنی صفات میں ہوتا ہے لیکن اس تصور کو جملہ سالیب ہنر میں ایک حد درجہ مشکل تصور خیال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد سادہ لوحی، بے رنگی یا بے حسی نہیں۔ سادگی ہمیشہ گہری علیست اور فنی مہارت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر فنی عمل میں اظہار اور آرائش کے عناصر پائے جاتے ہیں جبکہ سادگی انہیں دو عناصر کے اضافی تقابلات سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر فن تعمیر میں کچھ وضعیں تو کارآمد Functional ہوتی ہیں اور کچھ محض آرائشی حیثیت رکھتی ہیں۔ گر آرائشی وضعوں کو بے تحاشا استعما کیا جائے تو یہ بات سادگی کے منافی ہوگی۔ اس اعتبار سے سادگی کا تصور صفت بیان کی حیثیت رکھتا ہے اور خاکہ سازی کی قوت ایجاد Design Sensibility سے مشروط ہے۔

ہم نے تصویر شناسی کے ضمن میں سنجیدگی کے علاوہ ”روح تخیل“ کا ذکر کیا تھا کہ ایک معیاری تصویر کسی نہ کسی معنوں میں بشری تخیل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یوں تو جملہ فنون لطیفہ میں انسان کی پوری ہستی بوٹ ہوتی ہے لیکن اس ضمن میں تخیل کو ہمیشہ خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کورنٹ کے خیال میں تخیل ایک ایسی صلاحیت ہے جو اشیاء کے مخفی روابط کو دریافت کرتی اور متضاد عناصر کو متکشفانہ انداز سے مرتب کرتی ہے۔ تخیل کی کارکردگی کو ہر نوع کی عقلی اور منطقی انضباط سے قطع نظر ایک تخلیقی جست یا وہی اثر ان کے طور پر فرض کرنا چاہیے۔ غائب کا ایک مصرع ہے

سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اس مصرعے میں مفہوم کی ایک ایسی صورت ہے جس کی معرفت تخیل کی اہمیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ تخیل کی یہ نوعیت ہے کہ وہ حقیقت اور وجود کی مسلح حدود سے آگے بڑھ کر جھلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر موجود صورتحال اور اس کی برقرار حدود سے دائمی قسم کے عدم اطمینان کا اظہار۔ تخیل کی ایسی لازمی شرط ہے جس کی رو سے یہ فرض کیا گیا کہ شاعری زمین پر نہیں چھتی بلکہ ہوا میں اڑن ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

تخیل کو ہمیشہ ایک لاپرواہی قسم کی فضائے بعید درکار ہوتی ہے اور وہ اس فضا کو انتہائی انوکھے طریقوں سے دریافت کر پیتا ہے۔ تخیل کبھی مقام گزین نہیں ہوتا۔ اس کا تجسس لازول ہے، جہاں تک بصری تخیل کا تعلق ہے، اس کا ایک پناہ تاریخی عالم تشا ہے جس کا اعتراف تصویری آداب و قوانین کی عالمی روایت سے بہترین واقفیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

ہم نے تصویر شناسی کے ضمن میں تخیل کے بعد فنی پختگی کو بھی ایک لازمی شرط قرار دیا تھا۔ اس لیے کہ فنی آداب، اسالیب اور قوانین کے بغیر جو کچھ بھی سامنے آئے گا۔ وہ خام کاری کے سوا کچھ اور ثابت نہیں کر سکے گا۔

☆ ☆ ☆

نظموں کی چھاگل

ارشاد معراج

ستارے سن رہا ہے ٹو!
 وزیر آغا
 ہمیں نظموں میں جینے کا سبق دے کر
 پرانا پیڑ برگد کا یا پمپل کی گھنٹی چھاؤں
 تمہارے پاس آ بیٹھے
 سدھارتھ کی خموشی اور نظم طور کا
 فضا میں اب بھی ان کی خوشبوئیں مہک رہتی ہیں
 سودا سر منصور کا
 ستارے جانتا ہے ٹو وہ ایسے نظم کرتے تھے
 یا پھر شفق کی شفقتیں
 کہ جیسے محمد زیت کا
 اور رات کی لمبی مسافت کو
 مکھڑا الوہی گیت کا
 کئی کرتوں سے تم بھی تو مسافت جھیل کر
 سندھ سنہرے دن کی چڑیاں
 تنہا سفر میں تھے ستارے!
 وہ تمہارے واسطے ”نظموں کی چھاگل“
 شام کھیا نوں میں اڑتی ٹور کی
 بھر کے لائے ہیں
 اور اک کٹوری ساگ کی روٹی بڑے تنور کی
 ہزاروں فقراتی نظمیں
 گلابی پھول سے مصرعے
 ہا کھن کا پیڑ اور لمسی، قاش تر بوڑی
 وہ جن کا ذائقہ کینو کے ریل جیسا
 مستم ذائقہ جسموں کا، بروحوں کی اذیت
 ”پھاڑی راستے“ پہ ہجر کا موسم گزارا تھا
 اور دماغوں کا جھل
 انہوں نے ہجر کا موسم
 اور بچنے کی حیرتی، بوڑھے بدن کی تشنگی
 ستارے!
 سندھ و رما تھے کا، گلن کی پاکی
 ہجر کیا ہے جانتا ہے ٹو؟
 یاراگ سینے میں بسکتے درد کا
 یہ ایسا وار داتی ہے
 یا سر کوئی آنکھوں کی جل تھل کا

فقط جو خون پیتا ہے
 بدن ساکت بناتا ہے
 یہ سیسہ بن کے کانوں میں پگھلتا ہے
 کسی لوہار کی بھٹی کے جیسا ہے
 یہ آنکھوں سے چپکتا ہے تو سارے خواب کڑوے کر کے اٹھتا ہے
 کسی امرود میں کیڑے کی صورت روح میں جیتا نہ مرتا ہے
 تو تب نظموں کی کھتی پر بہت سا بورا آتا ہے
 چپکتا ہے، کئی سانچوں میں ڈھلتا ہے
 ستارے!

بس یہی کرتے رہے ہیں عمر بھر اپنے وزیر آغا
 انہیں محسوس کر اے بخت ورا!
 اور ہم

ہمیں تو جھاگ کی صورت
 فقط لمحوں میں رہتا..... ختم ہوتا ہے

نظم گہری نیند سو گئی

ارشاد معراج

ٹوٹے جاویدانور! نظم گہری نیند سو گئی
 ابھی نظم میں زندگی کو بتانا تھا نظم گہری نیند سو گئی
 لفظوں سے شکلیں بنانا تھا نظم گہری نیند سو گئی
 کاغذ پہ قصہ اگانا تھا نظم گہری نیند سو گئی
 اور دیس پردیس کی تازہ خبروں کو لانا تھا نظم گہری نیند سو گئی
 اور ”نور“ سے محبت نبھانا تھا نظم گہری نیند سو گئی
 ہم جو محبت میں گناہ تھے نظم گہری نیند سو گئی
 تو ہمارے لیے نظم دس بھی نیا ایک لانا تھا نظم گہری نیند سو گئی
 پر ”دشت کے بھیڑیوں“ میں ہمیں چھوڑ کر کھو گیا نظم گہری نیند سو گئی
 لمبی گہری مدھنیں دکا ہو گیا نظم گہری نیند سو گئی
 (کیسی ہجرت ترے پاؤں میں گھومتی رہ گئی) نظم گہری نیند سو گئی
 ہم نے آنگن میں شیشم اگائے مگر نظم گہری نیند سو گئی
 کیکروں نے بسیرا کیا نظم گہری نیند سو گئی
 ہم نے سورج سے کی دوستی نظم گہری نیند سو گئی
 وہ قریب آ گیا نظم گہری نیند سو گئی
 جون روحوں پہ یوں چھا گیا نظم گہری نیند سو گئی
 حسن راہ اجل پا گیا نظم گہری نیند سو گئی
 ہم سید بخت کالے بھنگے بنے نظم گہری نیند سو گئی

پوٹلی میں رہی خواب کی دھجیاں
چاند کی بوٹیاں، صبح کی تھوڑیاں
ہاتھ کی انگلیاں، آنکھ کی چلیاں
ذہن کی نرملاہٹ، زباں، کھوپڑی
بھیڑیے کھا گئے

بھیڑیوں کا جہاں !!!
تو نے جاویدا نورت ہی نہیں۔۔۔

زندگی سرخ قبا اپنی شہادت سے ہوئی

(شمینہ راجہ کی یاد میں)

شہرِ سبا کی ملکہ..... شمیمہ راجہ

سلمان باسط

آج سے چند برس قبل میرا شوق آوارگی مجھے بحیرہ احمر کے کنارے ہے اس شہر میں لے گیا جسے تاریخ نے شہرِ سبا کے نام سے چنے اور ق میں سنبھال رکھا ہے۔ یمن کے اس شہر میں ملکہ سبا کے نخل کے کھنڈرات دیدہ بینا رکھنے والوں کو پیچھا مویجتے ہیں کہ کتنی صحیفوں میں زندہ رہنے والی ملکہ کو کوئی نہیں مار سکتا۔

سبا کے کھنڈرات کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے سوچا کہ سورج کی پرستش کرنے والی اس ملکہ نے غروب آفتاب کے بعد کس طرح تنہائی اور گہرے کرب کو محسوس کیا ہوگا۔ آج ایک طویل عرصے بعد میرا شوق آوارگی مجھے ایک اور شہرِ سبا میں لے آیا ہے۔ میں پھر مبہوت اور ششدر ہوں۔ اس کا محل میری آنکھوں کی پتلیوں پر حیرت کا سایہ ڈال دیتا ہے۔ اس کا شیشے کا تخت اتنا آبدار ہے کہ میں قدم بڑھاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس شہر پر چمکنے والا سورج اس کی ملکہ کے غروب ہو جانے کے بعد بھی غروب ہونے کا نام نہیں دیتا۔ اور پھر صحیفوں میں زندہ رہنے والی ملکہ کو کون مار سکتا ہے۔

"شہرِ سبا" سمیت میں نے شمیمہ راجہ کے سارے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات شدت سے محسوس کی ہے کہ شمیمہ راجہ ہمارے عہد کی اکثر شاعرات سے بہت اونچے پیدائش پر کھڑی ہے۔ اس کی فکر، اس کا سلیقہ، اس کا ڈشٹن، اس کی ڈشٹن۔ یہ تمام چیزیں اسے اتنا قد آور بنا دیتی ہیں کہ سے محض خواتین کے قبیعے کی ایک شاعرہ کہنا بہت بڑی زیادتی ہے۔

شمیمہ راجہ بہت کثیر مطالعہ شاعرہ تھی۔ معاشرت، سیاست، تاریخ، بین الاقوامی معاملات اور ادب کے جدید تر رویوں سے آگاہی رکھنے والی یہ شاعرہ جب جذبات کو زبان دیتی تو حوالے خود بخود سمیٹے چلے آتے۔ اسے بات کو توانا بنانے کے لیے سہاروں کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ ارد گرد دیکھنا نہیں پڑتا تھا۔ اس کے مطالعے اور مشاہدے نے اسے ایسی دانش اور خوش سلیقگی عطا کی تھی کہ بڑے بڑے نامور لوگوں کے حصے میں نہیں آئی۔ سی مطالعے کی عادت نے اس کی شاعری کے اندر ایسا کلاسیکی رچاؤ بھردیا تھا کہ وہ ایک جدید تر دور کی شاعرہ ہونے کے باوجود لفظیات اور تراکیب میں کمال طور کا سلیکی رنگ کو ذکاوت پر ترفع بخشنے کی قدرت رکھتی تھی۔ اس کی غزلیوں میں دب سوزاں، عرش ناز، شگفتہ دس، فیصل شہرِ خیال، نام عشق، نقش فنا، نان و آب، گدائے کوئے ملامت، کلب عم، شب ملال، شہرِ جمال اور مصحف دل جیسی تراکیب جہاں اسے ایک کلاسیکی مزاج کی شاعرہ بناتی ہیں وہاں اس کے اندر چھپے اس تغزل کو بھی نمایاں کرتی ہیں جو ہر غزل گو کا خاصہ ہے۔

غزل کی لیلیٰ ہر محفل میں نہیں بیٹھ جاتی۔ یہ ہر کسی پر مہربان نہیں ہوتی۔ اس کے لیے لمبی ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ اس کے نازاٹھنا پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر یہ اپنی چشم نیم، زکسی پر ڈالتی ہے۔ شمیمہ راجہ خوش قسمت تھی جسے غزل اپنی تمام تر رعنائی، سلیقے اور محبوبیت کے ساتھ ملی تھی۔ وہ اگرچہ فیض کے قبیعے کی شاعرہ تھی مگر غلطیات اور تراکیب کے اعتبار سے شیفہ

کے قریب نظر آتی تھی اور اس فکری قربت کے باعث اس کی شاعری اور شخصیت میں جس شینگی نے جنم لیا تھا وہ اس کی پہچان بن گئی تھی۔

ثمینہ راجہ محبت کی شاعرہ تھی لیکن اس کے اندر وہ خود سپردگی نہیں تھی جو اکثر خواتین کی شاعری کو سطحیت کے درجے پر لے آتی ہے۔ وہ محبت کرتی تھی مگر انا کے ساتھ۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا وصف ہے جو اسے اس کی ہم عصر شاعرات سے بہت بلند کر دیتا ہے۔

وہ محض ایک دُروں میں شاعرہ نہ تھی۔ منظر کی تازگی اور فطرت کا حسن ایک دلربائی کے ساتھ اس کی شاعری میں موجود تھا۔ بعض اوقات تو اس کے اشعار اور اس کی نظمیں کسی مصوٰر کی خوبصورت پینٹنگز دکھائی دینے لگتی ہیں جن میں فنکار نے اپنے اندر کی تمام تر تخلیقی خوبصورتی کو کیوس پر منتقل کر دیا ہو۔ کہیں یہ مناظر حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ کہیں اداس کر دیتے ہیں مگر ہر کیفیت میں تازگی کا عنصر برقرار رہتا ہے۔

ثمینہ راجہ کی شاعری ایک شدید اور گہری جذباتی وابستگی کی شاعری ہے لیکن اس کی محبت کسی شوریدہ سرٹالے کی طرح نہیں بہتی بلکہ اس میں دریائوں کا فروغ ہے۔ سمندروں کی وسعت ہے۔ وہ شور نہیں مچاتی۔ فریاد نہیں کرتی۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ وہ تو اس اپنے آپ سے مخاطب ہوتی ہے لیکن ہوا اس کا نوحہ چرا کرے جاتی ہے اور اسے چاروں جانب پھیلا دیتی ہے۔ یہ شاعری نہ تو اتنی مبہم ہے کہ اس کی تفہیم ہی مشکل ہو جائے اور نہ ہی سطح پر بننے والے مبہموں کی طرح صاف دکھائی دے جانے والی چیز ہے۔ وہ درحقیقت غزل کہنے کے تمام سلیقوں سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ جو جمال احسانی نے کہا تھا

بہال کھیل نہیں ہے کوئی غزل کہنا
کہ ایک بات پھپھانی ہے اک بتانی ہے

وہ بات ثمینہ کے ہاں بالکل درست ثابت ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

اس نے وطن سے اور اپنی مٹی سے محبت کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کی یہ نظمیں ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی حدود سے اس کی وابستگی کی دلیل ہیں۔ ثمینہ کے دس میں موجود اس درد نے اس کی زندگی کے آخری ایام میں قدرے کڑواہٹ کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس نے مادر وطن کو بے دردی سے مٹنے والوں کو درشت لہجے میں بھی مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مصمتوں سے بالاتر ہو کر تمام قوم فردوں کو نظم و نثر کے ذریعے بے نقاب کرنے میں جٹ گئی تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ثمینہ کی شاعری ذاتی تجربات اور واردات کی شاعری ہے۔ وہ جو محسوس کرتی تھی، جیسا محسوس کرتی تھی لکھ ڈالتی تھی۔ زندگی نے اس کے ساتھ جیسا سلوک کیا وہ اس کے کلام سے منعکس ہے۔ ہمارے معاشرے کی عورت جن تلخ تجربات سے گزرتی ہے ان کو زبان دینے کی قدرت جب ثمینہ راجہ جیسی خوش فکر شاعرہ کو عطا ہوتی ہے تو سوز و گداز کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے لیے ہمارے مرد شعراء کو خاصی ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ ثمینہ کی شاعری میں اس کے ذاتی تجربات کے حوالے اس کی سچائی کی دلیل ہیں۔ محبت، نفرت، غصہ، دوستی، انتقام، دھوکہ، وفاداری، وصل، فرق۔ کون سا رنگ ہے جو اس میں موجود نہیں۔ ابتدائے عشق کا نغمہ، ملاپ کی لذتیں، ادھوری ماقاتوں کا دکھ، تشنگی کا احساس، بے وفائی کے زخم، ہجر کا کرب۔ یہ سب کچھ ہے مگر ویسے نہیں جیسے عموماً ہوا کرتا ہے۔ سستا جذباتی پن نہیں۔ داخلی تجربات کی ایسی بھٹی تھی جس نے اسے اور اس کی شاعری کو آئین بنادیا تھا۔ اور شاید نظم و غزل پر یکساں قدرت رکھنے والی

اور دونوں کی ہار یکویں سے آشنا ہماری شاعرہ سی سے تھی چچی اور اتنی جلی نظر آتی تھی کہ دامن دل اس کی طرف کھینچنے لگتا تھا۔ ”حسن کورہ گر“ کا شمیمہ راجہ ورژن اتنا مندر، اتنا چوٹکا دینے والا اور اس قدر مبہوت کر دینے والا ہے کہ شاید مہر شد صاحب کو بھی اپنی نظم کو نیا موڑ دینے میں ذرا تاثر مل نہ ہوتا۔

”----- تو بارہ برس پھر خدمت میں حاضر رہی تھی

جہاں زادانساں تھی

لیکن وہ بارہ برس غم کے قالب میں گزرے تھے

اور ”قاف کی سی افق تاب آنکھوں میں“

ہشکوں کا سیل رواں تھا

وہ آہیں وہ نالے، وہ زنداں سے باہر نکلنے کی خواہش

”گل ولا کے سیال کوڑوں“ کی حسرت

حسن کورہ گر تنگ آیا

اٹھا اپنی آپس، اٹھا اپنے نالے، تمنا کی وسعت

نکل جا، چلی جا

حسن کورہ گر! اے حسن کورہ گر! اے مری جاں!

یہ بارہ برس مجھ پہ اس طرح گزرے

”کہ جیسے کسی شہر مدفون پر وقت گزرے“

میں بارہ برس اور خدمت میں حاضر رہوں گی۔-----“

اب مجھے کوئی بتائے کہ تجربے کی یہ بھٹی اسے اس کی شاعری و کندن کیسے نہ بناتی۔

میں آخر میں آپ کو ”اصل کہانی“ سنانا چاہتا ہوں اور آپ کی آنکھوں میں جھانکن چاہتا ہوں تاکہ دیکھ سکوں کہ

اس دلگداز کہانی نے آپ کو بھی اتنا ہی اس، اتنا ہی دلگھی کیا ہے جتنا اسے پڑھ کر میں ہوا ہوں:

”شہزادے نے راجے کی بیٹی سے شادی کر لی

دونوں ہنسی خوشی سے

شیش محل میں رہنے لگے اور چلو کہانی ختم ہوئی“

لیکن بچو! ایسے کہانی ختم نہیں ہوتی ہے

آگے یوں ہوتا ہے

اک دن کھانا ٹھیک نہیں تھا

شہزادے نے راجے کی بیٹی کو جھڑکا

اک دن کپڑے دھوئے نہیں تھے

شہزادے نے راجے کی بیٹی کو ڈانٹا

شمینہ راجہ

وہ ستارہ ساز آنکھیں

وہ ستارہ ساز آنکھیں
مجھے دُور سے جو دیکھیں
تو مرے بدن میں جاگے
کسی روشنی کی خواہش
کسی آرزو کا جادو
کسی حُسن کی تمنا
کسی عشق کا تقاضا
مرے بے قرار دل کو
بڑی خامشی سے چھو لے
کوئی نرم تر و اُدا سی
کوئی موج زندگی کی
کوئی لہر سرخوشی کی
کوئی خوشگوار جھوٹکا
اسی آسمان کے نیچے
اسی بیکراں خلا میں
کہیں ایک سرزمین ہے

جو تہی رہی نہی سے
رہی روشنی سے عاری
رہی دُور زندگی سے
نہیں کوئی اس کا سورج
نہ کوئی مدار اس کا
اسی گمشدہ خلا سے
کسی منزلِ خبر کو
کسی نیند کے سفر میں
کسی خوابِ مختصر میں
کبھی یونہی بے ارادہ
کبھی یونہی اک نظر میں
جو کیا کوئی اشارہ
وہ ستارہ ساز آنکھیں
مجھے کر گئیں ستارہ

شمینہ راجہ

سدا بہار آگ

لگاؤ ہے کہ لاگ ہے
خبر نہیں، خبر نہیں
ادا نہیں، نظر نہیں
نہ رنگ پیش آئینہ
نہ حسن کوئی روبرو
نہ آرزو نہ جستجو
نہ شوق دید سامنے
نہ دُور کوئی مضطرب
کسی کے انتظار میں
سوا دریا کی زار میں
فضائے مرغزار میں
خزاں کی زرد شام، یا
رویشبِ غبار میں
ہوائے ہمدِ خمار کے
رُکے رُکے بہاؤ میں
نہ سوز میں، نہ ساز میں

نہ زندگی کے راز میں
نہ دل کے ایک زخم میں
نہ تن کے ایک گھاؤ میں
نہ رنج ہے نہ درد ہے
کہاں لگی، کہاں جلی
خبر نہیں، خبر نہیں
یہ شوق یا لگن میں ہے
یہ دل میں یا بدن میں ہے
خبر نہیں، خبر نہیں
لگاؤ ہے نہ لاگ ہے
سدا بہار آگ ہے

یہ ترک تعلق تو

آغاز ہوا موسم
پھر دردِ جدائی کا
یہ دردِ جدائی جو
تقدیر ہے آفت کی
حاصل ہے تمنا کا
منزل ہے محبت کی
اور ترک تعلق تو
بس ایک یہاں ہے
اُس رنج سے بچنے کا
جو ہجر سے زہریلا
اور زہر سے کڑوا ہے،
ہم کو یہ گوارا ہے
چہرے پہ رہے زردی
ملبوس پہ شکنیں ہوں
اور دل میں ہو اک شعلہ
تن جس سے جھلتا ہو،

تن آگ میں جلتا ہو
دردِ ڈھوپ کی شدت میں
اس ریت پہ صحرا کی
گر گر کے سنبھلتا ہو،
لیٹی تو نہیں یہ جاں
مجنوں تو نہیں یہ دل
لیکن ہے نظر پیاسی
ور ڈھونڈتی رہتی ہے
اس ریت میں اک چشمہ
اس راہ پہ اک محل
تم خواب سجا آئے
اُس راہ پہ اک قریہ
شاداب بنا آئے
تم خواب کی صنعت کے
موجد بھی ہو ماہر بھی
نکار بہت بچے

عاشق ہو بہت صادق
اور لفظ گری میں تو
سچ سچ کے فسوں گر بھی
پہے بھی بہت قریے
شاداب بنائے ہیں
پہے بھی بہت رستے
خوابوں سے سجائے ہیں
الفاظ کے جادو سے
کیا رنگ بکھیرے ہیں
اور سحر سے آنکھوں کے
کیا پھول کھدائے ہیں
فن کار ہو تم بچے
عاشق ہو بہت صادق
پھر اور کوئی رستہ
سنان جو پاؤ گے

بے چین بہت ہو کر
 کچھ پھول کھلاؤ گے
 بیتاب محبت کے
 کچھ خواب سجاؤ گے
 جو خواب ان آنکھوں میں
 اب چھوڑ کے جاتے ہو
 وہ ٹوٹ کے بکھرے گا
 رستے پہ کھدایا ہے
 جو باغ، وہ اُجڑے گا
 پھر دشتِ تمنا میں
 اک ڈھوپ کے رستے پر
 شعلایا ہوا کوئی
 سہایا ہوا کوئی
 سایا سا کھڑا ہو گا
 اور گونج رہی ہو گی
 اک سمت میں رسوائی
 اک سمت میں تنہائی

یہ ترک تعلق تو
 بس ایک بہانہ ہے
 مرنے سے ذرا پہلے
 قدموں کے سنبھلنے کا
 اُس رنج سے بچنے کا
 اُس غم سے نکلنے کا
 جو زہر سے کڑوا ہے
 اور ہجر سے زہریلا
 حاصل ہے جو اُلفت کا
 تقدیر محبت کی
 انجام تمنا کا!

شمینہ راجہ

آشوب

کیا وہ بھرے کوئی	طوفان نہیں اٹھتا	بستی میں کوئی عورت
جب آہ نہیں جاتی	جب شاخ پہ امکاں کی	راتوں کو نہیں سوتی
دل سے بھی ذرا گہری	اس دشتِ تنہا میں	جاگی ہوئی عورت کی
اور عرش سے کچھ اونچی	اک پھول نہیں کھلتا	سوئی ہوئی قسمت پر
کیا نظم لکھے کوئی	رہوار نہیں رکتے	جب کوئی بھی دیوانہ
جب خواب کی قیمت میں	موہوم سی منزل پر	بے چین نہیں ہوتا
آدرش کی صورت میں	آنکھوں کے اشارے سے	دہلیز کے پتھر سے
سکھوں گدائی کا	اور نور کی بوندوں سے	ٹکرا کے جبیں اپنی
شعر کو دیا جائے	بو چھاڑ نہیں ہوتی	اک شخص نہیں روتا
اور روک بیا جائے	اک غیلے ستارے سے	جب نیند کے شیدائی
جب شعرا ترنے سے	جب دل کے بلاوے پر	خوابوں کو ترستے ہیں
بادل سے ذرا اوپر	اس جھیل کنارے پر	اور دیکھنے کے عادی
تاروں سے ذرا نیچے	پیغام نہیں آتا	بینائی سے ڈرتے ہیں
کیا خاک لکھے کوئی	اک دور کا ہاشندہ	رہ رہ کے اندھیرے سے
جب خاک کے میداں پر	اک خواب کا شہزادہ	آنکھوں میں اترتے ہیں
انگلی کو ہلانے سے	گلفام نہیں آتا	آنکھوں کے اُجالوں سے

ان پھول سے بچوں سے

کہہ دو کہ نہ اب ننگے

پاؤں سے چلیں گھر میں

اس فرش پہ مٹی کے

اب گھاس نہیں اُگتی

اب سانپ نکلتے ہیں

دیوار سے اور در سے

جھلے نہ بدن ان کا

اب دھوپ نہیں رکتی

اس ٹوٹی ہوئی چھت سے

اور خواب پکھلتے ہیں

اب آگ کی بارش سے

اب نور کی بوندوں سے

مہکی ہوئی مٹی میں

انمول اُجالے کے

وہ پھوں نہیں کھلتے

اب جھیل کنارے پر

مجھڑے بھی نہیں ملتے

بستی میں کوئی عورت

راتوں کو نہیں سوتی

اور جاگنے والوں سے

اب نغم نہیں ہوتی

کیا نغم لکھے کوئی

جب جاگنے سونے میں

پالینے میں، کھونے میں

جب بات کے ہونے میں

اور بات نہ ہونے میں

کچھ فرق نہ رہ جائے

کیا بات کرے کوئی؟

عزل

نیند میں اس طرح سفر ہوتا
سامنے خواب مختصر ہوتا
آنکھ ہوتی کسی نظر کی اسیر
دل کسی آرزو کا گھر ہوتا
اک ستارے کی سمت ہجرت تو
خاکداں سے کبھی بھر ہوتا
اجنبی دلیں کی ہواؤں سے
رشتہ چشم و بال و پد ہوتا
رات اور دن کی اس مسافت میں
کوئی اپنا بھی ہم سفر ہوتا
میں جیا کرتی اُس کے روز و شب
وہ مری عمر میں بسر ہوتا
اپنی ہستی کو بھول جاتی میں
وہ بھی دنیا سے بے خبر ہوتا
پاؤں رکھتے زمین اُپر پہ ہم
کوچہ ماہ سے گزر ہوتا
اُس سے کرتے شکایت دنیا
آساں غمگسار اگر ہوتا

عزل

کون کہا ہے فقیروں کو خزانے دیجئے
دور ہٹ جائیے، بس دھوپ کو آنے دیجئے
وقت کی شاخ سے ٹوٹے ہوئے گل برگ ہیں ہم
دور تک دوڑ بٹوا پر ہمیں جانے دیجئے
سنگ بستہ تو نہیں منزل ماضی پہ یہ دل
اور غم دیجئے اسے اور زمانے دیجئے
وانگی خواب ہے اور نیند نہیں ہے ابدی
اس مسافر کو کوئی اور ٹھکانے دیجئے
ختم ہو جاتا ہے اک روز، کوئی رشتہ ہو
دل کا کیا حال ہے؟ اس بات کو جانے دیجئے
عکس مہتاب سے یہ خواب چمک اُٹھے گا
آپ خاموش سے کائی تو ہٹانے دیجئے
روز و شب اور نئے، آج کے آئینے میں
لیکن اس دل کو وہی عکس پُرانے دیجئے
یہ بدن خاک میں رکھ لیجئے آرام کے ساتھ
ایسے شعلے کو اماؤں میں سولانے دیجئے

یاد آتے ہیں زمانے کیا کیا

(سفرنامہ/ یادداشتیں)

ماسکو: یادوں کا سیلِ رواں

زاہدہ حنا

ہمارا جہاز گھنے جنگلوں سے گھرے ہوئے ماسکو شہر پر اتر رہا تھا اور مجھے خواجہ احمد عباس اور ویلی پروٹن کی بنائی ہوئی فلم 'پردیسی' یاد آ رہی تھی۔ ہندوستان اور سوویت یونین نے یہ فلم 1957ء میں مل کر بنائی تھی۔ ہمارے شہر کراچی میں یہ شاید 1960ء میں دکھائی گئی اور مبینوں کے کچرے چارہ۔ 'زگس'، 'اچلا سچد یو'، 'پرتھوی راج کپور'، 'مل راج سہنی'، 'بھرت بھوشن' سب ہی برصغیر کی فلمی صنعت کے بڑے نام تھے اور انہوں نے اس میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ موسیقی اہل بسواس کی تھی۔ پدمنی کا رقص، 'تنگیشکر کی آواز'۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس فلم کی کیا دھوم تھی۔ یہ 15 ویں صدی میں ہندوستان آنے والے ایک روی سیاحت افنا سے نکلتی کی کہانی تھی جو ایک ہندوستانی لڑکی چمپ کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ روی سیاحت ایک تاریخی کردار ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ روس سے ہندوستان آنے والے پہلے شخص تھا۔ خواجہ احمد عباس نے 'پردیسی' کی کہانی لکھی تھی، یہ شاید پہلی رنگین فلم تھی اور اس بات نے بھی لوگوں کو بے اختیار سینما گھروں کی طرف کھینچا۔ اس فلم کو 1958ء میں فلم فیئر ایوارڈ ملا اور 1958ء میں ہی کا نر فلمی میسے میں گولڈن پام ایوارڈ کے لیے اسے نامزد کیا گیا تھا۔

ماسکو میٹروپورٹ پر اترتے ہوئے کتنی بہت سی باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ یہ خیال بھی آیا کہ جب 'پردیسی' ریلیز ہوئی ان دنوں قرۃ العین حیدر پاکستان میں تھیں اور آگ کا دریا لکھ رہی تھیں۔ ڈھائی ہزار برس میں سفر کرتی ہوئی اپنی ہیروئن کا نام انہوں نے شاید 'پردیسی' کی ہیروئن چمپ سے متاثر ہو کر رکھا تھا۔

روس اور برصغیر کے ادبی رشتے بھی یاد آ رہے تھے۔ 1788ء میں بھگود گیتا کا روسی ترجمہ شائع ہوا تھا اور یہ نکلنے کی کرا، زن تھے جنہوں نے کالی داس کا شاہکار 'شکستلا' روسی میں ترجمہ کیا اور لکھا کہ میرے نزدیک کالی داس ہومر جیسا عظیم ہے 'رگ وید' 'پنچ تتر' کتنا مہم تماہد کی زندگی پر لکھا جانے والا قصہ جو ہر بوز اسف، اور دوسری متعدد ہندوستانی کہانیاں جنہیں وقتاً فوقتاً روسی میں ترجمہ کیا گیا اور جن سے لیونٹا لٹرائی کو خاص دلچسپی تھی۔

ادب ملکوں اور قوموں کے بیچ ایک پل کا کام دیتا ہے۔ روس اور برصغیر کے ادیبوں نے بھی ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے کے سفر میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت ہم بھی ادب کی ڈور سے بندھے ہوئے، اسکو پہنچے تھے۔ بہانہ یہ بات نئی تھی کہ اردو اور ہندی جاننے والے روسیوں اور پاکستانیوں نے فیض احمد فیض کی پیدائش کے 100 برس پورے ہوئے کا جشن منانے کا فیصلہ کیا تھا اور پاکستان سے 6 ادیب اور شاعر اس میں شرکت کے لیے کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے بلائے گئے تھے۔

یہ جشن جس عمارت میں منایا جا رہا تھا اس کا برصغیر کی تاریخ اور اس کی اہم زبانوں اردو، ہندی اور سنسکرت سے گہرا تعلق ہے۔ ماسکو کی ایک پرسکون گلی میں نام جس کا روز ڈیس تو دنگوا ہے، پتھر کی وہ ٹھوس عمارت سر اٹھائے کھڑی ہے جس میں انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ہے، اسے رشین اکیڈمی آف سائنسز نے قائم کیا تھا۔ اس عمارت پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر بہت سادقت گزرا ہے۔ ہماری اسٹیشن ویگن عمارت کے پورٹیو میں داخل ہوتی ہے اور رک جاتی

ہے۔ جناب آئی اے رومن، فیض صاحب کی بنیاں سیدہ ہاشمی، منیرہ ہاشمی، ازبکستان کے مشہور اردو دانشور دانش مرزا انیسٹ جو سوویت یونین کے زمانے میں فرینڈ شپ ہاؤس کراچی کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں، جنہوں نے ازبک اردو ڈکشنری مرتب کی ہے اور چند ہفتوں پہلے حکومت پاکستان سے انہیں ایک بڑا اعزاز ملا ہے۔ کشور نامید، افتخار عارف، راحت سعید اور میں گاڑی سے اترتے ہیں اور اس عمارت کو دیکھتے ہیں جہاں آج سے نہیں دہائیوں سے پاکستانی اور ہندوستانی ادیبوں کی آمد و رفت رہی ہے۔ اسی میں دنیا کے دوسرے شہروں کی طرح فیض کی پیدائش کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔

انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سائنسز کا برصغیر کی زبانوں اور اس کے ادیبوں سے گہرا ناتا رہا ہے۔ یہ انسٹیٹیوٹ 1818ء میں زار نے سینٹ پیٹرز برگ میں قائم کیا اور اس میں سنسکرت، ہندی، اردو، فارسی، ترکی اور ایشیا کی دوسری زبانوں کی کتابیں اور محفوظے جمع کیے گئے۔ یہاں ایشیائی ملکوں کے 20 ہزار سے زیادہ کتب بھی رکھے گئے۔ 1918ء میں اس انسٹیٹیوٹ کے 100 برس مکمل ہوئے لیکن اس وقت زار، زارینہ اور ان کا خاندان قتل کیا جا چکا تھا۔ ان کے مملکت پر ان کے خاندانوں کا قبضہ تھا اور ہر طرف خفقان راج کرتی تھی۔ روس ایک عظیم انقلاب سے گزر رہا تھا اور اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ انسٹیٹیوٹ کا صد سالہ جشن منایا جائے۔ 1930ء میں جب انقلاب روس کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں تب ایشیاٹک میوزیم، بدھسٹ کلچر انسٹیٹیوٹ اور ٹرکولوجکل کینٹ نام کے تیس اداروں کو اس انسٹیٹیوٹ کا حصہ بنادیا گیا۔ 1950ء میں اسے سینٹ پیٹرز برگ سے ماسکو منتقل کیا گیا لیکن اس کا ایک حصہ آج بھی سینٹ پیٹرز برگ میں ہے۔

2011ء کا آغاز ہوا اور اردو کے اس شاعر کی پیدائش کو سو برس پورے ہوئے، جس نے عشق، انقلاب اور فارسی و اردو کے کلاسیکی سرہائے کو آمیز کرتے ہوئے اردو شاعری میں ایک نیا لہجہ ایجاد کیا۔ اردو کی ادبی دنیا میں ایک بالکل نیا عجیب گئی۔ ہندوستان، انگلستان، کینیڈا اور امریکا ہر طرف سے جشن فیض کے بلوائے آئے گئے۔ روسی بھوکوں پیچھے رہتے۔ ماسکو تو یوں بھی فیض صاحب کا دوسرا گھر تھا۔ ہمیشہ سوسائٹی، انجمن فروغ اردو کی طرف سے بلوائے گئے تھے اور اس جشن فیض کی روح رواں فروغ اردو ماسکو کی صدر لہ میلادوی ہوا، اس کی نائب صدر اور ڈائریکٹر آف ریسرچ، میں اردو پروفیسر گرام کی پروڈیوسر ایرینا میکسی میلو، پروگرام کو ریڈیو فیض ظہیر اللہ خان اور پاکستان سوسائٹی کے صدر عامر عقیل فاروقی تھے۔

ماسکو ورینٹیل انسٹیٹیوٹ میں فیض کے صد سالہ جشن میں حصہ لیتے ہوئے مجھے یہ بات بار بار یاد آئی کہ انیسویں صدی میں ہندوستان کے سندھی تاجروں کا سفر کرتے تھے اور ان کی بڑی بڑی تجارتی کونھیاں وہاں موجود تھیں۔ روس نے جب 1870ء میں سمرقند، بخارا اور تاشقند کو فتح کر کے اسے روسی سلطنت کا حصہ بنایا تو کھیم چند اینڈ سنز، وی مل آ سونز جیسی ہندوستانی تجارتی کمپنیاں جو امریکا، شرق وسط، چین اور افریقا سے تجارت کرتی تھیں، وہ کروڑوں روپے اور لاکھوں پونڈ کا سامان تجارت روسی شہروں میں فروخت کرتی تھیں۔ تین شکار پوری تاجر ایسے تھے جنہوں نے تاشقند میں اپنی اپنی کارواں سرائے قائم کر رکھی تھیں۔ آج کی زبان میں یہ کہہ لیجئے کہ انہوں نے Motel کھول رکھے تھے۔ تاشقند، سمرقند اور بخارا آج رشین فیڈریشن کا حصہ نہیں لیکن دو دہائیوں پہلے یہ سب سوویت یونین کی قلمیں میں شامل تھے جس کے کئی شہروں میں فیض صاحب کے نقش قدم دیکھے جاسکتے ہیں۔ انیسویں صدی میں روس اور ہندوستان کے یہ تجارتی تعلقات انیسویں صدی آتے آتے دور دور تک پھیل گئے ہیں اور آج کے ماسکو میں پاکستان، ہندوستان اور روس کے بیچ تجارت، سفارت، ثقافت کے پہلے سے کہیں زیادہ گہرے رشتے قائم ہو چکے ہیں۔

ماسکو کی گلیوں میں گھومتے ہوئے میں یہی سوچتی رہی کہ ہمارے وہ سندھی تاجر جن کی اکثریت حیدرآباد سندھ

اور شکار پور سے تعلق رکھتی تھی، وہ کب کے ختم ہوئے لیکن آج ہندوستانیوں کی نئی نسل 'مہاراجا' 'دیوی کیٹے' اور 'تاج محل' میں ساؤتھ انڈین کھانے، ویجی میرین تھلی اور مقلیٰ کھانے پیش کرتی ہے۔ ان ریستورانوں نے اپنے شیف ہندوستان سے بدئے ہیں۔ ان کے مالک اور شیف روبل کھاتے ہیں اور گھر بھیجتے ہیں جب کہ ماسکو میں رہنے والے ہندوستانیوں، پاکستانیوں اور روسیوں کو چٹ پٹے کھانے ملتے ہیں۔ 1880ء اور 1890ء میں حیدرآبادی اور شکار پوری کارواں سرانے میں جانے کیسے کھاتے ملتے ہوں گے؟

وہاں جانے والوں کی اکثریت ان ہندوستانیوں کی ہوگی جو تاشقند میں آوکی بھاجی اور پوریوں کو یا سا بھر اور اڈی ڈوسا کو ترستے ہوں گے۔ تاشقند والے بنیادی طور پر گوشت خور تھے اور گوشت خور بھی ایسے کہ وہ بنے کو ذبح کرنے کے بعد اس کا پیٹ چاک کر کے اور اسے صاف کر کے اس سوچے رہنے میں چاول، بادام، پستے، کشمش اور کاجو بھر کر اسے تانت سے سی دیں اور پھر اس (مرحوم و مغفور) کو زمین میں دفن کر کے اس پر مٹی کا لپ کر دیں اور اس پر الاؤ جلا دیں۔ مرحوم و مغفور ذنب زمین کے اندر شکم میں بھرے ہوئے چاول اور میوؤں کے ساتھ اس آنچ سے دو تھیمے دو تھیمے پکتے رہے درودن بعد نکال کر مہمانوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ہائے بے چارے ہمارے حیدرآبادی اور شکار پوری تاجر جو کاروبار کی ڈور سے بندھے ہوئے تاشقند اور سرقتند بخار چھپے جاتے تھے جن کے ساتھ ان کی دھڑ پتیلیں نہیں ہوتی تھیں جو انہیں گرما گرم کچوریاں تل کر کھلاتیں اور اس کے ساتھ تازہ بنریاں پکا کر ان کے سامنے پرستیں۔ وہ کارواں سرانے نہ کھولتے تو اور کیا کرتے؟ آج جس طرح ماسکو کے 'مہاراجہ' اور 'تاج محل' والے دلی اور ممبئی سے شیف منگواتے ہیں۔ اسی طرح 1880 اور 1890ء کی دہائی میں یہ لوگ روسیا (بادرچی) حیدرآباد اور شکار پور سے بدتے ہوں گے اور کیوں نہ بلاتے کہ انسان کہیں بھی چد جائے، اس کے ہاتھ سے کھلائے جانے والے نوالوں کے ذائقوں کو کہاں بھولتا ہے۔ اور فیکل انٹیلیٹ میں فیض سیمینر میں شریک ہونے والوں کے یہ روزانہ دو پہر کا کھانا ایک ہندوستانی ریستوران سے آتا رہا اور رات کی پُر تکلیف ضیافتیں ان پاکستانی ریستورانوں میں ہوتی رہیں جو یہاں سے چاکر ماسکو میں آدو ہو جانے والے پاکستانیوں نے کھولے ہیں۔

انٹیلیٹ میں سنسکرت، اردو اور ہندی کی ماہر خواتین کے کردوں میں کہیں مہتما گاندھی کی تصویر ہے اور کسی تصویر میں مسز اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی مسکراتے ہیں۔ یہاں روسی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اردو، ہندی اور سنسکرت سیکھتے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان کی تاریخ کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔ ریڈیو ماسکو سے اردو ہندی کے پروگرام نشر ہوتے ہیں اور پاکستان اور ہندوستان میں سننے والوں تک پہنچتے ہیں، یہ پروگرام روسی ادیبوں، سائنسدانوں، فلم سازوں اور موسیقاروں کے بارے میں ہوتے ہیں، اس کے علاوہ سیاہی بجزیے اور تبصرے بھی چلتے رہتے ہیں۔

اس پروگرام کے دوران مجھے فیض صاحب کا ایک پرانا انٹرویو یاد آیا جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ عام رائے یہ پائی جاتی ہے کہ روس میں انقلاب سے قبل زوردار قسم کا ادب تخلیق ہوا لیکن انقلاب کے بعد روسی ادب میں وہ جان اور آب و تاب نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی پڑھنے والوں میں انقلاب سے پہلے کے ادب کی بہت پذیرائی کی جاتی ہے۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ 'یہ حقیقت ہے کہ روسی کلاسیکی ادب زیادہ جاندار ہے اور روس میں انقلاب سے پہلے بہت بڑے دیب ہوئے ہیں جن میں ٹالسٹائی، دوستوویسکی اور چیخوف جیسے ادیب شامل ہیں۔ لیکن انقلاب کے بعد بھی گورکی، شووخنوف اور پسترناک جیسے بڑے ادیب پیدا ہوئے اور جہاں تک انقلاب سے پہلے کے روسی

ادب کا تعلق ہے تو کسی ادیب کی تحریر کو پسند کرنا ایک ذاتی معاملہ ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو ایک ادیب پسند آئے اور مجھے وہ پسند نہ آئے۔ انقلاب سے پہلے کا ادب احتجاج اور بغاوت کی نمائندگی کرتا ہے۔ نئے روسی ادیبوں کے نزدیک یہ بات زیادہ اہم ہے کہ وہ تمام لوگوں تک اپنی آواز پہنچائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا پہلا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام عوام کو اس قابل بنائیں کہ وہ کل نیکی ادب سے استفادہ کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں اچھا ادب پڑھنے والا طبقہ پیدا ہوگا۔ ایک معاشرے میں صرف ادب کی ہی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ پڑھنے والے طبقے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سماج میں زیادہ لوگ ادب کو سمجھ سکیں گے وہاں ادیب بھی معیاری ادب لکھیں گے۔ ایسے حالات میں جو ادب پیدا ہوگا وہ زیادہ بلند ہوگا۔

اس سیمینار کے دوران فیض صاحب کی زندگی اور شاعری پر کئی پرچے پڑھے گئے۔ میزبان نے فیض کی زندگی پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے، وہ اس سیمینار میں دکھائی گئی۔ اس فلم میں 47 سے پہلے کے اس دنوں کی جھلکیاں بھی تھیں جب فیض امرتسر کے کالج سے وابستہ تھے، اسی زمانے میں پروگرامر نرژ، بیسوی ایشن کی سرگرم ادیب ڈاکٹر رشید جہاں نے ان کی ردانوی شاعری سن کر ان سے کہا تھا کہ عشق و محبت کی شاعری تو سب ہی کرتے ہیں لیکن تم اس سے آگے بڑھ کر انسانوں کے دکھ درد کو اپنی شاعری میں سمو، تب ہی وہ انسان سے عشق کی شاعری بنے گی۔

ڈاکٹر رشید جہاں جس کی کہانیاں انگارے میں شامل تھیں وہ ہندوستان میں اردو کے ادیبوں کو جھنجھوڑنے میں کامیاب رہیں۔ ہندوستان بھر کے مسووی ان پر کفر کے فتوے لگاتے رہے، انہیں قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں، مقدمہ چد انگارے ضبط ہوئی لیکن ڈاکٹر رشید جہاں نے اپنی روش نہ بدلی۔ فیض صاحب نے اس بات کا بار بار اعتراف کیا ہے کہ علی گڑھ کے شیخ عبداللہ کی باغی بیٹی رشیدہ جہاں ان کی شاعری اور زندگی کا دھارا بدل گئیں۔ ڈاکومنٹری میں بھی اس بات کا ذکر ہے اور ان رشتوں اور محبتوں کا تذکرہ ہے جو ہندوستان کی تقسیم سے پہلے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان تھے۔ اس فلم کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں ڈاکٹر رشید جہاں کی یاد چٹکیاں لیتی رہی جنہوں نے فیض کی شاعری اور زندگی کا رخ بدل دیا تھا اور جب کینسر میں مبتلا ہوئیں تو سودیت حکومت نے انہیں ہندوستان سے ماسکوا آنے کی دعوت دی لیکن ان کی موت مالی نہ چاسکی، انہوں نے آخری سانس ماسکوا میں لی اور دہائیوں سے دیودرا اور صنوبر کے چٹروں، سرسبز پودوں اور سرخ و سفید پھولوں کے سائے میں گورستان پر و نسکی میں آرام کرتی ہیں۔

فیض صاحب کے حوائے سے کچھ باتیں میں نے بھی کیں۔ میرا کہنا تھا کہ ماسکوا شہر میں فیض صاحب کو یاد کرنا ایک ورہی مفہوم رکھتا ہے، ماسکوا ان کا دوسرا گھر تھا۔ یہاں انہوں نے دنیا بھر کے ادیبوں کے ساتھ مل کر دھومیں مچائیں، ایشیا، افریقا، لاطینی امریکا اور ساری دنیا کے لیے کیسے حسین خواب دیکھے، امن اور آزادی کے خواب۔ ہمارے ادیبوں میں یہ وہی تھے جو پاپونزودا، شولو خوف، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور دنیا کے نامور ادیبوں کے ساتھ مل کر امن و دوستی کی دھمک کو اپنے اشعار سے سجاتے اور سنوارتے رہے۔

فیض خواب دیکھنے اور دکھانے والوں کے اس قہر سے تعلق رکھتے تھے جو متحرک تھا اور کچھ کر گزرتا چاہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ امن کا مسئلہ انصاف، مساوات، آزادی اور اجتماعی خوشحالی سے جڑا ہوا ہے۔ کسی بھی خطے کے ناراض لوگوں کو سماجی انصاف، مساوی مواقع اور من سب روزگار، عزت نفس اور تحریر و تقریر کی آزادی فراہم کیے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ اس نکتے سے آگاہ تھے اور اسی لیے ان تمام سیاسی معادلات کو اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے رہے کہ انقلاب اور آزادی نے ایک پرہیزگار روپ دھار کر ہر گھر کا پھیرا لگائے گی اور محروموں اور مجبوروں کو چین آرام سے آٹھ کرے گی۔

انسانیت پرستی فیض کے بدن میں لبہ کی طرح گردش کرتی تھی۔ 1947ء میں پاکستان وجود میں آیا تو اس کا جشن منانے کی بجائے انہوں نے وہ سول اٹھایا جو آج تک قائم ہے۔ ان کی نظم 'جشن آزادی' نے فیض کی شاعری اور زندگی کو وہ رخ دیا جس نے انہیں لوگوں کا محبوب و مطلوب بنادیا۔ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے کشت و خون نے انہیں اپنی بنیادوں سے ہلادیا۔ 14 اگست 1947ء کی رات لاہور کی سڑکوں پر انہوں نے امان طلب کرتی ہوئی ایک بے نوا، بے آسرا عورت کا رقص نقل ہو رہا تھا۔ انسانیت کی اس توہین پر ان کے کچ لب سے وہ نوحہ پھوٹا جس میں انہوں نے داغ داغ اچالا و شب گزیدہ سحر کی بات کی۔ چراغِ سر راہ کی بے خبری، گرانی شب میں کمی اور نجارت دیدہ دل کی گھڑی نہ آنے کا گلہ کیا۔ ان کی اس نظم 'جشن آزادی' کے پسے چند سامعین میں سے ایک ان کے عزیز دوست آئی اے رحمان تھے جو 62 برس گزر جانے کے بعد ماسکو میں ہونے والی فیض کی یادگیری کی اس محفل میں موجود تھے۔ رحمان صاحب بتاتے ہیں کہ مذہب کے نام پر اپنے ہی گھر، اپنے ہی شہر میں بے امان ہو جانے والی عورت کا نام فیض کو معلوم بھی نہیں تھا۔ ان کا یہ نالہ 'دس گیر' اس وقت کے حکمرانوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ 'سوریا' کا وہ شمارہ جس میں ان کی یہ نظم شائع ہوئی تھی، ضبط ہوا اور اس کی اشاعت پر 6 مہینے کی پابندی لگی۔ ریاستی حقوق میں فیض ایک ناپسندیدہ شخصیت ٹھہرے۔ آئی اے رحمان صاحب کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر اپنے ہی گھر، اپنے ہی شہر میں بے امان ہو جانے والی عورتوں کی آہ و بکا نے فیض کے ضمیر کو اس طور مہمیز کیا کہ پھر ان کی شاعری کا حجاجی اور، نقلی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔ ان کی نظمیں شاہان وقت کے طبع نازک پر گراں گزرتی رہیں اور وہ ایک کے بعد دوسرے امتحان سے دوچار ہوتے رہے۔ ان کا قامت لوگوں کی نظروں میں بند ہوتا رہا اور سرکار انہیں پابند سلاسل کرنے کے بہانے ڈھونڈتی رہی۔ آخر کار وہ پنڈی سارڈس کیس میں گرفتار ہوئے اور سولی کے سائے میں انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ساہا سال بسر کیے۔

یہ نظم جس نے فیض کی تخلیقی راہ کا تعین کیا، اسی کے بعد تیرا زام ان کے سینے میں ترازو ہوتے رہے اور سنگ و شام ان کے وجود کو لبورنگ کرتے رہے۔ وہ خود اپنے شہر میں پابہ جوار چلے۔ وہ ہمارے ان گئے چنے دل نگاروں میں سے تھے جو یہ کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے کہ پھر ہمیں قتل ہوتا کیس، یا رو چلو۔

مشرقی پاکستان نے ہمارے ظلم و ستم کے سبب ہم سے منہ موڑا تو یہ فیض تھے جو بنگالیوں کو دوسروں کی طرح غدار کہنے کے بجائے اپنے یاروں کی سلامتی کے لیے بے قرار ہوتے رہے۔ اس فکر میں سرگرداں رہے کہ کس کس کے نام بچھ گئے ہیں۔ ان یارانِ دمدار کا ماتم کرتے رہے جن سے جشنِ رنگ و نغمہ تھا، ان گلوں کے لیے گریہ کرتے رہے جو سر شاخِ جل گئے تھے، ان چراغوں کو یاد کرتے رہے جو تہِ دم بچھ گئے تھے۔ شاعری قلعے میں محبوتوں کے امتحان سے گزرنے والے دریدہ دامنوں کے لیے نکھی جانے والی وہ نظم جس کا نام 'شورشِ زنجیر' بسم اللہ ہے، اس میں بسم اللہ کی بکراہم سے کیا نہیں کہتی اور پھر ان کا یہ کہنا کہ 'سیرِ مقتلِ چلو بے رحمتِ تقصیر بسم اللہ' ستم کے دفتر بیان کر دیتی ہے۔ وہ گوشہٴ نقس میں فصلِ گل کا ماتم کرتے رہے اور انہیں وطن گساروں کی مشیتِ خاک جگر بار بار یاد آئی۔ ہم جب قدم قدم فوجی راج کی طرف بڑھ رہے تھے، اس وقت فیض کوئے جاناں کی خاک پر اپنے وگوں کے روشن لبہ کے چھڑکاؤ کی گھڑی سے ڈر رہے تھے۔ آنے والے دنوں کے تلخ ترا امتحان کے بارے میں پکار پکار کر خبردار کر رہے تھے۔

ان کی شاعری میں درد کا رنگ ہے اور انہیں کوئی لمحہ تسکین نظر نہیں آتا تب ہی وہ دل زدہ ہو کر کہہ اٹھتے ہیں کہ "دل اداس بہت ہے"۔ اور پھر جب فوجی راج قائم ہو گیا وطن کے سر دھمکے محبوت گاہوں میں، رار پر کھینچے جانے لگے تو

انہوں نے ہر جانب مچنے والے بہرام کو اشعار میں ڈھال دیا۔ فیض نے جو زندگی گزاری اس کے بارے میں انہوں نے 1959ء میں کہہ دیا تھا ”یہ ہمیں تھی جن کے لباس پر سر رہ سہی لکھی گئی۔“ انہیں اور ان کے ہم قیدیہ وگوں کو شہر یا روں نے جو زخم دیے ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے اختیار کہہ اٹھے ہیں کہ گلشن میں پھول کھلیں یا نہ کھلیں ہمارے زخم تو کھل اٹھے ہیں۔

درد کے سمندر کی شنواری میں جو موتی و سر جان فیض کے ہاتھ آئے وہ ان کی شاعری کو گنج گرب ماہ بنا گئے۔ آزادی کے لیے بے قراری، وطن سے جدائی اور جلا وطنی کسی ایک فرد یا ایک قوم کا تجربہ نہیں۔ اپنے اپنے زمانے اور اپنی اپنی زمینوں میں ہزاروں برس سے دنیا کے اہل گنت انسان اس کرب سے دوچار ہوئے ہیں۔ ابراہام مصر کی تعمیر کرنے والے پاپہ زنجیر خدایوں کی پشت پر پڑنے والے چاکوں کی اذیت اور پاکستان، ہندوستان، ویتنام، کوریا، فلسطین یا کسی بھی دوسری سرزمین پر غلامی اور بے توقیری کے چابک سے ہولہاں ہونے والوں کا درد اور ان کے سینوں میں طیش کے اٹھتے ہوئے آتش فشاں کی حدت ایک جیسی ہے۔ فیض کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے ان معاملات کو کسی ایک زمانے یا کسی ایک زمین کے لوگوں تک محدود نہیں کیا، اسے گزرے، گزر جاے اور آنے والے زمانوں پر پھیلا کر دیکھا اور اسی لیے اس کی شاعری دل پر درد پر شبنم کی طرح پگھلتی ہے اور آزادی کے طلب گاروں کے لیے رجز بن جاتی ہے۔ ذہنوں میں، نقاب کاشت کرتی ہے۔ ان کی انقلابی شاعری کو کئی کئی کاں میں لگنے والی آگ کی طرح ہے جو نظر نہیں آتی، زمین کی گہرائیوں میں اندر ہی اندر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اس کی تپش سے دھرتی کا سینہ ترختے لگتا ہے اور اس پر فرعون بن کر چلنے والے غاصبوں کے کھوے جل اٹھتے ہیں۔

ان کی شاعری انسانی درد کے رنگ میں جس طرح رنگی گئی، اس کا اشارہ فیض کے اس خط میں بھی ملتا ہے جو انہوں نے جیل سے اپنی شریک حیات ایلس کے نام اپنے بھائی کے، تقال کے چند دنوں بعد لکھا ”اسی ہی کسی صبح اسی چاند نے اس جگہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک تنہا مسافر کو پکارا تھا اور اسے کسی نامعلوم دنیا میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وہ مسافر میرا بھائی تھا۔ شاید اس وقت بھی چاند ایسے بہت سے چہروں پر چمک رہا ہے جو مر کر درد سے آزاد ہو چکے ہیں۔ کوریا کے کیمپوں میں محبوس قیدیوں کے چہرے بھی، یہ سب مقتول نوجوان بھی میرے بھائی تھے کہ جب وہ زندہ تھے تو، ایسی دور دراز سرزمینوں پر زندہ تھے جو میں نے نہیں دیکھیں لیکن وہ میرے تن میں زندہ تھے اور میرے لبوں میں ان کا لبو بھی شامل تھا۔ جن قاتلوں نے انہیں قتل کیا، انہوں نے میرے تن کا کوئی حصہ بھی سہمت نہیں چھوڑا ہے اور میرا بھی لبو بہا دیا ہے۔“

تہائی کا ایک رنگ ذاتی اور ایک آفاقی ہوتا ہے۔ فیض تہائی کے آفاقی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ذاتی تہائی کی توسیع انسان کی آفاقی تہائی میں کی۔ انسانی تہائی کا سب سے طمانہ رنگ جلا وطنی ہے۔ انہوں نے جلا وطنی جیسی اور اسے ”دل من، مسافر من“ میں اردو کا بیش قیمت شعری سرمایہ بنا دیا۔ ان کی شاعری کے اس پہلو پر یوں غور بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن روپی و نشور اور فیض فہم زاکٹر لڈ میلاوی یوانے اس کی ایک اور طرح تفسیر و تشریح کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں ”مرے دل مرے مسافر“ میں ایک ہم موضوع تہائی کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں فیض کی ساری نظمیں اور اشعار یاد آتے ہیں۔ سب سے پہلے نقش فریادی کی تہائی، پھر کوئی آید و زار نہیں کوئی نہیں۔ اس میں بھی تہائی کے بارے میں خود کلامی ہے۔ لیکن ”مرے دل، مرے مسافر“ میں تہائی کی قطعی دوسری کیفیت ہے۔ یہ گہر کی چار دیواری میں بند کردار کی تہائی نہیں بلکہ ہجوم میں اور آباد شہروں میں بھٹکنے والے انسان کی جان و تہائی ہے۔“

فیض کے رخصت ہو جانے کے بعد جو رات آئی تو میں نے سوچا کہ فیض صاحب کو اگر ان کے بدن سے الگ

کر کے ان کے ذہن ان کی روح کو کسی شے میں محفوظ کر لیا جاتا تو وہ شیشہ قوس قزح کے تمام رنگوں 'جگنوؤں کی چمک' خوشبوؤں کے غبار اور سات سروں کی پھوار سے بھر جاتا۔

انہوں نے ابتداء سے انتہا تک زندگی اسی خواہش میں گزار دی کہ وہ تمام انسانوں کا ہاتھ تھام کر اس طلسمی دروارے سے گزر جائیں جو امن و سلامتی کی راہدہانی میں کھلتا ہے اور بقول ان کے جہاں 'امن' گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دہن کا آنچل اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم ہے۔

فیض کی شاعری میں انسان پرستی، امن دوستی، تنہائی، جلاوطنی اور سینہ دکاری کے موسموں کی بات کرتے ہوئے ہیں، اسکو کی فضاؤں میں تیرتی ہوئی ان پھووس کی خوشبو کو یاد کرنا چاہتی ہوں جو چند دن پہلے 12 اپریل کو دیوار کریمین کے سائے میں دنیا کے پہلے خلا نورد انسان یوری گگارین کی لوح مزار پر رکھے گئے۔ جس طرح نگوں کی خوشبو یہاں کی فضاؤں میں تیرتی ہے اسی طرح فیض کے وہ جیلے ماسکو کے درودیور پر اور یہاں کے گل و گلزار پر اپنے لب رکھتے ہیں جو انہوں نے روس کی اس شاندار کامیابی کے 2 برس بعد لیمن امن انعام لیتے ہوئے کہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا

"آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا سے اپنی ہی دنیا کا نظارہ کرتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کیمتکیاں، خور غرضیاں، زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹ لینے کی کوششیں اور انسانوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔ فیض نے کہا تھا کہ اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا کے خزانے انسانی بس میں آ سکتے ہیں تو ہم کیوں نہ جنگی اڈے سمیٹ لینے، بم، راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دینے کی باتیں کریں۔ ایک دوسرے پر قبضہ جانے کے بجائے تسخیر کائنات کے سفر پر نکلیں جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں، جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں، جہاں لامحدود فضا میں ہیں اور ان گنت دنیا میں۔"

فیض چلے گئے ہیں لیکن اس کو یاد کرنے کا اس سے خوبصورت رنگ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اور ہمارے بعد آنے والے انسانیت کی فتح یابی کی سعی پیہم کریں۔

جشن کے آخری دن فیض کی بنائی ہوئی فلم 'جاگو ہوا سویرا' دکھائی گئی، پاکستان میں یہ فلم عرصہ دراز سے ڈیو میں بند ہے اور سویرا ابھی تک نہیں ہوا۔ فیض کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو ہمیشہ انسان دوستی اور امن پسندی کی بات کرتے رہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ جس طرح کا تناؤ تھا، وہ ان کو دکھ دیتا رہا۔ بدترین حالات میں بھی وہ اچھے دنوں کے خواب دیکھتے رہے۔ انہیں جب بھی موقع ملا انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا اور اپنے ان پرانے دوستوں سے ملے رہے جو ان کی طرح دونوں ملکوں کے بیچ امن کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ ان میں کرشن چندر اور علی سردار جعفری تھے، ان میں راجندر سنگھ بیدی اور کیفی اعظمی بھی تھے۔

اس موقع پر مجھے قرۃ العین حیدر کا روس کا سفر نامہ یاد آ جاتا ہے اس میں انہوں نے ادیبوں کی اس کانفرنس کا ذکر کیا ہے جس میں دنیا کے 34 ملکوں کے 120، ادیب اور مختلف زبانوں کے مترجمین شریک ہوئے۔ قرۃ العین حیدر اس کانفرنس کے آخری دن پہنچ سکی تھیں، اپنے سفر نامے میں فیض صاحب سے ملاقات کا ذکر وہ یوں کرتی ہیں:

'بانک کے کنارے شاہ بوٹا اور صنوبروں میں گہری شاندار الٹرا ماڈرن عمارت 'رائٹرز ہوم' باغ میں سیاہ روم کے تختے، ایک وسیع ہال جس کی تین طرف کی دیواریں پلیٹ گلاس کی ہیں۔ کانفرنس کا آخری اجلاس بھی ختم ہونے والا تھا، فیض صاحب بیضوی میز کے سرے پر چرچی کری پر بیٹھے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے، مجھے دیکھ کر حسب

عدوت بڑے اطمینان سے کہا 'ارے بھائی تم بہت دیر میں آئیں۔'
'آداب فیض صاحب اور کون کون کیا ہے پاکستان سے؟'
'ہم آئے ہیں۔ کیا ہم کافی نہیں؟'

'میں اپنے نام کی تختی کے سامنے دی کرسی پر جا بیٹھی، سامنے قطب شاہی کا سرخ سورج بہت نزدیک سے میرے
جھانک رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، اس وقت شام کے چھ بجے تھے، آج صبح چار بجے میں دلی میں تھی، سچ میں تین چار گھنٹے
ماسکو میں ٹھہرتے ہوئے شام کے چھ بجے ملک بیٹھو یا۔ ایک زمانہ ایسا گئے گا جب زمیں کی طنائیں کھینچ جائیں گی، سورج سوانیزے
پر اترے گا، ابد کا بول بال ہوگا اور بھائی بھائی کونہ پیچھے گئے گا۔

'بنگلہ دیشی ادبا کی قطار فیض صاحب کے مقابل میں بیٹھی تھی، ان کے قائم نے اپنی طویل تقریر جاری رکھی۔
ملیالم مصنف پلے کے نزدیک بنگلہ دیشی خاتون بیٹھی تھیں، نیلی کار چوٹی ساڑی، بڑا سا جوڑا، ماتھے پر سرخ بندی، نام بدر
النساء عبداللہ کے بعد ازبک، تاتار، تاجیک، منگول، کرغز اور روسی ادیب لوگ، بنگلہ دیشی لیڈر ڈاکٹر مظہر اسحاق کی تقریر
کے بعد پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے، چین امن و مفاہمت کی اشد ضرورت پر ایک مختصر بھاشن فی، بعد یہودیہ کے سیسے میں
نے سامنے رکھا ہوا مائیک قریب کھسکا یا، فیض صاحب بدستور مہاتما بدھ کی طرح جینٹے سگریٹ پیتے رہے۔

فیض صاحب کی باتیں اور یادیں ہمارے ادیبوں کی کتابوں سے رنگ برنگ کے ریشمی دھاگوں اور فیتوں کی
طرح نکلی چلی آتی ہیں۔ یہ روسی اور دوسری زبانوں کے ادیب تھے جن سے ماسکو میں فیض صاحب کی رسم درہ رسی۔ فیض
نے صرف رسول حمزہ توف کی شاعری کا ہی ترجمہ نہیں کیا۔ بسلائی شوشن کے افسانے اور چنگیز آہتما توف کی کہانیاں اور
ناولٹ فیض نے اردو میں ترجمہ کیے۔ سوویت ادیبوں کی چھٹی کانگریس میں شریک ہوئے تو مرزا قورن رادو، زلفیہ خانم،
گولائی ٹکونوف، ہاشمین سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔

فیض کی زندگی میں جس روسی ادیب نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ مریم سلگنیک تھیں۔ فیض نے 1971ء
میں شائع ہونے والا مجموعہ 'سر وادی سینا' مریم کے نام سے معنون کیا۔ وہ اپنے روسی اور ہندوستانی دوستوں میں 'میرا' کے
نام سے مشہور تھیں۔ روسی ان کی، وری زبان تھی۔ انگریزی کے علاوہ انہیں اردو اور ہندی پر بھی مکمل عبور تھا۔ مدد میدا سیلا
نے اپنی کتاب 'پرورش لوح و قلم' میں ان کے ور فیض کے ادبی اور دوستانہ مراسم کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
یہ مریم تھیں جنہوں نے فیض کو روسی قارئین سے روشناس کرایا۔

لینن امن انعام ملنے کے بعد فیض کی اس ملک کی مختلف ریاستوں میں بے حد شہرت اور توسیع ہوئی اور فیض جو
پہلے ہی سوویت یونین میں ایک نئے سماج کی تعمیر سے بے حد متاثر تھے، ان کی اس سے وابستگی میں کچھ اور اضافہ ہوا۔
مدد میدا سیلا نے اپنی کتاب میں اس حوالے سے ایک نازک نکتہ اٹھایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ

'روس میں فیض کے دوستوں میں سوویت نظام سے ناخوش نوجوان ادیب اور شاعری تھے جو شکایت کے انداز
میں ان سے پوچھتے تھے کہ کیا ان کو سوویت سیاست اور سماجی زندگی میں کوئی خامی خرابی نظر نہیں آتی ہے؟ فیض عام طور پر
اس نوعیت کی بحثوں میں نہیں پڑتے تھے۔ لیکن شاید یہ اندازہ لگانے میں غلطی نہ ہوگی کہ دوسرے ملک کے متعدد فنکاروں
کی طرح جن کو اشتراکی نصب العین عزیز تھے فیض بھی دنیا میں انصاف اور نیکی پر مبنی سماج کی کامیاب تعمیر پر یقین رکھتے تھے
اور اپنی سماجی و سیاسی امیدوں کو بے شک سوویت یونین سے ہی وابستہ کرتے تھے۔ وہ سوویت ملک کی ہر طرح کی غلطیوں

اور خامیوں پر آنکھیں بند کرنے کو تیار تھے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ سوویت یونین جس راہ پر اپنی مشترک منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے وہ نہایت دشوگر گزار رہا ہے اور اس راہ پر آگے چلنے والوں کے لیے کسی عطف قدم کا جواز بھی ہے اور اس کی بس اصلاح کی ضرورت ہے۔ فیض کے بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ بھی نظر آتا ہے۔

مثال رینہ منزل بکار شوق آیا ہر اک مقام پر ٹوٹی جہاں جہاں یہ کمد
یہ غزال 1970ء میں ماسکو میں ایک نوجوان 'باغی' شاعر سے ملنے اور ان کی شکایتیں سننے کے بعد لکھی گئی۔ کمد ٹوٹ جانے سے شاعر کی مراد روسیوں کی غلطیوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ یوں ملتا ہے کہ فیض اپنے اشعار کے ذریعے اپنے سوویت دوستوں کی بھی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

لینن امن انعام یافتہ ہونے کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد سے فیض اکثر سوویت یونین آنے جانے لگے۔ (اس انعام کا سرکاری نام تھا 'قوموں کے درمیان امن کی استواری کے صلے میں لینن انعام')۔ سوویت اعتبار سے یہی سب سے اعلیٰ امتیاز تھا جو یہاں کسی غیر ملکی شہری کو میسر ہو سکتا تھا۔ اب فیض کے لیے سوویت ملک کے دروازے پوری طرح وا ہو گئے۔ ان کو سب سوویت رہنماؤں میں جگہ جگہ جانے کا اور زیادہ قریب سے یہاں کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع میسر آیا۔ عام طور پر باہر سے آنے والے مہمانوں کو سوویت ملک کی زندگی کے پس پردہ جھانکنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ فیض ان میں سے ایک تھے۔ بے شک وہ، سوویت زندگی کے اس حقیقی پہلو کو بھی دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جو غیر ملکی مہمانوں سے چھپا ہوا تھا۔ لیکن لگتا ہے کہ اس کے باوجود بھی وہ بنیادی طور پر سوویت ملک کو بقول روسیوں کے 'گلابی چشمہ لگا کر' کافی عرصہ تک دیکھتے رہے۔

یہ وہ معاملات تھے جن پر فیض کے اس جشن صد سالہ میں کون گفتگو نہ ہوئی ور شاید، ابھی نہیں سکتی تھی۔ مد میڈا نے فیض کی آنکھوں پر اس گلابی چشمے کا سبب یوں بیان کیا ہے کہ فیض بھی (بعض دوسرے بائیں بازو والوں کی طرح) سمجھتے تھے کہ سوویت نظام کے خلاف ہونا سامراج مخالف اور عالمی امن تحریکوں اور 'تیسری دنیا' کے ملک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

فیض سوویت یونین کے انہدام کا عظیم صدمہ اٹھانے سے پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے اور دنیا اس طرح مقرب ہوئی تھی کہ ان لوگوں کی پہچان میں بھی نہیں آتی تھی جو اسی نظام کے ڈھالے اور پالے ہوئے تھے۔

فیض کے جشن صد سالہ کا ایک حصہ روس اور پاکستان کے تعلقات پر گفتگو کے لیے مخصوص تھا، اس کا اہتمام انسٹیٹیوٹ اور پاکستانی سفارتخانے کی طرف سے کیا گیا تھا۔ چند دنوں بعد صدر پاکستان روس کا دورہ کرنے والے تھے، اس حوالے سے تجارت، ثقافت اور سیاست میں تعلقات کو زیادہ وسیع اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی باتیں ہوئیں، ایک تجویز یہ بھی دی گئی کہ ماسکو کی یونیورسٹی جو اب فرینڈ شپ یونیورسٹی کہلاتی ہے۔ اس میں فیض چیئر قائم ہو، کچھ کا کہنا تھا کہ اس کا اہتمام انسٹیٹیوٹ کو کرنا چاہیے۔

تقسیم سے پہلے اردو کے متعدد ادیبوں نے روسی ادب کے تراجم کیے تھے اور پھر ماسکو میں جب بدیسکی زبانوں کا کتب گھر قائم ہوا اور ترجموں کا اہتمام ہو تو اس گنت روسی ناولوں کے ترجمے ہوئے اور وہ ناول ان دنوں بھی کراچی، لاہور اور دوسرے شہروں میں دستیاب رہے جب روسی ادب 'خطرناک' سمجھا جاتا تھا۔ پشکن کی لکھی ہوئی 'پکستان کی جیٹی' اگر آپ کے ہاتھ میں ہو تو کہ آپ کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے جوڑ دیا جاتا تھا اور خفیہ کے لوگوں کو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا

کہ الیگزینڈر بشکن سرخ انقلاب سے بہت پہلے کا قصہ ہے۔

بشکن سے عشق کا قصہ پرانا ہے، اسی لیے سیمینار سے ذرا سی فرصت ملی تو ہم میں سے چند نے بشکن میوزیم آف فائن آرٹس کی طرف دوڑ لگا دی۔ مصری، یونانی اور اہل روم کے علاوہ اطالوی، فرانسیسی، جرمن، برطانوی اور وینیزی مصوروں کے کیسے کیسے شاہکار یہاں موجود ہیں، لیکن وقت کی حٹائیوں کیسے کھینچ لی جائیں کہ ماتیز، پیزا، وان گوگ، گائین، رینویر، موئے اور نہ جانے کس کس کے شاہکار پر صرف ایک نظر ڈال سکیں۔ خاموشوں نے بشکن کے نام سے منسوب اس آرٹ میوزیم میں اطالوی نشاۃ ثانیہ کے عظیم ترین مجسمہ ساز، مائیکل اینجلو کے چند مجسموں کی پد سٹر آف پیرس سے بنی نمینیں بھی رکھ دی ہیں۔ ہم فرش پر کھڑے مائیکل اینجلو کے عرش کو چھونے والے ڈیوڈ کے مجسمے کو سراٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ وہ دیوڑا دور ہم بونے اس مجسمہ ساز کے معجزے کی شبیہ دیکھ رہے تھے جو اپنی چھینی اور ہتھوڑی سے سنگ مرمر کی سوں کو چھیل کر کیسے کیسے نقش و نگار بھرتا اور تراشتا چلا جاتا تھا۔ شبیہ جب اس طرح مسحور کرتی ہے تو اصل کیا چیز ہوگی۔

بشکن میوزیم کے اس خزانوں سے بھی سیری نہیں ہوئی تھی اور کسی اسکول سے آئے ہوئے تمیزدار بچوں کی ہنسی اور مصوری اور مجسمہ سازی کے نادر روزگار نمونوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت کی جو دنیا آباد تھی ان پر وجد کرنے کو جی چاہتا تھا، لیکن میوزیم کے عین مقابل سڑک کے اس پار کرائسٹ دی سیویور چرچ تھا، اس کی زیارت سے بعد کیسے محروم رہیں۔ ہم میں سے چند نے بشکن میوزیم میں رہنے کو ترجیح دی۔ میں نے بعض دوستوں کے ساتھ اس چرچ کا رخ کیا۔ یہ وہ چرچ ہے جس کے ساتھ ایک دلچسپ کہانی وابستہ ہے۔

چرچ ہوں، مسجدیں یا مندر ہوں، ان عبادت گاہوں سے کون نہ کوئی دلچسپ کہانی سراٹھاتی ہے کسی میں کسی روح کا ٹھکانہ ہوتا ہے، کہیں جا کر ادب و احترام سے منت مانگے تو وہ فوراً پوری ہو جاتی ہے اور کسی کا تبرک یا پر شا در ایض کو شفا بخش دیتا ہے۔ بشکن میوزیم کے عین مقابل بنے ہوئے کرائسٹ دی سیویور چرچ سے وابستہ کہانی، روسی انقلاب اور پھر ریڈ انقلاب کی کہانی ہے۔

اس چرچ کی پہلی اینٹ 1817ء میں رکھی گئی لیکن اس کی تعمیر کا فرمان شہنشاہ الیگزینڈر اول نے 1812ء میں اس وقت جاری کیا جب روسی فوجوں کو حمد آوروں پر شاندار فتح حاصل ہوئی تھی، اس کی تعمیر میں 44 برس لگے۔ 26 مئی 1883ء کو اس میں پہلی مرتبہ عبادت کا آغاز ہوا اور آج تک یہ روس کا سب سے بڑا گرجا گھر ہے۔ لیکن کہانی یہیں نہیں ختم ہوتی، 1917ء میں سرخ انقلاب برپا ہوا اور 1930ء میں اسٹالن کے حکم سے فن تعمیر کا یہ شاندار مظہر اور مجسمہ سازی اور مصوری کا یہ بے مثال خزانہ بکھر کر رہ گیا۔ اسٹالن کا ارادہ اس مقام پر ایک عظیم الشان یادگاری محل تعمیر کرنے کا تھا جس میں سوویت یونین کی تمام ریاستوں کی نمائندگی ہوتی لیکن دوسری جنگ عظیم نے اسٹالن کو اس کی مہلت نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ اس جہنم سے رخصت ہوا۔ آنے والوں کو خیال آیا کہ کیوں نہ یہاں تیراکی کا ایک عظیم الشان تالاب تعمیر کیا جائے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہ ہو۔ لیجئے جھٹ پٹ وسیع و عریض تالاب تعمیر ہوا اور نئی سل اس میں تیراکی کے مزے لینے لگی۔

90ء کی دہائی میں سوویت یونین کی تحلیل کے بعد روسی حکومت نے اس چرچ کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی اور کرائسٹ دی سیویور چرچ نے اپنی راکھ سے نقش کی طرح جنم لیا۔ آج اس کے سنہرے گنبدوں پر سورج کی کرنیں آنکھیں خیرہ کرتی ہیں۔ اندر جائیے تو مصوروں مجسمہ سازوں کی خلقی کے سامنے سر جھکا دیے۔ یہ تھاق تھا کہ وہ ایسٹرکادن تھا، گرجا گھر کے باہر گاڑیوں کا ہجوم تھا اور اندر بوڑھے، جوان، بچے سب ہی ادب و احترام کے ساتھ موجود

تھے۔ عورتیں سروں پر سیاہ چالی کے اسکارف پہنے صلیبوں کو بوسے دے رہی تھیں۔ بچے خوابوں کے لیے منتیں مان رہی تھیں، چڑھ دے چڑھا رہی تھیں۔ دنیا بھر کی عورتوں کا محبوب مشغلہ۔

روس کی نئی نسل بھد کیا جانے کے آج کی روشنیوں اور رونقوں کے لیے ان سے پہلے کی دو تین نسلوں نے کیا عذاب ہے اور کبھی مشقت کی۔ بھاری بھر کم بدن والی بد رنگ کوٹ اور بر کے جوتے پہنے عورتیں ماسکو میں اب خال خال نظر آتی ہیں۔ آج اس کی چوڑی سڑکوں اور عالیشان عمارتوں کے سامنے میں وہ لڑکیاں ہیں جن کی پھلائی کمر ہے، جن کے حسن و جمال کو ایس ٹی رڈر اور لاوریل نے نکھرا ہے، چہروں پر خوشحالی کی تابانی ہے، چھ گانے کی فریج بیل پر یہ لڑکیاں چلتی نہیں، تیرتی ہیں۔ ان کے غمزے نخرے دیکھ کر کس کا جی نہ چاہے گا کہ وہیں قتل ہو جائے۔ لڑکے ہیں تو وہ بھی جدید مغربی رنگ میں رنگے ہوئے، سیکڈ ہینڈ کے کسی آؤٹ لیٹ کے باہر محبوبہ کے غمزے اور عشوے پر غار ہوتے ہوئے۔ ماسکو کی وہ پولیس جو متوسط طبقے یا غیر ملکیتوں کی گاڑیوں کا بات سب بات چالان کرتی ہے وہ رات میں نکلنے والے نو دہائیوں کے نوجوان بیٹوں کی قانون شکنی سے یوں آنکھیں چراتی ہے جیسے کسی سولوی سے کسی حسینہ کو بے لباس دیکھ لینے کا جرم سرزد ہو جائے اور احسب سگنہ سے گھبرا کر وہ اپنی آنکھیں بند کرے۔ ہیوی سٹریٹس پر وہ نوجوان دیکھے جن کے بدن پر لباس کم، رنگین نقش و نگار زیادہ تھے، کسرتی بدن، کسی کی رنچیں شانوں پر لہراتی ہوئیں، کسی کا سر گھٹا ہوا، ہاتھوں پر آہنی پنجے چڑھے ہوئے اور آنکھوں میں شراب کا سرور۔

اسٹالن کا تن مردہ تنگ قبر میں کر دئیں بدلنے کے قابل بھی نہیں رہا، لینن صاحب ابھی تک کریملن میں عزت و احترام کے ساتھ شیشے کے تابوت میں لیٹے ہیں اور پتی بے نور آنکھوں سے زمانے کی گردشیں دیکھتے ہیں۔ بڑھے مرد، عورتیں، چند نوجوان شہنوں پر ہتھوڑے اور درانتی والا سرخ پرچم لہراتے ہر روز اس مرد انقلاب کو سلام کرنے جاتے ہیں، کمیونسٹ پارٹی کا سرخ سلام۔ ریڈ اسکوئر سے گزرتے ہوئے اس کی پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے بدن میں کپکپی سی جھوٹ جاتی ہے۔ کریملن کی یہ دیسی دیوار ہے جس پر سوویت یونین کے مالک و مختار حکمرانوں نے کھڑے ہو کر مسلح افواج کی سلامیاں لی ہیں۔ چشم تصور سے اس پر ریڈ کو دیکھا جس میں چوبیس اور پتیس پہیوں والی گاڑیوں پر چڑھے ہوئے انٹی میزائل، ان کے جلو میں چاق چو بند فوجی، ٹینک، توپیں اور آسمانوں پر اڑن بھرتے ہوئے بمباریروں کے پرے۔ شان و شکوہ کے مناظر، ایک عظیم عالمی طاقت کا جاہ و جلال لیکن عوام کے روزمرہ مسائل کا بڑھتا ہوا انہار۔

ڈبل روٹی کے لیے لمبی قطاریں، اسلحہ خانوں میں چھپتے ہوئے ہزار ہائی میزائل قطار در قطار۔ جس نے بھی کہا کہ حضور انبی جتھیا تو یقیناً اہم ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ سنگین معاملہ لوگوں کی روزانہ ضرورتوں کا ہے، یہ کہنے والا گردن زدنی ٹھہرا، سائبریا کا سرد جہنم اس کا ٹھکانہ ہوا، ہم بھی پاکستان میں اپنے مائی باپ سے ڈرتے ڈرتے یہی عرض کریں تو غدار کہہ جاتے ہیں۔

روسی آج سے نہیں صدیوں سے نیپے کی شاندار روایت رکھتے ہیں، ماسکو سے جب دعوت نامہ آیا ور پروگرام کے کوآرڈینیٹر ظہیر امین خان نے فون پر مجھ سے پوچھا کہ ماسکو میں اگر کوئی خاص چیز آپ دیکھنا چاہیں۔ میں نے فوراً عرض گزار کی کہ جناب اگر سواں یک کے دیدار نہیب ہو جائیں تو کیا کہنے۔ کہنے لگے دیکھئے کوشش کریں گے۔

ہم جب وہاں پہنچے تو انہوں نے بالکل بادشاہ ظہیر امین بابر کے شاہانہ انداز میں ہماری یہ خواہش پوری کر دی۔ اسٹیٹ کریمنس ہیلز میں دی سوان یک دیکھا اور یوں سمجھا کہ جیسے زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی۔ تھیر کی کیا

سجاوٹ اور کیا آرائش تھی۔ اسٹیج کی فراخی اور اٹھتے اور گرتے ہوئے پردوں کا حسن نہ پوچھیے، ابھی دریا بہریں لے رہا ہے، ابھی آسمان پر ستارے چمکنے لگے، موسیقی کی لہروں پر ہم تیرتے رہے اور نیکی اور بدی کے درمیان کشاکش کے مناظر دیکھتے رہے، عیش عیش کرتے رہے۔

اپنے سفید پردوں کو جنبش دیتی بچوں پر تھرکتی ہوئی نازنینیں، ان کے جھرمٹ میں وہ حسینہ جسے شہزادے کی دہن بنا ہے اور پھر ایک جادوگر کا داغہ، اس کی میلی نظر اسی حسینہ پر ہے جس پر شہزادہ فدا ہے۔ نیکی اور بدی کے درمیان ایک لمبی لڑائی جس میں آخر کار نیکی فتح مند ہوئی ہے۔ کم سے کم اسٹیج پر سہی نیکی کہیں توفیق مند ہو۔ لوگوں کی تالیوں کا ایسا شور ہے کہ طبیعت وجد میں آتی ہے۔ کھیل بنے اختتام کو پہنچتا ہے تو دو تحسین کے ساتھ ہی لوگ اپنے محبوب اداکاروں کو گھلدستے پیش کر رہے ہیں، تین در چار سال کی بچیاں، بچے جو تماشائی تھے، ننھے ہاتھوں میں گلدستے سنبھالے اسٹیج کی سیرمیاں چڑھ کر جاتے ہیں اور اداکاراؤں اور اداکاروں کو گل رلہ نذر کرتے ہیں۔ یہ بچے جو ناظرین میں سے تھے اور دو گھنٹے تک جن کی ایک آواز ہمیں سنائی نہ دی، اصل داد تو انہیں دینی چاہئے۔

ہم جب ماسکو پہنچے تو دریا نے ماسکو پر برف کی ایک ملکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ دو تین دن کے ندر یہ برف پگھل گئی اور اب اس کی بہروں پر دھوپ پگھلا ہوا سونا بن کر بہتی ہے۔ یہی بہریں پھر دولگا کے پانیوں سے گلے متی ہیں۔ وہی دولگا جسے ہمارے بے مثال ادیب اور دانشور رائل سکرٹا مین نے 'دولگا سے گرگا' لکھ کر ہندی اور اردو ادب میں یادگار بنا دیا۔ اس شہر کی فضاؤں میں 'سات بھٹس' سانس لیتی ہیں۔ یہ وہ سات شاندار عمارتیں ہیں جو شہر کے مختلف علاقوں سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں سب سے شاندار، یونیورسٹی کی وہ عمارت ہے بادل جس کا بوسہ لیتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے دیوار دور، وسیع ایوانوں اور راہداریوں کو اسٹالین نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن قیدیوں کی مشقت سے کشید کیا تھا۔ اپنی نسلوں اور دنیا کے بے شمار ملکوں کے نوجوانوں کو علم کو ایسا بہتا ہوا دریا دان کیا تھا جس سے ہمارے یہاں کے بھی نہ جانے کتنے نوجوانوں نے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ تیسری دنیا کے غریبوں کے کتنے ہی بیٹے اور بیٹیاں اس یونیورسٹی سے پڑھ کر نکلے، وہ دنیا کے تمام براعظموں میں پھیل گئے۔ یہ سرخ انقلاب کا صدقہ جاریہ ہے۔

کل ہمیں، ماسکو سے رخصت ہونا ہے، آدھی رات کے بعد میں اپنے کمرے کی کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹا کر اس سڑک کو دیکھتی ہوں جس کا نام شپسکی واسکایا سٹریٹ ہے اور جس پر بنے ہوئے 'میدان' ہوٹل میں ہم نے یہ دن یہ راتیں گزاری ہیں۔ دور دور تک پھیلا ہوا روشنوں سے جگمگاتا ہوا، سکونگاہوں کے سامنے ہے۔ میں کھڑکیاں کھول دیتی ہوں، خشک ہوا فرائے بھرتی اندر آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی زنانے سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کا شور۔ یادوں کا سیل رواں بہریں لیتا ہے۔ آریے ایسا لوکی نے "Revolutionaries of India in Soviet Russia" کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی تھی، وہ یاد آتی ہے۔ ہندوستان سے ترک وطن کر کے سوویت یونین جانے والے آدرش وادی ایم این رائے، شوکت عثمانی، مظفر احمد، غلٹی گپتا اور نہ جانے کتنے جو سرخ خواب کے اسیر تھے۔ "ج کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا۔ وقت کا گرجتا ہوا قہار دریا قوموں اور مملکتوں کو بہائے لیے جاتا ہے۔ عقیدے، نظریے، نسلیں، سب ہی وقت کے دریا میں بلبے۔ رات کے س پہر مجھے ایک بار پھر رشیدہ پا کی یاد آتی ہے۔ ماسکو سے رخصت ہوتے ہوئے رشیدہ آ پا کو میرا سرخ سلام۔

(مئی 2011)

بیٹے ہوئے دن یاد آتے ہیں

(1950 تا 1980)

اعتراف احسن

بچپن:

میں ستمبر 1945ء میں مری کے پر فضا مقام پر محمد احسن علیگ اور رشیدہ احسن کے گھر پیدا ہوا جس واقعے کی کوئی یاد میرے پاس محفوظ نہیں۔ 1950ء میں لڑکیوں کے سکول کوئین میری کالج ہو رہا تھا۔ پہلے سے میری دونوں بہنیں پڑھتی تھیں اور جہاں کی اوڈنٹوڈنٹس میری والدہ رشیدہ احسن بھی تھیں، میں داخل کرادیا گیا۔ یہ وہ عمر تھی جب لڑکیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ تین سال کی اذیت کے بعد جب لڑکیاں خوبصورت لگنے لگیں اور من کو بھانے لگیں تو اس اسکول سے اٹھ کر خالص لڑکیوں کے سکول اپچی سن کالج لہور میں داخل کرادیا گیا۔ زندگی میں مجھے یہ سب سے پہلا دھچکا لگا۔ کئی دہائیوں بعد بطور وزیر مجھے کوئین میری کالج میں ایک سالہ تقریب میں مہربان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنا پڑی تو میں نے اسی کالج میں اپنے سابقہ طرفہ تجربے کا ذکر کرتے ہوئے طاسبات اور خصوصیات کی اساتذہ کو کالج کی جانب خوشی خوشی آنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا،

شاید مجھے نکال کے بچتا رہے ہوں آپ

محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

اپچی سن کالج میں گزارے ہوئے دس سال یوں لگتا ہے کہ دنیا سے دور کسی دلکش جزیرے میں گزارے ہوں۔ ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس، گھڑ سواری، سوئمنگ گویا پڑھائی کے علاوہ ہر میدان کی سہولتیں میسر تھیں۔ شاید پڑھائی ہی پر زور نہ تھا۔ اگر G.D. Lang Lands اور TLG Mullen جیسے برطانوی اساتذہ نہ ہوتے تو میں اور میرے ہم عصر طلبہ شاید پڑھائی میں کورے کاغذ ہی رہ جاتے مگر ان اساتذہ نے ریاضی سے لے کر Dickens the Romantic Shakespeare اور Hardy اور دیگر شعراء، ادیبوں اور مفکروں سے روشناس کرایا۔ دنیا ساری کی تاریخ اور جغرافیہ کے نمایاں سنگ ہائے میل اور نقوش سے آگاہ کیا۔

اُردو شاعری اور ادب کا مزاج مجھے وادہ سے ملا جو ہمارے بچپن ہی سے جب بھی کار میں سفر پہرے کے جاتے تو دوران سفر میرا غالب اور خصوصاً اقبال کے اشعار، نظمیں اور غزلیں پڑھ کر سناتے اور ان کی اصطلاحات اور استعاروں کو آسان اور سلیس الفاظ میں سمجھاتے۔

رشیدہ نے قسم اٹھا رکھی تھی کہ جب تک کشمیر آزاد نہیں ہوگا وہ ریشم نہیں اوڑھیں گی۔ مرتے دم تک انہوں نے یہ عہد نبھایا اور ہماری شادیوں پر بھی پاکستانی سوتی کپڑا ہی زیب تن رکھے رہیں، ن سوتی ملبوسات میں آخر دم تک ماں کتنی خوبصورت لگتی تھی۔

نوجوانی:

1963ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ دیا تو جیسے نئی دنیا میں آ گیا۔ بڑے بڑے دیو قامت

مگر منکسر المزاج اساتذہ ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر اجمل، ڈاکٹر احمد حسین اور پروفیسر رشید جیسے اساتذہ کی کھنی چھاؤں میں بیٹھنے کا، عزائم ملا۔ طلباء میں یہ عہد سرمد صہبائی کا عہد تھا جو ٹک شاپ میں محفل لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ جبکہ شعیب ہاشمی انگریزی پڑھانے، ذراے کرنے اور کرانے کے علاوہ طالب علموں کی سوچ اور ان کے دہنوں کو روشن اور کشادہ کرنے میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ ان اساتذہ کی نظر میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی طلبہ سب برابر تھے۔ خالصتاً اور کڑا سدی گھرانے میں کرسس کا ٹیک کاٹا جاتا۔ دیوانی کے دن مٹھائی بانٹی جاتی۔ گوڑوں کی کرپا حاصل کرتے ہوئے جھجک نہ ہوتی۔ تفریق مذہب کی نہیں، طبقات کی تھی کہ

مذہب کی تفریق نہیں تھی

اور ہم سارے ایک ہوئے تھے

دنیا بھر کے سارے بے کس

غم کے سارے ایک ہوئے تھے

آپس میں کوئی تلخی یا جھگڑا نہ ہوتا، اگر کشیدگی تھی تو گورنر پنجاب نواب امیر محمد خان کالا باغ کے ساتھ تھی جس کے خلاف ہم نے مظاہرے کیے اور میں زندگی میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوا۔

یہاں ضمنی تبادلوں کے پہلی مرتبہ میں 1946ء میں اپنی ماں رشیدہ احسن کی ہانہوں میں اس وقت گرفتار ہوا جب میرے دادا چوہدری بہ دل بخش اور والد احسن علیگ کے گرفتار ہو جانے کے بعد قائد اعظم کی کال پر رشیدہ احسن نے بھی گرفتاری پیش کر دی۔

جیٹھ اور ہاڑ کے مہینوں میں گرمیوں کا زور اور شدت انتہا کی ہوتی۔ لوچلتی تو اس سے بچنے کی تدبیر کرتے ہوئے لوگ کبل، اوڑھ کے گھر سے باہر نکلتے لیکن ٹھنڈی سڑک یعنی سندرد اس روڈ ٹھنڈی ہی ہوتی۔ اس وقت تک سڑکوں کو مسلمان نہیں کیا گیا تھا اور ڈیوس روڈ اور لانس روڈ ہی کہلاتی تھیں اور ایسی کسی سڑک کا نام ”شاہ راہ بن بدلیں“ (وہ کون تھا) جیسے غیر ملکیتوں کے نام پر نہیں رکھی گئیں تھیں۔ نہر کا پانی، دریا کی طرح ریت سے آراستہ، مگر تازہ اور Invigorating تھا ہم نہر میں نہاتے بھی، درکنڈی کے ساتھ ”ٹھڈ آٹھ انچ کی مچھلیاں پکڑتے بھی تھے۔ شام ہوتے ہی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں بلا خوف ہر کنارے چہل پہل کرتی نظر آتی تھیں۔ نہر کنارے اکثر جوان جوڑے پاؤں پانی میں لٹکائے سرگوشیاں کرتے دیکھے جاسکتے تھے۔ کوئی پوچھتا نہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے کیا لگتے ہو؟ راوی اور چناب کا عالم تھا کہ۔

یہاں دریا کے پیلوں میں ہمیشہ مور پھرتے تھے

یہاں بچے ہمیشہ کھیلتے اور شور کرتے تھے

یہاں کی لڑکیاں دریا کنارے گیت گاتی تھیں
 سبھی راتوں سے ہیریں سر کی بازی جیت جاتی تھیں
 نہیں بیٹھی دھنوں میں بھگی راتیں بیت جاتی تھیں
 یہاں پنڈت پروہت اور ملا کا گزرو نہ تھا
 کسی چوپک کو عاشق کی اور بہ عذر ہی نہ تھا

ہسٹنگز کی ڈور کسی کا گلا نہیں کاٹی تھی اور سائیکل پر سارا شہر پھرتے تھے۔ اکثر لڑکیاں سائیکلوں پر سفر کرتی تھیں، کوئی ان کو مڑکے نہیں دیکھتا تھا در کسی کا اسلام خطرے سے دوچار نہیں ہوتا تھا۔ ملک کے بت سے بھی اسلام کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ مسجدوں سے کھیل کے میدان زیادہ تھے۔ انسان تو انسان، شہر میں جگہ جگہ گھوڑوں کے لیے پانی پینے کا اہتمام تھا۔ گے ہوئے بچوں کو شرم سے پیسے، کوئی نا کوئی گھر پہنچا دیتا تھا۔ زندگی قدرے سست رفتار مگر پرسکون تھی جیسے جالب نے کہا،

یہ بھی لذت پا پیادہ تھی
 دھوپ سے چھاؤں تو زیادہ تھی

گورنمنٹ کالج سے بی اے کرنے کے بعد میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے Downing College Cambridge چلا گیا۔ لاء میں تعلیم تو حاصل کی سو کی اور بہت کچھ سیکھا اور دیکھا، کیمبرج پہنچتے ہی بے ساختہ شعر کہہ دیا۔۔

کیمبرج ساتھ رکھ لیا ہوتا
 یوں تو ہر چھوکری حسینہ ہے

John Hopkins قانون کا استاد ہی نہیں اپنے رویوں سے انسانیت کے اصول بھی ایک غیر محسوس انداز میں سکھاتا تھا، مثلاً وہ زندگی میں اپنی کسی بھی بات یا اپنے کسی بھی نظریے کو جتنی نہیں سمجھتا تھا اور ہر کسی کو ہر وقت اور صرف عدالت کے کٹھنوں میں ہی نہیں، شک کا فائدہ دینے کا پابند تھا۔ اس کو لکھا انگلیخت کرو کہ فلاں پر و فیسر تمہاری تھیوری کی پھبتی اُڑا رہا تھا، اس کا جواب لفظ "Perhaps" یعنی شاید ہی سے شروع ہوتا تھا، مثلاً "شاید، میں اپنی بات واضح نہیں کر سکا" یا "شاید میری تھیوری میں کوئی سقم رہ گیا۔" کسی طور بھی وہ اپنے آپ کو دنیا پر یا کسی دوسرے پر فوقیت دینے کو تیار نہ تھا۔

کیمبرج میں فاروق شاہ سے ملاقات زندگی کا ایک سرمایہ ہے۔ چکوال کا یہ لڑکا میرا ہم عصر تھا۔ چار سال پہلے شکار کھیلتے ہوئے دوسرے شکاری کی بندوق سے نکلے ہوئے چہرے لگنے سے کلی طور پر بیٹائی کھو بیٹھا تھا مگر کیمبرج میں دیدہ وروں کے ساتھ پڑھتے ہوئے دیدہ دینا رکھے ہوئے تھے۔ چند برس پہلے فاروق شاہ برطانوی کسٹمز کے لیگل ایڈوکیٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر اپنے چوتے پوتوں، نو، سے نواسیوں اور اپنی بیوی رحیلہ کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ریٹائرمنٹ کے آسودہ ایام گزار رہا ہے۔

وطن واپسی:

کیمبرج سے ڈگری حاصل کرنے ورنلند سے بار کا امتحان مختصر ترین اور ریکارڈ عرصے میں پاس کرنے کے بعد 1967ء میں پاکستان واپس لوٹا تو ہر کوئی CSP بنا بیٹھا تھا۔ CSP کا امتحان دینے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا لیکن میں تو Left کا اور سوشلزم کا آدمی تھا۔ امتحان تو دیا، متحدہ پاکستان میں اس پوزیشن بھی آگئی، اب دشوار مرحلہ پیش آ گیا۔ نوکری کروں یا نہ کروں؟ لوگ کہتے تھے بھی نوکری کہاں، بادشاہت ہے۔ دل کہتا تھا کہ کارکنوں مزدوروں کی وکاست کرتے کرتے کہاں جبر کرنے والے قبیضے میں شامل ہو جاؤ گے؟ احسن ملیگ اور رشیدہ احسن نے اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد کیا ہوا تھا۔ بہنوں اور بھائی کے دل میں تھا کہ CSP انسر بن جائے مگر کوئی بھی مجبور کرے کو تیار نہ تھا۔ احسن ملیگ کے خاندان میں مکمل جمہوریت تھی۔ بالآخر اوکاڑہ میں انگریزی کے پروفیسر اور میرے بہت قریب ماموں (مرحوم پروفیسر سعید احمد) کو میرے ساتھ بات کرنے پر معذور کیا گیا۔ ستمبر کا آخری ہفتہ تھا، ماموں سعید نے پوچھا ”رزلٹ کب آناؤنس ہوا تھا؟“ میں نے کہا 14 جولائی کو کہنے لگے ذرا سوچو اعتراف کسان دس ہفتوں میں تمہارے لیے سو سے زیادہ رشتے تجویز ہوئے ہیں۔ میں ہنس دیا ورنہ کہا کہ ”مجھ سرفے کے ساتھ کس لڑکی کا مستقبل خراب کرنا چاہتے ہو؟“

CSP سے میرے انکار کے بعد بھی جس لڑکی نے میرے ساتھ مل کر اپنا مستقبل بھی داؤ پر لگانے کا ارادہ کر لیا وہ بشری سیف اللہ ہے۔ نورین، بشری کی بہترین سہیلی ہے۔ فرید حسن میرا بہترین دوست۔ ان دونوں کی شادی پر ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔ اب میرے لیے رشتوں کا یہ ہاتھ کتنا دلکش و مضبوط تھا اس کا احساس ستر کی دہائی کے اس زمانے میں ہوا جب ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران مجھے بارہا جیل جانا پڑا۔ وکاست بند ہوتی آمدن صفر ہوتی مگر بشری تھی کہ بچوں کی تربیت اور تعلیم میں کوئی فرق نہ آنے دیتی اور نہ ہی جیل کی محدود اور کرہ ناک مہقاتوں کے دوران، اتھے پر کوئی مل لاتی۔

ہاں، بیان کی روانی میں تو بات بشری تک ہی پہنچنی چاہیے تھی اور پہنچ گئی لیکن 1950ء تا 1980ء کا میرا قصہ شہید ذوالفقار علی بھٹو سے مہقاتوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگا۔ 6 اکتوبر 1970 کے دن میں نے CSP کا عہدہ لینے سے انکار کیا۔ 18 اکتوبر کو فلیٹیز ہوٹل رہور میں بھٹو صاحب سے جا ملا۔ اب میں سیاست کے لیے آزاد تھا، وہ بھی بہت حیران ہوئے کہ میں نے اتنا بڑا قدم کس زعم میں اٹھالیا لیکن میں اپنی گفتگو میں ان کو اس قدر متاثر ضرور کر پایا کہ جب چار سال بعد گجرات میں ایک ضمنی انتخاب کا مرحلہ آیا تو انہوں نے مجھے ہی ٹکٹ دیا اور پہلے روز ہی صوبائی وزیر مقرر کر دیا۔ بھٹو صاحب کے ساتھ اور ان کی صوبائی حکومت میں بیٹے دنوں کی یادیں ہیں اور ان کا تفصیل ذکر ضروری ہے۔ مگر وہ اگلے شمارے کے لیے۔



نظمیں زندہ رہتی ہیں
(نظمیں)

امر آمر

آفتاب اقبال شمیم

یہ عالم ایک جائے معجزہ ہے
آکھ حیرت میں
تماشادیکھتی رہتی ہے ہونے اور نہ ہونے کا
زمین اقلیم لمحے کی
وہ لمحہ جو ہزاروں ربط رکھتا ہے
عنصر سے
زماں کے بھید میں، اُس کے اشارے پر
وصال و ہجر کا، افاصلہ وفا صلہ کا
ایک ہنگامہ پیار رکھتا ہے مٹی میں
نہیں معلوم اُس کا مدعا کیا ہے؟
یہ ہمارے غف، ن لفظوں کے معنی بھی
اُس کے ہیں
یہ نکھیں
اپنے اپنے عہد کی فکرِ مروج میں
عجب حیرانیوں میں
اپنے ہونے کا تماشا کرتی رہتی ہیں

یہ عالم ایک جائے معجزہ ہے
آکھ حیرت میں
تماشادیکھتی رہتی ہے ہونے اور نہ ہونے کا
زمین اقلیم لمحے کی
وہ لمحہ جو ہزاروں ربط رکھتا ہے
عنصر سے
عجب پیوستگی میں اک ہجوم واقعہ،
منظر کشائی کا سماں
اُس کے جلو میں
ضرورتِ غائب کے دور و یہ سفر میں چلتا رہتا ہے
کہیں گلزارِ رشتے اور محبت کا
کہیں صحرا کی ویرانی تعلق میں
سمندر میں چمکتی دھوپ کا مرجان پلتا ہے
شمال اُس کا جنوب اُس کا
بدلتے موسموں کی بادِ گردش گیر ہے
جس میں
پرندے، تتلیاں ہجرت میں رہتے ہیں

ستمبر
گلزار

میں نے ایک سایہ اپنا پال رکھا ہے
گلزار

ستمبر کے دنوں میں

آسماں ہر سال ہی بیمار رہتا ہے

الرجی ہے کوئی شاید

ستمبر آتے ہی بارش کا پانی سوکھنے لگتا ہے اور

بادل کے ٹکڑے، میلے گندے پوتڑوں

جیسے پڑے رہتے ہیں، رُوکھی،

چڑچڑی سی دُھوپ میں دن بھر۔۔

چھپاکی سی نکل آتی ہے، شام ہوتے ہی ساری پیٹھ پر

اور لال ہو جاتا ہے اک حصہ فلک کا

جیسے زہریلے کسی پتھوڑے کا نا ہو

کئی دن کھانتا ہے آسماں اور لال، کالی آندھی چلتی ہے

بہت بیمار رہتا ہے ستمبر کے دنوں میں آسماں میرا!

میں نے ایک سایہ اپنا پال رکھا ہے

آگے پیچھے گھومتا ہے جیسے چھوٹا مپوئی ہے

بھونکتا نہیں کبھی

کسی بھی اجنبی پہ یہ،

اپنا ہی ملے کوئی تو کاٹ لیتا ہے

سایہ میرا کاٹ لے تو دانت کے نشان چھوڑ دیتا ہے

میں نے اپنا زہر سب

ساتے میں سنبھال رکھا ہے

میں نے ایک سایہ اپنا پال رکھا ہے!"

سوئیاں گھڑی کی پھر پریڈ کرتے کرتے نہ آمد کی آہٹ نہ جانے کی ٹوہ گلزار گلزار

سوئیاں گھڑی کی پھر پریڈ کرتے کرتے
اپنا دائرہ چکا گئیں
وقت پھر گزر گیا۔
تم سے اک قرار کی اُمید پھر سے نل گئی
پل سے پل، پرو پرو کے سارا دن
باندھتا رہا کلائی پر میں انتظار میں
ایک ایک لفظ سوچ سوچ کر،
زباں پہ پھیرتا رہا
شام ہوتے ہوتے سب جھلس گئے
تار تار دن اتر گیا غریب کے لباس کی طرح
دن پلٹ رہا تھا اپنا پتا جب کتاب کا،
کوئلے سے لکھ گیا تھا کوئی آسمان پر
آسمان، آج رات بند ہے!!

نہ آمد کی آہٹ اور نہ جانے کی ٹوہ ملتی ہے
کب آتے ہو؟..... کب جاتے ہو؟
کبھی کبھی آنکھیں میں لگا جب
! ملی کا یہ پیڑ ہوا میں ہلتا ہے تو،
اینٹوں کی دیوار پہ پر چھانکیں کا چھینٹا پڑتا ہے..... اور
جذب ہو جاتا ہے جیسے سوکھی مٹی پر
کوئی پانی کے قطرے پھینک گیا ہو....
دھیرے دھیرے آنکھیں میں پھر دھوپ سسکتی رہتی ہے!

بند کمرے میں
کبھی کبھی جب ویسے کی لؤل جاتی ہے تو،
ایک بڑا سا سایہ مجھ کو،
گھونٹ گھونٹ پینے لگتا ہے
آنکھیں مجھ سے دُور بیٹھ کے
مجھ کو تکی رہتی ہیں.....

کب آتے ہو؟..... کب جاتے ہو؟
دن میں کتنی بار مجھے تم یاد آتے ہو!

رخنہ دیوار آنکھیں

ریاض مجید

میرے بوڑھے دنوں کی حکومت میں آئے

خوشی کے سفیرو!

میں گزرے زمانے کے ویراں کھنڈر کی حفاظت پہ، مورگائیڈ، شکستہ کواڑوں کے

رخنوں سے چھپ چھپ کے ہر کھلے رن میں تم کو ہنستے ہوئے دیکھ کر کتنا

خوش ہو رہا ہوں؟

مری بوڑھی آنکھیں،

مزاروں کی ٹوٹی ہوئی جالیاں،

شہ نشینوں سے ملحق درپچوں کے ویران..... خاموش غریفے ہیں

جن کے ذریعے مرے محبس جاں میں تازہ ہوا روشنی آئی ہے

خوشی کا تسلس جو ک دوسرے (تم جوانوں) سے مجھ تیرے کی مسرت کا شاہد ہے

مجھ ڈڈتے جسم کے واسطے سطح ساحل کا جاں بخش منظر ہوا ہے

تمہاری کھٹکتی ہوئی پیالیاں،

چائے کے گرم بوسوں پہ خوشیوں کی خوشبو سے بریز گفتار،

معصوم پیشانیوں پر چہکتی خوشی کا اُجالا،

مری رات دن بجھتی جاتی ہوئی آنکھ کو نور کا درس ہے!

تمہارے لیے بھی سدا کی طرح میری یہ ہی دعا ہے

”جو سب سے ہوا ہے وہ تم سے نہ ہو“

(کوئی جانے والا کسی آتے موسم میں تو لوٹ کر آئے!)

تم آئندہ اپریل میں ان پرانے مزاروں کے بوڑھے مکین کی ملاقات کو پھر بھی آنا

پتھروں پر بھی جب گھاس پھیس،

اور پہاڑوں کی درزوں میں جنگلی گلابوں کے روشن دیے ٹنڈمیں

میں ہر آتے زمانے میں گزرے زمانوں کی بھتی ہوئی آنکھ سے سایہ سایہ شکستہ
کواڑوں کے رخسوں سے لگ کر تمہیں لان میں گھومتے ہنستے اور کھیلتے دیکھنے کی تمنہ کروں گا
مگر یہ نہ ہوگا

سدا کی طرح یہ دعا بھی اکارت چلی جائے گی

یہ دن رات، جذبے، سدا یوں نہ ہوگا!

ڈھیل پڑتی چلی جائے گی جب پھسلتی ہوئی ساعتوں پر گرفت اور پرانی کتابوں کے وپر
ستے بھاری بھر کم رسائل کا انبار بڑھتا چلا جائے گا
تو مدفون ماضی کی آواز کس کو سنے گی؟

مہکتی ہوئی صحبتوں کی چمکتی تصاویر آتے زمانے کی حدت سے الماریوں میں
کتابوں تلے لنگ ہوتی چلی جائیں گی

کہ آتے زمانے کی سیاہی میں جذبوں کا ہر کاغذی نقش مٹنے کی سبے چہرگی کا
سزاوار ہے!

تم اپنی تمنائوں کے یاد محلوں (نہیں ریت محلوں) کو آتی ہوئی تیز و تند آندھیوں سے
بچانے کی گولا کھ کوشش کرو

پر زمانہ تو تیزی سے بڑھتا ہوا ایک سیلاب ہے

تہہ بہ تہہ (آسمان کی طرف جاتی بلڈنگ کی اینٹوں سی) یادیں،

گزر تے ہوئے مضطرب وقت کی کروٹیں،

رُخ بَرُخ پھیلتی سوٹیں،

یہ وہ پرچہ، اندھی، پراسرار گلیاں ہیں جن میں بھٹکتے مسافر پرانی رتیں ڈھونڈتے مر گئے ہیں!

دیران ایئرپورٹ

ریاض مجید

ایک اک کر کے سب جا چکے ہیں
جانے والے بھی اور وہ بھی جوان کو جاتے ہوئے دیکھنے آئے تھے
میں رن وے سے کچھ دور ریٹنگ کو پکڑے اکیلا کھڑا رہ گیا ہوں
فضاؤں میں یوں گھورتا ہوں
کہ جس طرح پیسے افق نے مری زیست بھر کی کدائی ہوئی شے نگلی ہو
جی چاہتا ہے
ہوا میں نم آلودہ رومال ایسے ہڈوں
فضا کا پانچٹھے
افق میرے نگلے خزانے آگل دے
نگاہوں میں کچھ دیر پہلے کے کھوئے ہوئے رنگ ابھریں
گیا وقت پھر لوٹ آئے
(مگر یہ بھی اک سوچ، اک آرزو ہی تو ہے)
لڑتے لبوں پر وہ سرسراتی ہے
”اے ہوا کے مسافر
خدا تیرے سینے کو خواہش بھرے روز و شب کی مسرت سے آباد رکھے،
اسے مرے،
تری نیک نامی ہواؤں کے ہمراہ جائے،
جہاں تک ہوا کا گزرنہ ہو وہاں تک تری شہرتوں کا سفر ہوا“

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر

ریاض مجید

جانے والے زمانے کے رستے میں آنکھیں بچھا کر
مدد سال کی گرد کی تہہ میں ڈوبی فراموش یادوں کی آواز سن!
اپنے پیاروں کی مٹی کو کھل بھر جان
اس راہ پر بیٹھ جا، رفتگاں جس سے ہو کر گئے ہیں
(دعا مانگ..... وہ جس جگہ پر بھی ہوں خوش رہیں)

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر
آنکھ سے حال کی بے مروت چمک کو نکال اور دیکھ آج بھی ان منازل میں تیرے لیے کیا خوشی ہے؟
پرانی رتوں کے تصور سے بھیگی ہوئی آنکھ میں تیرے اشک سے قیمتی کوئی
شے ہے تو کہہ!
گئے لمحوں کی بے فضا یاد میں ڈوب کر ایک حسرت بھرے بوڑھے سینے سے باہر نکلتے ہوئے سانس سے
زندگی بخش اگر کوئی اک سانس ہے تو بتا!
یاد رکھ!

بھولے ہسرے ہوئے راستوں کی زیارت سے بڑھ کر نظر کے لیے
کوئی جنت نہیں ہے!

موسم سرد صہبائی

موسم تو ہر سال اس شہر میں آتے ہیں

ہرے بھرے نیا لے موسم

لیکن ان کی گود میں ہم اس موسم کی

کو نل ڈھونڈتے رہتے ہیں

جو سانسوں کے رش کو چھو کر

جسم کے اندر پوروں کے بل چڑھ آتی ہے

جس کی اوک میں پیاسی خواہش

ساری رتوں کے رنگ اور ذائقے چکھ لیتی ہے

جیسے گہرے بادل کی آغوش میں بارش

اور بہتے دریاؤں کی پاتال میں سپی

ایسے ہی ہم دونوں کی بیتاب کشش سے

اک یہ موسم چھا جاتا ہے

موسم جس کے دھانی کپڑے

لذت کی خوشبو سے تر ہیں

جس کے کھلے ہوئے بالوں میں

جنگلی تیرپوں کے پر ہیں

پہلا دھیان سرد صہبائی

لوگ جو نیند کے راستوں سے دلوں میں اترتے ہیں

ان کی شبیہیں

سمندر کی آغوش میں سانس لیتے ہوئے چاند

خواہش کی دوری میں اڑتے پرندوں سے

بیدار ہوتی ہیں

ان کا بدن خواہشوں کا تھیر

ملاقات

شہر ازل کا پراسرار موسم ہے

عمروں سے ہر روز

آنکھیں سمندر کی پاتاں کو چوم کر

دن کے ساحل کی جانب پلٹتی ہیں

ٹھہری ہوئی دھوپ کے آئینے میں

ہماری گہن خوردہ شکلیں ابھرتی ہیں

ان سے چھڑنے کا لمحہ یہی ہے

کہو جاگتی آنکھ سے

نیند کے جسم کو کس طرح ہم چھوئیں

ان سے کیسے ملیں

کون سی سرزمینوں سے وہ دل کے تنہا آفت پر اترتے ہیں

اور پھر حرم

ہماری حسوں سے نکل کر کہاں لوٹ جاتے ہیں

ٹاور آف سائینس

نصیر احمد ناصر

کتابیں پھاڑ ڈالے گی، جلا دے گی، بہا دے گی
کسی وجہ کے پانی میں
زمین پر زندگی ایسے ذلیل و خوار سی ہو جائے گی
جیسے رواقِ بے ستوں اپنا تیقن کھو کے ہوتا ہے

سنو آس درد کی آواز کو
جب ہم نہیں ہوں گے
ہم راڈ کر ہوگا

نوع، انسانی میں،
ستاروں، ستاروں کی کہانی میں
زمین کی بے زبانی میں، زمان کی بے زبانی میں
خدا کی لامکانی میں
ہماری دُم بچے گی بس
کسی ”خاموش ٹاور“ کی نشانی میں!

سنو آس درد کی آواز کو
جب وقت سے بے وقت ہو جائیں گے لمحے
نیند میں بے نیند ہو جائیں گی نیندیں
خواب میں بے خواب ہو جائیں گے سنے
اور آنکھوں میں رواں ہوں گی

شہری کیڑیوں کی بے صدا لمبی قطاریں
پلیسے چہروں پہ سرسوسٹ یوں کی گدگدی ہوگی
بدن میں ہڈیاں یوں ٹوٹ جائیں گی
کہ جیسے ٹوٹتے ہیں خشک سرکنڈے
فقط دُہچی بچے گی

کیوں کہ یہ جید محافظ ہے،
امیں ہے جینیاقی جج کے سر بستہ رازوں کی ...

سنو آس درد کی آواز کو
جب موسموں کی سبز و تارخ میں
خوں رنگ پئے پھڑپھڑائیں گے
ہوا سارے گلابوں کو
بس اک جھونکے سے ہل میں روند ڈالے گی
سیہ گھوڑوں پر آئے گی سپہ شب کی

کسی دن ملیں گے

نصیر احمد ناصر

ہر اک لون کی اپنی رتھ ہے، دکھاوٹ ہے
جیسے دھنک ایک آبی شجر ہے
جزیر جس کی بادل کے اندر ہیں
بادل سمندر کا بیٹا ہے
جس کا پہاڑوں پہ گھر ہے
زمینے اترے کیوس پر
زمانوں کی پینٹنگ بناتے بناتے
کبھی تھک گئے تو
ہم اُس گھر میں جائیں گے مہمان بن کر
یگوں تک رہیں گے
نہائیں گے رنگوں میں، غسلِ صباحت کریں گے
ابھی دور تخلیق جاری ہے پیہم
ابھی ایک سرمستی طاری ہے ہر دم
ابھی مجھ کو فرصت نہیں ہے
ابھی نظم مجھ کو لکھے جا رہی ہے
فعولن فعولن فعولن فعولن
ملیں گے کسی دن ملیں گے
فراغت ہوئی تو
خدا سے بھی تجھ سے بھی
دونوں جہانوں سے باہر ملیں گے
کسی دن عروسی زمانوں سے باہر ملیں گے!!

کسی دن ملیں گے
عروسی زمانوں سے باہر
شب استعارہ منائیں گے
تمثیلِ حسنِ ازل کی
کسی صد مثالی جہیں میں، حسیں میں تلاشیں گے
لفظوں کے انقال سے
معنویت کو آزا کر دیں گے
ابہام آلودہ دنیا سے نکلیں گے
ویراں ستاروں پر قصے بلاغت کریں گے
کوئی ایسا پیکر تراشیں گے
جو کائناتی تصور سے بھی ماورا ہو
کسی خواب آئینہ مجہول دن کو علامت بنا کر
محبت کی نثری حقیقت لکھیں گے
ابھی تک تو بس ایک میٹر ہے، رُوں رُوں ہے
جس میں زمانوں کی زد بہہ رہی ہے
یہی کہہ رہی ہے
فقط میں ہی نہیں ہوں کوئی تو نہیں ہے
سنو شش جہا تو! کوئی ساتویں سو نہیں ہے
نہ منزل نہ رستہ نہ کوئی سفر ہے
ہر اک سمت ”لا“ کا گزر ہے
ہر اک شے کا اپنا تاظر ہے، اپنی نظر ہے
کوئی کتنا اصلی ہے، نقلی ہے کس کو خبر ہے، مگر ہے

حطاب کہو، اب کیا بچو گے؟

نصیر احمد ناصر

تھک ہار کے کیا اپنے ہی سائے میں بیٹھو گے؟
 شاخیں کاٹ کے جوڑ پیر لگایا تھا
 اس پتے میں جو دام اور نام کمایا تھا
 کب تک اس پر گزراں کرو گے؟
 کب اور کہاں اپنے حصے کے اشجار لگاؤ گے؟
 دیکھو بابا!
 یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو
 بھوکے مر جاؤ گے!!

حطاب کہو، اب کیا بچو گے؟
 جنگل تو سب شہر ہوئے ہیں
 گلی گلی میں پائپ بجھے ہیں
 دیواروں اور سڑکوں کی
 گنجائش میں
 حسن سلوک اور حسن طلب
 متروک ثقافت کے قصے ہیں
 بچنے اور خریدنے والے
 ایک ہی تھیلی کے پٹے بٹے ہیں
 نام و نمود کی، اصراف کی گہما گہمی میں
 نامحدود ستائش کی خوش فہمی میں
 حسن گلو سوز بھی
 غارے کا، حسن افروزی کا محتاج ہوا ہے
 کل جو نہیں تھا، آج ہوا ہے

حطاب کہو!
 بے کاری کے دن کیسے کاٹو گے؟
 کن پیڑوں پر وار کرو گے؟

نظم لکھتی ہے تجھے

ایوب خاور

میں نہیں
یہ نظم لکھتی ہے تجھے
اپنی سطروں میں ترے ہاتھوں کی شمعوں کی نزاکت
صبحِ حرفِ خواب کے رنگوں سے لکھتی ہے
تری ان سبز آنکھوں کے انوکھے زاویوں کو، جھوٹ جج کو، مصلحت کو اور حسنِ مصلحت کے راز لکھتی ہے
جانِ جاں بچ میرے لہجے میں
ترے سُرِ تال لکھتی ہے
میرے دن کی اداسی، راستہ ٹکنے کی عجلت
اور میری آنکھیں جو تیری چمپئی خوشبو کی گرہوں میں بندھی رہتی ہیں
ان کا حال لکھتی ہے
نظم میری ہے مگر دھڑکن کے وقفوں میں
ترے قدموں کی آہٹ اور ترے سب خال و خد
نقطوں، کشوں اور دائروں کے باب میں لکھتی ہے کاغذ کی سفیدی پر ترے ماتھے کی روشن جھلس
شامیں درخ کرتی ہے
کبھی تیرے گھنے بالوں سے مضمون باندھتی ہے
اور کبھی تیری سلگتی سانس سے مصرع بناتی ہے
کبھی تیرے لہو کی آغچ سے عنوان پڑاتی ہے
ترے چشم و لب و رخ کے کنارے
تجھ سے ملنے کے کئی رستے بھرتی ہے
کچھ اس انداز سے تجھ کو
میری خاطر
میری یہ نظم لکھتی ہے

دو وقتوں کی ایک نظم

ایوب خاور

(۱)

محبت سے بھرا اک دن
ترے دامن میں کھلنے کے لئے
میری سبک انداز پلکوں پر اترتا ہے
تری خوشبو میں گھلتا ہے
رگوں کی ڈوریوں میں باندھ کر مجھ کو
ترے حسنِ سخن انداز کی چوکھٹ پہ لاتا ہے
بہت آہستگی کے ساتھ
دل کی ایک دھڑکن کی طرح معدوم ہوتا ہے
محبت سے بھرا ہر دن

(۲)

محبت سے تہی اک دن
جو دشتِ جاں میں سوکھے زرو پتے کی طرح سے آ کے گرتا ہے
رگوں کی ڈوریوں میں باندھ کر مجھ کو
ترے بے مہر حسنِ منجمد کے منحرف آئینہ خانے تک تو لاتا ہے
مگر پھر تیری بے مہری کے سانچے میں ڈھلے
برقاب لہجوں سے گزر کر بس ذرا سی دیر کو
اس دل کے سائے میں ٹھہرتا ہے
بہت آہستگی کے ساتھ
دل کی ایک دھڑکن کی طرح معدوم ہوتا ہے
محبت سے تہی ہر دن

محبت کا ایک سال

ایوب خاور

سانس کی پھانس ہے سالے سورج کے سینے میں گڑی ہوئی

چاند حرام لد ہر، سمند رگوٹھ کے اندر

برقوں، برقوں دھنسا ہوا

دن اور رات بھی

نگہ دھڑنگے، اک دو بجے سے لکے ہوئے

ان کے پاؤں تلے مٹی ہے

اور نہ سر پر ٹوپی ہے

وقت آنے والے برسوں کے خلا میں چلتا جاتا ہے

یہ اک سا محبت کا

تھمے ہوئے دن رات کے ننگے پن پر جمتا جاتا ہے

اس اک سال میں

کتنے سال گزاریں گے ہم

ہر اک دن، اک سال مثال

ہر اک دن کی صبح کا سورج حرف سوال

ہر اک دن کی جھسی ہوئی اور بھیگی ہوئی دوپہر

ہر اک دن کی، ہر اک شام شام جمال

ہر اک شام کی رات کمال

وصل کے ہر اک لمحے میں ہیں جیسے صدیاں گھلی ہوئی

ہجر کے ہر لمحے میں جیسے

ہلکی آنچ پر ریت کی دھڑیاں بھنی ہوئی

سینے میں ہر دھڑکن، جیسے

چولستانی اونٹ کی گردن میں ہوں ملیاں بندھی ہوئی

آنکھوں کی دو جھبیوں میں ہیں

کنوں ملال کے کھلے ہوئے

ہونٹ آپس میں ملے ہوئے

بچکیوں میں ہیں بندھے ہوئے

کسی

ایوب خاور

یہ کمرے کا اندھیرا اور گہرا کیوں نہیں ہوتا
درو دیوار سے لٹکی ہوئی یادوں کی جھلکی
اس قدر ہے آنکھیں مندتی ہی نہیں ہیں، ڈھن کی
دہلیز سے لگ کر کھڑی صدیوں کی نیند
بے حیا اور بے باس
ایک کسی کی طرح
بت نے خوابوں کو چولی میں سجائے
دودھ کے جیسی کھائی میں سبک وعدوں کا گلن
اور صراحی دار گردن سے لیٹے سانپ سا کندن
لب نم ساز کی پرتوں کے اندر
ایک انجانے، تھکے ہارے تبسم کی ہنک
ہاتھ پاک مہتاب، نیلم رز و کا نقش، کانوں کی لوڑ میں دعوتی انداز میں بہراتے جھمکے،
پاؤں کی ایڑی سے چٹنی
دستکوں پر دستکیں دیتی ہوئی جھانچھر کی جھرجھر اندر آنے
کے لیے بے تاب ہے کب سے
گھر دیوار و در
گمرے کی ہر اک چیز
کرسی، میز، بستر، لیپ، کاغذ اور قلم
غزلوں کا پائیں باغ اور نظموں کا جنگل اور اس جنگل کے

ہراگ پیڑ کی شاخوں سے پتوں کی طرح چٹے ہوئے جگنو
 اور ان سب جگنوؤں جیسی تری آنکھوں کی گہری ٹٹم ہٹ ماند پڑتی ہی نہیں،
 کمرے کا یہ دھندلا اندھیرا اور گہرا کس طرح ہوا
 اس دھندلے میں یہ آنکھیں بند کیسے ہوں!!
 یہ کسی نیند

آخر کس طرح
 حیرت لدی پلکوں کے پیچھے پتلیوں کی کھوہ میں جائے گی
 اندھیرا جب تلک گہرا نہیں ہوگا
 یہ سب منظر، ترے سب عکس جو کمرے کی ہر شے میں مقید ہیں
 اگر مدھم نہیں ہوں گے تو اندر کا اندھیرا اور گہرا کس طرح ہوگا
 یہ کسی رات کے پچھلے پہر

جب ساری دنیا کی تھکی آنکھوں کو ان کے
 ہٹے کے کچھ خواب دے کر مجھ تک آتی ہے،
 کھڑی رہتی ہے میرے ذہن کی دہلیز پر اور دستکوں
 پر دستکیں دیتی ہے، آ جاؤں میں آ جاؤں!!!
 مگر کمرے کا یہ دھندلا اندھیرا
 اور تری آنکھوں کے جگنو

نیند اور حیرت لدی پلکوں کے بیچ
 اک منقش آئینہ خانہ ... خلا
 اے خدا!!

آدمی

سعادت سعید

پختہ تر ہو کے ابھی خام ہے
ابن آدم
عقل مرتخ سے ہو آئی ہے
کیا بگڑا ہے؟
میں کہ انسان ہوں
جنگل میں ابھی رہتا ہوں
یعنی تاریکی کی اقلیم کا باسی ہوں
کہ انسان مراد اسم ہے
کمزوروں کو کھالیتا ہوں
روشنی عصر مہذب کی ہے بیکار
کہ فرعون ابھی زندہ ہیں
زر گرد چارہ گرد افسوس گرد
دلبر و دیدہ و رو و جلوہ گرد
روشنی رستہ مرادوک سکے گی کیسے؟
بے نوا جسموں پہ گرتا ہوں میں بجل کی طرح
سیل نفرت مری گھٹی میں ہے انمول ہوں میں
مجھ کو تجھ سے جو محبت ہے ریا کاری ہے
اس کو مجھ سے جو محبت ہے فقط دھوکا ہے
آدمی میں ہوں کہ انسان مراد اسم ہے

میں زندہ ہوں
موت میرے لیے آگ کھیل ہے
صیاد ہوں میں
کوئلو، ہلبلو، خرگوشو، غزالو
سنو
مری خوراک ہو تم
میں ہواؤں میں عقاب
اور سمندر میں نہنگ
بھینر یا شہر میں
جنگل میں پلنگ
حاکم عالم ارواح ضعیفاں میں ہوں
ہاں کہ جان غریباں میں ہوں
مجھ کو نمرود بھی کہہ سکتے ہو
مجھ کو شداد بھی کہہ سکتے ہو
یعنی تاریکی کی اقلیم کا باسی ہوں کہ
انسان مجھے کہتے ہیں

زبانِ خلق

سعادت سعید

لوگ کہتے ہیں کہ سب ہجر کشیدہ بندے
خود سے بیزار رہا کرتے ہیں
میں بھی جمہور کی رائے پہ یقین رکھتا ہوں
یوں خرافاتی بگولوں کی سراسیمہ فضا میں مجھ کو
اپنی آغوش میں لے لیتی ہے
ہجر کے بطن میں جو روشنی ہے
اس کو تاریکی کے سیال زمانے کا مکاں جانتا ہوں
بنسری ہجر کی ناطق ہے
رہے گی شاگی
یہ کہانی ہے مگر لولا کی
طاہر جان ہے کیا؟
نورِ مستور سے مجبور
مقید عاشق
میں کد آوازوں
پھڑکتے ہوئے لفظوں کے
حبابوں میں گھرا ہوں کب سے
سر پہ افتاد پڑے کوئی
تو وہ سوچ سکیں
گہری تاریکی میں ملفوف

اُجالے ہی تو ہیں
کہکشاؤں کو اگر کالے شگافوں سے نکلتا دیکھیں
ان کے دامن میں نہاں
گھومتے خورشید پیالے ہی تو ہیں
کالے ریٹیم پہ چمکتے ہوئے اہمول دکھوں کے موتی
اجنبی وسعتوں میں کیف و طرب کے منظر
لاکھوں سیار جزیروں کی ابد گیر بہشت
کون باغوں سے نکل آئے ہیں جھلمل جگنو
عرصہ ہجر میں آتش بار
نرگس روزنِ افلاک کی ہنستی خوشبو
اپنے ہر خوف کو مصلوب کرو
جھوٹی آوازوں
زبوں لفظوں کی
کسی ویرانے میں تدفین کرو
کون جانے کہ اجالوں کا مقید سورج
کب کسی گھر میں اتر آئے گا؟

نئے منظر

سعادت سعید

اپنا خوش رنگ الاؤ میں بچھا بیٹھا ہوں
 حیریاں تاریکی نے مجھ کو یہی سمجھ یا تھا
 کتنی راہیں ہیں سیاہی کے ابدزاروں میں
 آگہی جن پہ رواں ہو کے امر ہوتی ہے
 گرداں آوازیں کہ بے کل الفاظ
 مرے، عصاب کے محبوس خلاؤں میں ہیں بے حس
 یہ کبھی زندہ تھے
 ایسے ہی
 کہ ہم زندہ ہیں
 ان کا نیرنگ گیا
 رنگ گیا
 ان کی خوشبود رہی
 ان کی تمازت نہ رہی
 ان کے مفہوم کا دفتر ہے
 تصور میں ابھی تک راسخ
 مجھ کو وہ
 روشنی کا درس دیا کرتے تھے
 آج تک زندہ
 مرے گنبدِ ادراک میں

سانسوں کی دو آواز ہے
 میں جس سے سلگ اٹھا تھا
 اس نے اس رات
 مرے نام کو پیچھا تھا
 اور شرب کے
 یہ دھیرے سے کہا تھا مجھ سے
 میری تاریکی کو
 خوش رنگ الاؤ سے نہ تم ختم کرو
 مجھ کو انجان اندھیروں ہی میں گم ہونے دو
 میرے نورانی چراغوں کی
 یہ کرنیں تو فقط دھوکا ہیں
 اپنے خوش رنگ الاؤ کو
 بچھا دو کہ اندھیروں کا جہاں دائم ہے

نام کی بات

سعادت سعید

رات گئے تک
ہم نے کچھ بھی نہ سوچا
جسموں کی ڈھلوانیں دیکھیں
اس نے میرے
کہنہ دکھوں کے
خشک گلاب نہ سونگھے
میں نے اس کی شریاتوں میں
وردگار نگ نہ پایا
کان ہمارے
پوروں تک کی آہٹ سن نہ پائے
میں نے بوجھل آنکھوں سے
اک سیت دیکھی
اپنی ہی کفنائی میت
ہر سوتیز ہوا کے جھونکے
سامنے لیے گہرے غار
میں جب اپنے
سن کی مسند پر سج بیٹھا
میرے قرب کی
بے کل خوشبو

اس کا کرب بنی
میرے خواب کے خرمن پر
پھر خنداں برق گری
دل کے کھر درے پھر پر
اس کا نام نہ تھا
اس کے کاغذی پیراہن سے
شوئے غائب
میرے نام کے نقطے غائب
بہم، مہمل فقرے تھے
ہو ذابجد کیا کرتے
اسلوب کے کالے قلزم کے
ہم پارا تر نہ پائے
جن میں عشق کے پھول کھلے
وہ دشت و در نہ پائے

نئی زندگی چاہیے

ڈاکٹر فاطمہ حسن

میں پہاڑ ایک اونچی سا چُپ چاپ
ساکت کھڑا

آتے جاتے ہوئے موسموں کو گزرتے ہوئے دیکھتا
مجھ پہ گرتی ہوئی برف پتھر کے مانند جامد بھی
اور تبھی نرم پانی کے جھرنوں میں بہتی ہوئی
جھالروں کی طرح میرا سنگھار تھی
اب جو موسم بدلنے لگا

پھوٹی کونپلوں نے نئی زندگی کا سندیہ دیا
مجھ کو وادی بہت سون سونی لگی
کیوں کہ بھیڑوں کے مالک
تبھی ریوڑوں کو ہٹکا لے گئے
دورا کی جگہ

جنیں گی، نئی نسل بھیڑوں کی ان مالکوں کے لیے
میں کہ صدیوں سے چُپ چاپ ساکت کھڑا
منتظر ریوڑوں کا، گذریوں کا ہوں
مجھ کو وادی میں پھر زندگی چاہیے
جوازل سے ابد تک رواں ہو

یاد گرد

ابراہیم احمد

(اکرم محمود کے نام)

تمہیں دیکھا تھا میں نے..... جب مہ و سال گزشتہ سے نکل کر.....
تم یہاں آرام کرنے کچھ حساب عمر رفتہ کرنے آئے تھے کہ جب آسائشوں کے دن تھے فرصت سے
بھری راتیں

تمہارے پاؤں کے نیچے کہیں خوشبو کا رستہ تھا جہاں تم اپنے اگلے پن کو اڑھے خوش خرامی کر رہے تھے

تمہیں دیکھا تھا میں نے سامنے اس بیچ پر بے چین تہائی کے جھرمٹ میں کہیں کچھ سوچتے
نمناک آنکھوں سے درختوں کی طرف تم دیکھتے دیکھے چلے جاتے بہت حیرت سے میں کہتا کبھی تم
سے..... کہ اب ایسا بھی کیا آخر؟

سو پھر اک روز تم اٹھ کر کہیں کو چل دیے تھے اپنے آنسو پونچھ کر تکتے ہوئے ہم سب کے چہروں کو
ادھر میں آج اس دہلیز پر بیٹھا ہوا گناہوں سنگ میل رستوں کے کنارے سوچتا جانے کدھر کو جا نکلتا
ہوں فراموشی مجھے آواز دیتی ہے کوئی بارش بلاتی ہے مرے اطراف میں اک خاموشی کا نئے اگاتی
ہے..... مری ان جلتی آنکھوں میں

جو مجھ کو آج یوں حیران ہو کر دیکھتے ہیں انہیں اب کیا کہوں تم ٹھیک روتے تھے!

منزل صبح

ابرار احمد

یہ جو معمورۂ دنیا ہے، یہاں
سب کے ہتھے کا سفر ہوتا ہے
سب کے قدموں میں لکھی ہوتی ہے
اک مسافت، کسی منزل کی طرف
ہم نے چل پھر گے بہت دیکھ لیا
ہر روش خاک اڑالی ہم نے
اور اس راہ کا اک پھول ہو تم
پھول بھی سب سے الگ
جس کی خوشبو سے مسکتے رہے ہم
جس کی رنگت سے رنگتے رہے ہم
ہم تو اب ٹھہرے چلے جاتے ہیں
اور آگے، بہت آگے کو نکلتا ہے تمہیں

منزل صبح ہے

اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے

میرے بچے! سفر آغا زبوا

جس جگہ پاؤں پڑے رنگ کھلے

جس طرف آنکھ اٹھے
تو سب قریح بن جائے
جاؤ بچے
ہے قرینہ بھی بھی
ساعتِ وصل، جدائی کا مہینہ بھی
جب بھی تم لوٹ کے آؤ
ہمیں پاؤں گے یہیں
انجی دیواروں کے اندر
یا ... تر خاک کہیں

مگر یہ خواب ہیں میرے

انوار فطرت

میں کالی رات سے
 بچھڑا ہوا
 بھیگا ہوا
 نکلڑا جی ہوتا تو
 تری جاگی ہوئی آنکھوں کو بکلاتا
 میں ہا دل گر کوئی ہوتا
 تو چپکے سے
 جھلستی دو پہر کی اونگھتی تنہائیوں میں
 تجھ کو لیتا
 بھگوتا چہرہ تیرا
 ہوا ہوتا
 تو تیرے سر پہ
 تیری اوڑھنی نکلنے نہ دیتا
 میں تیری صبح سی روشنیوں میں
 تیری راتوں ہی سیہ زلفوں کی شاخوں کو
 جھکا رکھتا

سمندر میں اگر ہوتا
 تو تیرے مرمیں پاؤں بھگوتا
 اور اپنے ساحلوں کی ریت پر
 جھکے ہوئے موسم بناتا

میں ہوتا گر
 مگر یہ خواب ہیں میرے
 میں کچھ بھی تو نہیں ہوں۔

یہ اپنی سوڈ کب مکمل کراؤ گی

انوار فطرت

چاند کی کرنوں سے میں نے

اک آنچل بن رکھا ہے

تارے اس میں جڑے ہیں

اور ہوا سے گہر رکھا ہے

جب یہ آنچل ٹوٹاڑھے تو

تیرے سر پر ٹھہر نہ پائے

میں اس بوڑھے پیڑ کے نیچے

کب سے کھڑا ہوں

وقت کھڑاویں پہنے

دو دو دور بہت ہی دور تلک جا پہنچا ہے؛

آنچل جھستا جاتا ہے

تارے بھی بجھتے جاتے ہیں

اور ہوا

یہ بوڑھی ہوا

اور میں

کمینی بات

انوار فطرت

چھوٹی چھوٹی باتوں میں

کیا بڑی بڑی باتیں ہیں۔۔۔ جیسے

دروازے کی درزوں سے

کچھ ڈبلی پتلی کرنوں کا درآنا

اور خیال کا، چاند، ستاروں،

سورج، نووا، سپرنووا

اور خدا تک جانا..... اللہ اکبر

بڑی بڑی باتوں کے بلوں میں

چھوٹی چھوٹی چوہیاں اپنی خوف زدہ آنکھوں سے

ہم کو جھانکتی رہتی ہیں، ہم جیسے خدا ہیں

کوئی خدا کی بات کرے

تو ہم پر بودا پن چھا جاتا ہے

ہم خود کو کیسے کمینے لگتے ہیں

تنہا کا قضیہ

اتوار فطرت

ٹپک رہا ہوں

یہ

ٹپ :

ٹپ ،

کہ جیسے آبِ گراں کے گنبد میں گونج گم ہے

غروب ہوتی ہوئی یہ بنھیں،

یہ دمِ دم جھوم کرتے نفس کے گنجل،

یہ شہرِ گنجان کی ٹریفک،

بلائیں چاروں طرف سے ہارن بجا رہی ہیں

یہ تیری کنچا سی سرد آ نکھیں

اے ستِ رومرگ پیہم کے برف چرے

تلاش اس کو جو کھو گیا ہے

جو سوچتا ہے

پچاس برسوں سے سوچتا ہے

ترے لپیٹے میں آئے، اپنا نشان پائے

امان پائے

میں سوچتا ہوں، میں سو رہا ہوں

میں سو رہا ہوں، میں سوچتا ہوں

میں تنہا تھا

تنہا میں بٹ گیا ہوں

یہ میرے چوکھ جو بھڑسی ہے

یہ بھڑ میں ہوں

یہ بھڑ مجھ کو گچکی ہے

کہ جیسے میلے میں

کوئی بچہ:

ہر ایک چہرے کو دیکھتا ہوں

ہر ایک چہرہ ہے میرا چہرہ

مگر میں گم ہوں

اندھیرا پل پل برس رہا ہے

یہ گھن گھور سیال ہوتی شب

میں جس میں

قطرہ

قطرہ.....

چار دنوں کا قاتل

علی محمد فرشی

میں نے اپنے چار دنوں کے

ٹکڑے کر کے

صدیوں کے بھوکے

ان برسوں کے ہاتھ پر رکھا

جن کو میری عمر کا خاندان نہ کرنا تھا

اس لا حاصل جیون کی یلغار سے بچ نکلے

ان چار دنوں کے

قتل کا مجرم

میں ہوں

شاعر!

جو لفظوں کے مردہ پرندے

زندہ کر دینے کے بھید سے واقف تھا

لیکن مردہ شہر کے زندہ مردے

میرے قتل کی سازش

روز بتاتے

آٹے دال کا بھاؤ بتاتے

”بھاری بستے کب اٹھتے ہیں

بچپن کبزا ہو جاتا ہے

خالی پیٹ تو

بسم اللہ کا بوجھ اٹھانا بھی مشکل ہے“

اک دن بات سمجھ میں آئی

لفظوں کو زندہ کر دینا کیا کام ہے بھائی

”رات کی خبروں میں دیکھا تھا

ایک ستارہ

جس کو راکھ ہوئے بھی

دو سو سال کا غرصہ گزرا

اُس کی کرنیں

ابھی زمیں تک آتی ہیں

تم بھی شاید اسی ستارے کے پاسی ہو

دو سو سال سے پہلے والی دنیا کے باشندے!

زندہ لفظوں کا کیا کرنا

ہاں، اعداد کو زندہ کر سکتے ہو تو؟

آؤ آج ہی سیٹ سنبھا لو

اچھی پے ہے اور اضافی ”آ سائٹس“ بھی“

میں نے، گھر کے چار افراد کو

زندہ رکھ لینے کی خاطر

اپنے چار دنوں کا قتل کیا تھا

سب کہتے ہیں

”ٹھیک کیا تھا“

تم کیا کہتے ہو

بھائی!

دہلیزی

وحید احمد

اے لہس گزیدہ سن! وہ چھوڑ گیا تجھ کو
 اے زعم کشیدہ دیکھ! تو چنچ گیا ہے، لرزیدہ بنیاد پہ بیٹھا ہے
 جو تیرے نہاں خانے میں پیر کا ریشم بننا تھا
 پھر دن بھر ننگے پاؤں
 دیوانی پیٹھے پہ فنکاری سے جھول لٹکائے
 جو تیری پھوٹی نرم کپاس کی روئی چٹنا تھا

اے شاخ بریدہ سوچ! وہ توڑ گیا تجھ کو
 جو تیری جڑوں کو اشک بہا کر سینی کرتا تھا
 وہ ہر جائی باغوں میں تیری قلم لگاتا ہے
 بیگانی ڈال پہ تیری آنکھیں اُگتی دیکھتا ہے
 وہ غیر زہیں میں تیری شاخ سے پھول کھلاتا ہے

اے زہر چشیدہ مان! وہ پی گیا تیرا رس
 جو شام کے پیمانے میں حیراج م بناتا تھا
 وہ مے کا سوداگر
 اب ہمیشہ مے میں غیر کا سر کہ بیچا کرتا ہے

خاک بسری

وحید احمد

زیست کرتے ہیں تو ہم خاک بسر کرتے ہیں
سانس کو کھینچتے ہیں چہرے کے روزن سے ہم
اور پھر شام و سحر کھینچتے ہیں
دل کو دھڑکاتے ہیں بنجر سے بنی دھونکی سے
آنکھ سے تارِ نظر کھینچتے ہیں
پیدا ہوتے ہیں تو کٹ جاتی ہے جیون کی پتنگ
ہاتھ جھٹکوں سے کلنی پہ ہل کرتا ہے
اور انگوٹھے سے چھنگلی کے دھندلے اندر
بس لپٹی ہی چلی جاتی ہے
ہاتھ پر آٹھ بناتی ہوئی ڈور
سارا دن گونجتی رہتی ہے یہ دنیا باہر
راست کو سنتے ہیں اندر کا شور
عمر کی لمبی سڑک پر چلتے
اپنے اندر ہی سفر کرتے ہیں
زیست کرتے ہیں تو ہم خاک بسر کرتے ہیں

سراب پوش

وحید احمد

سلیس رنگوں کا پیرہن ہے
بدن کا حصہ بنا ہوا ہے
چھریرے تن کا ہر اک مسام
اس کے سوت ریشوں کے ساتھ مل کر
بڑی سہولت سے سانس لیتا ہے
جسم کی آج
ہلکی پوشاک سے نکل کر
بس ایک ہلکے سے قاصدے پر نواح میں تھر تھرا رہی ہے
یہ نرم لرزش سراب دیتی ہے
اور
پھر جب سوال کرتی ہے چال
تو آج کسمسا کر ہر اک قدم کا جواب دیتی ہے،
بولتی ہے
یہ سادہ پوشی مجھے تو حیران کر رہی ہے
لباس کی یہ کپاس میری نظر کو کھلیاں کر رہی ہے

اجنبی

وحید احمد

ایک لوری

مقصود و وفا

دراز و دور سے آئے ہوئے مسافر ہیں
ہے ایڑیوں میں دبا ٹوٹی کہکشاؤں کا گانچ
جگر کی سرخ رگوں میں شہابِ ثاقب ہے
شفق کی ریشمی پتھٹ ہے دل کے برتن میں
تو سانسِ دان میں تاروں کا نرم راتب ہے
کھسے ہوئے تھے کسی عرش پر صداؤں کے پھول
کرن کی ڈور کو دہرایا، ان کو باندھ لیا
بس یہا کرنے میں خاروں کا دھیان ہی نہ رہا
ہماری پوروں پہ ان کے نشان باقی ہیں
کسی سرائے میں ٹھہرے پرگی کی صحبت میں
کہیں پہ جتے رہے اور کہیں پکھلتے رہے
کہیں پہ روشنی رفتار کر کے پھیل گئے
کہیں پہ وقت جو کج ہو گیا تو ذرہ ہوئے
اگر بگڑ گئی ترتیب، کوہِ سار بنے
کہیں پہ جسم جو شق ہو گیا تو ذرہ ہوئے
یہاں پہ آئے ہیں، پوشاک ہی میں رہتے ہیں
نکال کر تھکی گردن کو دیکھتے ہیں ہم
دراز و دور سے آئے ہوئے مسافر ہیں
زمین پہ بیٹھے ہیں اور سانس لے رہے ہیں ہم

خوب تھا پھول بھی
خوشبو سے بھری راہیں بھی
خوب تھا زخم بھی
اور زخم بھری سانسیں بھی
خوب تھی ہجر کی محفل بھی.....
ترے وصل کی تنہائی بھی
خوب تھا سبزہ یہاں
خوب تھی دیرانی بھی
خاک کے راز بھی
اور راز میں کھتی ہوئی حیرانی بھی

اس تماشے میں خموشی سے صدا کرتی ہوئی
زندگی! میری کہانی بھی بہت خوب رہی
ریت پر بنتا ہوا اٹتا ہوا
زندگی! تیرا فسانہ بھی بہت خوب رہا
خواب میں خواب کا آنا بھی بہت خوب رہا

بے خوابی

فرخ یار

یہ چہ نہ	مجھے یہ مکاں
یہ کھاوی	اب بدلنا پڑے گا
یہ کا تا گیا سوت	ہری سانس رکنے لگی ہے
نکردار ہیں اُس کہانی کے	ہری خاک میں
جو ملکجے میں	خار و خس بھر گئے ہیں
ہواؤں، گھٹنے ہاولوں سے گزر کر	تجھے اک زمانے سے
زمین پر رُکی	کہتا چلا آ رہا ہوں
اور زمیں اولیں حیرتوں کی نشانی	ہری گفتگو میں تعلق کو پیوند کر
اسے اب سنائے چلی جا رہی ہے	آئینے سے نکل
زمین پہلا کلمہ	دھیان کر
زمین چارہ جو بھی	دھیان کر
زمین سرخ زرد بھی	تیرے چرنے پہ
نگر بے دھیانی میں لکھی مٹی سطر ہے	کا تا گیا سوت کچا ہے
جس کے اطراف	جو کھڑیوں سے
اک بے لہاسی رہے گی	لپٹ کے بھی کچا رہے گا
نٹھرتے گزرتے یگوں کے برابر	اسے تان کر کوئی کھادی بنے گی
میں اس بے حجبی سے	کہاں بن سکے گی

گھبرا گیا ہوں

کوئی بیچ ہے

بیچ در بیچ ہے

جس میں بیداریوں کے مقابل

دُھواں چل رہا ہے

دُھواں جس سے

دیوار و دراث گئے ہیں

کہیں وہ جو آ باد تھے

دل کی آ باد یوں میں

وداع ہو رہے ہیں

بتایا گیا تھا

ازل کی لکیروں پہ

رکھا گیا ہے

ابد کا کنارہ

مگر تو نے دیکھ

ازل بھی مسلسل

ابد بھی مسلسل

کہاں کی لکیریں

کہاں کا کنارہ

پہاڑوں، درختوں

کناروں سے لپٹی ہوئی زندگی میں تعاقب

جدائی کی شاخوں پہ

کھلنے لگا ہے

تجھے اک زمانے سے کہتا چلا آ رہا ہوں

مہافت بھری دو پہر

نیند کی مٹلیوں پہ نہ رکھ

آئے سے نکل

دھیان کر

دھیان کر

دیکھ تیری "فراری"

سواری سے خالی اُڑے جا رہی ہے

مجھے اُس نے جتنا شب کی کہانی میں

فرخ یار

جہنم جہنموں سے وہ جنتی رہی مجھ کو
جب اس کے سامنے
گڑی نہ تھی
سایہ نہ تھا
دیوار گریہ کا
جب اس کے سامنے
خوابیدہ رستوں پر
دھواں تھا
راگانی تھی
مجھے تب بھی جتنا اُس نے

مجھے اُس نے جتنا
شب کی کہانی میں
مکان کی سڑھیوں پر
لامکانی میں
ہوا کے زوہرو
دن کے نکلنے سے ذرا پہلے

وسطی عمروں کی ڈھارس

فرخیار

کہنے کو تو
نیند بھی اک جگراتا ہے
آنکھوں کے پٹ بند ہیں پھر بھی
ہم خاکِ دیوار میں توڑتے
کسی زمیں پر کسی زماں تک
جاسکتے ہیں
تاروں کے انگارے لے کر
ٹھنڈے دل دہکا سکتے ہیں
اور اپنا دل
کسی بخ بستہ رقبے کے کونوں
کھدروں میں رکھ آئے ہیں
کچھ کہہ نہیں سکتے
کہنے کو تو
سب اچھے ہیں
دفتر، افسر، اور ہم منصب
جن کی جوش بھری باتوں میں
خواب آور رنگینی ہے
سب کہتے ہیں دن بدلیں گے
ہم بدلیں گے

کب بدلیں گے، چاروں جانب
روز و شب، دیوار و در معلوم نہیں
پردے دیکھتے دیکھتے
۲۰ کیلنڈر بدل گئے ہیں
کہنے کو تو
سینہ سینہ، کمرہ کمرہ
نور بھرا ہے
اپنا گھرا پنی جنت ہے
جس کے باغ میں پیڑ زمرہ جیسے
پھل نلیم کی صورت میں
کمروں، پیڑوں، جنت کے رنگیں دروازوں
سے کچھ ہٹ کر
یہ سرخی یہ منظر نامہ
ذرا توقف سے دیکھیں تو
ہر کمرے ہر سینے میں گھبراہٹ ہے
اور جس باغ کا ذکر ہوا ہے
اُس میں اک اکٹھا ہٹ ہے
کہنے کو تو
کچھ بھی کہا جاسکتا ہے

زنجیر ہلتی رہتی ہے

فرخ یار

دن تو سب اک جیسے ہوتے ہیں
 اپنے اپنے قد
 اپنی اپنی بینائی سے
 مضمون بدلتا ہے
 دنیا گرد و پیش کو قطرہ قطرہ
 جوڑ کے زندہ کرتی ہے
 الف سے ب تک
 ب سے یے تک
 کب سوچا تھا
 بھاگتے بھاگتے
 خود سے ہی ٹکرا کر
 لوٹ آئیں گے
 بے ترتیب مکانوں میں سناٹا
 کان کی آواز سے چپکے کے اتنا اونچا
 بولے گا کہ نیندیں
 مستی کے درجے میں
 صفر سے نیچے گر جائیں گی
 چائے کی سُرخ سے پہلے
 غفلت کا دیباچہ لکھنا پڑ جائے گا
 نا اُمیدی اور اُمید میں ایک تعلق
 بھڑکی ہوئی دیواروں جیسا
 باہم بھی متوازی بھی
 اس رشتے کو جیون کا سرنامہ کریں
 یوں تو دل غلت
 بستر چکنائی سے بھر جاتا ہے
 کاغذ، قلم، کتابیں
 پل پل کرنے لگتے ہیں
 دردِ انت ہے لیکن کس طاق پہ رکھیں
 غلجست میں روحانی یا جسمانی ہونا
 مشکل ہے
 دل سے دل
 آنکھوں سے آنکھیں جریں
 تو کرموں کا پہیہ چلتا ہے

عشق نبھانے کو

پورا انسان ضروری ہے

جس کو دیکھ کے

پودے پھولوں، پیر پھلوں سے بھر جاتے ہیں

جس سے مل کے

حیرت کو تعویذ بنانا پڑتا ہے

اُلٹے سائوں کی کنتی میں

غلطی کا امکان ہے

ایک خیالت ہے

جو یکنائی سے لپٹی

دیواروں پر اُگتی ہے

بڑھتے بڑھتے جسموں کے پُر پیچ

دُھند لکوں میں جا پڑتی ہے

ایسا لگتا ہے ہم

آنکھوں کے پردوں سے لے کر

آنکھوں تک آلودہ ہیں

جس کو سوچا

اُس کو دیکھنے

چھو لینے کی خواہش ہے

تم کہتے ہو کل دیکھیں گے

کل ہتھو لیں گے

آج تمہاری بے چینی

دو سو تر بڑھی ہوئی ہے

کل کیا دن بچو تم کے افقی خط

سے ناک نکالے گا

یا چلو بھر حیرت کے ستاروں میں تم

اپنے آپ پر اترو گے

دن کیا!

دن تو سب اک جیسے ہوتے ہیں

ہاتھ سلامت رہیں تو دل بھی

دردِ دل بھی قائم

ہر شے زندہ

ہر شے روشن

بے خبری سے زخمت لے کر

ہم حاضر بھی اور شریک بھی

اپنی عرضی کے خود کا تب

اور خود ہی مکتوب الیہ

تم کہتے ہو کل دیکھیں گے

سوا میرے

پروین طاہر

ہوا کے ایک جھونکے نے
ذرا سا چھولیا اُس کو
شرارت سے بھری بھیگی گھٹانے
اک حسیں بوسہ دیا اُس کو
کسی حیران چڑمانے
نشیلی مدد بھری آنکھوں میں
لجھ بھر کو جھانکا تھا
سنہری آفتابی اک شعاع نے
اُن سنبھلی پلکوں سے
لمسیدا، کوئی حدت بھرا سا
دان مانگا تھا
(دیا اُس نے)
ہوا کی اس جسارت پر
گھٹا کی اس شرارت پر
کرن کی آرزو سے
اور بگیری کی تمنا سے
کوئی خائف بھدا ایسے بھی ہوتا ہے
سوا میرے!!

یہ دل روٹھا ہوا ہے
آج کل اُس سے
نہیں اُس سے نہیں!!
ناماخص ہوں خود سے

سرسوں کنارے

پروین طاہر

یہ لہلہاتی، گھلکھاتی سبز پیلی کھیتیاں
ہوا کے ساتھ جھومتی ہوئی نشیلی کھیتیاں
یہ پیلی پیلی کھیتیاں ہیں پڑکھوں کی نشانیاں
سنا رہی ہیں مجھ کو بیتے وقت کی کہانیاں
یوں آ رہی ہے ان سے خوشبو تازہ اک جہان کی
کہ کھڑکیاں سی کھل رہی ہوں جیسے خوش گمان کی
میں اک دھڑکن تڑاد ہوں مگر مری یہ کلپنا
پتنگ کیوں بنی ہوئی خدا کے آسمان کی
یہ دل کرے سراہنا ہرے بھرے جہان کی
میں پچھلے سات جنم سے ہوں بنی اک کسان کی
عجب خوشی سے بھر گئی میں ڈوبتی سی تہ گئی
میں بے وطن جو مدتوں کے بعد اپنے گھر گئی

میں آگہی وہ

سعید احمد

میں گدھے کا سمندر پار گر پایا نہیں
میرے لیے لا انتہا کے پانیوں کا اہتمام!
اجنبی سے اس جزیرے پر اُگے گہرے گھنے جنگل میں گم
ایک خود رو پھول کی تنہائیاں شدید مری تنہائیاں ہیں
میں کہ میرے چار سو تاریخ کی نامختتم پگڈنڈیوں کے سانپ دائم شوکتے ہیں

جون کے تیروں کی ساری تلخیاں اپنے گدھوں کو منتقل کرتا ہوا وہ
گرم اور لمبے دنوں کی راہ پر اپنے پسینے کو لبو میں ڈھالتا
اک گلی سے دوسری کی سمت یوں محو سفر
وقت کی بدرو میں جیسے تیرتا لمحہ امر لمحہ کوئی

میں تذبذب سے بھری پوری صدی کی اک شکستہ کھٹ پر بیٹھا کہانی لکھ رہا ہوں
جس میں کرداروں کی گنجائش ذرا کم کم تھی سو آخر (ب م لکھ کر بات کو آگے بڑھایا ہے مگر
رات کے ایوان میں بجلی چلی جانے سے ساری روشنی مرنے لگی ہے میرے اندر
ہر تھکے کے کنکروں سے آنکھ بھرتی جا رہی ہے

زندگی کی بے معانی رمز کے معنی کی فکروں سے ورا آفاق میں کھویا ہوا وہ
جس کی گہری پُرسکوں نیندوں کے ستارے پہ بارہ چاند جھلمل جھلملاتے ہیں ہمیشہ

جل پری

سعود عثمانی

اے دھابہ آب و گل، اے رمزد
اے سمندر کی سفیر خوش نوا
تجھ سے مل کر ہوں میں خود پر منکشف
مجھ سے بڑھ کر تو ہے میری آشن
تیرے گیتوں سے لہذا میں چارنو
صفحہ در صفحہ مرے دل کی کتاب
اے تیرے دل کی کلیں، اے ناز میں
اے میری تنہائیوں کی رازداں
اے میری کیفیتِ خواب و خبر
نیند اور بیداریوں کے درمیاں
تیری آوازوں سے مجھ میں مرتعش
گہرے نیلے رنگ کی یہ سطحِ خراب
میں ترا دکھ جانتا ہوں میری دوست
کوئی تجھ سا ہے نہ مجھ سا اور ہے
ایک دنیا میں بسر کرتا ہوں میں
پھر بھی میری اصل دنیا اور ہے
اصل دنیا، کون سی دنیا میں ہے؟
اے جہانِ زود ہجر و دیر یاب
کچھ لکیریں میری پابندی لے بھی

کھینچ رکھی ہیں حدِ ادراک پر
نیلگوں قلم سے میں بھی دن ڈھلے
لوٹ آتا ہوں سنہری خاک پر
کاٹا ہوں دو جہانوں کی تھکن
سانس لینا چاہتا ہوں میں، جہاں
سانس لیتی بستیاں ہیں زیر آب
جل پری اے جل پری اے جل پری
دل کے رازوں سے مجھے آگاہ کر
آب خوردہ خواہشیں، نم دیدہ غم
ان جہازوں سے مجھے آگاہ کر
جو کہیں ان دسعتوں میں غرق ہیں
تہ بہ تہ خاموشیوں میں جو خواب
اے میری صبحِ ازل، شامِ ابد
اے میری وارفتگی، اے شاعری
اے مرے موجود ہونے کی دلیل
شاعری، اے جھپٹنے کی روشنی
اے نگارِ نیم روز و نیم شب
اے وجودِ نصف خاک و نصف آب

جھیل

اقتدار جاوید

ریشمیں سلوٹوں سے بھرے
 پانیوں پہنڈاڑ
 میری تصدیق کر
 میری حالت سے جو
 اپنے ممتا بھرے گول چکر سے مڑ
 اور بتا!
 جھیل میں ایک کنکر گر
 سینکڑوں دائروں میں بنی جھیل
 کیسے ترپنے لگی
 فرق دانوں کے انبار پر
 لا جو ردی فلک کے تلے
 آتشیں اینٹ
 اپنی جگہ سے اہل
 بیچ میں ایک پردہ
 جو کھل رہا تھا ہزاروں برس، ہٹ گیا
 تیز طوفان اٹھا
 ڈرتے اوپر اڑے

نیچے جو ہڑینا
 اپنی کھلی پہ جیسے زمین تیز ہونے لگی
 ظہر کے وقت جب فرش اکھڑا
 نمازی اچانک یہاں دم بہ دم
 گھرے ہوتے گڑھے میں گرے
 میری تصدیق کر
 جھیل کی سطح خاموش کے نیچے
 کھرام ہے
 جھیل کی سطح خاموش کے نیچے
 آپس میں گڈمڈ پڑے لوگ ہیں
 جھیل کی سطح خاموش کے نیچے
 قرونوں سے دہکی ہوئی آگ ہے!!

درمیانِ آسمانِ اصل

اقتدار چاوید

نکیر نے	نگاہ برق سی پڑی	ستاروں والی رات ہو
کھڑاؤں کو اتار کر	تو اُس نے اُس ورق کو	کناروں والا آسمان ہو
برس کئی گزار کر	حریرِ جاں بنالیا	نہ زیب داستان کے واسطے
کہا	یہ کائنات اک ورق ہے	میں کہہ رہا ہوں
”کتابِ زندگی کا	اس پہ	اور
اولیں اور آخری ورق	جس جگہ بھی ہاتھ کو رکھیں	فقیر کی طرح
خدائے پاک نے	وہی ہے درمیانِ اصل	نہ مجھ پہ کوئی جبر ہے
خزانہ ہائے غیب میں	آسمان پر	کہ
چھپالیا	جہاں کہیں نظر پڑے	اگر کو جہاں سے
یہی ورق	وہی ہے درمیانِ آسمانِ اصل!	آنکھ بھر کے دیکھ لیں
جو کائنات کی قدیم اصل ہیں	پھول ہو، خیال ہو	وہ سارا ابر ہے!!
فلک کے پار ہیں پڑے	یا سانس ہو	
ہر ایک حرف ہے	یا سانس جیسی چمنیوں سے	
مقطعات سے جڑا!	دم بدم	
سو	نکلتی بھاپ ہو	
درمیاں سے	ہزار ہاں	
جس کے ہاتھ جو ورق لگا	ہزار ہاں نہیں ہو	
جہاں	یا فقط نہیں ہو	
حروف پر	اس کتابِ زندگی کا درمیان ہو	

ہرے وجود میں ہزار ہا وجود ہیں
 جو
 ایک دوسرے سے محو جنگ ہیں
 ہے ایک یدھ پڑا ہوا
 ہر ایک ہے مقام خاص پر کھڑا ہوا
 گئے ہوئے ہیں سب نے ترکشوں میں تیر
 تیز ہر میں بجھے ہوئے
 غلام کا قدم
 اپنی لباس میں
 کئی دنوں سے غرق ہیں
 وہ دیکھنے میں آدھی ہیں
 اصل میں
 وجود کو جلانے والی برق ہیں
 وہ تاک میں ہیں
 نوک نیزہ
 اک نقاب پوش خویرو کے دل کے پار ہو
 تو
 وہ بھی اپنے ڈھنگ سے
 گزاریں باقی زندگی
 وہ طوق کو اتار دیں
 جھٹک کے گردنوں کو
 طوق پھینک دیں
 مگر نقاب پوش تک، پہنچنا ہی محال ہے
 ہیں درمیان میں
 بہت سے مرحلے
 جنہیں عبور کرنا ممکنات میں نہیں
 معاملہ یہ اور طرح کا ہے
 جو
 کسی کے ہاتھ میں نہیں
 بہت سے کامل العیار
 اپنے فن میں تاک ہیں
 بھس کٹی،
 بہت سے پاکباز ہیں
 بہت سے پانیوں کی طرح پاک ہیں
 بہت سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے
 اک طرف کے ہو کے رہ گئے

محبت خواب محبت

ابرار عمر

ایک بستی سے ذرا دور پرے اور پرے
سرخ پھولوں سے مہکتی ہوئی خاموشی ہے
اک تعلق کی کلائی پہ دعائیں باتندھے
اک محبت پس اقرار وفا جھتی رہی
کوہساروں پہ ہوئی برف کی تازہ بارش
ایک کمرے میں ٹھنرتی رہی گھائل خواہش
خواب بے شکل پرندوں کی طرح اڑتے رہے!

بہت سے

ریت کے ستونوں کی طرح

جوار بھائے کا شکار ہو گئے رہ گئے

ہے کس کے ہاتھ میں کشودوبست

کیا پتا

ہے کس کا مرتبہ بڑا

ہے کون سب سے پست

ادھر، ادھر ہے منتظر

ہر ایک اپنی فتح کا

کسی کا آخری ہے پند

کسی کا اولین وار ہے

وہ کون ہیں

مرے خلاف،

کون ہیں، جو میرے سنگ ہیں

مرے وجود میں ہزار ہا وجود ہیں

جو

ایک دوسرے سے جو جنگ ہیں!!

خیر مقدم

عابدہ تقی

تتلی کی تقویم میں

کوثر محمود

سماعت جھروکے کھلے ہیں

اس آواز کے خیر مقدم کو جو

نقرئی آبیشاروں سی ہے

دل کو ہولے سے چھوٹی ہوئی

ٹھنڈی بارش ہے جس سے ٹپکتے ہیں

نیبے، گلابی، عنابی، ہرے، زعفرانی سروں کے سمندر

وہ آواز جس کے ہر اک تار برہم سے ملتی ہیں اب بھی

کئی زمزموں کے ترنم کو سانسیں

وہ آواز اک ساز کا راز ہے، عکس اعجاز بن کر

رگ دپے کی مردہ اداسی میں رس گھولتی

نیم مردہ حواسوں میں روخ اثر پھونکتی

منجھدا رز دواں کے تن کو حرارت

دل لخت کو دھڑکنوں کی بشارت سی دیتی

مرے آسمان گماں میں دھنک ہونے والی

محبت کے شجرے میں نکھی ہوئی

نسبتوں کی جھلک ہونے والی

وہ آواز دیر سماعت کی جانب قدم تو بڑھائے

مجھے زندگی کا یقین تو دلائے!

تتلی کی تقویم میں

صدیاں، سال، مہینے کب آتے ہیں

تتلی لحوں کو گنتی ہے

لیکن پھر بھی اپنا کام سلیقے سے پورا کرتی ہے

وقت کے جبر کا شکوہ کرنا

اُس کی سرشت میں کب لکھا ہے

وہ تو بہت سی سندرتیلیوں کو دنیا میں لانے کی خاطر

جنم جنم ہجرت کرتی ہے

لیکن اُن کی سُہرتا کو دیکھنے سے پہلے پہلے ہی

اک دن تیز ہوا کے رخ پر

یوں چپ چاپ چلی جاتی ہے

جیسے پھول سے نکلی خوشبو

پھول میں کب واپس آتی ہے

الف لیلہ یہ نہیں.....

فہیم شناس کاظمی

زندگی کے آخری زینے پہ بیٹھے ہیں رفیقی
اس سے آگے رات ہے
بارشیں ہیں
جنگلوں کے راستوں پہ خیمہ زن
وحشتیں ہیں
شورشیں ہیں
اجنبی سی آہٹیں ہیں

زندگی کے آخری زینے پہ کیا سوچیں اُسے
جس کے ہونے سے جہاں میں روشنی تھی
رنگ تھے
جس کے سرکش، جُسن پر
سارے زمانے دنگ تھے
ساحلوں پر کشتیاں
اور کشتیوں پر بادباں
دور تک پھیلا تھا نیلا آسماں
اب ستارے گر چکے پاتال میں
گم ہوئے امروز و فردا حال میں
گر چکی دیوارِ دل
سب منڈیروں سے کبوتر اڑ گئے
آندھیوں کے درمیں
آہنے میں عکس کیا باقی رہے

راستے دہلیز سے آگے کہیں جاتے نہیں
زندگی کے آخری زینے سے آگے اب زمیں متی نہیں
اس سے آگے رات ہے
اور آدی کی ذات ہے
جوشِ فمو
جام و سبو
دل میں لہو.....
کچھ بھی نہیں
الف لیلہ یہ نہیں
داستانوں سے ابھرتی دلت کی تاریخ ہے
وحشیانہ جج ہے
چار جانب گونجتی
گونج بڑھتی جا رہی ہے یہ رفیقی
زندگی کا آخری زینے بھی اب تو
ٹوٹتا ہے
ہوتا

نہ ہونے کے کس اندھے خلا میں ڈوبتا ہے

زمانہ تم کو بلارہا ہے

فہیم شناس کاظمی

نیم عریاں	اداس کیوں ہو
بھٹکتی تسلیں	گوئی ستارہ گنوا چکے ہو
بھٹک رہی ہیں	کہ خواب کوئی
وہ کپیوٹر ہو، فیس بک ہو کہ کوئی تھیٹر	کہ دل میں مہکا گلاب کوئی
ہزاروں آنکھیں	محبوب، خوشبوؤں سے لکھی کتاب کوئی
سلگتی جاتی بھٹکتی آنکھوں	تمہارے تکتے
میں ڈوبتا ہے جہاں کہنہ	تمہارے ہنسنے کی منتظر ہے
بدن رہے تمام منظر	مگر یہ تم ہو
تمام چہرے	ہوا کے شوریدہ راستے پر ٹہل رہے ہو
تمام لہجے	حجاب میں ہے سراب کوئی
شکستنی ہیں	صدا ہے خانہ خراب کوئی
گزشتنی ہیں	کسی طلب کا الاؤ بن کر
سوان کی پرواہ مت کرو	دہک رہے ہو
مسکرا بھی دو تم	سیاہ شب کے اداس لمحے
تمہارے نازک لبوں سے	سلگتی سوچوں
خوشبو سی بات کوئی	بہکتی موجوں کی سرکشی میں کوئی کہانی
ہوا میں ابھرے	ہزار بونے جہاں کے سرکس میں
تو رنگ ساری فضا کا نکھرے	اپنے کرتب دکھا رہے ہیں
تمہاری نازک نفیس انگلی سے لفظ کوئی	چھدی شکلیں ہیں

اگر ہو تخلیق

بات نکھرے

تمہاری خاطر

ہر ایک سو..... صد ہزار آنکھیں

ستارے، مہتاب، کہکشائیں

تمہارے ہنسنے کی منتظر ہیں

اور تم ہو

کمپیوٹر کے آگے

اداس بیٹھے

کہ جیسے سب کچھ گنوا چکے ہو

تمام ہستی لٹا چکے ہو

خلا میں نظریں بھٹک رہی ہیں

نہ جانے کس کو تل شتے ہو

یہ سرچ انجن

شموں رہ کر

ہزاروں رستے دکھا رہا ہے

زمانہ تم کو بدل رہا ہے

نظم

شکیلہ رفیق

سفر میری آنکھوں کا

جنم ہوا تو آنکھیں میری گدلی تھیں

شفق پھوٹی

تو ہوئیں ستارہ

اور پھر

بن گئیں ”گنورا“ سی

چ

اب

دنیا کیوں گدلی دکھتی ہے

محبت کم نہ ہونے دو

(پولیو کے قطرے پلانے والی لڑکیوں کے نام)

احفاظ الرحمن

وہ نازک تیلیوں کے خواب سے زیرِ دہر ہوں گے
پرندوں کی حسیں چہکار سے زیرِ دہر ہوں گے
پرندوں کے حسیں نغموں کو،
نازک تیلیوں کو رقص کرنے دو
محبت کم نہ ہونے دو!
محبت کم نہ ہونے دو!!

محبت کی ہتھیلی رنگ سے خالی نہ ہونے دو
محبت کم نہ ہونے دو، زمیں کو سانس لینے دو
زمیں پر جینے والوں کو مہکتے خوب لکھنے دو
مہکتے خواب کی تعبیر کا عنوان لکھنے دو
محبت کم نہ ہونے دو

محبت تیلیوں کی گفتگو میں رقص کرتی ہے
پرندوں کے حسیں نغموں کی ڈھن پر رقص کرتی ہے
ہوا کے ساتھ لہراتی ہوئی پرواز کرتی ہے
فضا میں میٹھی خوشبو کی لہک کو کم نہ ہونے دو
محبت کم نہ ہونے دو

محبت کم نہ ہونے دو،
جو نفرت بیچتے ہیں، خون کا بیوہ پار کرتے ہیں
خوشی کی کوکھ پر خنجر سے اپنے وار کرتے ہیں
لرزتی آرزوؤں کو ڈرا کر شاد ہوتے ہیں

پرائی پوٹلی

یامین

مہر کیا تھا
تجھے اس پوٹلی سے
جواڑا کر لے گیا ایسے
کہ جیسے وہ خزانہ ہو
وہ ہستے تھے
اماراتی کرنسی کے
چھپا ہوا کسی نے جن کو
اک ٹم نام کے خوش رنگ پیکٹ میں
مجھے اس نام کے بسکٹ کا بیج پوچھو
مڑہ کچھ اور ہی آیا
کہ مجھ کو بھوک ہی اتنی زیادہ تھی
ذرا سی
بس ذرا سی اک جھٹک دیکھی تھی سبکوں کی
تو کیسا رنگ تھا ان کا
کہیں سونے کے ہی ناہوں
.... وہ لشکارا تو سونے کا ہی تھا لیکن
مری اس بھوک کا چکارا ایسا تھا
کہ دو پیسے کی شے نے ہی یہ بازی جیتی تھی
ہوا یوں تھا

مجھے تو پوٹلی کو دیکھ کر ظالم کے بچوں میں
وہ دن اسکول کے یاد آ گئے
جب ریس میں مجھ کو
ہمیشہ کوئی پوزیشن تو ملتی تھی
مگر اس روز ہفتہ بھر کی بھوک جان نے میدان مارا تھا
کلو میٹر سے کچھ اوپر کی بسی دوڑ تھی
وہ تھا کہیں افداک پر
لیکن زمین کی خاک پر میں تھا
پرائی پوٹلی سے گیا ملا
اور کیا نہیں
اس سے غرض کچھ بھی نہیں مجھ کو
فقط اس بات سے ہے
جوا بھی تک آب زم زم جیسی تازہ ہے
بدی نیکی بھی ہے اپنی جگہ
لیکن
ہمیشہ دوڑ میں سبقت اسی کو ہے
کہ جو خواہش کی جانب رخ نہیں کرتا
مگر کوشش پہ اپنی جان دیتا ہے

چھٹی کا دن

یامین

چھٹی تھی

اور سارا دن

باغیچے میں کام کیا

بانس کی لمبی شاخیں کاٹیں

اس خود سر کو موڑ موڑ گئے رام کیا

خارگلاب سے ہاتھ ملایا

تنگسی کے دامن میں آیا

اک کونے میں ترگس سے کچھ خاص کلام کیا

ہر گل نکلا گل جاے سے

گھل گھل کر ہنگام کیا

رات کو جیسے سینے پر

کوئی کانچ کی پڑی ٹوٹی

جیسے بانس کی چھوٹی سی

کوئی شاخ شرارت پھوٹی

جائے کب وہ جیب میں آن گری تھی

اب سینے میں دھیرے دھیرے اپنے پنجے گاڑ رہی تھی

چھوٹی سی کونیل کی سوئی

ایک پہاڑ سے دل کو کیسے پھاڑ رہی تھی

جنگل میں شام

یامین

سفر آگے بھی باقی ہے

مناسب ہے کہ اب گھوڑا بھگاؤ

جواں مردی بچاؤ

کسی دن کام آئے گی

کہیں میدان بچنے پر

فرشتہ پھر نہیں آیا

شاہین عباس

وہی بس ایک بار آیا تھا اپنے کام پر
اور کام بھی کیا تھا
یہی بُرا قہر مندوں کو خبر نامہ سنانا
نور کا خاکہ اڑانا
فرش پر سے مٹی کے ڈھیلے اٹھ کر
پھر پنچ دینا زمین پر
یوں نشانہ باز حکموں کو بچا لانا
کہ جیسے نیزہ باز آیا ہو مشقوں سے گزر کر
اس دہانے پر کہ سب سیر و شکار
آساں کیے جائیں
الف احرام ہو یا لام لگی ہو
یا ابجد سے کوئی باہر ہو مونس ستر کا
..... ہمدرد، دونوں شرم گاہوں کا
شکاری کا حرم میں دخلہ
دستور کا گھر
کیسا کیسا سر تھا اُس کی پھونکنی میں
وہ دہانے سے گزرا آیا تھا اور ہم

ٹھیک اُس کی سیدھ میں پائے گئے تھے
باب استقبال پر ٹھیک ٹھہرائے گئے تھے
آؤ تو صا حب،
یہ کن پہلو دراز باد یوں میں
پشت پر شہر سے ٹھہر جھلنا جائے
پتکھی جھلنے آگئے ہو،
ذرا گردن کے ہلکورے ادھر لاؤ
جہاں ہم ہیں
نظر کی چوری چھب سے، یہاں انگنائی میں
گولائی میں دیکھو،
ادھر گہرائی میں جھانگو
پسینہ زیر جاموں پر ہے،
احراموں پہ کب ہے!
یہ تلووں کی لڑی، نعین کی جوڑی
سے ملوانے چلے ہو
ونچہ پادیکھتے ہو؟
ایڑیوں کے اس گزشت و رفت سے گزرو!

گراؤ مت ہمارے پائے جانے

اور چھپائے جانے کا کچرا

ہم ایسے اُن پردھوں کے

حاضر و غائب نہیں ہوتے

کہ ہم تشکیک اور تائید کی دو تجربہ گاہیں بنیں

دن بھر جو ٹمس، ٹیسٹ کی نوروز، نیلی بار

پر ٹپ ٹپ گریں،

سرخ کو چھلکائیں تو سمجھیں تجربہ اچھا ہوا

ایسا نہیں ہوتا

یہ دونوں پر سمیٹو، باری باری سب کے گھر آؤ

کبھی کو جانتے جاؤ

عبادوں کا یہ گولا، پاں نہیں چلتا

نقاب النور

ہمارے ساتھ تم پہلو درازی، راست بازی

سکے شکوے چھوڑنے

پھل توڑنے نکلو،

خدا را آؤ، آؤ

زندہ ہو جاؤ!

صدا کار کا نوحہ

وانیال طریقہ

سیاہ پیڑ رات کا

زمین کے مرمریں سفید جسم پر

گہرا رہا ہے زبرد پات خواب کے

اور نیلے توت ماہتاب کے

طلسمی طائروں کے پر

لٹک رہے ہیں اس کی شاخ شاخ سے

ستارگاں کے گھونسلے سے گر رہے ہیں

بیضہ ہائے آئینہ

بے خبر تراش سے

سورہی ہیں داسیاں اداسیاں

مہیب سائے بن رہے ہیں

داغ گہرے وقت کے لباس پر

گماں کی ریت جھڑکتی ہے

پڑ رہی ہے زندگی کی گھاس پر

سیاہ پیڑ رات کا

اکھٹڑنا کو تو دور ذکر چھینٹنا محال ہے

زمین کے مرمریں سفید جسم پر

صدا دہندہ آدمی کا کال ہے

اظہار محبت اک پہاڑی راستہ ہے

سلمان باسط

اسے بس ایک ہی ضد ہے
میں اس کی ذات سے منسوب
اپنے سب خیالوں کا کوئی پیکر تراشوں
اور اس کے سامنے رکھ دوں
اے بتلاؤں میں اس سے مجھے کتنی محبت ہے
اسے کیسے بتاؤں میں
زمین سے آسمان تک اس محیط بیکراں کو
اپنی مٹھی میں جکڑنا میرے بس میں ہی نہیں ہے
مرے سر پر چمکتے مہرباں سورج کی کرنوں کا
کوئی بھی گوشوارہ بن نہیں سکتا
زمین کی گود میں کتنے سمندر ہیں
کناروں پر خمیدہ ریت کے ذرات ہیں
میں ان کو ایک عددی دسترس میں کس طرح کر لوں
بھلا میں لامکاں کی وسعتوں کو
اس مکاں میں کس طرح لاؤں
جو قدرت نے ہمیشہ ان کہاں رکھا ہے

کہانی نہیں تھی

عنبرین صلاح الدین

ہر اک رات کے آخری اور پہلے پڑاؤ میں تیری سنائی ہوئی ہر
 کہانی پڑی ہے
 کہانی سے سانس بندھی ہیں
 کہانی میں جنگل، سمندر، پہاڑ اور صحرا بھرے ہیں
 کسی دوسری آنکھ میں تیرے لفظوں کے بوجھل بہاؤ کے
 دھندلے کنارے جڑے ہیں
 یہی دھندلاک رات کو دوسری رات سے
 اور راتوں کو آنکھوں سے
 آنکھوں کو سانسوں سے
 سانس کہانی سے، جوڑے ہوئے تھی
 کہانی میں کتنے اماؤ بچے،
 اور تجھے کتنی روشن جبینوں کا نقشہ بنانا پڑا،
 اب کہاں یاد تجھ کو
 ترے سامنے سے بھلا کتنے منظر سرکتے گئے اور کتنے رُکے
 یہ تجھے کب خبر تھی
 تجھے تو کہانی بنانی تھی
 جس میں بہادر، نڈر شاہ زادے
 سفر سے سرفراز لوٹیں

ہا پیر رینلیٹی

الیاس بابراعوان

اسکیپزم

الیاس بابراعوان

وحشتِ خواب کے پامال درپچوں سے پرے
ایک نوزائیدہ بچے نام حوالوں کا بھوم
رونقِ گریہ ہنگام ہوا چاہتا ہے
کیا خبر سرخ گولوں کے تروتازہ بدن
کس سے ترکہ ہنگام میں ڈھل جاتے ہیں
ساحرہ! چھین کوئی کذب میں ڈوبا ہوا راگ
سطوتِ شاہِ گریزاں ہے تو رہ جانے دے
بے بھر! گامِ تسلسل میں کہیں دور بہت
مگر لا حاصلی، آشفٹِ سری، ناموری
بس کہ ہے فصلِ تمنا کے لہو ہونے کا نام
ابر پاروں کی جبینوں پہ مضافات کا دکھ
جھلملاتا ہے تو تلواری بدستوں کی ہنسی
کاغذی نطق کے الہام میں وب جاتی ہے
سرخ ہوتے ہوئے چہروں پہ اتر آتا ہے
سبزہ رونقِ دربار کا پہلا موسم
ساحرہ! قصہ در بخت سناتے ہوئے لوگ
کیسے شوریدہ عناصر کی نوا بنتے ہیں!
چاک پر آبلہ پائی کی مسافت کے میاں
صرف انسان نہیں بنتے ہیں خدا بنتے ہیں

چل کہ صد چاک گریباں وہاں ہو آتے ہیں
یہ جو ہنگامہ ہستی ہے ذرا دیر کو چھوڑ
ایک بے انت مسافت کے ادھر بیٹھتے ہیں
یاد کرتے ہیں پری خانوں کی تلخی کی
اپنی آژردہ تمناؤں پہ رو لیتے ہیں
گرد میں رکھے ہوئے اشک، فردہ چہرے
گئے وقتوں کا تذبذب، نئے وقتوں کا عذاب
آ کہ شانوں سے گرا آتے ہیں اُس پار کہیں
اس سے پہلے کہ یہاں سیلِ فنا آنکے
نام لیتا ہوا دونوں کا اسی شور کے بیچ
وقت کے پار جہاں زاد کی دہلیز کے ساتھ
اشک روتے ہیں مسافت کا بھرم رکھتے ہیں
آ کہ نادیدہ جہانوں میں قدم رکھتے ہیں

خود تو جنت میں ہے۔۔۔

احمد شہریار

خون کا دریا، آگ کی لپٹیں

میرا خستہ جسم نزار

میں کیسے پیٹھوں چلاؤں!

آوازیں ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی جل جاتی ہیں

جن کی راکھ

دماغ میں، دل میں

سوچوں اور رادوں کو دفن دیتی ہے!

منہ کھولوں تو خون اترنے لگ جاتا ہے

سانس ٹلی میں

گلوب بھی چلاتا تو ہوں

زور سے چلاتا ہوں لیکن

اس فریاد کا حاصل

گہری خاموشی ہے

(گہری، زخمی اور سلگتی خاموشی ہے!)

وہ خاموشی

جسے خدا بھی۔۔۔ شاید۔۔۔ کم ہی سن سکتا ہو!

خون کا دریا، آگ کی لپٹیں

میرا خستہ جسم نزار

میرا جسم زباں ہے جس سے آگ کی لپٹیں چاٹ رہا ہوں

میں آدم کی

۔۔۔ اپنے باپ کی۔

بوکی فصلیں کاٹ رہا ہوں

پھر بھی چلا سکتا،

تو چلا کر کہتا:

نعت تجھ پر

سیپ ہوں!

تف تجھ پر تف

اے گندم شک!

چاروں جانب آگ ہے

جس میں جل جاتی ہے روح تک

لاوے کے بہتے دریا میں ڈھونڈ رہا ہوں موج تنگ

لیکن ملی نہیں اب تک!

آبائی مکانوں پر ستارہ

ذی شان حیدر

زمانے بہہ گئے کتنے
 وہی آنگن جو وسعت میں مجھے دریا بگا کرتا تھا
 وہ دو جست نکلا
 جس جگہ والاں تھا
 اب اس جگہ ہموار مٹی منہ چڑاتی ہے
 ادھر ہموار مٹی سے ادھر
 دو ڈھیریاں مٹی کی کب سے منتظر ہیں
 کوئی ملنے ہی نہیں سنا
 یہیں تھے وہ
 جواب مٹی ہیں
 جن کے خال و خد پورے بدن پر زور سے گر
 یاد کرتا ہوں
 یہیں تھے وہ
 یہ بکسا
 جس میں یادوں اور دھاگوں سے جڑی عینک
 تو رکھی ہے
 مگر دادا کی

Gladiator

ذی شان حیدر

عجیب منظر تھا
شور مچا تھا کان اندھے ہوئے پڑے تھے
میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا
عجیب منظر تھا
میں خواب میں اک تماش میں تھا
میں دیکھتا تھا
وہ لڑ رہے تھے
وہ ایک دو بجے لڑ رہے تھے
غبار اڑتا تھا اُن رتھوں سے
جوان کے جسموں کو روندنے کے لیے رواں تھیں
میں دیکھتا تھا
وہ سانس اندر کو کھینچتے تھے تو کھڑکھڑاتے تھے
اور ہواؤں کے خالی دامن میں دھوکہ زیادہ تھا
سانس کم تھے
پھر اُن کے زخموں سے خون برستا تھا
جو تپکتی ز میں پہ گرتا تھا
اور چمکتا تھا
صرف میں تھا... وہاں پہ موجود لاکھوں لوگوں میں
صرف میں تھا جوان کے زخموں پہ رو رہا تھا

میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا
عجیب منظر تھا
خواب کے گھر سے لوٹ آیا ہوں
ایک جھٹکے سے آنکھ کھوں ہے
جسم آباد ہو گیا ہے
اب اپنے بستر کی سلوٹوں پر
بدن کو محسوس کرتے سوچا ہے
میں بھی دنیا کے اس ایریتا میں لڑ رہا ہوں
مرے بدن سے بھی خون ہوتا ہوا پسینہ ز میں پہ گرتا ہے
اور چمکتا ہے
آج میرے لیے بھی ظالم ہوا کے دامن میں سانس کم ہیں
گلیڈی ایٹر ہوں
اور ہاتھوں میں یہ قلم ہے
مرے لیے کوئی آنکھ نم ہے؟؟؟؟

دعویٰ

یشب تمنا

زرد شرکا مرقعہ ہوں

میں سرداری پہ فکڑ ہوں

وفا داری،

ذہانت اور خطابت اور شرارت

مرے سب گامہ لیسوں میں

یہ اوصاف حمیدہ لازمی ہیں

زباں چڑے کی ہوتی ہے

جو ہم کا غد پہ لکھتے ہیں

صحیفہ تو نہیں ہے

تو پھر ایسے کہے لکھے کی

کوئی ہیبت ہے...

مقادیر اپنا مقدم جانتا ہوں

سارے کاموں میں

میں لمبی دوڑ کا گھوڑ

مخالف کو تھکا کر مارنے کا

ظرف رکھتا ہوں

میں خود ہوں شاعر اعظم

میں کتنے وصف رکھتا ہوں!

کچھ خواب جُنتے ہیں

سیما غزل

چلو اب ایسا کرتے ہیں

گلابی رنگ کے موسم

سبھی پھولوں کی خوشبو کو

ستاروں کی چمک اور جھلملاتی روشنی بھی

بانٹ لیتے ہیں

اندھیری، کالی راتوں کو

خزاں کے زرد رنگوں سے چپتی سسکیوں کو بھی

سمندر میں اترتے ڈوبتے سورج کی ساری

نرم کرنوں کی تنگن بھی اوڑھ لیتے ہیں

ہرے جنگل، ستارے، چاندنی اور قلیوں کے

شوخی رنگوں سے

ہم اپنے گھر سجاتے ہیں

چلو کچھ ایسا کرتے ہیں کہ نیلے آسمانوں کے کنارے

موڑ کر، تنگیہ بنا کر سو بھی جاتے ہیں

چلو پھر خواب جُنتے ہیں

تمناؤں کو چُمتے ہیں

یہ راہداریاں

عارفہ شہزاد

خٹک سی ہواؤں کی لہروں نے
 لمحوں کے موتی اچھالے
 تمہاری ان آنکھوں میں کتنے بھیرے لگے ہیں اجالے
 اجالوں میں
 یہاں چل رہی ہوں!
 یہاں ہر روش پر
 وہ خوشبو کے حقے لپکنے لگے ہیں
 مجھے ساتھ اپنے لیے جارہے ہیں
 یہ رنگوں کا اک قافلہ جو کھلا ہے
 کہاں آ ملا ہے؟
 یہ کیا سلسلہ ہے۔
 تمہارے سنہرے دنوں کی تمازت
 میری روح کی زندگی بن گئی ہے!
 یہ راہداریاں
 جن میں ہم چل رہے ہیں
 تم آنکھوں میں روشن انگلیں بھرے
 سنگیوں، ساتھیوں کے جلو میں
 یہ دیکھو.....

یہاں چل رہے ہو!
 وہاں ان درختوں کی چھاؤں میں
 پر چھائیاں ہیں تمہاری
 وہ اونچی عمرت کے دالان کے ایک گوشے میں بیٹھے
 تنہی ہونا؟
 لیکن کسے کھوجتے ہو؟
 تمہیں اس گھڑی کچھ خبر ہی کہاں تھی
 جہاں تم ہو
 آئیں گے ہم ایک دن
 تم سے ملنے!
 یہاں تم سے مل کر
 یہ میں سوچتی ہوں
 مرے اور اس کے سفر میں
 کبھی راستے ایک سے ہیں
 اور ان میں کہیں بھی
 یہ راہداریاں
 کیوں نہیں ہیں؟؟؟

پرائی گڑیا

عائشہ جاوید

پھینکی پھینکی سی مسکان
میں کپڑے کی پٹلی
بے رنگی اور بے کار
ریشم سا شہزادہ میرا
بھول گیا ہے میرا پیار
استور کے اک کونے میں
پھینک کے مجھ کو لے آیا ہے
نئی نویلی کالج کی بابی
میری سوتن سرخ سہاگن
لش لش کرتی گوری نار
میں کپڑے کی پٹلی
کوئی نہ میرا پریم ٹھکانہ
میرا کوئی گھر نا بار

میں کپڑے کی پٹلی
میرے رنگ ہزاروں
میرے سنگ نہ تھپے کوئی
میرا درد نہ سمجھے کوئی
جنم جنم کی کترن میں
جانے کس کی اترن میں
میرا کوئی نہ ماپ شمار
میں کپڑے کی پٹلی
میرے خواب بھی کپڑے جیسے
پھٹے پرانے لیرولیر
کوئی نہ میرا سنگی ساتھی
کوئی نہ میرا سچا دیر
میں کپڑے کی پٹلی
بوسیدہ کپڑے جیسا
میرا روپ سنگھار
بکھرا بکھرا میرا جیون
دھجی دھجی تن کا تھان

مجھے نظمیں بلاتی ہیں

عائشہ جاوید

مجھے نظمیں بلاتی ہیں
میں لفظوں کے گھنے جنگل میں
آ کر ڈھونڈتی ہوں
کاسی، اودی، سنہری
تتلیوں جیسی
کئی رنگوں کی نظموں کو
جو پر پھیلائے خاموشی سے
میرے ساتھ اڑتی ہیں
ہوا میں تیرتی ہیں، تھر تھراتی ہیں
کبھی شخوں، کبھی پھولوں،
کبھی پلکوں پہ آ کر بیٹھ جاتی ہیں
میں ان نظموں کو چھوتی ہوں
تو ان کے رنگ اتر کر آن جتے ہیں
مرے سادہ سے کاغذ پر
اسے رنگیں بناتی ہیں
مجھے لکھنا سکھاتی ہیں
مجھے نظمیں بلاتی ہیں!!

آدھی چار پائی میں گم عورت

عائشہ جاوید

یہ راتوں کی سیاہی ہے
یہ صبحوں کا اُجالا ہے
اسی کی ذات میں اسرار پوشیدہ ہیں
دل کی داستانوں کے
زمانے اس کی باہوں میں
سمیٹے پھیلتے رہتے ہیں
آدھی چار پائی میں یہ گم عورت
کئی قرونوں سے آدھی ہے
گواہی میں بھی، جینے میں بھی،
مرنے میں تو ہے بس آٹھواں حصہ
ادھورے خواب ہیں اس کے
ادھوری خوشیاں ساری
ادھوری سی تمنائیں
کبھی کامل نہ ہو پائیں
ادھورا پن ہی جیون ہے
محبت سے بھری
اس پوری عورت کا

مجھے کچھ دیر سونے دو

نازیب

مجھے کچھ دیر سونا ہے
اور اپنی آنکھ کی پتلی میں رقصاں تلیوں کے لمس کو محسوس کرنا ہے
سنو جاناں!

میں آنکھیں بند کرتی ہوں
تو ان مخمور لہجوں میں
تمہارے ریشمی احساس کی اک نرم سی خوشبو
نواح جسم و جاں میں پھیل جاتی ہے
فضا مہمیز ہوتی ہے
اسی ساعت ہوائے نیم شب نزلِ مُردوں میں گنگناتی ہے
تمہاری یاد آتی ہے
تو میری آنکھ کی پتلی میں رقصاں تلیاں مجھ کو ستاتی ہیں
بدن میں پھیل جاتی ہیں
سنو جاناں!

مجھے کچھ دیر سونے دو۔۔۔
وصالِ آثارِ لہجوں کا پید و تپتی گلابی تلیوں کے لمس کو محسوس کرنے دو
مجھے کچھ دیر سونا ہے
مجھے کچھ دیر سونے دو

دسمبر

نایاب

زمیں کے موسموں میں

ایک موسم

ڈکھا

شامل کر دیا میں نے

یوں تیرے نام سے منسوب

موسم کر دیا میں نے

فقط اک ہجر موسم چکھ لیا میں نے

گیارہ ماہ چھوڑے اور

دسمبر رکھ لیا میں نے

دیوتا

میرے ہدم

میرے سات ڈھوپ پلوں کے تم ساتھی ہو

مجھ سے پیار جتانے والے

مجھ کو دنیا کی سب دولت

ایک چھوٹی سی جیتی جاگتی گڑیا کے

روپ میں دینے والے

میری سب سانسوں کا اثاثہ

تم ٹھہرے ہو

میری کالی راتوں میں

صبح کا روشن تارا

تم ٹھہرے ہو

گر تم چاہو

نایاب

جیسے ریت سرکتے اور پھسلے وقت کے گھر میں

وقت کا حصہ بن جاتی ہے

وقت ہی پھر یہ کہلاتی ہے

پونجی گر تم چاہو تو

اپنی سانسوں میں مل بھر جو ذوری ہے

جس میں کتنے نوری قرونوں نے

اپنا جال بچھایا ہے

گر تم چاہو

ریت سرکتے سے پیسے

ارمان ہمارا پورا ہو سکتا ہے

بس اک رات کومات ہے وہی

ان نوری قرونوں کو ہم نے

اور پھر ڈھلتے چاند کے ہمراہ

اک دو بجے کی روحوں میں

جسم ہمارے ڈھل جائیں گے

وقت یہی پھر کہنائے گا

ترستے ہیں سدا تازہ ہوا کو

(نئی صنف)

ست پر تہ

جلیل عالی

ایک حیات	(۱)	بد لے کون	میدون رات
دل تنہا		اپنا نوت	آپ ہی کات
من آنگن			(۳)
ڈوبے پھول		کس کے ہاتھ	اپنی برات
سوکھ گئے		سوچ جدا	کیسا ساتھ
شکوہ کناں		دل باغی	اب شہ مات
لمبی چپ		اُس کے ستم	انعامات
قبرستان		وہ جو کہے	فرمودات
اندیشے		جوار شاد	تسہیرات
جینے دیں		جوا حکام	تعمیلات
دہراور دل		ہاں تمام	احسانات
		اُس کا حق	سب نعمات
	(۲)	خالی رکھ	شوق پرست
معمولات		کرتارہ	درخواست
آج انسان			(۴)
روح عصر		چکی بات	دن بھی رات
کس کی عطا		ملک اپنی	رکھک دوات
کون شکار		از بر ہیں	چند نکات
دشمن کون		کس کے دیئے	موضوعات
بربادی		بے معنی	منظومات
کون سے		شہر آشوب	تحریرات
پہلے لوٹ		ہیں ہوئے	سب نعمات

آئش بار	اب غزلات	چاہ عشق	راہِ نجات
اصل کہاں	تاویلات	باب عشق	آبِ فرات
سب بیکار	تشریحات	روح عشق	امکانات
اپنی کتھا	سُکھ لغات	بدلے عشق	تقدیرات
	(۵)	عشق تمام	توفیقات
اپنے ساتھ	کچھ بھات		(۷)
راس ہوئے	کب حامات	روح لغات	حرفِ نعت
ختم ہوئے	کب خدشات	اُس کی ذات	بحرِ صفات
اپنے بھی	کچھ جذبات	اک اک بات	کنزِ نکات
ہر دس میں	اک شلاط	اُس کا وجود	تنویرات
زندہ رکھ	احساسات	اُس کے طفیل	موجودات
کچھ اپنے	معیارات	زیبائے	گلِ حسنات
اپنے بھی	کچھ دن رات	وہ لہجہ	قند و نبات
خود سے بھی	کوئی بات	وہ میرت	راہِ نجات
اندر بھی	تو اک جہات	اپنی لاج	اُس کے ہاتھ
کچھ آنسو	آپِ حیات	سبز کرے	کشتِ حیات
(۶)		اُس کے نام	سب ابیات
پڑھ دن رات	عشق آیات		
عشق کی بات	ہشت جہات		
عشق کو مات	کس کی بساط		
عشق سوا	کس کو ثبات		
عشق بناں	خاکِ حیات		
موجِ عشق	ادبِ نشاط		

☆ فرشی کی سہ لفظی نظم ”پہلِ سراط“ کی تحریک پر۔

بننے رہتے ہیں فسانے کیا کیا

(افسانے)

آتش فشاں اور مدفون شہر

اسد محمد خان

یہ تحریر جو ایک نوع کے سفر نامے کی طرح وجود میں آئی تھی اور میرے ایک مجموعے میں شامل کی گئی تھی۔ کوئی پندرہ برس بعد Revise کی گئی ہے اور اس نئی صورت میں نئے قاریوں کے لیے حاضر ہے۔ میں کراچی کی رہبریوں سے حاصل کیے اس ری سرچ میٹر میں کا احسان مند ہوں جو آتش فشاں ویسولیس کے بارے میں وقتاً فوقتاً حاصل کرتا رہا۔ ان رسائل اور مضامین کا بھی شکر گزار ہوں جن میں ہر کلانی ایم اور پومپیا کی باریافت کی تفصیل درج ہیں اور انھی کی وجہ سے یہ تحریر اس قابل ہوئی کہ کسی بھی معتبر قاری کے سامنے لائی جاسکے۔ میں نے پومپیا کی سے کھود کر نکالے گئے ایک پہرے در کے صدیوں پرانے جسد کو مصوری کے رندہ شاہ کاری صورت میں بھی دیکھا ہے اور یہ درجہ ہے۔ (ام۔م۔خ)

یہ چوبیس گشت کا دن تھا۔ طلحہ نیپلز پر خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف اور خوب نیا ہو رہا تھا۔ شہر پومپیا کی سے سات میل دور فیشن میل قصبے ہر کلانی ایم کی بیکری والے نانائی نے اپنی چمٹریاں، ڈبل روٹیاں جہانی شروع کر دی تھیں۔ ڈبل روٹیوں، چمٹریوں پر نانائی کے نام کا "ایس پی" چھپا تھا یعنی سکستیس پاتوئکس برابر واسے اسٹینڈ پر سبزی فروش فوئیرس اپنی سبزیوں اور پھولوں کو پانی کا چھینٹا رہا تھا۔ دروازے کے قریب دیوار پہ "جے حروف" میں لکھا تھا "امفی ندا سے پیار کرتا ہے پارتم نووس"۔ جواہر تراشنے والے نے کٹر سنبھال لیا۔ وہ ایک خوش رنگ نگینے پر دیدہ ریزی کے ساتھ ابھرواں کام شروع کر چکا تھا (کیا خبر اس نے گاہک سے آج کا وعدہ کیا ہو) جیتل کی ڈھکی وار دکان دار ایک شمع دان کی مرمت میں لگ گیا۔

درزی، مصور، پھیری والے، سرائے کے مالک، پیار کرنے والے سبھی مصروف تھے۔ قصبے میں آنے والوں کا تاننا بندھا تھا مودہ یہاں کے وسیع و عریض اسٹینڈیم، پامیسترا میں ہونے والے مقابلے دیکھنے آ رہے تھے۔ یہ مقابلے روما کے پہلے ایمپیر آگستس یزیر کی سال گرہ کے سلسلے میں ہو رہے تھے۔ گہما گہمی، لپچ، ہنسی ٹہنے، ہر طرف میلے کا سماں تھا۔ دور دور سے لوگ چلے آتے تھے۔

جی ہاں، چوبیس گشت کا دن تھا۔ سارا تھا اناسی (عیسوی)۔ حضرت مسیح کو گزرے ابھی پورے پینسٹھ برس نہیں ہوئے تھے۔

تاہم اس قصبے میں جہاں جشن کا سماں تھا ہر کوئی جشن نہیں مناتا تھا۔ کچھ لوگ اپنی الجھنوں میں بھی تھے۔ عظیم چوک پر تعمیر کی گئی آگستس کے نام سے منسوب قربان گاہ کے ایک کمرے میں، جس کی کھڑکی پر سنا نہیں جڑی تھیں، ایک بند مرتبت آدمی سیری کی صعوبتیں جھیلتا تھا۔ (اب تو کوئی بھی اس کا نام نہیں جانتا) جواہر تراشنے والے کی دکان کے پیچھے کوٹھری میں نکڑی کے بستر پر ایک بیمار لڑکا پڑا تھا۔

کشتی گھاٹ پر چوڑے ہاڑبڈوں والے گٹھے ہوئے بدن کا ایک غلام اپنے درد کرتے رگ پٹھوں کو ایک اور کمر توڑ بوجھ کے لیے تیار کر رہا تھا۔

برابر کی حویلی میں چودہ برس کی ایک کھائی، دس ماہ کے صحت مند بچے کو جیسے تیسے سنبھالتی تھی۔
(یعنی کچھ لوگ اپنی الجھنوں میں تھے۔)

اور پھر لوگوں نے ایک بے پناہ گڑگڑاہٹ سنی۔ زمین کو ہلا دینے والا ایک جھٹکا لگا اور مسلسل گرج اور کڑک اور

ابتلا۔

مشرق کی طرف چار میل دور آتش فشاں ویوولیس کے دہانے سے آگ اور گرم راکھ اور جھاگ کا ایک بھیا تک ستون بند ہونا شروع ہوا جو سوہ میل تک اٹھتا چلا گیا۔

سولہ میل کی اونچائی پر اس نے نگرمتے جیسی اک چھتری کی شکل اختیار کر لی۔

اس چھتری کو جو نیپلز کے قریب کے قصبے ہرکلانی ایم اور وہاں سے سات میل دور ہے، شہر پومپئی اور اس کے مضاف میں، سن اناسی عیسوی میں دیکھی گئی تھی، آج صرف سوچا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔

اور اب سن دو ہزار عیسوی کا احوال سناتا ہوں

میں ان دنوں ٹی وی سیریل لکھا کرتا تھا (جو ضروری تھا اس لیے کہ بیٹیوں کو خوب پڑھنا لکھنا اور ان کے گھر بسانا تھا) تو امریکہ سے آئے ایک باہمت پروڈیوسر نے ایک غیر معمولی طویل (اور ظاہر ہے، راکھوں روپے کے خرچ سے) سیریل بنانے کا ڈس ڈالا، کراچی آئے، ایک جاننے والے ٹی وی ڈائریکٹر سے رابطہ کیا۔ وہ ڈائریکٹر میرے بہت اچھے دوست ہیں تو سرکی پروڈیوسر کو ٹرنت میرے گھر لے آئے۔ کہنے لگے ”اسد بھائی آپ نے ایک تاریخی سیریل لکھا تھا انڈلس، اسپین سے متعلق اب ہم، تاریخ سے صرف نظر کرتے ہوئے آج کے اسپین، پرتگال، فرانس اور ہسپانیہ کا تو اٹلی جانا چاہتے ہیں۔ آپ ایک غیر معمولی سیریل کی منصوبہ بندی کر لیجیے۔ ہم تینوں بھائی اسپین، پرتگال وغیرہ کی ریکی کر لیتے ہیں۔ وہاں کا موسم بھی ان دنوں (ہمارے حساب سے) اچھا ہے۔“

مختصر یہ کہ ہم نے اپنے سوٹ کیس، بیگ وغیرہ تیار کئے، پہلے جیرس پہنچے، وہاں سے اسپین کے صدر مقام مادرید اور پھر اندلوسیا، ہم ان پانچ چھ شہروں میں خوب چلے پھرے، تاریخی عمارتیں، میوزیم، کھیت، کھلیان، بے نیچے دیکھے۔ لوگوں سے انگریزی زبان میں اور ترجمانوں کی مدد سے بھی خوب باتیں کیں۔ میرے ساتھیوں نے نوٹ کیس اور میں نے (گويا) رجسٹر بھر لیے۔

خیر، ہم تینوں نے (گھر سے نکلنے سے پہلے) بہت سے امنگوں بھرے امکانات سوچ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سیریل کی ریکی کا کام نمٹ کے کچھ سیر سپاٹا کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسپین کے دارالخلافہ، مادرید میں تھے۔ رات کا کھانا کھا کے بیٹھے تھے۔ اندلوسیا کے پانچ شہر (جو ہمارے سیریل کی کہانی کی زد میں آتے تھے) یعنی، قرطبہ، غرناطہ، مالقہ، اشبیلیہ، تورے، اینوس سب دیکھے اور نوٹ کیے جا چکے تھے۔ پریوں کی کہانیوں والا شہر سگوویا دیکھ لیا گیا تھا۔ یونیورسٹی شہر سدا، نکا بھی خوب چھان پھانک لیا تھا۔ ہم پرتگال کے صدر مقام لزبس ہو آئے تھے اور اسپین میں تیسری بار وارد ہوئے تھے۔ اپنے مطلب کا سبھی کچھ دیکھا جا چکا تھا کہ ناگاہ پروڈیوسر بھائی نے نوید سنائی۔

”دوستو! سنو۔ زاویرہ کی ٹیلی میں ابھی بھی سکے بچتے ہیں، تو واپسی سے پہلے کیوں نہ ہم اٹلی بھی ہو آئیں۔“

پروڈیوسر بھائی نے روانہ ہونے سے پہلے بھی ٹی "دیکھ رکھنے" کا ارادہ ظہر کیا تھا اور کہا تھا، "چلیں گے مگر شرط یہ ہے کہ زائر ادا جائز دے" سو ہم نے کہا، بسم، اللہ! چلیے۔

اب سارے ہی کام نمٹ گئے تھے اور ہم نے ردا اور نیپلز کے سیرپاٹوں کی تفصیل طے کرنا شروع کر دی تھی (میں، جو گھر سے پومپائی کے مدفون (اور بازیافتہ) شہر پر خوب کام کر کے چلا تھا، اپنی بساط پھیلا کے بیٹھ گیا: میں نے شہر پومپائی اور قصبے ہرکلائی ایم پران کے آتش فشانی ویسویس کی۔ ٹی ہوئی مصیبت کا احوال سنانا اور علوم آثار قدیمہ کے بے مثال کارناموں کا قصیدہ پڑھنا اور اپنا اور اپنے ان دو بھائیوں کا ہوجرمانا شروع کر دیا کہ کس طرح ہمیں روم سے درگزر کرتے ہوئے سیدھے نیپلز پھر پومپائی پھر ہرکلائی ایم جانا چاہیے۔ میں نے کہا روم تو سیاحت کی بساط کا چٹا ہوا مہر ہے۔ پرانا ہو گیا۔

مگر روم کہ Eternal City ہے۔ کبھی پرانا نہیں ہوگا۔

خیر تو ہمیں پومپائی کے بازیافتہ نگلی کوچوں میں یسوع اور جولیئس سیزر اور آکستس (اور شاید اووڈ کی پرچھائیوں) سے کلام کرنے کا یہ موقع (اور شرف) اب حاصل کر ہی لینا چاہیے۔

میرے ساتھی کہنے لگے کہ دونوں سیزروں اور شاعر اووڈ کو تمہارے بتائے ہوئے شہر پومپائی اور اس دوسرے قصبے سے زیادہ روم میں Feel کیا جاسکتا ہے اور یسوع کا یہ ہے کہ وہ تو شہروں اور زمانوں کی حدود سے کب کے نکل چکے، اس کی کیوں ڈھائی دیتے ہو؟ اور سمجھو تو وہ ٹی کن سٹی بھی تھی کا ہے، انھیں دیں Feel کر لینا۔ میں نے کہا چلو ٹھیک ہے، آپ لوگوں کی "شہروں زمانوں کی حد" والی دیل ٹکڑی ہے، مانے لیتا ہوں۔ وہ ٹی کن سٹی والی نہیں مانتا۔ وہ جگہ تو سمجھو ایک organised religion کی میکرٹری لیٹ ہے۔ میں ہوا کی طرح آزاد عقیدت کا، اور کسی بے لاگ آراوہنا کا قائل ہوں۔ تاہم وہ ٹی کن سٹی کی حدود میں ماسٹرز کے پینٹ کیے میوز بھی ہیں اور دتی کی جامع مسجد جیسی میٹرھیں بھی (سوا پرومتہ الکبریٰ میں دتی یاد آتی ہے) اور بھی بہت کچھ ہے۔ بہتر ہے، روم پہ Tick لگا دو۔ وہاں بھی ہو لیں گے۔

اس تجت بازی میں نہ معلوم کیوں میں اپنے ساتھیوں سے اصل بات نہ کہہ پایا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں پومپائی دیکھنا چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس شہر کی باقیات میں میرا ایک دوست مجھے مل سکتا تھا جس کی شہرہ کوئی ۵۸، ۵۷ سال سے میرے ساتھ ہے۔ یہ پومپائی پر آگ کی بارش اور لہو کے سیل میں اپنے نیزے کی فیک لگائے، یقینی موت سے ایک ہشت دوری پر قدم جمائے کھڑے اس رومن سپاہی کی شہرہ ہے جس سے سن پینتالیس چھیپیس میں میرا تعارف ہوا تھا۔

بتاتا ہوں کہ کیسے اس دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔

میرے ابا بھوپال کے ایک صف اول کے اسکول میں آرٹ ماسٹر تھے۔ اسکول کے فائن آرٹس کے شعبے کو نواب کے ذاتی کتب خانے سے مصوری کی کتابوں کا عطیہ دیا جانا طے ہو۔ اس شعبے سے متعلق کئی سو کتابیں تھیں جو نواب نے دنیا بھر سے کٹھی کی تھیں۔ اب کہ ریاست کا چل چلاؤ تھا، نواب نے یہ نادار کتب اور ماسٹرز کی شاہکار پینٹنگز کے پرنس عوام الناس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے ابا چھ سات روز قصر سلطانی سے بھیجی ہوئی گاڑی میں بیٹھ، کتب خانے پہنچتے رہے اور اپنے طلبہ کے لیے کتابیں اور پرنس پسند کرتے اور اٹھواٹھوا کے لاتے رہے۔ شہر کا دوسرا ہائی سکول، جسے اس عنایت سے نوازا گیا تھا، بروقت کتب خانے پہنچ سکا۔ جب تک وہ لوگ پہنچتے میرے ابا ڈھائی تین سو نادار کتابیں اور

کئی درجن اعلیٰ درجے کے پرنس اسکول کے فائن آرٹس کے شعبے میں پہنچوا چکے تھے۔
کیا خزانہ ہاتھ آیا تھا۔

اسکول کی انتظامیہ نے دو فاضل لہاریاں حوالے کر دیں۔ میں وہیں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ابا نے کہا، کتابوں کی کیئرنگ کرنا ہے، پھر انہیں سلیقے سے لہاریوں میں رکھنا ہے۔ دو دن کی چھٹی ہے، میں کتابوں کی درجہ بندی کرتا جاتا ہوں، تم ور فلاں فلاں طالب علم فہرستیں بناؤ اور سمجھا سمجھا کے دفتریوں کے حوالے کرتے جاؤ۔ وہ ہاتھ کے ہاتھ اماریوں میں جھاتے جائیں گے۔ دو دن لگیں گے، کتابیں سب محفوظ ہو جائیں گی۔

ایسی نفیس و نایاب تصویروں کو اور چکنے مضبوط کاغذ پر چھپے مضامین کے ساتھ پیش قیمت جلد بندی والی کتابوں کو دیکھ، چھوٹا اور جستہ جستہ پڑھنا میرے لیے اتنی بڑی مسرت تھی کہ اسے یاد کرتے اب بھی بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔ لگتا ہے خون کی گراش تیز ہو گئی ہے۔

مصور کی عالمی ورثے سے میرے چھوٹے موٹے تعارف کا زمانہ یہیں سے شروع ہوتا ہے اور اس کے لیے میں اپنے باپ کا، اپنے اسکول کا نورنواب کے کتب خانے کا ممنون احسان ہوں۔

فہرست کی تیاری کا کام، جس طرح بتایا گیا تھا، ہم چار لڑکوں نے شروع کیا۔ کوئی آدمی گھنٹے ہم مستعدی کے ساتھ کیٹگری اور نمبر شمار اور نام کتاب کا یہ کھیل کھیلتے رہے، پھر ہم چار سے تین رہ گئے۔ میں نہ معصوم کس پل میں اپنا کام چھوڑ کے اور ایک کتاب سنبھال کے ایک طرف جا بیٹھا تھا۔ مجھے بہت ساری تصویریں دیکھنا اور ان سے مسحور ہونا تھا اور ساتھ میں لکھی ان کی تفصیل چاہتی تھی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ کہاں ہوں اور یہ کہ یہیں قریب ہی ابا موجود ہیں۔ الماری کی اوٹ میں ایک ڈیسک میں دھنک بیٹھا تھا کہ مجھ پہ ابا کی نظر پڑی۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ابا ڈسپن قائم رکھنے والے باپوں اور استادوں میں سے تھے اور کسی طرح کی بھی کام چوری برداشت نہیں کرتے تھے مگر اس روز میرا شہاک دیکھ کے وہ مسکراتے رہے، کچھ نہ بولے۔

میں مصوری کے دوشہ کاروں، ڈاؤنچی کے The Last Supper سے اور کسی کم معروف مصور کے پوینٹائی کے پہرے دار سے اس روز پہلی بار متعارف ہوا۔

نویں جماعت میں تھا تو پہلے اس شہر کی بربادی کی کہانی پڑھی ہوگی۔ پھر کہیں سے عہد قدیم کے ہیروز کے قصے ہاتھ آئے ہوں گے تو اس شہر مدفون سے صدیوں بعد بازیافت ہونے والے رومن سپاہی کا حال پڑھا ہوگا کہ جوانی جگہ پر ہی پتھر ہو گیا مگر پہرے کی جگہ سے ہٹا نہیں۔

آج میں یہ تصویر دیکھ رہا تھا۔

اور اب ایسا ہے کہ سہار کی دیکھی ہوئی اس پینٹنگ کو جزئیات کے ساتھ میں آج بھی بیان کر سکتا ہوں۔ خزانے کے بند آسنی دروازے کے آگے کھڑا دم پہرے دار اپنا سر اٹھائے میلوں دور دکھائی دیتے دیکھو لیس کے جنم دہانے سے فوارے کی طرح چھوٹے اس دیکھتے ہوئے ستون کو دیکھ رہا ہے (جو ماہرین کے شمار اور تخمینے کے مطابق فصفا میں سولہ میل تک اٹھا تھا اور مکرمتا چھتری بناتا بستیوں پر آن گرا تھا)۔ اس جاں سپار کے خود اور چار آئینے پر اور اس کی چلیوں کے فوارہ پر، سرخ و نارنجی جنم زار کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ لاوے کا ہورنگ گاڑھا دریا کابلی کے ساتھ بہتا ہوا قدموں تک آ گیا ہے، اس کی تسموں سے بنی پاپوش سے بالشت بھر رہی ہے۔ یہ جواں سال دنتوں پر دانت جھائے سب خوبی

اور یک نوع کے Abandon کے ساتھ قدم جمائے کھڑا ہے۔ لاپنے نیزے پر جمے ہوئے پنچے کی گرفت، جڑوں اور بازوؤں کے پٹھوں اور نسوں کا تار و اس کی فواد پہنی چھاتی میں کسی دھڑکتے دل کا پتادے رہی ہے۔ دل جو ایک فطری خوف سے بہر حال جو جھٹتا ہوگا۔

ابا کہنے لگے کہ مصور نے سپاہی کی آنکھوں کو اور اس کی گرفت کو Define کرتے ہوئے ایک ناموجود خوف کا موجود ہونا دکھا دیا ہے اور میاں! یہی اس پینٹنگ کا جو ز اور اس کا کلائمیکس ہے۔ ایک زندہ، نسان کی تصویر کشی کی ہے اس نے، کسی مردے کا یا مٹھین کا فوٹو نہیں کھینچا ہے۔

ہم باپ بیٹے (خدا ہم دونوں کی مغفرت فرمائے) Paintings کو پڑھنے، ان کو ”دور تک جا کے“ سمجھنے کا یہ کھیل خوب کھیلتے تھے۔ میرے لیے تو یہ کھیل ہی ہوتا تھا۔ ابا کے لیے یقیناً یہ کسی طرح کی Exercise in Asthetics ہوگی۔ کتنے ہی شاہکار (یعنی ن کے پرنٹس) ابا گھر لے آتے تھے اور بلا تامل انہیں سامنے رکھ کے سمجھتے اور سمجھاتے تھے Judgement of Paris, Birth of Venus, The Naked Maja اور بھی بہت سی چیمنگلز ہمارے (اس وقت کے، شاید آج کے بھی) مسلم، مذہب کلاس گھروں میں Taboo تھیں۔ کھیلے عام آویزاں کرنا رہا ایک طرف، اس تصویروں کو میز پر پھیلا کر بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ مگر ہمارے بڑے کمرے میں شاہکاروں کو سمجھنے سمجھانے کا یہ سیشن برابر چلتا رہتا تھا۔ گھر بھی حسب معمول اپنی رفتار سے چلتا رہتا۔ ایک بار کے سوا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ میرے تایا صاحب نے ایک دفعہ کچھ تصویریں دیکھ لی تھیں تو ابا پر بہت خفا ہوئے تھے کہ میں! یہ انبیا علیہم السلام کے نام کی شمشیں اور بے لباس مردوں عورتوں کے فوٹو تم گھراٹھا لائے ہو۔ ذرا بھی خیال نہیں کرتے وغیرہ۔

آدمی کتنے ہی لوگوں کے ساتھ زندگی کرنا چاہتا ہے، مگر یہ پورا پھیلاوا کچھ اس طرح کا ہے کہ ایسا ہو نہیں پاتا جیسا آدمی چاہتا ہے۔ عین میں اس طرح بالکل اسی طرح نہیں ہو سکتا۔

میں نے ویسودیس کی آتش فشاں سے برباد ہوئے ایک قصبے، ہرکلانی ایم کی باقیات سے اپنے بیان کی ابتدا کی تھی۔ کہ وہ چوبیس اگست کا دن تھا۔ خبیج نیپلز پر خوب دھوپ تگی ہوئی تھی۔ آسمان صاف اور خوب نیلا ہو رہا تھا۔ کہ زمین کو دہد دینے والا ایک جھٹکا لگا اور مسلسل گرج اور کڑک کے ساتھ اتلا آغا ز ہوئی اور ویسودیس کے جہنم دہانے سے فوارے کی طرح چھوٹا آگ اور گرم ترین راکھ اور جھاگ سے بنا ایک دہکتا ہوا ستون فضا میں سوہ میل تک اٹھ اور نگرمتا چھتری ہانا بستیوں پر آن گرا۔

صبح کا وقت ایک نحوست آغا جھپٹے میں بدل گیا

سورج کے بڑے حصے پر پردہ پڑ گیا تھا۔

اس قصبے کو اٹھارہویں صدی کے آغاز میں کھود کر نکالا گیا تو کھنڈروں کی باتیات میں کتے، بیل، چوہے (جو عام طور پر بھاگ جاتے ہیں) نڈل سکے۔ ہرکلانی ایم کے ڈگ (اور کتے بیل چوہے) شروع کے جھٹکوں اور گرج کڑک سے دہشت زدہ ہو کے بھاگ کھڑے ہوئے ہوں گے۔ زلزلے کے جھٹکوں اور گندھک کی بو کے ہوتے بھی بہت کم راکھ قصبے پر برسی۔ لیکن دھوئیں اور راکھ اور جھاگ کا ایک کوہ بیکر بادل سات میل جنوب میں بسے (۲۵ ہزار آبادی کے) شہر پومپائی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھا گیا۔ دوپہر ہوتے ہوتے پومپائی شہر کے پناہ گیروں کے جھوم کے جھوم بہت خوف اور پریشانی میں، شمال کی طرف جانے کے لیے، ہرکلانی ایم کی سڑکوں گلیوں سے بڑ بڑاتے گزر رہے تھے۔ شمال میں نیپلز کی

بندر گاہ تھی اور عافیت تھی۔ یہ بھاگنے والے اپنے شہر پر برستی ہوئی آگ اور راکھ کے بارے میں بتاتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگ اس خیال سے کہ اگر ہوا کا رخ بدل گیا تو یہ قصبہ بھی پومپئی کی طرح برباد ہو جائے گا، جھوسوں کے ساتھ ٹیپلز کی طرف نکل گئے۔ ٹیپلز پہنچ کر وہ اس شہر ناپرساب کے ایک حصے میں، جو آج بھی ”ہرکلانی ایم کوارٹرز“ کہلاتا ہے، جا رہے۔

میں نے مثال دے کر سمجھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا، ”جیسے کسی کو کراچی آنا پڑے اور سمجھو وہ اپنی یادوں کی اسیری میں علی گڑھ کا لوٹی، یا بنارس بنا کے بیٹھ جائے۔“

(ہدایت کار نے گھور کے دیکھ، بڑے بھائی کراچی کا یہاں کیا ذکر؟) میں نے سوچا، اپنے شہر

سے محبت کرتے ہیں۔ انھیں یہ حوالہ بدشگونی جیسا لگا ہے، (Sorry)۔

اور پھر رات ہو گئی۔ لاوے کا گڑھا دریا مسلسل بہتا تھا اور آتش فشاں کے دہانے سے جھتی ہوئی گیسیں مرغولے بناتی فضا میں دور دور تک اٹھتی تھیں۔

جو بہت ہی ڈر گئے تھے ساحل سمندر پر جا بیٹھے کہ اگر حالات اور خراب ہوئے تو ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے نکل جائیں گے یا کشتیوں میں بیٹھ کر جہاز کر جائیں گے۔ بعضوں نے شہر پناہ کو نکالے رکھنے والی کمالوں محرابوں میں پناہ لی۔ انہوں نے سوچا ہوگا یہاں ٹھیک رہے گا، بالکل آگے سمندر جو ہے (سوان کے پتھر ائے ہوئے جسد کہیں اٹھ رہی صدی گزرنے کے بعد کھدائی میں برآمد ہوئے سمندر فرنگوں پیچھے چلا گیا تھا۔ لاوے نے لینڈ ماس (Real Estate) بڑھا دیا تھا۔)

تو بھائی، آدھی رات کا گھبر بجا، اگست کی پچیسویں تاریخ ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد آتش فشاں کے دہانے سے میلوں کی بندی تک پہنچا ہو، قیامت کی آگ اور راکھ ورسنتے ہوئے جھاگ کا وہ ستون نگرستا چھتری بنانا زمین پر آن گرا۔ انا لند وانا الیہ راجعون ایہ خاتمہ تھا۔

ہوا میں اور آتش فشاں کی گیسوں میں خوب پھینٹا گیا Super-Heated جھاگ اور راکھ کا ملغوبہ شہر کی طرف ساتھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے پکا۔ اس کی حدت کا اندازہ ہر دہائی کے سات سو پچھتر درجے فارن ہائٹ لگایا ہے۔ احتفظنا جان ہی نے کو تھوڑی سی مہمت ملی تھی۔ سو ہرکلانی ایم د لے جو بستی میں رہ گئے تھے ساحل تک پہنچنے کو دوڑے۔ مگر دہشت کی س ہڑ بڑی میں، جو ہری کی دکان کی کوٹھڑی میں لینا ہوا وہ بیمار لڑکا، اور کستس سے منسوب قربان گاہ کے کمرے میں اسیری کی صعوبتیں جھیلتا عالی منصب قیدی در بھی کچھ بے چارے، جہیں دگ بس بھول گئے تھے ایک نہایت تکلیف دہ موت (اور احمق نہ جسنانی ہمیشگی) بھگتنے کو پھنسے رہ گئے۔

اس مقبرہ پرستی پر سے آگ کا ایک بے پناہ سیل گزرا۔ وہ اپنی لپیٹ میں بہت کچھ یتا ہوا ساحل آب تک پہنچ گیا۔ پھر دوسرا ریل آیا جو پہلے سے کہیں زیادہ بھیا تک اور تباہ کن تھا۔ اس نے چھتیس اڑادیں اور دیواریں گرا دیں۔ پھر دالانوں، اساروں اور چھتوں اور دیواروں اور سب چیزوں کو پکڑے کی طرح سمیٹتا ہوا وہ سمندر میں اتر گیا۔

ویسویس جب انہیں گھنٹے بعد خاموش ہوا تو یہ قصبہ چھیا سٹیف موٹی، بہت سیاہ اور چٹان کی طرح سخت کھرند سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ کھرند ایسی تھی کہ عام اوزاروں کے بس کی نہیں تھی اس لیے جب ۱۷۰۹ عیسوی میں کنوؤں کے جیسے Shafts نچلے طبق میں اتارے گئے تو بس ایک قدیمی ”تھی ایئر“ کے اسٹیج تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی۔ وہاں سے یہ مشکل ماربل کے چند Slabs اور یونانی اور رومی مجسمے ہاتھ آئے۔ اگلے پچاس برسوں تک کنویں کھودنے کا (اور چوری چکاری کا

بھی) سلسلہ جاری رہا، پھر بند ہو گیا۔

کیوں کہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ قریب کے شہر پومپائی پر پڑی راکھ اور لدا آسانی سے ہٹایا جا سکتا تھا۔

ہرکلانی ایم سے کلاسیکل فن کے جو نو اور مختلف اشیاء کی صورت میں برآمد ہوئے تھے ان سے، بہر حال، اس وقت کی عمرتوں اور فرنیچر اور کپڑوں کے ڈیزائن متاثر ہوئے اور کچھ رونق آ گئی۔

واقعے کو انیس سے زیادہ صدیاں گزر گئی تھیں، اور کھدائی میں بس اسی طرح کی چیزیں نکل پائی تھیں۔

کھودنے والوں نے اب جو پومپائی پر توجہ دینی شروع کی تھی تو بیس فیٹ موٹی راکھ کی دور کی کے نیچے سے بہت سی چیزیں نکلی تھیں۔ پر میرے دوست پومپائی کے پہریدار کے سوا آدمی کوئی نہ نکلا تھا۔ شہر کی تباہی سے پہلے ہی سب ہرکلانی ایم، یا اور آگے، نیپلز میں پناہ لے چکے تھے۔

پھر اٹھارہویں صدی کے کسی مصور نے پہرے دار کے نیزہ تھامے، پھر ہوئے جسد کو دیکھا اور Paint کیا اور میرے ابا، نواب کے کتب خانہ خاص سے وہ کتاب پسند کر لے جس میں اس بے مثل کینوس کا پرنٹ موجود تھا۔ اس وقت تک میں ”عبد قدیم کے ہیروز“ نامی کتاب میں پومپائی کے پہریدار کا قصہ پڑھ چکا تھا اور پھر، جیسا کہ یہاں کر چکا ہوں، میرے باپ نے اس پینٹنگ کے محاسن سے مجھے روشناس کرایا اور اب نئے طے قیتم کے اس جون مینی میں، میں، اسٹین کے دارالخلافہ مادرو میں بیٹھا اپنے دوستوں کو آدہ کر رہا تھا کہ یارو! نیپلز چلو اور پومپائی کے اس جوان مرگ سوانت کو دیکھو۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔

”ایسے موقعے“ میں نے خود سے کہا، ”ایک نہبتا چھوٹے شہر کے Average طالب علم کے بے ماجرا لڑکپن میں کب آتے ہیں ایسے موقعے؟ کہ اسے ایسی کوئی کہانی پڑھنے کو ملے اور ایسا کوئی شاہ کار دیکھنے کو ملے اور طالب علم کو وہ مصور باپ مد ہو جو تھویر کو اس طرح سمجھ اور سمجھ سکے۔“

میں ان سب نوازشوں، عنایتوں، بہرہ مند یوں کے یہ وقت کا شکر گزار ہوں کہ جس کی کیمسٹری نے کسی سمجھ میں نہ آنے والے عمل کے دوران بہت سے واقعات بہ ظاہر ایک بے ترتیبی سے اوپر تلے رکھ دیے، جس سے وہ سب ہوتا چلا گیا جو میرے لیے اچھا، بہت اچھا تھا اور جو میرے سامان گمان میں بھی نہ تھا۔ یقین کیجئے ایسا نہ ہوتا تو کچھ اور ہو جاتا۔

اس لیے کہ کسی بھی راد چلتے کے ساتھ وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ چھپائی گئی ٹی ٹی نکالتا اور دائیں بائیں فز کرتا نکلا چلا جاتا ہے۔

میرے اس اناسی عیسوی کے قصبے ہرکلانی ایم کے سلسے میں بھی کہیں نیچے میں اڑس کے چھپائی گئی ٹی ٹی جیسا ایک فیکٹر موجود تھا۔

وہ تھا آتش فشاں ویسوویس!

جس نے جواہر تراشے والے کی دکان کے پیچھے کوٹھری میں پڑے بیمار لڑکے کو ٹھیک سے ناشتا بھی نہ کرنے دیا۔ لڑکے کے بستر کے سرھانے ایک طشتری میں مرغ کی تلی ہوئی اور پتھر بنی ہوئی ٹانگ رکھی تھی (آدھے گھنٹے پہلے، ما آئی ہو گی، ”لے میری جان اتیرے یہ لائی ہوں“ لے کھالے کچھ بھی تو نہیں کھاتا۔ باپ کے ساتھ لگا لگا چلا آتا ہے۔“)

اور یک دروازے کے برابر دیوار پہ لکھی وہ Graffiti کہ، ”امفیہ خدا سے پیار کرتا ہے پارتم نووس“ (میں نے اسی فقرے سے تباہی کی یہ کہانی آغاز کی ہے۔)

Aah! عشق! یہ خانہ آباد کبھی بھی ظہور کرے، کہیں بھی ظہور کرے، کوئی نہ کوئی جتن کر کے، مٹی پہ چڑھ کے، اپنی یا نگوں سے سب گلیاں چوبارے بھر دیتا ہے کہ ”ارض و سما سوسٹو۔“

تو ساحل پر، اور انٹی پڑی کشتی کے برابر اور دکانوں اور دست کاروں کے ٹھیوں پر اور نانباتی کے نور میں وقت یوں ٹھہر گیا تھا کہ اسے دیکھا جاسکتا تھا۔ Oven میں پوری اسی ذہل رویاں لگی تھیں۔ ان روٹیوں، پیسٹریوں پر نانباتی کے نام کا ”ایس پی“، سسکتھیں پاتو لکس چھپا ہوا تھا۔ وہ نگینہ جس پر جوہری کام شروع کر چکا تھا، اوزاروں کے برابر پڑا زلت تھا کہ جوہری بے سوچے سمجھے بھاگ اٹھا تھا۔ اندر کوٹھری میں پڑا بیمار بیٹا بھی یا نہیں رہا تھا اسے۔

پیتل کی ڈھلائی والا کاری گرمی کے لیے آئے شمع دان کو جہاں کے تیاں پھینک کے دوڑ گیا تھا (جی نہیں، ”جہاں کا تھاں“ نہیں۔ یہ شمع دان اس کی بیٹھنے والی تپائی پہ پڑا تھا۔ گھبراہٹ میں وہ اٹھ ہوگا، شمع دن اور ہتھوڑی تپائی پہ ڈال ہوگی اور نکل لیا ہوگا۔)

ہر کلائی نیم کی تفصیلی کھدائی میرے پیدا ہونے سے آٹھ برس پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت Compressed-Air برے، بجلی سے چلنے والے اوزار اور بل ڈوزر بھی آچکے تھے۔ کھدائی کا کام اب کے آثار قدیمہ کے ماہروں کے سپرد تھا۔ خزانے ڈھونڈنے والے طالع آزمایوں کو اس جگہ سے پچاس (یا زیادہ) قدم دور بھیج دیا گیا تھا۔

آج میں عرض کرتا ہوں کہ، آج اس قصبے کے سولہ ہزار کس لاؤس کی موبالات چٹانوں کو Chip off کر کے بازیافت کیے جاتے ہیں۔ ان سولہ ہزار کلوں کی کٹر عمارتیں، پتھر جڑے کھرنجوں والی گلیاں، فورم اور باسیڈیکا جس میں انتظامی دفاتر و رکھریاں تھیں اور پاسٹر کا آدھے سے زیادہ میدان (جہاں آگستس کی سال گرہ کی خوشی میں کھیوں کے مقابلے ہو رہے تھے) نکالا جا چکا ہے۔ عمارتیں اور ان میں پھنسے رہ گئے لوگ، ان میں پڑا سماں، سب اس لیے محفوظ (اور پتھر) ہو کر رہ گئے کہ آتش فشاں کا جاری کیا ہوا پگھلا مادہ سب میں بھرتا چد گیا تھا۔ اور چیزیں اور لوگ ”ہوا بند“ ہو گئے تھے۔

اس قصبے میں جانا بالکل ایسا ہے جیسے ہم نے کسی غیر مرنی دیوار کے پار ایک ٹائم وارپ (Time Warp) میں چھلانگ لگا دی ہو۔

سائل کنڈے، اپنے کھانچوں میں سٹے ہوئے، اب بھی گھومتے ہیں۔ پانی کے ذخیروں میں لگی ہستی ٹوٹیاں اشرے سے کھلتی بند ہوتی ہیں۔

رسوئی گھر میں برتن بھاندے، ڈھیلے ڈھلائے موجود ہیں۔ کونلے کے چولھے پر ایک سلا چڑھا ہے۔ ایک خواب گاہ میں مرمر کے تختے پر کنگھے اور آرائش جمال کا سب سامان پڑا ہے۔ کنگن، انگوٹھیاں، ہنسیاں اور بروج۔ آئے کچھ ابرا، کچھ شراب آئے۔

اور صاف جیو! اب یہ ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے۔

☆.....☆.....☆

وقت کے کوڑے دان میں

رشید امجد

وقت کے کوڑے دان میں بہت کچھ تھا جسے زمانے سے اٹھ اٹھ کر وہاں پھینک دیا تھا ایک سفید ریش داستان گو بھی تھا جو کبھی لہجے کے اتار چڑھاؤ سے سانس باندھ دیتا تھا، مجمع کی سانسیں اس لہجے کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے ہوتی تھیں، اسے داستان سننے کا فن آتا تھا اور اس کی داستان سننے دور دور سے لوگ چلے آتے تھے لیکن اب وہ خود ایک بھولی بھری داستان تھا، جسے سننے کے لیے نہ مجمع تھا نہ اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ باقی رہ گیا تھا، وقت کے کوڑے دان میں وہ بھی زمانے کی مسترد کی ہوئی اشیاء کی طرح ایک طرف پڑا تھا، داستان گوئی کا شوق بھی اس کے اندر کہیں دور نذر موجود تھا لیکن اب داستان سننے والے کہاں؟

وقت کے کوڑے دان کی ہر شے اپنی جگہ ایک داستان تھی، بھولی بھری داستان سبھی اس کوڑے دان میں تھے۔ ایک دوسرے سے متعلق، ایک دوسرے سے غیر متعلق، بوڑھا داستان گو اور اس کی ننھی کوچہ کے سہارے وہ گھنٹوں کھڑا داستان سنایا کرتا تھا دیمک چاٹ رہی تھی۔ اس کی داستانی بھی پرانی ہو کر کوڑے دان کا حصہ بن گئی تھی۔

افسوس بوڑھے داستان گو نے تاسف بھرا لباس لیا اور اسے وہ زمانہ یاد آیا جب اس کی داستان سننے کے لیے دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے۔ اسے اپنے ہیرو سے بڑا پیار تھا، اس کے جمال، بہادری اور بے خوفی کا ذکر کرتے ہوئے داستان گو کا چہرہ تہمتہ نہ لگتا تھا، اس کی آواز میں جوش پیدا ہو جاتا اور جب ہیرو ہمیشہ کی طرح منع کرنے کے باوجود چوتھی سمت نکل جاتا تو مجھے بھر کے لیے ٹھہر جاتا، مجمع پر ٹپٹپٹ ہوئی نظریں ڈالتا، جب لگتا کہ مجمع میں سکوت سا آ گیا ہے تو وہ داستان کا اگلا حصہ شروع کرتا۔ ہیرو کی مصیبتیں اور مشکلات داستان میں جو الجھن پیدا کرتیں، وہ خود ان سے لطف اندوز ہوتا اور مزے لے لے کر بڑی مہارت سے اختتام کی طرف بڑھتا۔

لیکن اب یہ سب پرانا، بہت پرانا ہو گیا تھا، پہلے تو مجمع اٹھا ہی نہ ہوتا، اگر دو چار جمع بھی ہو جاتے تو تھوڑی دیر بعد، داستان کے آغاز ہی میں ایک ایک کر کے نکل لیتے۔

خالی پنڈال کو دیکھ کر داستان گو کا کلیجہ چیرا جاتا۔

”سن تو وہ بھائی سن تو لو۔“ وہ آخری جاتے ہوئے کو منی صب کرتا لیکن کوئی مڑ کر نہ دیکھتا۔

”کیا میری داستان پرانی ہو گئی؟“ وہ خود سے سوال کرتا مگر جواب کون دیتا، سائیں سائیں کرتا خالی پنڈال بول

نہیں سلکتا تھا مگر کچھ کہتا ضرور تھا جسے داستان گو سن نہیں پاتا تھا۔

ایک دن ہمت کر کے اس نے آخری جاتے ہوئے شخص کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

”بھائی کچھ تو کہو۔۔۔“

وہ شخص کچھ نہ بولا، بس اسے دیکھتا رہا۔

”کچھ تو بولو کچھ تو کہو۔“

”آگے جانے والا ایک شخص مڑا، چند لمحے دونوں کود نکھتا رہا، پھر بولا ”یہ بول نہیں سکتا صرف سن سکتا ہے۔“

”اور تم.....“ داستان گو نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”میں بول سکتا ہوں لیکن سن نہیں سکتا۔“

”تو میرے سامعین میں سبھی گوشتے بہرے تھے۔“

جو سن سکتا تھا اس نے اشاروں میں دوسرے کو کچھ سمجھایا، دوسرے جو بول سکتا تھا بولا ”ہم تمہاری داستان نہیں سنتے تھے، ہم تو تمہیں دیکھتے تھے، تمہارے جوش اور ولولے کو، ہاتھوں کے اشاروں کو، اور تمہارے ایک ایک انداز کو“ لگا جیسے لفظ لفظ ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں۔

”تو اب“ داستان گو نے اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ دیکھ چاٹتی لٹھی کو دیکھ، جو ڈگر رہی تھی۔

”تو اب“ داستان گو کو اپنی کاہلی آواز خود کو عجیب لگی۔

”اب“ بولنے والا بڑبڑایا۔

تادیر خاموشی رہی، پھر رک رک کر بولا ”اب سننے والوں میں سے بہت سوں کی بینائی بھی جا رہی ہے۔“

داستان گو کو لگا اس کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ دیکھ زدہ لٹھی کا ٹپ کر رہ گئی۔

”اسی لیے..... شاید اسی لیے“ وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

بول سکے والا اور سن سکے والا دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ تادیر دیکھتے رہے پھر بول سکے والا بولا۔

”ہم جو دو چار رہ گئے ہیں ہماری بینائی بھی لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہی ہے۔“

پھر بہت دیر چپ کے پھر پھڑانے کی آواز آتی رہی۔

”بس جسکے ہے، سننے کا تو آ جاتے ہیں“ بول سکے والا بولا ”لیکن کسی کو سنائی نہیں دیتا کسی کو دکھائی نہیں

دیتا۔“ پھر وہ خود ہی ہنسا ”اے داستان گو تمہیں تو سنائی دیتا ہے دکھائی بھی دیتا ہے؟“

داستان گو کو ہر شے، وہ دونوں بھی دھندلائے سے لگے، آواز دور، بہت دور کہیں سے آتی سنائی دی، ٹوٹ ٹوٹ

کر، رک رک کر۔

”تو سننے والے“ سننے والا، دونوں ہی ”اس نے سوچا، قدم ڈگر گئے۔ دیکھ اب شاید لٹھی کو چاٹ

چکی تھی، اب وہ صرف دکھائی دینے کی حد تک لٹھی تھی، ذرا بوجھ پڑا تو کچھ مٹی کی طرح نہٹتی چلی گئی۔ داستان گو دھڑم سے

نیچے جا پڑا۔

وقت کے اس کوڑے دان میں بہت کچھ تھا جسے نہانے سے اٹھا اٹھا کر یہاں پھینک دیا تھا، ایک سفید ریش داستان گو،

مٹی مٹی ہوتی لٹھی اور سننے والے جو دیکھ نہیں سکتے تھے، جن کے بولنے اور سننے کی قوت بھی لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہی تھی۔

وقت کے اس کوڑے دان میں !

☆...☆...☆

بغلی گلی کے جا بجا پھیلے نقش

صبح آ ہو جا

اُس کا اوچھڑ عمری سے اگل قدم آگے بڑھنے ہی والا تھا، لیکن اب بھی وجود کا ہر عضو خزاں ہر دوش ہونے کے باوجود اس پر چڑھی بہار کی کٹھا سمیٹے ہوئے تھا۔ اور وہ.....؟

پریم گلی کے آستانے کی چوکھٹ، بڑے بازار میں فٹ پاتھ والے کنڈونمنٹ کے سرکاری ٹل کے روپر و بزاز کی دکانوں کے بیچ دبی ہوئی اپنی شنگار کی جھلک دکھاتے شروع ہوتی اور سانب لہریوں کی طرح پھیلتی جاتی ہے۔ بائیں جانے کی بجائے دائیں جانب کے آخر میں پتلی سی گلی کو پار کرتے ہی وسیع و عریض احاطہ اینٹوں کا پکافرش اور سیلا! نظروں کو جذب کرتا، بے تانت کھینچتا خوبصورت حویلی نما مکان، تراشیدہ پتھروں کی چٹائی و راحت و سکون بخش مینو کا سرسبز و تنگم، تینوں بھرے بڑے بازاروں سے آنے والے، چیت چالوں کے چونچلے، اپنے کیسے پر ہاتھ پھیرتے دل آویزی کے مول تول کی رقوم میں معاملہ مننے نہ پٹنے سے نفع نقصان کا ترازو آویزاں اور دس بی دس میں گرہ گاتھ پکی، صافست و نشست سے بے بہرہ، سر ڈھانپنے، منہ چھپانے، تاکتے، نظروں سے نشہ دوری رست چوستے، اپنے آپ کو سمیٹتے۔ ہراک راس رس کے سوداگر مینو کے در کی پذیرائی کے خواہش مند، طلب گاری میں حسد کا مغلوب کرتا سحر، اور روکھا جواب سن کر ہوا کو ٹھوکر میں مارتے مینو ہی کے گھر کے دوسرے کمروں کی جانب اٹھتے قدموں کے ساتھ ہی مینو کی محبت کی شہد چٹائی صبح آواز کانوں میں سمیٹے، تجب میں غصاں۔!

سویمبر چٹاؤں کے یارو !

وہ پتھر یا نہیں، وہ تو گالیکہ ہے !

دن بھر اپنے راگوں سے اس گھر کو اور محلے بھر کو رنگ دیتی ہے.....!

تم لوگوں کے دل میں جب بھی خیال آئے تو

صبح دس بجے گائیکی کی ڈولی میں سوار ہونے، چلے آنا.....!

مگر کوئی سنٹر کی بغلی مستی بکھیرتی گلی کا یہ عجوبہ چلن روپ کیسا.....؟

اور سواووں کے الجھاؤ میں پستے، دوجے سب دروازوں کی جھریوں سے بناؤ سنگھار میں بنی بچی شوخ چنچل کچلے میں سجد و سنگ مہر رس نیکاتی جلوہ گر ہوتیں، جو چیت چال باتوں کے پون جھولے کے چم چھلکاتی، مول توں کرتی، بازوؤں سے پکڑ کر اندر کھینچ لیتیں اور دروازے پر زنجیر چڑھنے کی آواز، کہ محاصل و خراج وصول، سواری جانور پرلد، ملکہ کی محل سرا میں پہنچا ہی چاہتا ہے.....!

گھر ملکہ سے کہاں.....؟

ساری بغلی گلی میں اور کہاں.....!

جہاں ہوس و حرص کے شعلوں سے جلاتی آنکھیں، شوق کی بھڑکتی شندی، پھیتوں کا ہنگام، فحش گوئی اور دشنام

بھرے ٹھنوں سے بھر پورا اور وہ ؟

نچانے پریم گلی میں اس کی کٹی پٹنگ کیسے آگری۔ بغلی گلی کے بیچ دھم نے دیکھا، کہ کڑی آنکھوں کے کھوج نے بیچ باندھتے پیر مندے مے فروش دلاؤں نے انہیں پہچانتے، اُن کو گھیر کر پھنسا، سودے کی پونچھ کو بنا پونچھے، بے رنگ کرتے، زیر مراد کا آگے پیچھے پڑو پھیرتے، بنا ہینگ پھٹکری لگے لڑکی کو تار یک لبر تھ میں اتارنے کی خواہش میں سپرد در پھد نکا، پھلی چادر کے نیچے ہاتھ میں ہاتھ پکڑے معموریت چھینتی چاہی، تو دو بجے پیچھے رہ گئے دیو بیکل غراتے انہیں گھیر کر کھڑے ہو گئے، تو مے فروش در لوں کا انہو اُن کی یہی غرہٹ پر ہی آ پہنچا اور چاہتے تھے کہ دست پنجہ کر کے ہاں کو چھین لیں مگر چادروں کی بیکل میں چھپی پکی دل کتی بندو توں کی جھٹک دیکھتے ہی وہ سب اندر تک خوف کے مارے بخ ہو گئے اور سیدھے سیدھے کیسے کی جھٹکار کا بوجھ پوچھا تو اُن کی ہوا نکل گئی۔ رقم کے ہندسوں کا بوجھ سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے مینو کے در کی جانب راہ نمائی کر ڈالی، مینو نے بھی رقم کی جھٹکار کا بوجھ دیکھا، سنا اور مسکرائی، اُس کے دنت دیکھے، چلت دیکھتے نام پوچھا اور آواز کی چاشنی جھکتے اسے کمرے میں بھجوانے سے پہلے اثبات میں سر ہدیا، تو سائیں جو اُن کے ساتھ نہیں تھ مگر اس کی خوشخواری، رعب اور دبے کی پوشاکوں میں ملبوس گیا رہ گا تھ کیت ٹھہر دیو قامت سور ماؤں کے سنگ بندھا تھا، وہ مینو کی زبان سے مول تول سننے کے منتظر، مگر سپہی اقرار پر ایسے پھیلے کہ جہاں دیکھے تو اپرات وہیں گادے ساری رات، دو چھٹیں سکد شاہی لینے کے بعد اپنے انعام کی رقم پتے پلٹ گئے ورا ہی پر بغلی گلی کی تمام ٹائیکڈ آنکھیں حیرانی سمیٹے ابھی پُ سکون بھی نہ ہوئی تھیں کہ حسو کے گاہک اپنے کمرے میں لینے سے انکار پر دھوم مچ گئی اور جب مینو نے کرید کر اڑان بھری کبوتری تو پھر تو کس چھتری پر بیٹھے گی۔ تو جو با گائیگی کی مجلس آرائی پر وہ مسکرائی، تو ٹھیک ہے دو ایک سارنگی والے اور طہر اھولک والے بلا لیتے ہیں تو سارے کوٹھے بھلاتے پھڑ پھڑائے، سواہوں کا اک لشکر مینو کے رو برد آ یا کہ پانی پت کا میدان کھل گیا۔؟ بیسوا کے اطوار میں تو دن کی محفل سجا ناہید از قیاس تھ۔

ہاں کوں بہت ہی سرچڑھا گا بک ہو تو بات دوسری ہے، لیکن یہ ؟

یہ کیسا چھالا ہتھیلی پر پاں رہی ہو۔؟

کل کلاں کو ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔!

لیکن مینو کا جواب، وہ بھی دھیسے سروں میں دل چھینتا۔۔۔!

دل داسی کا مندر ہو تو۔۔۔؟

اور مری منو ہر ہر دم جس کے رو برد ہیں، وہ۔۔۔؟

وہ تو دن رات کو شام لاسٹ پر چڑھائے گی ہی۔۔۔!

لیکن پھر وہی سرگوشیوں کی بوچھاڑ

شام کا پڑاؤ اور قفقوں کی روشنی، تو سب عیب ثواب چھپائے۔۔

مینو! آخر تمہارے شاندار مکان میں دو بجی لڑکیاں بھی تو ہیں وہ۔۔۔؟

وہ اگر بکھر گئیں تو۔۔۔؟

پیارے، آئینہ رو، دلبر بکھیلو! بکھر نہیں۔!

ان کے سے دن رات، آئینہ بند، جس جس روش پر اظہس زریں بچھا ہے اور جشن کا ساں رہتا ہے !!

مگر تم نے تجا نے یہ خیال کیا یا لیا ہے.....؟
 یہ تو پہاڑ ہے چپ کا، نہ کچھ اٹکتی ہے اور نہ ہی کھلتی ہے !
 اگر صرف گانا ہی تھا تو سرائے نیلی رام اور قصائی گلی کھل گئی۔ وہاں جا بیٹھتی !!
 مگر تم ؟

ہر ایک کی ٹوہ میں رہنے والے چھوٹی کے، باد کا بھی نہ جان سکے کہ وہ کون ہے۔ پریم گلی میں اولین درس تو یہی تھا کہ نکالوں اتری ہر ذی روح کے وجود میں آتی جاتی ہوا میں بھی سیندھ لگا رکھو کہ اس نعلی گلی کی پرچہ ناگنی سانس لیتی راہوں میں نیچے اور بالا خانے کے کمروں، بالکونیوں پر پھیلا ہوا شہر افسوں، پھونکے ہوئے سحر پڑ فریب میں اسیر کرتی چٹک ملک تو گلی کے فرش سے قلب تک بے فکری میں مستی چھالتے، انڈیلنے، ذومعنی دعوت کے اشارے نرھکاتے، ہر آنے جاننے والے قدموں کو زنجیر کرتے اپنے سحر میں تازگی محشر پھونکتے، جدا جدا کمروں کے سلاخوں کی ہی فطرت کے پیچھے اودھ کھلے درپچوں سے تاڑتی کھل بھری انگلیاں، گھونگٹ کاڑے دروازوں کی اوٹ میں نیم عریاں پہلو بدلتے، پنڈلیوں، رانوں کا حرص و ہوس کو ہمیز گاتی شہوت بھرے کچاؤ سے نظروں کا امتحان لیتی نیم عریاں حسن آرائیاں، اندر اور باہر کے رونقی بازاری لگے میلے کے اڑدھام میں نظروں کو چٹا ناز کرتے، اندر تک کا پوشیدہ احوال کھود نکالتے مگر اسے کریدنے کے باوجود کچھ بھی تو نہ نکال پائے، صرف اور صرف اک لمبی تیز دھار سینہ شکنندہ آہ، لٹسے کی صورت تراشتے، آسن گراہن کر داتے، کیرت سچاں، بچتی گھنٹی میں فتح یابی کی آس سپنوں کی جی محض کپڑ چھن نچوڑ سے کیا نکلتا، کچھ بھی تو نہیں کوئیل سنٹر ۹

سولین کے گھریو چوہے اور ہلا کر اوں فوجیوں کی بیرکس کے میس اور کراڈن کندھوں پر سجائے فوجیوں کے رہائشی بنگلوں کے کچن اور چھوٹی موٹی بھٹیوں کو روشن رکھنے کے لیے وہ بازار پرانی چھوٹی میں ایندھن سپلائی کا مرکز !
 مگر خمریاتی نشے میں مست، نامیوں کے لیے اس کے کوئی معنی ہی نہ تھے، کیونکہ میس میں ہر نوع کی پکی پکائی خوراک مینو کے مطابق مل ہی جاتی تھی۔ وہ تو ؟

وہ تو اپنی پیاس کے مطیع تھے، عورت کے جسمانی مس اور خمری گھونٹ میں مست، ہر آڈر پر بیک کرنے کو تیار، کمانڈنٹ کے حکم سے بسائی گئی پریم گلی کا عالم مستی ہوا یا ہوش میں کساد جود، وقت بے وقت، ہمیشہ یاد رکھتے درخصوص کرسمس کی دس چھٹیوں میں مال روڈ پر فرمستیاں کرتے، ہوا کو سونگھتے، کچھ بجلی کے سب شیٹن اور کمپنل سینما کے بیچ بہتی سڑک پر اسی کے بہاؤ میں بہتے اونچے سروں میں گاتے ہوئے کوئیل سنٹر میں یاریلوے چٹلی کی طرف جاتے، برڈن لوسٹریٹ پر ہو لیتے یا میسی گیٹ سے نیچے اتر کر تین اطراف سے بکھر کر کوئیل سنٹر مین بازار کے وسط سے پار اوں لوسٹریٹ کی بیچ کی گلی سے ہوتے ہوئے، پریم گلی میں اتر جاتے اور احاطے میں جمع ہو کر مینو کی حسو کے نعرے لگاتے اور جھوم کی قطاریں لگ جاتیں، بدن سے خوشبوؤں کی پیٹ میں ہونے کے باوجود گورے کی اٹھتی ہوئی گول کی مستی سمجھ کر پیتے اور وہ گھڑی کی سوئیوں سنگ لپٹی دس بجے ہی دروازہ کھولتی، صحن بھی اچھا خاصا بڑ تھا یعنی پچیس بائی تیس فٹ لمبا چوڑا، جتنے بھی نامیوں سے صحن کھچا کچج بھر جاتا، دروازہ بند کرنے لگتی تو اندر آنے والوں کو جگہ نہ ملنے کے سبب باہر ہی روکا جاتا تو چونکٹ پار کرنے کی آس میں دھینکا مستی شروع ہو جاتی کئی ایک تو دروازے سے ٹک جاتے کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ دے۔ کھلی ہوئی دم پخت مینو بھر پور چٹک ملک میں لپٹی بقایا طوق بہار، چوبیس پچیس ظرافت بانٹی اندر سے نمودار ہوتیں اور پسند کے نامیوں کی گود کو بھر دیتیں

اور چوہ چائی شروع ہوتی تو وہ ہتھ ٹائیے تو انہیں گھورتی رہتی اور پھر وہ پچکارتی دھیمے سروں میں اندر کی بڑ بونگ اور چوکھٹ سے چنے اور باہر اعلیٰ کے مینوں والے پختہ فرش پر بے ترتیب کھڑے دھکم پیل کرتے ہنگام چلتے مایوں کو ٹھنڈا کرنے کی سعی کرتے کل پر نالتی، مگر جو باؤن کی غرائیں ابھرتے ہوئے تیز تر ہو جاتیں تو پھر سر جھکم میں ایک بجلی کا ایب کوڑا رسید کرتی کہ وہ چپ ساکت، ان کی نظریں سوالوں کے ساتھ استجاذوں سے بھر پور، تم سب کی باری کل آئے گی، تو وہ دھتکارے کتوں کی طرح سر جھکائے، کہ کل کی فہرست میں ان کا نام درج۔ مگر دروازہ بند کرنے سے پہلے وہ سب کو باری باری دینی تند شراب کا ایک آدھا ہینٹے، بڑی دھیرج سے دروازہ بند کر دیتی اور وہ باہر ایشیوں لگے فرش پر بیٹھتے، ارے سے دو چٹکیاں لیتے کہ کانوں میں کوئیل کٹھی اتر کر داکھ کی بھٹی سے نکلی سیلی پور کی شراب کے خم کے خم تارتی، بے سدھ کرتی چلی جاتی اور کوئی تین سواتین گھنٹے اس کی گائیگی مدہوش کیے کھونٹے پر باندھے رکھتی اور تو اور ساری پریم گلی میں بھی سنا چھایا رہتا۔ اس کے علاوہ تو کوئی دوسری گائے کے بل پر نہیں تک سکتی تھی۔ گر گلہ ٹھیک ہوتا یا شش پہلوم، پنجے اور بیڑیاں پائیل کی جھنکار کو اپنی سنگت میں سمیٹ سکتیں وردن میں بھی سر بھر کا تکیہ گائے نرت بھاؤ کے ماتروں اور وقفوں میں پاؤں کی چلت کا بوجھ سہاؤ سے اٹھ سکتیں تو یہاں پر، اسی گلی میں ایک گوشہ جری والی ماسی جی کے ہرقبضہ جہانے سنگیت بہاتا، وردن مایوں کی راں یا راجہ بازار والی قصائی گلی میں طبعی سرنگیوں پر لہکتی لہراتیں۔ مگر نکلی کا تو کام منوں کا حساب ہوتا ہے، اب کون گھنٹا بھر گائے ناچے اور اونچان کی جانب اڑان بھرتا پھرے۔ مگر سب ہی اس کی گائیگی کے جلوے سے انجہائی حیراں و ششدر مست است اگلے دروازوں کا روپ دیکھنے چل دیتے اور ساری پرچہ گلیوں کی چتوں اور دروازوں کی اوٹ سے جھانکتی آنکھیں، اونچے نیچے سروں میں ٹکریں اور لہرتی کھنیوں اور انگلیوں کے بڑے واضح اشاروں سے پھنستیں، حسن کی پھولی سروں اور اس پر چمپئی و دیگر کھینچ رنکار رنگ گل بوئے بھی حیرت میں غرق اور وہ سہ پہر تک مناکر رات کی پہلی گھڑی کے اوین سے میں ہی ساری رعنائیوں کو، شش و پنج میں چھوڑ نکل کھڑی ہوتی، سب نے تو کیا، مینو تنک نے سبب جتنا چاہا مگر ؟

احاطہ فضل الہی کی مسجد سے جہاں عشا کی اذان بلند ہوتی و دسرمند کو سیاہ شال سے لپیٹتے مولوی متھ کے بچوں کے سکول کے سامنے سے ہوتی براؤن لوسٹر ہٹ پر نکل کھڑی ہوتی اور کلکتہ بیکری کے ساتھ چپس گلی سے نکلتے ہوئے، چٹکی سے تکی سڑک پار راتے دائیں بائیں نظر ڈالتے، ریوے ہنگوڑ کے درمیانی گلی میں گھس کر نظروں سے غائب ہو جاتی۔ نماز ختم ہوتے ہی نمازی تو نداں نداں نکلتے جاتے لیکن جب آخری نمازی کھجے کی پڑسردہ زرد روشنی میں اپنی منزل کی جانب جاتے ہوئے نظروں سے غائب ہوتا تو، شاید کوڑے کرکٹ والی گاڑیاں وقفے وقفے سے آتیں اور ہونٹ کے سامنے والی مچی زمین پر ڈھیریں لگاتے غائب ہو جاتیں اور چاروں بھٹکی ڈھیریوں کو کوڑا گھر میں منتقل کر ڈالتے۔ مگر جیسے ہی ہسپتال سے کوڑے کی گاڑی آتی در کوڑے کی تین ڈھیریں لگنے سے پہلے ہی ریوے کے فیسر ہنگوڑ کے بیچ راستے سے نکلتی اور بجلی کے کھجے کے نزدیک ٹالی کے تناور درخت کے ساتھ آٹھنٹھتی، وہ ہر کوڑے کے ڈھیر کو نہیں چھینرتی تھی، مگر ہسپتال سے آئی گاڑی کے کوڑے کی ڈھیریاں بنتے ہی چاروں بھٹکی اپنی سڑگڑیاں چھوڑ کر آتے دو پلچوں سے تعاریاں بھرتے در دو سیڑھیاں چڑھ کر کوڑا بھرے تنار کے کوڑے کو آسنی کوڑا گھر میں پھینکتے چپے جاتے مگر سڑگڑیوں سے ماری باری کش لیتے، چائے کے پیالے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھل پھل ضرور کرتی، ہر نوع بوسیدہ پرانے کاغذوں کے مجڑے ہوئے گولے تک کو نکال کر اپنے جیوٹ کے توڑے میں ڈال لیتی، اور الٹ پٹ کرتے کوڑے کا ڈھیر بکھر کر پھیل جاتا تو وہ

توڑا کندھے پر ڈال کر چل دیتی۔ پہلی بار نزدیک آتے بھٹیوں نے اسے شدید زد و کوب کرنے اور توڑا چھیننے کی کوشش کی، سواہوں کے نیگے بے نیام واردوں سے تو وہ اندر سے لہو بہان ہوتی ہی رہی، اک لمبی چپ سا دھسے مار کھانے کے باوجود ہونٹوں پر چڑھا نقل نہ کھولا، مگر توڑے کو پوری قوت سے اپنے سینے سے چٹائے رہی۔ اور جواب ؟

تو وہ اس کے بچے اندر ہی کھولتا رہا اور یہ ہی کھولا مسلسل روا بنے اُٹتے وجودی سرنگ میں ہیرتا رہا، مگر ان کے ہاتھ اور زبان جیسے ہی تھکی۔ زمین سے اُٹھتے، اپنے آپ کو سمیٹتے، چاندی کا ایک ایک روپیہ ان کی ہتھیلی پر نکالتے، توڑا سنبھالتی ہونگلو ز کی جانب نکل پڑی تو وہ شدید حیرانی سے دو چار، کبھی اپنی ہتھیلی اور کبھی ہونگلو ز کی نگلی کی پڑسردہ زرد روشنی میں اسے غائب ہوتے دیکھتے رہ گئے، چاندی کا روپیہ اس زمانے میں بڑی قدر قیمت رکھتا تھا، جب ان کی آمد کا سلسلہ چل نکلا تو وہ چاروں اسے کاغذ ڈھونڈ ڈھانڈ کر توڑے میں بھر کر اس کے حوالے کرنے پر بھی تیار ہوئے، مگر وہ نکسالی مہرزدہ چپ کے آگے بے بس، وہ تو بس گورا شاہی کے چاندی کی قوت اور زور آوری تلے دبے اپنی گڑگڑی سے ہی چمٹے رہتے اور جب وہ چل جاتی تو وہ بکھری ڈھیری کو اکٹھا کرتے اپنے کام میں بخت جاتے !

اور وہ ہونگلو ز کے سندان موڑ پر گئے کھبے کے بلب کی روشنی میں ہتھیلی اک اک کاغذ کا نظریہ تراش پھیر کرتے، سارے کاغذ ریکی نالے میں پھینکتے، توڑا بنگلے کے چاروں جانب کھڑی منہدی کی گھنٹی باڑ میں چھپا کر، اسی طرح سیاہ شاہ میں منہ سر لپیٹے نکلتی، مگر کوڑے کی بدبو کو اپنے کپڑوں میں لیے ہوئے، مینو کے مکان پر سیدھی غسل خانے، بدبو کے گتے کچوکوں سے، گھٹی متلی سے نجات پانے پہنچ جاتی۔

چھاؤنی میں کوئید سینٹر کے بالکل کونے پر جو ہوٹل ہے نا اس کا سامنے رخ چھوڑ کر باقی کی تینوں دیواریں، تین اطراف نالوں سے پھونتی سیم سے بچاؤ کے لیے خیرہ سری دان پھری، درلی میں غرق، لنگ سے پ، کوڑا گھر کوئید سنٹر کی سڑک کے متوازی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا، ریلوے کی کوٹھیوں کے روپر سڑک پار پندرہ فٹ اونچی دیواروں پر بجلی سے کھینچے بند ہوتے پیٹ میں لگے دولہے کے دو دروازے، ان کے نیچے وہ کوڑا لے جانے والے بڑے بڑے ٹرکوں کا گیراج۔ کوڑا گھر گزروں کی بھری بھر کم چھت پر دھڑا، اور اس پار رنگ گیراج میں دونوں گاڑیوں کو کھڑا کرنے کے بعد بھی بیچ میں اتنی جگہ رہ جاتی کہ اس میں آگے پیچھے دو چار پائیاں ضرور بچھ جاتیں، جس پر دونوں کوڑے کے ڈسپوزل والے ڈرائیور دن بھر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے بھٹی کی دیسی شراب کے لیے لمبے لمبے گھونٹ بھرتے مشکیزہ خالی کرتے ہی مدہوش چارپائیوں پر گر جاتے اور منہ اندھیرے ہی کوڑا گھر کوٹروں میں خالی کرتے، ڈسپوزل کی جانب نکل کھڑے ہوتے اور پیچھے آٹھ بجے جمعہ ر کے آنے سے پہلے ہی چاندنی کا روپیہ لینے والے چاروں بھنگی پہلے پورا کوڑا گھر دھوتے، بچا کھچا بھوسہ منڈی کی جانب جاتے نالے میں سب کچھ بہا دیتے اور پھر ہوٹل کے سامنے والی زمین بالکل صاف آئینے کی طرح چمکا دیتے۔

ڈسپوزل سٹیشن سواہن اور شہر اور کیٹ سے آنے والے نالے کے ملاپ سے کوئی دو میل نیچے بنایا گیا تھا اور وہاں ہی اس ڈسپوزل سٹیشن سے کافی اوپر اسی کے کنارے پر اک بہت بڑا غارتھا کافی ندر تک گیا ہوا۔ شاید یہ کسی زمانے میں تاجید ہونے والے لہتر اڑی شیروں کا مسکن رہا ہوگا۔ اسی غار میں شراب کشید کرنے کی دو بھٹیاں لگی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی کھانے کا اک ڈھا ب بھی بنا ہوا تھا، جس کا کھانا نہایت ہی لذیذ، وقت بے وقت وہاں آورگی میں رہے سوگوں کا ہجوم گارہتا تھا، تینوں وقت کی روٹی اور شراب کا بھرا گلاس ایک آنے میں۔ وہاں ہی سے وہ ایک چوٹی کی دو پاڑھائی بوتلیں، کھال

کے چھوٹے سے مشینزے میں بھرا لیتے اور پھر سورج کی ڈھلوان سے اترتی سُرخ شام رنگ میں اپنے آپ کو پھوڑتی نچوڑتی، سیاہی میں وٹ پوٹ، رات کی چوکھٹ پر دستک دیتی تو وہ چاروں خاکروب جو دن بھر پیلچوں سے کوزے کے ڈھیروں کو پانی میں بہاتے رہتے، کوزے کو کافی نیچے تک کہیں بھی نہ دیتے، کوزا ٹرکوں کے دونوں کلیئروں کو پہر تک بمشکل ایک ٹرک کو صابن سوڈا لگا کر صاف کرنے کے بعد نہا دھو کر دھبے ہوئے نیپے اور ہال تبدیل کرتے اور بھٹی کے ڈھارے پر پہنچ جاتے جہاں کوزے کو بہاتے چاروں بھنگی اپنے آپ کو دھوتے، منجھتے دن بھر کی مشقت کو کو بھگاتے، دھلے ہوئے اور ہال کو پسینے اور گزشتہ روز کے بدبو سے بھرے ہتھ اور ہال دو ڈرائیوروں کے، دو کلیئروں کے اور چاراپے خاک روہوں کے۔ سارے اور ہال بھٹی کی صفائی اور برتن، منجھنے والی عورتوں کے حوالے کرتے، اُن کے پہاڑی پتھروں کی طرح مضبوط ہاتھ پر دو ایک دل بھاتے فقرے کہتے ہوئے سرکار سے منے والے وردی دھلائی والاؤنس میں سے دونکیاں دیکھی صابن اور دھونے کی اجرت؟ ایک دقنی، یعنی ایک بڑا تانبے کا گور بادشاہ کی شبہ سنگ ڈھلا، اُن کے ہاتھ پر بیٹنگی رکھ دیتے شام کو سوکھے ہوئے اور بالوں کے ساتھ اضافی ایک رونی اور، دونوں دیہاتوں کی جمع پونجی کے خزانے میں ایک انکی کے اضافے سے موج لگ جاتی۔

رات کو کوزا گھر میں پہنچ کر گھر سے آئے کھانا کھا کر ٹخوں جب نہل لگاتے، مال روڈ کو چھو کر لوٹتے تو وہ توڑا بھر کر بیجانے والی سیاہ چادر میں لپی عورت کو دیکھتے، تو اُن کے اندر کھلبلی سی مچ جاتی بے ساختہ چاروں بھنگی اُن ہی قدموں پر رُک جاتے، تو ڈرائیور اور کلیئرز بھی ہراساں رُک جاتے، بھوتی ہے، پیروں کو دیکھوا لے ہیں۔ اگر یہ دیکھ لیتی تو ہم سب کا کلیجہ چبایا جاتا۔ کافی دیر کے رہنے کے بعد وہ لوٹتے تو کوزا گھر پر موجود چاروں بھنگی کوزا گھر میں ہسپتال کا آدھا ٹرک پھینک چکے ہوتے۔ چاروں ڈسپوزل والے بھنگی سوال کرتے کہ تم نے کسی کو سیاہ چادر میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے دیکھا اور وہ چاروں منکر ایک دوسرے کی آنکھوں میں اترتے پوچھتے، وہ کون تھی؟ مگر مسلسل انکار سے وہ اپنا دھمکتے، بھٹی دلوں کو گالیں دسیٹے اپنے ٹھیوں پر بیٹھ جاتے اور ڈرائیور بھی اپنی چار پائیوں پر بیٹھتے بڑا تانتے، سیاہ چادر بھٹی والے جانے کیا مل کر شراب بناتے ہیں، چلتے پھرتے سائے بھوت بن جاتے ہیں اور اپنی اپنی شراب اندر اندر دھلتے دونوں ڈرائیور، دونوں کلیئرز اور چاروں بھنگی مدہوش خواب خرگوش میں غرق، لیکن صبح تڑکے پانچ بجے تازہ دم اٹھ کھڑے ہوتے اور رات کے نظر آنے والے بیولے کی جگہ پر نظر مارتے، اپنی بزدلی پر نفرت کرتے، ڈسپوزل جانے کے لیے چل پڑتے۔

یہ بھوت والی بات نہ جانے کیسے ہسپتال کے کورڈوں میں پھیل گئی۔

وہ ہسپتال سے کوزا لانے اور خالی گاڑی واپس لے جانے اور تھانے کے پچھواڑے بھور منڈی کے نالے کے روپر و سڑک کے ساتھ چکی قد آدم سے اونچی یوار میں کوارڈروں کو جاتے راستے سے پامپ لے کر کوارڈر میں آتے پانی سے دھو کر گاڑی سکھا کر ہسپتال کے مین گیٹ سے اندر گیراج میں لے جاتا۔ اتوار کے عد وہ چھ دن بلاناغہ بارہ بجے سویا ہوا اٹھتا تو نہانے دھونے کے بعد بیوی جو ہسپتال میں مڈوائف تھی، وہ ڈیوٹی پر جاتے ہوئے اس کے کھانے کو ڈھانپ کر چھوڑ جاتی۔ وہ دو پہر دو بجے سے رات دو بجے تک کا ملازم، ہسپتال کے سارے وارڈوں میں فینا کیل کا پچا را لگاتا اور تھکاوٹ سے چور چور، کوارڈروں کے ساتھ لگے سب بھنگیوں کے کوزے بھرے ڈرموں کو دیکھتے، گنت ہوا گھر کھانے کے لیے پہنچتا، بیوی سے گپ شپ کرتے، کھانا کھا تا رہتا۔ مگر چھ دن بھوت والی ڈراتی خوف پھیلتی کھانا دوائف کو بھی دہلا گئی اور فکر مندی سے اُس نے شوہر سے کچھ پر حید کی تو چھ دن ضبط کرتے پیٹ میں ابھرتا پچا را پھینکنے کی سرحدوں کو چھو رہا تھا اور اب وہ کسی لمحہ

بھی پھٹ سکتا تھا کہ بیوی نے کرید لی۔ پڑچھتی سے بیوی کا پرانا پرس اتار اور چھ روپے چاندی کے نکالے اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ بیوی نے سواوید نظروں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا۔

بی بی! جینرز نے احسان کا بدلہ اُسی کے ہاتھوں ہم تک پہنچا دیا۔ پہلے روز تو راتے پیٹے میں نے اسے پیچا نا نہیں، کیونکہ اس کا علیہ ہی خراب ہو چکا تھا۔ مگر جب سکے ہتھیلی پر آیا تو حیرت اُمنڈ پڑی اور سوچ میں پڑ گیا کہ یہ چہرہ کہاں دیکھا ہے اور پھر ذہن سے نکالتے، سوچتے کھرچنے کی پوری کوشش کی۔ کہ آیا ہوگا کوئی جنرل وارڈ میں اپنے کسی مریض کو دیکھنے۔ مگر وہ بچے روز جب وہ روپیہ ہتھیلی پر رکھ کر پلٹنے لگی تو یک دم اک جھمکا سا ہوا جو سب کچھ عیاں کر گیا۔

گیارہ بھاری بھر کم، کرخت زشت چہرے داخل کے ساتھ چادر سے سر اور گردن لپیٹے وہ چادر تانے سوئے ہوئے مریض کے پاس روکی گئی اور ہسپتال کا اک پرانا سائنڈ دکھاتے اُسے ڈسچارج سرٹیفکیٹ کا نام دیا اور کل لے جانے کی تاریخ بتائی گئی۔

اور اُس کے ساتھی کی آزادی کا مژدہ سناتے سکھر روڑی جانے کا دروازہ کھول ڈالا، کاغذ پکڑ کر چہرے پر رونق چھائی تو اُن کے کرخت چہروں کو دیکھتے کاغذ پر آنکھیں نکائے رہی اور وہ اُسے بازو میں کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ اُس سے اگلے روز وہ بستر خالی تھا۔ وہ تجسس کا ڈسار۔ سیشن سے پوچھ کچھ کرنے پر اسے پتہ چلا کہ وہ بید تو پچھلے دس روز سے خالی ہے، تو پھر وہ مریض۔۔۔؟

چاب بازی کے شکوک سے ہاتھ ٹھنکا ضرور مگر مدعی کے نہ ہونے کے سبب بات آئی گئی ہوگئی! مگر پھر بات چال گئی جھنجھوڑتی، کہاں سے کہاں نکل کر کوڑا گھر سے ہی چپک کر رہ گئی۔ رات کو وہ کوڑے کے ڈرموں سے کوڑا گاڑی میں ڈال ہی رہا تھا کو اچانک باہر کے رات میں ک گرج کے ساتھ ہی ننگی گایوں کی بوچھڑ میں، اُس کے چہرے پر چار پانچ تھپڑ برس گئے اور کاغذ کا ایک گولہ بناتے کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا۔

تجھے شرافت سے ہوکل چلنے کو کہہ رہے ہیں اور تو۔۔۔؟
نخرے کرتی ہے۔

ساتھ والے سو رماؤں میں سے ایک بول۔ سائیں آپ چھوڑو! اسے ہمارے ساتھ آ جائے گی۔

منہ نہیں تم نے، کہتی ہے کہ اگلے دن تک تو یہیں انتظار میں بیٹھی رہے گی۔

اور وہ یک دم جو اپنا غراتے ہوئے اُس پر پل پڑی۔

ہاں میں یہاں ہی رہوں گی۔

چھ سال تو نے مجھے لٹنے کے لیے اُسے اپنی جیل میں رکھا اور۔۔۔!

اور وہ بناوی گئی زبردستی رخصت خواب، اُس کی ساری اُمنگ ترنگ میں، لیدہ جذبات خاک کا ڈھیر

چھ سال کے بعد تو پھونکا کہ وہ پنڈی کے سرکاری ہسپتال میں ہے، وہاں اچھا علاج ہوتا ہے مگر تو مجھے یہاں اس لیے لایا ہے کہ ہم دونوں پر ٹوٹے مظالم کا نشان منادے اور یہاں تو مجھے اس لیے بھی لایا ہے کہ مجھے یہاں بیچ ڈالے، تو بیچ ڈال اور ختم کر اپنے جوہر کو اور جس کوڑے کے ڈرم میں وہ ڈسپ رچ سب کا بھینکا ہے وہ میری نظر میں ہے، میں ڈرم سے ڈھونڈوں گی اور نہیں ملا تو کوڑا گھر کو بھی دیکھوں گی اور روز دیکھوں گی۔ کبھی تو وہ ڈسپ رچ سلپ مل ہی جائے گی۔

اس کے بعد پتہ ہی نہ چلا کہ وہ گئے تو کہاں گئے؟ مگر چھ دن پہلے وہ کوڑا گھر آ پہنچی اور پھر ہر رات میری کوڑا

گاڑی کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ کاغذوں کو پھر دلتی توڑے میں ڈال کر لے جاتی ہے۔ آگے کا تو مجھے لکھ نہیں پتا، مگر میری ہتھیلی پر رکھے چاندی کے روپے کی بدولت میری ہتھیلی تک اُس کی سلامتی کی اُغائیں مانگتی ہے۔

محلے کے باہر روز اونچے بلے پر بنے چھوٹے سے کرشن مندر میں آرتی اُتارتے گیتا کا ایک ادھیائے ضرور پڑھتی، آرتی ختم ہونے پر پاٹ شالہ میں وہ بچوں کو گیتا ہی پڑھاتی تھی۔ بس یہ آرتی اتارنا اور بچوں کو پڑھانا ہی اُس کے لیے عذاب کا درکھول گیا۔ شوہر اُس کا غریب سا آہن گر تھا، مگر کاری گریسا بے مثال کے بوبائس کے ہاتھ میں آتے ہی پانی ہو جاتا، روڑی سکھر برج کی مینٹیننس کے سبب وہ کام کی تکمیل ہونے تک وہیں ایک چھوٹے سے گھر میں معصوم کرایے پر رہنے لگے تھے، کہ ایک روز آرتی کے بعد بچوں کو پاٹ شالہ میں پڑھانے لگی تو اُس کی سریلی آواز ہی کی لگام کو تھمے گھڑ سوار کی اپنے گھوڑے کی لگام ہاتھ سے نکل گئی اور وہ مندر کی سڑھیاں چڑھ کر دور سے ہی ٹکٹکی باندھے اُسے نکلتا رہا اور اگلے روز اُس کے زور آوروں نے دروازہ دھکیل کر کھولا اور نیم چند کی مشکیں باندھ کر لے گئے اور وہ اُس کی عالی شان حویلی میں ہر رات بچھتی رہی مگر گانے کے لیے مکمل انکاری اور نیم چند کے احواس سے تو شاید اُس کا نرلی منو ہر بھی بے خبر تھا، کام کرنے والی نے ایک روز جاگیردار کی ذاتی جیل میں اسے دیکھ لیا، بس اُسی سے اس کے جھوٹ سچ کی کٹھا کھل گئی، کہ وہ اُسے اُس کے ہاتھوں بچ کر چلا گیا ہے۔ چھ ماہ بعد شاید اُس کے نثرین کرتے جملوں اور گیتا نہ سننے سے اُس کا دل بھر گیا اور پنڈی ہسپتال میں نیم چند کے مریض ہونے کی خبر سنی، مگر ساتھ ہی اک سرگوشی اُس کے بکنے کی بھی کانوں میں اتر آئی اور پھر ڈسپانچر سب اُس کے رو برو، مگر وہ تو جھوٹوں کے پڑ میں رکیدی جا رہی تھی اُس کی تو ہندی میں اتنی ہی تعظیم تھی ورا ب وہ ڈسپانچر سب جو تھی بھی کہ نہیں، انگریزی میں تھی اُسے کیسے پڑھ پاتی

بس اُن الفاظ کی شکلوں کو آنکھوں میں سجاتے، آشنائی کی راہ تلاش کرنے کی سعی میں اپنے ہی تک پہنچنا چاہتی تھی کہ وہ کاغذ اُس کے ہاتھوں سے چھن گیا، اور بیشتر وہ کچھ سوال اٹھاتی، اُس نے چھین کر گورہ بنایا اور کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا۔

اور یہ سن ۱۹۱۵ء کی کرمس کا واقعہ ہے کہ جب پریم گلی کا چکلا ؟

وہ پریم گلی میں اپنے وجود کی جلتی آگ سے بنے پھپھولے پھوڑتی رہی۔

اور سی درد میں سمیٹی آواز پر سننے والے بہن برساتے رہے، درمینو کی تجوری بھرتی رہی کہ اچانک ہی اُس کرمس کے پہلے روز ہی میں ٹامیوں کی ہڑبونگ میں دروازہ بند کرتے کسی ایک نامی کا اتھاتی گھونسا ایسا گردوں پر لگا کہ اُس نے اک لمبی چیخ ماری اور فرش پر آگری اور منہ سے اُبلتا گیتا کا دھیائے ساتھ ہی دم توڑ گیا۔ مینو اور ساتھ والی لڑکیاں داویلا مگرتی، بے اختیار لگتی، اُس کی لاش پر جاگریں۔

چکلا تو ٹامیوں کے اُدھم کے سبب سن پندرہ میں ہی کمانڈنٹ کے حکم سے بند ہو گیا، چکلی کے اُچار ہوتے ہی مینو کی لڑکیاں بھی نہ جانے کہاں کہاں چلی گئیں۔

مگر مینو ؟

اپنے صحن کے آئین میں حسو کی بنی قبر کی مجاور بن کر رہ گئی۔ آخر پیدر پنجوڑتی بیٹی روز روز نہیں پیدا ہوتی اور اُس کی آواز کی چاہ میں پٹے لوگوں نے اس ندوہنا کی سے اپنے بکھرے حواس پر قابو تو پایا مگر ٹامیوں سے انتقامی سید زوری کا مقابلہ شروع !

جب تک نہوں نے یک نامی کو مار نہیں گرایا چین سے نہ بیٹھے اور حسو کی موت کے پانچویں دن ہی کرکس کا رنگ چڑھ ہوا تھا۔ رات گرتی باز میں حسو کی بھکاری کے یک عاشق دکا ندر سے گرز نکال کر ہنگامہ کرتے ٹامیوں میں سے، بہت زیادہ، چھل کود کرتے تباہی اور لوٹ مچاتے نامی کو بنوت کا ایسا ہاتھ مارا کہ اُس کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو گیا اور باقی نامی شورغل مچاتے تتر بتر ہوتے بھاگ نکلے۔ گورے کی لاش رات گئے تک وہاں پڑی رہی اور آخر کار اُسی دکا ندر نے لاش تانگے میں ر دی اور پونٹ میں لے گیا اور کمانڈنگ آفیسر نے اسے سو روپے انعام دیا کہ کتوں کے دانتوں سے برطانوی گورے کی لاش کو وہ بچا لایا۔ اور.....؟
اور تاج برطانیہ کی راج رہ گئی !

☆ ☆ ☆

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے ویس ایپ گروپ کو جوائن کریں

یڈمن پینسل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حنین سیالوی : 03056406067

کٹے سر کی حکایت

نجم الحسن رضوی

مردہ خانے کے باہر ان لوگوں کا جھوم تھا جو میتیں اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے مگر وہ پوری میت نہیں ایک آدمی کا کٹا ہوا سر مینے آیا تھا، پولیس کے ساتھ یہ کٹ ہوا سر کل کے دھماکے کے بعد اس کے فیٹ کی بالکونی میں آگرا تھا۔ وہ اسے مردہ خانے دلوں کے سپرد کر گیا تھا تا کہ اسے لاوارث رشتوں کے کھاتے میں دفن کر دیا جائے مگر اب پولیس کو اس کی ضرورت پڑ گئی تھی تفتیش کرنے کے لیے۔ ان کا خیال تھا کہ سر خود کش کا بھی ہو سکتا ہے۔

تھانے دار نے مردہ خانے کے منشی سے پوچھا۔ ”کدھر ہے سر؟“

”سر؟“ منشی نے رجسٹر سامنے سے ہٹا کے عینک کے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں چمکائیں۔

موبھٹی پھر وہی سوالوں کا سلسلہ اس نے سوچا۔ یہ سوار ت ختم ہی ہونے پر نہیں آرہے تھے۔ یہ قصہ کل

شروع ہوا تھا۔

وہ پتلون پہن کے بستر کے ایک سرے پر بیٹھا جوتوں کے تسمے باندھ رہا تھا کہ اسے لگا جیسے بڑی دل دہلانے والی زوردار آواز کے ساتھ کہیں سامنے بجلی گری ہے، پھر نیچے سے گردوغبار کے باول گرج کے اوپر اٹھے، وور بار کی بو میں ڈوبی ہوئی راگبیروں کی چیخیں ہر طرف پھیل گئیں۔ کمرے کی سب کھڑکیاں اچانک کھل گئیں اور شیشے کی کرچیوں ٹڈیوں کی شکل میں اڑتی نظر آئیں۔ بہت دیر تک اس کے کانوں میں سیسہ بھرا ہوا سڑک پر بم پھٹا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کے بالکونی تک گیا جہاں سے سڑک صاف نظر آتی تھی۔ جو کچھ اس نے دیکھا اس سے اس پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ کھڑے کھڑے کانپنے لگا۔ نیچے صرف تباہی تھی۔ جھتی گاڑیاں، دھواں و ر خون آلود چہرے سڑک پر انسانی اعضا، بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے کتنا وقت گزر گیا۔ وہ کمرے میں جا کے کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور دل کے قابو میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ نیچے سے پولیس کی گاڑیوں اور ایسبیلینوں کے سائرنوں کی آوازیں آتی رہیں۔

کچھ دیر بعد پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور بالکونی میں گیا۔ پولیس نے دھماکے کی جگہ کے آس پاس رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں اور امدادی کارروائیاں جاری تھیں۔ وہ کمرے میں جانے کے لیے پلٹا اور اسی وقت اس کی نظر اس عجیب سی شے پر پڑی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر جب اس نے قریب جا کے اسے غور سے دیکھا تو پتہ چل کہ وہ کسی آدمی کا سر تھا جو دھماکے کے وقت تن سے پگھڑ کے، اس کی بالکونی میں آگرا تھا۔ وہ ڈر کے پیچھے ہٹا پھر دو بار اس کے پاس گیا۔ چہرہ تو آدھا باقی رہ گیا تھا مگر خون آلود پیشانی پر جھکے ہوئے ہاتھوں میں سے امدھ کھلی دونوں آنکھیں خلاء میں گھور رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پہلے اس نے سوچا کہ سڑک پر گاڑیوں کا ملبہ اٹھانے والے امدادی رضا کاروں میں سے کسی کو مدد کے لیے پکارے مگر وہ سب اتنے مصروف تھے اور نیچے شور و تازا زیادہ تھا کہ اس کی آواز وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ ایک بار اس نے ہاتھ کے اشارے سے کسی امدادی ادارے کے کارکن کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تو اس نے جوابی اشارہ کیا کہ وہ میزچیوں سے نیچے اتر آئے کیونکہ عمارت کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا تھا اور میزچیاں مدد مت تھیں۔

اس نے کسی کو مدد کے لیے بلانے کا ارادہ ترک کر کے خود ہی اس صورت حال سے نمٹنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے ایک بار پھر کٹے ہوئے سر کو دیکھا۔ کئی ہوئی سرد سے خون رس رہا تھا اور جہاں سر پڑا تھا وہاں خون کی ٹیکریں کھڑی کالال جالائیں رہی تھیں۔

پھر وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ تقریباً دوڑتا ہوا میزروں سے نیچے اتر اور لپک کے ایک پولیس مار جنٹ کو جو اپنی موٹر سائیکل کو ایڑ لگا کے کہیں جانے کی جلدی میں تھا، پکارا ”سرا، ادھر میرے فلیٹ میں!“ پولیس والے نے اسے ایک نظر دیکھا ”اچھا تمہارے سر میں بھی کچھ ہوا ہے، چلو ہسپتال جاؤ!“ اس نے قریب کھڑی ایسبومینس کے رضا کاروں کو آواز دی ”سنو! اس آدمی کو!“ مگر اس سے پہلے کہ کوئی اس کی طرف بڑھتا اس نے کسی سے مدد لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور دوبارہ اپنے فلیٹ کی طرف اپکا۔

اس نے اسٹور روم میں سے پرانے اخباروں کے ڈھیر پر سے ایک اخبار اٹھایا اور اسے بائوٹی میں پھیلا کے اس میں کٹے ہوئے سر کو پیشنا چاہا مگر جیسے ہی اس نے چھڑی کی مدد سے سر کو چھوا اسے لگا جیسے کوئی ہولے سے کراہا سو پھر سر خود بخود سیدھا ہو گیا۔ بالوں کی لٹیں سمٹ گئیں، پیشانی صاف ہو گئی اور دونوں آنکھیں بھی پوری طرح کھل گئیں جو اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ لمبے بھر کو ٹھٹکا مگر پھر چھڑی کی مدد سے سر کو اخبار میں پینے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ کٹے ہوئے سر کو سبزی لانے والی پلاسٹک کی ٹوکری میں ڈال کے نیچے لے جائے مگر پھر خود ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ کھٹی ٹوکری میں کسی آدمی کا سر بے جانتا بڑی غیر اخلاقی حرکت ہوگی۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اس کی بیوی میکے جاتے وقت اپنا چوکور سنگھار دان گھر پر ہی چھوڑ گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کے سب خانے نکال دیے جائیں تو اس میں کٹے ہوئے سر کی گنجائش کھل سکتی تھی مگر پھر یہ سوچ کے اپنے فیصلہ بدل دیا کہ سنگھار دان میں تو آدمی کا سر بڑا ہی بے ٹکا لگے گا۔ وہ دوبارہ اسٹور میں گیا کہ وہاں کوئی پلاسٹک کا تھیلا یا شاپر ہی ڈھونڈ سکے۔ اچانک اس کی نظر اس چھوٹے سے دستی بیگ پر پڑی جس میں وہ جنازہ لیم جاتے وقت اپنے تو بے در جوتے وغیرہ ساتھ لے جاتا تھا۔ دستی بیگ جینز میں استعمال ہونے والے نیلے مضبوط پٹے سے بنا تھا اور تھوڑی سی مناسب سائز کا۔ کتنا ہوا اس میں بٹائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ اسے اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے نیچے تر تو ہالک یوں لگ رہا تھا جیسے وہ استعمال کا کوئی سامان اٹھائے اپنے کام پر جا رہا ہے۔

اتنی دیر میں سڑک تقریباً صاف ہو چکی تھی اور ٹریفک پولیس والے، امدادی داروں کے کارکن، ٹی وی چینلوں کی نشریاتی طشتریوں سے لدی گاڑیاں اور سب ایسبومینس اپنے کام سے فراغت پا کے جا چکی تھیں البتہ دھماکے میں تباہ ہونے والی گاڑیوں کا مہا اپنی جگہ پر موجود تھا اور تفتیشی ٹیم کے ارکان اسے ابھی تک کرید رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے ایک افسر کو مخاطب کیا ”کچھ پتہ چلا، یہ خودکش حملہ تھا نا؟“

تفتیشی افسر نے مڑ کے بیڑاری سے اس کی طرف دیکھا ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، تنے لوگ تو اپنی جان سے گئے!“

”کتنے لوگ؟“ اس نے سوال کیا۔

”بہت سے“ تفتیشی افسر بولا ”اور ابھی تو اور مر رہے، ہسپتال والوں سے پتہ کرو“ پھر وہ طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلا کے کہنے لگا۔ ”تم اخبار والے ہونا تمہیں تو پھر زیادہ سے زیادہ متنبہ چاہئیں تم اخبار والوں کا

تو خبر سے پیٹ ہی نہیں بھرتا، مگر فسوس میں تمہیں مرنے والوں کا کوئی فائل اسکو نہیں بتا سکتا تمہیں اس کے لیے اپنا سونے کا جہان ہوگا!“

وہ چپ کھڑا رہا تو تفتیشی افسر سمجھا اسے شاید اس کی بات بری لگی ہے اس لیے وہ اسے تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ”فکر مت کرو، تمہیں بڑی خبر ملے گی اپنے اخبار کے لیے، لوگ کب مرنے سے تھکتے ہیں؟“

اس نے پھر بھی کچھ نہیں کہا اور تفتیشی افسر کو بلے کو الٹتے پلٹتے دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے پوچھا۔ ”اگر یہ خودکش عملہ تھا تو اس کے بدن کے اعضاء بھی تو ملے ہوں گے؟“

”سب مل گئے ہیں“ تفتیشی افسر نے سرو لہجے میں جواب دیا۔

”اس کا سرہ؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل ملا ہے!“ افسر نے جواب اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا، بیزاری سے کہا۔ ”پوری فہرست متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کے پاس ہے۔“

”اچھا“ اس نے کہا۔ ”اس تھیلے میں۔۔۔!“ مگر اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتا، تفتیشی افسر اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے بول ”یار اب مجھے کام کرنے دو تمہیں جو کچھ بتانا ہے وہ جا کے میں ایچ او کو بتاؤ۔“

عدالتی کا تھانا اتنا دور نہیں تھا کہ وہ پیدل نہ جا سکتا مگر اس وقت اس نے دستی بیگ کو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور بس میں سوار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ تھانے دار سے اخباری نمائندہ بن کے ہی بات کرے گا تا کہ وہ تنجیدگی سے اس کی بات سنے۔

تھانے دار میز پر بیٹھا اپنی مکر وہ مونچھوں سے کھیل رہا تھا۔ اسے دیکھ کے اس نے پہلے اپنی مونچھوں کو مردوز پھر میز پر دھکا مار کے بولا۔ ”جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیں مجھے باہر جانا ہے!“

”میں روزنامہ انکشاف کا نمائندہ ہوں جناب!“ اس نے کہا۔ ”آپ بتا سکتے ہیں کہ آج ہونے والے دھماکے میں کتنے خودکش شامل تھے؟“

”خودکش، یہ کون کہتا ہے!“ تھانے دار نے میز پر گھونسا مار کے کہا۔ دھماکہ تو کاربم سے ہوا ہے۔“

”یعنی وہاں کوئی خودکش موجود نہیں تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”کوئی بھی نہیں؟“ تھانے دار نے مونچھیں مردوزیں۔

”مگر وہ تفتیشی افسر تو کہہ رہا تھا کہ یہ خودکش تھا اور اس کے بدن کے سب اعضاء بھی مل گئے ہیں!“

”تو وہ اس کے پاس ہونگے!“ تھانے دار نے اسے شعلہ باز نگاہوں سے گھورا۔ ”اسی سے نہیں براہ بھی کراؤ۔“

”مگر سرجی“ اس نے کہا۔ ”میرا ایک دوست کہتا ہے کہ اسے بھی ایک آدمی کا سر ملا ہے؟“

”کیا؟“ تھانے دار دھڑکا۔ ”یار یہ خودکش بھی عجیب آدمی ہے، کتنے سرتھے اس کے۔ کنبخت آدمی تھا کہ پورا

راون؟ اپنے دوست سے کہو پوپیس سے خواجہ محول بازی نہ کرے ورنہ خودکش کے سر کے ساتھ ساتھ اس کے دھڑ کا بھی

اسے حساب دینا پڑے گا۔ ویسے تم اپنا پتہ یہاں چھوڑ جاؤ، کیا پتہ ضرورت پڑے۔“

”جی اچھا“ اس نے اپنا کارڈ تھانے دار کی میز پر چھوڑ دیا اور دستی بیگ سمیت باہر نکل آیا۔

اور اب تھانے دار اس کے ساتھ آیا تھا اس کٹے ہوئے سر کو مردہ خانے سے واپس لینے اسے تو شاید یہ اندازہ بھی

نہیں ہوگا کہ اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے اسے کتنے پاڑ بیٹھنا پڑے تھے۔

تھانے سے نکل کے وہ کچھ دیر فٹ پاتھ پر ناک کی سیدھ میں چلتا رہا کہ شاید پیدل چلتے ہوئے کوئی کام کی ترکیب اس کی کھوپڑی میں اتر آئے مگر دماغ نے تو جیسے کام ہی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک پارک کے پاس جا پہنچا۔ اس سے سوچا کچھ دیروہاں بیٹھ کے دستی بیگ میں موجود کسی نامعلوم آدمی کے اس کئے ہوئے سر سے چھٹکارا پانے کا منصوبہ بنائے جو اس سے چپک کے رہ گیا تھا۔ پارک کے پاس سڑک کے کنارے گھاس کے قطعہ پر بیچ خالی تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور دستی بیگ اس نے اپنے قدموں کے پاس گھاس پر رکھ دیا تاکہ نظروں میں رہے۔ چانک اسے بھوک کا احساس ہوا۔ وہ صبح بدحواسی کے عالم میں بغیر کچھ کھائے پیے گھر سے نکل پڑا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو پارک کے ایک کونے میں اسے بھٹے وار آنکلیٹھی پر بھٹے بھونٹے نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ بھوک بہلانے کے لیے فی الحال یہی ٹھیک رہے گا۔ وہ بیگ کو گھاس پر چھوڑ کے بھٹے وارے کی طرف بڑھا۔ وہ بھٹے وارے سے بھٹا لیکر پلٹا ہی تھا کہ چانک اس نے دیکھا کہ ایک آوارہ شخص اس کا بیگ اٹھا کے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ویری گند اس نے سوچا، یہ تو بالکل غیبی مدد ہوئی۔ وہ وہیں ٹھہر گیا اور اس نے چور کو بیگ اٹھا کے بھاگنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی مگر چور نے دوڑتے دوڑتے اچانک زپ کھولی اور یہ جاننے کے لیے کہ کوئی قیمتی چیز اس کے ہاتھ لگی ہے، ایک نظر اندر دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے زور کی چیخ نکلی اور وہ بیگ کو گھاس پر پھینک کے سڑک پر کود گیا۔

چور کو سر پر پاؤں رکھ کے بھاگتے دیکھ کر اسے بہت ہنسی آئی۔ ”بزدل آدمی!“ وہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کے بیگ اٹھایا۔ ادھ کھلی زپ کے اندر سے کتا ہوا صرف نظر آ رہا تھا بلکہ اب اس کی آنکھوں میں ایک غصیلی تحریر بھی پڑھیں جاسکتی تھی وہ پھر بیچ پر بیٹھ گیا اور بھٹے کے دانے چباتے ہوئے اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچنے لگا کہ آخرا ب اسے کیا کرنا چاہیے۔ تفتیشی افسر کے مطابق مرنے والوں کی گفتی پوری ہے اور تھانے دار کو بغیر تن کے سر قبول نہیں پھر اس سر کا کیا بنے گا۔ عجیب ٹیڑھا سول تھا۔ اچانک اسے اپنا وہ دوست یاد آیا جو سارے ٹیڑھے سواؤں کے جواب جانتا تھا۔ اس نے موبائل فون پر اسے پکارا۔ ”یار فوری طور پر تمہاری مدد چاہیے، ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں۔“

”کیسی مشکل ہے؟“ دوست نے پوچھا۔

”یار اس سر کا کیا کروں؟“

”اے سر کا؟“

”نہیں کسی دوسرے کا سر ہے مگر میرے سر پر گیا ہے، ملو تو بتاؤں!“

”اچھا تو اڑے پر آ جاؤ!“ دوست نے کہا، ”میں وہیں ملوں گا۔“

ان کا اڈہ ایک قریبی ریسٹوران تھا جہاں وہ دونوں پریشانی کی حالت میں جا بیٹھتے تھے۔ دوست نے آتے ہی پوچھا۔ ”وہ سردالی کیا بات تھی سر؟“

اس نے دستی بیگ کھولا۔ ”یہاں ہے وہ بات۔“ یعنی بن بلایا مہمان!“ اس نے دوست کو کئے ہوئے سر کے اچانک اس کے گھر میں ازل ہونے کی سب تفصیل بتائی۔

”عجیب گھامڑ دی ہو!“ دوست نے کہا۔ ”اسے ساتھ لیے پھر رہے ہو، وہیں سے اٹھا کے سڑک پر پھینک دیتے۔“

”کیا؟“ یار مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ میرے ساتھ رہنے آیا ہے۔ میں نے تو بڑی کوشش کی کہ تھانے والوں کو

پوری بات بتاؤں مگر اب کیا کروں اس کا کیا اسپتال میں پہنچا دوں؟“
دوست ہنس۔ ”اسے اسپتال سے جاؤ گے؟ کیا فائدہ، وہاں زندہ لوگ جاتے ہیں تو تھوڑی دیر بعد مردہ خانے
سے برآمد ہوتے ہیں!“

”تو اخبار میں اشتہار دے دیتے ہیں!“ اس نے کہا۔
”یعنی جس کا سر ہے وہ اسے آکے لے جائے، چریا ہوئے ہو کیا؟“
”شاید کوئی آ ہی جائے شناخت کرنے؟“
”اور مینا اگر سچ مچ میں سر کنہ رات میں آ گیا اپنا سراپس لینے تو۔“
”تو کیا کروں میں؟“ اس نے جھجھکا کے پوچھا۔
”ایسا کرو کہ اسے لے کر کسی، کسی بس میں چڑھو جس میں آدمی پر آدمی سوار ہوں اور پھر اسے وہیں کسی سینٹ
کے نیچے چھوڑ کے نیچے اترنا۔ قصہ ختم۔“
”نہیں یار بہت مشکل کام ہے آج کل لوگ چاروں طرف نظر رکھتے ہیں، کسی نے میری یہ حرکت دیکھ
لی اگر تو پھر۔“

”اچھا تو یوں کرو اس بیگ کو کسی پکڑا کنڈی میں ڈال دو اس میں کوئی دشوری نہیں روز وہاں سے ہر طرح
کی چیزیں ملتی ہیں، گلی سڑی، لاشیں بھی۔“
”نہیں، نہیں، یہ تو ایک مرے ہوئے آدمی کی بے حرمتی ہوگی۔“ اس نے توبہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
ابھی وہ یہی بات کر رہے تھے کہ سڑک پر ایک ایسبومینس سرخ روشنیوں چمکاتی ہوئی ہنوبچو کا شور مچاتی گزری۔
اس عقبی شیشے پر خیر خواہ، کا نام سرخ حروف میں چمک رہا تھا۔
”ارے، ارے اس کا تو ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔“ دوست نے کہا۔ ”بس یہی ہے تمہارے پرائیم کال۔
ان کے پاس جاؤ فوراً اسی وقت!“

”خیر خواہ کے پاس؟“ اس نے پوچھا۔
”بالکل، یہ تمہاری مدد کریں گے، ان کا تو کام ہی یہی ہے شہر بھر سے لاوارث لاشیں جمع کرنا انہیں سب
قصہ بتاؤ ان کا مردہ خانہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔“
دوست کی بات مان کے اس نے دستی بیگ اٹھایا اور خیر خواہ کے دفتر کا رخ کیا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک شخص
نے جو دروازے کے پاس کرسی میز سجائے بیٹھا تھا، اس سے سوال کیا ”میں مردہ خانے کا نقشہ ہوں، تم شناخت کے لیے
آئے ہو کیا؟“

”شناخت؟“ وہ کچھ سمجھا نہیں۔
”مردے کی شناخت“ منشی نے کہا۔
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں کچھ ریا ہوں؟“
”مردہ؟“
”نہیں، نہیں مردہ نہیں!“

”تو کیا کوئی زندہ دی؟ تم مردہ خانے میں آئے ہو بھائی!“ منشی طنز سے مسکرایا۔ اس نے دستی بیگ آگے بڑھایا۔ ”اس میں ایک آدمی کا سر ہے!“

”صرف سر اور اس کا دھڑ کہاں ہے؟“ منشی نے اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔
 ”یہ تو مجھے نہیں معلوم اس نے کہا۔“ دھماکے کے بعد یہ سر گھر میں آگرا تھا، میں اس کا کیا کروں۔“
 ”تو پولیس کو بتایا ہوتا، میرے بھائی منشی نے کہا۔ مرنے والے کے دیگر اعضائے بھی تو ملے ہوں گے دھماکے کے بعد۔“

”میں نے بتایا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”مگر وہ، نے نہیں، بولے ان کا حساب پورا ہے، منشی دھنیں، اتنے سر، جتنے سر، اتنے پاؤں اور اتنی ٹانگیں۔“

یہ کل شام کی بات تھی اور آج پھر وہ وہیں کھڑا تھا اور، ب تھا نے دار بھی اس کے ساتھ تھا۔
 ”ہاں تو“ منشی نے تھانے دار کی طرف دیکھا، ”کیا کہہ رہے تھے آپ، کس کا سر؟“
 اس سے پہلے کہ تھانے دار کچھ کہتا وہ آگے بڑھا اور منشی کو اپنی طرف متوجہ کر کے بولا۔
 ”یاد نہیں کل شام میں آیا تھا اور اس آدمی کا کتنا ہوا سر آپ کے حوالے کر گیا تھا، چہرہ تو بگڑ گیا تھا مگر آنکھیں سلامت تھیں یہ دیکریں۔ شاید وہ پرچی بھی ہو میرے پاس جو آپ نے مجھے دی تھی!“ اس نے جیب نٹولی۔
 ”اچھا وہ!“ منشی نے کچھ سوچ کے کہا۔ ”اسے تو پہچانا ہی مشکل تھا مگر وہ لے گئے اسے!“
 ”کون لے گئے؟“ تھانے دار نے پوچھا۔

”وہی، میں نے جانے والے آپ نے دیکھا ہوگا۔ باہر کتنے لوگ جمع ہیں۔ میں نہیں ابھی نہ میں تو ہنگامہ کر دیتے ہیں، بڑی توڑ پھوڑ مچاتے ہیں۔“
 ”مگر!“ تھانے دار بولا۔ ”صرف ایک کئے ہوئے سر کو کون لے جائے گا بھد جب کہ وہ پہچانا بھی نہیں جاسکتا ہو!“

”ہاں بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ چہرہ نہیں پہچان میں آتا مگر بدن کے باقی حصے تو!“ منشی نے وضاحت کی۔
 ”لیکن اس کا دھڑ تو تھی ہی نہیں پھر وہ اسے کیسے لے گئے؟“ تھانے دار نے سوچ بھر کر پوچھا۔
 ”آپ کو پتہ نہیں کیا؟“ منشی نے کہا، ”بہت سی کئی پھٹی لاشیں بھی تو آتی ہیں روز، کسی کا سر غائب ہوتا ہے، کسی کے ہاتھ پاؤں!“

”یعنی؟“ تھانے دار حیران رہ گیا۔ اس کے لہجے میں بہت سے سوال پوشیدہ تھے۔
 ”جی“ منشی رسائییت سے بولا۔ آپ ٹھیک سمجھے پھر وہ اسے کیسے لے گئے؟“ تھانے دار نے سوچ بھر کر پوچھا۔
 اس میں ہرج ہی کیا ہے، پوری میت دفن کرنے کو ملے تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔“
 میں نے تھانے دار کی طرف دیکھا، وہ سکتے کی حالت میں تھا۔ مردہ خانے کے باہر پھرنے والوں کی میتیں ساتھ لے جانے والے بے شمار لوگ اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔

☆ .. ☆ .. ☆

انتہائی نگہداشت

پروین عاطف

میراثک یقین میں مدت جا رہا ہے۔ ڈگڈگی بجانے والا اب خود بھی تھک چکا ہے۔ میرے مٹی کے ڈھیر بدن میں اب اوپر والے کے اشاروں پہنا چنے کی سکت نہیں رہی۔ ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پھرتی سے ادھر ادھر بھاگتے سفیدونوں کے چروں پہ پھیلتی ویسی دیکھ کر مجھے اک گونہ کامرانی کا احساس ہو رہا ہے۔ آدھی صدی زندگی کا کچرا سینے پہ دھرنے کے بعد فنا کے عیش سمندر میں غرقاب ہو جانے کے بعد میں اس بے نیاز کوششکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا جس نے زندگی کے پہلے پانچ برسوں کے اندر اندر جب میں زمین آسمان، چاند تاروں، جھرنوں، آبشاروں، گیتوں، محبتوں کے طلسماتی حسن سے ابھی واقف بھی نہیں ہوا تھا ابھی مری دنیاں باپ، لالہ، آپنی نرائی سکل اور پچھواڑے والے درزی چچا سے آگے کچھ بھی نہیں تھی۔ مجھ پر فانی گرا کر مجھے منجھی سے منجھی کر دیا۔ زندگی کے تابوت میں بند کر کے حکم دیا گیا کہ حسیں تو قائم رہیں گی لیکن بدن کبھی زندہ نہ ہوگا۔

ماں کی صورت تو اب میرے ذہن میں ایک غیر مرئی محبت کے احساس سے زیادہ کچھ بھی نہیں لیکن قربت مرگ کے محبت میں بھی اس کے آنسوؤں کی جلن میں اپنے مٹی بدن پہ جوں کی توں محسوس کرتا ہوں کھڑکی کی سل پہ بیٹھا موت کا گدھ نر پرندہ مجھے جھوپ کر لے جانے کے شوق میں بار بار پر پھڑ پھڑاتا ہے لیکن ٹوٹیوں، انجشنوں، نالیوں میں جکڑے رہنے کے باوجود میں جانتا ہوں ابھی وہ گھڑی نہیں آئی جب سین پورا ہو جانے کے بعد ڈائریکٹر کٹ کی آواز لگاتا ہے۔ قہار جبار سے بھی میرے بدن کے آدھے حصے کی زندگی کشید کرتے وقت میرے فائدے کی غلطی یہی ہوئی کہ وہ میرے ذہن کی ساری بتیاں گل کرنا بھول گیا۔ اسی لیے فلم ختم ہوتے ہوتے بھی کئی گزشتہ اپی سوڈ (episode) میرے ارد گرد مسلسل چل رہے ہیں۔ میری ماں تو میرے توکھڑا بدن کو دوبارہ زندہ کرنے کی خواہش میں مجھے بارہ تیرہ برس کی عمر تک تھپتھپتے تھپتے اس قدر تھک گئی تھی کہ ایک رات میرے ساتھ سوئی سوئی وہ خود ابدی نیند سو گئی۔ ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ میں بہن کے دس برس بعد پیدا ہوا تھا۔ اُسے رب نے چاند تاروں کی کرنیں پیس پیس کر بنایا تھا میں گول منوں کہہ کر کے چلے پر ل پروہی سے ڈھا، ہوتھن متھنا تھا۔ پر بیماری سے پہلے لا۔ آپنی ہر گھڑی مجھے گیلو، ملو صدقے واریاں کرتی، اھاک پہ لٹکائے رکھتی تھی۔ لا۔ آپنی تو سنڈرید تھی ہی لیکن اس کی زندگی کا پیدائشی مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ زندگی کے کسی بھی بد صورت پہلو یا انسان کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نرم خواہ اور رحم دل ہونے کے باوجود بس بدنمائی اور بد صورتی کی قربت اُسے دے کا دورہ ڈال دیتی تھی۔ امیر کبیر گلزار بھائی چھوٹی عمر میں اس کا ہاتھ مانگنے پر مجبور بھی اس کا مس ایشیا، جیسا قد بہت اور چہرہ دیکھ کر ہی ہوئے تھے۔ ماں تو میرے فانی روہ منہ سے گرنے والی رالیں بھی اپنی ہی جہنی سے صاف کرتی تھی لیکن اس کی اچانک موت کے بعد خوشبوؤں میں بھیجی نازک اندام آپنی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مجھے اپنی محل نما کوٹھی کے ایک کمرے میں ڈال کر دو تین ملازم میری راکھی پر چھوڑ دے۔ کمرے کا ایک دروازہ بھی باہر نوکر کواٹروں میں کھلتا تھا۔ وہ میری ایک ہی آواز پر بھاگے بھاگے امداد جاتے تھے۔ میری زبان میں لکنت تو تھی لیکن دوسروں کو بات سمجھنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

آپنی اپنی دولت کے دریغ مجھے ہر طرح کی تکلیف سے بچا کر رکھنا چاہتی تھی۔ یہ ایک بات کہ زندگی کی بھگ دوڑ جنگاموں نے میرے لیے اُس کے پاس بہت کم وقت چھوڑا تھا، نہ نہ کرتے بھی پولیو کے بعد احساسِ جرم تو میرے وجود میں اُسی دن سرایت کر گیا تھا جس دن مجھے یہ علم ہوا کہ اپنے جسم کی تمام فطری رطوبتوں اور غلاظتوں کا اخراج مجھے بستر کے اندر ہی اندر کرنا ہو گا اور وہ بھی کسی دوسرے کے رحم و کرم سے شروع میں اوجیز عمر عاشق مسیح باجی سے حاصل کر دیا بھاری تنخواہ کے عوض بیڈ چین اور پیشاب کی بوتل مجھے استعمال تو کر دیا، تا تھا لیکن انہیں اوپر اوپر سے کھنگا کر غسل خانے میں اس طرح پھینکتا کہ ساری فضا متعفن ہو جاتی۔ میں تو پنی مکروہ زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ باہر سے آنے والے لوگ جب چند منٹ کمرے میں رک نہ سکتے تو مجھے اندازہ ہو جاتا کہ میرے کمرے کا، حوالہ دوسروں کے لیے قابلِ برداشت نہیں ہے۔ آپنی کی کبھی کبھی آمد سے پہلے تو سارے لالچی ملازم کمرہ ہسپتال کے دی آئی پی روم کی طرح چکا دیتے لیکن جتنے دن وہ نہ آ سکے، جی جناب جی، ہاں جناب کرنے کے علاوہ وہ مجھے پانی پلانے میں بھی گھنٹوں لگا دیتے تھے۔ ماں کی مشق جھلیاں تو جان کنی کے ان محوں میں بھی میرے دماغ میں جوں کی توں محفوظ ہیں۔ میرے منہ کے دائیں ٹیڑھے جیسے کوا اپنے ہاتھ سے کھول کر جب وہ نوالہ اُس میں رکھتی اور چباتے چباتے جب وہ میری نیم مردہ براچھوں سے باہر گرنے لگتا تو وہ آبدیدہ ہو کر اپنی جھولی آگے کر دیتی۔ اس میں گرا بیو میری جھولی میں سود فہ گرا میر بچہ۔ وہ کہتی ملازم تو بھاری تنخواہوں کے باوجود مہینے دو مہینے میں آپنی سے کہہ دیتے بھی کہ میرے بوجھل وجود کو سدا صاف ستھرا رکھا، سنہاں لینان کے بس میں نہیں تھا۔ پندرہ ہزار روپے ماہانہ کا میلزس بھی پانچ ہفتوں کے اندر اندر ہی یہ کہہ کر نوکری چھوڑ گیا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کمزور تھی، اور مجھے مدنا جانا اس کے بس میں نہ تھا۔ انجینیئرنگ ہداشت کمرے میں سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ ناک منہ پر جکڑی نایوں کی وجہ سے بولنے سے محذور ہوں۔ چاک و چوبند و جوان ڈاکٹر جب ہر طرح کی بھاگ دوڑ کے باوجود مجھے آہستہ آہستہ خا کے سمندر میں اترتے دیکھتے ہیں تو اپنے کسی سینئر کے مشورے پر کچھ مزید نیکن لوجی مجھ پر لا دیتے ہیں اور اس ناک منہ پر جڑی نایوں اور نونیوں کی وجہ سے میں نہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ میں بخ بستہ پانیوں میں ڈوب رہا ہوں اور اس ڈوبنے کا احساس پر سکون ہے مجھے اپنی زندگی کی قید با مشقت سے آزاد ہونا چاہیے لیکن میری پیاری ماں جاکی بہن؟ جن کے گلز رہ گئی اپنے بڑے بڑے پلازوں کی کنسٹرکشن چھوڑ کر ہر بری پاکستان نہیں آ سکتے اور وہ اپنے پلازوں کے جھروکوں سے برستی اشرفیوں کی بارش میں میری بہن کو بھگوتے ہیں، میری وجہ سے بچاری آپنی پاکستان سے باہر بھی زیادہ نہیں جاسکتی لیکن شدید گرمی اور موڈ شیننگ سے گھبرا کر وہ اپنی امیر کیر سہیلیوں کے ساتھ گرمیاں اپنے ہی ملک کے پہاڑی علاقوں میں گھوم گھوم کر گزارتی ہے۔ اس بار بھی جانے سے پہلے مجھ سے کہتی تھی جلد تم چاہو تو میں تمہارا مری جانے کا بندہ بست کر دوں۔ موت جو کے مددزم ہی آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتے۔ نہیں آپنی آپ جائیں گھر جیسا آرام مجھے باہر کبھی نہیں مل سکتا۔ جنرل رزارہ چلا لے گا، میں نے حسب سابق حوصلے سے کہہ دیا تھا۔

میں جانتا تھا آپنی بھی مجھے مری کا سدا صرف گونگلوں سے مٹی اتارنے کی خاطر دیتی تھیں۔ میں یہ بھی جان چکا تھا کہ اوپر والے نے میرے ساتھ بہت بڑا چھل کیا ہے۔ چرند، پھول، شجر، دریا، پہاڑ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جن کے بدن مکمل ہوں جو اپنی غلاظتیں خود سنبھال سکتے ہوں۔ عناصر کا اتھا حسن مجھے صرف ٹی وی کی اُس سکرین کے پیچھے سے جھانکتا تھا جو میرے بستر کے سامنے لٹکا دیا گیا تھا۔ میں نے تو چھک چھک کرتی دھواں اُڑاتی ریل یا ڈم کے پیچھے سے دھوئیں کی لکیریں بنتے آسمانوں میں گم ہوتے جہاز کو بھی محض ٹی وی پر نکلنے والی فلم کے ذریعے ہی دیکھا تھا۔ ان میں بیٹھ کر

سفر کیسے کرتے ہیں۔ یہ تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

سہارا آپی کو گلزار بھائی نے دہلی میں اپنے کسی شہ چنگ مال کے افتتاح کے لیے بلایا تھا۔ جانے سے پہلے وہ چاہتے تھے آپ اپنی ان کے شان و شوکت کا حلف اُن کے ساتھ کھڑی ہو کر اٹھائے۔ علم نہیں تھا کہ پرانی شوگر کی وجہ سے میری استریاں اچانک خون تھوکے لگیں گی اور میری کال کوٹھڑی کا تار کھول دیے جانے کا فرمان جاری ہو جائے گا۔ چونکہ ارٹھ نے کل مجھے بتایا تھا۔ جدے میں عمرے کے دوران آپ کو میری مخدوش حالت کا علم ہو چکا تھا۔ ہسپتال و سون کو یڈر اس ڈر بھیج دیئے گئے ہیں۔ عمرے کے یزن کی وجہ سے نہیں جلدی سیٹ نہیں مل رہی۔ سیٹ ملتے ہی وہ واپس سیدھی میرے پاس چلی آئیں گی۔

”گلو“ کے بیٹوں کی ہستہ آہستہ ہسپتال میں پھیلتی آواز الہامی ہے۔ اُس جیسی گرم و سرد چشیدہ ڈھیٹ عورت صرف اسی کے لیے بین ڈال سکتی ہے جو واقعی دوسرے کن رے پہنچ چکا ہو۔ میں جانتا ہوں میرے لیے رونے پر اُسے اس کی ضروریات بھی مجبور کر رہی ہیں لیکن وقت رخصت اگر میں کہوں کہ میرے لیے بین ڈال کر رونے والی اس بے ہنگم عورت کے سوا دنیا میں کوئی دوسر نہیں ہے، تو وہ مبالغہ نہیں ہوگا۔

منکر نکیر لکھتے ہیں تو لکھیں۔ اس کی ادا صرف بے نیازی نہیں بے انصافی بھی ہے۔ جاتے جاتے ذہن کا جل بجھ جل بجھ حصہ بولتا ہے، اگر میں اپنے بدن کے زندہ متحرک حصے کے ساتھ ٹکٹے بھاری مردہ ماس کو کاٹ کر الگ کر سکتا تو میں بھی اپنے آپ کو صاف ستھرا معطر رکھ سکتا تھا۔ پر اب جاتے جاتے کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی سرنگوں کرنے والے صحت مندوں اور مجھ جیسے کثیر التعلد و کوڑھیوں کے درمیان بے وجہ ایک ناقابل عبور دیوار چین کھڑی کر دی جاتی ہے۔ ہم بے گناہ زندگی کی رنگ پیکاریوں سے کھیلتے، مہبتوں کے کھیں رچاتے ہوگوں کو صرف دور دور سے دیکھ سکتے ہیں اپنی غوسٹوں کی دیوار ناپ کر ان میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اسی قربت مرگ کے لمحے بھی مجھے یاد ہیں، آپ اپنی ایک بار میری شدید محرومیوں سے شرمندہ مجھے وہیل چیئر میں انڈیل کر رشتہ داروں کی شادی میں بھی لے کر گئی تھی ہجوم کو دیکھ کر میرے خون کا فشر تو جو بڑھا سو بڑھا، چیخ چاہائے ہائے کرتے ترس کھانے والے میرے گردنوں جمع ہونے لگے جیسے میں دنیا کا کوئی نواں بچوہ تھا اس سے پہلے کہ میں وہاں دھڑکیں مار مار کر رونے لگتا یا فرسٹریشن سے انہیں گالیاں دینے لگتا میں نے اسلم اور اللہ رکھے سے کہا مجھے فی الفور واپس گھر لے جاؤ

آخری ملازم سیف اللہ جب اپنی بھاری تنخواہ والی نوکری یہ کہہ کر چھوڑ گیا کہ باہر والا آدھا رندہ آدھا مردہ بدن تو ہمت کر کے صاف کر لیتا ہوں لیکن بھیا کی بیماری تو اندر سے ہی دن بھر بدبو چھوڑتی ہے، وہ نہیں سہاری جاتی۔

مجھ سے بدبو والی قد آور ”گلو“ چوڑی کافی دیر سے کونھی کی سنائی ستھرائی پر معمور تھی۔ وہم کی حد تک صفائی پسند ہوئے کی وجہ سے ”گلو“ کو بھاری تنخواہ دے کر آپ اس سے دن بھر جھاڑو پوچھے پھروائی رہتی۔ آپ اپنی کشادہ رستی کی وجہ سے اس کے سامنے سدھائے ہوئے جانور کی طرح دن بھر سن سٹینڈ میں مصروف رہتی تھی کیونکہ اس کے نشی شوہر اور بچوں کا اس کے بغیر کوئی دوسرا کفیل نہ تھا۔

سیف اللہ کی شدید بدتمیزی کے بعد آپ نے بال بال نخواستہ میری تمام ذمہ داری ”گلو چوڑی“ کے حوالے کر دی۔ اُس نے پہلے دن ہی اپنے دونوں مضبوط بازوؤں میں مجھے اٹھا کر مجھے بند پین پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ہم عیسائی لوگ تو صدیوں سے آپ ہوگوں کے گوموت سنبھالنے ہیں، آپ کی دفعہ مجھے کوئی موت آ جائے گی۔ جب یسوع مسیح خود کوڑھیوں

کو سینے سے لگا سکتے ہیں تو مجھ کم ذات کا کیا نگرہ؟؟

وہ میری ہونق زندگی کا پہلا دن تھا جب مجھے میری غلط فہمیاں سنبھالنے والے ہاتھوں میں غصے اور جھنجھلاہٹ کا احساس نہیں ہوا۔ وہ مجھے ایسی خوشدلی سے سنبھال رہی تھی جیسے کوئی ماں اپنے گندے بچے کو سنبھالتی ہے۔ احتیاط سے بیڈچین میرے نیچے رکھنے کے بعد اس نے سہ دوسری طرف کر کے بچے کا ناشروع کر دیئے تھے

اُس کی سنبھال میں توجہ اور شفقت تو تھی لیکن وہ میرے نیچے تلے پڑے نوٹوں پر اس طرح جھپٹتی جیسے چیل چھپکڑوں پر جھپٹتی ہے۔ کیوں جھپٹتی ہو مجھ سے اتنے پیسے؟ شرم نہیں آتی میری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے؟

جناب عالی! اُس کتے کی اولاد اپنے خنصر "سٹیفن" کی خاطر بے غیرت ہو گئی ہوں۔ میں عشق نہ کچھے ذات میرے حضور! تین دن تو نشے کے ہسپتال سے علاج کرا چکی ہوں اس بھڑوے کا۔ آتے ہی دوبارہ سے جاتے ہیں اسے اس کے نشئی دوست سے زہر پلانے، آپ سے کیا پردہ مجھے تو ابھی ماہانہ تاریکیوں بھی نہیں آتی تھیں جب میرا دل سٹیفن کی شریقی آنکھوں نے لوٹ لیا تھا۔ آپ معصوم کیا سمجھیں حضور میرے پیٹ کی خالی پیلی میں "موتی بھی تو اُسی کے وجود نے پردے تھے نا" اپنے ان تینوں پیاروں کے پیسے بھی تو صرف اپنی غیرت بچتی ہوں کبھی جان بچنی پڑی تو دریغ نہیں کروں گی۔ جناب آپ کی خیر خیرات جو بھی لے جاتی ہوں سی سے دیا جتا ہے میری اندھیری کوٹھڑی کا۔

"گٹو" چڑی یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ میری قربت سے زیادہ تر دور بھاگنے والی آپنی غیر موجودگی کی خلافی مجھ پر نوٹوں کی بارش برسا کر کرتی تھی اور وہ نوٹ ملازموں کو امیر بننے کے علاوہ میرے کسی کام نہیں آ سکتے تھے۔

"گٹو" مہترانی نے جب میرے بدن کا چارج سنبھال تو میں انیسواں ٹاپ رہا تھا۔ آدھا چہرہ گھنے بالوں سے بھرا تھا۔ آدھے مفلوج جیسے پرسوکی پرانی گھاس جیسے برنگے بال اُگ رہے تھے۔ انیس بیس کی عمر تک میں مرد کی مردانگی کے کسی بھید سے بھی واقف نہ تھا۔ چند مہینوں سے اپنے بے کراں بدن کی ہلکے مہترانی پیشاب کی بوتل میرے مضطرب مردانہ عضو کے ساتھ لگاتے لگاتے اسے اپنی کھر دردی نگاہوں سے سہلاتی تو اچانک ریزہ کی ہڈی میں چالیس واٹ بلب جیسی ملکی ہلکی شعاعیں جھننے لگتیں۔ نسوں کے مردہ جال میں توانائی کا لذیذ احساس، جاگ اٹھتا کیا کر رہی ہو بدتمیز، میں آہستہ سے بڑبڑاتا چاروں چک جہانگیر ہیں سرکار۔ وہ زور سے قہقہہ لگاتی۔ اپنے خاں صاحب کو میں نے مردوں میں سے ایک بھروسا مرد نہ بنایا تو "گٹو" چوڑی نام نہیں۔ جو کچھ زندہ نہیں لگتا وہ بھی زندہ کر کے دکھاؤں گی ایک دن۔ وہ میری ڈانٹ سنی ان سنی کر کے "نکا موٹا جہرہ ہی وے" لگاتی ہوئی نکل جاتی۔ اور میں گھنٹوں بین اُس انوکھی روشنی اور توانائی کے بارے میں سوچتا رہتا جس کے بن مہترانی کے کھر درے ہاتھوں میں پوشیدہ تھے۔ کچھ ہی دنوں کے اندر اندر "گٹو" نے مجھے اس گھڑی بھر کے تلذذ کا عادی بنا دیا تھا۔ میں صبح اٹھتے ہی بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگتا نوٹوں سے اس کی جھولی بھر دیتا جن سے وہ نشے کے عادی سٹیفن کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی اور مجھ پر اپنے ڈھیلے رمانہ بدن کے مزید بھید کھولنے لگتی۔ آہستہ آہستہ میرے اور پینتالیس سالہ "گٹو" کے درمیان ایک باقاعدہ پوشیدہ رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ میرے بدن کے مردہ تو دے میں زندگی کی چنگاری بھڑکانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ میری میلی چینی متعفن دنیا میں ایک عورت کے وجود کی وجہ سے رنگ کھلنے لگے تھے۔ پچھلی جون میں شدید گرمی اور لوڈ شیڈنگ سے تنگ لالہ آپنی نے جب اپنی امیر کیر سہیلیوں کے ساتھ کوہساروں کا رخ کیا تو "گٹو" کئی راتیں میری دیکھ بھال کے بہانے سرائیٹ کو اڑوں میں بسر کرنے لگی تھی۔ دوسرے ملازموں کے سونے کے بعد وہ وڈ شیڈنگ کے گھپ اندھیروں میں میرے پاس آتی اور ایک سدھائے ہوئے جانور کی

طرح مجھے اپنے بدن کی ہر ٹکڑ سے کھینے کی اجازت دے دیتی۔ کچھ دیر میں اپنے آپ کو اس کے اتھل پتھل، اس کے ڈھیر کا مالک سمجھنے لگتا۔ زندگی کے مذاکد کی معمولی سی جھلک نے بھی میرے اندر جیسے کی اُمتگ پیدا کر دی تھی۔

ماں کی وفات سے لے کر ”گلو“ چوڑی کی میری زندگی میں آمد تک مجھے کسی ایسے نسب فی لس کا تجربہ نہیں تھا جس میں قبولیت یا ہمدردی کی کوئی معمولی سی چس بھی موجود ہوتی۔ وہ میلی تھی یا بد صورت! اس نے مجھے زندگی کے گلزار کی حرگیز جھلک دکھائی تھی انسان سے انسان کی جڑت کی اہمیت اُجاگر کی تھی۔ ان دنوں میں اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

سٹیفن کا بدن نشے کی زیدتی کی وجہ سے برودہ بن چکا تھا۔ اس کی جون بہن کی شادی کی تمام ذمہ داری اسے بھائی اور بھالی پر ہی تھی۔ سٹیفن کو تو مصری محی بنا کر ”گلو“ نے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ پر بھری بر درنی میں وہ اپنے نیم مردہ شوہر کی تھڑی تھڑی نہیں کرانا چاہتی تھی۔

سر بانے پڑے، مینٹر پر میرے دل کی جل جل بھل بھل دیکھ کر ڈاکٹر لوگ دوبارہ ادھر ادھر بھاگنے لگے ہیں۔ وینٹی لیٹر وینٹی لیٹر کی گھس گھس صاف سنائی دے رہی ہے۔ دیووں بار نیلی وینٹن پر اور میرے پاس آنے جانے والے دکاندار طبقے سے میں مرنے والوں کے آخری لمحات کا حال سن چکا ہوں دل بھسے جھٹکے کھاتا رہے۔ جب تک انس فی ذہن کی ہستی گل نہ ہو موت جیت نہیں سکتی۔

میری ڈوبی ڈوبی بینائی کے باوجود میرے ذہن کی پھر کی جون کی توب چل رہی ہے۔ سفید ریش ڈاکٹر نے مجھے دل کا جو ٹیکا لگایا ہے اس نے سانس ایک بار پھر رواں دواں کر دیئے ہیں۔

نند کی شادی کی فکر میں گھسی گھوٹنے اس رات میرے بدن کی مکمل، لٹل کے بعد ”مجھ سے مدد کی التجا اسی لہجے میں کی تھی جیسے عورتیں، بچے کماؤ مردوں سے کرتی ہیں۔“ میرے خاندان کی جوانی کے صدے میں بلی کی شادی کی ذمہ داری کو بھی اچھی طرح پورا کرنا چاہتی ہوں، سٹیفن نامراد کو دنیا کے سامنے ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ کیا کہتے ہو میری سرکار؟؟؟

اس نے دھیرج سے میری قمیض کے من کھوستے ہوئے کہا: زندگی بھر قدم چومتی رہوں گی۔

”کچی“ میں ہنسا

میری سرکار آپ بھی کونسے کم لپے ہیں نہ آؤں تو آپ کو بھی اس بچ کی لگن لگی رہتی ہے۔ اب اس ربار سے اُٹھ کر جاؤں بھی کہاں؟

سیاحت یا سیر کے لیے جاتے وقت آپ شائد میری خود اعتمادی بڑھانے کی خاطر اپنے پورے گھر کی چابیاں مجھے ہی دے کر جایا کرتی تھی۔ زیور، کیش تو زیادہ تر بنکوں میں ہی بند رہتے تھے۔ لیکن کمروں میں بچے نوادرات کی قیمت بھی لاکھوں سے کم نہ تھی۔ بہت زیادہ نہیں لیکن اپنی ضرورت کے مطابق آدھی رات برکت مسج کے مشندے بھائی لے کر آؤ اور باقی ملازم جب گھری فیند سو جائیں تو گھر سے کچھ قیمتی اشیاء اٹھ کر لے جاؤ اور ان سے علی کی شادی کا بندوبست کر دو۔ میں نے گھر کی چابیاں اُسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ صبح ڈاکے ڈاکے کا شور پڑے تو تمہیں بھی موجود ہونا چاہیے۔ چیزیں احتیاط سے پیچنا کام پر وگرام کے مطابق پورا ہو گیا۔ ڈاکے کی خبر سن کر پوچس آئی تو میری بے بسی دیکھ کر ملازموں سے گالی گلوچ کرتی رہی۔ میں نے تھانیدار کو کچھ پیسے دے کر پی کے آنے تک کسی ملازم کو تھانے پکھری نہیں جانے دیا ”گلو“ نے میری مردہ اینگو کو زندگی بخشی تھی۔ میری اپنی ہی ذلت سے نفرت کو کم کیا تھا۔ سحر انگیز حقائق سے پردہ اٹھایا تھا۔ چند مہنگی اشیاء کی گمشدگی آپنی کے لیے کسی بڑے خسارے کا باعث نہیں تھی۔ ”گلو“ کا اپنی برادری میں سرخرو ہونا میرے لیے باعث

اطمینان تھا آپلی وہ پسلی پر پریشان تو ہوئی لیکن نقصان سے زیادہ اسے دکھ تھا تو میری بے بسی کا شکر ہے بیوا ان بھیڑیوں نے تیرے کمرے کا رخ نہ کیا تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر سکتی۔ حفظہ ماتقدم کے طور پر آپلی نے ”نگو“ سمیت ان تمام ملازموں کو نوکری سے فارغ کر دیا جنہیں وہ پیچھے گھر چھوڑ کر گئی تھیں۔ اگلے روز ”نگو“ مجھے داتا گنج بخش کے مزار کی طرح سر سے پاؤں تک چومتی۔ شکر ہے بھری مری زندگی سے غائب ہو گئی تھی۔ سنیہن کی عزت کی خاطر اس نے میری ذات کی بھی بلی چڑھا دی تھی۔

میرے کمرے کی فضا ایک بار پھر گھٹن اور نقصان سے تھڑ گئی۔ کسی اپنائیت بھری انسانی پھوٹ کے بغیر میری فالج زدہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد و تھڑوں میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ میرے آدھے زندہ حصے نے بھی مٹی سے مٹی ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے ایک آدھ بار اپنی بہن سے کہا بھی تھا کہ ”نگو“ کی طرح دل لگا کر مجھے کوئی نہیں سنبھال سکتا لیکن اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی تھی۔ میری آپلی میری بہترین گاد فادر تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ”نگو“ کے چلے جانے کے بعد میری روح نے بھی ہفت آسمانوں میں اڑان بھرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آج وہ مجھے اندر آ کر ایک نظر دیکھنے کی خواہش میں صبح سے کئی دفعہ دھکے کھا چکی ہے۔ یہ انتہائی نگہداشت کا کمرہ ہے۔ وہ نہیں جانتی یہاں ڈاکٹروں کی مریض کے ساتھ خفیہ کارروائی میں کوئی غل نہیں ہو سکتا۔ یہ زندگی اور موت کے درمیان آخری پیدھ ہے۔ باہرین ڈالٹی کالی پیلی چوڑی کیسے جان سکتی ہے کہ انتہائی نگہداشت کمرہ دراصل وہ پیلی پیدھ ہے جہاں سے انسان کو اس کی آخری پرواز پر روانہ کیا جاتا ہے اور پیلی کا پٹر کے ذیل انجن کی آواز تو میرے دماغ کے پرچے اڑا رہی ہے، اللہ کرے آپلی کو آج ہی واپسی کی سیٹ مل جائے۔

☆...☆...☆

کچے شہوت

انور زاہدی

بہار کے شروع شروع کے دن تھے۔ ہوا کے جھونکوں میں ہر طرف پھولوں کی جھک ایسے ہی تھی جیسے قدرت نے آسمان سے زمین پر چاروں طرف ایئر فریشر سے پھیرے کر دیا ہو۔۔۔ یہ جن دنوں کا ذکر ہے میں شاید آٹھویں کے امتحان سے فارغ ہو کر نوے کلام کی تیاری میں لگن تھا۔۔۔

عجب عمر تھی اور عجیب دل۔۔۔ اپنی ذات کے علاوہ مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔۔۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھ کچھ پڑھ رہا تھا کہ مئی نے آواز دی۔۔۔ باہر نکلا تو وہ کچن کے دروازے میں کھڑی تھیں۔۔۔ وہیں انہوں نے مجھے بد کر پیسے دیئے اور مارکیٹ سے بسکٹ اور وٹو سکواش کی ایک بوتل لے کر کہتے ہوئے تاکید کی۔۔۔
رومی۔۔۔ دیکھو ہمیشہ کی طرح کسی کھیل میں نہ لگ جانا۔۔۔ تمہارے پاپا کے ایک دوست اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے ہاں آ رہے ہیں۔۔۔

میں نے ہمیشہ کی طرح مئی کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے پیسے لیے اور سائیکل نکال کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔۔۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد جب گھر پہنچا تو ایک ریڈی میڈ بہانہ میرے پاس موجود تھا اور وہ میں نے مئی کے سامنے نہایت سلیقے سے پیش کرتے ہوئے کہا۔

مئی گھر کے قریب ولی مارکیٹ سے بسکٹ تول گئے تھے۔۔۔ لیکن وٹو سکواش کی بوتل لینے کے لیے مجھے صدر بازار جانا پڑا۔۔۔

مئی نے گھورتے ہوئے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا۔۔۔ اور کچن میں چائے بنانے میں لگ گئیں۔۔۔ میں بجائے ڈرائنگ روم میں جا کر پاپا کے دوست اور ان کی فیملی سے ملتا ہوں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔۔۔ اور دوبارہ اپنی کتابوں میں کھو گیا۔۔۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ پاپا کی آواز آئی۔۔۔

ارے بھئی رومی۔۔۔ ادھر آؤ بیٹے۔۔۔ میں ڈرائنگ روم میں پہنچا۔۔۔ تو وہاں پاپا اور مئی کے علاوہ۔۔۔ پاپا کے دوست اپنی مسز اور ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے۔۔۔ میں نے ایک سرسری نظر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی۔۔۔ پاپا کے دوست اور ان کی بیگم کو چھوڑتے ہوئے جب میری نظر وہاں موجود اچھی ہم عمر لڑکی پر پڑی تو اس میں مجھے کوئی ایسی خاص بات نہ نظر آئی۔۔۔ جس کے باعث میں اسے کوئی اہمیت دیتا۔۔۔ ہاں اب تو ایک چیز جو مجھے پہلی ہی نظر میں محسوس ہوئی تھی وہ اس لڑکی کے دیکھنے کا مخصوص انداز تھا۔۔۔ اس کے چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ نکھیں نہ صرف جاذب نظر تھیں۔۔۔ بلکہ وہ اس لڑکی کے ذہن اور خود اعتماد ہونے کی غماز بھی دکھائی دیں۔۔۔

لطیف صاحب۔۔۔ یہ میرا جینا رومی ہے۔۔۔ اور پاپا میری طرف مڑ کے کہنے لگے۔۔۔
بیٹے یہ آپ کے انکل اور آٹنی ہیں انہیں سدم کریں۔۔۔ اور ہاں بیان کی بیٹی۔۔۔ نیلا ہے۔۔۔ تم۔۔۔ ایسا کرو انیلا کو اپنے ساتھ کمرے میں لے جاؤ یا پھر باہر رن میں جا کر کھیلو کو دو۔۔۔

میں نے کمرے میں موجود پاپا کے دوست اور ان کی مسز کو سدم کیا اور ان کی بیٹی انیلا کو اپنے ساتھ چنے کے بے بدولی سے دعوت دے دی۔۔۔

ہاں ہاں۔۔۔ بیٹی ایلا جاؤ۔۔۔ اور رومی کو پناہ دوست بنا لو۔۔۔ پاپا کے دوست لطیف صاحب نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

ایلا وہاں سے اٹھ کر میرے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔۔۔ صحن میں برآمدے کے دروں میں لگی بیلوں گود کچھ کر وہ ایک لمبے کور کی اور مجھ سے پوچھنے لگی۔۔۔

یہاں۔۔۔ پودے۔۔۔ میرا مطلب ان بیلوں سے ہے۔۔۔ یہ کس نے گائے ہیں۔۔۔؟

میں نے انہی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔۔۔

یہ شوق میری مٹی کا ہے۔۔۔ ان کا بس چلے تو سارے گھر کو باغ میں بدل ڈالیں۔۔۔

میری بات کو سن کر وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں پودے۔۔۔ بیٹیں۔۔۔ اور پھول اچھے نہیں لگتے۔۔۔؟

پہلی بار اس لڑکی کی بات سن کر جسے اب تک میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔۔۔ میں اپنے خیالات کے گرداب سے باہر آ گیا۔۔۔ اور چونک کر اسے حیرت سے دیکھا۔۔۔ وہاں میرے سامنے ایک تیرہ چودہ برس کی دہلی پٹلی سی لڑکی۔۔۔ زرد اور سبز پھولوں کی فراک پہنے سفید ساکس اور سکوس شو میں بیوس اپنے کندھے پر جھولتے ہوئے باؤں میں سرخ رہن لگائے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو کھولے ہوئے۔۔۔ میری طرف ایسے دیکھ رہی تھی۔۔۔ جیسے صحر میں سے گزرتے ہوئے کسی دشت نور کو اچانک کوئی سراپا نظر آ جائے۔۔۔ اور میں اس محو حیرت لڑکی کو بچ صحن میں کھڑا ہوں دیکھے جا رہا تھا جیسے میری آنکھوں کے سامنے چاروں طرف دیوں کے جل اٹھنے سے چاندنا ہو گیا ہو۔۔۔ اتنے میں مٹی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔۔۔

رومی۔۔۔ ایلا بیٹی کو۔۔۔ یہاں سچ صحن میں ایسے کیوں لے کر کھڑے ہو گئے ہو۔۔۔ اپنے کمرے میں سے جا کر بیٹھو۔۔۔ میں تم لوگوں کے لیے دمنوں کے گلاس دیں لا کر دیتی ہوں۔۔۔ تم ایلا کو اپنی کتابیں وغیرہ دکھاؤ۔۔۔ یا پیچھے لان میں جا کر کھیل لو۔۔۔

مٹی کی آواز مجھے دشت حیرت سے واپس لے آئی اور میں ایلا کو لے کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔۔۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہو کر ایک بار پھر کمرے کو ایسے حیرت سے دیکھنے لگی۔۔۔ جیسے کوئی ماہر آثار قدیمہ کسی نئی دریافت کو بخور دیکھتا ہو۔۔۔ جب میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔۔۔ تو وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے بولی۔۔۔ تمہارا نام تو بڑا اچھا ہے رومی۔۔۔ مگر تم اسے کیسے لکھتے ہو۔۔۔؟

ایلا کی بات سن کر میں نے جتے ہوئے کہا۔۔۔

اس میں کیا خاص بات ہے یہ تو بہت آسان سا نام ہے۔۔۔

اور میں نے وہیں اپنے سامنے میز پر پڑے کاغذ پر اپنا نام انگلیش میں لکھ کر اسے دکھایا۔۔۔ اور کہا۔۔۔

ایسے۔۔۔ کیا اس نام میں کوئی خاص بات ہے۔۔۔؟

میرے لکھے ہوئے نام کو دیکھتے ہی وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔۔۔

مجھے معلوم تھا کہ تم یہی لکھو گے۔۔۔ روم سے رومی۔۔۔ لیکن۔۔۔ روم کا مطلب تو کمرہ ہوتا ہے۔۔۔ اور تم

کمرہ تو نہیں ہو۔۔۔ تم تو انسان ہو۔۔۔ تمہیں چاہئے کہ اپنے نام کے اسپیلنگ میں۔۔۔ او کی جگہ۔۔۔ یو۔۔۔ کا استعمال

کرو۔۔۔ تو لفظ رومی کا صحیح مطلب نکلے گا۔۔۔ اور یہ اچھا بھی لگے گا۔۔۔

میں جواب تک خود کو بے حد عقل مند سمجھا کرتا تھا اپنے سامنے موجود اس چھوٹی سی ایک دیلی پتلی سی لڑکی کے سامنے ہونق بنا۔۔۔ اس کی شکل ایسے دیکھے جا رہا تھا۔۔۔ جیسے آج سے پہلے کبھی کسی لڑکی کو نہ دیکھا ہو۔۔۔ میری محویت کو توڑتے ہوئے "خرکاروہ بولی۔۔۔"

رومی۔۔۔ اب میری شکل ہی دیکھتے رہو گے۔۔۔ یا مجھے کچھ دکھاؤ گے بھی۔۔۔ "میری سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ انہی کو کیوں دیکھ دوں۔۔۔ میرے کمرے کو تو اس نے داخل ہوتے ہی آثار قدیمہ سے متعلق کر دیا تھا۔۔۔ بالآخر نبھانے کیا سوچتے ہوئے میں نے اسے اپنے کاکس نکال کر دکھائے۔۔۔ اتنے میں مٹی ٹرے میں ہم دونوں کے لیے وٹنوا سکاٹش کے گلاس اور پھل رکھ کر لے آئیں۔۔۔ ایلا نے بجائے اسکاٹش کے گلاس اٹھانے کے میرے کاکس کو دلچسپی سے دیکھا اور پھر میری طرف ایک حیرت سے دیکھ کر کہنے لگی۔۔۔

رومی تم کس کلاس میں پڑھتے ہو۔۔۔؟

مجھے یوں لگا جیسے میرا سارا اعتماد اور اپنی ذات کے بارے میں سارا زعم۔۔۔ ہاتھوں پر لگے صابن کے جھاگ کی مانند بہہ گیا۔ میں نے رندھی ہوئی "واہ میں۔۔۔ جیسے میں کسی جاب کے حصول کے لیے انٹر دیو بورڈ کے سامنے بیٹھا اپنی قسمت کا فیصلہ سن رہا ہوں۔۔۔ ڈرتے ڈرتے آہستہ سے جواب دیا۔۔۔

نویں میں۔۔۔

میرا اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔۔۔ اور اسکاٹش کا گلاس ہاتھ میں تھامے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔۔۔ اور بھی تک کاکس پڑھتے ہو۔۔۔ یہ تو میں نے چھٹی کلاس میں پڑھا چھوڑ دیئے تھے۔۔۔ اب میں آنٹھویں میں ہوں۔۔۔ اور آج کل لوزیا اسکاٹ کا ناول۔۔۔ لفظ دیمن۔۔۔ جو مجھے میرے ماموں نے برتھ ڈے پر دیا تھا، پڑھ رہی ہوں۔۔۔ اور تم۔۔۔ تمہارا نام تو اتنے بڑے فلسفی شاعر پر ہے اور پڑھتے کاکس ہو۔۔۔

ایلا نے میرے سارے اعتماد کا بھرکس نکال کے رکھ دیا تھا۔۔۔ میں جواب تک خود کو ہر چیز سے لا تعلق سمجھا کرتا تھا۔۔۔ اس دیلی پتلی سونو سی لڑکی کے سامنے خود کو اس قدر بے بس سمجھ رہا تھا۔۔۔ درابھی میں اسی سوچ میں گم تھا۔۔۔ کہ کس طرح اس تیز طرار لڑکی سے اپنی شکست کا بدلہ یوں کہ اس نے کاکس کو وہیں میز پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔۔۔ آؤ ہمارے ن میں چلتے ہیں۔۔۔ یہاں تمہارے کمرے میں تو کاکس کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں۔۔۔

اور میں اس کے کہنے پر فوراً ہی اس کے ساتھ باہر لان میں ایسے چلا گیا۔۔۔ جیسے یہ تو خود میں اسی بات کے منتظر میں تھا۔۔۔ اور یہ پھر اس بظاہر سیدھی سادی لڑکی نے اپنی باتوں سے مجھے مسحور کر دیا تھا۔۔۔ بلکہ اگر یہ کہوں تو کہیں زیادہ مناسب ہوگا۔۔۔ کہ ایلا کی ناقابل فہم شخصیت۔۔۔ اور پھر اس کی باتوں نے مجھے مکمل طور پر مسمرائز کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔

لان تمام رات ہونے والی بارش کی وجہ سے دھلا دھلا دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ آسمان ابھی تک گہرے اودے بدلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔۔۔ فضا میں مزید بارش کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ یہ موسم بہار کی شاید پہلی بارش تھی۔۔۔ درختوں اور پودوں پر ہر طرف رنگ بکھرے پڑے تھے۔۔۔ ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکوں میں مرطوب موسم کی خنکی کے ساتھ ساتھ دروں میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔۔۔

ایلا پلک جھپکتے میں لان کے مرکز میں لگے شہوت کے درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔۔۔ اس نے مز کر ایک

دفعہ میری طرف دیکھا۔۔۔ جیسے پٹی اس مہم میں مجھے بھی شریک کرنا چاہتی ہو لیکن دوسری ہی لمحے کچھ کہے بغیر درخت پر چڑھنے لگی۔۔۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔۔۔ پھر یہ بھی سن رکھا تھا کہ شہوت کے درخت کی ٹکڑی ہلکی ہوتی ہے اور اچانک ٹوٹ جاتی ہے۔۔۔ اسے اس بات سے باز رکھنے کی کوشش کی۔۔۔ اور دوڑ کر اسے منع کرنے کے لیے شہوت کے درخت تک پہنچا لیکن وہ اتنی دیر میں درخت پر چڑھ چکی تھی اور میں نیچے کھڑا سے ایک شاخ سے لٹکتا ہوا کچے شہوت توڑنے میں مگن دیکھ رہا تھا۔۔۔ اب وہاں میری نگاہوں کے سامنے شاخ سے نکلے ہوئے شہوت کے پتھوں کے بجائے۔۔۔ انیلا کی فراک میں سے نظر آتی اس کی گندمی رنگ کی دہلی پتلی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔۔۔ میں اسی منظر میں گم تھا کہ وہ وہیں شاخ سے لٹکے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔۔۔

رومی۔۔۔ کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔ شہوت۔۔۔ یا کچھ اور۔۔۔؟
اور میں جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے کے خوف سے گھبر کر اپنے دفاع میں کچھ کہنے ہی والا تھا۔۔۔
کہ وہ بڑا بخ سے بولی۔۔۔

کیوں نہیں کہتے کہ میری ٹانگیں دیکھ رہے ہو۔۔۔ مگر کاکس پڑھنے والوں کے ہاں تو ہر چیز کا مک ہوتی ہے۔۔۔ شاعری تم کہاں سمجھو گے۔۔۔؟

یہ کہتے ہوئے انیلا نے وہیں سے اک دم نیچے چھلانگ لگائی اور مجھ پر آ گری۔۔۔ اور ہم دونوں بھٹکے ہوئے لان کی گھاس میں ایک دوسرے پر ڈھٹے ملے۔۔۔ انیلا کا چہرہ میرے چہرے کے تقارب تھا۔۔۔ کہ اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کو مس کر رہے تھے۔۔۔ اس کے ایک ہاتھ میں کچے شہوتوں کا سچھا تھا۔۔۔ جو میرے گالوں کو چھو رہا تھا۔۔۔ میری سانسوں میں شہوت کی، نوس خوشبو کے ساتھ۔۔۔ اس کے گرم جسم کی ایک غیر، نوس مہک مس گئی تھی۔۔۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنا سانس بوجھل ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔۔۔ اور لگتا تھا جیسے اگر یہی کیفیت کچھ دیر اور رہی۔۔۔ تو شاید میرا سانس رک جائے گا۔۔۔ ہانپتی ہوئی وہ مجھ پر سے انھی اور اپنی فرک کو درست کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔۔۔ اور میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔۔۔

آؤ رومی۔۔۔ اب اندر چلتے ہیں۔۔۔ آج کے لیے تباہی کافی ہے۔۔۔ اگلی بار آؤں گی تو تمہارے لیے کچھ کتابیں لاؤں گی۔۔۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ چلی گئی۔۔۔
انیلا کے چپے جانے کے بعد آج پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میرا کمرہ واقعی ایک آثار قدیمہ سے کم نہیں تھا۔۔۔ لیکن انیلا کی کچھ دیر کی موجودگی نے اس کمرے میں۔۔۔ ایک نیا رنگ بھر دیا تھا۔۔۔ دیکھنے میں ایک چھوٹی سی دہلی پتلی ٹکڑی۔۔۔ جسے میں نے پہلی نظر میں درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔۔۔ میری ذات میں اس قدر قلیں سی مدت میں ایک انقلاب برپا کر گئی تھی۔۔۔ میرے پیڈ اور پڑھنے کی میز پر بکھرے کاکس میرا ہی مذاق اڑاتے ہوئے نظر آئے لگے۔۔۔ ٹیبل کے اوپر لگے آئینے میں خود پر نظر ڈالی تو ایسا لگا۔۔۔ نجانے کتنا وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے اس مختصر سے وقت میں۔۔۔ میں ایک نو عمر لڑکے سے ایک نوجوان میں تبدیل ہو گیا تھا۔۔۔ میں نے وہیں ٹیبل کے اوپر لگے آئینے میں کرے آن سے اپنا نام RUMI لکھ ڈالا۔۔۔ لیکن ایک تبدیلی کے ساتھ۔۔۔ اوکے بجائے یو۔۔۔

چھپکلی اور چائے کی پیالی کے درمیان

مشرف عالم ذوقی

میری مکمل شخصیت کسی جوکر کی طرح ہے اور مجھے ہار ہار لگتا ہے جوکر کی طرح جیتے جیتے ہوئے آپ سامنے والے شخص کے اندر اور باہر آرام سے جھانک سکتے ہیں اسی طرح، جیسے دوستو فسکی کا ایڈیٹ شرمایا ہو شہزادی کے دل تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر رہا ہے۔ مصنف کو بے شرم ہونا ہوتا ہے مگر اس کی موجودگی میں احمق اور جوکر دونوں طرح کے کردار بیک وقت شامل رہتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی دونوں کرداروں کو ایک ساتھ انجام دیتا رہتا ہے۔ جنگل، پہاڑوں، برف اور گلیشیر کے پگھلنے سے الگ، میں زیادہ تر رومانوی دنیا سے الگ ہی رہتا ہوں اور بہت چھوٹی چیزیں بلکہ وابستہ چیزیں مجھے متاثر کرتی ہیں۔ مثال کے لیے خوبصورت وادیوں میں کوئی ٹھونڈا درخت مجھے دکھ جائے تو حیران آنکھ سے مجھے اس پر مسطہ خزاں کا حساب لگانا زیادہ چھانگتا ہے اور اسی لیے افسانوں سے زیادہ گھوڑے یا بھری پڑی بستیوں سے زیادہ دیرنی، شہر خاموش یا وحشت کے بجائے گھنٹھروں کو سننا مجھے اچھا لگتا ہے اور شاید اسی لیے اس گھر میں ناہیدنازی میری توجہ کا مرکز بن سکی کہ اس کے کمرے میں اندھیرے جمع تھے، وہ اپنے احساس کی تپش سے جالوں، پگھلاؤں، چھپکلیوں سے لے کر ذری سہمی آواز کی آہنی موسیقی بھی کمرے میں پیدا کر لیا کرتی تھی۔ ایک کہانی کے بعد دوسری کہانی کی تلاش کچھ یوں ہوتی ہے کہ ہم بچھڑے کرداروں کو بھول جاتے ہیں انہی دنوں میری ملاقات نئی تاس کے کمال یوسف سے ہوئی تھی اور اس کہانی میں کئی کہانیاں یکا یک شامل ہوتی چلی گئی تھیں

جیسے کمال یوسف کا اپنی بیوی اور چھ مہینے کی بیٹی کے ساتھ انڈیا گیٹ پر آنا۔ رات بھر بچہ بستہ ہواؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انقلاب اور احتجاج کا حصہ بن جانا اور میرا گر جانا۔ تعجب ہے نا، مصنف بھی کرتے ہیں بلکہ میں تو یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اکثر مصنف بے خیالی میں گر جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی آنکھیں راستہ بنانے کی جگہ اپنے ہی خیالوں میں سفر کرتی رہتی ہیں اور وہ سامنے کی رکاوٹ کو نہیں دیکھ پانے کی صورت میں بدوجہ چوٹ کھا جاتے ہیں لیکن کمال یوسف سے ملنے، میرے گر جانے اور صوفیہ کے اتفاقاً ملنے کی کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انہی دنوں کا تذکرہ ہے جب ہندوستانی سرزمین پر سیاست نے نئی کروٹ لی تھی۔ دلی کا انڈیا گیٹ ہزاروں رکھوں کی بھیڑ میں انقلابی چوک میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ دے پائوں آنے والی انقلاب کی وہ آہٹ تھی جو شاید اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی گئی۔ یہ وہی دور تھا جب دنیا کے کئی حصوں میں اس طرح کے مظاہرے عام تھے۔ سیاسی چہروں کو یہ فکر دامن گیر کہ عوام کا غصہ جاگ گیا تو تخت و تاج کا کیا ہوگا۔ بار بار تباہ و برباد اور آباد ہونے والی دلی آزادی کے بعد ٹھن سوئی ہوئی، خاموش تر شاکی بن کر رہ گئی تھی لیکن ایک حادثے نے دلی والوں کو نہ صرف جگا دیا تھا بلکہ دلی کے ساتھ ہی پورا ہندوستان بھی جاگ گیا تھا اور یہ معاملہ تھا جیوتی گینگ ریپ کا معاملہ۔ ایک معصوم سی لڑکی جیوتی جس کو میڈیا اور چینلز نے ابھی نہ بھی جیسے ہزاروں نام دے ڈالے تھے۔ ایک کالج کی لڑکی جو صبح سویرے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک خالی بس میں بیٹھی اور بس میں سوار پانچ لوگوں نے بے رحمی کے ساتھ بوائے فرینڈ کی موجودگی میں اسے اپنی ہوس کا شکار بنالیا اور

چلتی بس سے دونوں کو باہر پھینک دیا۔ یقینی طور پر ایسے معاملات پہلے بھی سامنے آئے تھے لیکن بے رحمی اور درندگی کی نہ بھونے والی اس مثال نے دلی کو احتجاج اور انقلاب کا شہر بنا دیا تھا۔ جنت منتر سے لے کر دلی گیٹ اور انڈیا گیٹ تک ہزاروں لاکھوں ہاتھ تھے جو انقلاب کے سرخ پرچم کے ساتھ ہوا میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بطور مصنف کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اکیسویں صدی کی غی دنیا میں قدم رکھنے کے باوجود آج تک جہلت اور درندگی کے واقعات میں کوئی کمی کیوں نہیں آئی تو علم نفسیت کی موٹی موٹی کتابیں بھی ہانپ جاتی ہیں کہ نہ قدیم عہد میں کچھ بدل سکا اور نہ اس انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سائنسی انقلاب کے عہد میں کچھ بدلنے کی امید ہے۔ وہی مرد ہے۔ عورت کو اپنی حکومت کے طور پر محسوس کرنے والے اور صدیوں کے انقلاب کے باوجود برتری کا وہی پیمانہ ہے جو آج بھی عورتوں کو حاشیہ پر دیکھنے کا خواہشمند ہے اور اسی لیے عورت ہونے کے تصور میں، مرد نے کبھی اس کی اثران کا استقبال نہیں کیا بلکہ ایسی ہراڑاں اس کی مردانگی کو لٹکارتی رہی۔ سیمون بوار سے تسلیم نہ کریں تک عورت جب یہ کہتی ہے کہ یہ گھر میرا ہے، یہ فریج میرا، یہ لیپ ٹیپ میرا اور یہ بدن میرا تو مرد کی "کھپیں تن جاتی ہیں۔ مرد نہ عورت کو برا بھلا کہتا ہے نہ سانچے سے سیاست تک اس کے قد کو پھیلنے اور بڑھنے ہوئے یورپی ممالک کی عورتیں بھی اس معاملے میں وہی ہیں، جو ایک عام ایشیائی عورت کا معاملہ ہے۔ وہاں بھی زنا بالجبر اور زور زبردستی کی وارداتیں عام ہیں اور یہ وارداتیں ہر سطح پر ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ تہذیب کی اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی ایک تعلیم یافتہ لڑکی رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر سفر نہیں کر سکتی۔ دفاتروں میں کام کرتے ہوئے اسے چوکنار ہونا ہوتا ہے۔ وہ گھر میں بھی محفوظ نہیں ہے۔ یہاں باپ سے بھائی تک کے قریبی رشتوں میں بھی "سگ زرو براہ شغل" کی مثال ہی سامنے آتی ہے۔ صرف ایک بدن کے تصور میں آزاد ہوتے ہوئے اور ترقی کے مینارے چڑھتی ہوئی عورت بھی زمانہ قدیم کی داسی محسوس ہوتی ہے جس کی ڈور روزِ زل سے مرد کے پاس ہے اور اسے مرد کے اشاروں پر ہی ناچنا ہوتا ہے۔

نھنڈک اپنے عروج پر تھی۔ سرد ہواؤں کے باوجود پر جوش مظاہرہ کرنے والوں کے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو حیوانی گینگ ریپ کے ظالموں کو سزا دلوانے اور ایوانِ سیاست کو جگانے آئے تھے۔ سیاسی ہاجل تیز ہو چکی تھی۔ انڈیا گیٹ کے آس پاس کی سڑکیں رین بسیرے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ سرد ہر، جنگلی، ہتنگوں کا اڑنا، چمخوروں کا حملہ۔ لیکن جاگتی آنکھیں امید سے پر کہ اب اس انقلاب کی، بہت کو کوئی روک نہیں سکتا۔

اور اسی مقام پر پہلی بار میں نے کمال یوسف کو دیکھا تھا۔ عمر یہی کوئی تیس بیس کے آس پاس۔ گورا خوبصورت چہرہ۔ جینز کی پینٹ اور گرم جیکٹ پہنے۔ اسے ایک سفید شال بھی ڈال رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی، جس کی گود میں ایک ننھا بچہ بھی تھا۔ لڑکی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ کمال یوسف نے ننھے شیرخوار کو گود میں لے لیا۔ میں نے خود کو تیار کیا یہی موقع تھا جب میں اس سے گفتگو کر سکتا تھا۔

وہ محبت سے ملا۔ ہاتھ بڑھایا اور اپنائی سے بولا۔

’کمال یوسف۔‘

اس بار چہکنے کی باری میری تھی۔

’مسلمان؟‘

’کیوں؟‘ اس بار اس کے ساتھ وہی لڑکی نے چبھتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ’مسلمان نہیں ہونا چاہئے‘

’نہیں میرا مطلب ہے‘ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ’عام طور پر اس طرح کے احتجاج میں مسلمان شامل نہیں ہوتے۔‘

کمال یوسف نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ’کس نے کہا کہ مسلمان شامل نہیں ہوتے۔ کس دور میں جی رہے ہیں آپ؟‘ اس نے آگے بڑھ کر شرارت کے انداز میں میرے چہرے کے سامنے اپنا ہاتھ لا کر چٹکیاں بجائیں۔ ’تمیں کروڑ کی آبادی ہے ہماری صاحب۔۔۔ مسلمان بھی اسی ملک کا حصہ ہیں لیکن آپ انہیں حصہ ماننے پر تیار نہیں۔ وہ فیس رہا تھا۔‘

’نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔‘ میں گڑبڑا گیا تھا۔

کمال یوسف نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ میری بیوی ہے۔ ناہیدناز۔ ہم نئی تال سے آئے ہیں۔‘

’ناہیدناز؟‘

اس بار ناہید کا قہقہہ بند ہوا۔ ناہید یوسف کہتے یا ناہید کمال، تب ہی آپ تسلیم کرتے کہ ہم میں کوئی رشتہ بھی ہے۔‘

’نہیں۔۔۔ میں مسلسل پڑتے ہوئے حسوں سے گھبرا گیا تھا۔‘

میری اپنی شناخت ہے۔ ناہیدناز کا چہرہ سخت تھا۔ اس دنیا میں ایک لڑکی اپنی شناخت اور آزادی کے ساتھ کیوں نہیں جی سکتی؟۔ کمال سے شادی کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میری شناخت کمال کی محتاج ہے۔ میری اپنی آئیڈینٹیٹی ہے، کمال کی اپنی آئیڈینٹیٹی۔ ایک گھر میں دو لوگوں کو اپنی اپنی آئیڈینٹیٹی اور اپنی اپنی پرائیویسی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق ہونا چاہئے۔‘

رات کے دو بج گئے تھے۔ اسٹیج سے ہر کچھ وقفے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کمال یوسف نے بیگ سے چادر نکال کر زمین پر بچھ لی۔ ہم چادر پر بیٹھ گئے۔ تھرمس سے چائے نکال کر س نے ایک کپ میری طرف بڑھایا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ ناہیدناز بچے کو پتنگوں اور کینزوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمال یوسف نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرد تھا۔ سپاٹ۔

’مسلمان۔ دوسروں کے منہ سے اکثر یہ نام سنتے ہوئے پریشان ہو جاتا ہوں۔ ہاں بھائی مسلمان ہوں تو کیا ہوا۔ دوسرے مذاہب کے ناموں پر حیرانیاں کیوں نہیں پیدا ہوتیں۔ مسلمان، اس نام کے ساتھ اچانک ہم چودھویں یا پندرہویں صدی میں کیوں پہنچ جاتے ہیں اور مسلمان کہاں نہیں ہے؟۔ کرکٹ سے فلم اور سیاست تک اور ہم جس مقصد سے یہاں آئے ہیں، وہ صرف ایک معاملہ نہیں ہے۔ یہ معاملہ کسی مذہب سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ اس نفسیاتی خوف کا معاملہ ہے جہاں ایک لڑکی اپنے ہی گھر میں ڈر ڈر کر رہتی ہے اور باغ ہونے کے بعد بھی مسلسل ڈرتی رہتی ہے۔‘

ناہیدناز نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ بچے کو سوتے ہوئے کہا۔ ابھی یہ صرف چھ مہینے کا ہے۔ دلی آنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ہم نے ایک لمحے کو نہیں سوچا کہ ہاشا کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ جانتے ہیں کیوں؟‘

لڑکوں کو آزادی دیتے ہوئے آپ کی دنیا لڑکی کی آزادی کے پرکاش لیتی ہیں۔ کبھی اسے چھری دی جاتی ہے، کبھی جاب۔ کبھی اسے اپنوں سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ لڑکوں کے لیے کوئی شرط نہیں رکھی جاتی۔ لڑکی نہیں ہوئی عذاب ہو گئی اور آپ ہی کے سماج نے اسے بے رحم نام دے رکھے ہیں۔ فاحشہ، طوائف، برنڈی، داسی، کلنگنی۔ یہ سارے نام مرد کو کیوں نہیں دیتے۔؟ سب سے بڑا دلاں اور بھڑوا تو مرد ہے۔ فاحشہ، طوائف، کلنگنی یہ سارے نام مرد پر

فٹ بیٹھتے ہیں۔ کیوں کہ ساری زندگی سبھی سبھی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے ہمیں، تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ اپنی مرضی کی زندگی نہیں جی سکتی۔ سے ایک مرد کا خدم بننا ہوتا ہے۔ اس کے بچوں کو پاتا ہوتا ہے۔ مرد کیوں نہیں پاتا بچوں کو؟ کھانا کیوں نہیں بناتا؟ بیوی کو چائے کیوں نہیں پیش کرتا؟ گھر کیوں نہیں سنبھالتا۔ ہم آواز اٹھائیں تو آپ مذہب، شریعت اور موٹی موٹی آسمانی کتبیں سے کرا آ جاتے ہیں۔ ان کتابوں میں مرد کو کیوں نہیں بتایا جاتا کہ وہ عورت کے ساتھ خوش رہے۔ عورت کو ہی بتایا جاتا ہے کہ شوہر کی خوشی میں ہی اس کی تقدیر کی تعویذ پڑی ہے۔ کمال سے شادی کی تو تقدیر کی یہ تعویذ اتار چھین گئی۔ کیوں کمال؟

کمال یوسف نے زور کا قہقہہ لگایا۔ 'شادی سے پہلے مانا ہوا تو سوچتا تھا کہ ایسی پاگل اور عجیب و غریب لڑکی شاید دنیا میں نہ ہوگی۔ مدتوں کا سلسلہ طویل ہوا اور بات شادی تک پہنچی تو نابید نے صاف طور پر کہہ دیا۔ ۸ بجے اٹھتی ہوں۔ بیڈنی مجھے تم دو گے۔ ناشتہ میں بنا دو گی۔ شادی کے بعد بھی ہم دو دو گے جو گے جن کی اپنی اپنی آزادی دنیا نہیں ہوتی ہیں۔ میں ٹھہرا، مذہبی گمراہی میں آنکھیں کھولنے والا۔ ایسا گمراہ جہاں آج بھی بہشتی زیور کی حکومت چلتی ہے۔ وہ غصہ رہا تھا۔

مجھے یکا یک احساس ہوا، کئی تصویریں ایک دوسرے میں منعکس ہونے لگی ہیں۔ یہ سارے چہرے آپس میں گزرا ہو رہے تھے۔ اب چہروں میں کہیں صدیوں کی آگ روشن تھی تو کہیں آگ سرد پڑ گئی تھی اور ان سے الگ بھی ایک چہرہ تھا۔ کمال یوسف کا چہرہ۔ مجھے یقین ہے خدائی بستی میں عورتوں کو عزت دیے والے، آزادی دینے والے ایسے مردوں کا مشینی طور پر بننا شروع ہو چکا ہے۔ تو کیا یہ صدیوں سے سفر کرتی ہوئی عورت کے احتجاج کی ہی شکل ہے کہ نئے سماج کی مشینوں نے نئے افغان کے مردوں کو اگلنا شروع کر دیا ہے؟ یہ سمجھتا ہے، وقت کی مانگ یا آنے والی تبدیلیاں ہیں؟ اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ مرد اپنی خصلت کو کب تک پوشیدہ رکھ سکتا ہے؟ اور اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ اگر ایک دن کمال یوسف بھی وہی عام سا مرد ثابت ہوا تو؟ میں نے اس طرف توجہ دلائی تو نابید ناز و زور سے ہنس پڑی۔

'آپ کیا سمجھتے ہیں، کیا ایسی صورت میں، میں ایک منٹ بھی ان کے ساتھ رہ سکتی ہوں؟ بالکل بھی نہیں۔ میں دھکے مار کر اسے گھر سے باہر نکال دوں گی۔ دھکے مار کر میں اس بات پر غور نہیں کروں گی کہ ہمارا کتنا پرانا ساتھ تھا اور اس بات کو بھول جائیے کہ میری آنکھوں میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی آنسو کا قطرہ چمکے گا۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہمیں شادی کے بعد مرد کو سوچنے والا معاشرہ ایک بیمار معاشرہ ہوتا ہے۔ جو ہم سے کہتا ہے کہ دیکھو، یہ تمہارا مجازی خدا ہے اور اس کی خوشی میں ہی تمہاری زندگی کا سفر پوشیدہ ہے۔ میں نے بڑی ہوتے ہی اس دقیانوسی کتاب کے چتھڑے بکھیر دیے۔ مرد کو سمجھنا ہو گا کہ اس کی خوشی ہماری ذات میں پوشیدہ ہے۔'

کمال یوسف آہستہ آہستہ مسکرا رہا تھا۔ جھینگر چیخ رہے تھے۔ پانچلوں اور چھروں کی بیخار بار بار پریش کر رہی تھی۔ فلیش چمک رہے تھے۔ جینٹلز اور میڈیا کے لوگ بھی کافی تعداد میں تھے۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی مگر زیادہ تر آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ آزادی کے بد کے تھکے ہوئے لوگوں میں اس انقلاب کو ایلر امیہ کی ایک موبوم سی کرن پیدا ہوئی تھی۔ مجھے اس بات سے زیادہ غرض نہیں تھی کہ یہ انقلاب بھی ہزاروں انقلابوں کی طرح پھس جاتا ہے یا اس سے اچھے نتائج کی امید کی جاسکتی ہے۔ میرے لیے اس وقت اتنا کافی تھا کہ جمہوریت میں مرتے ہوئے لوگوں کے لیے ایک معصومی لڑکی کا قتل ایک بڑے انقلاب کا گواہ بن گیا تھا۔

کندھے پر جھومتے ہوئے بیگ سے کاغذ اور قلم نکال کر کچھ دیر ادھر دھر کے نوٹس پیتا رہا۔ اس درمیان کمال

یوسف اسٹیج کی طرف نظریں کیے بغیر تقریر سننے میں محو تھا۔ ناہید ناز کے ملائم ہاتھ سوئے ہوئے بچے کو تھپکیا دے رہے تھے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ناہید ناز کے ساتھ بھی ہوا ہوگا جس نے نئی نال سے دلی آنے میں مدد کی ہوگی۔ میں پھر اسی خیال کے رتھ پر سوار تھا کہ کتنی عجیب بات، ایک مہذب دنیا میں سچ بھی معصوم لڑکیاں، بچیاں، عورتیں اپنی آزادی اور حق کا مطالبہ کر رہی ہیں اور ساری دنیا سوئی پڑی ہے۔ اپنے ہی گھر میں خوف کا پیچھا کرتے ہوئے، بڑے ہونے کا خوف، جوان ہونے کا خوف، شادی نہ ہونے کا خوف، شادی کے بعد کا خوف، طلاق کا خوف، زندگی کے سمد میں صرف خوف کے تصور تھے اور ابھی ہوئی تھیں، ہزاروں معصوم زندگیاں مر رہی تھیں۔ موت پر فتح بھیجے جا رہے تھے۔ ساہیو میں درخت اگانے کی مہم چل رہی تھی۔ انسانوں جیسے انسان پیدا کیے جا رہے تھے۔ موت پر فتح پائی جا رہی تھی اور سائنس کے ہزاروں حیرت انگیز کارناموں کے باوجود امریکہ سے ہندوستان تک خوفزدہ تھی تو عورت پریشان تھی تو عورت چار برس کی معصوم بچی بھی ہوس کا شکار ہو رہی تھی اور ۹۰ سال کی بزرگ خاتون بھی مرد کی درندگی سے محفوظ نہیں تھی۔ انتہائی بد صورت اور ناکارہ لڑکوں کو بھی شادی کے بارے میں یا بڑھتی عمر کے بارے میں سوچنا نہیں پڑتا تھا اور حسین لڑکیوں کی شادیاں بھی معاشرے میں عذاب بن کر رہ گئی تھیں۔

ایک دوزخ سے نکل کر دوسری دوزخ میں داخل ہونے کا راستہ کھل جاتا تھا۔ میں نے دیکھا، ناہید ناز بغور میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی اور یہی لمحہ تھا جب میں نے نرم نرم لہجے میں دریافت کیا کہ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ کیا اس کی زندگی میں بھی آیا ہے۔؟ وہ جیسے میرے اسی سوال کے جواب میں تھی۔ چھوٹے ہی اس نے دوسرا سوال میری طرف داغ دیا۔

’کیا دنیا میں کوئی لڑکی ان حادثوں سے محفوظ بھی ہے؟ کسی ایک لڑکی کا نام بتا دیجئے‘ وہ ہنس رہی تھی۔ جب سے دنیا بنی ہے۔ ایسی کوئی لڑکی بنی ہی نہیں۔ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی شہد کی طرح ایک جسم لے کر آ جاتی ہیں اور سب سے پہلے اپنے ہی گھر میں اپنے پیٹھے جسم پر چبھتی اور ڈستی ہوئی آنکھیں پڑھتے ہوئے خوفزدہ ہو جاتی ہیں جو عورت اس سچ سے انکار کرتی ہے وہ جھوٹ بولتی ہے۔ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ مرد اپنی فطرت بدل ہی نہیں سکتا۔

’اور آپ کے شوہر؟‘

’وہ بھی شوہر نہیں ہیں خدا کے لیے انہیں شوہر نہ کہئے۔۔۔ وہ میری بیوی ہیں۔‘ ناہید نے کھٹکھٹ کر جواب دیا اور اب میری حرمت میں ہیں۔ کیوں کمال کمال یوسف نے قہقہہ لگایا۔

ناہید کے چہرے پر پھر سے شکن نمودار ہوئی تھی۔ لڑکے اپنے گھروں میں کیوں نہیں ڈرتے۔ پھر تو لڑکوں کو آزادی ملتی ہی چلی جاتی ہے۔ ناجائز آزادی۔ اور لڑکی۔ کیوں آپ اور آپ کا مذہب صرف ان پر ہی بندش اور پہرے بٹھاتا ہے، مردوں کو بے لگام کر دیتا ہے۔

میں نے پہلی بار ناہید ناز کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ایک سافٹ معصوم چہرہ۔ عمر یہی کوئی ستائیس اٹھائیس کے قریب۔ تھپانچ فٹ دواچے سے کچھ زیادہ۔ ستواں بدن۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ ایک کشش بھی تھی۔ کیا یہی وہ کشش تھی کہ مرد کے لیے عورت کا چہرہ اور وجود دیکھتے ہی دیکھتے ایک جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔؟

ناہید کی آنکھیں نیلے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے پٹ کر پھر میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی ’وہ میرے باپ بھی ہو سکتے ہیں، بھائی بھی اور یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہاں بھی دوسری لڑکیوں یا

عورتوں کے لیے ایک چور مرد ضرور رہتا ہے۔ میرا احتجاج اسی بات پر ہے کہ وہ چور مرد آتا ہی کیوں ہے عورت کا وجود ہی جسم کیوں بنتا ہے، مرد کا وجود جسم کیوں نہیں بنتا۔ آپ نے ابھی سوال کیا، کیا کوئی ایسا حادثہ میرے ساتھ بھی ہوا ہے ہاں ہوا ہے۔ نہ ہوا ہوتا تب بھی میں اس احتجاج میں ضرور شامل ہوتی

کمال پوسٹ نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اب وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔

’میں جس دفتر میں کام کرتی ہوں، وہاں کا حادثہ ہے یہ۔ شام کے سات بج گئے تھے۔ عام طور پر میں پانچ بجے دفتر چھوڑ دیتی تھی۔ اس نے مجھے روک کر رکھا تھا۔ آفس کے زیادہ تر اسٹاف جا چکے تھے، مگر آٹھ دس لوگ ابھی بھی اپنی اپنی سیٹوں پر موجود تھے۔ سات بجے اس نے مجھے طلب کیا۔ میں کمرے میں گئی تو پتہ نہیں کیا سوچ کر اس نے دروازہ بند کیا۔ میں نے سمجھا کوئی خاص بات ہوگی۔ کوئی ایسی راز کی بات ہوگی جو اس اوروں سے خفیہ رکھنا چاہتا ہے۔ مجھے اس وقت تک اس کی نیت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں مسکرا رہی تھی۔

’دروازہ بند کیوں کیا؟‘

وہ مسکراتا ہوا سوالیہ نشان سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اب آپ، تنی بھولی بھی نہیں کہ آپ کو بتانے کی ضرورت ہو۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ پہلی بار شدت سے مجھے خوف کا احساس ہوا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ پتہ نہیں کیا کیا اول فوس بول رہا تھا۔ میری پروموشن ترقی سیکری میں اضافہ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا اور اچانک اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کو تھم لیا۔ یہ ایک غیر متوقع حسد تھا اور میں اس کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ میں نے اس کو دھکا دینے کی کوشش کی تو اس نے مجھے صوفے پر گرا دیا۔ لیکن اپنا تو وزن کھو بیٹھ اور میرے لیے یہی لمحہ زندگی ثابت ہوا۔ خود کو بھال کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ میز پر کپ میں گرم چائے پڑی تھی اور اس سے قبل کہ وہ اٹھ کر دوبارہ مجھ سے دست درازی کی کوشش کرتا میں نے گرم کھولتی ہوئی چائے اس کے چہرے پر اچھال دی۔ ناہید ناز کے چہرے پر سلو میں نمایاں ہو گئی تھیں میں سانس روکے ناہید ناز کی کہانی سن رہا تھا۔

پھر کیا ہوا؟ پھر تو آپ دروازہ کھول کر بدحواسی کے عالم میں گھر روانہ ہو گئی ہوں گی؟

’نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں کیوں گھر بھاگتی! میں نے کیا جرم کیا تھا۔ جرم اس بدذات نے کیا تھا۔ کھوتی ہوئی چائے نے اس کے چہرے کو کھسا دیا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں تھم کر زور سے چلایا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ آفس میں موجود اسٹاف کے لوگ بھاگتے ہوئے کمرے میں آئے تو میں پولیس کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

وہ صوفے پر چڑھتا ہوا تپ رہا تھا۔ پانی اس کی آنکھیں گرم کھولتی ہوئی چائے سے جھلس گئی تھیں۔

چائے کے چھینٹے اچھل کر دیوار تک گئے تھے۔ سفید چمکتی ہوئی دیوار۔ ایک چھپکلی نیچے آتے آتے چانک ٹھہر گئی تھی۔ پھر وہ رکی نہیں، دوسرے ہی لمحے وہ تیز تیز اوپر کی طرف بھاگ گئی تھی۔

ناہید ناز نے میری طرف پیٹ کر دیکھا۔ اب وہ ہنس رہی تھی۔ یہ چھپکلیاں برجہ ہوتی ہیں؟ کیوں؟ دیواریں نہ ہوں تو شاید چھپکلیاں بھی نہ ہوں گی۔ آپ کے گھر میں بھی چھپکلیاں ہیں؟

میں خاموشی سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ انقلاب بھی سردی کی نذر ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہوتی تھی۔ زیرک حکمران اپنے عہد کو بھیک میں آئی اُترن اور خوراک مفت بانٹنے کی بجائے قیمت یاد کرتے تھے۔ “میزبان نے ہنگامی لی۔ اُس کے چوڑے بوجھل ہورے تھے۔ مہمان استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے رہا۔ وہ دوبارہ بول پڑا۔ ”گورے کی اُترن سے بڑی ناگوار ہند آیا کرتی۔ میری ماں کو اُترن سے سخت نفرت تھی۔ پڑوسن سے اکثر بحث ہو جایا کرتی۔ اُس کا شوہر اور دونوں بیٹے بڑے بڑے خوبصورت کوٹ پتلونیں پہن کر خوب بن ٹھن کے نکلتے۔ میری ماں کا خیال تھا کہ غیر مسلموں کے پسینے کی بدبو اُن کے کپڑوں میں رچی رہ جاتی ہے۔ پڑوسن خانہ بھی میری ماں کی طرف بڑی کٹڑ مذہبی عورت تھی۔ کہا کرتی، کیا کریں، بہن حلیمہ! مجبوری ہے۔ میں گرم کپڑے دھونے کا فرسولا جانتی ہوں۔ رشتوں کا مسئلہ تیار کر کے سوڈے اور کھولتے پانی میں جوش دینے اور پھر گلہ پڑھ کر کپڑے شربا کرنے سے پیدید ڈھل جاتی ہے۔ گلہ پاک کی برکت سے ہی ہم مسلمانوں کے پسینے سے بدبو نہیں آتی، خواہ پورا سینا نہ نہائیں۔ میری ماں فوراً ہی تائید میں سر ہلا دیتی اور کہتی، ٹھیک کہتی ہو، بہن! شکر ہے اللہ پاک کا کہ ہم مسلمان پیدا ہوئے۔ اب یہی دیکھو کہ انگریز عورتیں اور مرد بالکل سونے اور ہیرے جواہرات کی طرح خوبصورت لگتے ہیں، لیکن سنا ہے، نزدیک جانے سے مرے ہوئے پڑے کی سڑاند آتی ہے۔ خالہ سیکندہ جواب دیتی، بے شک۔ اب کیا کریں؟ مجبوری ہے۔ تیرا بھائی سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک ہے اور بھانجے کاٹ میں پڑھتے ہیں۔ بندے کو عزت دینی پڑی ہے، ورنہ گلہ گو ہو کر غیروں کی ناپاکی کھٹی نہ دھوتی۔“

ثالث اللہ کے بوں سے کھوکھلا قبیلہ برآمد ہوا۔ سیدھا ہاتھ پھیلا کر پانچوں انگلیوں اکڑائیں اور منٹھی بند کر لی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تیرتی نمی کی ادٹ سے سرخ ڈورے جھانک رہے تھے۔ کہنے لگا، ”ہم وہ بد قسمت قوم ہیں، جنہیں حضرت عمر فاروقؓ جیسا حکمران ملا اور نہ ہی کارل مارکس، لینن یا ماؤ جیسی لیڈر۔ ہمارے ساتھ اسلام اور سوشلزم کے نام پر برابر دھوکے ہوئے۔ میں بڑا انقلابی مزدور لیڈر بن گیا۔ تابندہ اُن دنوں جواں تھی، بڑی جوشیلی اب تھک اور نڈر ور کر۔ گارمنٹس فیکٹریوں کی خواتین مزدوروں کو منظم کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ حکومت وقت نے ہمارا قبلہ درست کرنے کی ٹھان لی اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ میرے جسم پر زور پھیر گیا اور جب تسلی کر لی کہ نس نس سے انقلابی گرمی کا فور ہو گئی ہے تو رات کے پچھلے پہر سرکاری کارندے مجھے میری کھوئی میں واپس ڈال گئے۔ ایک روز اچانک تابندہ بھی آ گئی۔ اپنا ملاحظہ کرواتے ہوئے بولی، دیکھو ثالث اللہ! درم آ جانے سے تفتیش رک گئی۔ مگر تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم ڈر کر انقلابی جدوجہد سے تائب ہو گئے۔ نو جن ذرا کم ہوئے تو اسی جوش و جذبہ سے تمہارے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر استحصالی قوتوں کے خلاف ڈٹ جا دیں گے۔“

نہر آلود آنکھوں میں جھللاتی پانی کی چادر کناروں سے چھٹک گئی۔ لب کپکپائے اور الفاظ سنائی دیے۔ “کا۔ گوجراں کا ثالث اللہ گجر، جو نو جوانی میں دوستوں سے شرطید کرات کو دیرنوں میں چڑیلوں اور جنات سے بھڑ جانے کو تنہا چل دیتا تھا، اُس روز اپنی کامریڈ ساتھی سے پیٹ کر بہت رویا۔ میڈیکل اُن فٹ ہونے پر فوجی ڈکٹروں سے کہا تھا، ”سر! اگر میری ٹانگوں میں معمولی تنگی ہے تو کیا ہوا؟“ مجھے آخری سانس تک جم کے لڑتا ہے، میدان سے بھگنا ہی نہیں۔ میجر نے ہنس کر جواب دیا تھا، دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے پوری قوت سے بھگنا پڑتا ہے۔“

گہری سرد آہ سنائی دی اور خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد بوڑھا کامریڈ بول پڑا، ”جس کڑیل جوان کی آمد پر آسیب زدہ جگہوں سے بھوت پریت بھاگ کھڑے ہوتے تھے، وہ ریاستی جبر کی تاب نہ لا سکا۔ تابندہ کمزور پڑنے کی بجائے مجھے تھکتے ہوئے تسلیاں دل سے دیتی رہی۔ درد کے نلحات میں مجھ پر ایک اور حقیقت کھل گئی۔ بہادری کسی

مخصوص قوم کی میراث نہیں۔ جس کمیونی کا ہم مذاق اڑایا کرتے اور بزدلی کے طعنے دیتے نہ تھکتے تھے، اس کی عورت مجھ سے ریہہ بہادر ثابت ہوئی تھی۔ دراصل ہمیں تاریخ ہی ایسی پڑھائی گئی تھی ہم باور کر بیٹھے تھے کہ جو کوئی جتن اکٹرا جھگڑا لڑا اور وحشی ہو، وہ اتنا ہی بہادر ہوتا ہے۔ بہر حال، میں اور تابندہ ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ تعیناتی ایجنسی کو حلف نامہ لکھ دیا کہ ہم گمراہی کا رستہ ترک کر چکے اور تجدید ایمان کے بعد کچے سو من ہو گئے ہیں۔“

خادمہ کے اندر آنے سے گفتگو میں تعطل آ گیا۔ چائے صرف مہمان کے آگے رکھی، تاہم دیگر لوازمات سے میز بھر دی۔ انوار، محمد کو میزبان کی باتوں میں تکی دیکھی محسوس ہونے لگی کہ کھانے پینے کی طرف خاص توجہ نہ رہی، البتہ میزبان کے اصرار پر تکی ہوئی چھٹی کے چند قہقہے لے لیے، جب کہ اس نے خود اپنی پیٹ میں مٹن ٹکڑوں کی ڈھیری لگالی ور کھاتے ہوئے بولنے لگا۔ ”جن دنوں میں پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا، اندھ جانے کن ذرائع سے بڑی آسان اردو میں لکھی تصویریں کہانیوں کی کتابیں ہم تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ سب سے پہلے ہاتھ آنے والی کتاب کی کہانی آج بھی یاد ہے انقلاب چین کے بارے میں تھی۔ ایک دیہاتی عورت چوری چھپے اپنی مرغیوں کے غڈے جمع کر رہی ہوتی ہے کہ مخبری ہوے پر اچانک چھاپا پڑ جاتا ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے اہل کار کٹیا سے اندھے برآمد کر کے حق سرکار ضبط کر لیتے ہیں۔“

ثنا اللہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ذرا سا توقف کر کے بولا ”سرخ انقلاب کے حوالے سے ایسے ہی زور فرسالیئے گردش کیا کرتے تھے۔ جب کہ ہم نے شعور آنے پر یہی پڑھا اور سمجھا کہ سرمایہ دارانہ نظام واقعی مجموعہ تضاد اور ہر برائی کی جڑ ہے۔ مگر ہم میاں بیوی نے نیک چال چلن کا جو حلف نامہ دیا، اس پر سختی سے کاربند ہو گئے۔ اس جارحیت پسند نظامانہ نظامی فیض ہے کہ مراعات یافتہ طبقے پر نہیں برس رہا ہے، درحقوق طبقات پس گئے ہیں۔ اس نظام کی پیداوار ایک تیسرا طبقہ بھی ہے۔ تم اس کو بچو لیا کہہ سکتے ہو۔ کمیشن ایجنٹوں، دالوں اور بھڑوں کا، جو ہر طرح کا معاملہ کروا کر خوب مال ہڈرتا ہے۔ جبکہ محنت کشوں کی جائز ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو رہیں۔ اس دنوں شغف شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے فیکٹریاں ہنٹ بھایا کرتی تھیں، جس کی آواز سنتے ہی ورکر نکل کھڑے ہوتے تھے۔ بعضوں کی عورتیں اخراجات پورے کرنے کی غرض سے گھر کا دروازہ کھول دیا کرتیں اور کچھ ایسی بھی تھیں، جو اضافی آمدنی کی تلاش میں خود چل دیا کرتیں۔ تب میں کہا کرتا: ”بچ گئے گھٹلو، چلے گئے جھڈو اور آ گئے۔“

اسی لمحے تابندہ بیگم اندر آ گئی اور بولی: ”میاں اتم نہیں سدھو گے۔ ہر وقت ہڈیاں بکتے ہو۔ سنبھل جاؤ۔ مت بھول کرو کہ اب ہم عزت دار شہری ہیں۔ ٹٹ پونچھے مزدور لیڈر نہیں رہے۔“ ثنا اللہ نے ٹوک دیا اور کہا: ”یاد ہے جان من! تم نے صحیح فیصلہ کیا۔ آخر ہمارا بھی حق ہے کہ پیش آرام کی زندگی بسر کریں۔ ورنہ یہ عالی شاں ذاتی رہائش اور اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں ہمیں کبھی نصیب نہ ہوتیں۔ تر مال کھانے کو ہر انسان کا دل چاہتا ہے۔ اور میں تو زور دہ پھرنے کے بعد مزدوری کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ دیسے ہی کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کسی زمانے میں ہر شہر کے اندر مخصوص علاقہ ہوا کرتا تھا۔ جیسے لاہور میں ہیرا منڈی، راولپنڈی میں رتہ اور کراچی کی نیپئر۔ اب یہ سہوستان پورے ملک کے تقریباً ہر علاقے میں بآسانی میسر ہے۔ جس معاشرے میں معاشی انصاف نہ ہو، وہ اسی طرح ایک حافظ سے سارے کا سارا ہی قہہ خاند بن جایا کرتا ہے۔ اب تو عرصہ سے گھٹا بجانے کا رواج ہی نہیں رہا۔ جب، جہاں اور جس وقت کوئی چاہے، حاضر کہاں گئے تھدیں مشرق کے کھوالے؟ کیوں نچت بیٹھ گئے؟؟ صرف ہمارا قبلہ درست کر کے ہی سرخرو ہو گئے۔“

تا بندہ بیگم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ”فیض احمد فیض نے کیا بول دیا یہ داغ داغ جا۔ سب ٹھلے کے پیچھے پڑ گئے۔ ہم کیا کریں؟ جو بن پڑتا ہے، کرتے ہیں۔ تم ہی بتلاؤ، سراسر حرام نظام میں حلال طریقے سے ڈکھی انس نیت کی خدمت بھلا کیسے کریں؟ اصوص بنا رکھا ہے کہ کوئی بھی حرام خور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا پائے۔ کتنے ہی شریف گھرانوں کی عزت بچئی۔ ہمیں خود کنواری بیٹیوں کو رات کے اندھیرے میں لے آویں۔ پاؤں پکڑ کے آنسوؤں کی برسات میں فریاد کریں کہ کوئی ایسا عزت دار خلی مل جاوے، جو جہیز کے دام دے سکے، مریوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ورنہ عزت دو کوڑی کی نہ رہے گی۔“ ذرا توقف کر کے بیگم دوبارہ بولنے لگی ”یہاں ہر دوسرے شریف بندے کی تاؤ منجھدار میں پڑی۔ بہت سوں کی پارلگادی۔ بچیاں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ ہم خود بے اولاد ہیں لیکن بچیوں کی حفاظت سنگی ماؤں سے زیادہ کریں۔ یہی دیکھ لو اودہ حرام خور بڑھا جو گزشتہ روز آیا، حواس باختہ ہوا بکے گیا کہ بڑا عزت دار ہے، جو بیٹیوں کا باپ۔ کوئی پہچان نہ لے۔ عزت خاک میں مل جاوے گی۔ ہم نے بول دی: بڑے میاں! جمع خاطر رکھو، ہمارے پاس آویں ہی صرف عزت دار لوگ۔“

لحہ بھر کو کچھ سوچا ور خاتون خانہ بولی ”ارم“ ناگوندھ رہی تھی۔ ہم نے بازو سے پکڑا اور لے آئے۔ ہاتھ ڈھلا کے پرفیوم لگائی اور کہا، چل، جھٹ سے حرمی بڑھے کو بھٹکتا۔ مہینے بھر سے تیرے گھر کی بجلی کٹی ہوئی ہے۔ یہ بے بل کی پوری رقم اُدھر جھڑوس کو اخراج ہونے لگا۔ خند ط کیا خاک ہو، تھ۔ جھک ماری، بخت میں ارم کو مزید نوٹ تھما۔ بے اور نکل بھاگا۔ بدحواسی میں گاڑی ریورس کرتے ہوئے جنگلے میں دے ماری مگر پٹ کر نہ دیکھا۔ یہ بات ہم بھی مان گئے کہ یوں بے دریغ سخاوت حرام مال سے ہی ہو سکے۔“

انوار احمد دم بخود ہوا، بوڑھے میز پاس جوڑے کو دیکھے گیا۔ ہنسی کی اور ردنا بھی۔ سوچنے لگا کہ فضیلتوں بھرے معاشرے کے ہر فرد کو عزت کی پڑی۔ مجھ سمیت بیگم نے میاں سے کہا ”سو پارکھا ہے، خود کو بھڑوامت بودہ کر دے۔ تم سے آج تلک ایک بار بھی بھڑوا گیری کروائی ہو تو بولو“ ”ٹاٹا نے گردن یوں ڈاس رکھی تھی گویا ڈیپریشن حاری ہو۔

بیگم برا دراست انوار احمد سے مخاطب ہو کر بولی ”میاں صاحب زادے! تم نے بولا، کسی بڑے صدے سے گزرے ہو ور ہفتہ دس دن کے لیے گھر سے دور چلے آئے۔ بہت اچھا کیا۔ وقت اور مقام کے بدل جانے سے غم کی شدت میں کمی آ جاوے۔ ہم نے خوب سوچ سمجھ کر تیرا غم بھلنے کو مناسب ساتھی کا انتخاب کیا۔ بہت سلیبھی ہوئی پڑھی لکھی بچی ہے۔ بس یہ کہ شوخ اور ماڈرن نہیں، نو دولتوں کی لڑکیوں جیسی۔ باپ سفید پوش ہے۔ جہیز اکٹھا کرتے کرتے دل کا مریض ہو گیا۔ بڑے دایوں نے باتوں باتوں میں ریفری جریز وغیرہ کا بھی مطالبہ کر دیا۔ باریت کی دعوت کے لیے جو پائی پائی جوڑ رکھی تھی، اس میں سے بھی کچھ رقم عداج معا بے پر خرچ ہو گئی۔ منگیتر نے اپنی ہونے والی بیوی سے کہہ دیا، میری جان بچا اپنے ابا اور اماں کو مجبور کرو، کسی بھی طرح ہماری عزت رکھو۔“

مہربان خاتون نے کھنڈ بھر کو انوار احمد کی آنکھوں میں غور سے دیکھا اور کہا ”تم دیکھنے میں بہت بھلے لگو ہو۔ ہم جانیں، ہمارا گمان بچ ثابت کر دھاؤ گے۔ زیادہ کالا لچ نہیں، بس یہ کہ بچی اب اپنے گھر کی ہو۔ اسی میں بھی کی عزت ہے۔“

میں بائیں سارہ حنائی ڈیلی تلی کھلتی ہوئی رنگت والی قبول صورت لڑکی سنی سنائی بیٹھی تھی۔ انوار احمد کو اچھی لگی۔ اس کی شخصیت میں ایسی کرشماتی کشش موجود تھی جو ہم کلام ہونے والی عورت کو بہت جلد اپنی جانب متوجہ کر لیتی۔

لیوں پر افسردہ مگر دلفریب مسکراہٹ سجا کر دھیمی آواز میں بولا: ”جنا! تم نے کبھی ریل کا لمبا سفر کیا ہے؟“ جانا نے اس پر طائرانہ نظر ڈال کر سر کو ہلکی خوش وی اور بولی: ”ہاں! تاتیا با کے ہاں اسد م آیا جب بھی گئے، ریل گاڑی سے ہی سفر کیا۔“ لنگاہیں دوبارہ مٹنے پر وہ شرما گئی تاہم مسکرا بھی دی۔ انوار نے ہاتھ یوں بڑھایا گویا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ جانا نے اسی لمحے ہاتھ مٹا دیا۔

ہاتھ میں ہاتھ پیتے ہی انوار احمد نے آہستی سے جانا کو اپنے پہلو میں کھینچ لیا اور کہنے لگا: ”نسائی زندگی بھی ایسی ہی ایک سفر ہے۔ راستے میں کئی چھوٹے بڑے اسٹیشن آتے ہیں۔ کہیں جھٹ پل کو گاڑی رُک جاتی ہے، کہیں ذرا زیادہ دیر کا پڑاؤ ہوتا ہے، جب کہ بعضوں پر رکتی ہی نہیں اور اسی رفتار سے ٹھکا ٹھک کے روہم پر فرار لے بھرتی نکل جاتی ہے۔ طرح طرح کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ پہاڑ، میدان، دریا ندی، ماے، کھیت اور باغات، چھوٹے بڑے دیہات، قصبے اور شہر۔ بنجر زمینیں، کھنڈرات، اکیسے دو کیسے مکانات اور سڑکیں۔ کہیں جنگل بیابان ویرنے اور ریگستان۔ چرند پرند اور انسان۔ خانہ بدوش کے ڈیرے اور قافلے۔ نہ جانے کیا کیا۔ لیکن چلتی ٹرین میں سوار انسانوں کو صرف اُن سے واسطہ پڑتا جو اُس وقت اُن کے ہمسفر ہوں۔ بعض تھوڑی دور ہی اگلے اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں اور کئی-کئی منزل تک ساتھ رہتے ہیں۔ ہماری تھوڑی دور تک کا یہ بہت لمبی مسافت کا، باہم خندہ پیشانی سے پیش آنے پر کٹھن سفر بھی نسبتاً خوش اسلوبی سے گٹ جاتا ہے۔“

انوار نے ذرا توقف کیا۔ اُس کی مسکراہٹ قدرے گہری ہونے سے سوہوم سی افسردگی معدوم ہو گئی۔ کہنے لگا: ”میرا اور تیرا یہ سفر اس اعتبار سے منفرد ہے کہ سلیپرز کلاس کے ہم دو ہی مسافر ہیں۔ سفر مختصر سی لیکن ہم اسے خوش گوار بنا سکتے ہیں۔“ جانا مسکوری ہوئی اس انوکھے ہمسفر کو دیکھے گئی۔

رات کا ستانا بچ لیتے لگا۔ ٹرین پوری رفتار سے جنگل ویرانوں کی وسعتوں کی کوچیڑی، اُڑتی چلی جا رہی تھی۔ کسی کسی لمحے انجن کی کھٹی کھٹی دسل سنائی دے جاتی۔ گمان گزرتا کہ غیر معمولی لمبی ریل گاڑی کی آخری بوگی کے کپار ٹنٹ میں محو سفر دونوں ہمراہی منزل سے یکسر غافل ہو چکے ہوں۔ ٹھکا ٹھک کی بلند ہوتی آواز کے ساتھ ہی ہلارے آنے لگتے اور دسل سنائی دینے پر آنکھیں نیم وا ہو جاتیں۔ کھڑکی کے اندھے شیشوں پر بوڑھے مایوس مزدور لیڈر کا دھندلا عکس نمودار ہو جاتا۔ لیوں کی ہلکی جنبش کے ساتھ ہی بڑبڑاہٹ برآمد ہوتی: ”بج گئے ٹھکو“

آخر کار انوار احمد سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور زپر لب بولا:

”اسٹاپ اٹ کریزی اولڈ مین! آگے بڑھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ غم آلود سمندری ہوا کے تیز جھونکے چہرے سے چھونے لگے۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ہماری نے پیچھے سے آکر چپکے سے ہاتھوں کے چلتے میں لے لیا۔ انوار نے پٹ بند کیے، دیز پر دے کھینچ کر شیشے ڈھانپ دیے اور انہی قدموں پر گھوم گیا۔

☆.....☆.....☆

سید باب

عبدالصمد

موبائل پر بات کرتے کرتے چانک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ موبائل بند کر کے اس نے کچھ سوچا، پھر
'ٹھہ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، بیوی غور سے اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہی تھی، آخر وہ پوچھ بیٹھ گئی۔

”کیا ہو؟“

”بھوت!“

مرد کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

”بھوت؟“

بیوی کے منہ سے بھی بے ساختہ نکلا۔

”ہاں شاید“

مرد کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اپنی بات خود اسے ہضم نہیں ہو رہی۔

”مطلب؟“

بیوی کچھ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”مطلب کیا، جو حالات ہیں ان سے تو۔“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ شاید اسے اپنا جملہ مکمل کرتے اچھا نہیں لگا۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ بیوی تک اس کی
ترسیل ہوگئی ہے۔ وہ مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔

”کچھ بتاؤ تو شاید بھوت کو پکڑنے میں، میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں“

اس نے غور سے بیوی کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا، شاید وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے، اس نے سوچا، سے بتا ہی دینا

چاہئے۔

”ارے بھائی، بچے جس طرح غائب ہو جاتے ہیں، اسے آخر کیا کہیں گے؟“

”پھر ملتے نہیں گیا۔۔۔؟“

بیوی کا لہجہ ابھی تک وہی تھا، یعنی غیر یقینی۔

”کچھ مل بھی جاتے ہیں، مگر ان کے جسموں سے خون، آنکھوں سے زندگی اور دماغوں کی روشنی نکلی ہوتی ہے۔“

اس نے جو کچھ سنا تھا، بتا دیا۔

”بتاتے نہیں، ان کے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟“

بیوی بھی اب قدرے سنجیدہ ہوگئی۔

”اس قابل نہیں رہ جاتے“

یہ بات بھی اس نے سنی تھی۔ بیوی کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ شاید وہ جو کچھ سمجھ رہی تھی، وہ بات تھی نہیں، مگر اسے شوہر کے بڑھتے ہوئے اضطراب کے سبب باب کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔

”یہ سب باتیں، بتاتے کون ہیں...؟“

”سارے لوگ“

مرد کو اس کا سوال شاید بے تکالفاً، بیوی پھر کچھ سوچنے لگی۔ اصل میں بھوت والی بات سے کسی طرح ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ اسی کی طرح اس کے شوہر کو بھی یہ بات بیچ نہیں رہی ہوگی۔ پہلے بہت پہلے، وہ اپنے وطن میں، اپنے اس دیہی مکان میں رہتے تھے جہاں چھوٹے بڑے کھیریل مکانوں کی ایک قطار سی تھی، اور بڑا کھڑا گلیاں، پرچہ راستے، بجلی و جلی تو تھی نہیں، گاؤں شام ہی سے سو جاتا، صرف ان مکانوں میں کچھ جاگ ہو رہی ہوتی جہاں کر اس تیل کے دیے میسر ہوتے یا چھوٹی چھوٹی موم بتیاں، وہ بھی اس وقت تک، جب تک لوگ کھانا پینا ختم نہیں کر میں یا اکا دکا ایسے طالب علم جن کے والدین کو کچھ عقل اور کچھ دولت و دیعت ہوئی تھی اور جو شہر کے اسکول میں پرائیویٹ امتحان دینے کی تیاری میں مصروف ہوتے۔

مرد کو اچانک کچھ یاد آیا۔

”میں ذرا چرچ والی مسجد کے امام صاحب کے پاس جاتا ہوں...“

”امام صاحب کے پاس...؟ ان کا اس سے کیا تعلق...؟“

اس کی بیوی حیران ہوئی۔

”شاید وہ کچھ بتائیں کچھ گائیڈ لائن دیں“

وہ جوڑے کے قسے باندھتے ہوئے بول۔

”یعنی؟“

وہ اپنی حیرانی کو کسی طرح دور کرنا چاہتی تھی۔

”افوہ! آخر بھوت جنات کے بارے میں کون جلائے گا؟“

مرد جھنجھلا گیا۔ بیوی کو یاد آیا کہ گاؤں میں دو مسجدیں تھیں۔ ایک آبادی سے ذرا دور تالاب کے پاس کالی مسجد تھی۔ اس نام کی وجہ تسمیہ بظاہر اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ کائی جتے جتے اس کے درو دیوار بالکل سیاہ ہو گئے تھے۔ اسے صاف کرانے کی کوئی ہمت نہیں کرتا تھا۔ مشہور تھا کہ وہاں جنات کا ڈیرہ ہے۔ وہاں کوئی نماز پڑھنے بھی نہیں جاتا تھا، بلکہ وہاں سے گزرتے وقت کوشش کی جاتی کہ تیزی سے نکل جائیں۔ اشد ضرورت ہی کے تحت اس راستے کو اختیار کیا جاتا۔ جانے کے پہلے، درمیان اور جانے کے بعد جتنی دعائیں یاد ہوتیں، سب کا ورد کیا جاتا۔ جنہیں وہاں سے گزرنے کی مجبوری تھی، انہیں تو ساری آیتیں اور دعائیں اذیر ہو گئی تھیں۔

مسجد کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ کچھ مفروضے، کچھ کہاوت کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ بچوں کو اس کے نام ہی سے ڈرایا جاتا اور بڑے بھی کوشش کرتے کہ اس سسے میں زیادہ باتیں نہ کی جائیں۔ رات میں تو اس کا خیال آنے ہی پر لوگ لرز جاتے۔ لہذا آبادی کے بچوں بیچ جو مسجد تھی، وہ آباد بھی تھی اور اس کے امام اور مؤذن کالی مسجد کے بھوتوں کو بھگانے کی ترکیبوں سے واقف بھی تھے۔ بڑے بھوت امام صاحب سے بھاگتے، چھوٹے مؤذن صاحب

سے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی جن یا گاؤں کی زباں میں بھوت کے چکر میں پڑ ہی جاتا۔

بیوی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ تو ان باتوں کو ماننا ہی نہیں تھا بلکہ مذاق اڑاتا، پھر کس بات کے لیے امام صاحب کے پاس گیا ہے۔ اس نے پوری بات بتائی بھی نہیں تھی۔ یوں بھی یہاں بھوت و دوت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ہزاروں میل دور اپنے وطن کے بھوت کے بارے میں بتانے گیا ہے تو پچارے امام صاحب، حتیٰ دور کے غیر ملکی بھوت کا کیا بگاڑ لیں گے۔ وہ تو ایسے کبھی نہیں تھا۔ بس چند منٹوں میں ایسی کایا پیٹ ہو گئی کہ

اس کا سواکل دور میز پر رکھا تھا۔ اس نے دوڑ کر اٹھ بیا اور مرد کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ نمبر نہیں لگا، اس نے پھر کوشش کی، بار بار کوشش کی، نمبر نہیں لگا۔ تھک ہار کر اس نے کوشش چھوڑ دی۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس سے کیا کہتی۔ منع تو کر نہیں سکتی تھی، ایک اضطراب کے عالم میں وہ نکلتا تھا، اسے پریشان کرنا مناسب نہیں تھا، کچھ دیر میں وہ آ ہی جاتا۔ ابھی اس کی سوچ کا سفر جاری ہی تھا کہ وہ آ بھی گیا۔

”بہت جلدی آ گئے.....؟“

”میں ان کے پاس گیا ہی نہیں، راستے ہی سے لوٹ آیا.....“

مرد تھکا ہوا سادہ یوان پر لیٹ گیا۔

”جب گئے ہی تھے تو پھر مل ہی آتے“

اس نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا شاید

”سوچا، مام صاحب کے سوالوں کا میرے پاس کیا جواب ہے۔ ان کے سوالوں کی پٹاری بھی تو بھری ہو

گی“

اس کی آواز میں شکست خود دگ تھی۔

”آخر تم ان سے کیا چاہتے تھے؟“

”کیا چاہتا تھا؟ بس ان سے مشورہ کرتا، دریافت کرتا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے“

وہ ایک لمحہ کے لیے لڑکھڑا گیا تھا، پھر فوراً ہی سنبھل گیا، بیوی نے تمسخر بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور زیراب

تبسم کے ساتھ بولی۔

”تم تو ان باتوں کے قائل ہی نہیں تھے، آئی مین، بھوت اور جنات وغیرہ کے۔ وہاں بڑی مسجد کے مام

صاحب کا تو تم مذاق اڑاتے تھے کہ ان کی پھونک پھونک سے کوئی بھوت و دوت نہیں بھاگتا، پھر؟“

”قائل تو تم بھی نہیں تھیں“

مرد نے اس کی باتوں پر فوراً بریک لگایا۔

”وہ تو بے بھی نہیں ہوں، مجھے تو تمہاری حالت پر فسوس آتا ہے“

عورت اب خاصی سنجیدہ ہو چکی تھی۔ مرد نے اس کی طرف غور سے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔

”بہت دنوں سے میں یہ باتیں سن رہا تھا۔ تمہیں نہیں بتایا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ آج تو اتفاق سے تم نے

سن میں.....“

مرد اب اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا۔

”بچے آخرا تھے دنوں سے غائب ہو رہے ہیں تو لوگوں نے اس کا پتہ نہیں کیا؟ ان کے ماں باپ کو نیند کیسے آتی ہے، انہیں چسپن کیوں کر نصیب ہوتا ہے؟“

شاید عورت کو اب بھی اس بات پر پورا یقین نہیں تھا، وہ جرجر پر اتر آئی۔ مرد کی آنکھوں میں بے بسی کی ایک ہر سی دوڑ گئی، وہ آہستہ سے بولا۔

”وہ اپنی ساری کوششیں کر کے تھک چکے ہیں۔ جو بچے واپس آتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ“

”ابھی، مجھے تو یقین نہیں آتا“

”یقین تو مجھے بھی نہیں آتا، یاد ہے، گاؤں میں اس قسم کے واقعات رونما ہو جاتے تھے، کالی مسجد کے پاس

مرد کو پتہ نہیں کیوں اس وقت وطن کی یاد آ گئی۔

”لیکن تم تو اس وقت بھی اس کا یقین نہیں کرتے تھے۔“

عورت نے نکمپیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تب کی بات اور ہے، تب ہم واقعی کچھ نہیں جانتے تھے، آج بہت کچھ جاننے کے بعد بھی کچھ نہیں جانتے“

مرد نے ایک ایب جھنڈا لایا کہ عورت کو آگے کچھ کہتے نہیں بنا۔ مرد کو شاید عورت کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ عورت سوچنے لگی کہ مرد کو کیا پڑی کہ وہ اس قسم کی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر پہنچی بھی نہیں تھی کہ مرد اٹھ کر بڑی بیتابی سے کونے میں اونچی میز پر رکھے ٹیپون کو ڈائل کرنے لگا۔ سامنے نئی میز پر چار چار سیل رکھے تھے، فون کا استعمال تو کبھی کبھار ہی ہوتا، خاص طور پر اس وقت جب بہت دور باتیں کرنا ہوتیں یا نا اور نہیں ملتا۔ وہ اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

”راست کو تنہا ہرگز مست نکلنا، دروازے کو خوب اچھی طرح سے بند رکھنا، سیل ہمیشہ پاس رہے، کبھی بھولنا مست اور اور اپنے شناختی کاغذات ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا، اور بجٹل گھر پر، کاپی اپنے ساتھ“

اس قسم کی بے ربط باتیں وہ دوسرے نمبروں پر بھی کرنے لگا۔ عورت سمجھ گئی کہ وہ اپنے بچوں سے باتیں کر رہا ہے، جو دوسرے ملکوں میں رہتے تھے مگر یہ س کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پریشانی تو وطن کے بھوت کی تھی اور یہ تو کیا بھوت نے اپنا دائرہ عمل بڑھا دیا ہے؟

وطن میں بھوت بھگانے کے بہت طریقے تھے۔ بڑی مسجد کے امام صاحب اور مؤذن صاحب دونوں کے اپنے اپنے نسخے تھے۔ گاؤں کے ذی حیثیت لوگ امام صاحب سے رجوع کرتے، بقیہ مؤذن صاحب سے۔ کبھی کبھی امام صاحب کا نسخہ فیل ہو جاتا تو پھر سب لوگوں کے لیے مؤذن صاحب ہی ذریعہ نجات رہ جاتے۔ دونوں کی الگ الگ فیس مقرر تھی۔ بھوت جس معیار اور حس مرتبے کا ہوتا، نسخہ وی بی ہوتا۔ کچھ بھوت باتوں سے نہیں راتوں سے بھاگتے تھے جس شخص پر بھوت ناز ہوتا، اسی کو سراپا بھوت تسلیم کر لیا جاتا۔ سے پائے سے رسیوں میں جکڑ دیا جاتا یا پٹنگ پر باندھ دیا جاتا اور امام صاحب یا مؤذن اسے جوتے مار جاتے اور بار بار پوچھتے، وہ بھاگتا ہے یا نہیں۔ کم زور قسم کے بھوت تو دو چار جوتے ہی میں بھاگ جاتے مگر بیکڑ تو وہ رنگ دکھاتے کہ خدا کی پناہ۔ اس شخص میں پتہ نہیں کہاں سے اتنی طاقت آ جاتی کہ وہ ریش تڑا کے بھاگ نکلتا۔ یہ موقع بہت خطرے کا ہوتا۔ وہ کسی کو بھی نقصان پہنچا دیتا۔ سامنے کے کسی شخص کو اٹھا کے پیچ

دیتا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ امام صاحب یا موزن صاحب سے بہت ڈرتا۔ انہیں دیکھ کر دور بھاگ جاتا، من کے پڑھ کر پھونکے ہوئے پانی کی بوتلوں کو اٹھا کر پھینک دیتا۔ گھر والے طرح طرح کے بہانوں سے، پانی کے راز کو راز رکھ کر انہیں پلانے کا جتن کرتے۔ ان نسخوں کے علاوہ بہت سی خود کردہ ترکیبیں بھی چلی آتی تھیں، درگاہوں پر چلنے، بزرگوں کے مزار کے پائنتی کپڑے کی دھجیوں، خاک شفا کا صبح و شام استعمال وغیرہ۔

گاؤں، گھر سے اتنی دور، دیار غیر میں بھولی بسری باتیں، عورت کے ذہن کے پردے پر ابھر رہی تھیں، مگر اسے یہ یاد نہیں آیا کہ ان تدبیروں سے بھوت بھاگتے تھے یا نہیں۔ ضرور بھاگ جاتے ہوں گے، تب ہی تو ایک مدت سے یہ تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوال گڑبگڑنے لگے۔ جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں سواہلوں کے دھانگے اور الجھتے جاتے تھے۔

ادھر مرد بہت مصروف رہنے لگا تھا۔ اس کی مصروفیت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مصروف تو وہ پہلے بھی رہتا تھا، وہ بھی رہتی تھی۔ یہاں روٹی پر مکھن اسی وقت لگتا جب اس کے لیے چار ہاتھوں سے محنت کی جاتی۔ ضروریات زندگی کے حصول میں ان کے چوہیں گھٹنے کا لہجہ بندھ ہوا تھا، مگر وہ مرد کے چہرے بشرے پر ان مصروفیت کی تحریریں پڑھ رہی تھیں جن کا کوئی حساب کتاب اس کے پاس نہیں تھا۔ ان کی زندگی میں پہلی بار اس کا وقت مشترک نہیں رہا تھا۔

مرد کو زیادہ خاموش دیکھ کر عورت پوچھ بیٹھی۔

”اندرا اندر آخر تم کس غم کو اہتمام سے پاس رہے ہو؟“

مرد نے غور سے عورت کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔

”تمہیں کوئی فکر نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ تم جس چھوٹے سے پھوڑے کو زخم کی صورت دیکھ رہے ہو، اس کا وجود کم سے کم

ہماری آنکھوں کے سامنے تو نہیں ہے اور میں۔“

”مجھے تعجب ہے کہ تم اس چیز کو ہوائی یا تصوراتی سمجھ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

مرد نے عورت کی بات کاٹ دی۔

”کیوں نہ سمجھوں؟ اتنے دن ہو گئے یہاں آئے ہوئے کہ اب تو احساس ہی نہیں ہوتا، ہم یہاں، جنبی

ہیں۔ یہاں ہمیں وہ سب کچھ ملا جو اپنے وطن میں نہیں ملا، پھر کیوں نہ ہم یہاں کے بارے میں سوچیں، اپنا وطن تو اب غیر

ہو چکا ہے۔“

عورت کی ساری دلیلیں، مرد کے اندرون کو پگھلانے میں ناکام رہیں، وہ بڑی بے اعتنائی سے اس کو دیکھ رہا تھا،

عورت کے چپ ہو جانے پر، اس نے بڑے تنکھے انداز میں پوچھا۔

”تمہیں کس نے بتا دیا کہ تم یہاں محفوظ ہو۔۔۔؟“

”مان پیتے ہیں کہ ہم یہاں بھی محفوظ نہیں، لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ اس سوچ سے تو ہم دور غیر محفوظ ہو جائیں گے،

لہذا میری ماں، وطن کی بد کو وطن میں رہنے دو اور یہاں کے آرام کو غنیمت سمجھو۔“

عورت جیسے فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ مرد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”مجھے حیرت ہے، تم اتنی سی بات نہیں سمجھتیں۔ ارے بھائی، وہ بلا چوکھٹوں اور سرحدوں میں قید نہیں ہے، وہ

کسی وقت، کسی لمحہ یہاں بھی تو آ سکتی ہے۔
”یعنی بھوت؟“

عورت کے لہجے میں تسخیر تھا۔ مرد اندر اندر کھوں کر رہ گیا، مگر اپنی دفاع میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، وہ فوراً کچھ نہیں بولا، دراصل یہ باتیں اسے خود ہضم نہیں ہو رہی تھیں، پھر وہ آہستہ سے بولا۔
”یہ ساری خبریں مجھ تک پہنچ رہی ہیں، بار بار پہنچ رہی ہیں، بار بار ان کی تصدیق ہو رہی ہے، پھر میں انہیں سرے سے کیسے غلط مان لوں؟“
مرد کے لہجے میں جو بے بسی اور بے چارگی تھی، وہ عورت کے احساس کو بھی چھو گئی، اب کے اس کا انداز بدل گیا۔

”ایک بات، یہ مسئلہ تو فی الحال وہیں کا ہے، ہم تو وہاں برسوں سے گئے بھی نہیں اور شاید اب جا بھی نہیں پائیں گے، یہاں مسئلہ پیدا ہو گا تو دیکھا جائے گا۔۔۔۔۔“
”ہاں، بے شک برسوں سے وہاں نہیں گئے، لیکن وہاں جانے کا ارادہ تو کبھی ترک نہیں کیا، وہاں جانے کی تمنا تو دل میں ہمیشہ روشن رہی، پھر وہاں کے درد، وہاں کی مصیبت کو ہم کیوں محسوس نہ کریں؟“
مرد خاصہ جذباتی ہو گیا۔ عورت حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا یہ انداز اس کے لیے نوکھا تھا۔ ایک لمحہ میں وہ سوچ کی اسی سطح پر آ گئی، شاید یہ دونوں کے لیے ضروری تھا۔ اس نے پوچھا۔
”پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہاں تو اس آفت کو دور کرنے کی کچھ تدابیر بھی تھیں، کچھ نسخے بھی تھے، یہاں تو پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہئے کہ پہلے ہم وہاں کی فکر کریں یا یہاں کی۔۔۔۔۔“
عورت نے بہت کوشش سے اپنا لہجہ شیریں رکھا، یوں بات نہ کرے تلخ تھی مگر مرد اپنی دھن میں صرف اس کی شیرینی ہی کو محسوس کر سکا۔

”دونوں کی، اسے یہاں آنے میں دیر ہی کتنی لگے گی؟“
عورت سوچ میں ڈوب گئی۔ واقعی یہاں تو زیادہ سے زیادہ ۷۰٪ امام صاحب سے رجوع کیا جاسکتا تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ بھی کچھ مدد نہیں کر سکیں گے۔

شاید مرد وطن جانے کا ارادہ کر چکا تھا، اس نے اس کی خبر عورت کو نہیں دی تھی۔ بس گا ہے گا ہے وہاں کا ذکر کرتا رہتا۔ ذکر تو وہ آپس میں بہت سی چیزوں کا کرتے، مگر اکثر صرف موضوعات کو خوشنما بنانے کے لیے باتیں ہوتیں۔ عورت کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ مرد کے دل و دماغ پر وطن سوار ہے، لیکن وہ چاہت ہو کہ اس کرید میں نہیں پڑ رہی تھی۔ اس نے مرد کو نشانہ بنانے کا ارادہ بھی اب چھوڑ دیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ دونوں مل کر اس قسم کی باتوں کا مذاق اڑاتے اور مرد کا تہقہ سب سے بلند ہوتا۔ مرد کا انداز فکر کبھی کبھی اسے چارز لگتا۔ واقعی یہ معاملہ کسی انسان کا تو نہیں لگتا تھا، جس مخلوق کا تھا، وہ تو کہیں بھی کسی دقت بھی نازل ہو سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے عورت کو جھرجھری سی آ گئی۔

تھوڑی دیر خیا لوں کے جنگل میں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد وہ پھر بنیادی موضوع پر آ گئے۔
”جو بچے واپس آ جاتے ہیں، وہ تو ایک طرح سے چشم دید گواہ ہیں۔“

عورت نے اگلیاں خیال کے طور پر ایک بات کہی۔

مرد کے ہونٹوں پر ایک طنز یہ مسکراہٹ رہ گئی۔

”شاید ہم اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ ان سے کچھ معلوم ہو جاتا تو ہم اندھیرے میں کیوں بھٹکتے رہتے۔“

”ساری چیزوں کو چھوڑ کر انہیں پر Concentrate کرنا چاہئے تھا۔“

عورت نے مرد کی بات سنی ان سنی کردی اور یوں بولی جیسے اپنے آپ سے کچھ کہہ رہی ہو۔

”وہ واپس آئے تو ان کے ذہن ماؤف تھے، زبانیں بند اور جسم بے حس۔“

مرد نے طوعاً و کرہاً پھر دہرایا۔

”ان لوگوں نے بھی کوئی مدد نہیں کی۔۔۔؟“

عورت نے جیسے بے خیالی میں سوال کیا۔

”کن لوگوں نے؟“

مرد نے کنکھوں سے عورت کی طرف دیکھا۔

”ان لوگوں نے۔۔۔“ امام صاحب، موڈل صاحب، بزرگوں کے آستانے وغیرہ۔“

عورت قدرے جھنجھلا گئی۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ مرد تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے۔

”گئے تھے، پائل لک گئے تھے، مگر سب کے سب بے بس ثابت ہوئے۔“

مرد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”وہ لوگ تو مار پیٹ کے ذریعہ بھی ایسے معاملوں کو درست کر دیتے تھے۔۔۔؟“

عورت کو بھولی بھری امید ابھی بھی روشن دکھائی دے رہی تھی۔

”وہ اس رکت نہیں رہ گئے تھے کہ اس پر کوئی مزید سختی کی جاتی۔ ان کی جانیں بھی جاسکتی تھیں۔“

مرد کے لہجے میں خاصی مایوسی تھی۔

”اس کا مطلب ہے۔۔۔؟“

عورت نے جملہ مکمل نہیں کیا، شاید وہ بھی جانتی تھی کہ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ مرد نے بھی اس پر سوالیہ نگاہیں

ضرور ڈالیں، مگر وہ بھی جانتا تھا کہ مطلب کچھ نہیں۔

”یعنی؟“

کچھ دیر کے بعد عورت کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

مرد نے، ثابت میں سر ہلادیا۔

عجب بات یہ تھی کہ اس موضوع پر وہ جب بھی بات کرتے، ہمیشہ صفر پر پہنچ جاتے اور ان کا دروازہ بند ہو جاتا اور

اس وقت تک بند رہتا جب تک وہ، سے نئے سرے سے کھونٹے میں کامیاب نہ ہو جاتے اور نیا سرا بھی کیا وہ کچھ دور

تک بڑی امیدوں کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے، پھر وہی صفر

”ارے بھائی۔ کون سا ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں نکلتا، مگر یہ کیا بات ہوئی کہ اس کا کوئی حل ہی نہیں

نایاب، ناوہاں۔“

یہ بھی عورت کی جانب سے بند دروازے کو کھولنے کی ایک کوشش ہی تھی۔
مرد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہاں“

”ہاں“ یہاں بھی، ابھی ہم جن بھت سے گزر رہے ہیں، تمہیں کیا لگتا ہے، ہم ان بچوں سے کچھ مختلف ہیں
کیونکہ جن کے جسموں میں خون نہیں ہوتا، دماغوں میں
”بس بس“

مرد نے ہاتھ اٹھا کر سے روک دیا۔ ویسے اس کے اندر سے ایک بے ساختہ چیخ نکلتی والی تھی۔
کبھی کبھی مرد بھی سوچنے لگتا کہ ہزاروں میل دور کے پرابلم سے وہ اس قدر ہراساں کیوں ہو گیا ہے۔ عورت کی
بات سے سچ لگنے لگتی کہ وہ تو اپنی ساری کشتیاں جلا چکے ہیں پھر لیکن اس کی ساری سوچ اسے پھر اسی نکتے پر لے آتی
کہ یہ پرابلم تو سرحدوں اور دیوروں میں قید رہنے والی نہیں۔ وہ کسی وقت یہاں بھی پہنچ سکتی ہے، وہاں بھی پہنچ سکتی ہے
جہاں اس کے بچے رہتے ہیں۔ وہ ناگلوں پر چلنے والی چیز نہیں، پروں کے دوش پر اڑنے والی بلا ہے۔ اور یقیناً اس کے
مددباب کے لیے، مادی نہیں، مادی ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔ یہ ذرائع ضرور استعمال میں آئے گئے ہوں گے، ابدتہ
اس میں یقیناً کوئی ایسی کمی رہ جاتی ہوگی جس کے سبب یہ مصیبت بڑھتی جاتی ہے۔

مرد نے اپنے طور پر ایک فیصلہ کی۔ اس نے ادھر کی خبریں وصول ہی کرنا چھوڑ دیں۔ جب بھی کوئی خبر اس کے
اندر پہنچتی، اس کے بیچن میں اضافہ ہو جاتا تھا مگر وہ اپنے فیصلے سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ دراصل وہ ذرائع ابلاغ
سے یوں گھرا ہوا تھا کہ اس کے اندر جو بھی سانس جاتی تھی، وہ طرح طرح کی خبروں سے آلودہ ہوتی، جو ہر آتی وہ بھی ان
سے لتھڑی ہوتی۔ ہزاروں میل کے علاقے آنکھوں کے بالکل سامنے آ جاتے تھے اور وہ بہ نفس نفیس اپنے آپ کو ان میں
موجود پاتا۔ وہاں کے دکھ درد اس کی ہڈیوں میں پیوست ہوتے ہوئے محسوس ہوتے اور وہ اس تکلیف سے بلبلاتا تھا۔

پتہ نہیں، اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ سارے احساسات شاید اس کے ذہنی ہیں۔ کیوں کہ سے دوسروں کے
چہرے بشرے پر اس کا اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش باش نظر آتے، جیسے کوئی اندیشہ ہائے دور دراز انہیں
چھو کر نہیں گیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ذرائع ابلاغ نے ان کے احساسات پر اپنا ڈنک نہیں مارا ہو، یا پھر انہوں نے اپنے
آپ کو یوں باندھ رکھا ہے کہ کوئی ڈنک ہی ان کے اندر پہنچنے سے محذور ہو۔

(۲)

مرد، باہر نکلا تو پھر واپس نہیں آیا۔

دیر سویر تو ہوتی ہی رہتی تھی، کبھی کبھار وہ کسی کام میں پھنس جاتا تو گھر نہیں بھی پہنچتا تھا مگر اس کی اطلاع ضرور
دے دیتا۔ ایک آدھ دن نہیں آنے نے کسی تشویش کو کوئی خاص جنم نہیں دیا مگر نہیں آنے کا وقفہ کئی دنوں میں تبدیل ہو گیا تو
عورت کا چونکنا لازم تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اتنا فیر ڈم دار کبھی نہیں تھا، اس کی طویل غیر موجودگی حیرت انگیز بھی تھی، اس پر سے اس
کے سبیل کا لگا تار بند رہنا۔ وہ اپنا سبیل کبھی بند نہیں کرتا تھا، وہ کہتا تھا۔ پھر سبیل رکھنے کا ناکدہ کیا سبیل سے دوسروں کی جو
امیدیں بندھی ہوتی ہیں، ان امیدوں کو پامال کرنا نہایت غیر اخلاقی فعل ہے۔ عورت بہت باہمت اور ہاشعور تھی۔ غیر

موافق حالات سے عام طور پر گھبراتی نہیں تھی۔ غیر ملک، غیر آب و ہوا، غیر تہذیب و تمدن اور اجنبی زبان و بیان کے، حول میں، برسوں سے زیست کرتے ہوئے، وہ زندگی کی تیز رفتاری سے بہت حد تک ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اس نے اس صورت حال پر دایلا کرنے کی بجائے صبر اور تحمل سے اس کا سامنا کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے سوچا، سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟ پولیس۔۔۔۔۔

پولیس کے ریکارڈ میں کوئی انہونی درج نہیں تھی، ویر دراز سے کوئی اجنبی لاش دستیاب نہیں ہوئی تھی، کسی حادثے کی کوئی اطلاع نہیں تھی، کسی نے کوئی شکایت درج نہیں کی تھی، چھوٹے موٹے کسی دنگے کی خبر بھی نہیں تھی۔ اس نے خفیہ پولیس سے رابطہ قائم کیا۔ ان لوگوں نے کچھ عملی اور کاغذی کارروائی مکمل کی اور اس کے ہاتھوں پر صفر رکھ دیا۔

پھر اس کو خیال آیا، جہاں سرکار ناکام ہو جاتی ہے، وہاں غیر سرکار کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس نے ایک غیر سرکاری ایجنسی سے رابطہ قائم کیا، وہ روز انہیں امید بھرے لہجے میں فون کرتی، وہ بھی اپنی روزانہ محنت کا زانچہ اسے سنا دیتے۔ نتیجہ پھر صفر۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مرد کو آس کھ گیا یا زمین جگل گئی۔ اسے شک ہوا تھا کہ کہیں وہ اپنی الجھن میں ملک سے باہر تو نہیں چھ گیا۔ تھوڑی سی تنگ و دو کے بعد اس شک کا غبار ابھی پھوٹ گیا۔ اس کا پاسپورٹ گھر رکھا تھا اور ہوائی ایجنسیوں نے اس جیسے کسی آدمی کے باہر نہیں جانے کی تصدیق کر دی۔ اسی بھگ دوڑ میں اسے اشارہ ملا تھا کہ قومی سلامتی کے پیش نظر کبھی کبھار سرکار مشتبہ افراد کو کسی خفیہ مقام پر لے جا کر پوچھنا چھ کرتی ہے، ایسے افراد کا بہت بہت دنوں تک پتہ نہیں چلتا۔ اس سے اس کی گھبراہٹ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اسے یقین تھا کہ مرد کی کوئی حرکت کبھی قابل گرفت اور مشتبہ نہیں رہی۔ وہ بہت دنوں سے یہاں رہتے ہیں، کسی نے آج تک ان پر انگلی نہیں اٹھائی اور انہیں کبھی کسی پریڈنی کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مرد کی گم شدگی کی وجہ کچھ اور ہو سکتی ہے، مگر کیا۔۔۔؟

معا اس کو خیال آیا کہ وطن والا بھوت بلا آخر یہاں تو نہیں آ پہنچا۔ یہ خیال آتے ہی وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔ اس کے ہوش و حواس ایک دم گم ہو گئے۔ اس چیز کو اس نے اپنے اندرون کبھی تسلیم نہیں کیا تھا، اس مسئلے پر وہ کبھی چپ رہی تھی تو صرف مرد کی خاطر، اسے تو مرد پر تعجب ہوتا تھا اور وہ اس کی پریشانی کو دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی۔ مرد ہی نے اس سے کہا تھا کہ بھوت کو کسی سرحد یا رکاوٹ کی پریشانی نہیں ہوتی۔ سوچ کا یہ مرحلہ سخت پریشانی کا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ پریشان ہوئے سے مسئلے کا حل نہیں نکل سکتا۔ پریشانی کے احساس پر فوراً قابو نہیں پایا گیا تو یہ بڑے اطمینان سے اپنے پنکھ پھیلا دے گی۔

اس نے اپنے منتشر حواس کو یکجا کیا اور نئے سرے سے حالات کا سامنا کرنے کی ٹھان لی۔ سارے وجوہات ایک ایک کر کے اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔ آخر وہ انہیں وسیلوں کو استعاضا کر سکتی تھی جو اس کے امکان میں تھے۔ اب تو ایک بات رہی جاتی تھی کہ مرد اپنی مرضی سے غائب ہو گیا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ نامعلوم مصلحتوں نے اسے جکڑ لیا ہو، یا پھر کوئی اور وجہ ہو۔

اس کے دل کی گہرائیوں سے نفی کی اتنی تیز چیخ نکلی کہ اس کا وجود لرز گیا۔ وہ تیس پینتیس برسوں سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہے تھے۔ انہوں نے ہر طرح کے دن دیکھے تھے اور ہر رنگ کی راتوں سے ان کا واسطہ پڑا

تھا۔ گویا ان کے سامنے ہینتیس برسوں کا ایک پہاڑ کھڑا تھا جو زمانے کے ہانے جلنے سے ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔
پھر.....؟

پھر وہی ؟

یعنی ؟

ایک ایسا راستہ اس کے سامنے آگیا تھا جس کی خرداری پر اس کے قدم آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیتے۔

یہ بات اسے ہمیشہ مسکھکھ خیز لگتی۔

آج بھی لگ رہی تھی۔

وہ اسے کسی طرح تسلیم بھی کر لے تو پھر اس کے سبز باب کے لیے اس کے پاس کون سا حربہ تھا۔ اتنے برسوں میں، آج تک اس نے اس وجود کے بارے میں کچھ سن ہی نہیں تھا۔ برادران وطن میں سفید چمڑی کے لوگ کبھی کبھی اس وجود کو تسلیم کرتے دکھائی دے جاتے۔ وہ پتہ نہیں کیسے مکان کے کسی کونے، باغ کے کسی گوشے، سڑک کے کسی ویرانے اور زمین کے کسی حصے میں اس ان دیکھے وجود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے جن سے وہ کچھ اور نہیں دیکھ سکتے تھے، وہ اس کا کوئی عراج نہیں کرتے، اسے جوں کا توں چھوڑ دیتے۔ لیکن ان کے بھوت میں اور اس کے وطن کے بھوت میں بہت فرق تھا۔ وطن کے بھوت کو درست کرے کے کئی طریقے رائج تھے، یہاں تو اس موضوع پر کسی سے بات بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ خود، مردیک بار بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس دوڑ گیا تھا اور آدھے راستے ہی سے لوٹ آیا تھا۔

عجیب بے بسی کا عام تھا۔ اتنا تر تری یافتہ ملک اسے ایک بندر دروازے کا کمرہ نظر آتا تھا۔ کوئی روشن دان، کوئی روزں نہیں، اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کیفیت میں دوسرے لوگ بھی مبتلا ہوئے تھے یا نہیں، ہوئے تھے تو پتہ نہیں، انہوں نے اس کے لیے کیا کیا.....؟

بہر کیف، اسے اتنی تشفی ضرور تھی کہ جو کچھ اس کے بس میں تھا، وہ اس نے ضرور کیا۔ جو بس میں نہیں تھا، وہاں اس نے اپنی سوچ کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔

(۳)

اچانک مرد لوٹ آیا۔

پورے بدن پر نیلے نیلے نشانات، جسم اور منہ سوچے ہوئے، چال میں لڑکھڑاہٹ، آنکھوں میں بے پناہ ویرانی اور سردی

پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان ہی نہیں پائی۔ وہ آیا اور آتے ہی گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس وقت واہ بیا کرنے کا موقع نہیں تھا۔ یوں بھی یہاں، مفضولیات کے لیے وقت کس کے پاس تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ یہاں کی پولیس اور انتظامیہ سے بہتر اور کوئی انتظامیہ نہیں ہو سکتی، مگر اس کے تجربے نے بتایا کہ کم سے کم اس کے لیے جیسی وطن کی پولیس، ویسی یہاں کی پولیس۔ وہ سارے امکانات پر دستک دے چکی تھی۔ بہر کیف، اب تو مرد گھر آ ہی گیا تھا، یعنی تمام واقعات کا چشم دید گواہ۔ وہ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتی رہی، پتہ نہیں اس کی کیسی بے ہوشی تھی کہ وہ بار بار ہوش میں آتا اور بار بار بے ہوش ہو جاتا، تو اس کی آنکھوں کی ویرانی پکار پکار کے کہتی کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔

ٹھہرے ہوئے وقت میں

مبین مرزا

یہ سب خواب ہے یا حقیقت؟
کب تک یوں ہی چل سکتا ہے؟
اور جب منظر بدلے گا تو کیا ہوگا؟

سوالوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ کوئی سوال نیا نہیں تھا، لیکن مسلسل سوچنے اور بار بار اندازے لگانے کے باوجود خالد شیخ پچھلے کئی مہینوں میں خود کو ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ آخر کیوں نہیں ہو سکا تھا؟ ایک سوال یہ بھی تھا، بلکہ اب سب سے اہم سوال یہی تھا۔ وہ شخص جس نے اپنی زندگی کے گزشتہ تینتیس برس کتنے ہی سوالوں کے جواب ڈھونڈنے میں لگائے تھے اور بڑے بڑے ٹیڑھے سوالوں کے جوابات بدلا کر حاصل کر لیے تھے، وہ ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب پانے میں کیوں ناکام ہو رہا تھا؟ یہ ایک در سوال تھا، لیکن آخری نہیں، اس کے بعد بھی سوالوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وہ تو اچھا یہ ہے کہ میرے پاس فرصت کا وقت نہیں ورنہ یہ سب سوال مجھے کھن چکر ہی بنا دیتے۔ اُس نے خود سے کہا۔ اس اثنا میں وہ ہوٹل کی لاں میں داخل ہو چکا تھا۔ ٹھنڈک اور خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ صدف کے آنے میں ابھی دس منٹ تھے۔ وہ آج بھی وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ اُس نے سوچا اور مسکرا دیا۔ اس عرصے میں کئی باتیں ایسی ہوئی تھیں جن پر اُسے خود تعجب ہوا تھا اور جن کا سوچ کر اُسے ہنسی آتی تھی۔

ہوٹل کی مابی میں اُس نے دائیں جانب ایگزیکٹو فلور کی لفٹ کے سامنے صوفوں پر نظر کی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے اُس طرف بڑھ گیا۔ یہ وہ مخصوص جگہ تھی جہاں وہ پہلے پہنچنے پر صدف کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس عرصے میں وہ جتنی بار اس ہوٹل میں اُس سے ملا تھا، طے شدہ وقت سے ہمیشہ کچھ پہلے ہی پہنچا اور اسی جگہ اُس کا انتظار رہا تھا۔ یہ اُس کی زندگی کے معمول کے خلاف بات تھی۔ طے کردہ وقت پر پہنچنا تو اُس کا معمول رہا تھا، لیکن اگر کبھی اسے کسی کا انتظار کرنا پڑ جاتا تو سخت کوفت محسوس ہوتی اور اگر یہ انتظار چند منٹ سے زیادہ ہو جاتا تو کوفت جھنجھلاہٹ بن جاتی، جس کا وہ ظہار کیے بغیر نہ رہتا۔ صدف کے سلسلے میں اس کا رویہ بالکل مختلف تھا، یہی نہیں، صدف سے تو پورے معاملے ہی کچھ اور تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ تعلق میں جو کچھ ہوا تھا، وہ سب کچھ ہی خالد کی زندگی کے معمولات سے بالکل الگ تھا۔ کیوں نہ ہوتا، صدف خود بھی تو ایک بہت مختلف لڑکی تھی۔

خالد نے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے جیب سے موبائل فون نکالا، پہلے مسڈ کال دی کیس، کوئی خاص نام نہیں تھا کہ جسے فوری کال بیک ضروری ہو۔ اس کے بعد میسج دیکھے۔ پہلا میسج صدف ہی کا تھا۔ ”بہت معذرت، میں شاید تین چار منٹ لیٹ پہنچوں گی۔“ خالد کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ کتنی ذمہ دار ہے یہ لڑکی۔ اس نے سوچا۔ یہاں تو لوگ آدھا گھنٹا لیٹ ہوتے ہوئے بھی یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتے کہ انہیں پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے۔ خالد کی آنکھیں اس وقت ہوٹل

کے دبیز شیشے کے دروازے پر تھیں، جس کے آگے ایک خوش قامت دربان چوکس کھڑا تھا۔ خالد نے گردن گھما کر، بی پر نظر ڈالی، زیادہ لوگ نہیں تھے۔ دائیں طرف کانٹنی نینٹل کھانوں کے ریستوران کے دروازے سے ذرا آگے کسٹمر سرورس ڈیسک پر بیٹھی ہوئی دونوں خواتین بڑے انہماک سے اپنے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھیں۔ اُن سے آگے اُچلے شیشوں والے کچھ بھجوروں کے کاؤنٹر پر کھڑا ہو آدی شیشوں کو مزید چمکانے میں مصروف تھا۔ خادمہ کی نظریں بوٹ کر پھر موبائل فون کی اسکرین پر آکر کیں۔ وہ پیغامات پڑھنے اور جلدی جلدی کن کے جوابات دینے لگا۔ اسی اثنا میں صدف کا ٹیک اور مسیج آ گیا۔ ”مائی ڈیر! مجھے دیر ہونے کا بہت افسوس ہے لیکن ٹریفک جام قسمت کی نحوست کی طرح آدی کا راستہ بند کر دے تو کیا ہو سکتا، لیکن بہر حال اب میں اس نحوست سے نکل چکی ہوں اور صرف پانچ منٹ میں تمہارے پاس ہوں گی، تم مہر ندامت کے ساتھ۔“ صدف کو عام طور پر پہنچنے میں دیر نہیں ہوتی تھی، لیکن اگر کبھی ہو جاتی تو دوسرے منٹ کے بعد اس کے ایسے ہی پیغامات آنے لگتے تھے۔ صدف واقعی انوکھی لڑکی ہے اور دلچسپ بھی۔ خالد نے خود سے کہا۔ وہ پھر موبائل فون پر مصروف ہو گیا۔

”ہیلو...! آئی ایم سوری ڈیر۔“ صدف نے شیشے کے دروازے کو ہاتھ سے تھامے ہوئے دور ہی سے نعرہ لگایا اور پک جھپک آگے بڑھی اور پل کی پل میں خادمہ کے ساتھ صوفے پر ”ن بیٹھی۔“ ”یار اس شہر کا ٹریفک دنیا کی سب سے مشکل چیز بن چکا ہے، اومائی گاڈ۔“

”مجھے اندازہ ہے، جیسی طرح۔“ خادمہ نے کہا، ”اس لیے تمہیں اس پر زیادہ پریشان ہونے اور معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”یار بندہ پریشان تو ہوتا ہے نا جب ٹریفک عفریت بن کر اُس کا راستہ بند کر دے۔“ صدف نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں میں گنگھی کر کے انہیں درست کیا۔

”ہا ہا ہا! تم تشبیہیں اور استعارے خوب مزے کے استعمال کرتی ہو۔“

”دادوے رہے ہونا، کچی بات؟“

”ہاں ہاں، یقیناً دادو۔ اچھا یہ بتاؤ کہاں بیٹھنا ہے، میرا مطلب ہے، کیا کھانا ہے؟“

”ارے یار، وہی اپنا دلچسپ کھانا لیکن یاد رہے، آج تم میرے مہمان ہو۔“

”کوئی تکلف تھوڑی ہے۔ خیر“ وہ پھر تو ادھر ہی بیٹھ رہی ہے۔“ خالد نے اٹھتے ہوئے بائیں طرف اشارہ کیا۔

”تکلف ہے یا نہیں ہے، آج مہمان تم ہو، یہ طے ہے ورنہ“ صدف نے خادمہ کے پیچھے پکے ہوئے اپنے سیل فون کو اس کی پسلیوں سے اس طرح لگایا جیسے کوئی ہتھیار بند شخص کسی نیپے آدی پر قابو پانے کے لیے اُسے اپنے اسلحے سے خرد کر رہا ہے۔

خالد نے قہقہہ لگایا اور بولا، ”ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔“

”گڈ بوائے!“ صدف نے اُسے گدگداتے ہوئے ہاتھ ہٹا لیا۔

خالد نے محسوس کیا کہ آج وہ زیادہ چونچال کیفیت میں ہے۔

کھانے کے بعد صدف نے ایک لمحے کے لیے خادمہ کے چہرے پر نظریں جمائیں جیسے آنکھوں سے کچھ کہنا چاہتی ہو اور پھر مسکراتے ہوئے بولی، ”مائی ڈیر! تم نے کھانے کے درمیان دو دفعہ پوچھا کہ میں نے تمہیں آج

کھائے پر کیوں بدیا ہے تو سنو، اس سے بلایا ہے کہ میں آج رات ملک سے باہر جا رہی ہوں اور یہ طے نہیں ہے کہ کتنے عرصے کے لیے جا رہی ہوں، اس سے میں نے سوچا کہ تمہارے ساتھ اودھنی لےج کیا جائے۔“

خالد کی نظریں صدف کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دراصل کے بعد وہ بولا ”لیکن ایک دم یہ کیوں؟“

”بس پروگرام بن گیا، اس لیے۔“

”لیکن غیر ملکی دورے کا پروگرام اچانک تو نہیں بن سکتا۔“ خالد کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

”کیوں نہیں بن سکتا؟ ارے یہ امکانات کی دنیا ہے، یہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ صدف نے آنکھیں مٹکا کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ نہیں بتانا چاہتیں، مت بتاؤ لیکن جانے کی کوشش مت کرو پلیز۔“ خالد نے قدرے تلخی سے کہا۔

”ارے ارے، بگڑتے کیوں ہو۔ میں نے کوئی غلط بات تھوڑی کہی ہے۔ کیا یہ امکانات کی دنیا نہیں ہے ہم خود بتاؤ۔“ اس نے خالد کی آنکھوں کے آگے یوں نگلیاں بلائیں جیسے اُن میں برقی رودروں ہو۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے، خالد نے ایک لمحے کے لیے سوچا، آخر آج یہ کس موڈ میں ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ سخت جھنجھلاہٹ میں اُس نے سر جھٹکا اور کوئی جواب دیے بغیر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ صدف خوش طبع لڑکی تھی، لیکن آج اس کی خوش طبعی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اُسے اندازہ تک نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سامنے والے کے لیے الجھن کا باعث بن رہی ہے۔ آخر وہ بتانا کیا چاہتی ہے؟ کیا اُس کی زندگی میں اب کوئی اور مرد آ گیا ہے؟ اس سوال پر خالد کو لگا جیسے اُس کے اندر اچانک تاریکی سی پھیلنے لگی ہے۔ جب کوئی سوال ایک بار پیدا ہو جائے تو پھر چاہے وہ تاریکی پھیلنے لگے یا تہلکی کے عنبریت کو رنگوں میں اتار دے، اُس سے منہ نہیں پھیر سکتا، اس کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ پچیس باؤن برس کا آدمی جب اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے جدید بدیر اس طرح کے کسی نہ کسی سوال سے دوچار تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ یہ محض ایک سوال نہیں، زندگی کی حقیقت ہے اور حقیقت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ نتیجہ چاہے جو بھی ہو۔ یہ سب خیرات ایک لمحے میں خالد کے ذہن سے گزرتے چلے گئے۔

”ہاں تو بتاؤ نا، کیا غلط کہہ رہی ہوں میں؟ کیا یہ امکانات کی دنیا نہیں ہے؟“ وہ صدف کی آواز کی انگلی تھامے اپنے ذہن کی دنیا سے واپس پٹ۔ صدف کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت تھی۔ وہ ایک دم غصے سے بھر گیا، لیکن چپ رہا۔

”یوں گاؤ دی بن کر کیوں گھور رہے ہو؟ کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی یا تمہارے پاس اس کا جواب نہیں ہے کوئی؟“ صدف کی کھلی ہوئی باجھیں دیکھ کر خالد کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس کا مطلب ہے یہ سنہری مچھلی اب کسی اور دریا میں ترنے کی تیاری میں ہے۔ ختم ہو گیا سب ڈراما، اُس کے اندر کسی نے کہا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے سوچا سامنے رکھی ہوئی میز اُلٹ کر اٹھ کھڑا ہوا اور چل دے۔

صدف اس کے تیور قطعاً نہیں بھانپ رہی تھی۔ اُس پر شوخی کی کیفیت طاری تھی۔ ”نالائق بچے اودھیان سے میری بات سنو۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔“ صدف نے مسکراتے ہوئے کہا، ”دیکھو، یہ جو موبائل فون ہے میرے ہاتھ میں، یہ آج کی اس امکانات سے بھری ہوئی دنیا کا ایک فینومنا ہے۔ دیکھ رہے ہو نا اس موبائل فون کو؟“ اس نے ہاتھ میں تھامنا ہوا

فون اس کی آنکھوں کے آگے لہراتے ہوئے تھا۔

بس یہی وہ لمحہ تھا جب خالد کے اندر غصے سے بھری ہوئی بدوق کی بلی دب گئی اور اس نے آنکھوں کے آگے جھولتے صدف کے نازک اور خوبصورت مخروطی انگلیوں والے ہاتھ کو سخت غصے سے جھٹک دیا۔ جھٹکنے میں اتنی شدت تھی کہ صدف کے ہاتھ سے موبائل فون اچھل کر بھاگ، پچنے فرش پر گر اور برقی رو کی طرح پھسلتا ہوا زور سے سامنے کی دیوار سے ٹکرایا اور چھٹا کے کی آواز کے ساتھ ساکت ہو گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے سب لوگ اس طرف متوجہ ہوئے۔ ہر طرف ایک سنا سنا چھایا ہوا تھا۔ عقی دیوار کے آگے کھڑی ہوئی گانا گاتی لڑکی بھی ایک دم خاموش ہو گئی۔ سب چہروں پر خوف اور اضطراب کی ملی جلی پر چھائیں تھیں اور لوگ اس ڈرامے کے اگلے سین کے منتظر تھے۔

صدف نے ایک لمبے لمبے کی طرف دیکھا اور نہایت عجلت کے ساتھ دھیمی آواز میں بولی، ”سب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں فون اٹھ کر لاتی ہوں۔ تم کہیں اٹھ کر مست جانا پیڑ۔“

خالد جیسے کسی خواب سے چونکا۔ ایک لمحے کے لیے بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہوا اور کیوں ہوا؟ اس قدر غصے سے کیسے اور کیوں آگیا؟ اتنی طاقت سے اس نے ہاتھ مارا، اسے خود تعجب ہوا اور نفقت کا احساس بھی۔

فون اٹھ کر واپس آتی ہوئی صدف کے چہرے پر غصہ، کوفت یا تھکنجھ بٹ کے بجائے اسی مدامت تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔ خادمہ کے دل میں ندامت کا احساس گہرا ہو گیا۔ ”کی ایم سوری۔“ خادمہ کے منہ سے بمشکل نکلا۔

”اٹس اوکے۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں ٹونا ہوا موبائل تھا۔ اس نے اطمینان سے ٹکڑوں کو جوڑ کر موبائل بن کرنے کی کوشش کی مگر بے کار۔ وہ خادمہ کو دیکھ کر مسکرائی اور دوبارہ ٹکڑوں کو ٹھیک ٹھاکر موبائل کو آٹن کرنا چاہا مگر اسکرین تاریک تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ”ڈارنگ! سب ٹھیک ہو گیا ہے۔“ اس نے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک اچشت سی نگاہ ڈالی پھر خادمہ کے چہرے پر ایک لمحے کو اس کی نگاہیں رکھیں۔ ”باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ میں اب یہاں سے جاتی ہوں۔“ اس نے گردن موڑ کر ایک بار پھر ہال پر نظر دوڑائی اور جلدی سے اپنے پرس سے کچھ نکال کر اپنی پلیٹ کے نیچے رکھتے ہوئے بولی، ”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں جو اس وقت اور اس جگہ نہیں ہو سکتیں۔ ایک گیسٹ ہاؤس میں کمرہ بک ہے، یہ اس کی الیکٹرونک کی ہے اور اس کے ساتھ اس کا یڈریس بھی۔“ اس نے پلیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بولی، ”میرے جانے کے بعد اٹھ لینا۔ میں دو گھنٹے بعد وہیں ہوں گی۔ تم مجھ سے آدھ پون گھنٹہ پہلے پہنچ جانا۔“ صدف نے دیگر کونسل لانے کا اشارہ کیا پھر بولی، ”یہاں سے اٹھ کر جہاں بھی جانا ہو، خلاف معمول جانا

اور ہاں جب وہاں پہنچو تو باہر کہیں نہ بیٹھنا، سیدھا کمرے میں جا کر میرا انتظار کرنا۔ کمرے میں اس طرح رہنا جیسے تم وہاں نہیں ہو، میرا مطلب ہے کہ ایک بار پہنچ کر باہر مست نکلنا۔ میں آ کر دروازے پر دستک نہیں دوں گی، دوسری چابی سے کھول کر خود اندر آ جاؤں گی۔“ دیگر کونسل لاتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ بل لے کر وین چڑھ گیا تو وہ پھر بولی، ”اور ہاں،“ اس نے سے پہلے اپنا فون کہیں بھول آنا، مگر گاڑی میں نہیں کہیں۔“ اس نے چلتی ہوئی۔ ”یہ کہہ کر وہ ٹھکی اور اطمینان سے چل دی۔ خادمہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ سب کیا ہوا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے۔ غصے میں آنکھوں کے سامنے تھلواتے ہوئے موبائل فون کو جھٹکنے کے بعد سے تو جو کچھ ہوا تھا وہ سب جیسے کسی فلم کا سین تھا، کسی جاسوسی فلم کا۔ خالد کو اب تک حیرت تھی کہ اس نے اتنی زور سے ہاتھ پیسے مارا کہ صدف کے ہاتھ سے چھوٹ کر موبائل اتنی دور جا پڑا اور اتنے زور سے گرا کہ بے کار ہو گیا۔ اس کے بعد صدف کا یوں دھیمے دھیمے بولنا اور ہدایات دینا، کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے چانک وہ

ایک فلمی کردار بن گیا تھا۔ آگے کیا ہونا تھا، اُسے کچھ خبر نہیں تھی۔ بس یہ معلوم تھا کہ اُسے وہ کرنا ہے جو صدف کہہ کر گئی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ بھی اُسے معلوم نہیں تھا۔

ایک لمحے کو اس نے سوچا جیسے یہ سب کچھ خواب ہے، لیکن کچھ بھی خواب نہیں تھا، سب حقیقت تھا۔ صدف ہل سے نکل کر جا چکی تھی۔ ہل اور اُس میں بیٹھے ہوئے سب لوگ اپنی معمول کی حالت میں تھے۔ عقبی دیوار کے ساتھ بنے لکڑی کے چہترے پر کھڑی سائونڈی لڑکی غیر ضروری طور پر ہل ہل کر ایک پرانا نغمہ گارہی تھی۔ ویٹر معمول کے مطابق یہاں سے وہاں آ جا رہے تھے۔ ہوٹل کے مخصوص کوٹ پیٹ میں بلبوس لڑکیاں جنہوں نے اپنی عمر اور چہرے کے برخلاف بڑے بڑے جوڑے باندھ رکھے تھے، مسکرا کر نئے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ہاں میں خاصی ٹھنڈک تھی، اس کے باوجود خالد نے محسوس کیا اُسے پسینہ آ رہا ہے۔ نیشو سے ہاتھ اور گردن کے پسینے کو صاف کرتے ہوئے اُس نے ویٹر کو آواز کا اشارہ کیا جو اگلے ہی لمحے اس کے سامنے حکم کا منتظر تھا۔ خالد نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی ورا سے چائے مانے کو کہا۔ دائیں ہاتھ کے صوفوں والی روم میں آخری میز پر ایک عورت اپنے سے کم عمر خاوند یا عاشق کے سامنے مسلسل بولے جا رہی تھی۔ وہ ایسی کوئی حسینہ عالم تو نہ تھی لیکن اس حقیقت سے باخبر معلوم ہوتی تھی کہ اس دنیا میں عورت کے بغیر مرد کا گزارا ممکن نہیں۔ سمجھ دار عورت کی طرح اپنی مستحکم حیثیت کو انہجائے کرنا اس عورت نے بہت پہلے سیکھ لیا ہوگا۔ خالد نے سوچا۔ اس وقت اُس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غصے کا اظہار کر رہی تھی۔ خاوند یا عاشق وہ جو بھی تھا، اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا، جسے وہ رہ رہ کر اس انداز سے جھٹکتی تھی کہ ہاتھ سے ہاتھ نہیں چھوٹتا تھا۔

”سر چائے بنا دوں؟“ ویٹر نے برتن میز پر رکھتے ہوئے خالد سے پوچھا۔ ثبات کا اشارہ پا کر اس نے چائے بنائی اور کپ خالد کے آگے رکھ کر رخصت ہو گیا۔ خاوند کا دھیاں پھر صدف سے آج کی ملاقات پر مرکوز ہو گیا۔ حالوں کہ صدف نے اُسے ملاقات کا جواز بتا دیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ملاقات کی نوعیت اور مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ اُس کی تو اب تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آنا فانا صدف کا غیر ملکی دورے کا یہ پروگرام کیسے بن گیا اور وہ بھی غیر معینہ مدت کے لیے۔ یہ پروگرام یقیناً چانک نہیں بنا ہوگا، پہلے سے ہل رہا ہوگا لیکن اُس نے خاوند کو اس کے بارے میں بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا، ضروری کیا مطلب؟ اُس نے جھنجھلا کر خود سے کہا، ”اُس نے تو باقاعدہ چھپایا ہے پروگرام اور اب جب اُسے چاہتا تھا تو وہ بتا رہی تھی۔“

چند ماہ قبل وہ جب پہلی بار اس سے ملی تھی تو ساری رکاوٹوں کو توڑتی ہوئی اُس تک آ پہنچی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے پوری طرح واقف تھی۔ اُس کے کتنے ہی ٹی وی پروگرام اُس نے دیکھے ہوئے تھے اور کتنے ہی کالم پڑھ رکھے تھے۔ اس کی کہی ہوئی کتنی ہی باتیں اور لکھے ہوئے کتنے فقرے اسے یاد تھے جن کا وہ بات کرتے ہوئے بہت بر محل حوالہ دیتی تھی۔ خالد اپنی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ملک کے نامی گرامی صحافیوں میں شامل تھا۔ اپنے شعبے کے لوگوں میں ہی نہیں، ملک بھر کے عوام میں بھی اُس کا ایک نام تھا، ایک بچون تھی۔ اس مقام تک آنے میں اُسے خاصا وقت لگا تھا۔ اس اثنا میں آنکھوں کے نیچے حلقے گہرے ہوئے تھے اور چہرے پر سونٹیں نمایاں ہوئی تھیں۔ سر کے بالوں میں چاندی کے تاروں کی مقدار خاصی بڑھ گئی تھی جسے وہ باقاعدگی اور سلیقے سے ڈائی کر کے چھپائے رکھتا تھا۔ وزن میں اضافہ ہوا تھا جو پیٹ پر زیادہ نمایاں تھا۔ اہل خانہ لوئر مڈل کلاس آبادی میں یک سو بیس گز کے مکان سے، ٹھہ کر اشرافیہ کے علاقے میں چھ سو گز کے آراستہ مکان میں آ گئے تھے اور بینک بیلنس میں بھی ہندسوں کا شمار بدل گیا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی بھی چیز کے

لیے اس نے اپنی ساکھ خراب نہیں ہونے دی تھی۔ یہ سب کچھ ہوا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی خاندانی اور ذاتی عزت میں بھی کمی نہیں اضافہ ہی ہوا تھا۔ ترقی کی دوڑ میں شامل لوگ جس چیز کو سب سے زیادہ بھولتے اور بہت دیر تک بھولے رہتے ہیں، وہ ساکھ ہوتی ہے۔ لیکن خالد شیخ نے اپنے صحافی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس چیز کو ہمیشہ یاد رکھا تھا۔

وہ اکثر تعجب سے سوچتا کہ جب سب کچھ عزت سے مل سکتا ہے تو آخر لوگ بے عزتی سے حاصل کرنے پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی پلٹ کے لیے، کوئی بینک بیلنس کے لیے، کوئی کسی پرمٹ کے لیے اور کوئی کسی لڑکی کے لیے۔ اس خیال پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ وہ بھی تو یک لڑکی کے لیے اس وقت ایک فلمی سچویشن سے دو چار تھا، لیکن صدف کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ کوئی اور ہی مخلوق ہے۔ بے انتہا حسین اور ساتھ ہی بے پناہ ذہین۔ اس کا ذہن جس طرح چیزوں، لوگوں اور حالات کے بارے میں سوچتا ہے وہ اچھے خاصے سمجھ دار لوگوں میں بھی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سحر اور دل کشی تھی جس نے اپنے سے ذہنی عمر کے اس آدمی کو جس کا نام خالد شیخ تھا اور جس نے اب تک کی زندگی بڑی بردباری سے گزار لی تھی، پوری طرح جذب کر لیا تھا اور اس طرح کہ اب وہ خود کو اس کے بغیر ادھورا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے صدف سے ملاقات کے بعد درجنوں مرتبہ خود سے یہ سوال کیا تھا کہ آخر وہ کیوں اس کے قریب آئی ہے اور اس سے کیا چاہتی ہے؟ اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا، اس لیے کہ صدف نے اس عرصے میں ایک بار بھی کسی مقصد، کسی خواہش یا ضرورت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر حیران ہوتا تھا اور کبھی الجھن میں بھی پڑ جاتا لیکن صدف سے گریز ممکن نہ تھا۔

صدف کے ساتھ، ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے سے لے کر اس کے بیڈروم تک پہنچنے کے سڑکی رفتار ہی حیران کن نہیں تھی، اس دوران صدف کا رویہ بھی تعجب خیز تھا۔ لیکن یک صدف ہی کا رویہ کیا، خود خالد شیخ کا رویہ بھی تو اس کی اب تک زندگی کے بالکل برعکس تھا۔ اب نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں اس سے پسے ہوئے نہیں آئی تھیں۔ آئی تھیں، کئی ایک آئی تھیں لیکن ان میں سے جس کو اس نے جہاں تک آنے کی آزادی دی تھی، وہ وہیں تک پہنچی تھی، اس سے ایک قدم آگے نہیں۔ صدف کے ساتھ معاملہ عجیب ہوا تھا، خالد کا مدافعتی نظام اس کے آگے کم زور پڑنے لگا اور بہت جلد صفر ہو کر رہ گیا۔ یہی نہیں، بلکہ اس کے بعد اس کا دھیان تک اپنے مدافعتی نظام سے ہٹ گیا۔ یوں صدف بہت جلد اور نہایت آسانی سے اس کے اندر آ پہنچی۔ اس کا علم اسے جب ہوا جب وہ پہلی بار اس کے خوبصورت اپارٹمنٹ کے بیڈروم میں اس کے ساتھ بستر پر تھا۔ سو سو فٹ اچھلتی اور اچھالتی موجوں کے تند و تیز طوفان سے گزر کر وہ اب ایک عجیب خمار میں تھا۔ طوفانی موجیں مدھم مدھم ہو کر اب اس کی رگوں میں دوڑتے خوں میں ہلکورے مچتی تھیں۔ ابھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ صدف نے موٹی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اس کے سینے کے بالوں کو زری سے سہلاتے ہوئے بولی، ”فور فینڈ آگنی تھی تمہیں۔ خراٹے لینے لگے۔“

”ہاں جانے کیسے آگنی، حالانکہ اس طرح آتی نہیں ہے۔“ خالد نے ذرا جھپٹتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن تم بہت مزے کا سوتے ہو، بالکل معصوم بچوں کی طرح۔“ وہ اس کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگی۔
 ”ہا ہا ہا! عجیب لڑکی ہو تم!“
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ عورتیں عام طور سے اس طرح فوراً بعد مرد کے سو جانے کو پسند نہیں کرتیں۔“

”اس میں کیا بات ہے، کیوں پسند نہیں کرتیں؟“

”نہیں معلوم، بس یہ ہے کہ اچھا نہیں لگتا نہیں۔“

”اس کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہوگی نا؟“

”میں نہیں جانتا۔“

”تھیں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔“

”کی تھی مگر بتایا نہیں کسی نے۔“

”ہا ہا ہا! عورتیں بہت گھٹتی ہوتی ہیں۔“

”ہا ہا ہا! صرف عورتیں یا لڑکیاں بھی؟“

”وہ سب جو کسی دوسرے مرد کے ساتھ بستر پر آ جائیں۔ ہا ہا ہا“ صدف نے اُس سے زیادہ زوردار

قبضہ لگایا۔

خالد نے ایک لمحے کو اُسے حیرت سے دیکھا اور پھر ہنس دیا۔ وہ اتنی ہی عجیب تھی۔ کچھ بھی کہنے سننے اور ماننے میں اُسے کوئی تاثر نہ ہوتا تھا۔ خالد نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا، ”تم نے پوچھا نہیں اور اس پر افسوس بھی نہیں کیا کہ میں اس سے پہلے بھی کئی عورتوں سے ملا ہوں۔“

”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔“ صدف نے اطمینان سے جواب دیا، ”تم اتنے گریس فل ہو کہ بہت سی عورتیں چاہتی ہوں گی کہ تمہارے ساتھ بستر پہ ہوں۔“ وہ لمحہ بھر کی پھربوں ”اور پھر یہ بھی تو ہے کہ یہ سوال وہ لڑکی پوچھ سکتی ہے جو پہلی بار کسی مرد کے ساتھ اس طرح ہو۔ میں تو خود تم سے پہلے کئی مردوں سے ملی ہوں، میں کیا پوچھوں۔“ وہ پھر اُس کے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

خالد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواب کیا کہے۔ عجیب بے باک لڑکی تھی۔ وہ چونکا ضرور، لیکن یہ صاف گوئی اسے اچھی لگی۔ عام عورتوں کے بالکل برعکس، جو بارہویں مرد کے ساتھ بستر پر ہوتی ہیں اور اسے یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں کہ وہ ان کی زندگی میں آنے والا شوہر کے بعد واحد شخص ہے اور یہ کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ ان کے دس نے کب اور کس طرح اس کے آگے نہیں بے بس کر کے ڈال دیا۔ خالد کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

”کیوں ہنس رہے ہو؟“ صدف نے پوچھا۔

”تم عام عورتوں سے بہت مختلف ہو۔ عام عورتیں ایسی کسی حقیقت کا اعتراف نہیں کرتیں۔“

وہ دھیرے سے ہنسی، ”میرا خیال ہے، یوں مختلف ہونا کچھ برا تو نہیں۔“

”بلکہ مجھے تو یہ بہت اچھا لگا۔“ خالد نے اُس کے چہرے پر آئی ہوئی بالوں کی سٹ بتائی۔

”تھینک یو، تھینک یو۔ ویسے میں بتاؤں، تم بھی ایک بالکل الگ طرح کے آدمی ہو اور بہت پیور بھی اور

بہت چھبے بیڈ کم پینیں بھی۔“

ایک بار پھر خالد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تالیوں کے شور سے وہ چونکا۔ داہنے ہاتھ کی طرف ذرا آگے لگی ہوئی بیسی میز سے تالیوں کا شور آرہا تھا۔ گانے والی لڑکی اور اس کا پورا بینڈ ”پپی برتھ ڈے ٹو یو“ گارہا تھا۔ وہ اچھا تو

یہ برتھ ڈے پارٹی چل رہی ہے۔ اُس نے سوچا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ صدف کو گئے ہوئے گھنٹا بھر ہونے والا تھا۔ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

خالد کو کمرے میں پہنچے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ وہ بے وقت کے مطابق صدف کو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ جانے وہ کہاں تھی، بول پہنچنے سے پہلے خالد نے دوبار اُس کے موبائل پر، بٹل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن فون آف تھا۔ ظاہر ہے وہ نوٹ گیا تھا، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اُس نے اب تک نیا فون کیوں نہیں لیا تھا۔ اب تو شہر کے ہر عذتے میں موبائل مارکنس کھل چکی تھیں اور ایک بھی نہیں، ایک ہی جگہ دو دو پلازا موبائل مارکیٹ بن گئے تھے۔ گزشتہ دہائی میں یہ کاروبار شہر میں خوب چمکا تھا۔ نہیں صرف ایک بچی کا روپا نہیں، بلکہ ایک اور بھی۔ وہ تھا لوٹ مار کا کاروبار، اس میں بھی خوب ترقی ہوئی تھی، بلکہ سب سے زیادہ اسی میں ہوئی تھی۔ سڑک پر چلتے آدمی سے لوٹ مار سے لے کر ایکٹی، بھتا خوری وراغوا برائے تاوان تک اس کاروبار نے تو جس طرح فروغ پایا تھا اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اب کوئی بھی کہیں بھی محفوظ نہیں تھا۔ لگتا تھا سیاسی جماعتیں اپنے اپنے ووٹ بینک کے حلقوں میں خود اس کاروبار کی سرپرستی کر رہی تھیں۔ عدالتے بٹ گئے تھے اور ان میں رہنے والے لوگوں کی حیثیت کے مطابق اس کاروبار کی ترقی بھی الگ الگ طرح کی تھی۔ تاریخ کی کتابیں اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے عداقوں میں جن بٹ ماروں اور اٹھائی گیسروں کے قصے سناتی تھیں انھیں اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ان آحری اور دوسری دہائی کے بددائی برسوں میں شہر کرپچی کے مختلف علاقوں میں پچشم خود دیکھ جاسکتا تھا۔ خالد نے سوچا، دنیا آگے کی طرف جاتی ہے اور ہم اکیسویں صدی میں سفر کرتے ہوئے اٹھارویں صدی میں آ پہنچے ہیں۔ اسے پھر صدف کا خیال آیا۔ وہ تو چند لمحے فون کے بغیر نہیں رہتی۔ اتنے فون اور اتنے میسج اُس کے پاس آتے ہیں کہ ذرا دیر خالی نہیں رہتی۔ اس وقت کیسے رو رہی ہوگی۔ وہ تو خیر جیسے بھی رو رہی ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس وقت اُس سے کس طرح رابطہ کر سکتا ہوں؟ وہ کہاں ہے اور کب پہنچے گی، یہ کیسے معلوم ہو؟ خالد نے خود سے کہا اور ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ انتظار کی گھڑیاں یوں تو ہمیشہ ہی طویل ہوتی ہیں لیکن اگر انسان کسی ایسی صورتحال میں ہو تو جیسے وقت کا پیہر گھومنا ہی بند کر دیتا ہے۔

خالد نے سب کچھ صدف کی ہدایات کے مطابق کیا تھا۔ اب اس کے پاس بھی موبائل نہیں تھا۔ وہ اپنا فون دفتر کی میز پر بھول آیا تھا۔ یوں تو خیر گیسٹ ہاؤس کے اس کمرے میں فون کی سہولت موجود تھی، لیکن صدف نے اس سے کہا تھا کہ کمرے میں اس طرح ہونا جیسے تم نہیں ہو۔ مطلب یہ کہ اُسے اپنی موجودگی کا کسی طرح اظہار نہیں کرنا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اسے اطمینان اور خاموشی کے ساتھ اس کا انتظار کرنا تھا اور بس۔ وہ پھر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ ابتدائی ملاقاتوں میں اس نے بتایا تھا کہ اس کا باپ مرچکا تھا اور ماں امریکہ میں تھی، بیٹے کے پاس۔ وہ بچھنے کئی برس سے یہاں نہیں آئی تھی۔ سب میں ایک بار صدف ہی ماں اور بھائی سے ملنے کے لیے چلی جاتی تھی۔ یہاں وہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں انٹرنیشنل ریلیشنز کی اسٹڈنٹ تھی اور بہت اچھی تنخواہ لے رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ ڈیٹس میں اس کا ایک آراستہ اور شاندار اپارٹمنٹ تھا، جس میں وہ تنہا رہتی تھی۔ سرمایہ داروں اور سرکاری قریبات میں بھی وہ اکثر شریک ہوتی تھی۔ پی آر کے معاملے میں وہ خاصی فعال نظر آتی تھی۔ ایسا یقیناً اس کی پرکشش شخصیت کے سبب ہوگا۔ یہ سب سوچتے ہوئے خالد نے ذہن میں ہلکا سا غبار محسوس کیا۔ اس نے ٹھہر کر منہ ہاتھ دھویا۔

داش روم سے باہر نکلتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ کمرے کے دروازے کے اس طرف کوئی موجود ہے۔ اگلے

ہی لمحے دروازہ آہستگی سے کھلا اور صدف اس کے سامنے تھی۔ ”آئی، ایم سو سو ری ڈارلنگ، آئی ایم ریٹی سو سو ری۔“ اس نے آگے بڑھ کر خالد کے گلے میں بائیس ڈال دیں۔ ”حالات، کام، وقت کچھ بھی اب میرے کنٹروں میں نہیں رہا۔“ سب اس کا پورا وجود خالد سے پیوست تھا۔

ایک مافوس اور مسکور کن رو خالد کے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے دونوں بازوؤں میں اسے بھر لیا اور نرمی سے بولا، ”یہ سب کیا ہے، کیوں ہے، میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔“

”بتاتی ہوں۔ یہی سب بتانے کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے، اس لیے کہ تمہیں کچھ بتائے بغیر میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی، کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ میرے بتائے بغیر چلے جانے سے تم ان گنت سوالوں سے دو چار ہو جاتے اور پھر زندگی بھر ان سوالوں سے دو چار اور میرے لوٹ آنے کے منتظر رہتے۔“ اس نے ایک بار پھر خالد کو خود سے لگا کر بھیج لیا پھر نرمی سے الگ ہوتے ہوئے بولی، ”بیٹھو، بتاتی ہوں۔ لیکن ایک بات میں سب سے پہلے کہنا چاہتی ہوں، وہ یہ کہ اب جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہی ہوں۔ اس پر تمہیں یقین دلانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے، سوائے اُس جذبے کے جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے۔“

خالد جو سامنے کے صوفے پر بیٹھا حیرت اور تشویش سے اُسے دیکھ رہا تھا بولا، ”کیا جو تم بتانے والی ہو، وہ تمہاری ذات سے متعلق ہے یا کچھ اور؟“

”ہاں وہ میرے بارے میں ہے اور کچھ تمہارے بارے میں بھی۔“

”لیکن اپنے بارے میں تو تم بہت کچھ مجھے پہلے ہی بتا چکی ہو۔“

”میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور جو بتایا ہے وہ درست نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”اور جو آج بتاؤ گی کیا وہ۔“ خالد تلخی سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کہانا کہ میرے پاس ثابت کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ جی چاہے تو مان لینا اور نہ میرے ساتھ اس آخری ملاقات کو بھی فراموش کروینا۔“ صدف ملول ہو گئی تھی۔

”آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ خالد رکھائی سے بولا۔

”دیکھو خالد، میرے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس طرح بات کرو گے تو میں بہت کچھ نہیں کہہ پاؤں گی۔“ صدف نے قدرے بے بسی سے کہا۔

”کس طرح بات کر رہا ہوں؟ خیر، تمہیں جو کہنا ہے کہو، میں سن رہا ہوں۔“

”ہاں سن ہو، ماننا نہ، نا تمہاری مرضی۔ میں تم سے بات کی خاطر سو رسک لے کر آئی ہوں آج، اس لیے کہ میں

جانتی ہوں آج کے بعد شاید نہیں یقیناً آئندہ ہماری کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی۔“

”میں احسان مند ہوں مگر کون سا رسک اور کیوں؟“ خالد کا لہجہ بدستور رُکھا تھا۔

”زندگی کا رسک!“ صدف نے ذرا درشتی سے کہا۔ ”ور پھر تم تک آنے کے لیے مجھے اپنا موبائل ضائع کرنا پڑا

جس میں کئی قیمتی چیزیں تھیں میری، مثلاً میری ماں کی تصویریں اور مسیح جو اندھیروں میں مجھے روشنی دیتے تھے اور زندہ رہنے کی طاقت بھی اور۔“

”میں سمجھا نہیں۔ وہ موبائل تو میرے ہاتھ مارنے کی۔۔۔۔۔“

”نہیں، تم نے کچھ نہیں کیا۔“ اس نے خالد کی بات پوری ہونے سے پہلے پھر بولنا شروع کر دیا، ”میں اتنے چڑا دینے والے انداز میں موبائل تمہاری آنکھوں کے آگے پار بارہر، ہی اس لیے رہی تھی کہ تم رنج ہو کر میرا ہاتھ جھٹک دو۔ میری ترکیب کامیاب رہی، تم نے جھٹکا لیکن وہ تمہارے جھٹکنے کا زور نہیں تھا جس نے موبائل کو تیس فٹ دور دیوار سے اس زور سے جا ٹکرایا، وہ میرے اپنے پیچکنے کی قوت تھی، اس لیے کہ میں اس فون سے چھٹکارا چاہتی تھی۔“

”مگر کیوں؟“ تذبذب اور تشویش کے ذورے خالد کی آنکھوں میں پھیل گئے تھے۔

”اس لیے کہ اس کے خراب ہوئے بغیر میں آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔“

”میں سمجھ نہیں۔“

”وہ صرف موبائل نہیں تھا، ٹریکر بھی تھا، میری ایک ایک بات، ایک ایک سیکنڈ کی حرکت ریکارڈ ہوتی تھی اس کے ذریعے۔“

”مگر کیوں؟“

”میری جواب میرے کام کی وجہ سے۔“

”تمہارا کام؟“

”ہاں میرا کام..... میں ایک ایجنٹ ہوں۔“

”مجھے تمہاری بابت شبہ تو تھا مگر یہ اندازہ“

”میں جانتی ہوں تمہیں شبہ ہوا تھا مجھ پر۔“ صدف نے اس کی بات کاٹتے ہوئے گفتگو جاری رکھی، ”لیکن وہ

شبہ کہیں بہت پیچیدہ رہ گیا۔ تمہیں تو اب اس کا دھیان تک نہیں آتا ہوگا۔“

خالد کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے کہ صدف ٹھیک کہہ رہی تھی۔

”میں چھ ماہ پہلے اپنے مشن پر پاکستان آئی تھی اور مجھے یہاں کم سے کم دو سال رکنا تھا مگر آج صبح اچانک مجھے

ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنے کو کہا گیا ہے۔ ہمارے کام میں اب اس وقت ہوتا ہے جب ٹاسک وقت سے پہلے پورا ہو جائے یا ایجنٹ کی پروگریس تسلسل بخش نہ ہو۔“

خالد ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے وہ کسی جاسوسی فلم کا کردار ہو۔

صدف نے اس کی طرف دیکھا جیسے آٹک رہی ہو کہ وہ اس کی بات توجہ سے سن بھی رہا ہے اور بولی، ”ایک وجہ

اور بھی ہوتی ہے اچانک واپسی کی اور وہ یہ کہ مارگٹ کے بارے میں پلاننگ بدل جائے، پلاننگ بدلنے کا مطلب ہے کہ

اسے مارنے کا فیصلہ کر لیا جائے یا پھر ایجنٹ مشکوک ہو جائے۔“ وہ سانس لینے کو رکھی اور پھر بولنے لگی، ”میں، بھی کچھ

نہیں جانتی کہ مجھے کس وجہ سے واپس آنے کا رڈر دیا گیا، لیکن میں یہ جان چکی ہوں کہ اس کیس میں مجھ سے کچھ غلطیاں

ہو چکی ہیں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ جو ٹاسک مجھے دیا گیا تھا، اس کا سب سے اہم حصہ تم تھے اور تم جیسے لوگوں کے بارے میں

اکثر فیصلے بدل دیے جاتے ہیں، انھیں راستے سے ہٹانا ضروری ہو جاتا ہے۔“

خالد کے چہرے پر اب تشویش، اضطراب، غصہ کچھ نہیں تھا۔ وہ پوری توجہ سے صدف کی بات سن رہا تھا۔

صدف خاموش ہوئی تو وہ بولا ”اور جو کچھ تم اس وقت کر رہی ہو، جیسی اس طرح مجھ سے ملنا، کیا یہ ایک غلطی نہیں ہے؟“

”یقیناً ہے اور بڑی غلطی ہے اور اس کی سب سے چھوٹی سزا موت ہو سکتی ہے میرے لیے۔“

”یہ جانتے بوجھتے اس وقت تم نے پھر ایسی غلطی کیوں کی؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں اتنے کم وقت میں پوری تفصیل سے تمہیں نہیں سنا سکتی۔ ویسے اس تفصیل سے تمہیں کچھ حاصل بھی نہیں ہوگا۔ بس مختصر یہ سمجھو کہ تمہارے ملک کا مجھ پر قرض تھا اور یہ ملاقات اسی قرض کو تارنے کی ایک کوشش ہے۔ پٹیزاب توجہ اور خاموشی سے میری بات سنو۔“ وہ گھڑی بھر کی اور پھر بولی: ”میں ایک پاکستانی فوجی کی بیٹی ہوں جو روس سے جنگ کے دنوں میں پاکستان کی طرف سے افغانستان گیا ہوا تھا۔ ماں نے بتایا تھا کہ افغانستان کے اُن ہنگامہ خیز دنوں میں میری ماں کا پہلا شوہر مر چکا تھا۔ اس لیے جنگ کے زمانے میں اس پاکستانی فوجی سے اُس نے نکاح کر لیا تھا اور میں اس کی حاملہ اولاد ہوں۔ ماں کے بقول اس فوجی یعنی میرے باپ کے میری ماں پر اور اس کے خاندان پر بہت احسانات تھے۔ اس کا سب سے بڑا احساں یہ تھا کہ اُس نے جنگ میں شدید زخمی ہونے کے بعد ایک امریکی سے میری ماں کو ملا دیا تھا جو اُس کا گہر دوست تھا اور اُن دنوں افغانستان میں تعینات تھا۔ اس سے میرے باپ نے ماں کی مدد کی درخواست کی تھی۔ میرا باپ اپنے وطن واپس پہنچنے سے قبل راستے ہی میں مر گیا تھا۔ بعد میں اس امریکی سے میری ماں کے قریبی مراسم رہے، لیکن اُس سے میرے کسی بھائی یا بہن نے جنم نہیں لیا۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ ماں نے سچ بتایا ہے کہ میں اُس کی حاملہ اولاد ہوں۔ بہر حال، روس کی شکست کے بعد اس امریکی کی وجہ سے میرا خاندان یعنی میری ماں، بڑا بھائی اور میں امریکہ پہنچے اور امریکی امداد پر تعلیم اور پرورش پائی۔ میں نے اپنے باپ کو ظاہر ہے کبھی نہیں دیکھا، لیکن میری ماں نے جس طرح درجنی بار اس کی نیکیوں اور خصوص کا ذکر کیا، اس کی وجہ سے میں نے خود کو ہمیشہ اُس کی قوم اور ملک کا مقروض سمجھا۔ میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں یہ قرض کسی نہ کسی طرح اُتار دوں۔ قسمت نے موقع دیا اور میرے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک ٹاسک دے کر مجھے اسی ملک میں بھیج دیا گیا۔ یوں اس قرض کو دا کرنے کا ایک بہانہ میرے ہاتھ آ گیا۔“ وہ پل بھر کوڑکی جیسے بولتے بولتے اغاظ و رخسارت کا ریلہ اچانک ختم کیا ہو۔

خالد بت بنا اُسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی کہانی نہ رہی تھی۔ تیس دہائیوں سے طویل اپنی صحافتی زندگی میں اُس نے کتنی ہی کہانیوں کو کھوجا تھا، کیسے کیسے کردار دیکھے تھے، لیکن جو کہانی آج وہ سن رہا تھا، وہ بالکل لگ تھی خود کہانی نے ولی کی طرح۔ خاندان کا ذہن، اعصاب، حیا۔ اس وقت سب ساکت تھے۔

”اس قرض کو ادا کرنے کا احساس تم نے اور بڑھادیا۔“ صدف پھر بولنے لگی۔

”میں نے؟“ خالد نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں تم نے۔“ صدف نے بہت ملائمت سے جواب دیا اور اٹھ کر اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی۔ اُس نے خالد کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھا، اور پھر اپنے گھٹنے پر رکھتے ہوئے بولی: ”مگر تمہیں پتا نہیں ہوگا کہ کب اور کس طرح۔ میں اب بھی زیادہ تفصیل میں نہیں جاپاؤں گی۔ بس یوں سمجھو کہ میں جس مشن پر یہاں آئی تھی اس کا ایک اہم ٹارگٹ تم بھی تھے۔ اپنی ٹریننگ کے مطابق میں نے تم پر کام کیا۔ تم تک پہنچنے اور تمہارا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہی لیکن اس سے آگے کچھ نہ ہو سکا۔ تم پر مال و جانیدار کے لالچ، بین الاقوامی شہرت اور عالمی طاقتوں کے تعلق جیسی کسی بھی کشش نے کوئی کام نہ کیا۔ تمہاری اپنے کام، اپنے لوگوں اور اپنے ملک سے کٹ منٹ کے آگے میری ایک کے بعد دوسری کوشش ناکام ہوتی گئی اور ایک کے بعد دوسرا ہدف اڈھورارہا۔ لیکن یہ بھی کوئی ایسی بات نہ تھی۔ ہمارے پاس ٹارگٹ حاصل کرنے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں اور پھر بھی کچھ نہ ہو پائے تو ٹارگٹ کا صفایا تو خری اور سو فیصد کامیاب رہتا ہی ہے مگر

پھر یہ ہوا کہ تم میرے لیے نارگٹ رہے ہی نہیں۔ تمہارے ساتھ رہنے اور بستر پہ وقت گزارنے کے بعد میں اپنے پروفیشن اور بے مشن سے خود کو ڈس اور ہینٹ محسوس کرنے لگی۔ اپنے راستے پر لانے کے بجائے تمہیں تمہاری اسی اصل حالت میں قائم رکھنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں نے ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کیا کہ تم ایک بہت ٹھٹ نارگٹ ہو، تمہیں زیادہ ایکسرسز اور زیادہ وقت دینا پڑے گا۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں، میری ٹریننگ بہت پرفیکٹ ہوئی ہے اور میں ایک وین ٹرکی ہوں۔ میں نے رپورٹس بہت سنبھل کر اور بہت اچھی بنا کر بھیجی ہیں، لیکن میں جانتی ہوں، اوپر مجھ سے بھی زیادہ ذہین اور تجربہ کار لوگ بیٹھے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو لوگ مجھ جیسی کسی چیز یا کوڑنا سکھاتے ہیں، انہیں اڑتے اڑتے اس کے پرگنہ اور کاٹنا بھی ضرور آتا ہوگا۔“ اُس نے گہری سانس لی اور ٹھٹ ٹھٹ کر بولی، ”لگتا ہے اب میرے پر کٹنے کا وقت آچکا ہے۔“ اس نے اپنے گھٹنے پر رکھے خالد کے ہاتھ کو سہلایا اور خاموش ہو گئی۔

خالد جیسے سانس روکے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اُس نے گھٹنے پر رکھے ہاتھ کو اٹھایا اور اُس کے دونوں مہنم ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”تھینک یو، آئی ہو پٹو۔“ صدف کے چہرے پر دل کش مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”ٹریننگ کے دوران میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایجنٹ کی زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے اور اُسے خود کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، لیکن ضرور ہو جائے تو مشن کو پور کرنے یا بچنے کے لیے جان دینے سے گریز کا خیال تک اُسے نہیں آنا چاہیے۔ ٹریننگ اس طرح دی جاتی ہے کہ موت بھی ہمارے لیے ایک نارگٹ ہو جاتی ہے۔“ وہ ہنس دی۔

خالد کے ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

”میرا خیال ہے، میں رو میننگ باتیں کرنے لگی ہوں۔“ صدف نے قہقہہ لگایا۔

”تمہارے جانے کا پروگرام بد نہیں سکتا یا کم سے کم کچھ دنوں کے لیے رُک نہیں سکتا؟“ خالد نے پوچھا۔

”ایسے احکامات میں ہماری رائے یا مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آرڈر ٹو بی او بیڈ و ڈاؤن ایجی کنسڈریشن اور

ڈیے۔ ہمیں دی جانے والی ٹریننگ کی یہ سب سے اہم کمانڈ ہے۔“

”تم غائب تو ہو سکتی ہو۔“

”نہیں، یہ کوشش بالکل بے کار ہوگی۔ اس لیے کہ بالآخر ڈھونڈ لی جاؤں گی اور پھر“ تصور سے ہی صدف کو

جبر جبری آگئی۔ ”بٹ ڈونٹ وری، آئی ایم ناٹ آفریڈ آف ایجی تھنگ۔“ ابھی تو پھر مکاناٹ کا درکھلا ہوا ہے کہ شاید بچت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے لیکن بھگنے کی کوشش کے بعد صرف اور صرف اذیت ناک موت کا راستہ باقی رہ جائے گا اور کچھ نہیں۔“ اُس نے یہ سب اس طرح سے کہا جیسے اُس کی آنکھیں اس وقت موت کے راستے کو دیکھ سکتی ہوں۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور یوں، ”ارے میں نے تمہیں کس بات میں لگا لیا۔ میں تمہیں ایکنگ کی جو کہنا چاہتی تھی، وہ کچھ اور تھا۔“ وہ چیپ ہو گئی جیسے آگے اُسے جو کچھ کہنا ہے اس کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہو۔

خالد سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر نہایت ملامت سے بولی، ”تم صرف انڈرا ویز رویشن نہیں ہو خالد۔۔۔“ ”لبا سانس

کھینچ کر پھر گویا ہوئی، ”اب ای مل پر بھی ہو۔ ای ایل کا مطلب ہے ایلی می نیشن لائن۔“

خالد کا چہرہ کسی بھی تاثر سے عاری تھا جیسے یہ اُس کے لیے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔

صدف نے کسی توقف کے بغیر اپنی بات جاری رکھی، میں جانتی ہوں کہ تم کو یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی کہ آخر تم کو نارگٹ کیوں کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ہماری رپورٹس بتاتی ہیں کہ تمہارے دہشت گرد مذہبی تنظیموں سے لکس ہیں۔ صرف لکس نہیں، بلکہ تم اُن کی ٹاپ ٹائن قیادت کے پاکستانی صحافت میں سب سے بااعتماد نمائندے ہو۔ اور تم ہی وہ شخص ہو جو ہمارے مفادات کو نقصان پہنچانے، اور اپنے معاشرے میں ہماری دشمن قوتوں کے لیے عوامی سینٹی مینٹس کو متحرک رکھنے میں سب سے اہم کردار ادا کر رہے ہو۔ تمہاری ہی وجہ سے تمہاری سوسائٹی میں ان مذہبی تنظیموں کے نظریات اور پالیسیز کی عوامی اپیل نہ صرف ہوتی ہے، بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے اور جس سے ہمیں مسلسل نقصان پہنچ رہا ہے۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

خالد نے پلیٹ کرا سے کوئی جواب نہیں دیا۔ سپاٹ چہرے اور خالی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔
صدف نے پھر بولنا شروع کیا، ”خالد! ہمارے ہاں رپورٹس بہت حقیقہ سے بنائی جاتی ہیں اور صرف ایک سورس سے نہیں بلکہ ایک وقت کئی سورسز استعمال کر کے بنائی جاتی ہیں، اس لیے وہ غلط نہیں ہوتیں۔“ وہ پھر چپ ہو گئی۔
خالد نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔

صدف پھر بولی، ”اور میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ تم جس سرکل میں ہو وہ بہت اُن رہنما نکل ہے۔“ وہ ایک سچے کوز کی پھر بولی، ”معاف کرنا، ویسے اس وقت تمہارے ہاں بکاؤ مال کی شرح میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس کو چیک کیا جائے وہ بکنے پر تیار مانتا ہے۔ اس لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کون کس کے لیے کام کر رہا ہے اور کس کا زکوٰۃ سر دکر رہا ہے۔ تم جیسے ڈیڈی کیڈ لوگوں کی تعداد ہر شعبے میں کم ہو رہی ہے اور بہت تیزی سے۔ میں تمہیں نام دے کر بتا سکتی ہوں کہ اس وقت تمہارے یہاں کون کون سیاستدان، بیوروکریٹ، میڈیا پرس اور مذہبی رہنما کس سورس سے وابستہ ہے، لیکن میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ تم خود بھی ایسے لوگوں سے ضرور واقف ہو۔ تمہاری سوسائٹی ڈک لائن پر ہے، جیسے کوئی ڈھلان پر ہوتا ہے۔“
وہ چپ ہو گئی۔

خالد نے اس بات پر بے چینی سے پہلو بدلا۔ اُس کے چہرے پر اضطراب تھا۔
”آئی ایم سوری، میں جانتی ہوں یہ سننا، جاننا، مناسب تکلیف دہ ہے، بہت ذیت ناک لیکن میں جانے سے پہلے تم سے ایک بار یہ ضرور شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اصل میں تم جیسے لوگ سوسائٹی کے جسم میں موجود ہر پلے، دوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اسے زندہ رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر“ وہ چپ ہوئی، ایک لمحے کے لیے خالد کی آنکھوں میں جھانکا پھر اپنے ملائم ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام کر بولی، ”مگر اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ ایسے لوگ خود زندہ رہیں۔ سوسائٹی کو تاریخ کے حوالوں سے زیادہ زندہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آئی وٹس یو یوٹنگ، ہدی اینڈ پروڈکٹو“
”کف۔“ اور اگرچہ یہ ناممکن نظر آتا ہے، لیکن پھر بھی میرے دل میں خوشی ہے کہ میں زندگی میں کبھی دوبارہ تم سے مل سکوں۔“ اُس نے خالد کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما۔ اُس کا چہرہ ہنستا رہا تھا۔

خالد نے بھی جواب دیا ایسا ہی کیا۔
کمرے میں اب مکمل سکوت تھا۔
صدف نرمی سے خالد کا ہاتھ سہلا رہی تھی اور اُس کی گہری گرم سانسوں کی پھوار خالد کے سینے پر پڑ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے، میں جو کچھ تم سے شیئر کرنا چاہتی تھی، جیسے بھی ممکن تھا، کر چکی ہوں اور تم تک وہ سب پہنچ گیا جو میری خواہش تھی کہ پہنچا دوں۔“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے خالد کی طرف دیکھا۔

خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر ممنونیت بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں محبت تھی۔

”تھینک گاڈ! بس یہی میں چاہتی تھی۔“

”بھئی! ایک بات بتاؤ؟“

”ارے ہاں، یہ بتانا تو رہ ہی گیا کہ میرا اصل نام پشیمینہ ہے۔ جب ماں پر گیک سٹ ہوئی تو میرے باپ نے اس سے کہا تھا کہ لڑکی ہوئی تو وہ اس کا نام پشیمینہ رکھے گا اور لڑکا ہو تو شاہ میر۔ میری پیدائش سے پہلے جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، اس کا انتقال ہو چکا تھا مگر ماں نے میرا یہی نام رکھا۔ ہاں اب پوچھو کیا پوچھ رہے تھے؟“

”تم نے اتنی صاف اور شستہ اردو کہاں سے سیکھی اور اتنی صفائی، سلیقے اور ذہانت سے اپنی بات کہنا کیسے آیا تمہیں؟“

”زبانیں سیکھنا ہماری ٹریننگ کا حصہ ہے۔ میں پشتو، فارسی، عربی، فرنچ اور جرمن بھی اسی طرح بہت اچھی بول سکتی ہوں۔ اب رہا بات کا سیدھا اور ذہانت، تو ایسا ہے کہ میری ماں دو متم خاندان سے ہے اور میرا باپ بگٹی قبیلے کے سرداروں کی اولاد تھا، یعنی دونوں طرف سے رائل خاندان کا خون میری رگوں میں ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ حسن، ذہانت اور بہادری میری خاندانی وراثت ہے۔ اس میں تھوڑا سا کچھ اضافہ میں نے اپنی محنت سے بھی کیا ہوگا۔“ اس وقت اس کے چہرے پر وہ جاذبیت تھی جس نے حامد جیسے محتاط اور پختہ کار شخص کو ڈھیر کر دیا تھا اور پھر اس کا یہ کھلا اور پراعتقاد اظہار، خدا کی پناہ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

پشیمینہ نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولی، بس اب کچھ ہی دیر میں مجھے یہاں سے جانا ہوگا لیکن میں اس الوداعی ملاقات کے ختام سے پہلے کچھ وقت تمہارے ساتھ بستر پر گزارنا چاہتی ہوں اگر تم بھی ایسا چاہو تو۔“

خالد نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما اور بستر پر آگیا۔

پشیمینہ کو بھول جانا ممکن نہ تھا اور حامد اسے بھولنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مہینوں بعد جب ایک دوپہر اس کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی اور آدھی درجن سے زائد گولیاں اس کے جسم کے مختلف حصوں میں جگہ بناتی ہوئی جمع ہو گئیں اور اس کا ڈرائیور اس ہولناک واقعے کے باوجود ہوش و حواس کو برقرار رکھتے ہوئے اسے بروقت ہسپتال پہنچانے میں کامیاب ہو گیا اور ڈاکٹروں نے جنگامی طور پر آپریشن کرتے ہوئے قسمت کی یاوری سے اس کی جان بچائی تو جیسے وقت کی رفتار ایک دم تھم گئی۔ لمحوں کا بہتا ہوا دھارا رک گیا۔ دس مٹھی کی ریت کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل کر عدم کے ساحل پر گرتے چلے گئے۔ ہوش میں آنے اور اوسان بحال ہونے پر ڈاکٹروں، ایملی خانہ اور دوستوں نے نئی زندگی کی مبارکباد دی، حوصلہ بڑھایا اور دعاؤں دیں۔ اس دن مہینوں بعد اس نے پہلی بار پشیمینہ کو بہت شدت سے یاد کیا اور اس سے ملنے کی تمنا اس کے پورے وجود میں جاگی۔ اسی شام ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ اس کے خون کا دورانیہ ان دنوں میں پہلی بار بڑھا ہے۔



ایک غیر معروف راستے سے مڈھ بھٹ

زیب اذکار حسین

اس خواب کی تعبیر تو اب ناگزیر ہو چکی تھی۔ یہ کہاں ناگزیر قرار پائی تھی اس کی خبر کبھی نہ بکھی آپ کو بھی ہو جائے گی۔ فی الحال تو اہل ارتقاہ نے پابندی عائد کر دی ہے۔ محل وقوع پر۔ دفعہ ایک سو چوالیس صرف کسی ملکی قانون کے کسی مخصوص کوڈ کا حصہ ہی نہیں ہے۔ یہ بملکی ہندسہ جاتی تراکیب میں بھی اپنا ایک اثر رکھتا ہے۔ ہندسے فقط ایوسڈ کے شاگردوں کا ہی خاصہ نہیں ہیں۔ انہیں ماریہ جینا ناگوری اور فلورنس ای ایلن کی ابھیمیں بھی تو حاصل رہی ہیں۔ رافیل سان زاوچن چٹنٹلز کا امانت در رہا ہے ان کی شہادت مانیکل انجیلو اور لی اونور ڈوڈی ونسی کی مستقبل بنی بھی دے گی۔ یہ تعمیرات ایک طلسمی طرز کی بنیادیں جائیں گی۔ سترہویں صدی جس مقام سے غائب ہوگی۔ وہاں کے میوزک کمپوزرز آرٹ آف فوج تخیق ہی نہیں کریں گے۔ اس کے بااں اشوک اس سلوک کی طرف آئیں گے ہی نہیں جو وولف گینگ ایڈیس موزارت کی فنی مجبوری سے ابھریں گے۔ مجبوریاں کئی طرح کی موتی ہیں ایک وہ جن کی وجہ سے فن کاروں کا سر جھک جاتا ہے اور ایک وہ جو فن کاروں کو کپکپاتی مانگوں کے ساتھ کھڑا بنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ جیسے لدوگ وین پتھاون، جس نے اپنی نیمفشی نمبر ۳ کو نیچو لین بونا پارٹ کے نام معنون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ اعزاز ایک آمر کو نہ دینے کا فیصلہ کر کے نہ صرف باخ کو بالواسطہ طور پر خرچ عقیدت پیش کیا بلکہ مستقبل کی میوزیکل تھیوری کو بھی اپنا احسان منتقل کر دیا۔ اب جارج ایٹرن کی رول فلم کی ایجاد تاریخی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ اب برق چریڈ کی موت کبھی نہیں ہو سکے گی جس علاقے کی سترہویں صدی غائب ہو جائے گی اس علاقے کے فنکار وہ الاگ الاپتے رہیں گے۔ جو پانی میں گنگ لگانے کے کام آتے ہیں مگر اس آگ کی گواہی کون دے گا؟ یہاں کا قانون کینن (Canon law) تو اپنے فنکاروں کو ایک ساتھ گانے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ یہاں تو آرٹ آف فوج پیدا ہی نہیں ہوا۔ یا پھر اس کو درباروں کی دہلیزوں میں چن دیا گیا۔ یہاں کا پتھاؤن اپنے کانوں کی دل و جان سے حفاظت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے کان "مقدس رازوں" کی بھٹک سے محروم رہیں گے۔ ورنہ اس کی سماعت مجروح کر دی جائے گی۔ یہاں پر موزارت کی موت کا سوگ نہیں منایا جائے گا۔ یہاں کے پانیوں کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کس کا جسم کوئلہ ہوا اور کس کی روح راکھ ہوئی۔ وہ تو خاک چاٹنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ انہیں اس امر سے کیا غرض؟ کوئی تپ دق سے مرا یا زہر کھا کر۔ کوئی زہر دے کر، مارا گیا یا کسی کو تنہائی کی موت چھائی۔ اس انلی کے ماسٹر پیئر کو بڑھاپے کی موت نصیب ہوگی۔ اس کی جوئی کہیں گم ہوگئی ہے کیونکہ یہاں فراق نہیں ہے۔ یہاں وصال ہے۔ یہاں کا کیپٹن جان اسمتھ خاموش ہے۔ اس کو وینیل مریکہ میں کوئی ہوائی زبان کو خاطر میں نہیں آتا۔ اس زبان کے گیت نہیں لکھے جاسکتے۔ یہاں کا سرن فرانسسکو اتاروں کو خوش آمدید نہیں کہتا۔ یہاں اتاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ یہاں کا رواج ہے کہ اتاروں کو ادب سے طلب کرو ورنہ باروں میں اور "شرف" و "دعوت" کے روبرو سفاکی سے قتل کر دو۔

یہاں پر دہراشکوہ کی ماش ہاتھیوں تلے روندی جاتی ہے۔ یہاں پر سرمد اور عنایت کو "معصومیت" کی سزا دی

جاتی ہے۔ یہاں کا مٹن نا بیٹا نہیں ہے مگر: سے مرنائی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اُسے موہ مملکت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ بھولے سے بھی ایسا گیت لکھے کا جتن نہیں کرتا جس سے ”عالم پناہ“ کے کسی دور کو خوف محسوس ہو۔ یہاں کے خوفزدہ مصاحبین۔ مرنائی کے کھنور سے باہر نکلنے کی جگہ و دو میں ہر ”حسرت تعمیر“ کو دفن کرنے کے درپے ہیں۔ یہاں کسی ”دانا“ کو غالب نہیں رہنے دیا جاتا۔ یہاں حسرت روائی کا خاتمہ مقصود ہے۔ یہاں کسی کو کسی عارف کی جوانی کا صدمہ لاحق نہیں ہے۔ یہاں کے مصاحبین کو فقط اپنی عرفیت عزیز ہے۔ رام چندر جی اور سیتا جی بن باس کے لیے کب گئے تھے اور کب واپس آئے، کسی کو نہیں معلوم۔ یہاں پر تلاش سوت کا دوسرا نام ہے۔ پناہ کی نوید نہیں ہے۔ یہاں پر ہند سے رہنمائی کے کام نہیں آتے، تاریخی کے کام آتے ہیں۔ یہاں کے چودہ برس، چودہ ٹانیوں پر محیط ہیں اب بات اہل ارتقا کی عائد کردہ پابندی پر جا ٹھہری ہے۔ یہ پابندی کھونٹ لگانے والوں کے لیے کم از کم دو برس کی مختصر مدت کے لیے، نفاذ العمل ہوگی اور نسبت غیر متعلق ورڈز و رس نتائج کے یقین داروں کو گھنٹ سات، دودھ کا رہوں گے اس پابندی سے باہر آنے کے لیے، وہ محل وقوع تک پہنچ ہی جائیں گے اور پھر ہمیں کھوجتے پھریں گے اور ہم ہوں گے کہ انہیں مایوسی سے تعبیر کی روشنی حاصل کرنے کا خیال دے رہے ہوں گے۔ وہ اپنے آئندہ کے خواب اس تعبیر کی روشنی میں تعبیر کریں یا اس عدم آباد کا رخ کریں، جہاں تعبیری راستے ہر کس و ناکس کا استقبال کرتے ہیں تو تلاش کی ہوگی اس تم کو کے حصے میں، دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا کہ دوسرے نگرانی پر مامور ہیں کہنے والوں نے کہا ہوگا ”ہمیں غلط مت جانئے“ ہمیں برا کہہ لیجئے۔ ہمیں بھدا کہہ لیجئے، مگر جانے دیجئے۔ ”رخسہ اندازوں نے دکھائی ہوئی، ہاتھ کی صفائی اور چھین لی ہوگی، ابلاغ کی کنجی۔ اب آیا ہوگا آپ کا بردبار انہیں خراج تحسین پیش کرنے۔ بہت لٹی ہوگئی ہوگی چال اور سنانے والوں نے سنائی ہوگی کھری کھری۔ چنانچہ چاندی ہوگئی ہوگی رخسہ اندازوں کی، وہ چل پڑے ہوئے ستے داسوں سونا خریدنے تو طے کیا ہوا؟ آپ کا بھلکوتا آپ کو یہ دلاتا رہے گا کہ ہم برخود غلط نہیں ہیں ہم غلط برائے خود ہیں تلاش جب کسی کے حصے میں آتی ہے تو گمشدگی بھی اپنے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی پہلی شرط یہی ہوتی ہے کہ باقوتی اعداد سے بھتاب برتا جائے۔ اسی کارن تو آپ کے متلاشی کو آمیزہ آواز میں داخلہ لینا پڑا۔ یوں داخلہ حاصل کرنے میں تو زیادہ دقت پیش نہ آئی، البتہ شمولیت اختیار کرنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ یہاں پر نہ وقت پوچھ کر یا کرتا تھا۔ ایک نسل مجبوری کے تحت مایت وقت کو پانی کی طرح بہنا پڑا۔ ایک ڈالرو تو ڈوبنے کے لیے بھی ناکافی تھا۔ تیر کی کافن سیکھنے کے لیے کتنے ڈالر زکی، بیت کا وقت خرچ کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا تخمینہ اندازوں میں تو ہو ہی نہیں سکتا، اندیشوں میں کہیں ممکن ہے۔ بس اتنا جان لیجئے کہ قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کا بھروسہ مند سسکیاں سنتا پھرا۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ دعاؤں کے حصار سے ٹکنا اور دعاؤں کی زد میں آنا۔ گویا اس عقل کے آڈو ایک گردان بن گئی۔

تھما دیا گیا ایک لٹوسیدھے ہاتھ میں اور ایک رسی اُلٹے ہاتھ میں۔ پیادہ تو پہلے ہی قرار دیا جا چکا تھا۔ اب ہم نوالہ وہم پیالہ بنا دیا گیا۔ ایک ہیکلے کا یہ حضرت اس کھونج میں گئے رہتے کہ میرا شمار جہاں کس میں کس مخلوقات کا خاصہ ہے۔ میں جہاں جاتا ہیکلا ہمراہ ہوتا کس کی بڑا بہت انگ سنتے پھرا۔ معنویت سمجھ میں نہ آئے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ مگر مفہوم کا سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ یہ حضرت مسند کم ہی بولتے۔ اس کا منہ زیادہ بولتا، کبھی چلتے ہیں گر جاتے اور کبھی گرتے ہیں چل پڑتے۔ اس گراوٹ اور اس ٹھہراؤ کا مفہوم انگ الگ طور پر سمجھنا بھی نئے نصاب کا حصہ ٹھہرا۔ ان کے سامنے اچانک وہ سواری آ جاتی جسے دیکھنے اور جس کی حاضری کو، کوئی ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ یوں بھی جس کی اصولی آمد

نوے نوے کے بعد (یعنی انیسوے دن) متوقع ہو، گویا ایک تو کر یا دوسرے غم چڑھا۔ اسے کون راہ نور دی کا موقع دے گا۔ یہ سواری، حول کی مراد تو رکھتی ہی نہیں تھی، اس لیے لوگ باگ گزرا بڑ کر رہ جاتے۔ اگر کبھی کسی کا پردہ فاش کرنا مقصود ہوتا تو حضرت یوں تورا کر گرتے کہ قریب کھڑے دگ پہلے بھاگتے، بعد میں پلٹتے۔ اب ان کو اٹھانے کی فکر راقی ہوتی اور اگر کسی کو شرمندگی سے بچنا مقصود ہو۔ تو ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے کہ مدعی کا دھیان ہی کہیں اور بٹ جاتا۔ سامنے ایک ٹرک کھڑا نظر آتا، جس پر کہیں لکھا ہوتا "موقع دیکھ کر بات کرو۔" اب دیکھو تو ٹرک چل پڑا ہے۔ اب اس کے پیچھے ایک رکشہ چلنے لگا ہے۔ اس رکشہ کی پشت پر لکھا ہے "بالکل صحیح۔" اب ایک سوزو کی بھی کہیں سے آنکلی ہے۔ یہ ہائی روف سوزو کی ہے۔ اس کے عقبی شیشے پر تحریر ہے "اب جانے بھی دو۔" تو بات یہ بنی کہ اب جانے بھی دو۔ اور ایک عورت جس کے چہرے پر نقاب ہے۔ اپنے بے نقاب ہمرابی سے کہہ رہی ہے۔ "پھر کبھی سہی۔" تو گویا مجھے موسیقی کے اس بہاد سے گزرنے کا۔ زندگی میں گزار رہا ہوں۔

یہ زندگی مجھے گزار رہی ہے۔ شور میرے دلوں کا ہے۔ یہ میری ہریموں کا ہے۔ یہ بار و میرے ہیں یہ میں بازوؤں کا ہوں۔ یہ انگلیں میری ہیں یا میں ان ناگوں کا ہوں۔ میرا جودان ناگوں پر سو رہے۔ یہ میری سواری دونائیں سہار رہی ہیں۔ یہ آنکھیں میری ہی ہیں۔ یہ میں ان آنکھوں کا ہوں۔ میں محض خول کا خلیہ تو نہیں ہوں۔

جب تعبیر ناگزیر قرار پاتی ہیں تو تعمیر عناصر متحرک ہو جاتے ہیں۔ اب خوابوں کے محل وقوع کا نیندوں سے اٹھ لیا جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ خوابوں کی فضائیں، موسیقیائی مالاٹیں اور فضا کی بلندیوں میں مزاحیہ نقوش کے ساتھ تبدیل ہو سکتی ہیں۔ ان کی سختیوں اور آسائشیں وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں۔ یہ محفوظ رہیں گی۔ خاطر جمع رکھئے!

اس کی مملکت اور ماہیت کا جاننا کبھی کبھار ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان کی کرداری تبدیلی پر ناک بھوس مت چڑھائیے! یہ بہ اعتبار مستقبل ہے۔ اگر آپ اس فضا پر ناخوش ہونگے تو آپ پر تسلس واضح کر دیا جائے گا۔ یک ٹرک ڈرائیور آئے گا آپ کے پاس۔ اس کا نام نادر ہوگا۔ وہ آپ کو یقین دلائے گا کہ "خریدو مال واپس کیا جاسکتا ہے" اگر آپ پھر بھی خوف کی ریاست سے باہر نہ نکلے تو ایک ڈکیت جس کا نام رمیش ہوگا۔ آپ کو یہ باور کرائے گا کہ "کھائی کے لئے کا خوف دل سے نکال دو۔" تو گویا آپ نے رمیش کی درخواست بھی رد کر دی۔

لیجئے! آپ کا خوابی ماحول آپ کو "جو تھا اور جیسا تھا" کی بنیاد پر واپس کیا جا رہا ہے۔ اسے ہری زرد (preserve) کر لیجئے۔ اگر آپ وہ اوزار دیکھ لیتے جو آدھاری کر رہے تھے، اپنے کھوکھلے پن پر، تو آپ کی حالت کیا ہوتی؟ جب خوابوں کی تعبیریں ناگزیر قرار پاتی ہیں تو وہ کردار جنم لیتے ہیں جن کی معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ تکمیلی توازن کے لیے جنم لیتے ہیں، ان کا موازنہ موزونیت سے مت کیجئے۔

جب تعبیریں ناگزیر قرار پاتی ہیں تو پھر کردار جنم لیتے ہیں۔ اس کی تکمیل کے لیے ایسے کردار، جو اپنا کوئی کردار نہیں رکھتے۔ کوئی حق بے کار نہیں رکھتے۔ یہ سامنے آتے ہیں راستوں کی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے۔ ان کرداروں کے بنیادی فرائض پر مت جائیے۔ ان کی اضافی ذمہ داریوں پر نگاہ رکھئے۔ سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ دیکھئے یہ کہ کس کے حصے میں کیا آتا ہے اور کس کے پاس سے کیا جاتا ہے؟ کیا گزرتا ہے؟ تو تلاش آئی اس کم گو کے حصے میں اور گمشدگی روانہ ہوئی ایک باتونی کے بطن سے۔ ہمارے نام گمشدہ افراد کی فہرست میں بھی شہید ہی ہیں۔ ہم باپتہ، لاپتہ ہیں۔ ہماری ایک ہی بات ہے۔ گھبراہٹ مت۔ گھبرانے کے مقامات بہت آگے ہیں۔ تعاقب میں یہ دوانے والے

عنصر ہیں۔ اس لشکر سے ایک رکن کم ہو جائے گا اور انہوہ نقطہ میں ایک رکن کا اضافہ ہو جائے گا۔ آپ کا مرد ہمارا آپ کو یاد دلاتا ہے گا کہ سٹار کراسڈ (star crossed) کے ساتھ دنیا کا ناروا سلوک موجب مصیبت بن سکتا ہے۔ اگر عزت بیگ کی رسوائی کی اطلاع بخارا کی ہواؤں کو ہو جاتی تو وہ اس دریا کی بہروں سے لپٹ جاتیں جس میں دو کمزور نہلوں کو ڈوبنا تھا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب گمرانی پر مامور کردار کسی دوسرے کام میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ سی لیے تو کہا جاتا ہے کہ گمرانی پر مامور ارکان کی ذمہ داریاں دوچند ہوتی ہیں۔ یہاں پر ایک رکن کی گمشدگی ایک جماع کی گمشدگی قرار دی جاتی ہے لہذا بھٹکنے کی بھول ممنوع ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ان اعداد سے احتیاط کی گفتگو کی جائے جو اپنی گنتی میں الفاظ کی عمودی عاقبت میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ہمیں کیا قید میں ڈالیں گے، ہم تو خود قیدیوں کے قافلوں میں شامل ہیں۔ تو اب بات یوں بنتی ہے کہ مجھے شامل ہونا پڑا اس انہوہ میں جس کا کوئی حرف میرا ہم عقل نہیں تھا۔ میرا ہم شکل تو آپ کو ہر ساتویں گلی میں مل جائے گا۔ اپنے بے ٹکے پن کے ساتھ اپنے رنگ سے سائیکل کے ہمراہ رنگ آود چھری، کانوں کی نوکیں تیز کرنا پھرنا نظر آئے گا۔ سے سائیکل پر بیٹھنے کی اجازت اس وقت تک نہیں ہے جب تک سورج غروب نہ ہو جائے۔ دھڑ سورج غروب ہوا اور ادھر یہ سائیکل پر طوع ہوا۔ کبھی یہ آپ کو کھیل کے میدان کے پاس اچھلتا ہوا نظر آئے گا، کھیل کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تم شایوں کے قریب کھڑا بے ٹکے انداز میں تاسیاں بجاتا نظر آئے گا یا پھر غیر معروف معاشرتی راستوں میں تحقیق معروف کے ساتھ چلتا دکھائی دے گا۔ اس کا شمار انہی کرداروں میں ہوتا ہے جو کھیتوں میں بہرہ پھر کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ان جانداروں کا جو دراصل بے جان ہوتے ہیں۔ یہاں پر یہ ان پرندوں کو ازانے کا فریضہ سر انجام دیتے نظر آتے ہیں جن سے پکی ہوئی فصلوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ جہاں تک شہروں کا تعلق ہے تو یہ چوراہوں پر سنگنز کے ارد گرد منڈالتے نظر آئیں گے۔ یہ ایئر پورٹس کی عمارت کے قریب بھی پائے جاتے ہیں۔ ہوائی اڈے وریل کی مڑیاں ان کی پسندیدہ جگہیں ہیں۔

ان کا کام پرندوں کو حساس علاقوں سے دور رکھنا ہے۔

یہ ہوائی جہازوں کو پرندوں کی ٹھوکروں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ریڈیو لائسنز کو ہموار دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ گاڑیوں کی رکاوٹ کے بغیر رواں دواں رہیں۔ اس کے علاوہ یہ نظر آئیں گے مدار یوں کے من پسند رضا کاروں کے طور پر۔ یہ وہی ہیں جنہیں بعض مداری ”بچہ جمہورا“ کہتے ہیں۔ جمہوری دور میں یہ ان محاذوں پر چلے جاتے ہیں، جن محاذوں پر ان کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ آمریت کے زمانے میں یہ عوام میں گھل مل جاتے ہیں۔ اب یہ تمام تفریح گاہوں پر ”چنا چور“ بیچتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس کا ذہین ٹھکانہ وہ سینما ہاؤسز ہوتے ہیں جن کا کاروبار ٹھپ ہونے میں نوے دن باقی ہوتے ہیں۔ یہ انٹرول کے دوراں کوئٹہ ڈکنس اور بد مزاج بن کباب سرد کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اس کے علاوہ یہ ساحل سمندر کے کنارے گیلی ریت پر قلابازیاں کھاتے نظر آئیں گے۔ یہ کسی بھی پارک کے باہر غبارے بیچتے ہوئے بھی نظر آ سکتے ہیں اور کسی بھی ایرانی ریسٹوران میں یا کسی ”لمباری چائے خانے“ میں دیٹر کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے پکڑے جاسکتے ہیں۔ یہ اچانک نظروں کے سامنے سے غائب بھی ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ انہیں ٹیبل وال کہہ کر پکاریں۔ کیونکہ یہ خود کو ہار وال کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ بابر والا ب آپ کو ایک ایسی فیکٹری کے فورمین کے طور پر نظر آئے گا جس فیکٹری کا، ٹک تین بار نشورنس کی رقم ”آگ لگ جانے“ کے حیلے سے حاصل کر چکا ہے۔

اب اس کا منصوبہ اس فیکٹری کو بنک رپٹ قرار دوانے کا ہے۔ مگر نیا فورمین فیکٹری ورکر کی جواب طلبی پر ہند نظر آئے گا۔ یہ ہر روز حاضری لگاتا ہے اور حاضریاں لگواتا ہے۔ اس نے "حاضر جناب" کی آوازوں سے فیکٹری کے کان بھر دیئے ہیں۔ یہ کہاں کہاں سے مزدوروں کو لا کر جمع کر رہا ہے اس کی خبر کبھی نہ ہو سکے گی فیکٹری اوزر کو۔ وہ یہ حساب ہی لگاتا رہے گا کہ اس کے ہاں کل ملا کے سات سو چھ ورکرز کی گنجائش تھی تو چھ سو سات مزید کہاں سے آگئے تھے جب "قرتی" کا آرڈر ایک نچلے عدالت صرف ایک شنوائی کے بعد جاری کرنے پر رخصت مند ہو جائے گی تو وہ پری زائیڈنگ آفیسر کے گھر جائے گا۔ اس کا جنرل منیجر پر پزل یہ کام کرنے سے انکار کر چکا ہوگا۔ یہ جب عدالت کے گھر جائے گا تو وہاں بھی فورمین کا ایک ہم شکل اسے "کافی" سرو کرتا دکھائی دے گا۔ مگر اس میں "محض" اتفاق۔ جسٹ کوئٹنس (just co-incidence) کی صورت کام کرتی رہے گی۔ اسے کہتے ہیں اشکال کے دائرے اور اسے کہتے ہیں صورتوں کی لکیروں۔ اب آپ اس شکل کے آدمی کو ماحصل سمندر پر ورکش کرتے ہوئے پائیں گے۔ اسے بہت جلدی ہے کیونکہ اسے یثیاء کی سب سے بڑی چورنگی کے سب سے ہم ٹریک سنگٹل پر جا کر ڈیوٹی دینا ہے۔ اس کے پاس ایک بید کی چھتری ہے اور یہ اس چھتری پر اپنے سر کی بیضوی ٹوپی گھمائے گا اور آتی جاتی گاڑیوں کو آمدورفت کے اعتبار سے اشارے کرے گا۔ اس کے اشارے کوئی سمجھنے کو آمادہ نہیں ہے۔ سوائے ایک ٹریک کانسٹیبل کے جو خود اشاروں کے ہاتھوں ہلکان ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہو چکا ہے۔ وہ بمشکل یک دو بار اسے ٹوک سکے گا۔ "ادھر دیکھو۔"

"کیا کر رہے ہو یہاں سے جاؤ"

مگر ڈیوٹی پر موجود میرا ہم شکل اس نصیحت کو درخور اعتنا سمجھے تو ایک بات بھی ہے۔ ورنہ بات تو دوسری، تیسری اور پھر چوتھی ہو سکتی ہے۔



کارڈیلیا

بشری اعجاز

وہ 23 مارچ کی ایک ناقابل فہم رات تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سرگودھا کے آسمان پر چھائے ہوئے کالے سیاہ بادل پورے زور سے برس رہے تھے، بجلی کی لپک جھپک شہر کی دور دراز گلیوں کے سینے میں کنار کی طرح اترتی، پہل بھر کو چندھیا دینے والی روشنی کا بھماکا ہوتا اور پھر وہی اندھیرا۔ جس میں شہر کے خاموش پڑے مکانوں کے پرناے اور تنگ گلیوں کے گٹر تیزی سے ابل رہے تھے، سڑکوں کے کھدے پانی سے بھر رہے تھے، ادھڑی ہوئی سڑکیں نہروں کی طرح بہہ رہی تھیں اور آوارہ کتے، بلیاں اس خوفناک طوفان سے گھبراتے، کوڑے کے ڈھیروں میں سرگھسیڑے پڑے رہتے تھے، یہی وہ شہر کی گھڑی تھی جب کارڈیلیا، کنگ لیر کے محل سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس نے محل کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پیچھے مڑ کر چلی کے منقش دروازے کی طرف دیکھنے کی اک کمزور کوشش کی جہاں سایوں اور بنتے بگڑتے ببولوں کے درمیان کچھ بھی واضح نہ تھا، ساری شکلیں بے چہرہ اور ساری مانوس آوازیں دم گھٹ گئیں تھیں اور سارے رشتے ٹاٹے گندی بے حسی کی کچھڑ میں لتھڑ کر اپنی پہچان کھو چکے تھے۔ اس سے پتلے بار یک چادر کے پو سے سراچھی طرح ڈھانپتے ہوئے، وجود کے اندر، ہڈیوں کے گودے تک میں پھیل چکی کپکپی کو دکھنا چاہا، جو اس کے رُگ دریشے میں گہرا مچپے ہوئے تھی۔ بے قراری سے محل کی کھڑکیوں، روشندانوں، دروازوں اور دروازوں سے لپٹی اس محبت کی چاب کو شدت سے ڈھونڈ رہی تھی جو مورخہ 9 مارچ بروز سوموار اس دنیا سے رخصت ہوئی اور اس نے دربار شریف کی جنوبی سمت اس مٹی کی ڈھیری کی مسابقتی میں نہ کانپا، جس میں وہ خوبصورت اور مہربان عورت سوتی تھی، جس نے سختی کے اک بے قرار پل میں جب اس کی جان ہیروں سے کھینچ کر سینے کے قلوبت میں بری طرح پھڑ پھڑاتی تھی اور موت کی سسکیاں کانوں میں گونجتی تھیں اور وہ اک واضح بے قراری سے دابنے باہنے تاکتی تھی، کارڈیلیا اس کے سامنے آنکھ کی زد پہ آئے، خزاں رسیدہ پتے کے مانند کھڑی کانپتی تھی اور گھٹی آواز میں روتی تھی، منھیاں چھینچتی تھی اور کھوتی تھی اور نوٹے الفاظ میں ماں ماں پکارتی تھی، عین اسی لمحے ماں نے کارڈیلیا کا ہاتھ کنگ لیر کے ہاتھ میں دے کر اس سفر کی روانگی کے لیے ہادیان کھولے، جس کا وعدہ ہر ذی روح اپنے ساتھ لکھوا کر لایا ہے۔ پھر وقت بتاتا ہے کہ ماں نے سکون سے چٹکیں موندیں اور اس کی رون آرام کی منزلوں کی جانب سبک رفتاری سے روانہ ہوئی اور کنگ لیر نے کارڈیلیا کو اپنی شفقت کے سائے میں لے لیا، لیے رکھا تا آنکہ نو، رچ کی منگوس صبح طلوع ہو گئی، جس نے اس کی ساری اچھی اور مہربان صبحوں کو عفریت کی طرح نکل لیا اور وہ، استعمال کے چند جوازوں کے ساتھ، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی، اس گلی سے یوں نکلی جیسے کوئی زندگی سے نکلتا ہے۔

☆ . ☆ . ☆

بہت دن ہوئے، جب سرگودھا سے دوسو ستاڑی۔ اے، سینکڑاٹ ناؤن کے گھن میں جامن، شہوت، آم، انار، امرود اور پیتے کے نوخیز درخت ہراتے تھے اور گرمیوں کی رات میں زمیں پر گرمی کچی کچی جامنوں اور امیوں سے گھن میں خوشگواریت بھری رونق کا احساس ہمہ وقت موجود رہتا تھا، پھل دار درختوں پر آتی رنگارنگ چڑیوں، طوطوں، مہیوں، بلی

ترکھن (بدب) اور لیوں کے پرے مندر تے تھے اور انہیں ڈانے کے لیے بابر شید، درختوں کے نیچے کھڑا ہو کر کبھی تالی بجاتا تھا اور کبھی مکی جوار کے کھیتوں میں ہانکا کرنے والوں کے انداز سے نہیں شی شی کرتا تھا اور جب بہت مجبور ہو جاتا تو ان پر چھوٹی چھوٹی کنکریاں اچھلتا۔ اس کا چوکا گرمیوں میں مین ان درختوں کی چھوٹے ہوتا تھا، کا کو مصلن مٹی کی بڑی سی صحنک میں آنا ڈال کر، بل بل کر گوند حتی تھی اور اس دوران کسی پکھن کو بیت بھک کر کے اس کے سر پر گرتی، تو وہ انہیں زیر لب ایسی گالیاں بکتی تھی، جو میاں جی کے گھر میں تھیں کہ ان میں ایسے سے نادر اور تازیبا خیالات کا استعمال ہوتا کہ مرد بھی انہیں سننے کی تاب نہ رکھتے تھے اور کان لپیٹ کر دور نکل جاتے تھے اور پھر پوچھنے سات سالہ میاں واجد کے پیچھے روٹی کی بڑ کی پکڑے سارے صحن میں چکراتی پھرتی تھی اور اس محنت شاقہ کے باوجود بھی میاں واجد کو کھانا نہ کھد سکے کی وجہ سے، بیوی جی سے ڈانٹ کھاتی تھی اور کوٹھے کی دیوار میں منہ دے کر بھیس بھیس روتی تھی۔

تینوں بڑے بچے مقامی جرمن مشن سکول میں باقاعدگی سے جاتے تھے۔ صبح دم آشی سید یونیفارم، سنہری ہکل والی سرخ بیلٹ اور سرخ ہی سٹول لیے، دونوں لڑکیوں کے سر ہانے کھڑی انہیں آدائیں دیتی تھی تو دونوں اپنے اپنے بستروں پر کابلی سے کسماتے ہوئے سو جاتی تھیں، کاش آج سکول کی دیوار گر جائے، کلاس ٹیچر مر جائے، رمضان ٹانگے والے کا گھوڑا بیمار ہو جائے یا پھر "65ء" کی جنگ ہی لگ جائے جس کی وجہ سے پورے بیس دن سکول بند رہا تھا مگر ایسا کبھی نہ ہوا، نہ کلاس ٹیچر کو کچھ ہوا، نہ رمضان کے گھوڑے کو ان کی بددعا لگی اور رہی جنگ تو وہ 65ء کے بعد 71ء میں ہوں، جب انہیں سکول بہت اچھا لگنے لگا تھا، یہی وجہ تھی کہ 71ء کی جنگ نے انہیں بہت بھرور و بد مزہ کیا تھا اور یہ بد مزگی اس وقت گہری داسی میں بد گئی تھی جب مشرقی پاکستان ان سے الگ ہوا اور سنہری ریشے کے اس دیس کی فلمیں، فنکار، شہر جو انہیں بہت اچھے لگتے تھے سیلاب اور دریا جواں کی تاریخ جغرافیہ کا حصہ تھے، اجنسی ہو گئے تو وہ دونوں انہیں اپنے اپنے جوت کے بیگ لے کر بیٹھ گئیں اور سوچنے لگیں، یہ بیگ پھٹ گئے تو پھر کیا ہوگا، جوت کہاں سے آئے گی؟ یہ اور اس جیسے اور سینکڑوں سوال اس وقت پوری قوم کے سامنے تھے مگر رہنما یات ملک وقوم شاید ان سے بے خبر تھے، اسی لیے نئی دھڑے ہندیاں اور سیاہی جوت توڑ عروج پر تھے، مشرقی پاکستان پر بنگلہ دیش کی مہر لگانے والے اور پاکستان کو توڑنے والے اپنے علاوہ کچھ اور سوچنے کی فرصت نہ پاتے تھے۔

آشی دونوں کو آواز دیتی تھی اور سارے بہانے فیل ہو جانے کے بعد وہ دونوں، امی جی کی ڈنٹ پر تیزی سے اندر والے باتھ روم کی جانب بھاگتی تھیں، جہاں بھائی کھڑا جمایاں لے رہا ہوتا، غسل خانہ خالی نہ پا کر دونوں کو باری باری گلی والے غسل خانے میں جانا پڑتا، جو بے بی اور امی جی کے لیے مخصوص تھا۔ وہ غسل خانہ کم اور عافیت کدہ زیادہ تھا، جس کے سامنے گلی کے کونے میں پانی کی موٹر لگی تھی، سامنے جامن کا سبز چکنے چوں والا درخت، دھنیے، پودینے اور ہری مرچوں کی کیاری اور اس کے ساتھ برآمدی سے محققہ سرکاری نلکے کا کھڑا تھا جہاں نہر بندی کے دنوں میں نوکریاں کپڑے دھوتی اور بڑے برتن ماٹھتی تھیں۔ بے بی جی اور دوسری بوڑھی نانوں کا خیال تھا کہ پلاسٹک کے لوٹے سے استنجہ کرنے سے پاکی نہیں ہوتی لہذا لوہے کا استادہ بیٹھے پانی کے نلکے سے بھردا کر جب وہ گلی والے غسل خانے کی طرف جاتیں تو استادے کے اندر سے ملکی بلکی چھن چھن کی آواز آتی جیسے کوئی گھنگھرو باندھے رقص کی تیاری کر رہا ہو۔ جس سے کمروں میں بیٹھے بچوں کو معلوم ہو جاتا، کوئی نانی باتھ روم میں جا رہی ہے۔ کون سی۔ نانی محمد زہرا کہ نانی سردار بیوی، یا پھر بے بی جی۔ کسوٹی شروع ہو جاتی اور اس دوران غسل خانے کا دروازہ بند ہو جاتا، گھنگھرو کی آواز ختم ہو جاتی

وہ وسط جون کی ایک پکھلی ہوئی دوپہر تھی، جب تینوں بڑے بچے تھمتھاتے ہوئے چہرے لیے اسکوں کے تانگے سے اترے اور اپنے اپنے بستے ٹھانے، بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ برآمدے کے سامنے گھیری کے ساتھ والا کمرہ چونکہ گھر والے مرکزی بیڈروم کے طور پر استعمال کرتے تھے، لہذا بچے سیدھے وہیں گئے۔ سب سے پہلے بڑی بچی داخل ہوئی اور حسبِ عادت چلائی، پانی، پانی، مگر پانی کے لیے اس کے گلے سے نگلی اونچی آواز واک عجیب حیرت نے آن لیا، آنکھیں سامنے نوازی پنگ پر تھم گئیں جس کے اوپر سفید محل کی سفید چادر میں لپٹی، گلابی فراک والی اک چھوٹی سی بچی سوئی ہوئی تھی جس کی آنکھیں بند تھیں اور چھوٹی سی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے جیسے سلک کے موتی۔ تینوں بچے ہنسہ آہنسہ چلتے پنگ کے قریب پہنچے، بچی کے چہرے پر ہلکی ہلکی سوجن تھی اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں اور ہنڈوؤں پر سر سے کی کمان کھینچی ہوئی تھی۔ بے بی پاؤں اور نو مولود سے آنے والی مخصوص سی مہک نے انہیں کچھ دیر خاموشی سے وہیں کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا جس کے بعد ایک ہی وقت میں تینوں کے ہونٹوں پر ایک ہی سواں کلبلا یا۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آئی؟ امی جی اتنیوں نے ایک ہی وقت میں جواب کے لیے ماں کو آواز دی، جو سامنے نظر نہیں رہی تھیں۔ امی کدھر ہیں، تینوں نے آشی سے پوچھا، جو ٹھنڈی پانی لیے دروازے پر نمودار ہوئی تھی، ماہندے والے کمرے میں کیوں؟ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ کیا ہوا، کیا ہوا کا شور مچاتے وہ تینوں آنندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوئے مگر کمرے کا ماحول دیکھ کر ٹھنک کر رہ گئے۔ سامنے کا منظر تھا ہی کچھ ایسا، امی جی، اونچے رنگین پایوں والی مہری پر چادر اوڑھے لیٹی تھیں، ماں عادل نائن ان کی ٹانگیں دبار ہی تھی، نانی زہرہ گرم حریرے کا پیرلہ پکڑے پاس کھڑی تھیں اور کمرے میں ہرل کے دھوئیں کی سرمئی دھند پھیلی ہوئی تھی، یہاں امی جی کو؟ تینوں سراسیمگی کی حالت میں کھڑے پوچھ رہے تھے۔

دھند کے اس پار سے نانی محمد زہرہ نے جواب دیا۔

نہیں پچو! بس ذرا بخار ہو گیا ہے۔ اچھا، اور وہ بچی؟ انہوں نے نانی محمد زہرہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بے صبری سے سوال کیا۔ تمہاری بہن ہے، اللہ میاں نے اسے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ ہماری بہن؟ آئی کہاں سے؟ روشندان سے، روشندان سے۔ تینوں نے حیرت اور استعجب سے کمرے کی اونچی دیوار کے بند روشندان کو دیکھا، اک نگاہ امی جی پر ڈالی، جنہیں نانی محمد زہرہ، گھونٹ گھونٹ حریرہ چلا رہی تھیں اور بھاگتے ہوئے ہارنگل گئے۔ روشندان کے ذریعے ان تک پہنچنے والی چھوٹی سی بچی کا نام عظمیٰ رکھا گیا جو بعد میں زمی ہو گیا، تارہ آنکھوں اور گول منوں چہرے والی زمی، جد ہی بڑے بہن بھائیوں کے لیے دنیا کی سب سے بڑی دلچسپی بن گئی۔

بہت بعد۔ مردیوں کی اک ڈھلتی سہ پہر میں، بابے منشی معطلی نے حقہ تازہ کر کے اباجی کے پاس رکھا اور خود زمین پر کڑوں بیٹھ گیا۔ اباجی، صحن میں برآمدے کے سامنے اپنی مخصوص جگہ پر پچھی چار پائی پر نیم دراز تھے، کمرہ کچھرا بھی مع شرے کا حصہ نہیں ہوا تھا لہذا جتنا بھی ”چل“ کرنا ہوتا تھا انہی دیڑروں میں ہی لوگ کرتے تھے، وہیں خودکلامی اور وہیں ہم کلامی کے مرحلے طے ہوتے، سوچ بچار، صلاح مشورے، انہی دیڑروں میں موقع محل کے حساب سے ہوا کرتے تھے۔ یہ وقت اباجی کے آرام کا تھا، جو وہ اپنی چار پائی پر نیم دراز حقہ سامنے رکھے پرانے ملازمین کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ میں گزارا کرتے تھے۔ آج وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے، پاکتی بچھڑے کھیس کا کونا موز کر بونا بیٹھا ان کے پاؤں دبار ہا تھا،

گرم دھسے سے خود کو اچھی طرح لپٹنے کے بعد وہ حقے کی منہ میں ڈال کر تھوڑی دیر خاموشی سے کچھ سوچتے رہے اور پھر اک لمبی داری کے بعد، حقہ چھوڑ کر ایک دم سیدھے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کھٹکھار کر گلا صاف کیا اور قریب کی چارپائی پر بیٹھی اسی جی سے پوچھا، 'زمی کدھر ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتیں، ازمنہ اندر سے جی اباجی کہتی ہوئی باہر آئی۔ بچو دھراؤ، میرے پاس، سچ میں تمہیں کنگ لیئر کی کہانی سنانا چاہتا ہوں، کہانی کا سن کر قدرے لائق بیٹھا باغشی حعلی بھی غیر محسوس طریقے سے چہرے کا زاویہ بدلتا قریب ہوا، گھر کے دیگر ملازم بھی ادھر ادھر سے کھسکتے آہستہ آہستہ چارپائی کے گرد اکٹھ ہونے لگے۔ باورچی خانے میں بیٹھی آشیشی نے ریڈیو لاہور کی پنجابی میوزک سرورس کا والیم کم کیا اور کانسیاں جی کی آواز پر لگا دی، جو کہہ رہے تھے، شیکسپیر کا یہ کھیل، ایک بہت بڑے بادشاہ کنگ لیئر پر لکھا ہوا ہے، شیکسپیر کہتا ہے، اس کی تین بیٹیاں تھیں اور اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھیں، اس محبت کا اظہار وہ گاہے گاہے مختلف طریقوں سے کرتی رہتی تھیں۔ ایک دن بادشاہ کو ان کی محبت جاننے کا خیال آیا، اس نے انہیں پاس بلایا اور سب سے پہلے بڑی بیٹی سے پوچھا، پیاری بیٹی! تمہیں اپنے باپ جان سے کتنی محبت ہے؟ اس نے برملا جواب دیا، اتنی جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے، اپنے بچوں اور شوہر سے بھی زیادہ۔ اس جواب سے کنگ لیئر بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد اس نے سبھی سواں دوسری بیٹی سے کیا، اس نے بھی جواب میں اپنی بھرپور محبت کا یقین دہایا اور کہا، دنیا میں اگر کوئی مجھے سب سے عزیز ہے تو وہ آپ ہیں بابا جان! اس جواب سے سرشار ہوتے ہوئے، بادشاہ نے اپنی تیسری اور ذیلی بیٹی کا رڈیلیا سے پوچھا تو اس سے یہ کہہ کر بادشاہ کو حیران کر دیا کہ بابا جان! دھاپیار آپ سے اور دھابھیا اپنے ہونے والے شوہر سے ہے، شوہر سے؟ یعنی تم میری محبت میں اپنے ہونے والے شوہر کو بھی شریک کر رہی ہو؟ جی بابا جان، اس لیے کہ اس کا بھی مجھ پر حق ہے، کارڈیلیا نے متانت سے جواب دیا۔ کیا تم یہ سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو، بادشاہ نے صدمے سے پوچھا۔ جی بابا جی۔ سب سے پیاری بیٹی کا یہ جواب سن کر بادشاہ نے غصے میں آ کر اپنی سلطنت دونوں بڑی بیٹیوں کو دے دی اور کارڈیلیا کو عاق کر دیا۔ یہاں پہنچ کر باجی، چند ثانیوں کے لیے رکے، انہوں نے حقے کی نئی دوبارہ منہ میں ڈال لی اور اک لمبی گڑگڑاہٹ کے بعد، آہستہ آہستہ دھواں چھوڑا۔ یہ وہ ڈرامائی موڑ تھا جس نے زمین پر اکڑوں بیٹھے باپے غشی حعلی، امیر و ماچھی اور بوٹے سمیت، سب کی بنفیس باندھ رکھی تھیں۔ وہ سانس روکے اباجی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دھیرے سے کان کھجیا اور دھسے کو کندھوں سے ہٹا کر بازو گود میں رکھ لیے، دلچسپ گفتگو کے باہر اور بار بار سنائے جانے والے واقعات کو ہر دفعہ اک نیا رنگ دے کر، اس میں دلچسپی کا عنصر اور سسپنس قائم رکھنے والے، باجی نے حاضرین پر اک سرسری نگاہ ڈالی اور قریب بیٹھی زمی کی طرف شفقت سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔ مگر زمی نے بادشاہ کا یہ خیال، بعد میں غلط ثابت ہو گیا، دونوں بڑی لڑکیاں لاچی اور خود غرض نکلیں جس کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب انہوں نے اس کی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اسے بے دخل کر کے ذلیل کرنا شروع کر دیا، پھر اسے معلوم ہوا، اس سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ اس نے محبت کرنے والی بیٹی پر خوشامدی اور جھوٹی بیٹیوں کو ترجیح دے کر نہ صرف اپنے ساتھ ملکہ کارڈیلیا پر ظلم کیا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں رہی۔ مگر کارڈیلیا چونکہ اپنے "ابے" سے بہت پیار کرتی تھی لہذا اس نے اسے لچی بہنوں کے چنگل سے چھڑایا اور اپنے باپ کو اپنے پاس لے آئی۔ اصل کہانی سے اپنے مطلب کا خلاصہ نکال کر اباجی نے ٹیپ کا مصرعہ دہرایا میں اسی لیے کہتا ہوں، بیٹوں کی نسبت بیٹیوں میں وفادار زیادہ ہوتی ہے اور پھر بیٹیوں میں بھی کوئی کوئی بیٹی کارڈیلیا ہوتی ہے، یہ کہتے ہوئے انہوں نے ازمنہ کو اپنے ساتھ لگایا اور دم بخود بیٹھے حاضرین محفل، جی میاں جی ابانگل سچ گل اسے کہتے ہوئے آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔

کڑھل کی پرانی چار پائی، جس کا رنگ کثرت استعمال اور مرسوں کا خالص تیل لگانے کی وجہ سے گھس میلا لگی ہو چکا تھا، جامن کے نیچے پٹھنی تھی۔ جس پر امی جی بیٹھی بھیرے کے ڈبے کھیس کے بمیل وٹ رہی تھیں، چار پائی کی دوسری جانب نانی محمدزہرہ ٹھنوں پر کھیس کا دوسرا حصہ بچھائے، سوتر کی تین تین تدیں الگ کر کے، پہلے نہیں شہادت کی انگلی پر پینتیس پھر بسم اللہ پڑھ کر باری، رٹی وٹ چڑھا کر، نہیں پس میں ملا تیں، دونوں ہتھیلیوں میں مسل کر انہیں گھس تیں اور گانٹھ دے کر چھوڑ دیتیں۔ نکا پراندہ نکا پراندہ، بڑی لڑکی چونکہ ہر جگہ گھسی رہتی تھی، بے اختیار چپائی، پُپ امی جی نے گھر کا۔ نانی محمدزہرہ نے اک چھٹی ہوئی فخر یہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور دوبارہ تندگی پر تان لی، یہ وہ مسکراہٹ تھی جو ہر ایک کو نظر نہیں آتی تھی، صرف اسے ہی دکھائی دیتی تھی، جو انہیں جانتا تھا، لہذا یہ مسکراہٹ بڑی نے ہی دیکھی۔ امی جی نے وٹے ہوئے بمبوں کو ہتھیلی پر رکھ کر، ایسے سنوارا جیسے بچے کو نند کر مائیں ان کے بال سنوارتی ہیں، بودی بناتی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کھیس گھسنے پر ہی پھیلا رہے دیا اور قریب رکھی کھچی کی پکھی اٹھا کر جھلنا شروع کر دی۔ جون کی کڑک دوپہر میں، تندوری کی دھپتی سرخ آگ میں، دور سے تاتے تانے کی بھاہ مارتی پھوپھینی نے چادر اتار کر پرے پھینکی اور پانی اور پلٹھن کا چھینٹا دے کر تھپ تھپ کرتے ہوئے روٹی گھڑی اور تندوری میں جھپتے ہوئے کٹ ہو گئی۔ کسل وٹے ہوئے نانی محمدزہرہ کی دو فالتوا کھیس پھوپو پر چپکی ہوئی تھیں۔ دیکھ دیکھ حیات بیوی (امی جی) اس بے حیوں، ایدھی میٹ میٹ، نیواں گلا، پنڈے کا جوڑ جوڑ دکھرا لگ رہا ہے۔ امی جی نے پکھی جھپتے ہوئے دیکھا تو گھر پر کرنگاہ بٹلی، ہاڑ کی لوتی دوپہر میں بے مزہ کے میں نہائی پھوپو، آنے کی تازہ تون کی طرح کھلی پڑی تھی، آؤ چیزا کر کے کھاؤ۔ چاہے روٹی بنا کے۔ کوئی لڑکی کھاؤ یا ثابت ثبوتی دعوت عام ہے۔ ہائے اتنی، روٹی اتارتے ہوئے پھاپو سسکاری، روٹی کہ پھاپو! روٹی کے بہانے گیراج اور دیڑھے کے خواہ مخواہ چکر گاتار محنت ڈرائیور رک کر سوچنے لگا۔ ڈھیٹ، بے حیا۔ نانی محمدزہرہ نے پاس رکھی کھچی کی موٹی دستی والی پٹھی، لار کر پھوپو کی طرف پھینکی جو سیدھی اس کی دھکی پر جا کر گئی۔ اک چھوٹی سی ہائے ر کے اس نے نانی محمدزہرہ کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا اور دوبارہ روٹی گھڑنے لگی۔ دیکھ، حیات بیوی، اس کڑی کے پنڈے میں ڈرتو جیسے بے ہی نہیں، کیڑی بے شرمی نال بکتی ہے۔ چنی لے لی سراتے، بھینے، منہ نہ متھاتے جس پہاڑ دھتا، اسے بھی جوانی چڑھی ہے، اللہ دی شان۔ پھاپو نے پچھا جی، کہتے ہوئے روٹی تنوری میں جھونگی اور آنے سے بھرے ہاتھوں کے ساتھ ڈھینگر دوں پر پڑی چنی گھسیٹ کر سر پر ڈلی۔ سینے کی بدذاتے، نانی محمدزہرہ نے کڑک کر کہا اور ایک ان دیکھا کھنگھار جو ایسے موقعوں پر ضروری ہوتا تھا، گلے کی تہوں سے پٹ کر، کبے پا سے اچھالا اور پھاپو کو نفرت سے دیکھتے ہوئے بویس۔ اس سے پوچھ حیات بیوی! یہ ہر دے ہر لے پاسے کیوں ٹپ ٹپ کر جاتی ہے، کیا کام ہے اس کا مردوں میں، وہاں رنگ رنگ کے جنے، اور یہ مٹکی ہوئی کتی کی طرح سوچتی پھرتی ہے۔ پھوڑیں مائی جی! آپ کو تو پتہ ہے واجد کا کتنا کھڑا ہے کہیں تک کر نہیں بیٹتا، اسی کے پیچھے بھاگتی رہتی ہے ہر دیش۔ امی جی نے حسب عادت معاذ رفع دفع کرنا چاہا مگر نانی محمدزہرہ اس قدر جلد پسائی پر تیار نہ تھیں، پھر بولیں وہ تو ٹھہرا معشوم جاسک، اسے کیا پتہ، کہ ہر جانا ہے، مدھر نہیں، یہ خود ششکار تی ہے اسے، کبھی قلفیوں اور کبھی لمبوں کے بہانے۔ تو بہ نانی محمدزہرہ کتنی بڑی جاسوس میں۔ بڑی بڑی نے دل ہی دل میں سوچا۔ کیوں نی پھوپو مائی جی کیا کہہ رہی ہیں؟ میں نے کچھ نہیں کہا بیوی جی، ہاتھ میں پکڑا چیزا دھولتی ہوئی پھاپو مس مس کرنے لگی، ہیکھاں کچھ نہیں کیا؟ حیات بیوی! پنڈال اس کی نگلی میں، کوئی دوا جن چاڑے گی نہیں تے۔ اس کے

چالے ٹھیک نہیں ہوں۔ برآمدی میں بیٹھی تھی جو بھڑک رہی تھی اس نے بھی نانی محمد زہرہ کی تائید میں زور کا ہنکارا بھرا۔ مگر اس سے پہلے کراہی جی، کیس باقاعدہ طور پر اپنے ہاتھ میں بیٹھیں، گلی سے سیاہ گرگابی کی آواز آئی، جو تیری سے قریب آ رہی تھی۔ آٹھینے، ٹوڑا (روٹی) تیار ہے؟ جی میں جی! گوشت دم پر لگاتے ہوئے، تھی نے بھنے ہوئے تیتروں کی قاب نکالی اور اس پر کٹ ہو، دھنیا اور سرچیں چھڑکیں اور پیس جی کے لیے تازہ روٹیاں لیے کندی پکڑ کر تھوری کی طرف لپکی، جہاں پھوپھینی، جی سے سرکا آدھا حصہ کچ کر ٹیٹ فمیں اور نیویں گھٹے سے، تھوری میں جھکی، ہو ہو کوکا کوکا کی بوتل لگ رہی تھی، یہی وجہ نانی محمد زہرہ کی گھوری نوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔



نانی محمد زہرہ اُڑی نے، وقت کی بھول سے یاد کی چنگاری اٹھائی اور پھونکوں سے اس پر جی راکھ اڑانے لگی۔ دُور ک بھولی بسری آواز کا چہرہ، اس کے نوٹے ہوئے دل کی اک تھی سی تھمت سے جھانکا گہرے گندی رنگ پر جھریوں کی آڑی ترچھی لکیروں کے درمیان دوا امید سے خالی بوڑھی آنکھیں، اس کے سامنے آن کر ٹھہر گئیں۔

امو! امورانی روتی کیوں ہے، آ میرے کول آ جا! آواز آئی اور آم کے نیچے کھیتی ایک تین سالہ گول مٹول پچی، جس نے سودنگ کی نیوی بیوفراک پہن رکھی تھی، نے اپنی تیز چمکیلی آنکھیں اس بوڑھی پر نکا دیں جس کے بھیتر کوئی ایسی بے چینی تھی جو اسے نکلنے نہیں دیتی تھی، اسی لیے کبھی وہ تیز رنگ کے چھنٹ کے جزدان میں لپٹا، قرآن کھولے، گھنٹوں کے حساب سے، لاہندے منہ کر کے ہل کر پڑھتی رتی، کبھی چاد چھنتی دکھائی دیتی، کبھی گندم سے بکھوڑے جو چین ڈھونڈ رہی ہے کبھی بھل وٹ رہی ہے، کبھی اچا رڈال رہی ہے اور کبھی نوکرانیوں کی خفیہ جاسوسی پر مامور دکھائی دیتی ہے مگر جب رات بھٹکتی ہے اور ساری خلقت آرام کی منزلوں پر بستر کرتی ہے تو اس وقت اس بڑھی کی لس ہو جاتی ہے، بستر پر پہروں کروٹیں ملتی رہتی ہے، یہ نہیں کہ اسے بے خوابی کا مرض لاحق ہے، اس بات صرف اتنی ہے کہ اس وقت دکھوں کی وہ گٹھڑی جو اس نے کئی کئی گانٹھیں دے کر مضبوطی سے باندھی ہوئی ہے کھل جاتی ہے وراک ک ہیز نسری نسری کرتی آزاد ہو جاتی ہے اور اس کے سارے "انجوں" میں پھیل جاتی ہے۔ اس کے بعد پرانی داستان گو بڑھی، جو ہیر وارث شاہ، سیف الملوک اور قصہ یوسف زلیخا پڑھنے میں دور دورا پناہی نہیں رکھتی، ہڑک کر کہتی ہے۔

دور و گئے تال ہائے گلے کوئی کوئی رہندا جہرے کے

امو! امورانی، آ میرا بچو، میرے کول، نیوی بیوفراک والی گول مٹول زمی کو بڑھی اپنی کمزور ہاتھوں میں بھر لیتی ہے اور ہلکتے دل کو تسلی دیتی ہے، نسری نہیں تو کیا ہو، موتو ہے۔ ہاں! موتو ہے اور عین اسی لمحے، گہری سیاہ کدھنی پٹوں والی نسری، جس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی اداسی جمع ہے دھم سے آن کر، بڑھی نانی کے سامنے اسادہ ہو جاتی ہے۔

"دور و فرق تیرے دایمنوں تاپ رہیا نت چڑھیا، نانی کے سوکھے لبوں پر یہ مصرعہ دم توڑ دیتا ہے اور وہ بے بسی سے ہلکتی ہے۔ نی نسروٹو مجھے بھل کیوں نہیں جاتی؟

ساڑھے تین بائی تین کا جستی صندوق جس کے کندے سے سیاہ تال جس پر چانکا کی سنہری مہر تھی لٹکا ہوا تھا، ایک پلاسٹک کی جھکی، پہنے والے کپڑوں کی دو چھوٹی چھوٹی پٹلیوں پر مشتمل کل اثاثہ اٹھائے، وہ دونوں ماں بیٹیاں، دور دور کے دھکے کھاتی، سیلنٹ ٹاؤن کی اس کوٹھی میں ڈیگروئے، اخل ہوئی تھیں (جہاں سے، صرف پچھ ماہ بعد نسری کا جنازہ اٹھا تھا) حیات بیوی نے آگے بڑھ کر خالہ اور اس کی بیٹی کو سینے سے لگالیا، جنہیں دیس والوں نے دیس سے نکال دیا تھا۔

نسری کو اپنے والدین دوسری شادی کا دکھ نہ تھا، دکھ اس بے قدری اور بے توقیری کا تھا جو والد اور اس کے گھر والوں نے کی اور انہیں اتنا شک کیا کہ وہ مہاجر بن کر وہاں سے نکل گئیں اور پھر پناہ کے نام پر خون کے رشتوں کی مکروہ شکلیں دیکھتیں، بالآخر وہ سوسائٹی اے میں پناہ گزین ہوئیں جہاں انہیں عزت بھی ملی اور محبت بھی۔



کارڈ میں نے کنگ یسٹر کا ہاتھ تھا اور گھٹنوں کے بل جھک کر بوسہ دیا۔ کنگ یسٹر نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا اور اس کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے گویا ہوا۔ کارڈ یہاں تک خداوند خدا کی وہ نعمت ہو جس کا میں کبھی شکر ادا نہیں کر سکتا۔ کارڈ میں نے سر جھکا لیا اور احقر نا دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔ ابا جی نے، چاچے رحے لمبر، چاچے سلطان رس اور سلطان ہاؤس والے چاچا سلطان کو بتایا، میری چھوٹی بڑی، ازمی بہت ذہین ہے اور مجھے اس سے بہت سی امیدیں ہیں۔



نسرو کی آنکھ سے ایک ننھا سا تارہ ٹوٹا اور جانے کس طرح اس جستی بیٹی میں جا گرا جس میں اس کے واضح کا سامان، اس کی مرگ سے پہلے اکٹھا ہو رہا تھا۔ کبھی بستر کی چادروں کے لیے سفید اور بونکی رنگی کے ٹی آ جاتی، کبھی تکیوں اور میز پوشوں کے بے چارہ سوئی۔ جسے کات کر نسری فنانٹ با بے رشید کو دیتی، جو گول چوک سے ٹھپے لگوانے اور کڑھائی کے لیے دھاگہ لانے چد جاتا۔ جب یہ کام ہو چلتے تو بڑے سائز کا فریم لگا کر، وہ سار وقت چھپی گلی میں چھپی چارپائی پر بیٹھی ان چادروں پر رنگ برنگی پھولوں کی نوکریاں کاڑھتی رہتی، سرخ گلاب، زریا، کارنیشن اور سورج مکھی کیا نہ ہوتا ان رنگی نوکریوں میں، جو چادروں کے چاروں کونوں پر دونوں میں کھل جاتیں اور سفید کے ٹی پر موسم بہار کی رت اپنا جو بن بے آ جاتی، دن رات کی مسلسل محنت کے بعد، جب چادر تیار ہو جاتی، تو نانی محمد زہرہ، نسری کو کوٹنے میں، مومن شوکت کا نام لکھنے کی ہدایت کرتیں، یہ ہدایت کرتے وقت ان کا چہرہ اک ایسی مسرت سے بھر جاتا جو ان کے چہرے پر اس سے پہلے کبھی کسی نے نہ دیکھی ہوتی۔ بظاہر تو نسری اس ہدایت پر توجہ نہ دیتی مگر بعد میں سیاہ پنسل سے خوشحالی کے ساتھ بڑا بڑا شوکت لکھنے اور اس میں سرخ اور ہزرائیکر کے دھاگے سے قصیدہ کاڑھنے تک، سر سے کر پاؤں تک، شرم سے گلابی ہوتی رہتی۔ پھر ان چادروں کو نہایت احتیاط سے دھویا جاتا اور استری سے ایسی سلونیں بھی نکالی جاتیں جو بظاہر دکھائی نہ دیتی تھیں، پیر سے ان چادروں کو سنوارتی ہوئی نسری خود بخود، شرماتی رہتی اس کا کنگ دنا چہرہ کبھی مدھم کبھی شوخ رنگوں سے مستقل سجا رہتا۔ راج کی بیٹی میں، بھیرے کے کھیسوں، در یوں اور چائناچی، شیشہ جال اور شٹیل کی آٹھ عدد درخانیوں سمیت، جانسن اینڈ برادرز کے ڈز سیٹ، چاندی کی نازک پیلیوں، چھبونی گاگروں اور فرانس کے بلوریں گلاسوں سمیت جتنے بھی اتنا نے ہوئے، حیات بیوی نے کیے کہ وہ تھی ہی ایسی، خاموشی سے محبت کرتی تھی اور فرض سمجھ کر خدمت کرتی تھی، سمندروں جیسے ظریف اور زمینوں جیسے گہرے محبتی دل والی وہ عورت، ہر ایک کے لیے اپنی اپنی جگہ پر بہت ضروری تھی، اتنی کہ اس کے بغیر، اس کے ارد گرد رہنے والے، اک قدم آگے بڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، نانی اور نسری تو تھیں ہی

اور اس

اور پھر کچھ عرصہ بعد سردیوں کی وہ طویل شام آگئی جب بستر مرگ پر پڑی نحیف داناواں نسری کے نتھنے پھڑکتے تھے، مارے ضعف کے اس کی آنکھیں مند مند جاتی تھیں اور دونوں پسپاں درد کی آگ سے بھری جاتی تھیں، اس کے چہرے پر اس وقت، دور سے فقط داسی کی ماری دو آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، بالکل دو دنیاں متکھنید جیسی اجڑی ہوئی

بیمار آنکھیں جن کی پتلیوں پر خوابوں کی لوٹ سیل لگی ہوئی تھی، خواب زندہ رہنے کے چاہے جانے کے، خوشیاں حاصل کرنے کے، جن کے بوجھ سے دہلیس کی پٹلیں، موت کی دسکوں سے بار بار کھتی اور بند ہوتی تھیں، ایسے میں وہ دروازے کی جانب بار بار دیکھتی تھی، خدا جانے کس کا انتظار تھا اسے؟ پانکٹی بیٹھی داستان گونانی کی زبان لکڑی ہو کر تاسو سے چٹ گئی تھی اور وہ جامن کے گھنیرے درخت کے پیچھے پیچھے، دسمبر کے ٹھٹھرے ہوئے سورج کی مدھم پید ہٹ دیکھ کر جھرجھری سی مٹی تھی اور اس کی بوزھی آنکھیں، خوف، صدمے اور جدائی سے لب لباب بھرتی جا رہی تھیں۔ اسی رات نسری چلی گئی، اس کی مہاجریت کے ایام بالآخر پورے ہوئے اور داستان گونانی کے سینے کے ڈھنڈار میں اس کی کہانیاں ہمیشہ کے لیے گم ہو گئیں اور ان کے کردار اپتے ہو گئے۔ اس نے نسری کے جہیز کا سامان، جو دو عدد دوپے کے ٹکڑوں، ایک عدد جستی چٹنی اور اس کے اندر نسری کے ہاتھ کی کاڑھی ہوئی چادریں، ٹیکے کے غلاف، کروشے کے موتی لگے رومال اور دیگر شیاں محلے کی غریب لڑکیوں میں بانٹ دیں اور خود کو چھوٹے چھوٹے معمولی کاموں میں مصروف کر لیا۔

☆.....☆.....☆

۱۲ بیان سرگودھا بتاتے ہیں، 22 فروری کی وہ رات، گرچہ چاند کی آخری راتوں میں سے ایک تھی، مگر اتنی تاریک اور گھمبیر نہ تھی، جتنی اُردی کو لگ رہی تھی، اس کا دل اندھیروں کی تہوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ روشنی، بوند بھر روشنی، جس کا ہاتھ تھم کر، اندھیرے کی سرنگ کو پار کیا جاسکے، واپس 287-A کی، مومن فضا میں جیا جاسکے، مگر چند گھنٹے قبل، چوک سیٹلائٹ ٹاؤن کے قریب ہری پورہ اور ہیڈ برج پر ہونے والے اک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ، اس کی زندگی کی ساری روشنی سمیٹ ساٹ، پی اے ایف ہسپتال کے آئی سی یو کو چل دیا اور وہ ؟

☆.....☆.....☆

جولائی ۱۱، سٹرائکی ہوئی رات کا آخری پہر چل رہا تھا، دیواریں دور سے سیک چھوڑ رہی تھیں اور اینٹ گارے کے مکانوں کے مساموں سے جس کے نوارے چھوٹ رہے تھے، ویہڑے میں پینڈنٹ فین کے سامنے قطر میں لگی چار پائیوں پر کالی اور ہنر کنی والے سفید کھیس بچھے تھے، جن پر سرسے گھروالے بے خبر سو رہے تھے، پانکٹی کی جانب تھوڑا ہٹ کر، نوکرانہوں کی دانی چار پائیوں سے خزانوں کا شور اٹھتا تھا اور پرانے پینڈنٹ فین کی گھوں گھوں میں گم ہو جاتا تھا، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھا پوٹلی کی طرح پوٹے پوٹے پیر دھرتی، چونکی نظروں سے دیکھتی، لکڑی کا خشکی دروازہ کھوں، نالی کی طرف نکل گئی، گھر کی پچھلی دیوار کے ساتھ بہتی یہ نالی اور اس کے گرد و پیش کا اجڑا ہوا، بظاہر تو نوکرانیوں کی رفع حاجت اور کپڑے دھونے کے لیے مخصوص تھا، مگر درپردہ وہاں ایسی سرگرمیاں زیادہ ہوتی تھیں، جو سرعام نہیں، چھپ کر کی جاتی ہیں۔ ابھی اس نے نالی کی پلپا پر بیٹھ کر، آنکھوں پر پانی کا پہلا چھپ کا ہی مارا تھا کہ تاریکی چیرتا، شہوتوں کے جھنڈ لٹاڑتا، پتے کھڑکا تا، آہٹ بجاتا، رحمت نکلا اور شکرے کی طرح اس پر جھپٹ پڑا، پھا پو کے وجود سے چھوٹی پسینے اور مختلف ماسوں کی ہواؤں کو سونگھتے ہوئے اس کی سیاہ رنگت، منجے ہوئے تانبے جیسی ہونے لگی اور اوپر کے دو لمبے دانت، کٹھن خبیث مسکراہٹ سے مزید نوکیلے لگنے لگے، جو پھا پو کو دیکھتے ہی اس کے پورے وجود پر چسپاں ہو گئی تھی۔ چھوڑ مجھے کوئی آجائے گا، اس کی گرفت سے نکلنے کے بجائے وہ مزید اسے چٹتی ہوئی بولی۔ کوئی آتا ہے تو آئے، آج تو میں نے امب کے اچار کی یہ پوری پھاڑی کھا دی، بنا نہیں ملنا، حافظ آباد سے تعلق رکھنے والا ادھیڑ عمر ڈرائیور پھا پو کے کنوارے لمس سے بے حال ہوا جا رہا تھا، کتنی حرام دی دور سے دھیریاں دیتی رہتی ہے، تڑپتی رہتی ہے آج بڑی مشکل سے قابو چڑھی

ہے، چھوڑوں گا نہیں۔ شکل سے ٹھیک ٹھک شریف اور بھلا، نس لگنے والا رحمت، اچانک ہاتھ آنے والے اچاری مرتبان کا بند ڈھکن کھولنے کے لیے بے وسہ ہوا جارہا تھا، پھا پو بھنویں پھینکتی مگر س کے کسے ہوئے وجود سے اٹھنے والی ہلکی امی کی کھٹی خوشبو، اتنی سوا دی تھی کہ وہ لوں رالیں نیکانے لگتا تھا اور دماغ نشے کی حالت میں گھومنے لگتا تھا۔ اب اسے اتفاق کہیں پاپا پو کی بدبختی کہ پیڈ شل فین کے سامنے لگی چار پائیوں کی قطار کے آخری سرے پر سوئی ہوئی، نانی محمد ہرہ کی آنکھ بے نیکی کھل گئی، انہوں نے آنکھ میچ کر، صبح کے تارے کا مقام دیکھا، فجر ابھی دور تھی، منی پر دوبارہ لیٹتے ہوئے، ان کی نگاہ ہوتا نوکرانیوں کے حصے پر پڑی، پپا پو کی منی خالی تھی، اس کے بعد کیا ہوا، غائبانہ بتانے کی ضرورت نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے مگر کے بڑے ستور میں، جہاں اوپر نیچے جڑی ہوئی چار پائیاں اور چوکیوں پر رکھی پیٹیاں اور گندم کے بھڑدے تھے، وہاں نیلوں پر گرم ریت کی ٹکوریں کرتی اور پھنوں پر بلدی تیل کا پکوان بڑا باندھتی، پپا پو کی حالت خارش زدہ کتیا جیسی تھی اور رحمت کو لمبی رخصت پر حافظہ باندھ بیچ دیا گیا تھا، جس کے بعد ایسے ”قاسد“ خیالات رکھنے والی دوسری نوکرانیوں کو بھی دقتی طور پر کان ہو گئے تھے اور بڑی بڑی نانی محمد ہرہ کی جاسوسی مصیبتوں کی دل سے معترف ہو گئی تھی۔

☆...☆...☆

تین، چار، پانچ، آدمی نے ایک دفعہ پھر انگلیوں پر گنا، اباجی کے ہوسپتال جانے کے بعد وہ جب بھی چند گھنٹے آرام کے لیے گھر آتی، تو اسی طرح، بار بار، ان کے گھر سے جانے کے دن گنتی اور گھبرا گھبرا کر سو جتی، اتنے دن ہو گئے ان کی سیاہ گرگابی کی چاپ سے یہ گھر محروم ہے۔ نہرو، آشی، بونے کو کسی نے وجہ بے وجہ آواز نہیں دی۔ ریڈیو بی بی سی کے لیے، ویڈیو میں سر شام میز رکھنے کا اہتمام بھی نہیں ہوا، وہ ہے کا چمکین، ستاؤہ بھی کسی نے نلکا گیر کر نہیں بھرا، اور تو اور عصر کے بعد، گھر میں انگلیٹھی دہکانے کا اہتمام بھی نہیں ہوا اور تیر کا پتل شور بہ، تھوری روٹی اور گاجر کا حلوہ، جو سر شام اس کی میز پر لگ جاتا تھا وہ اتنے دنوں سے گھر والے بنانا ہی بھوں گئے، اس کے باوجود یہ گھر چل رہا ہے، کیسے چل رہا ہے؟ انو، میاں جی کی غنئی تیار ہو گئی ہے، جلدی لے جاؤ، آشی کی آواز کہرام کی طرح، اس کے اندر رنج گئی، بخن، ہوسپتال اور میاں جی کو مٹی نیشن کچھ بنا نہیں... مگر اس کے باوجود...؟

☆...☆...☆

کوٹ فضل احمد کی حویلی کی اونچی دیواروں سے پچھ نوں ڈھل رہے تھے، در و میڈرے کے لہندے پڑے، بارہ در کی دیواروں کو چامتے، مدھم ہو رہے تھے، لکڑی کے پانچ فٹ اونچے اور دس بائی دس فٹ کے مستطیل تخت پر، رات کے کھانے کے برتن بھٹدے، دیہاتی دسوں کے مطابق جڑے ہوئے دور سے لشک، مار رہے تھے، کھاتوں پلیٹی اور علی دی، بالٹیاں بھر بھر، ویڈرہ تر دک رہی تھیں، کچی مٹی کا وتر اور اس سے ٹھنکی خوشبو، جامن، سوڑے اور سکھ چین کی خوشبوؤں سے مل کر خوشبو کا کایسانیا فیور بنا رہی تھی جو دنیا کی کوئی خوشبوئیں کشید کرنے والی فیکٹری تیار نہیں کر سکتی، جن کے درمیان اونچی، باریک بان کی چار پائی پر بیگم بیوی بیٹھی، ہیر وارث شاہ کے بیت اٹھاتی تھیں اور ماسکھراتی انہیں پٹکھا جھتی تھی۔ دفعہ زمین پر تھ کر بیٹھی سجاتی دیندارنی نے ہانک لگائی، ”بیگم بیوی دی سوتی جوڑی دی خبر، شاد و سدی رہوے، عباد رہوے۔“ حویلی کے صدر دروازے سے میاں محمد علی اور نواز شہ علی اندر داخل ہوئے۔ ”ہیں نی ساجیے، تینوں خشبو آگئی ہائی۔“ کھاتوں نے حیرت سے پوچھا، سبانی نے ہاتھ پر رکھی باسی روٹی کا ٹونا لپیٹ کر منہ میں دھکیلا اور گھٹ پان کا بھرتی بمشکل بولی، ”خشبو کیویں نہ آوے، اس کانک نہیں کھاتی میں۔“

نیگم بیوی کے ملائم چہرے پر بیٹوں کو دیکھ کر خوشی کی جوت چلی، جو فوراً ہی بجھ گئی۔ انہیں پیار دیتے ہوئے نیگم بیوی نے اس کے عقب میں دو رتک متلاشی نگاہ دوڑائی جو پلٹی تو اپنے ہمراہ گہرا طلال اور لمبی افسردگی لائی جس نے ان کے روشن چہرے کو تاریک کر دیا، کتھے گیا میرا، شیر محمد، میرا حسینہ پتر، ایک لمبی سہانہ کے سینے سے جدا ہوئی اور لمبے پیڈ سے مارتی عرش بریں تک پہنچی، جہاں سفید براق لباس میں شیر محمد موجود تھا اور دکھ سے ماں کے دل کو دیکھتا تھا۔ دونوں بیٹے ان کے واسطے باہنے بیٹھے تھے، ایک نے ماں کو تھپے میں لے لیا، دوسرے نے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیے۔ بے بہہ جی شیر محمد کو بھول کیوں نہیں جاتیں، وہ جنتوں کا باشندہ، اب اس مٹی سے اس جیسا کہاں نکلے گا، صبر کریں، آپ تو سدا کی صابر ہیں۔ میں تو صابر ہوں بچو، مگر میری مامتا نہیں صابر، یہ مجھے ساہ نہیں پہنے دیتی بڑا تنگ کرتی ہے۔ بے بہہ جی، ہم ہیں نہ آپ کے پاس، کبھی آپ کے احترام میں کی کی ہو تو بتائیں! نہیں جانتے، تم دونوں نہیں جانتے۔ شیر محمد، سینے سے ہٹے تو میرا اندر سرت پکڑے، مجھے ہوش آئے دیکھو، ادھر دیکھو، انہوں نے دونوں کے ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لیے، یہاں بیٹھا ہے میرا شیر محمد، اپنے سوٹوں اور بوٹوں کے ساتھ، ہٹے تو، نیگم بیوی کو کچھ بھائی دے، وہ اپنے آپ میں واپس آئے، روح قلموت میں لوٹے، ہوش کی فکر کرے۔ فارسی، اردو اور پنجابی میں یکساں دسترس رکھنے والی نیگم بیوی، سناہوں کا بھرا ہوا صندوق اپنی چار پائی کے ساتھ رکھتی تھیں، جس سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جدائی کے مضمین پڑھتی تھیں اور گھنٹوں بلکی آواز میں شیر محمد کو روتی تھیں۔ نہیں کیسے سمجھا جائے، کیسے حوصلہ دیا جائے، دونوں بھائی گہری سوچ میں ڈوب گئے اب تو شیر محمد کو گئے بھی سات برس ہو گئے بے بہہ جی، کچھ تو خود کو سنبھالیں۔ او۔ بچو، مجھے تو ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ بھیرے سے اس کی منہ آنے کی گھڑی جیسے ہر وقت مجھ پر گزرتی رہتی ہے۔ اور اس کے وچھوڑے کی چکی کے پڑوں میں میری جان ہر ویسے پستی رہتی ہے، ململ کا پوآنکھوں پر رکھ کر، وہ پوری جاں سے یوں ہچکولے کھانے لگیں، جیسے کوئی دخانی جہاز ڈوبنے سے پہلے، طوفانوں کی زد میں آ کر بری طرح ڈولتا اور ہچکولے کھاتا ہے۔ زمانہ شناس، سبانی دیندارنی نے بھانپ کر جلدی سے وین کھینچا، شیر محمد دے اپنی کرسی آلیا کھاتوں (خاتون) اور ملی دی (بھٹ مل) بھی جھٹ پٹ پانی کی بالٹیاں پھینک، منہ پر پلاڈل کر اس کے قریب بیٹھ گئیں، شیر محمد اے اچے نانویں آلیا، بیٹوں کے رپ ویزرے میں و دروہوں کی طرح چکرانے لگے، حویلی کی دیواریں، بارہ دری کی محرابیں اور وترتی ہوئی کچی مٹی کے سینے میں، بیٹوں کی میٹھیں پورے زور سے کھینے لگیں اور سات برس قبل، مختصر بیماری کے بعد، دنیا سے جانے والے نوجوان شیر محمد کا وچھوڑا، نیگم بیوی کے مٹھو سینے سے ہی نہیں وہاں موجود تمام جادو اور بے جان چیزوں کے طعن سے جھانکنے لگا، ”شالا کوئی انج نہ جائے، دے میرا افسر پتر“ نیگم بیوی کے سفید ململ کے دپنے کا پانا پڑانے لگا، اور دور کوہ مری، کشمیر پوانتھ سے سرکاری بنگلے کی فرنیچ وندوز اور ٹین کی تحریکی چھتوں سے لپٹے ہوئے دھوئیں کے بادلوں کی ٹہنی بنگلے کے مساموں سے قطرہ قطرہ بننے لگی، شیر محمد کے کمرے کی دیواروں سے مٹی فرن اور جھومر بیل کے نارنجی پھولوں کی کنواریاں، اداسی سے ایک دوسری کی جانب دیکھنے لگیں اور دیوار اور چیل کے درختوں کے نیچے رکھی، شیر محمد کی کرسی اور میز کی خالی جگہ اک ایسے مرعے کے مانند دکھائی دینے لگی جو پڑھنے والے کے لب سے ادا ہوئے بغیر گریں ہو۔ قبر کی مٹی اوڑھ کر، ہمیشہ کی نیند سو جانے والی میاں شیر محمد، اپنے خاندان کے ایک ایسے کردار کی صورت، ان کے درمیان ایسے رہنے لگا جیسے وہاں سے کبھی، کہیں نہ گیا ہو۔

☆...☆...☆

آزمی نے ابا جی کے بند کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر زمریو کا سرخ بلب جلا دیا۔ کمرے میں پھیلی

مہم سرخی کا غبار چر کر ایک آواز آئی کون؟ جی اُرمی! آجیو، میرے پاس آ جا وہ آگے بڑھی اور بستر پر رکھی جاسی رنگ کی شیل کی بھاری رضائی اٹھا کر کونے میں ٹکائی اب جی! اُس کے ہونٹ ہلے روئی کے تخت بجیے سے ان کے تیل کی مخصوص مہک اٹھی اور سرخ و حسد لی روشنی میں بیٹے کمرے کی فضا کا حصہ ہو گئی۔ اُرمی نے اک سب سانس کھینچی جیسے اس مہک کو روح کے باطن میں اتار رہی ہوتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ کاشن کی سفید چادر پر ہولے ہولے ہاتھ پھرتے ہوئے وہ مسکنے لگی، با جی! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی یہاں۔ خدار واپس اپنے کمرے میں آ جائیں، اب جی! دوسو ستاسی اے میں آ جائیں، اپنے گھر آ جائیں!..... ابابا جی! میرے پیارے ابابا جی!

مادی ستونے تنوری میں جھلکا ڈال، کا کونے بارونگ کرتے سے کنو کن بھری ہوئی منی کی صحنکیں اپنی طرف گھسیٹیں اور بسم اللہ پڑھ کر پہلی صحنک میں پانی ڈالا، بابے رشید نے جاسن کی گھنی چھاؤں تلے رکھے پورے بھرے چوہے میں پتلے بالن کی نئی چھڑیاں لگائیں اور بھنے ہوئے چوزوں کو دم پر لگا کر پلاؤ کے لیے جدی جدی پیاز کے لمحھے کاٹنے لگا، پڑنگ، آلو گوشت، روسٹ، ور قیہ کرے بنا کر آشی گلابی کارمیکا کی نئی، سینٹنگ نمبل پر پڑ کر تے ہوئے، گلابی چیریر والا بون چائنا کا ڈز سیٹ لگانے لگی جو خاص خاص موقعوں پر ہی، شیشے کی سلائیڈنگ سائڈ بورڈ سے باہر آتا تھا۔ اسے احتیاط سے لگاتے ہوئے، آشی بار بار دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی، جہاں اب بابا رشید کا کو سے جھو جھو رہا تھا، ”ایہہ مذہراتے پاگل ہو گیا اے، ہر ایک دے گل پون لوں وگدا اے، پتہ نکل بیوی جی نے اسے کیوں ڈھیل دی ہوئی ہے۔“ آشی کی چونک اس سے تازہ تازہ جھڑپ ہوئی تھی اس لیے اسے اس پر تاؤ چڑھا ہوا تھا۔ گلاس، کنٹری اور سلاڈ نمبل پر سیٹ کرتے ہوئے آشی کے کان گیٹ پر لگے ہوئے تھے جس کے سامنے میاں جی، گھڑی میں بار بار وقت دیکھتے نہل رہے تھے، شیخ حادف نے بارہ بجے پہنچنا تھا اب پورے دو بج رہے ہیں۔ انہوں نے شیخ زید بن سلطان النیہان کے ٹریڈ منسٹر کی استقبالیہ ٹیم کو غائب چوتھی دفعہ کہا، جو مکے کے معززین اور گھریلو ملازمین کے علاوہ، ان کے جڑی کے تلی بلی، چار چاروں چاچے سلطان راں، چاچے رجاوے روانے اور چاچا ڈاکٹر مظہر ملک، جو سول ہسپتال سرگودھا کے ایم ایس ہونے والے تھے، پر مشتمل تھی اور پھر ٹہلنا شروع کر دیا، میاں جی بیٹھ جائیں، وہ بادشاہ لوگ ہیں خدا جانے کب آئیں، چاچے مظہر ملک نے کہا۔ ملک جی، اب تو فکر ہونے لگی ہے، آخر وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے۔ دیر سو رہتے ہندی ای ہے، میاں جی، لمبیاں سفر اس وقت۔ چاچا سلطان راں نے کان کھاتے ہوئے کہا۔ ہیں، ہیں گیٹ پر بھونپو نماہارن گونجا۔ لگتا ہے پروہنے آگئے ہیں۔ ابابا جی، بعد استقبالیہ ٹیم پکتے ہوئے آگئے بڑھے۔ ابلا دسہلا، کہتے ہوئے شیخ حادف نے ملائم ریشم کا جبہ سنبھالا اور ریخ رو در سے بمشکل اپنا وجود اور جبہ نکاتے ہوئے ابابا جی کے گلے لگ گیا اور عربی روان کے مطابق ان کا پر جوش بوسہ لیا اور محض کے معززین اور استقبالیہ ٹیم کے ارکان سے بھرپور سحافتے کے بعد قطار میں لگے ملازمین کی طرف بڑھا جو صبح سے نہا دھو کر، سروس کا تیل چڑے، آڑی، انگلیں نکالے، اپنے بہترین کپڑے پہنے مہمان کے انتظار میں سوکھتے تھے۔ شیخ حادف نے ان سے آدھے چپے کا مصافحہ کیا اور اپنے سانوںے، مگر خوشبودار ہاتھ پر لگی غیر جواہراں کے میلے ہاتھوں کو دور سے دکھا کر، شوق اور بے قراری سے، دوبارہ ابابا جی کی طرف پکا جواس دوران ہاتھوں پر چرمی خول چڑھائے، اپنا نایاب چٹا چرگ، ہاتھ پر بٹھائے اس کے نرمیلے جھاگ جھاگ پردوں پر، محبت سے ہاتھ پھیر رہے تھے، یوں جیسے اس کی چینہ سہلا رہے ہوں، اس نایاب پرندے کے لیے، ابو ظہبی سے کرچی، کراچی سے لاہور اور لاہور سے پورے 6 گھنٹے کا سفر ماروا، رطے کرنے کے بعد، سرگودھا پہنچنے والا شیخ زائد کا نمائندہ جت لگی بے تاب ہوتا کم تھا۔ چٹا چرگ، جسے چند روز قبل ابابا جی نے اپنے تجربہ کار

شکاریوں کی ٹیم کے ساتھ تھل کے ریتے سے پکڑا تھا، اس کی دھوم قرب و جوار سے نکل کر اب دور دور پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے، اس شوق سے وابستہ لوگوں کا آنا جانا شروع تھا، باجی مصروف تھے، باجی خوش تھے کہ انہوں نے ایسا پرندہ پکڑ لیا جس کی نسل دنیا میں نایاب ہو چکی ہے، یہی وجہ شکار سے واپسی کے بعد ان کا زیادہ وقت، پرندے کے ساتھ گزر رہا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب تیل کی دولت سے تازہ تازہ مال ماس ہوئیں، عرب ریاستیں، دوست کے اس اچھارے کو دور کرنے کی خاطر، یورپ میں درہم و دینار بھرے، بدواں وحشت کے ساتھ، پوری دنیا میں تفریح اور سروساہت کے نام پر اک ایک بے گام عیثیٰ کو فروغ دینے جا رہی تھیں، جو آنے والی دہائیوں میں نہ صرف عربوں کی عیش پسندی، مابلی اور سیاسی کمزوری کی علامت بننے والی تھی بلکہ خطے میں صیہونیت اور امریکی سامراج کی بالادستی کا سبب بھی بننے والی تھی۔ مصر میں فوجی انقلاب نے شاہ فاروق کا دور جبر و ختم کر دیا تھا مگر اس کے بعد کرنل ناصر کی حکومت تیزی سے اپنے فیصلے کیے جا رہی تھی جو بڑی طاقتوں کو پس پردہ خطے کا کنٹرول سنبھالنے میں بے حد معاون ثابت ہو رہے تھے، اخوان المسلمین جیسی سیاسی اور مذہبی نمائندہ تنظیم پر سختی شروع تھی، جو انٹیکو مصری پیکٹ کی مخالفت کر رہی تھی، استاذ حسن انبا کی شہادت کے بعد اب سید قطب کی باری آ چکی تھی جن کی فکری رہنمائی میں اخوان اپنے مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔

سید قطب تمام مغرب پسند عرب حکمرانوں کی آنکھ کا شہتیر بنے ہوئے تھے، اردن کے گلپ پاشا نے انہیں، اردن میں داخلے کی اجازت نہ دے کر سرعام اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا، اخوان تمام پیش پسندوں اور مالوں کے لیے چیخ بن چکی تھی لہذا سید قطب کو اپنی شہرہ آفاق کتاب ”معاہد فی السطریق“ پر سزائے موت دے کر، بڑی طاقتوں کو ہرل اسلام کا پیغام دینے والوں نے اپنی وفاداریوں پر تو مہر لگادی، مگر دنیا نے اسلام کو ایک دردمند مسیح اور رہنما سے محروم کر دیا۔ تیل کی دولت، وادی یس اور اس کے بھائی بندوں کے سر کو چڑھ چکی تھی، سید قطب تختہ دار پر کھڑے کر رہے تھے میرے دوست! معرکہ عشق سے میں ہرگز نہیں اکتایا اور میں نے ہرگز ہتھیار نہیں ڈالے، اگر تاریکی کے لشکر مجھے چاروں جانب سے گھیر بھی لیں تو بھی مجھے صبح کے طلوع کا پختہ یقین ہے۔“ ”وہ صبح طلوع ہو چکی ہے، چشم حیراں بکھر کر دیکھتی ہے، پچھلی صدی میں جس سحر کی، ہتھابوئی تھی، اب اس کا اجاں، مصر کے باہر دور کے اندھیرے بھورہا ہے، اخوان المسلمین کے محمد مرسی، اسد می تشکیل نو کا آغاز ہیں یا دنوں کا اسٹ بھیر، یہ فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ ہاں ادھر ترکیہ میں بھی یہی محیر العقول سلسلہ چل نکلا ہے، ”مولانا طیب اردگان“ دوسری بار جدیدیت پسندوں کے سینے پر موگ دلتے مفتخ ہوئے بیٹھے ہیں اور ان کی ہلیہ نے خاتون اول کا ٹائٹل لینے سے انکار کر دیا۔ یہ خدفت کے مرد بیمار کی شغیہ بی کا اعلان ہے یا محض ملت اسلامیہ کی انگڑائی، کیا معلوم؟ ابو ظہبی، عمان اور بحرہ کے شیوخ نے تلور کے شکار کے لیے خواجہ فرید کی روپی میں ڈبرے ڈال رکھے ہیں، وہ حوروں پر یوں کے نولے کھوجنے اور برہوں کے جھولے جھولنے نہیں، اپنے اپنے بازوؤں، ہاریوں، عقابوں اور چرگوں کی سپاہ لیے چوستان میں سیزن کے سیزن اترتے ہیں بالکل موسمی پرندوں کی طرح، جو منجھد موسموں میں گرم پانوں کی تلاش میں میدانی جھیروں کے کنارے اترے ہیں اور جب برف کے شیشے کی تہیں ٹڑخنے کے دن آتے ہیں تو پرے باندھ کر ہزاروں میل کی مسافتیں طے کر کے اپنے وطن کو مٹتے ہیں۔

ان شیوخ کا بھی یہی چلن ہے جنہوں نے اپنی ریاستیں تو متحد کر لیں ہیں اور شیخ زائد کو اپنا بیڑا بھی مان لیا ہے مگر شوق میں اب کوئی مذاق نہیں یہی وجہ ہے چوستان میں رات کو دور سے دیکھو تو، برقی قنصوں، آگ کے جلتے الاؤ اور آوازوں کی بھنبھناہٹ، الگ الگ خیمہ گاہوں کی خبر دیتی ہے، ان خیموں کے شہروں میں جزیروں، رسد کی جھپوں، بیوی

ویٹ ویٹکل اور صحرا کی قدیم سواری، اونٹوں کی لمبی قطاروں نے جنگل میں منگل کا سماں باندھ رکھا ہے۔ جب ان اونٹوں کے ساربان صحرائی وحشت میں بھری آواز میں، ”آچنوں رل یار“ گاتے ہیں تو چاند ٹھنڈی چاندنی کی چوٹیوں پر کھڑا، دور سے ریت پر کندیں پھینکتا ہے اور محبت پسند دلوں کو شکار کرتا ہے، عرب شیوخ کے پرندے فضا میں غوطے لگاتے ہیں چرگ فضا سے بیٹھتا ہے اپنی پرداریں پھیلائے کے شوق میں ہانپتے ہیں اور عقاب، پٹ پٹ کر جھپٹتے ہیں مگر کس پر؟ صرف اس ننھے پرندے پر جس کی ننھی ننھی آنکھوں میں خوف بھرا ہے، جس کا دل تیز تیز اچھلتا ہے اور جس کا گوشت لذیذ ہے، بے حد لذیذ، اسی لیے اس پر باز جھپٹتے ہیں۔ خوبی بھی کتنی بڑی مصیبت ہے۔

روہی محروم تھی، روہی محروم ہے، وہ ملک، مہدوم، سردار جو، اس کی ملکیت کا حق صدیوں سے اپنے نام محفوظ کرائے بیٹھے ہیں، روہی نے ان کی کبھی شکل نہیں دیکھی، ان کی آواز نہیں سنی، اس کے بے ٹوئے، پیلوں اور جھاڑ، اسی لیے ابھی تک اپنی پرانی ساخت اور قسمت نہیں بدل سکے، ہاں یہ شیوخ۔ یہ شکاری، جو خود ریت کی بولی جانتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں، انہوں نے روہی کو محرومی سے بچانے کے سلسلے شروع کر رکھے ہیں، رحیم یار خان میں شاہی محدث و شکار گاہیں، جن میں ہرن قلائچیں بھرتے اور تیز چچی اڑنوں میں، پتہ پتہ ڈالی ڈالی گھومتے نظر آتے ہیں، ان شیوخ خصوصاً شیخ زاہد کا یہی کم ہیں جنہوں نے روہی میں پانی، سکول، ہسپتال، ڈسپنسریں اور سی نوع کے کئی رفاهی کام شروع کر رکھے ہیں جو آگے چل کر اس علاقے کے زخموں پر پھا ہے رکھنے اور محرومی کی ذلتیں کم کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہونے والے ہیں۔

☆ ☆ ☆

میاں جی! انکھیں کھولو جی اور دیکھو تے کون آیا ہے، بوٹے مصی کی جانگلی آواز آئی۔ سی یور میں بھاری پتھری طرح گری، میاں جی نے آنکھیں کھولیں، سامنے دیکھا ”کارڈیلیا آئی“ ان کی آواز اور ہونٹوں کے پھیلاؤ سے معلوم ہوتا تھا، اسے دیکھ کر وہ خوش ہوئے ہیں، کارڈیلیا بچو آ میرے پاس آ کے بیٹھ۔ وہ گری پر تنگ تھی اور اس نے خود کو پھر ایک دفعہ بتایا، ابا جی اب خطرے سے باہر ہیں۔ ڈرپ اتر چکی ہے۔ فوڈ پائپ بھی اتر چکی ہے، یہی لیکوئیڈ لے رہے ہیں باتیں بھی کرتے ہیں، صحت کی سرخی بھی رنگت سے جھلکتی ہے، نیند بہتر ہو گئی ہے اور چیٹ انفیکشن کا نام و نشان گیا۔ پھر یہ دس کیوں نہیں ٹھہرتا۔ کیوں جرات نہیں پکڑتا، اس کے حوصلے کیوں س قدر مدھم ہیں؟ ”خدا جانے کیا ہونے والا ہے؟“

☆ ☆ ☆

باتشاه کے محل میں پہنچ کر، بخشے بازدار کی آنکھیں پھٹنے لگیں، کرشل کے قانون جن کی دودھیا چمک آنکھوں کی جنی دھیری کے اندر گھسٹی چلی جاتی تھی، عالیچہ ایسا کہ پاؤں رکھو تو گم ہو جاتا تھا، خشکی ایسی کہ آنکھیں نشیوں کی طرح بے وقت جڑنے لگیں، وسیع و عریض مہمان خانے کی دیواروں سے معطر ہو کے کو سے کو سے جھوسے بڑھ بڑھ کر اس کا پالے کا مارا ٹھنڈا پنڈ تھپتھپا رہا ہے تھے جیسے اماں لوریوں سنار ہی ہو، تھپ تھپ کے اللہ ہو کہتی سر رہی ہو، وہ شدید حیرانی میں، میاں جی سے پوچھ رہا تھا، پکھاتے کدائیں نظر نہیں آوند، میاں جی! یہ کوی واکہاں سے آ رہی ہے جس کی نگہ دلوں کو چڑھتی ہے۔ میاں جی، اندر سے پر بھیجی رواج موٹی سف دامن دولن قالین پر، رکھا حقہ گڑ گڑاتے ہوئے اطمینان سے بوئے، اذخشی! وہ سامنے دیکھو، دیوار میں نئی واکا ہیر لگا ہوا ہے جس کا چمکا ہوا پھینکتا ہے۔ پچھا جی، کہتے ہوئے بخشا، حسن بن صباح کی جنت میں اترے بدحواس فدائی کی طرح لگ رہا تھا، ماحول نے اسے حشیش کی ڈبل ڈوز پلو کر گنگ گردیا تھا، سودا گئی کر دیا

تھا، ٹھنڈے مشروبات سرو کرتے پیرے بے موسے پھلوں کے سنہری طلشت، خوشبودار چائے، پیالیاں ایسی نازک ہاتھ لگانے سے ٹوٹنے کا ڈر، شیشے کے چمکیلے گلاس، جن میں پانی چاندی جیسا دھائی دے اور ان گھسوں میں جھاگ جھاگ چٹا کولا ڈا، پلے چھوڑتی کوکا کولا، دودھیارنگا پینچی کا شربت اور نجانے کیا ہے آرہے تھے۔ آنکشا بیچارہ کیا جانے، بس دیکھتا تھا اور دیکھتے دیکھتے سوچنے کے قابل بھی نہ رہا تھا، اس ماحول میں اتنی مرغوبیت، اتنی شوکت تھی کہ کوٹ عنایت خاں ضلع جھنگ کا تھلوچی بازار بازو پر چونڈیاں کاٹ کاٹ، خود کو یقین دلاتا تھا، یہ خواب نہیں حقیقت ہے، وہ شیخ زاہد کے رحیم یار خان کے محل میں ہے اور حیاتی اسے اک اونچے درجے کے پل میں لے آئی ہے، جسے وہ نظریں چڑھ کر دیکھ رہا ہے، اس سب کتتری کے مارے کبھی ایسی تہ بند کے لڑکھٹا، کبھی ڈب سیٹھا اور کبھی خواہ مخواہ گھٹنے جوڑ کر میٹھے کی کوشش کرتا اور کبھی سر جھکا کر قالین کے اوئی ریٹے، اپنی سیا دکھاں والے کھر درے ہاتھ سے کھینے لگتا۔ اونکشا چرگ کھسے اے؟ میاں جی! شیخ ہوراں نے لے لیا تھا کہتے تھے، جھٹ ہک اپنے کول رکھیں گے۔ کیہو شیخ؟ جی جیہڑے سرگودھے گئے تھے اور زمیں یہاں لائے ہیں۔ اچھا شیخ حادف۔ جی میاں جی! یہ جوش حادف ہے نہ نکشا، شیخ زاہد نے اے ابو ظہبی کی سب سے وڈی وزارت دی ہوئی ہے، بڑا اعتبار ہے شیخ زاہد کا اس پر، سارے اہم کام یہی کرتا ہے۔ میاں جی نے نکشے کو رازدار نہ بتایا، دیکھا نہیں تم نے، کیسے ہمیں قائل کر کے یہاں تک لے آیا ہے ورنہ میں اپنے شوق کی چیز کسی کو دینے کے متعلق سوچ بھی سکتا تھا، چاہے وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، جی ٹی آپ باتشہ ہو میاں جی، کسی سے گھٹ تو نہیں۔ گل ایہہ ہے نکشا، میاں جی اس کی سن ان سنئی کرتے ہوئے بولے۔ بادشاہ کوئی بھی نہیں ہوتا، بادشاہ انسان کا اخلاق ہوتا ہے۔ جتنے عرب ہمارے پاس اس چرگ کے لیے آئے ہیں ان سب سے اس عرب کا اخلاق اچا ہے، یہ نہ ہوتا تو میں اس کے ساتھ اٹھ کر تنی دور آتا؟ جی ہاںکل میاں جی، نکوناں، گلے تھے (ہر بات پر) کیڈی سوئی، واللہ واللہ کر دالے، اس واللہ آتے تے میرا جی ٹھر ٹھر جاتا ہے۔ ماں، زبان بڑی مٹھی ہے شیخ حادف کی، میاں جی نے تائید کی اور حقہ ٹرگز انے لگے۔ پر کب گل آکھاں میاں جی! نکشہ جھجکتا ہوا قریب آیا اور ادھر ادھر راز دانہ انداز میں دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ اگر ہم یہ کچھ موچ دیتے تو ہمارا ہال کمرہ چھت تک روپیوں سے بھر جاتا، عرب شہزادے ترلے پا گئے ہیں میاں جی! نکشیں اونکشا! چبلاں نہ مار، بھلا میاں وازش ہو اور کچھو دیتے، میں نے روپیوں کو بھلا لگائی ہے، اللہ نے لوڑاں جو گے بہوں دیئے ہیں۔ ادھر رحیم یار خان کے ابو ظہبی چلیں میں، میاں جی اور ان کے بازدار کے، مین یہ گفتگو چل رہی تھی اور ادھر، شیخ حادف، صحرا میں، شہی کیمپنگ کی یکپہنچ کے ذریعے، شیخ زاہد کو نایاب پرندے کے حصول کی خوشخبری سن رہا تھا، شیخ نے مہمانوں کو اگلے روز اپنے صحرائی مسکن پرانے کی دعوت بھجوائی تھی۔

صبح، چولستان پر سورج سونے سے دھلی کرنوں کی پچکاریاں پھینک رہا تھا، کہیں زرد، کہیں نارنجی، ریت کے ٹیپوں پر دھوپ کا سونا، سورج کی رفتار کے ساتھ، رنگ بدل رہا تھا، ریت کے مساموں سے تپش اٹھ اٹھ آسمان کو چڑھتی تھی، جسے ٹو کے ٹھکڑا اور دلوں کی صورت اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے، یوں جیسے جیسی عورت بچہ اٹھائے پھرتی ہے۔ رومی کے بے ٹوئے اور جھاڑیاں، چھوٹے پرندوں، پالتو جانوروں، نیلے پیلے سرنگ گلابی رنگ کے گھاگروں اور بے گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپے، سیاہی مائل تپکتے چہرے وئی عورتوں اور ان کے سروں پر رکھی ٹھڑوں کی قطاروں سے جیتی جاگتی لگ رہی تھیں، ریت کے حد نظر بچھاؤ پر دور دور تک سورج کی تیکھی چمک، آنکھوں کے اندر گھسکتی تھی اور چہروں پر تمازت کی سرخی چھوڑتی تھی۔

اباجی سفید پگڑی، سیاہ شیردانی، جیسر مین کے ٹھے کی اکڑی ہوئی گھیردار شلوار، بوسکی کی قمیض، سونے کے بن اسٹڈ اور اپنی پسندیدہ اومیگا کے ساتھ س نیری میں تھے جو کٹر بڑی تقریبات، اور خصوصی میل ملاقات کے موقعوں پر اختیار کرتے تھے، ورنہ عام حالات میں، سفید ٹھے کا تہمد کرتا، چاندی کے بن اسٹڈ اور نفیس ملائم چمڑے کی سیاہ گرگابی ان کا پہناو تھی، ہاں اومیگان کے باروسے غسل کے وقت ہی جدا ہوتی تھی۔

شیخ رابعہ کی ریٹ میں بیٹھے ہی بنسے کو فیند کے جھوٹے آنے لگے، سیٹ تھی جیسے دھنکی ہوئی روئی کا گالا جسے سفید مخمل کے کور نے اتنا نرم اور چاذب نظر بنادیا تھا کہ اس پر چند یوں بھرا کھر در ہاتھ پھیرتے ہوئے بنسے کو جھر جھری سی آرہی تھی، تین چار جھپٹیں، شیخ حادف کی ریٹ روو کو فالو کر رہی تھیں چنا چرگ اپنی پیلی پیلی تیز نکھوں سے شیشوں کے پار، آسمان پر اڑتے ننھے پرندوں کو دیکھتے ہوئے بار بار پر پھڑ پھڑا رہا تھا، اس کی تیر نو کیلی چونچ پر چمڑے کا خوش چڑھا ہوا تھا اور پاؤں رنگین ریشمی ذوری سے بندھے تھے، بخشادار سے اس کے پروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیب کے ٹھنڈے خوشبو بھرے ماحول میں میوں جی سے پوچھ رہا تھا اگر ٹیس آکھوتے چرگ کو نامہ (خوراک) دے دوں؟ ابھی نہیں، گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے میوں جی نے جواب دیا، ان کا سرخ و سفید چہرہ، کھڑکی کے شیشے سے چھن چھن کر اندر آتی دھوپ اور شیخ سے ملنے کی ایکساٹمنٹ کی وجہ سے تھم رہا تھا، شیخ حادف ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھ رہا تھا، اخی، آپ تھک تو نہیں گیا؟ نہیں شیخ میاں جی خوشدلی سے مسکرتے ہوئے کہہ رہے تھے اور اُم کلثوم ”شکوہ“ گارہی تھی۔

چولستانی ہوا کے ننھے ننھے بگولے، ریت پر دور تک بلبلے بناتے اور خود بخود پھٹ جاتے، جیپوں کے بھری ناز، ریت کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں لٹاڑتے، نیلے روندتے بتی وا کے جھکڑ گھلاتے، اپنا راستہ خود بناتے، مقررہ اسپڈ سے زیادہ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے، خبر تھی شیخ زاہد ناشتے پر مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے، دائر بیس بار بار یہ پیغام نشر کر رہی تھی، غیموں کے ایک وسیع شہر سے گزرتے ہوئے اباجی نے شیخ حادف سے پوچھا، یہاں انو یہ شارجہ کے پرنس کی کیسپنگ ہے۔ اچھا اباجی نے سر ہلایا، آگے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے دوبارہ پوچھا، لیس آگے، شیخ حادف نے ہنس کر جواب دیا۔ س مزید اکیونیکیشن کا قصہ سن کر بعد میں اباجی بہت لطف اندوز ہوا کرتے تھے، جسے بعد میں انٹر پرائز کی موجودگی نے آسان بنادیا تھا۔ شاہی جیپیں، امارات کی مختلف ریاستوں کے بسے صحرائی شہروں سے گزر رہی تھیں، جہاں دیکھتے کو نکلوں پر گول گول گھومتے ہوئے بکرے بھی ہو رہے تھے، ہر طرف اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں، میوؤں والی زعفرانی چادلوں کی دیکھیں دم ہو رہی تھیں، شیر برنج کے دیچے، قہوہ اور طرح طرح کی عربی ڈیٹائنس کی تیاری نے ماحول کو اک خاص طرح کی پر جوش سرگرمی، مسرت اور رونق سے سباب بھر دیا تھا، ارد گرد کی خاموش فضا بلکے ارتعاش، ہنگامے اور تہذیبی کے رنگوں سے لبریز ہوتی جا رہی تھی، یوں جیسے سادہ کینوس پر مصور نے سارے شوخ رنگ الٹ دیئے ہوں۔ چوستان میں موسم سرما کے آخری دو مہینے، عام دوگوں کی زندگیوں میں اک نئی دلچسپی اور ذہنی و تصوراتی تخیل پذیری کے ذائقے سے کراتے تھے ایسے ذائقے جو اس کی سخت ناہموار زندگیوں کی سطح کو وقتی طور پر قدرے ہموار بنا دیتے تھے اور وہ میسے میں آئے بچے کی طرح ارد گرد کی رونقوں کا حصہ بن کر، گھر کی تاریکیاں چند ساعتوں کے لیے بھول جاتے تھے۔

چنا چرگ شاہی سوار یوں اور وی آئی پی ٹریٹمنٹ کے لارے بیتا، اب اباجی کے ہاتھ پر منتقل ہو چکا تھا، اس کے پروں پر ہاتھ پھیرتے، وہ پر جوش انداز میں اس کی عادات، صفات اور رفتار کی خصوصیات کے علاوہ اس کی نایاب ہونچکی

نسل کے بارے میں اپنے بازدار سے سیر حاصل گفتگو کر رہے تھے جس کا حال کھونوں کی دکان میں آئے ندیدے بچے کا سا تھا، آنکھیں کیا کیا نہ دیکھ رہی تھیں اور وہ اس کا حال تو عجیب ہی تھا، پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اچھی، دودھ میں دھلی دنیا کا وہ حصہ بنا ہوا تھا اس میں اس کا میلا، بے مایہ وجود جتنا بھی اوپر اٹکتا تھا، یہی وجہ وہ کبھی خود کو دیکھتا اور کبھی اس کا حول کو، جس کے ریشم میں وہ ٹاٹ کے پیوند کی طرح دور سے نہایت بھدا اور نمایاں نظر آتا تھا، حالانکہ اس نے وہ کپڑے پہن رکھے تھے جو میاں جی نے پکھری بازار کی سب سے اونچی دکان سے اسے خرید کر دیے تھے، درجنہیں وہ نہایت احتیاط سے کبھی کبھار استعمال کرتا تھا۔ واہ مولائی تیری شان کتنے بخش بلوچ تے کتنے باتشا ہواں دیاں ملقاتاں اب ایسے میں دل سینے جتنا بھی اچھلتا کم تھا، اس جا دو مگرے اس کے حواس مکمل طور پر پاندھ لیے تھے، سی لیے وہ بڑبڑدیکھتا تھا، خود کو بھی اور ارد گرد بھی!

اچانک کاروں رک گیا، فحیرہ کے پرنس کے ڈیرے پر! چنا چٹا اس وقت، اندھیروں میں جتنی ایسی شمع کے مانند تھ جس پر ڈھیر ہونے کو پروانے بے تاب تھے، یہ عام لوگوں کو عام نظر آنے والا پرندہ، شکاریوں کی نگاہ میں کتنا خاص تھا، اس کا اندازہ صرف انہی کو تھا، جو اس شوق سے وابستہ تھے، شنید تھی فحیرہ کے پرنس نے صرف پٹے چرگ کو دیکھنے کے لیے شیخ زادہ کو چار دفعہ ٹیلی فون کر کے جازت طلب کی تھی۔ فرانسیسی خوشبوؤں کے ملب سے نہ کر سیدھے باہر آنے والے فحیرہ کے شہزادے کی عمر، اب جی پچاس سے اوپر بتاتے تھے، جو خالص چینی ریشم کا جھاگ جھاگ عبوسنبھلتا، ارد گرد کے ماحول کو پوائزوں اور شنیل کی بدلیسی خوشبوؤں سے سالب بھرتا، چنا چرگ ہاتھ پر بٹھائے دے لفظوں میں منہ مانگی قیمت پر خریدنے کا اصرار کر رہا تھا۔ جنوبی پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ سے تعلق رکھنے والا چرب زبان انٹر پرائز چھوکر، جس کی پینٹ ٹخنوں سے، ایک انچ اونچی تھی، ہل خشک اور اڑے اڑے تھے، چیک کی بوٹرٹ کے ہٹل آخر تک بند تھے، آنکھوں پر سستی کا ہی چٹک تھی اور انگریزی سے گرائمر جھڑ جھڑ کر باہر آتی تھی، میاں جی کو مسلسل ترغیب دیے جا رہا تھا، ایسے موافقے زندگی میں کبھی کبھی ملتے ہیں سائیں! تقدیر ہر ایک پر اتنی مہربان نہیں ہوتی اسوچ لیں، بعد میں پچھتا نا نہ پڑے۔ ہر وہیم میں آپ کے بیٹے کی اعلیٰ ملازمت، فحیرہ میں کاروبار، شیخ کی خصوصی توجہ اور پرندے کی منہ مانگی رقم اس کے علاوہ بخش دے ہی دل میں حساب جوڑ رہا تھا مگر اس سے کچھ جڑ نہیں رہا تھا، پیشکش کے تمام 'حصوں' کو چھوڑ کر اس کی سوئی منہ مانگی رقم پانگی ہوئی تھی، دولا کھرو پیہ! "اس ملک وچ آج تا میں، لکھ روپیہ کنھا، کسے بندے دیکھیا اے بخشیا؟" کوٹ عنایت کے سردار محمد عباس خان کی آواز نے اس کے لوں کھڑے کر دیئے، میاں جی 'کھنہ ہی ہے، کوئی ہیرا تے نہیں، کی جی جان داکیسہ اتبار، پراں دے چھوڑو من اوہ قدرے قریب ہو کر، میاں جی کے کان میں پھر کا۔ او میں اونکھیا، سریوں پھر گیا اے تیر۔ ہوش کر، کیمڑیاں متاں پیادینداں، میں بھدا کھنہ دینا اے؟ میاں جی گرجے بخش سم کر چپ ہو گیا، شیخ حادف نے جیب کا ہارن بجایا، یہ اٹھ رہا تھا واپسی کا چل چلیے! میاں جی مڑے، انٹر پرائز چیئر سیز میٹوں کی طرح پیچھے دوڑا۔ میاں جی ابو ظہبی والوں کو کتنے کانچ رہے ہیں، یہ تو بتا دیں؟ ہمان سے زیادہ 'او' چھوہرا... میں تجھے بیوپاری لگتا ہوں، بندے کی پہچان سکھ اگر بیوپاری کرنا ہوتا تو میں یہاں تھلوں میں آتا ایسے شوق پاتا!

شیخ حادف کی زیرک مسکراہٹ، اس کے سخت نقوش پر ملی ہوئی تھی، اور اس کی سنجیدہ آنکھوں میں فتح مندی کی تیز چمک تھی، گیسر بدلتے ہوئے وہ دوسری گاڑیوں کو بیک دیوڑ سے دیکھ رہا تھا جو تیزی سے اس کے پیچھے بھگنا شروع ہو گئی تھیں اور ریت کے تیز جھکڑوں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر ایک دوسرے کی ٹکا ہوں سے او جھل کر دیا تھا، وائرلیس کا



بی اے ایف کے ICU میں نہ دن کا پتہ چلتا تھا نہ رات کا، وقت کی گھڑی کا سیل جیسے کسی نے نکال دیا تھا اور وہ دن اور رات کی سرحد پر رکھ کھوکھ وجود ٹھہنے خود سے پوچھتی تھی میں کہاں ہوں؟ میوں جی! ناشتہ کر لیں، اچھا کہتے ہوئے انہوں نے دہنے ہتھ مگاہ کی، جہاں بڑی، سوپر بسکٹ دودھ پتی میں مکس کر رہی تھی، بچو زیادہ گرم تو نہیں؟ نہیں اب جی، بالکل ٹھیک ہے، اس نے نشو و نما کے گلے کے ساتھ پھیلائے اور بیڈ اونچا کر کے چیچ ان کے منہ میں ڈالنے لگی۔ آج ہمیں کتنے دن ہو گئے ہیں ہسپتال میں؟ جی آنٹھواں دن ہے۔ چھٹی کب ہوگی؟ جی ایک دو دن کے بعد۔ اچھا! آج آپ کو بہران میں نہ لے چیں، باہر دھب بڑی سوئی ہے، آپ کو اچھی لگے گی، چلو اب جی نے آمادگی ظاہر کی، بوٹو، اب جی کی گرگابی، وہ بد جی کہتے ہوئے بوٹو پکا، گرگابی پکڑ کر اپنی گرم لوٹی سے اسے جلدی جلدی چکایا اور آگے ہو کر ان کے پاؤں میں پہنانے لگا جو اس اثناء میں بیٹی کا سہارا لے کر بستر پر اٹھ کر بیٹھ چکے تھے، ڈیبل چیئر پر انہیں بٹھاتے ہوئے بوٹو، شکر شکر کر رہا تھا اور ڈرنج بیگ پکڑے ساتھ ساتھ چپتی بڑی سوئی رہی تھی، کب اپنے قدموں پر چھیں گے میرے اب جی! ڈیبل چیئر، کاریڈور سے گزرتی ہو سہل کے وسیع اور خوبصورت دن کی طرف بڑھ رہی تھی، جہاں بہار کے سارے پھول ڈیزی، ڈیلیا، گلاب، پونیو، سینزی، رینکلس اور سوٹ پیز، آنکھوں کو فرحت اور آسودگی مہیا کر رہے تھے۔ شیشم، سفیدے اور پاپلر کے بوڑھے درخت تیر، ہوائیں ہاتھیوں کی طرح جھول رہے تھے، مریضوں کے لواحقین، چپس کی بچوں، گھاس کے قطعات، پھولوں اور کیاریوں کے قریب بیٹھے کسی دھوپ سے اپنے دکھیا رہے، تھکے ہوئے پنڈے سینک رہے تھے، درود تنجینا پڑھ رہے تھے، دریا کریم کا در در کر رہے تھے۔ کارڈیہ، نہیں آئی؟ جی وہ صبح گئی ہیں گھر؟ اچھا! باہر تے رت بدلی سوئی لگتی ہے بونیا جی میں جی اترت بدل گئی اے، پتہ ای نہیں لگیا۔ واقعی، پتہ نہیں لگا، بالکل نہیں لگا، بڑی نے گھبرا کر سوچا اور ڈیبل چیئر دھکیلتی، پیلے گلابوں کے تختے کی جانب بڑھ گئی پھد دے رنگ کالے سرخ گلاباں دے موسم وچ، پھلاں دے رنگ کالے!



میوں جی نے، چنے چرگ کو تامل دیا اور چوا چوا پانی پلایا، اس نے مستی میں پرکھیرے، شاں شاں شاں۔ شیخ حادف نے سر پیچھے کو ہٹایا، مہدارے مین کی سینک نہ لے اڑے۔ ریت کے اڑتے پھینتے، کرکر کرتے جھکڑ، جیپوں کو اڑائے چے جاتے تھے۔ شاہی خیمہ گاہ کی جانب اور یہ خیمہ گاہ کیا تھی، اک بھر پور فینسی جو شروع ہو چکی تھی۔ تھلو جی بازدار بتاتا ہے، باتشاد کا تبوا اندر سے ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر، بین جھپکنا بھول جاتی تھی اور ہوش کو خود پر دھیان کی سرت ہی نہ رہتی تھی۔ بخش تو بخشا، اب جی بھی خیمہ گاہ کا اندرون دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے صحرانکہ دنیا کے بہترین مقامات دیکھ رکھے تھے، اس پر شیخ کی میزبانی، کئی کورس کا ناشتہ سرد ہو رہا تھا۔ علی الصبح ادھر رڑکا پانی کر، دو پہر تک بجے تک کچھ فالتو نہ کھانے والے اب جی، تھوڑا تھوڑا چکھتے بھی، میزبانوں کے صرار پر اتنا کھا گئے کہ طبیعت جو جھل ہونے لگی، اس کے باوجود نعتوں کے خوان تھے کہ آئے جا رہے تھے، باوردی بیرے، معطر، حول، خواب آگئیں روشنی اور اُر کنڈیشنڈ کی ہلکا ہلکا لطف دیتی ہوا، انا لین فرنیچر، فرنیچ Tapestry، ویلوٹ کے بھرمی بھر کم پردے، جن پر سونے کی باریک تاروں اور ریشم سے شکار گاہ کا منظر، کسی فنکار نے بڑی مہارت سے بنایا ہوا تھا، طالوئی کرشل کے ڈیکوریشن پس، جن پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی، طلدنی

جھپوان سے انھتی خوشبوؤں میں رچی بسی فضا میں، تھلوچی بازدار کو اپنے حقے کی پیڑی بدشکلی نرئی، مٹی کے بوتے اور کڑوے تہا کو سے حیاتی میں پہلی دفعہ نفرت محسوس ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا، گھر جاتے ہی حقہ تبدیل کرنا ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ جھپوان سے ٹھتے خوشبوؤں کے لیے میں سر تا پا لہنہ بخش، بے خودی کی کسی انوکھی منزل پہ پہنچا، دیکھ رہا تھا، میاں جی چٹا چرگ، شیخ کے ہاتھ پر بٹھار ہے ہیں اور شیخ ہاتھ کو بلند کیے اسے انتہائے مسرت سے دیکھ رہا ہے 'ابو جی اس کی نایاب ہو چکی نسل، عادات، تیز اڑان اور شکار کی خصوصیت پر اپنا انسانی گلو پیڑیا کی علم مقدسی انظر پر پیر کے کانوں میں انڈیل رہے ہیں، جسے وہ جلدی جلدی شیخ کو غفل کر رہا ہے اور شیخ کے سر سے مرعبا اور 'اللہ کی تحسین آ میرا دازیں نکل رہی ہیں، جو بخشے کے کانوں کو بے حد بھلی محسوس ہو رہی ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا ہے (دودن سے اس کا دل عجیب سا ہو گیا ہے) وہ ٹیپ رکاٹ، جو شیخ حادف نے میاں جی کے بچوں کو بطور تحفہ دیا ہے، کاش وہ اس وقت ساتھ ہوتا اور اس میں یہ آ دازیں بھر کر وہ کوٹ عنایب خان لے جاتا اور سب کو سنو تا اور نہیں بتاتا، اس کو بھی دنیا کے اندر، وہ کیسی سوئی دنیا، جیوندے جی دیکھ آیا ہے، ایسی ہی ہو گی وہ دنیا، جسے مولیٰ جی، جنت کہتے ہیں ... مگر افسوس ٹیپ رکاٹ.....!

بخشیا گنج کے جیب و چوں چرگ کا نامہ لے آ، بخشا بھ گا بھا گا گیا اور پھر اس نے جیوندے جی دیکھا، سونے کی چم چم کرتی تھالی سے چرگ کا نامہ لے رہا تھا اور چاندی کی گلدی میں، اس کی نوکیلی تیز چونچ آدھی ڈوبی ہوئی تھی، بڑا بخت آلا پکھو اے، اس نے رشک اور حسد سے اس پرندے کو دیکھا جسے، ملک عرب کا وڈا باتشاہ اپنے ہاتھ پر بٹھائے اس کی ٹہل سید اکرم رہا ہے سبحان اللہ، تیری شاں اللہ تھلوچی بازدار کو ایک دم رعب یاد آ گیا۔ میاں جی تھکے ہوئے تھے، انہیں شاہی مہمان خانے میں بھیج دیا گیا جہاں انٹرکنڈیشنل سے رخ ہوا نکل نکل کر منہ پر پڑتی اور چولستانی ہوا کے ٹو سے جھوٹوں کو ٹھینکا دکھاتی تھی، یہ وہی ٹھینکا تھا جو امیری نے ہمیشہ غریبی کو دکھایا ہے۔!



آشی صبح سے ڈائننگ روم کی گلدی فارمیکا کی چمکی میز پر دھو کر رکھے ہوئے برتنوں کا ڈھیر سمیٹ رہی تھی، بہت سے کام باقی تھے ابھی، شیخ حادف کے لائے ہوئے فروٹ کے ٹوکڑے، مختلف قسم کی کھجوروں کے بند ڈبے اور قہوے کے پیکٹ بھی سنبھالنے تھے، مجھے میں بیوی جی کی ہدایت کے مطابق انہیں تقسیم بھی کرنا تھا؟ 'دل بڑا ڈاٹا شیخ دا، ساریاں نوکراں نوں لین وچ لا کے سو سو ونڈ گئے نوں' چا چار سولا آرائیں، باہرو بیڑے میں، امی جی سے کہہ رہا تھا، چا چار رکھ باجوہ، حماں اور چا چار کرم علی ماچھی، اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور کا کو سوچ رہی تھی اس رقم سے 6، شے کی نیسیجوں (کان کی سخت سخت ہڈی کا زیور جو دیہاتی عورتیں پہنتی ہیں) بھ بڑے کے منظور سنیا رہے سے ہوا لیتی ہوں، اتنی رقم حیاتی میں پھر کب جڑے گی۔ بابا رشید اس رقم سے سونا بنانے کے س نسخے کا سامان، ناچا ہتا تھا، جو حافظ آباد کے اس بابے نے اسے دیا تھا، قرب و جوار میں، جس کی شہرت کیمیا گر کے طور پر تھی جس نے دو مربعوں کو آگ لگائی، مال ڈنگر پھونکا اور حیاتی کے پورے پچیس ورے پھونکنے کے بعد، سونا بنا بھی لیا مگر خدا جانے اس کے بعد اسے کیا ہوا، یہ کام ترک کر کے اس نے مسجد کا پھوڑا مل لیا اور باقی زندگی، مسجد کی مٹی میں پانی بھرنے، وضو کے لوٹے دھونے اور نمازیوں کی سیوا میں گزار دی۔ مشرقی پنجاب کے شہر گورداس پور کا مہاجر بابا رشید، جس کی عمر اس وقت ستر کے قریب تھی اور بابے پر فیشن جو باورچی تھا اور پارٹ ٹائم، سنیسی، طبیب اور کیمیا گر تھا، مگر سچی بات یہ کہ وہ فل ٹائم اپنے شوق کو دیتا تھا اور سچی کھچا خانساں گیری کو، یہی وجہ آشی سے ہر وقت اس کا اٹ کھڑکار ہتا تھا۔ اسے جو بھی پیسہ ملتا، خفیہ طور پر بنائے کشتوں، مچھونوں اور رنگ

رنگ کی مینھی کڑوی پھکیوں پر صرف ہو جاتا۔ اکثر گھر کی چھت اور صحن کی دیواروں پر اس کی ٹمبل سے باندھے منہ والی کوری باندیاں رکھی دکھائی دیتیں، جن میں کئی روز مٹی کی ٹنگیٹھی میں اپلوں کی آگ پر اک خاص درجہ حرارت میں پکانے کے بعد، وہ انہیں کھل کرنے میں مہینوں مصروف رہتا، اکثر گھر کے گیٹ پر کوئی اجنبی چہرہ دیکھ کر ملازم اس سے پوچھتے تو معلوم ہوتا وہ بابا رشید کا مریض ہے۔ حافظ آباد کے کیمپ ٹرکی پورے جیسے ماہ خدمت اور منت ترلے کے بعد اسے یہ نسخہ حاصل ہوا تھا، جسے دیتے ہوئے یزھے کیمپ گرنے جس کی پلکیں اور بھنویں سفید ہو چکی تھیں اور زخروں کا ماس اکیل ککڑ کی طرح ٹٹک کر نیچے آ گیا تھا، نے باواز بلند کہا تھا۔ تیری مت۔ رٹی گئی ہے رشید، میں اب بھی کہتا ہوں اس گھائے کے سودے سے باز آ جا، اندر کے سونے کی سونہ اے پیلی دھات، گر بن بھی گئی تو زے سپ ٹھوئیں! اونہ سپ ٹھوئیں، بڈھے کا دماغ خراب ہے، روک سپ ٹھوئیں کہتا ہے، ایک بار مل تو جائے پھر تجھے بتاؤں گا، سپ ٹھوئیں ہیں یا حیاتی کی اخیر! جلدی جلدی میڈے گوشت بھوتا بابا رشید، ریل باز ریل میں پنسر کی بڑی دکان پر جانا چاہتا تھا، سو روپے سے امید ہے، بہتیرا کچھ آ جائے گا، تھڑ گیا تو کا کو سے نیٹھ لوں گا، بابے کا چہرہ شرارتی مسکراہٹ سے بھر گیا، یہ وہ مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر میاں جی کے پرانے ملازم اسے مذاق سے کھجوا بابا کہتے تھے۔ آشی کی گھر میں خصوصی حیثیت کی بنا پر اسے شیخ نے پانچ سو کی خطیر رقم دی تھی جو اسے یوی جی کے پاس یہ کہہ کر رکھوا دی تھی کہ جسے بھائی (سرگودھا کے تیور صراف) سے دو تولے کی گائی بنو دیں۔ بچوں کے لیے ٹیپ ریکارڈ راک جھوبہ تھا، بات کرتے تو سنتے۔ کھنتے تو سنتے بڑتے تو سنتے اور سن سن کر ہستے ہستے لوٹ پوٹ ہو جاتے، یہ ایسا کھیل تھا جو ہر دفعہ یا اور دلچسپ معلوم ہوتا۔ اس سے قبل خاندان میں صرف لیاقت بھائی کا گھر تھا، جنہوں نے جیسے، قبل یہ ”عجوبہ“ خریدا تھا، جس کی زراں خصوصیات پر یقین نہ کرتے ہوئے، لوگ جوق در جوق اسے دیکھتے جاتے رہے اور خاندان کی کئی سمارٹ کا بھینٹ باجیوں نے، ”تمہی میرے مندر تمہی میری پوجا اور چلتے چلتے مجھے کوئی مل گیا تھا“ جیسے مشہور گانے اپنی سریلی آوازوں میں گا کر، ایک تو ٹیپ ریکارڈر کا ہنر چیک کیا اور دوسرے اپنی ”داریں، جو کسی صورت بھی لٹا منگیٹلک سے کم نہ تھیں، ان کی دھاک لوگوں پر بٹھا دی!

☆...☆...☆

میرا خیال ہے، ہم انہیں پرسوں ڈسپارچ کر دیں گے۔ میڈیکل بائیکل ٹیک ہیں بس یکسیڈنٹ کا شاک ہے ابھی ان کے دماغ پر وہ آہستہ آہستہ جائے گا۔ ICU میں اگر کچھ دن اور رہے تو خدا نخواستہ کوئی انفیکشن نہ کیج کر لیں! شکر یہ ڈاکٹر، از می سراپا تشکر تھی در چھوٹی، بڑی کی آنکھیں امید، خوشی اور طمانیت سے بھر گئیں، بوٹے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر دیکھا اور اس کے تڑکے ہوئے ہونٹوں پر، اللہ تیرا شکر ہے کا کلمہ بھرا، گھر جاتے ہی بابا مشوم شاہ پڑ پڑا جلاؤں گا اور سبز جہنم الگاؤں گا۔ مبارک ہو کل اباجی کا کمرہ ٹھیک کرواتے ہیں، بڑی نے چھوٹی سے کہا، اباجی نے آنکھوں پر رکھا بازو بٹایا، ان کی آبی رنگی آنکھیں، دفعۃً سامنے دیوار پر ٹھہر گئیں، یوں جیسے کچھ دیکھ رہی ہوں۔ یوں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ دنیا یہ آج پھر آ گیا ہے، ان کی آواز نے وہاں موجود دونوں کو ہلا دیا۔ کون میاں جی، بونا بڑک کر بولا۔ وہ ہی سفید پروں والا، جو چارون پہلے بھی آیا تھا۔ چارون پہلے؟ بوٹے سمیت سبھی حیران تھے، آپ نے بتایا تو انہیں میاں جی! اوتھ تھے ہی نہیں، میں نے تو تمہیں بہتیرے سدا رہے تھے۔ وہ دیکھو، سامنے دیوار پر، جہاں اس دن بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا مجھے دیکھ رہا ہے۔ چارون نے جبراً ICU کی مختصر دیوار کو دیکھا اور ان کی آنکھوں میں خوف کا غبار پھیل گیا۔ اباجی! کیلا کھائیں گے؟ او بچو! پہلے اس سے تو پوچھو، کیوں آتا ہے ادھر؟ جی جی ابھی پوچھتی ہوں، پہلے آپ کیلا تو ہیں۔ ادیکیں بچو! پہلے

مہمان کو کھدوا اور اس سے کہو، کھا کر چلا جائے مجھے نیند آ رہی ہے۔ کارڈ میز نے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور اس کا پورا وجود سہم کے جالے میں پھنسی مکڑی کی طرح پھڑپھڑانے لگا ICU میں گہری دیہ خاموشی چھا گئی جس میں دلوں کی دھک دھک صاف سنائی دیتی تھی۔

☆ ☆ ☆

کوٹھی کا گیٹ پورا کھلا تھا، آنے جانے والوں کا پچھلے دو دنوں سے تانتا بندھا ہوا تھا۔ ابا جی کے رحیم یار خان سے لوٹنے کے بعد شیخ زائد کی مہمان نوازی اور تحائف کے چرچے، ارد گرد کے گھروں سے نکل کر رشتہ داروں اور دوسرے مٹے چنے والوں تک پہنچ گئے تھے، گاؤں کے کئی بچے (چوزہ) بغل میں دابے، مبارک کے لیے جوق در جوق آ رہے تھے، چارچے رکھے اور چارچے رسولے نے گاؤں جا کر، شیخ زائد کے نہایت سے شیخ حادف کی سخاوت اور میاں جی کو دی جانے والی عزت کے جو قصے سنائے تھے، اس کے بعد کمیوں کا گھروں میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا تھا، وہ بسوں میں بھر بھر A-287 میں پلٹتے جا رہے تھے تاکہ عربوں کے تحائف کی "زیارت" بھی کر میں اور میاں جی سے باتشہ کی ملاقات کی باتیں بھی س لیں، عرب کے باتشہ سے ملاقات کی سنسنی چہرہ سو پھیلی ہوئی تھی۔ امی جی عورتوں کو شیخ حادف کی دینی کھجوروں سے کھجور دیتیں تو کھجور پکڑنے سے پہلے، وہ شربی سے اٹھ کر، ننگے پر ہاتھ "شرط" (پاک) کرتیں اور پھر لسم اللہ پڑھ کر کھجور کا بھورا بھورا کتر تیں، ختم ہو جاتی تو "شکراے کہتی اٹھتیں" درگھنسی جا من یا آم کے میڑ کے نیچے ہنسی زمین میں دبا دیتیں !

ماسی راجو نے کا کو سے کان جوڑے، جو آٹے کی تون کو پانی کا چھینٹا دے کر دودھیا پانی سے چکنی ہو چکی صحنک میں مہارت سے گھم گھما کر اب اس بڑی سی "ٹے کی گولنگی کو صحنک میں جہا کر اس پر اٹھکیں چھو رہی تھی، میلی ملیل کی بد رنگ چادر کے پوتے، کھلیں بھیتے ہوئے ماسی راجو نے چسکا یا ہے، ان کا کو، ذرا سوکا وہ لوٹ (نوٹ) تو دکھا، جو شیخ ہورائے نے تمہیں دیا ہے سنا ہے میری تلی جتنا دوا ہے اور اس پر بابے (قائد اعظم) کا فوٹو بھی لگا ہوا ہے نوٹ تو اسی میں نے بیوی جی (امی جی) کے پاس رکھوا دیا ہے، بھلائی دی ڈی رقم میں پاس رکھ سکتی تھی؟ کا کو نے وزویدہ نگاہوں سے، ہانڈی بھونٹتے بابے رشید کی طرف دیکھا، یہ بات سن کر جس کے موٹے جامنی ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور کدو گوشت میں پانی کا چھینٹ دیتے ہوئے، اس کی نگاہ کا کو کے کالے پراندے پر تھی، جو اس کی کمر پر جھول رہا تھا، جس کے دو ہرے دھاگے سے بندھی نخی سی چابی، اس صندوقچی کے تالے کی تھی، جس میں کان لیر سے باندھ کر کا کو نے نہایت احتیاط سے نوٹ چھپایا تھا جسے اس کی ٹوہ میں مسلسل رہنے والے بابے رشید نے دیکھ لیا تھا اور اب وہ پراندی کے کالے دھاگے سے بندھی چابی اڑا کر، ماسی راجو کی کھر دردی تلی جتن بڑا نوٹ نکال کر، کیسیا گری کا پرانا شوق پورا کرنا چاہتا تھا تو ری دھک گئی تھی، پچ پچھنی، دھکتے کوٹوں پر بک بک بھر کے پانی کا ترکا دینے کے بعد روئیں لگانے کی پوزیشن میں آ چکی تھی، کا کو اپنے سیاہ، چٹنی جھد والے ہاتھوں سے نہایت مہارت سے گول گول میزے بنا رہی تھی، ماسی راجو اس سے ہاتھ ہونے کے بعد اب آٹھی کے پاس جا بیٹھی تھی، جس کے ریڈیو پر رفیع نہایت دلسوز آواز میں گارہا تھا "یاد نہ جائے بیتے دنوں کی۔۔۔ جا کے نہ آئیں جو دن۔۔۔ دل کیوں بلائے انہیں۔"

☆ ☆ ☆

دل کا بھی عجب حال ہے نہ دن کو چھین نہ رات کو آرام گھر کے ہال کمرے کے وسط میں کھڑی از می نے، دھندلی نگاہوں سے، سفید فینکسن (Falcon) (جسے ابا جی اور ان کے شکاری چنا چڑگ کہتے تھے) کو دیکھا، جسے ابا

جی نے ہاتھ پر بٹھایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شادابی باقی تھی، وہ اس لمحے میں کتنے مطمئن تھے، کتنے سرور! کمرے نے وہ لمحہ جیسے اپنی مٹھی میں محفوظ کر لیا تھا مگر اس لمحے سے وابستہ وہ سارے سکھ اور خوشیوں اور رونقیں، جو ابھی اس ہال کمرے کا حصہ تھیں، انہیں شاید کبیرہ محفوظ نہ کر سکا تھا یہی وجہ تھی گزرتے وقت کو ڈھونڈتی، آوازیں دیتی، اسے پکارتی، کارڈ میا کنگ لیئر کے قد سوں کی آہٹیں چننے کی کوشش کر رہی تھی، جو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔

جو سکڑ سٹ کر اب پی اے ایف کے ICU کے اس بیڈ پر مدھم ہوتی جا رہی تھیں، جہاں اب جی نے سفید پروں والے کو دو دفعہ سامنے دیوار پر بیٹھا دیکھ کر، اس کی خاطر مدارت کا حکم اپنے بچوں کو دیا تھا تاکہ وہ جائے اور اب جی آرام سے نیند کر سکیں۔ وہ شروع سے ایسے ہی تھے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اوقات میں، بڑی سے بڑی مجبوری کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ معمولات کی پابندی، سادہ اور غذائیت بخش خوراک، دن میں دو دفعہ لمبی سیر، اور رات کو نو بجے ستر پر لیٹ جانے والی روٹین نے انہیں تمام عمر قابل رشک صحت کا مالک بنائے رکھا۔ اگر یہ ایکسڈنٹ نہ ہوتا تو؟ مگر یہ ایکسڈنٹ کیسے نہ ہوتا! از مئے بچو انسان دنیا میں ہر چیز سے فرار حاصل کر سکتا ہے، مگر موت سے نہیں۔ یہ دبے پاؤں چلتی ہزار راستوں سے آتی ہے اور انسان کو بے خبری میں دبوچ جاتی ہے۔ یوں کہ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا اور وہ اس کا شکار بن جاتا ہے۔ اب جی کی آواز نجانے کہاں سے آئی ازی نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ وہ سفید پروں والا مہمان آخر کیوں متواتر آ رہا ہے ان کے کمرے میں؟ اس نے گھبرا کر سوچا اور کارڈ نہیں پر رکھی اس تصویر کے سامنے بے اختیار جھکتی چلی گئی جس کی آنکھوں میں محبت کی روشنی تھی اور لبوں پر نہ ٹوٹنے والی محبت۔ جو ایک نکل اسے دیکھی جا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو، ہر جدائی کا اپنا رنگ اور اپنی الگ داستان ہوتی ہے، عظمیٰ اور اس نے اپنے معین وقت پر آ کر رہنا ہوتا ہے اسے ہر گز روکا نہیں جاسکتا۔ حوصلہ پکڑو، بچہ۔ یہ دنیا ہے، اس میں آنا جانا تو نگار ہوتا ہے کس کس کو روڈ کی؟ تصویر کے سامنے دو زانو بیٹھتے ہوئے ازی نے اس آواز کو سنا، یا نہیں۔ مگر اسے گلا، جسے کوئی اس کے دس کوٹھی میں سے کر، نچوڑ رہا ہوں، یوں جیسے گے کو، بیلن میں ڈال کر رس نکالا جاتا ہے۔ اسے یاد آیا، ام، جامن اور انگور کی گھنی تیل کی شاخوں کے سائے میں، جب ہوا کے تیز جھونکے سے انگور کے دانے کچھے سے ٹوٹ کر، ٹپ ٹپ نیچے گرتے تھے، تو بان کی چار پائی پر بیٹھ کر شہاب نامہ، شبنامہ کر بلایا عبدالحییم شرر کی جو یادیں حق پڑھتی، تصویر والی مہربان عورت۔ اک سودہ نگاہ ارد گرد پر ڈالتے ہوئے چار پائی پر بکھرے ہوئے کچے ہوئے انگوروں کے رس بھرے دانے کا کوئی طرف بڑھاتے ہوئے ایک دم سے کبھی تھی، چند راوی، لہندی سیکنگ گن کالج کی سٹوڈنٹ تھی اور سوشل روز پر بند وڑکیوں کے ایک آشرم میں رہتی تھی۔ ایک روز پنجاب پبلک لائبریری میں ہم دونوں ایک ہی کتاب اپنے نام جاری کرانے کے میدان تھے۔ کاکو انگور کا دانہ دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے، امین آباد کی چند راوی کی کہانی، درن زبان اردو کے باوجود یوں سختی تھی، جیسے بابے رشید سے آشی کی غیبت۔ جو وہ دل کھول کر کیا کرتا تھا۔ خاموش اور باادب بیٹھی کاکو شہاب نامے کے کثر باب اسی طرح اسی تھی۔ اس مہربان عورت سے فرمائش کر کے چاہے اس کے پٹے کچھ پڑتا تھا یا نہیں۔ مگر پٹے تو ماسی بکری والی، ماسی کھاتوں ٹائپ ان تمام دیسی عورتوں کے بھی کچھ نہ پڑتا جو بیوی جی کے ”قصہ“ شروع کرتے ہی سر پر چادروں کے چو جھاتے عقیدت سے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب وہ اس فقرے پر آتی تھیں، جب مجھے چند راوی سے محبت شروع ہوئی، اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا۔“ اس کے بعد بیوی جی کتاب بند کر دیتیں اپنے مہین ڈوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے گوشے صاف کرتیں۔ کاکو دردگیر سامع خواتین، سڑسڑ بہتی ناک رگڑتیں۔ آنکھیں پونچھتیں۔ وہاں سے پرے

کھسک جاتیں۔ اُزی پرہل میں کھڑے کھڑے جیسے عمریں بیت گئیں صدیاں گزر گئیں، اس نے بند ہاتھ کی مٹھی کو کھول کر دیوانوں کی طرح دیکھا، ساری لکیریں اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھیں مگر قسمت ؟

☆ ☆ ☆

سفید پروں والا اچانک ICU کی دیوار پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا س نے پر پھڑ پھڑائے جیسے جانے کی تیاری میں ہو اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کالس . کنگ لیٹر، نے اپنے ہاتھ پر باقاعدہ محسوس کیا اور اک الوداعی نگاہ اپنے بیڈ کے ارد گرد کھڑے ہوؤں پر ڈالی، اور پھر وہ نگاہ لرزئی، ڈولتی ڈمگائی کارڈییا کے چہرے پر پل بھر کے لیے ٹھہر گئی کارڈییا نے ڈکٹروں کی آمد و رفت میں اچانک بڑھ جانے والی تیزی سے گھبرا کر کنگ لیٹر کے سر ہانے لگی ہارٹ مانیٹرنگ مشین کی طرف دیکھا، خدا جانے وہاں کیا دکھائی دیا کہ وہ دہل کر، کنگ لیٹر کی طرف لپکی اباجی ! اباجی نے سفید پروں والے کے ہاتھ میں اس اثناء میں ہاتھ تھما دیا تھا سن نہ سکے وہ دوبارہ چوٹی اباجی ! اباجی نے مڑ کر اک نگاہ اپنی چھوٹی بیٹی پر ڈالی از میسے ! کوئی سفید، کوئی پیغام ہے تو دے دو وعدہ کرتا ہوں

تصویر والی مہربان عورت تک پہنچا دوں گا۔ ہاں ہاں تمہاری ماں تک وہیں تو جا رہا ہوں میں اسی اونچے ستونوں اور بھاری بھر کم جھاڑ کانوسوں والے شیشے کے محل میں جہاں وہ سترہ برس سے میری راہ دیکھتی ہے، چلتے چلتے تھک گیا ہوں، بچو! اب آرام کرنا چاہتا ہوں اباجی ار می نے ک بسی چیخ ماری اور بیڈ پر آسودگی سے آنکھیں موندے، واقعہ کی کسی عجیب منزل پر پہنچ جانے والے، اباجی کے جسم سے لپٹ گئی جو نہ بلاتا تھا نہ بولتا تھا بوٹو، چارخانے کے میسے کھیس کا پلو منہ پر ڈالے، ان کے پاؤں پر گرا پڑا تھا ڈاکٹر بھردی سے، ان کے لواحقین کے کندھے تھپتھپاتے تھے از میسے بچے انسان دنیا میں ہر چیز سے فرار حاصل کر سکتا ہے، مگر موت سے نہیں یہ دے پاؤں ہزار راستوں سے آتی ہے ور بے خبری میں دیوچ لیتی ہے اُزی نے لرز کر کارڈییا کی طرف دیکھا جو کنگ لیٹر کے محل سے ہمیشہ کے لیے نکل رہی تھی وہ 23 مارچ کی ایک ناقابل فہم رات تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سرگودھا کے آسمان پر چھائے ہوئے بکالے سیاہ بادل پورے زور سے برس رہے تھے۔ بجلی کی لپک جھپک شہر کی دور دراز گلیوں کے سینے میں کتا کی طرح اترتی، پل بھر میں چندھیادینے والی روشنی کا جھماکا ہوتا اور پھر وہی اندھیرا اُزی نے جل بجھ جل بجھ کرستے، روشنی اور اندھیرے کے اس کھیل میں پیچھے مڑ کر دیکھا محل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو رہے تھے اُزی پر کارڈییا پر یادوں پر ؟

☆ ☆ ☆

تیسری مخلوق کی ایک کتھا

زمین سالک

دریا کا پاٹ یہاں چوڑا سا تھا۔۔۔ پہاڑ سے اترتی پگھلنے والی پانیوں سے اس کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔ لگتا تھا کہ آگے نیچے وادی میں اخروٹ کے درختوں میں گم ہوتی اس کی گزرگاہ بھی شاید مزید خاموش ہو جائے گی۔۔۔
صبح کے وقت موسم نکھر نکھر رہا تھا۔۔۔ انکا ذکا چیلیں منڈلا رہی تھیں۔۔۔ اور نیچے دھیمے سروں میں عصفوری چچہاہٹ غور کرنے پر کبھی کبھی سنائی دیتی تھی۔۔۔ پتوں کی خوفناک سرسراہٹ کبھی کبھار بھیاٹک سنائے کو توڑ جاتی تھی۔۔۔

جنگل کے اندھیرے کا شائبہ سیتوں بچیوں کے تحت الشعور سے نکل کر ہونٹوں پر آ گیا۔۔۔
وہ گھر سے خوش خوش پارک جانے کو چلی تھیں۔۔۔ پر جوش، اٹھکیلیں کرتی۔۔۔ اور اب کنفیوژ سی ہو رہی تھیں۔۔۔ آخر چھوٹی عاصمہ سے رہا نہ گیا۔۔۔
ماموں کیا ہم وہاں تک جائیں گے؟ اس نے درجہ جنگل میں اخروٹ کے گھنے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔۔۔

ہاں پارک اس کے پیچھے ہے۔۔۔ اس نے خالی اندھن سے کہا۔۔۔
آپ کی کانچ کیا اسی جگہ ہے۔۔۔؟ ابھی تک نظر نہیں آئی۔۔۔ منجھلی ذکیہ بولی۔۔۔
ہوں۔۔۔ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔۔۔
میں تھک رہی ہوں۔۔۔ ٹافوں کا یہ تھیلہ کچھ دیر تم رکھ لو ذکیہ۔۔۔ بڑی نزہت نے کہا۔۔۔
کیا اس رسی سے ہم پارک میں ایک اور اونچا سا جھوڑا ہیں گے؟ عاصمہ پھر بولی۔۔۔
اُمی اٹھ گئی ہوں گی۔۔۔ ہمیں ڈھونڈ رہی ہوں گی۔۔۔ خوب مزہ آئے گا۔۔۔ منجھلی چپک کر بولی۔۔۔
لیکن جذبات سے عاری اس کا رواقی چہرہ دیکھ کر وہ تینوں خاموش سی ہو گئیں اور ان کے چہرے بھی لمحہ بھر کو زینو کے چیلوں جیسے دکھنے لگے۔۔۔

اپنی، ابھی فکروں سے وہ جیسے اچانک چونکا اور چڑ کر دھاڑا۔۔۔
ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ خاموش رہو اب بچیو۔۔۔
تھیلا بچی کے ہاتھ سے چھوٹ کر پتھریلی جگہ پر گر پڑا۔۔۔ دھات اور شیشے کی ٹلی جلی ٹکرتی آوازوں نے سنجیدہ ماحول کے تناؤ میں جیسے اور اضافہ کر دیا۔۔۔ بچیاں مزید خوفزدہ سی ہو گئیں۔۔۔ لیکن رضا سنبھلا، کچھ سوچا اور پھر کھسیانا ہو کر بات بنائی۔۔۔ جیسے وہ بڑی سمجھدار ہوں۔۔۔

میری چابیاں بول رہی ہیں شاید۔۔۔ اور لوہے کا پتھر ابھی۔۔۔ بو۔۔۔ بوتل بھی۔۔۔
لیکن وہ مطمئن تو کیا ہوتیں۔۔۔ ہونق سی لگنے لگیں۔۔۔ وہ جوش و خروش تو کبھی کارِ خست ہو چکا تھا۔۔۔

بچیاں ماموں کے چہرے کو گاہے بگاہے سہم سہم کر دیکھ رہی تھیں۔۔۔ گھنے جنگل کی چھنتی روشنی میں اس کے چہرے پر سیاہی اور گرد کی غیر سرگئی سی تہہ جمتی نظر آ رہی تھی۔۔۔ اور چہرے کے خطوط بھیا نک سے ہو گئے۔۔۔ بے نور سے آنکھوں کے گرد پڑے کالے حلقے، پچکی ہوئی چھوٹی پیشانی، ٹیز سی ناک اور کچھ دیر پہلے تک اس کے بھرے گال وچکے ہوئے، جھریوں والے دیکھنے لگے۔۔۔

بڑے پتھر کے پیچھے درخت کی شاخ پر ایک کالے سانپ کی تازہ بہ تازہ اتری ہوئی کینچلی ہوا کے جھونکوں میں لہرائی۔۔۔ وہ کسی معمول کی طرح جیسے خواب میں چلا جا رہا تھا۔۔۔ اس کا ذہن مرغوع لے کھاتا اسے پیچھے لے گیا۔۔۔

عورت کا بچہ نہیں ہوتا اس سال بیت گئے۔۔۔ سب علاج بیکار۔۔۔ ہا ہا۔۔۔
 سرخ رومال سر پر باندھے، خوشبودار صندل کی دھونی رمائے، آسن باندھے، ابھی داڑھی اور غلیظ کپڑوں کے مالک نے اچانک پنی سرخ ڈوروں والی آنکھیں کھولیں تو اس کی کمر میں سنسنی سی دوڑ گئی۔۔۔ اپنے حواس پر قابو پاتے۔۔۔ قوت مجتہد کر کے بور۔۔۔

بابا آپ سب جانتے ہیں۔۔۔
 جو کہوں گا کر دے۔۔۔ خرچہ بھی ہوگا۔۔۔
 میں تیرا ہوں، اس نے کہا تھا۔۔۔

سوچ لو۔۔۔ ہاں کر دی تو ناں نہیں کر پاؤ گے۔۔۔ جان سے جاؤ گے۔۔۔ میرا موکل تیرے سر پر ہو گا ہمہ وقت۔۔۔ بے کلکتے والی۔۔۔ اور شیو کی عبادت کا دن ہے آج۔۔۔ سنیچر۔۔۔ وہ سفید دانوں کو رو میں پھینکتا تو رور سے بھسم ہو جاتے اور بھپکارہ سا نکلتا۔۔۔ عجیب سی آواز بھی آتی جیسے سسکیں سی انگاروں سے نکل رہی ہوں۔۔۔ اس نے کانچ کی بوتل، تیز دھار کی غلیظ سے دستے والی چھری اور رسی کی طرف اشارہ کر کے اٹھلانے کو کہا اور خود تیزی سے آگ میں دوبارہ دانے جھونک جھونک کر وچکی آوازوں سے منتر پڑھنے لگا۔۔۔
 اور پھر اس کی طرف بھی مڑے پھینکنے لگا۔۔۔

رضیا خواہیدہ سی بو جھل آنکھوں سے وہ اشیاء دلا یا۔۔۔
 بچے یہ انوکھا طلسماتی نا پید منتر ہے۔۔۔ کوئی معمولی نہیں۔۔۔ جادو کی دنیا کا بہت بڑا راز۔۔۔ کتنے چلے کاٹے۔۔۔ استاد کی بیس سال خدمت کا صلہ۔۔۔ اگر تو نے عمل کے دوران روکنے کی کوشش کی تو جی ستر ہزار جن جو ستر ہزار فرشتوں کے باوجود کام کر رہے ہیں۔۔۔ تجھے بھسم کر دیں گے۔۔۔ دھین سے سن۔۔۔ اس سحر کا اثر تلوار کی طرح ہے۔۔۔ اب تیری کوئی واپسی نہیں۔۔۔ اچھی طرح سمجھ لے۔۔۔ اور پھر اس نے 'بنگال کنڑ' اس کے سر، کندھے پر پھیری تو وہ نڈھال سا ہو کر لڑکھڑایا۔۔۔ عامل اپنا کام پورا کر چکا تھا۔۔۔ اس کی آواز اسے کبھی دور کبھی نزدیک سے آتی سنائی دیتی۔۔۔

اولاد چاہئے تو تین چھوڑیوں کا تازہ خون اس بوتل میں لا کر دے۔۔۔ تیرا کام ہو جائے گا۔۔۔ لڑکا ہوگا۔۔۔
 اس کی رات سے ذرا پہلے پہل۔۔۔

سرسراتی آواز اس کے کانوں میں بری طرح پیوست ہو کر دماغ تک تھکتی چلی گئی۔۔۔
 بابا۔۔۔ کیا۔۔۔ تین چھوڑیوں سے کام چل سکتا ہے۔۔۔؟

اس نے ہچکچاتے پوچھا۔۔۔

ہاں۔۔۔ مگر اس کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا۔۔۔

پھر اس نے مٹھی بھر مٹی اپنے ہاتھ میں لے کر اس پر مانترا فرقے کا منتر، آدم مٹی، پڑھا اور اسے اپنا دایاں ہاتھ باہر نکالنے کو کہا۔۔۔

رضا کو عجیب سی سننا ہٹ کا احساس ہوا اور اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔۔۔

جب اس نے دوسرا منتر پڑھا تو سننا ہٹ غائب ہو گئی۔۔۔

اب وہ عامل اور اس کی عملیات سے قدرے مایوس بھی ہو چکا تھا۔۔۔

عامل نے اگلہ اہم ”سنا کا عمل“ کرنے کے لیے اسے ایک سفوف نما چیر پانی سے لگنے کے لیے دی جسے اس نے بلا تاثر لے لیا۔۔۔

سفوف عامل نے اس پر پدمنی او کا شیطانی منتر پڑھا اور مردے کی ہڈیوں کے، اس سفوف سے اس میں مخصوص سفوف خصوصیات منتقل کر دیں۔۔۔

پھر اس نے تیز بے ہوش کرنے والا غلیظ سا مشروب دیا تو وہ اسے پیٹے ہی لڑکھڑا کر بے ہوش ہو گیا۔۔۔ ہوش آیا تو اس کا سر چکر رہا تھا اور کانوں میں ’’وم میں ہوں جو ہوں‘‘۔۔۔ ’’وم مٹی پدمی ہم‘‘ منٹروں کی گونج تھی۔۔۔ عامل نے اس کے ہاتھوں چھری، رسی، کانچ کی بوتل، عورت کے بالوں کے گچھے، کٹے ہوئے ناخنوں کی پوٹلی۔۔۔ ایک تھیلے میں ڈال کر پکڑائی تھی۔۔۔ اور سفوفی عملیات اور چند ناگزیر جنس منتر بھی سکھ دیئے تھے۔۔۔

گھنے جنگل کا اندھیرا چاروں کو ہڑپ کرنا جا رہا تھا۔۔۔

بچیاں مزید بے چین ہو گئیں۔۔۔

مضافات امیٹ آباد سے دور اس سناٹے علاقے کے اشیر میں تیسری مخلوق کی آبادی کے چند گھرانے، درختوں کی پکھلیاں، اپنے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔۔۔ کچھ بچے شوقیہ پڑھ بھی رہے تھے۔۔۔

اس انسانی جتنے اور اس کے ساتھ بابا کے، مامور کردہ غیبیٹ موکل کو یہاں دیکھ کر تو وہ کچھ بے چین سے ہوئے پھر منہ بنائے اور پھر مائیں مطمئن ہو کر اپنے کھانے بنانے، صفائی ستھرائی میں جُت گئیں اور بچے پھر سے کھینے لگے۔۔۔

اس ویران سناٹے علاقے میں کبھی کوئی بھولا بھٹکا انسان آ جاتا تو وہ اسے بخائی علاقہ سمجھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے دن ہی دن میں عبور کرنے کی کوشش کرتا۔۔۔ اور کبھی اشیر کے آتش زدے بھی انسان کی موجودگی اور اس کی خطرناک عادات اور انجانے سے ڈرتے۔۔۔

اس کا سبک ورلڈ میں آباد وہ خود فرشتوں، دیگر اجسام لطیفہ، ارواح اور خیر و شر کی قوتوں کا میڈیم۔۔۔ عام انسانی نظروں سے پوشیدہ تھا۔۔۔

شیاطین و ملائکہ اس پتھر میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے برسرِ پیکار تھے۔۔۔ اور دونوں طاقتیں بہروں کا ایک سلسلہ زمین کے اس طرف بھیج رہی تھیں۔۔۔ خیر کے ایک اور چیر و کار کو درغلا کر اپنے پیر و کاروں کی تعداد بڑھانے کی کوشش میں ایک بار پھر کامیاب ہو گیا تھا۔۔۔

ماموں نے نزہت سے تھیلہ خاموشی سے لے لی۔۔۔ وہ ٹھنڈا سانس لیتے لیتے رک گئی تھی۔۔۔

بدکار کے حصہ پر پھر سے سیاہی، گرد اور ذلت کی ایک غیر مرئی سی تہہ جم گئی۔۔۔ اس کے چہرے کے خطوط
بھیانک، ہڈیاں بے طرح ابھری ہوئی، آنکھیں بے نور، پیشانی پتلی ہوئی، ناک ٹیڑھی اور گالوں میں جھریاں اور گڑھے
پڑے ہوئے دیکھنے لگے۔۔۔

کھڑی اعلانات پر اس نے تھپے سے اچانک چھری نکالی اور نہت کونانگوں میں لجھا کر مزاحمت کا موقع دیے
بغیر گلے پر چھری چلا دی۔۔۔ ننھی سی خرخراہٹ ہوئی اور وہ بے سدھ لیٹ گئی۔۔۔ شبہ رگ سے خون کے ساتھ زخروں
سے ہوا کے بلبلے خون میں پھوٹنے لگے۔۔۔ اس نے بوتل نکالی، خون کی دھار کو پتے منہ والی بوتل میں پکڑنے کی کوشش کی تو
اس کی آستین اور ہاتھ خون آلودہ ہو گئے۔۔۔

دونوں بچیوں نے خون دیکھتے ہی فلک شکناف چھین ماریں اور بے ہوش ہو گئیں اور یوں قاتل کا کام آسان کر
گئیں۔۔۔

ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی سیکنڈ، اشیری لہروں کی رفتار سے پلک جھپکنے سے کہیں پہلے ایتھر کی اس دنیا میں
موجود تیسری نسل کا قبیلہ جائے واردت پر امنڈ آیا۔۔۔ عورتیں، بچے اور منہر مرد۔۔۔ ساتھ ہی ان کی بزرگ ترین ہستی اور
دوسرے مردوں کو فوری پہنچیت کا سندیرہ بھجوا دیا گیا۔۔۔

انہوں نے حیرت و استعجاب سے دونوں بچیوں کے المناک انجام کا مشاہدہ کیا اور عالم کے مسلط کردہ موکل کو
اس عمل قبیح میں انہوں کی مدد کرتے دیکھ کر لعن طعن کی۔۔۔

بال، ناخن، سالم ہڈی اور آتش دانوں کی پونلی نکالی۔۔۔ چھوٹے سے روئے کے پاس خون کی بوتل رکھ کر منتر
پڑھنے لگا۔۔۔ جادوگری سے جادوگری کی تجدید نو ہو چکی تھی۔۔۔

بدکار کے گرد دیوار کا ساخت ہاتھ تن گیا۔۔۔ اب اشیر سے اس کے لیے دعا اور فریاد کا راستہ رک چکا تھا۔۔۔

کاسک ورلڈ کا مہین سے مہین عہدہ اثر اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔۔۔

ایک عشاوہ، پردہ، بین حائل تھا۔۔۔ وہ اشیر کی خفیہ طاقتوں کی امداد سے قطعی محروم ہو چکا تھا۔۔۔

ہچانیت میں زوردار بحث ہو رہی تھی۔۔۔ خروٹ کا جنگل لرز رہا تھا۔۔۔

شہر کے نرہندوں کو ان کے تئیں خیر کے پیر و کاروں کو الجھانے، نیچے دکھانے کا ایک اور موقع، ایک نئی مسرت کی
نوید تھی۔۔۔ وہ طاقتور شراٹکیز کاسک وائبریشن گے نئے سلسلے لے کر آئے تھے۔۔۔

زمینی مخلوقات پر چھوڑنے۔۔۔ ان اشیری لہروں میں بری خواہشات، افکار اور تباہ کن تہذیب کی شکلیں کلبہ راہی
تھیں۔۔۔ کاسک ریجن سے، کی ہرنی شیطانی تجویز دو بیچارے انجام سے لہی تھی۔۔۔

وہ کالے کتوں، سانپوں، چھپکلیوں، موشیوں، مکھل چیریوں، چڑیلوں، مغولوں، زومبیوں، دیوؤں، عفریتوں
کے روپ دھارے اپنے مخالفین کو ڈرانے، دھمکانے، ورغلانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔۔۔ تاکہ ان کے شوق عبادت اور نیکو
کاری کو نشانہ بنائیں۔۔۔

باب نے کہا، سب سے خطرناک جذبہ حسد کا ہے۔۔۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی یہ طومی جذبہ بھی پیدا ہو گیا
تھا۔۔۔

طرطوش بو۔۔۔ ذر سوچ سمجھ کر دلو بڑے میں ناحق الجھاتے ہو۔۔۔ کیوں اتنا پشاپ بکتے ہو۔۔۔ یہ

ہم ہی تو تھے ہمارے جد امجد تھے۔۔۔ جنہوں نے اس کو توتی شرف المخلوقات کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔۔۔ کیا غلط کیا کہ راندہ درگاہ ٹھہرے۔۔۔ اب دیکھ لو کیا درست کیا غلط۔۔۔

بزرگ نے کہا، کتنا پوتر ہے یہ انسان۔۔۔ ہاں اس سے بچ کر رہنا۔۔۔ یہ الزام بھی ہم پر لگائے گا کہ، فوق الفطرت قوتوں نے، جنات نے کروایا ہے۔۔۔ تیار رہو۔۔۔

ہم تو ایسا نہیں کرتے۔۔۔ ایک بچہ بولا۔۔۔

یہ ہمیں آ سیب کہتے ہیں۔۔۔ یہ خود آ سیب ہیں۔۔۔

شیطان ہماری بدنامی کا باعث بھی تو بنا ہے۔۔۔

بر رگوار منہ سنبھال کر۔۔۔ کیا یہ انسانی مجرم بے گناہ ہے۔۔۔ یہ معصوم کہے گا کہ اس کے خیالات، میرے

معصوم، عامل یا اس موکل نے چرا لیے تھے۔۔۔ اور اس میں خباثت بھر دیے۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔ مجھ سے سب کچھ کروایا گیا ہے۔۔۔ وغیرہ۔۔۔

وہ کیسے۔۔۔؟ خیالات کو پراگندہ کر کے۔۔۔ ان کے مذہب خیال عبادت کا نظریہ بدل کر۔۔۔

خباثت ہماری نسل کے اندر بھی تو پائے جاتے ہیں۔۔۔

بزرگوار کے منہ سے نکل گیا۔۔۔

طرطوش پھرے سچ پا ہو گیا۔۔۔

ہاں ہاں کہہ دو اصل مجرم عامل ہے جس نے اس پر میرے موکل کو مامور کیا۔۔۔ موکل ہی اصل مجرم ہے۔۔۔ کیا

یہ ہی نصف ہے تم سب کا۔۔۔ ایک تو مدد کریں اور موروں والی لڑائی بھی ٹھہریں۔۔۔

یہ تو کہے گا ہی نہیں کہ یہ اس کی زیادتی ہے۔۔۔ بلکہ کہے گا کہ مقتول اس سوک کا پیدا ہونے کا حقد رکھتا تھا۔ اور مجھے بچہ

حاصل کرنے کے جنون میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔

اچھا اگر تم لوگ بے قصور ہو تو بتاؤ کہ آدم جادو اور، فوق الفطرت چیزیں ہی کیوں اپنے حسد کی آگ ٹھنڈی کرنے

کے لیے استعمال کرتا ہے۔۔۔؟ بابائے کہا۔۔۔ اس لیے کہ قتل کے لیے اسے طاقت، جرأت، درندگی، حیوانیت چاہئے جو یہ

اپنی سوسائٹی میں استعمال کرتے سو پور سو چتا ہے۔۔۔ طرطوش نے جواب دیا۔۔۔ جواب تک خاموشی تھا۔۔۔

دادا ابو، یہ کیسا دھواں سا آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔۔۔؟ اس میں تو کوئی انسانی شکل چھپی ہوئی ہے۔۔۔ اس

کے سر پر چاند کی طرح دو سینک ہیں۔۔۔ کالی کالی آنکھوں کی پتلیاں کیسی چمکتی ہوئی روشن سی لگ رہی ہیں۔۔۔ اس

کے پیروں میں کھڑ ہیں۔۔۔ اور اس کی دم بھی تو ہے۔۔۔ یہ گندھک کی سی بو ہر طرف پھیلتی جا رہی ہے۔۔۔ اس کے

چہرے پر کیسی مکاری لکھی ہے۔۔۔ یہ کون ہے۔۔۔؟

بزرگ نے فوراً جواب دیا۔۔۔ بیٹا یہی تو شیطان ہے۔۔۔ ننگا شیر، ننگ جنات۔۔۔ جنات۔۔۔ کی بدنامی

کا باعث۔۔۔

بچہ بولا۔۔۔ دادا ابو۔۔۔

کیا یہ اس کی کھال میں چھپا انسان تو نہیں ہے۔۔۔؟

☆ ☆ ☆

نئے رشتے

اجمل اعجاز

فلیٹ کی مخصوص پارکنگ میں پہنچ کر میں نے موٹر سیکل کو بریک لگائے اور بائیں ہاتھ میں پسینی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی جو پونے گیارہ بجنے کی نوید دے رہی تھی۔ مجھے دفتر کو چھوڑے ہوئے تقریباً چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ دفتر سے یوں تو پانچ بجے چھٹی ہو جاتی تھی لیکن میرے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ میرے یہ دفتری اوقات کے بعد روزانہ دو گھنٹے اور ٹائم کرنا لازمی تھا۔ دفتر سے سات بجے رخصت ہو کر میں دفتر کے سامنے ہی سڑک کی دوسری جانب واقع جم خانہ چلا گیا تھا جہاں کچھ وقت میں نے بلکی پھلکی کسرت کرنے میں گزارا اور باقی وقت ٹیبل ٹینس کھیلنے میں گزر گیا تھا۔ وہاں سے مارغ ہو کر گھر کے قریب ہی ایک ٹھیپے سے برگر کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ مجھے اپنے فلیٹ پر پہنچتے پہنچتے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ میں نے گیٹ کے تالے میں چابی گھمائی، گیٹ کھول اور بجلی کا بٹن دبایا۔ روشن اداسی نے میرا استقبال کیا۔ فلیٹ کی خاموشی اور دیرانی آ سیب زدہ ماحول کی عکاس تھی۔ راشدہ کو گھر چھوڑے ہوئے آج پانچواں دن تھا۔ وہ آج بھی واپس نہیں آئی تھی۔ میں جانتا تھا وہ ضد کی پکی ہے اور اپنی بات منوانے تک واپس نہیں آئے گی۔ اس کے احتجاج کو پورے پانچ روز گزر چکے ہیں۔

بڑھتی ہوئی روز روز کی مہنگائی نے یوں تو ہر گھر کے بجٹ کو ٹپٹ کر دیا تھا لیکن راشدہ کے مطالبات معمول کی بات تھی۔ اسے مہنگائی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ہر سب چھ ماہ بعد اپنی جیب خرچی میں اضافے کا مطالبہ کر دیتی تھی، جو میری محدود تنخواہ اور اور ٹائم کی آمدنی کے باوجود پورا کرنا میرے لیے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

ہماری شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا، اولاد نہ ہونے کے سبب زندگی بے کیف اور بے رونق کے گھنور میں گزر رہی تھی۔ اس نے اپنی سسرال والوں سے تعلقات پہلے ہی کشیدہ کیے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف اس کے میکے والوں کا آنا جانا تھا، جسے میں پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے آئے دن کے مطالبات زرنے مجھے پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں نے شادی کے فوراً بعد ہی اس کی جیب خرچی کے لیے ماہانہ رقم مختص کر دی تھی تنخواہ منے پر، گھر کی مہینے بھر کی ضرورت کا سامان میں خود خرید کر لاتا تھا، اس کے علاوہ روزانہ سبزی گوشت لانا اور دیگر ہنگامی اخراجات کو پورا کرنا بھی میری ذمہ داری تھی۔

اپنی جیب خرچی کی ساری رقم وہ اپنے چہرے، ہاتھ پاؤں اور بالوں کو صحت مند اور خوبصورت بنانے اور نئے فیشن کی تراش خراش والے ملبوسات پر خرچ کرتی تھی۔ میں نہیں جانتا یہ اس کا شوق تھا یا جنون۔ وہ سلائی کڑھائی کے نئے نئے نمونوں کی تلاش میں اکثر مختلف بوتیکس کا طواف کرتی اور اپنے ملبوسات کو کڑھائی اور سلائی کے مراکز سے اپنے پسندیدہ نمونوں سے مزین کرتی تھی۔ وہ عام گھریلو خواتین سے مختلف نظر آنا چاہتی تھی۔ فیشل، ویکسنگ، پیچ، مینی کیور، پیڈی کیور، تھریڈنگ، بالوں کی تراش، خراش اور آرائش کے لیے اس کے رابطے اکثر شہر کے مہنگے بیوٹی پارلرز سے رہتے تھے۔ میرا خیال ہے شہر کے سارے بوتیکس اور بیوٹی پارلرز ایسی ہی خواتین کے دم سے قائم و دائم ہیں۔

بیوٹی کا بننا سنورنا، خوبصورت نظر آنا، اچھے ملبوسات پہننا بے شک اس کا فطری حق بھی ہے اور ہر مرد کی خواہش

بھی، لیکن اس شوق کو پورا کرنے کے لیے مطالبہ بزرگوار کا وقفے وقفے سے تسلسل قائم رہے، جو ایک خاوند کو اپنی محدود آمدنی میں پورا کرنا، ناممکن ہو تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔

ابتداء میں ایسی صورتیں پیش آنے پر میں نے سے سمجھایا

”پیشک فیشن اچھی چیز ہے، لیکن ہر انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے چاہئیں۔“

”میرے ذہن میں اس مشکل کا ایک حل ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ضرور بتائیے۔“ میں نے پراسختیاں لہجے میں پوچھا۔

”گھر کی ضرورتوں کی اشیاء کی ماہانہ خریداری میں کروں گی۔ میری کوشش ہے جو بچت ہوگی، وہ میری ہوگی۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”میری طرف سے جازت ہے۔“ میں نے اس کی تجویز فوراً مان لی کہ اس طرح میں ہر ماہ ہزار سے سامان کی

خریداری کی کوفت اور پریشانی سے بچ جاؤں گا اور اس سے میری تنخواہ پر اضافی بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔ وہ چند ماہ تک اپنی نئی ذمہ داری کو بخوشی نبھاتی رہی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ جو خریداری کرتی ہے اس کی مقدار اور معیار کیا ہے اور اس طرح ہر ماہ وہ کتنی رقم پس انداز کرتی ہے۔

ہمارے گھر کے تمام کپڑوں کی دھلائی کی ذمہ داری دھوبی پر تھی جو ہر پندرہ روز بعد کپڑے لے جاتا اور دھو کر واپس کر دیتا تھا۔ اس کی دھلائی تو یقیناً اچھی تھی مگر اس دھلائی کے نتیجے میں کپڑوں کی آب تھوڑی سی مدت میں ختم ہو جاتی تھی۔ دو چار دھلائیوں کے بعد ہی کپڑے بد شکل اور بے جان ہو جاتے تھے۔ میری نئی قمیصوں کے کالر جلد ہی پھٹ جاتے اور اکثر نئی شرٹس دھلنے کے بعد بے ڈس ہو جاتی تھیں۔ ایک دن میں نے راشدہ سے کہا ”گھر میں واشنگ مشین موجود ہے، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ کپڑے کسی کسی کے ذریعے گھر پر ہی دھلوائیے جائیں۔ اس طرح بچت بھی ہوگی اور کپڑوں کی زندگی بھی بڑھ جائے گی۔“

اس نے متبادل تجویز پیش کی۔

”اگر یہ کپڑے میں خود دھوؤں تو؟“ اس نے سوالیہ نظریں میری جانب اٹھائیں۔ میں اس سوال پر حیران ہو رہا

تھا کیونکہ شادی کے بعد آج تک اس نے واشنگ مشین سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ کپڑے دھونے سے صابن اور سوڈا اس کے ہاتھ اور ناخن کے حسن کو متاثر کریں گے۔

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ میں نے بے یقینی کے ساتھ اس کے چہرے کو دیکھا۔

”وہ رقم جو آپ دھوبی کو دیتے ہیں مجھے ادا کریں گے۔“

”بے شک، لیکن صابن اور نیل کی قیمت کی کوئی کے بعد۔“ میں نے شرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”مجھے منظور ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

اس فیصلے کا سبب بھی یہی سوچ تھی کہ کپڑے گھر میں دھلیں گے تو زیادہ صاف دھلیں گے، ان کی آب و تاب

جدی خراب نہیں ہوگی اور یہ کہ گھر کی رقم گھر میں رہے گی جس سے یہ اپنے فیشن اور بناؤ سنگھار کے بڑھتے ہوئے اخراجات میں توازن قائم کر سکے گی۔

اس دن جب میں اتوار کی تعطیل کے سبب دیر سے سوکراٹھا تو مجھے احساس ہوا کہ گھر کے مردوں کے فرش پر مٹی کی

ہلکی سی تہہ جی ہوئی ہے اور جا بجا پھٹے ہوئے کاغذوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور پرزے اور مختلف رنگ کے پد شک کے شا پر زفرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ مسبری کے کناروں، سینئر ٹیبل اور کرسیوں پر بھی مٹی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر راشد سے پوچھا۔

”کیا ماسی نہیں آ رہی۔ فرش اور فرنیچر گرد آلود نظر آ رہے ہیں۔ کیا ہوا ماسی کو؟“
 ”ہاں وہ کام چھوڑ گئی ہے۔ پیسے بڑھانے کا مطالبہ کر رہی تھی۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولے۔
 ”تو دوسری ماسی کا انتظام کر لو۔“ میں نے مشورہ دیا۔
 ”اب اس تنخواہ پر کوئی بھی ماسی جھاڑو پوچھا کرنے پر تیار نہیں ہے۔“ وہ اسی انداز سے بولی۔
 ”اب میرا کام یہی رہ گیا ہے کہ میں ہر ایک کی تنخواہ میں اضافہ کرتا رہوں۔“ میں نے غصے میں چھپے طنز کا تیرا اس کی جانب پھینکا۔

”حقائق سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ آپ مہنگائی کو بھی دیکھیں کہاں جا رہی ہے۔“ اس نے ماسی کے حق میں دلیل دی۔

”مہنگائی تو پھر سب کے لیے ہے نا۔“ میں نے جوابا کہا۔
 ”آپ اپنی آمدنی بڑھانے کی کوشش کریں۔ یہی ایک حل ہے۔“ وہ سنجیدہ تھی۔
 ”سارے دن جھک رہا ہوں۔ دفتری اوقات کے بعد اور ٹائم بھی کرتا ہوں۔ بھلا میں اور کس طرح آمدنی بڑھاؤں۔ چوری کروں یا ڈاکہ ڈالوں۔“ غصہ میری آنکھوں میں اتر آیا۔
 ”تم ہی میری اس مشکل کا کوئی حل نکا دو۔“ میں نے اس کی جانب عجزی سے دیکھا۔
 ”اگر میں گھر میں خود جھاڑو دینے لگوں تو؟“ اس نے اُمیدوں بھرا سوال میری جانب اچھل دیا۔
 ”یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔“ ہمدردی کے جذبات میرے سینے میں اٹل پڑے۔
 ”ماسی کی ماہانہ تنخواہ میں وصول کروں گی۔“ اُمیدوں اور ارمانوں کا تاج محل یکدم زمیں بوس ہو گیا۔ میں نے مایوسی کے ساتھ اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور سپر انداز ہو گیا۔ میری سوچ کا محور یہی تھا کہ گھر ایک مرتبہ پھر صاف ستھرا ہو جائے گا اور گھر کی رقم گھر میں رہے گی جو راشدہ کے بڑھتے ہوئے ذاتی اخراجات میں مددگار ثابت ہوگی۔
 ”مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے اس کی یہ شرط بھی مان لی۔

اس کے ماہانہ جیب خرچ میں تنخواہ کے سلائیڈ اضافے کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مہینے بھر کے سودا سلف کی خریداری پر بچت کے ساتھ ساتھ اب وہ دھوبی اور ماسی کی تنخواہ بھی وصول کر رہی تھی، اس کے باوجود جب اس نے پھر جیب خرچی میں اضافے کا مطالبہ کیا تو میں طیش میں آ گیا اور اس کا مطالبہ رد کر دیا۔ میرے انکار پر وہ ناراض ہو گئی اور میری غیر عاضری میں، مجھے اطلاع دیے بغیر اپنے میکے چلی گئی۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں روزانہ کا معمول تھا اور وہ یہ عمل اکثر دہراتی رہتی تھی۔

میں اکثر سوچتا کہ دوسری بیویاں بھی تو ہیں جو اپنے گھر کو خود اپنے ہاتھوں سے بناتی اور سنوارتی ہیں۔ ایک ایک پیسے کی بچت کرتی ہیں۔ اپنے بچوں، اپنے گھر اور اپنے خاندان کے سکھ اور آرام کے لیے اپنا تن من اور دھن سب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ ایک یہ بیوی ہے جو بیوی کم دھوبن زیادہ ہے۔ جو بیوی کم ماسی زیادہ ہے، اس عورت نے اپنے عمل سے میاں

بیوی کے رشتے کو نیا نام دیا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے احساس دلاؤں گا کہ سچا رشتہ میں بیوی کا ہے اور گھر دونوں سے قربانی اور وفاداری کا متقاضی ہے۔

گھڑی کی سوئی گیارہ کے ہند سے کو عبور کر کے آگے بڑھ چکی تھی۔ تنہائی، خاموشی اور بے اعتنائی کا زہر روح میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ بے چینی، بے کیفی، بے وفائی کا ہر بوند بوند ٹپک کر میری فکر اور سوچ کو آلودہ کر رہا تھا۔ میں نے موبائل فون اٹھایا اور اسے پیغام بھیجا۔

”میں تمہاری جیب خرابی بڑھانے کو تیار ہوں۔“

جوا ب فوراً ہی اس کا پیغام ملا:

”مجھے آکر ساتھ لے جاؤ۔“

اس کا میکہ قریب ہی تھا۔ بمشکل پانچ منٹ کی پیدل مسافت پر۔ وہ خود بھی آ سکتی تھی۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ جب بھی ماراض ہو کر جاتی مجھے ہی اسے سینے کے لیے جانا پڑتا تھا، میں نے موٹر سائیکل کی چابی، ٹھائی، فلیٹ کا گیٹ اور تالا لگایا، نیچے اتر، موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور چند منٹ بعد میں اس کے دروازے پر موجود تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کا ہارن بجایا، وہ فوراً گھر سے نکلی اور موٹر سائیکل کی پچھلی نشست پر سوار ہو گئی۔

”آخر کار آپ ہاں گئے۔“ جب ہم بستر پر دراز ہوئے تو اس نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔

”ہاں۔۔۔ میں نے اس مشکل سے نکلنے کا ایک حل تلاش کر لیا ہے۔“

”کیس حل؟“ اور وہ سوال کرنے کے ساتھ ہی خوشی سے نڈھال ہو کر جیسے کپے ہوئے پھل کی طرح میری

آغوش میں آگری۔

”یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اور پھر میں بے جا گھوڑے کی طرح جذبات کی دلدلوں میں دوڑ پڑا۔ گھٹنوں، پہاڑیوں اور ڈھلوانوں کے تلاطم خیز سفر کے اختتام پر جب میری سانسیں بحال ہوئیں تو میں نے قریبی دیوار پر کھونٹی پر لٹکتی ہوئی پتلون کی عقبی جیب سے اپنا بٹوہ نکالا اور ہٹوے میں سے ایک سرخ رنگ کا نیا نوٹ نکال کر دائیں ہاتھ کی پہلی اور درمیانی انگلی کے درمیان پکڑ کر اس کے چہرے کے قریب لہرایا۔

”یہ کیا ہے۔۔۔۔۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹوں کی چمک تھی۔

”یہ اس رفاقت کا صلہ ہے جو تم نے مجھے ابھی ابھی بخشا ہے۔“ میری مسکراہٹ طنز آمیز تھی۔

”صرف سو روپے۔ اس سے کیا بنے گا۔“ اس کی مسکراہٹ اداسی میں ڈھل گئی۔

”تمہیں مہینے میں اسی طرح کے چار پانچ نوٹ مل جا یا کریں گے جس سے تمہیں اپنے اخراجات کو پورا کرنے

میں مدد مل جائے گی اور مجھے آسانی یہ رہے گی کہ میری جیب میں رقم ہوگی تو میں خرچ کروں گا ورنہ نہیں۔“

میں سوچ رہا تھا نسوانیت کی اس تذلیل پر وہ تمللا اٹھے گی، چراغ پا ہوگی اور خونخوار بھوک شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوگی لیکن میں حیراں تھا۔ اس کے چہرے پر پشیمانی و رثہ مندگی کے برعکس کامیابی کا سرور، ہرادی کا طمینن اور ایک فاتح کا سا وقار تھا۔ میں اپنے حملے کی ناکامی پر شرم ساری اور پسپائی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ادھوری

تحریر: فاطمہ زہرا جبین

صبا عبد الحمید ہمیشہ خدا، زندگی اور محبت کی مثلث میں خود کو تلاش کرتی رہی۔۔۔ اس تلاش میں اُسے ہمیشہ خدا تو مل جاتا تھا۔۔۔ اور زندگی کے لطیف احساس کی دھنک بھی چہرے پر نکھار لے آتی تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔ محبت۔۔۔ ہر مقام پر رنجش میں ہی رہی۔۔۔ یقیں کی خوش غماں پگھندی۔۔۔ رخش تمنہ کی لامحدود جستجو۔۔۔ بس ایک بڑا خواب کی حاجت لیے وہ زندگی کی راہ پر چلتی چلی جاتی تھی۔۔۔

سولہ برس کا سن قیامت تھا۔۔۔ ابھی خواب بھی آنکھوں میں پوری طرح ستارہ بن کر ہی نہ جھمکا پائے تھے کہ اقات نے اپنی دور پرے کی رشتہ و رفقہ آپا کے بیٹے احمر سے اُس کی مشقی کر دی۔۔۔ حار نکہ ابھی اُس کا ایک بڑا بھائی اور چار بڑی بہنیں کنواری بیٹی تھیں۔۔۔ اُس کی اس مشقی کی کئی بڑی وجوہات تھیں جن میں سے دو بڑی وجوہات اہا کی اُس سے شدید نفرت اور بے تحاشا خوبصورتی جس کے سبب اُس کی بہنیں بھی اُس سے خائف تھیں۔۔۔

احمر اُس کا سنگیتر۔۔۔ اُسے اچھا لگتا تھا۔۔۔ کیونکہ وہ اُس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔۔۔ احمر کے بھی کچھ خوب تھے۔۔۔ جو وہ صبا کے ساتھ مل کر پورا کرنا چاہتا تھا۔۔۔ آرزوئیں اُس کی آنکھوں میں ستاروں کی طرح جھلکتی تھیں اور صبا نے جیسے ایک شہر غماں اپنے اندر بس لیا تھا۔۔۔ محبت آسمانوں کے حریری کناروں سے اُترا ہوا ایک الوہی خواب۔۔۔ وات کا آئینہ۔۔۔ اور پھر گم ہو گئی اُسی مثلث میں۔۔۔ جہاں خدا، زندگی اور محبت صبا کو پیکر بخزور ضا بنا گئے۔۔۔

عبد الحمید بچوں کی خود کفیل تو تھے لیکن معاشی طور پر وہ بہ دن حالات خراب سے خراب تر ہوتے جاتے۔۔۔ ایک چھوٹے گریڈ کے بنک افسر۔۔۔ آٹھ بچے جن میں سے سات بیٹیاں اور ایک اکلوتا بیٹا۔۔۔ وہ صبا کی پیدائش کے بعد سے ملوں ہی رہتے۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ صبا جو برداشت ہی نہ کر پاتے تھے۔۔۔ وہ تو راہدہ کا دم تھا کہ صبا اپنی زندگی کی خراں گزیدہ سوہ بہاریں بھی دیکھ سکی۔۔۔ ورنہ اہا تو اُس کا گلہ گھونٹ کر کب کا اُس کو دفن کر دیتے۔۔۔

صبا کی پیدائش صرف ایک بچے کی نہیں تھی بلکہ جزواں بچوں کی پیدائش تھی۔۔۔ ایک لڑکا اور ایک من موہنی سی لڑکی۔۔۔ بیٹا سانس پیتے ہی مر گیا اور صبا جیتی رہی۔۔۔ یہی زخم عبد الحمید کو کھاتا تھا۔۔۔ یہی وجہ تھی کہ راہدہ نے بڑے بچوں سے پہلے ہی اُس کی مشقی کر دی تاکہ اُسے ہی سب سے پہلے اس جہنم نما سے رخصت کر دے۔۔۔ حقیقتاً راہدہ صبا کو نوٹ کر پیار کرتی تھی کہ وہ تھی ہی چاہے جانے کے قابل اور اُس کے شوق بھی چاہے جانے کے قابل تھے۔۔۔ چینگنگ کا ہنر اُسے اللہ کی طرف سے تحفے کے طور پر ملا تھا۔۔۔ کھڑے کھڑے منظر کار بورڈ پر منتقل ہو جاتے۔۔۔ علم کا حصول اُس کا نصب العین تھا۔۔۔ اور تو اور اللہ نے اُسے خوبصورت، وار سے بھی نوازا تھا۔۔۔ جب وہ محلے کے میلا دوں میں نعشیں پڑھا کرتی تو سامعین پر رقت سی طاری ہو جاتی۔۔۔ راہدہ کے بقول صبا اللہ کی بہت چہیتی بندہ تھی۔



آج موسم کچھ زیادہ اچھا نہ تھا اور شہر کراچی کے حالات بھی کچھ موسم ہی جیسے تھے۔۔۔ عبد الحمید کا دل نہ تھا کہ

دفتر جائے لیکن ٹھہرنی اُسے ہمیشہ ہماری ہی پڑتی تھی سو وہ بال دل خوش تھا تیار ہوا اور اپنی زندگی آلود برائے نام موٹر سائیکل پر بنک آ گیا۔۔۔ ابھی وہ پہنچا ہی تھا کہ مینیجر نے اُسے بلایا۔

’اللہ خیر کرے۔۔۔ آج بلال صاحب نے صبح ہی صبح کیوں بلایا وہ اپنے ساتھی ڈاکر کے سامنے بڑبڑایا۔۔۔‘
حالانکہ آج تو تیس وقت سے چندہ منٹ پہلے ہی دفتر میں ہوں
’اے یہ رجلدی جاؤ ڈاکر نے اُسے احساس دلایا کہ اُسے بنک مینیجر نے بلایا ہے۔۔۔‘

’جی سر وہ اب بلال صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔‘
’حمید صاحب آج ایک اہم کام ہے۔۔۔ بیٹھے۔۔۔ بلال صاحب نے، انہیں سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔۔۔‘

’جی سر۔۔۔ وہ بیٹھ گیا
’یہ فائل لیجئے۔۔۔‘ حشام بلگرامی صاحب ہماری برانچ بہت پرانے اور سہولت کلائنٹ۔۔۔ اسی لیے اکثر میں اُن کے گھر چلا جاتا ہوں۔۔۔ ورنہ کبھی دوسرے افسران کو بھیج دیتا ہوں۔۔۔ ذرا بڑی عمر کے کلائنٹ ہیں۔۔۔ اور صاحب ثروت بھی۔۔۔‘

’جی سر۔۔۔ لیکن۔۔۔‘
’بھئی لیکن ویکن کچھ نہیں۔۔۔ بس یہ فائل پکڑو۔۔۔‘ مدثر صاحب کے پاس جاؤ وہ تمہیں سمجھا دیں گے کیا کرنا ہے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ پچھلے سال بھر کے اسٹیٹمنٹس لینا نہ بھولنا۔۔۔ وہ پورے سال کے ایک ایک پیپر کو چیک کریں گے۔۔۔ دو چار گھنٹے لگ جائیں گے۔۔۔ صبر سے سب سننا اور کوئی اونچ نیچ نہ ہونے دینا۔۔۔ یہ در ہے احتشام صاحب ہمارے ٹاپ کلائنٹ ہیں۔۔۔ خیال رکھنا۔۔۔‘

’جی اچھا سر۔۔۔ لیکن سر میری بابت اس قابل نہیں ہے کہ اُن کے دولت کدے تک چل سکے۔۔۔‘ عبدالحمید نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’ادہ۔۔۔ میں اصغر صاحب سے کہے دیتا ہوں۔۔۔ وہ آپ کی سواری کا بندوبست کر دیں گے۔۔۔ بس خیال رکھیے کہ وقت سے کچھ قبل ہی پہنچ جائیں۔۔۔‘

وہ دن عبدالحمید نے دن بھر احتشام بلگرامی کے ساتھ گزارا۔۔۔ بنک ڈاکوٹس سے لے کر عبدالحمید کی نجی زندگی تک سب احتشام بلگرامی جان چکے تھے۔۔۔

پھر یوں ہوا کہ برانچ مینیجر کے حکم اور احتشام صاحب کی خواہش کے مطابق وہ حشام صاحب جیسے متمول شخص کا ذاتی ملازم سا ہو گیا۔۔۔ وہ اکثر اُسے آتے جاتے کچھ رقم بھی دیا کرتے۔۔۔

احتشام بلگرامی پینسٹھ برس کے تھے اور گزشتہ آٹھ برس سے بیوی کے انتقال کے بعد سے تنہا رہتے تھے۔۔۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی بیرون ملک اپنے اپنے معیار زندگی میں خوش تھے۔۔۔ پیسے سے وہ ضروریات زندگی کی ہر چیز خرید لیا کرتے تھے لیکن نہ خرید سکے تو گھریلو زندگی۔۔۔ تنہائی کا ساتھی۔۔۔ دوسرا ہٹ کے لیے کوئی۔۔۔ کوئی۔۔۔ ہاں۔۔۔ کوئی ایسا جو اُس کا خیال رکھے۔۔۔ اُن کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے۔۔۔ اُس کے ساتھ بچے اور ڈاکٹر کا لطف لے سکیں۔۔۔ لی وی مودی

دیکھ سکیں۔۔۔ زندگی کو عمر کے س دور میں گزر اور دیکھنے کے خواہشمند تھے۔۔۔

ایک روز جب، حشام بڑی ترنگ میں تھے جب عبدالحمید ان کے سامنے بیٹے تھا۔۔۔

’یار میں شادی کرنا چاہتا ہوں‘۔۔۔

’جی‘۔۔۔ عبد الحمید کچھ کچھ حیران سا ان کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ سوچنے لگا کہ یہ بڑھاپہ تو پورے کا پورا ہی ٹھیک یا

ہوا ہے۔‘

’کوئی مناسب سی خاتون نظر میں ہیں کیا حمید؟‘۔۔۔

’سر۔۔۔ سر۔۔۔ وہ ہٹکا سا گیا۔۔۔

کیوں۔۔۔ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔۔۔ کیا نکاح کی خواہش رکھنا اور اس کا اظہار کرنا گناہ میں شمار ہوتا

ہے۔۔۔

’نا۔۔۔ ہیں۔۔۔ نہیں سر۔۔۔ دراصل میں آپ کے سوال کو سمجھ ہی نہ سکا۔۔۔‘ عبد الحمید بوکھلا کر بولا۔۔۔

’دیکھو میں۔۔۔ ہم آدمی ہیں کھرے۔۔۔ عمر کو کہ تھوڑی بڑی ہے۔۔۔ لیکن شادی کے بعد بیوی کو سونے میں

تول کر رکھیں گے۔۔۔

’جی سر۔۔۔ میں دیکھتا ہوں۔۔۔‘ عبد الحمید سوچ میں پڑ گیا۔۔۔

وہاں سے نکلتے عبد الحمید سوچتا ہی چلا گیا۔۔۔ سوچ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی تھی اور ہمت کٹھن مرحلوں

سے گزر رہی تھی۔۔۔ یوں ہی چار ہفتے گزر گئے۔۔۔ ایک روز وہ زاہدہ کو کالغٹن کے ساحل پر لے گیا۔۔۔ زاہدہ حیران کبھی

سمندر کی مٹی پھنرتی موجوں کو دیکھتی اور کبھی عبد الحمید کا برف سا چہرہ دیکھتی۔۔۔ لہروں کو بھی جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔۔۔ بادل کا

ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی ہم گیا۔۔۔ سماں بھی نہ رہ سکا۔۔۔ ایک بوند بے قیمت سی گرمی اور سمندر میں سمٹ گئی۔۔۔

☆ . . ☆ . . ☆

چند مستحضر گھڑیاں۔۔۔ اداس سا قہقہہ۔۔۔ اور ایک سیلی سی مسکراہٹ۔۔۔ بڑی آسانی سے چھ ماہ قبل کی گئی

مشتی توڑ دی گئی۔۔۔ احمر دوڑا چلا آیا۔۔۔ صبا کو دہائی دی۔۔۔ عبد الحمید اور زاہدہ کے سامنے رگڑ گرایا۔۔۔ رو دیا۔۔۔

فضیلہ نے بہت کہا سنا۔۔۔ مگر عبد الحمید کے کان پر جوں تک نہ چل گئی۔۔۔ احمر چھپ کر صبا کے پاس آیا۔۔۔

’صبا۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔۔۔ کیوں ہو گیا۔۔۔ کیسے ہو گیا۔۔۔‘

’پتہ نہیں۔۔۔ رات کی بارش میں ٹپکتی چھت ساتھ وہ دوا نکھیں بھی برسیں۔۔۔

’میں جوگی بن جاؤں گا صبا‘۔۔۔ وہ رو دیا۔۔۔ لیکن وہ بے بس تھی کہ زندگی کی لائن آف کنٹرول پر اتنا تعینات

تھے۔۔۔

شادی کا دن۔۔۔ ولہن کا دن۔۔۔ دولہا کا دن۔۔۔ بارات کی شوخیاں۔۔۔ قیمتی حریری لباس کی مہک۔۔۔

حسن کا ٹیک۔۔۔ اور جبکے ہوئے آنسوؤں میں اپنی تلاش آساں نہ تھی۔۔۔ گر آنسو گرتے تو وہ خود اپنی ہتھیلی میں جذب

کریتی۔۔۔ لیکن آنسو بہے نہیں۔۔۔ بہک گئے۔۔۔ دل دریا کے آس پاس۔۔۔ اسے خبر ہی نہ تھی کہ کون مسکرا رہا

ہے۔۔۔ کون رو رہا ہے۔۔۔ ایک بے خبری کا عالم تھا۔۔۔ یک شکستہ سی ہستی تھی۔۔۔ پتہ نہیں وہ اماں تھیں یا کوئی بہن یا بڑا

بھائی جو صبا کو کسی کے پہلو میں گاڑی میں بٹھا گیا۔۔۔ جو پہلو میں تھا۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔۔

’تھک گئی ہو۔۔۔ میرے کندھے پر سر نکالو پلیز۔۔۔ بڑی مہربان آواز تھی۔۔۔
 ’صبا۔۔۔ اب رخصتی ہو رہی ہے۔۔۔ گاڑی چلنے والی ہے۔۔۔ رخصتی کے بعد بیٹی پرانی ہوتی ہے۔۔۔ جہاں
 جاری ہو اب وہیں سے جنازہ اٹھنا چاہیے۔۔۔ آبا کی کرخت آواز مہربان سرگوشی پر حاوی تھی۔۔۔
 ’ابا۔۔۔ وہ گاڑی سے ایک جھٹکے سے اتری۔۔۔ ’کیا آپ میرے جنازے پر آئیں گے۔۔۔
 ’چلو۔۔۔ چلو۔۔۔ اندر بیٹھو۔۔۔ بتم میری بیٹی نہیں احتشام صبا کی منکوحہ ہو۔۔۔ ابا نے اُسے بڑی بے
 دردی سے گاڑی کے اندر دھکیل دیا۔۔۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔۔۔
 ’اور یہ درمیشہ کے بند ہو گیا۔۔۔ صبا سسکی
 ’نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ احتشام کی مہربانی آواز نے اُسے سینے کی کوشش کی صبا۔۔۔ بہت خوش رہو گی۔۔۔

صبح کا نور بھی صبا کے اداس اور سہمے ہوئے چہرے کی زرد کو نہ چھاسکا جب اُس نے اپنے شوہر کو نظر بھر
 دیکھا۔۔۔ کوئی تاثر نہ تھا۔۔۔ کوئی خوشی کی کرن نہ تھی۔۔۔ جوڑی نہ تھا۔۔۔ سول اور چنٹھ کا۔۔۔
 ’صبا۔۔۔ گھوڑے اور سرد پر بڑھاپا کبھی نہیں آتا۔۔۔ خوش رہا کرو
 ’میں خواب کیسے خریدوں۔۔۔ صبا کی آواز گہرے پاتال سے آرہی تھی۔۔۔ احتشام سہم سے گئے۔۔۔ ایک
 بے نام سی اجنبیت کے سامنے۔۔۔
 ’کیا خواب ہیں تمہارے۔۔۔

میرا میٹرک ناکمل ہے۔۔۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔۔۔ یہ اور اس جیسے بہت سے خواب ہیں میرے۔۔۔ صبا
 رُک رُک کر بولی۔۔۔ ’میں آپ کے ساتھ رہ کر۔۔۔ آپ کے ساتھ جی کر۔۔۔ آپ کی ہو کر۔۔۔ احتشام کتری کا شکار
 نہیں ہونا چاہتی۔۔۔

’ہوں۔۔۔۔۔ احتشام وہ آرام گری سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔۔۔
 ’کیا میں کسی غلط خواب کو خریدنے کا سوچ رہی ہوں۔۔۔
 ’نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔۔۔ وہ پٹ کر اُس کے پاس آن کھڑا ہوا۔۔۔ ’تمہارا آج کا خواب
 کل کی حقیقت ہے۔۔۔

وقت کی رفتار خاصی تیز تھی۔۔۔ صبا پڑھنے لگی۔۔۔ احتشام نے اُس کی اعلیٰ تعلیم کا خوب بندوبست کر رکھا
 تھا۔۔۔۔۔ سات سال کا سفر۔۔۔ جیسے تعلیم و تربیت کا سفر۔۔۔ ایک پُرانی میلی زندگی سے وقار کا سفر تھا۔۔۔ صبا کی
 شخصیت۔۔۔ اب ایک ناقابلِ تسخیر عورت کے ہر وقار و روپ میں تھی۔۔۔
 ’دیکھا آپ نے۔۔۔ میں کس قدر مضبوط ہوں۔۔۔ وہ اُس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔۔۔
 ’خوبصورت۔۔۔ حوصلہ مند۔۔۔ مضبوط اور ذہین۔۔۔ مجھے تم پر فخر ہے۔۔۔
 ’یہ سب آپ کے سبب ہے۔۔۔
 ’اگر تم ذہین نہ ہوتیں تو صبا دھرا کا دھرا رہ جاتا۔۔۔ احتشام نے اُسے بہت پیار سے دیکھا۔
 ’کیا انا نے بھی مجھ پر فخر کیا ہوگا۔۔۔

’کیوں ہڈانی باتوں کو یاد کر کے اپنے آج کو خراب کرتی ہو۔۔۔ تم سا کوئی نہیں۔۔۔‘ احتشام کا لہجہ گمان نہیں حقیقت تھا۔۔۔ ’صحران کو ہارش سے اور اس عمر میں مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔۔۔‘

’کیا میری قیمت کی بات کر رہے ہیں۔۔۔ جو آپ نے میرے بے غیرت باپ کو ادا کی؟‘ صبا کی تیوری پر مل تھے۔۔۔

’ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔۔۔ خوبصورتی اور معصومیت کی بھی۔۔۔ اور جس چیز کی قیمت ہو اس کے پاس چوائس نہیں ہوتی۔۔۔ عبدالحمید نے تمہیں بیٹی نہیں چیز سمجھا۔۔۔ اور اس کے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔۔۔ اور تمہارے لیے ایک بہتر مستقبل انتظار کر رہا تھا جو شاید تمہارے علاوہ کسی اور کے نصیب میں نہیں تھا۔‘ احتشام نے بہت ٹھہر ٹھہر کر اس سے کہا۔۔۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔۔۔ ایک گہری خاموشی کے ساتھ۔۔۔ ’خاموش کیوں ہو۔۔۔ مجھے تمہاری اچانک خاموشی سے بہت خوف آتا ہے۔۔۔ مجھے تمہاری آواز سن کر اچھا لگتا ہے۔۔۔ تمہیں زندگی میں آگے بڑھتا دیکھ کر لطف آتا ہے۔۔۔ تم جینے کی آرزو ہو۔۔۔ سنگ ہو۔۔۔ سیپ میں مٹھپا موتی ہو۔۔۔ میں تم میں اپنے جینے کے سہارے ڈھونڈتا رہتا ہوں۔۔۔‘

’سچی۔۔۔ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے میں کبھی بھی اپنے آپ سے نڈا بھی سوئے ایک موقع کے جب مجھے آپ کا نام لینا پڑتا ہے۔۔۔ بار بار زبان رک جاتی ہے۔۔۔ بار بار۔۔۔ انگل۔۔۔ چچا وغیرہ وغیرہ منہ پر آ جاتا ہے۔۔۔‘

’آ۔۔۔ ہاں۔۔۔‘ احتشام مسکرایا۔۔۔ ’جانتا ہوں۔۔۔ حقیقت سے فرار نہیں حاصل کرتا میں۔۔۔‘

’اچھا یہ بتائیں مرد کی اوقات کیا ہے؟۔۔۔ صبا بہت سنجیدہ تھی۔۔۔‘

’کیا مطلب؟ وہ ہمیشہ اس اداس سی لڑکی کے ہر سوال کے تیار رہتا۔۔۔‘

’یہی کہ مرد کی اوقات کیا ہے۔۔۔‘

’ہوں۔۔۔‘ احتشام نے ایک لمبی سی سانس بھری۔۔۔ ’مرد اس ہستی کا نام ہے جو اپنی شرافت کا تعین عورت کی شرافت سے کرتا ہے۔۔۔ وہ شریف اسی عورت کے لیے ہوتا ہے جو اس کو رد کر دیتی ہے۔۔۔‘

’واؤ۔۔۔ کچھ اور۔۔۔؟‘

’مرد اپنے دل کے مسکن کا بھی تعین خود کرتا ہے۔۔۔ صبا احتشام۔۔۔ ہر عمر کا مرد عورت کے دل میں رہنا اور بسنا چاہتا ہے۔۔۔ اگر رہنے کو اسے دل نہ ملے تو وہ چلتے جی مر جاتا ہے۔۔۔ اب دیکھو مجھے۔۔۔ میں کیسے جینے کے بہانے تلاش دیتا ہوں تمہارے ساتھ۔۔۔‘

’اور میں یہی بہانے اپنی بینٹنگز میں ڈھونڈتی ہوں۔۔۔‘

’جانتا ہوں۔۔۔ تمہاری ہر ادھوری بینٹنگ۔۔۔ تمہیں اگلے دن جینے کی انگ دیتی ہے۔۔۔‘

چودہ برس بہت آسانی سے گزر گئے۔۔۔ شاید احتشام کے لیے۔۔۔ صبا نے بہت سے سمجھوتے کیے۔۔۔ جذباتی اور ذہنی طور پر۔۔۔ احتشام اس کے لیے آسان تھا۔۔۔ جو اسے آسان درآ سہاں یہ اڑتا تھا۔۔۔ لیکن اس کا کیمہ ہمیشہ خالی ہی رہا۔۔۔ وہ ابا کی بدسلوکی۔۔۔ احمر کا جوگی سا پیار بھول ہی نہ پاتی تھی۔۔۔ رحل جاب سے گرا شک امانت تھا وقت کے پاس۔۔۔ وہ پناہ راز جانتی تھی کہ جس عمر میں اس کا دل توڑا گیا۔۔۔ وہ اسی عمر میں ٹھہر گئی تھی۔۔۔ اور آنکھوں

میں زندگی کی حقیقت جیسے ایک مانت کی طرح بھی ہوئی تھی جیسے کہ بسا وقت میں رکھی خوش گمراہ حسرتیں خاک کے فرش پر تنہا تھیں۔۔۔

ایک روز جب آسمان پر بادلوں کا پہرہ تھا۔۔۔ وہ سفید جوڑے میں بیوس اپنے پیٹنگ روم میں جاری تھی۔۔۔

’صبا۔۔۔ کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟‘

’کیوں ڈرتے ہیں شامی۔۔۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی ہوں۔۔۔‘

’نہیں ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ شاید میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔۔۔ یہاں آؤ۔۔۔ مجھے سانس لینے میں وقت ہو رہی ہے۔۔۔‘ احتشام کی طبیعت واقعی بہت خراب ہو رہی تھی۔۔۔ اور اتنی خراب ہوئی کہ وہ اب جینے کا کوئی بھی بہانہ صبا کے آنچل میں نہ ڈھونڈ سکا۔۔۔

احتشام جاتے جاتے زمین پر صبا کے لیے جنت کے ساتھ وصیت چھوڑ گئے کہ اگر وہ دوسری شادی نہ بھی کرے تو ان کے نام کے ساتھ محفوظ زندگی گزار سکتی ہے۔۔۔ اور ایک انکشاف۔۔۔ ایک چیک کی فوٹو کاپی تھی جس سڑھے تین کروڑ کا تھا۔۔۔ اس پر عبدالحمید کا نام لکھا تھا۔۔۔ وہ جانتی تھی اب نے کیا کیا ہے لیکن اتنی بڑی قیمت اس کے تصور میں نہ تھی۔۔۔ اسے اپنے ہی باپ سے گھن سی محسوس ہوئی۔۔۔

☆ ☆ ☆

آنے والے سالوں میں اس نے کئی نئی اور پُرانی مصروفیات کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا۔۔۔ کمزور و بے بس لڑکیوں کی مدد کرنا۔۔۔ انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں مدد دینا اس نے جیسے اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔۔۔ اور سوشل ورک کے بعد بچے ہوئے وقت میں وہ پیٹنگ کرتی۔۔۔ سناٹے نہیں بولتے۔۔۔ یہ اس کی تصویر کا عنوان تھا۔۔۔ ایک نامکمل احساس۔۔۔ جسے آرٹ گیلری میں بہت سراہا گیا۔۔۔ وہیں اس کی ملاقات حمدان سے ہوئی جو ابھی نیا سڑیکہ سے آیا تھا۔۔۔ چھوٹے باپ کا بڑا بیٹا تھا۔۔۔ حمدان اس کا پرستار بن گیا۔۔۔ لیکن وہ جتنا اس کے قریب آتا صبا کو احتشام کی یاد آتی۔۔۔ اس کا فلسفہ یاد آتا کہ۔۔۔

”مرد سہستی کا نام ہے جو اپنی شرافت کا تعین عورت کی شرافت سے کرتا ہے۔۔۔ وہ شریف اسی عورت کے لیے ہوتا ہے جو اس کو رد کر دیتی ہے۔۔۔“

اور شاید اب وہ جیسے وہ حمدان کی انا کا مسئلہ بن رہی تھی۔۔۔

’حمدان۔۔۔۔۔ جو آپ سوچ رہے ہیں وہ نہیں ہو سکتا۔۔۔‘

’کیوں۔۔۔ حمدان نے پوچھا۔۔۔‘

’میں احتشام کی بیوہ ہوں۔۔۔‘

’میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ حمدان کی آواز میں درخوست تھی۔۔۔‘

’نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ وہ ٹینشن سے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔‘ نہ میں ایسا کروں گی اور نہ ہی ایسا میرا خیال

ہے۔۔۔

’تو آپ تمام عمر بیوہ کی زندگی جینا چاہتی ہیں۔۔۔‘

’میں عزت کی زندگی جینا چاہتی ہوں۔۔۔‘

’تو آپ مانیں گی نہیں۔۔۔‘

’دوستی کر سکتی ہوں۔۔۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ ایک اچھا دوست آپ کے اندر چھپا ہے۔۔۔‘

’کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔‘

’میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ ویسے آپ امریکہ سے وکالت پڑھ کر آئے ہیں نا۔۔۔‘

’جی۔۔۔‘

’آپ۔۔۔ کل میرے آفس آجائیں۔۔۔ میں اپنی فرم کا آپ کو لیگل ایڈوائزر بنانا چاہتی ہوں۔۔۔ اگر

آپ کو قبول ہے تو آجائیں۔۔۔ مگر نہیں تو آج یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔۔۔‘

’لیکن صبا۔۔۔‘ حمدان آگے بڑھا

’ایکسکیوز می۔۔۔ آپ مجھے مسز بلگرامی کہہ کر پکار سکتے ہیں۔۔۔ مسز احتشام بلگرامی۔۔۔‘

حمدان سمجھ گیا۔۔۔ وہ مختلف عورت ہے۔۔۔ اُسے مردوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔۔۔

آنے والے سال میں حمدان نے صبا بلگرامی کی فرم میں لیگل ایڈوائزر کا عہدہ قبول کر لیا۔۔۔ سی ورن ایک

دن صبا کی طبیعت خراب ہوئی وہ اسپتال گئی اور چند دنوں میں اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُسے کینسر سائموئی مرض ہے۔۔۔ اور یہ

بھی کہ کینسر پنی آخری اسٹیج پر ہے۔۔۔۔۔

صبا نے حمدان کو بلا یا اور اپنی آخری وصیت پر کام شروع کر دیا۔۔۔۔۔

’مسز بلگرامی۔۔۔ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔۔۔‘ حمدان حیران و پریشان تھا۔

’مسز حمدان۔۔۔ ڈاکٹر کی ٹیم کے مطابق میرے پاس جینے کے لیے چار ماہ ہیں۔۔۔ اور کام بہت ہے۔۔۔‘

’مایوسی کی باتیں نہ کریں۔۔۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔۔۔‘

’ہاں ڈاکٹر کہتے ہیں۔۔۔ میں احتیاطی طور پر وصیت مکمل کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔ آپ پلیز وہ کام کریں جو میں کہہ

رہی ہوں۔۔۔ صبا کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔۔۔۔

ادھر حمدان نے اُس کی آخری وصیت مکمل کی اور صبا کے دستخط کے لیے گھر آیا۔۔۔ صبا نے دستخط کرنے میں ذرا

بھی تاخیر نہ کی۔۔۔۔۔

’بہت نروس محسوس کر رہی ہوں حمدان۔۔۔۔۔‘ بہت عرصہ بعد شاید پہلی بار صبا نے اُسے اُس کے نام سے مخی طبع

کیا۔۔۔ ’دل ڈوب جا رہا ہے۔۔۔ ذرا میری نرس کو بلا دیں میں اپنا آخری وقت چیننگ روم میں گزارنا چاہتی ہوں۔۔۔‘

حمدان اُس کی نرس کو بلا لایا۔۔۔۔

رات بھر صبا اپنی چیننگز سے باتیں کرتی رہی۔۔۔ اور صبح اُسے بے انتہا خراب حالت میں شہر کے معروف

اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔۔۔ تین ہفتے تک وہ زندگی اور موت کے درمیان جنگ لڑتے لڑتے ہار گئی۔۔۔

ایک کہانی جو کمسنی میں شروع ہوئی تھی۔۔۔ خدا، زندگی اور محبت کی مشٹ میں جو تہ شتی تھی اُس نے اُسے پالیا

تھا۔۔۔ اُس کی ساری جائداد وراثت اُسے ایک ٹرسٹ میں چلے گئے اور وہ ٹرسٹ صرف کمسن اور مجبور لڑکیوں کی مدد کرتا

تھا۔۔۔ وصیت کے مطابق اُس کے والدین کو اُس کی موت کی اطلاع دی گئی جب وہ اُس کے گھر آئے تو وصیت کے

مطابق انہیں واپس لوٹا دیا گیا یہ کہہ کر کہ

’فروخت شدہ چیز پر کوئی حق باقی نہیں رہتا‘۔۔۔

جب گھر کا سامان یلام ہو رہا تھا۔۔۔ حمدان اس کے پیٹنگ روم میں گیا۔۔۔ جس کی ہر پیٹنگ صبا نے
حمدان کو وصیت کر دی تھی۔۔۔ وہ ایک ایک کر کے پیٹنگ دیکھتا رہا۔۔۔ حیرت انگیز طور پر ہر پیٹنگ ادھوری تھی۔۔۔
گھماں کی وسعتیں۔۔۔ احساس کی مدہم ہو۔۔۔ اور یک خط۔۔۔ جس میں لکھا تھا۔۔۔
’حمدان۔۔۔‘

کسی کو پالینا

کسی کے ہو جانا

صرف وجود کی تکمیل ہی نہیں

ایک ہیجلی خواب کا ذوال بھی ہے

انتقام ایک عظیم انسان۔۔۔ جس نے مجھے جینا سکھایا۔۔۔ میری تربیت کی۔۔۔ میں اس کی منکوحہ ضرور
تھی۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ کنواری بیوہ ہوں۔۔۔ ایک ادھوری عورت مگر مکمل انسان۔۔۔ میری ہر پیٹنگ اُن ہی کے نام
انتساب ہے۔‘

حمدان باہر لان میں نکل آیا۔۔۔ سینہ بوجھل تھا۔۔۔ جیسے کہیں دُور سے دیکھو تو۔۔۔ آب و گل کا ایک چھوٹا سا
نکڑا۔۔۔ فلک کی بیکراں وسعتوں میں کسقہ رخسار نما لگتا ہے۔۔۔ جیسے سفید دودھیا چادر پر رنگوں کی قوس و قزح کھلی
ہو۔۔۔ سمندر کا پل اور گہرا نیلا ہو گیا ہو۔۔۔ اور صبا کی مدھ بھری نیلم سی آنکھوں میں ٹھہرے، زل کے خواب کی تعبیر گلابی صحرا
میں اُتر آئی ہو۔۔۔ جیسے بس زنداں گھپ اندھیرے سے کوئی صاحبِ دیدار۔۔۔ سیاہ کپڑوں ملبوس شام کی ڈھلتے سناٹوں
میں ایک دیا لیے نکل آئی ہو۔۔۔ یہ کہتے ہوئے۔۔۔

’میرے خدا۔۔۔ شب و حشت کے اس لیے سفر میں اس عورت کو اتنا تو معتبر کر دے جو روشن آنکھوں سے بحر
کے رنگ چٹن سکے اور زندگی کے خواب بُن سکے۔‘

☆ ☆ ☆

یہ کہانی تو نہیں

سائرہ غلام نبی

تخیل کو تراش کر کہانیاں بنانا پہلے تو میرا مشغلہ تھا۔ پھر یہی روزگار ٹھہرا کہ نثر ٹینٹ انڈسٹری میں کہانی کی بڑی اہمیت ہے۔

ایسی کہان جو کسی نے سوچی نہ ہو۔

کسی نے برتی نہ ہو۔

یا نکل ان چھوٹی۔

عین میں وہی توقعات جو عاشق اپنی محبوبہ سے رکھتا ہے۔ اسی Work Station پر میرا کمرہ ہمہ وقت ”قصہ خوانی بازار“ بنا رہتا ہے۔

گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے۔۔۔

بھانت بھانت کی کہانیاں سنانے والے۔۔۔

دور، دور سے چلے آتے ہیں۔

پہلی کہان میں دو عورتوں کے درمیان ایک مرد آ جاتا ہے۔ اس سے اگلی میں دو مردوں کے درمیان ایک عورت آ جاتی ہے۔

دو عورتوں کے درمیان ایک عورت۔۔۔

اور دو مردوں کے درمیان ایک مرد۔۔۔

ایسی روایات عام زندگی میں تو ہتی ہیں۔ مگر کہانیوں میں خال خال لطافت، چاشنی، تضادات سے ابھرتی ہے اور تضادات و تضادم نہ ہو تو کہانی نہیں بنتی۔۔۔ سپاٹ۔۔۔ بے رنگ واقعہ رہ جاتی ہے۔۔۔ شوبی کی طرح۔

دھیان اس کی طرف کیا گیا کہ وہ لمحہ بعد سامنے موجود تھی۔

”اے رنگ تم کو پتہ ہے آج کل میری زندگی میں کیا ہے؟“

وہ آتے ہی شور مچانے لگی۔

”اتنا پتا ہے کہ تمہاری زندگی میں رومانس دور دور تک نہیں ہے۔۔۔

شوبی نے میری توقع کے مطابق منہ بنایا، شدید بے زار کن شخصیت ہے یہ شوبی۔۔۔ مجھے اس کی بے رنگی سے وحشت ہوتی ہے، چڑھتی ہے کہ اسان، اشیاء، رویے اپنے اصل رنگ میں نہ ہوں تو بڑے اوپر اے اور نحوست زدہ نکلتے ہیں۔

دھوپ نہ چھوٹے۔۔۔ جیسے بدلی چھائی ہوئی ہو۔۔۔ جیسے تصویر پر دھول پڑی ہو۔

اس کو دیکھ کر، کسی کی بھی تخلیقی صلاحیت بانجھ ہو سکتی ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔

سوا سے دیکھ کر میں شدت سے اکٹا جاتی ہوں۔ میری بے زاری سے بے نیاز وہ ہے کہ سماج کو ہڈ دینے والی

کہانی کا مطالبہ لیے ہر وقت سر پہ سوار رہتی ہے۔ اب میں اسے کیسے بتاؤں کہ کون دیکھنا چاہتا ہے، ٹی وی، فلم کے تفریحی سوڈ میں رونے والی، نحوست زدہ گندی سدی حقیقت پسندی۔۔۔

اس نے میری بور شکل دیکھ کر بات بدلی۔۔۔

”اوکے، اوکے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“

فٹ وہ کام کی بات پر آ گئی۔

”تم نے مجھے جو اسکرپٹ دیا ہے نا اس میں ہیرو کیا سکرپٹ پینے والا انسان ہے یا مگار۔۔“

”وہ گھاس کھانے والا انسان ہے“

میں نے چڑ کر جملہ پورا کیا۔۔۔

جواہر سے مجھ سے زیادہ غصہ آ گیا۔ میری میز۔۔ جس پر کاغذوں کا جمعہ بازار لگا رہتا ہے۔ یہ اسکرپٹ پھینک

کر بولی۔

”یار ایک تو تم بھی نا، عجیب عجیب انسان مجھے پکڑا دیتی ہو۔ اللہ معافی۔۔ شعر بولنے والا، مشکل مشکل

باتیں کرنے والا، فضول الفاظ منہ سے نکالنے والا، توہ۔۔۔“

اس کا پنا ذاتی ڈکشن ہے۔ لفظیات، روز مرہ، محاورے کے چکر سے آزاد۔۔

مجھے اس پر غصہ آ جائے تو میں اس کی صنف اسے یاد دلاتی ہوں۔ سوچیں کیا۔

”اے بڑکی۔۔! تم کیسی انسان ہو۔۔ بائے داوے۔۔“

سننے ہی دانت کچکچ کر بولی۔۔۔

”سرہ جی!۔۔ آئندہ مجھے یہ گالی نہ دینا۔۔!“

میں نے بھی اپنے شاعروں، ادیبوں کی بے عزتی کرنے کا بدلہ لے لیا تو ہی سکون ملا۔ اس کا دل جدنے ولی

مسکراہٹ سچا کر میں اپنی کہانیوں کی سستی رومانی دنیا میں گم ہونے لگی کہ میں نے اسکرپٹ میرے ہاتھ سے چھینا۔

”کیا میں شکل سے بچ سکتی ہوں؟“

چشم تار کر اطمینان سے کہا۔

”نگلتی کیا ہنڈ رڈ پر سٹھ ہو۔“ میں نے نظریں جما کر زور دے کر کہا۔

چونکہ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھ دار ہے، سمجھ گئی مگر میرے الفاظ آگ لگا چکے تھے اور جیسے اس کا سارا وجود جھلنے

لگا۔ اتنا کہ اس کے منہ سے شعلے نکلنے لگے اور مجھے لگا کہ میرے کمرے میں شاعری، ناول افسانے کی کتابوں کے جنگل

میں آگ لگ جائے گی اور کئی دن تک نہیں بجھے گی۔

”آج سے سات سو پچیس سال شہسوارا تار بھینکی تھی۔۔“

”اف بس کر دو“ میں ویسے ہی کھلی زبان من کر لرزی جاتی ہوں۔ خواجواہ اسے طیش دلایا مگر اب وہ رکنے والی

نہیں تھی۔ جملہ کھل گیا۔

”اور فیصلہ کیا تھا کہ زندگی جہیز میں بسر کروں گی۔“

اس نے چٹکی سے جہیز کا مونا کپڑ پکڑ کر دکھاتے ہوئے کہا۔

”توبہ! سوچ سمجھ کر بولا کرو، کوئی مرد بھی سن سکتا ہے“

”کیوں میں کوئی لڑکی ہوں۔۔۔ عورت ہوں۔۔۔ کم زور ہوں۔۔۔ میں کیوں زبان زد کوں؟“

”پیدا تو تم لڑکی ہوئی تھیں۔۔۔ نام بھی زنا نہ رکھا گیا تھا۔ پھر کیا ہو؟“ مجھے چھیڑ سو جھی۔ گویا اسے اوقات یاد رہی۔

اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ میری گردن دبا دے۔ میں اس کے کمزور پہو پر مسلسل چنگی لے رہی تھی۔

وہ چاہنے کے باوجود میرا کچھ نہ بگاڑ سکی کہ اپنے کیریز کو جیک بگاڑنے کے لیے اس کو مجھ سے کہانی درکار

تھی۔ جس کو ڈائریکٹ کر کے وہ شو بزماریٹ میں ان ہو سکے۔ ان سب معاملات کے پیش نظر وہ کچھ دھیمی ہوئی۔

”دیکھو دادا! وہ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی نا۔۔۔ اس کو ایک دن میں نے اپنے ہاتھوں قتل کر دیا۔۔۔“

اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا جو کسی طرح کسی قاتل کے ہاتھ نہ دیکھتے تھے۔

”نہیں! اتنے پیارے ہاتھ کسی کا خون نہیں کر سکتے۔۔۔“

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔۔۔ جو اس نے جھٹکے سے کھینچ لیا۔

”یہی بات بری لگتی ہے“

”کیا؟“ میرا حیراں ہونا بجا تھا۔۔۔

”اپنے رنگ روغن کا قصیدہ سننا“

”یار! عورت کی فطرت ہے“

”یقیناً تمہارے شاعروں نے بتایا ہوگا۔ سوری! میں نہیں، نئی ان مردوں کو جو عورت کے سامنے شاعر ہو جاتے ہیں۔“

”اے احمق! کبھی ان کے آگے بے وقوف بن کر دیکھ۔۔۔“

میں نے شرارت سے سے گھیرا، وہ ایک لمحے کو بے وقوفی کی زد میں آ گئی اور اس کا اعترافی موڈ بن گیا۔

”یہ جو میں دیکھتی ہوں نا۔۔۔ ہمیشہ ایسی نہیں تھی۔ اچھی خاصی نیک پروین تھی۔ لپٹی لپٹائی۔۔۔ چھپی چھپائی۔۔۔“

”یہ کون سی صدی کا قصہ ہے؟“

میں حیران ہو کر انکشان کی زد میں آ کر بولی۔

وہ جھینپ کر رہ گئی۔

”جب میں نئی نئی کام کرنے نکلی تھی۔ غلطی سے صحافت کا پیشہ اختیار کیا کہ پڑھے لکھوں کی فینڈ ہے۔ قلم سے جہاد

کروں گی۔ جرائم کو بے نقاب کروں گی۔ اصلاح معاشرہ کروں گی۔ کام سیکھوں گی۔ یوں سمجھ جانی! خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔“

پھر وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

”ہوش میں آئی تو پتہ چلا کہ سکھانے والا استاد مجھے محبت سکھانے پر تلا ہوا ہے۔ رومانس میں ماہر کرنے پر اتر

آیا ہے۔“

میں ہنسنے لگی کہ اس کی پھینکی زندگی میں زنا نہ ملائمت کے آثار دریافت ہو رہے تھے۔ میں خوش ہونے میں حق

بجائے تھی۔

”مرد عاشق ہوتا ہے، عورت حسین ہوتی ہے۔ دونوں کے سمبندھ سے کائنات چل رہی ہے۔ سیکھ لینا تھا، گے

کام آتا، بہت ترقی مٹی۔۔۔“

”کیوں مجھ میں صلاحیت کی کمی تھی۔ میں چل سکتی تھی، پھر سکتی تھی، کام سیکھ سکتی تھی۔ جس پیدل آقا، اس پر مر بھی سکتی تھی۔ پر یوں نہیں۔۔۔ نیوز روم کے ڈیسک پر کیا بیٹھی۔۔۔ چیف ایڈیٹر سے ے کر بیون تک کی محبوبہ بن چکی تھی۔
دو دن گزرے، دو ہفتے گزرے، دو مہینے گزر گئے۔ کوری کی کوری۔۔۔ ویسے سب اوکے ٹیک تھ۔ مگر جانی! مجھے کام کی پیاس تھی۔۔۔ اور پھر۔۔۔“

وہ رک گئی۔۔۔ ٹھہر گئی۔ پھر اپنے مطابق پر آ گئی۔ جس سے میں بد مزہ ہوتی ہوں۔
”یار جانی! مجھے آگے جانا ہے۔ بہت آگے۔ ساج کو بے نقاب کر دینے والی، بلاسٹ کرنے والی کہانی۔۔۔ ایک عدد کہانی۔۔۔ یار، جو قلم سے نہ کر سکی۔ وہ کمرے سے کروں گی۔ گندگی کو گنداد کھاؤں گی۔“
”شوٹی! وہ محبوبہ۔۔۔ اس کا کیا ہوا؟“

کہانی اور کمزوری سننے کی انسانی فطرت مجھ میں جاگ گئی۔۔۔ میں نے چھپ چھپ بات کا سرا اٹھایا۔۔۔ کاغذوں کے جھہ باز میں چٹخا چاہئے تھا۔

”کھاتی اپنی مرضی کا ہوں۔۔۔ پہنتی اپنی مرضی کا ہوں۔۔۔ جاتی اپنی مرضی کا ہوں۔“ پھر قلمی ہچے میں بولتے ہوئے۔
ایک بار پھر رک۔

”تو پھر سوؤں گی بھی اپنی مرضی کا۔۔۔“
”اوہ۔۔۔!“

”پھر میں نے شلوار۔۔۔“

”اے رک رک۔۔۔“ میں بوکھلائی۔

”مطلب میں نے دوپٹہ پھینکا۔۔۔ چوڑیاں ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ سینڈ میں ماسی کو دے دیں۔ لپ اسٹک، نیل پاش کو آگ لگا دی اور ایسی بن گئی۔“

اس نے اپنے مردانہ حلیے والے وجود پر حقارت بھری نظر ڈال۔۔۔
”کسی نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے گلے سے لگایا۔ کسی نے چائے کی فردی۔ ڈھابے پر بیٹھ گئی۔ کسی نے سستا جملہ پھینکا۔ میں نے کرا راجوک سنایا۔ سب ٹھنڈے پڑ گئے۔“
نہ چھین چھپائی۔ نہ لگائی بھنائی۔ نہ چٹا رہ۔ نہ مزہ، میں بد مزہ ہو گئی۔
وہ چپک کر بولی۔

”دیکھو جانی! یہ کانایہ پھوسی بیکار ہے۔ سارے پتے کھوں کر رکھ دو تو کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔۔۔“

”جب میدان میں ترے ہیں تو کھیلے بغیر، یاد رہے، جیتے بغیر گھر جانے کا فائدہ۔“ میرا اپنا فلسفہ ہے۔

”جانی! فائدہ یہ ہوا کہ ”عزت“ بچ گئی۔ وہ آنکھ دبا کر بولی۔

مجھے اس فنی ڈائیناگ پر ہنسی آ گئی۔

وہ بھی ہنستے ہنستے دیرینہ مقابلہ دوہراتے نکل گئی۔

”اگلی باری تم مجھے دے ہی دو۔ ایک کہانی۔ ساج کا بھرم کھونسنے والی۔ ٹھیک۔۔۔“

اور میں رومانی مکالمے لکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ حقیقت اور فرض میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ خالق کھر درے ہوتے

ہیں۔ خیال کتنے رومان ہوتا ہے۔ انٹرنیٹ انڈسٹری کے لیے کہانی وہی اچھی ہے جو تخیل سے پھوٹی ہے۔ جہاں سب اچھا اچھا ہے، یا ہو جاتا ہے۔ مگر ایسی کہانی شوبی کو نہیں چاہئے۔۔۔
کافی دن گزر گئے۔

بخیر، انتظار کرائے ایک بار پھر وہ میرے سامنے آگئی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ شور شرابا آج اس کے مزاج میں نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ وہ کئی سمٹائی سی ہے۔ جسم کو چرے ہوئے، مجھے عجیب سا محسوس ہوا مگر میں نظر انداز کر کے اپنے کام میں گم رہی۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ کہنے لگی۔

”سارہ جی! جینز پہنویا شلوار۔۔۔ سالی فلمی عزت کہیں محفوظ نہیں۔۔۔“

میں دو ہرائی ہوئی کہانی سننے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی کہ زندگی کی سب سے خوبصورت کہانی میں سے ”عاشق“ کا کردار منہا کر کے ہر قصے کو سپاٹ کر دیا جائے۔ وہ میرا موڈ دیکھ کر اپنے مطالبے پر آئی۔
وہ اسی سوال کو دوہرا رہی تھی۔

”سماج کو ہلا دیتے والی۔۔۔“

”نہیں ملی“ اس کا سوال پورا نہ ہوا تھا کہ میں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

اس نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ پست لہجے میں بولی۔

”سارہ جی! تم کو پتہ ہے اب میری زندگی میں کیا ہے؟“

”مار کٹائی، کالم گلوچ۔۔۔ اور کیا ہے یار فلرٹ کرنا مردوں کی فطرت ہے، اس سے سمجھو نہ کر۔“

”مطلب۔۔۔ وہ تنکھی ہو کر سیدھی ہوئی۔ اس کی تقریر کے پیش نظر میں نے پہلے بونا شروع کر دیا۔

”چاؤ۔۔۔ منہ توڑ دو۔۔۔ فلرٹ کرنے والوں کا۔“

میں نے اس کی تھکی طبیعت کو جوش دلایا۔

”نہیں!“

”تم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں کیا؟۔۔۔ جبراً کیوں نہ پیرا؟“

وہ بے دم ہو کر گری۔۔۔

”سارہ جی! کیسے منہ توڑ دوں؟ چوڑیاں اگر چہ میں نے نہیں پہن رکھیں۔۔۔ اس نے ڈنڈا سی کلکیوں کو

دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا لہجہ مزید پست ہوا۔ وہ رکی۔ پھر بے چارگی سے بولی۔

”اس بار بھی مرد ہوتا تو میں اس کا منہ ضرور توڑتی۔ پھر تمہارے پاس آتی۔۔۔“

چند لمحے خلا میں گھورتی رہی۔ پھر جھرجھری لے کر بولی۔

”مگر چوڑیاں اس نے پہن رکھی تھیں۔۔۔ اور میں کچھ بھی نہ کر سکی۔۔۔“

سماج کو ہلا دینے والی لائن خود اسی نے مجھے دے دی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ اس پر کہانی لکھ کر اسے دوں یا

اب تک محفوظ رہ جانے والی عزت پر مبارک باد دے کر اسے رخصت کروں۔۔۔!

☆ ☆ ☆

مولوی صاحب کی ڈاک

سیمیں کرن

مولوی صاحب نے اک بڑا سا بوری نہا تھیلا جو کہ ڈاک سے آئے خطوط سے بھرا تھا، چھاتے ہوئے بدوی سے میگزین ایڈیٹر کی ہدایت کوٹا اور اپنے آفس میں آکر کرسی پر بیٹھ گئے اور تھیلا میز پر دھردیا۔ ان کا غصہ ان کے چہرے سے مترشح تھا، وہ بڑبڑائے۔ ”لاحول ولا کیا ہو گیا ہے لوگوں کو؟ ایک طرف لادینی، فاشی، عربیانی اور اخلاقی قدروں کا اس قدر زواں اور دوسری طرف اسٹے غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے مسئلوں کیلئے سواں پوچھا گویا ہر کام ہر سانس اس دم سینے وقف ہے، گویا قوم موتی ہو گئی ہے یہ قوم بھی۔ ان کا آفس بوائے ان کی بڑبڑاہٹ پر ہنسا۔ ”ارے مولوی صاحب آپ کیوں خفا ہوتے ہیں؟ آخر اسی کام کے تو آپ کو دام و شہرت دونوں مل رہے ہیں۔ آپ تو دعا کیجئے کہ لوگ آپ کو مزید مسائل میں گھر کر خوب سوں بھیجیں۔“ بات تو سچ تھی۔ مولوی صاحب نے خاموشی سے اسے گھورا اور روزمرہ کی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا باتیں نہ بناؤ وہ تمام خط بمعہ نام و پتہ اکٹھے کرو جن میں تقریباً ایک سے مسئلہ سوال ہیں جن کا مشترکہ جواب دیا جاسکے وہ سر ہلا کر اپنے کام میں جست گیا۔ مولوی صاحب خود بھی خطوط دیکھنے لگے، وہی عام سے روزمرہ کے مسئلے مسائل چھوٹے چھوٹے کاموں اور باتوں پر فتوے طلب کر کے دین کو تنگ کرنے کی آرزو، مولوی صاحب نے کچھ خطوط اور ان کے جواب سینے معاً جو خط ہاتھ لگائیں کافی دلچسپ لگانہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

ازلاہور

محترم مولوی صاحب

السلام علیکم

کے بعد عرض ہے کہ میں آپ سے مشورہ طلب کرنا چاہتا ہوں میرا مسئلہ کچھ ذاتی سا ہے میری بیوی بہت پڑھی لکھی خاتون ہے، ایم اے نفیست کر رکھا ہے وہ خوبصورت خوب سیرت عورت ہے سیکھ منہ بھی ہے۔ میرے تمام اہل خانہ کے ساتھ اس کا سلوک بہت چھا اور عمدہ ہے اس کے حسن سلوک کے سبھی معترف ہیں مگر جانے کیوں وہ مجھے اپنے حسن سلوک کا اہل نہیں سمجھتی، میرے ساتھ اس کا رویہ بہت سرد بلکہ بدسلوکی پر مشتمل ہے، وہ میرے ساتھ انتہائی تلخ لہجے میں بات کرتی ہے میرے پیار و محبت کا جواب انتہائی سرد مہری سے دیتی ہے، ازدواجی ذمہ داریوں کو اس مارے باندھے فرض سمجھ کر سر سے اتار بیٹھتی ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے اور میرے لیے کچھ بھی نہیں! یہ نہیں کہ وہ بدتمیزی کرے یا میرے کام کرنے میں کوتاہی کرے مگر اس کی زبان آنکھیں اس کا تمام بدن اس کی ناگواری و بیگانی کی داستان بنا رہا ہوتا ہے۔ اس کی انہی حرکات کی وجہ سے میں نے اس کی تمام تر لیاقت کے باوجود اسے چاہنے کی اجازت نہیں دی گوکہ اس پر اس نے کافی دایلا کیا مگر آخر سے ہار مانی پڑی۔ میں خوفزدہ تھا کہ ایسی عورت جو ب مجھے کچھ

نہیں سمجھتی خود کمانے لگے گی تو میرا کیا حال کرے گی؟ میں نے اس کے رویے پر بہت غور کیا ہے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے مگر اس کے مزاج و رویے میں کسی صورت بہتری نہیں آتی یہ صورت حال میرے لیے از حد تکلیف دہ ہے۔ اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ وہ بچوں کے حق میں بہت اچھی ماں ہے میرے والدین کیلئے اچھی بہو، بہن بھائیوں کیلئے اچھی بھابھی مگر مجھے وہ کیوں محبت و حسن سلوک کا حقدار نہیں سمجھتی؟ اور ایسی بیوی کیلئے کیا حکم ہے؟ اور مجھے مشورہ دیجئے کہ میں اسے کس حد تک چا کر سمجھ سکتا ہوں؟ کیا سختی کروں؟ خود سے الگ کرنے میں بھی خاندان مسائل سے دوچار ہوتا ہے؟ وہ میری بات کو کسی صورت سمجھنے کو تیار نہیں، اس کے رویے سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی اور مجھے سمجھنا ہی نہیں چاہتی مگر پھر اس کا دیگر افراد کے ساتھ رویہ مجھے الجھن میں ڈالتا ہے مجھے مشورہ دیجئے کہ میں اس صورت حال میں کیا کروں اور ایسی عورت کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے اور اللہ اور اس کے رسول کی رہنمائی میں بتائیے کہ ایسی عورت کا کیا مقام ہے؟ و لہذا

مخلص

حشمت اللہ

مولوی صاحب خط بلند آواز میں پڑھ رہے تھے۔ آفس بوائے خط سن کر ہنسنا وادہ مولانا یہ تیرے بندے، ”تو خود جو مرضی ہو پر اپنے واسطے تجھے ایک کھجور میں سب کچھ چاہیے ہاں۔“ مولوی صاحب نے چشمے کے پیچھے سے اسے گھور منہ ہی منہ میں لاجول اور استغفر اللہ پڑھا اور جواب لکھنے لگے۔

”حشمت اللہ صاحب جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ کی زوجہ محترمہ بہت سے اوصاف کی مالک ہیں خوب صورت و خوب سیرت ہیں اہل خانہ اور بچوں کے معاملے میں بہت عمدہ ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ آپ کے ساتھ ان کا رویہ کس بناء پر ناروا ہے ان کی شکایت کو دور کرنے کی کوشش کیجئے۔ محبت اور نرمی سے معاملے کو سلجھائیے کہ عورت میں عڑھ پن پیدا کئی و فطری ہے وروہ ناقص العقل ہے اس بات کو ملحوظ رکھ کر اپنی بیگم صاحبہ کو سمجھائیے وراں کے باقی اوصاف کو مد نظر رکھ کر نرمی کی کوشش کیجئے اور جو وہ پھر بھی نہ سمجھیں تو آپ سختی بھی کر سکتے ہیں آپ کا ہر حکم بجا آنا ان پر لازم و فرض ہے اور ایسی عورت چاہے وہ کتنے اوصاف کی مالک کیوں نہ ہو اگر اس کا شوہر اس سے راضی نہیں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کر لے۔ یہی اللہ اور اس کا رسول کہتا ہے کہ ایسی عورت جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گی اور جنتی عورتوں کیلئے بشارت ہے کہ انہیں ان کے شوہروں کو دی جانے والی حوروں کی سردار بنادیا جائے گا۔ اسی بات سے آپ کی بیوی کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے شوہر کا مرتبہ کتنا بلند رکھا ہے۔ وہ عورت کیلئے اس کے باپ سے بھی زیادہ محترم ہے، آپ کی بیوی کو توبہ کر کے آپ کی تابعداری اختیار کرنی چاہیے۔“

مولوی صاحب نے جواب لکھ لینے کے بعد حسب معمول توبہ استغفر پڑھی اور اس ان دیکھی عورت پر نفرین بھیجی!

بہت دن گزر گئے بہت سے خطوط آئے اور ان کے جواب لکھے گئے۔ مولوی صاحب کو بھول گیا کہ سوس کیا تھا کیا جواب دیا گیا تھا اور اس سوال کے نتیجے میں کتنے سوالوں نے جنم لینا تھا؟

اس دن بھی مولوی صاحب اپنی ڈھیروں ڈھیروں کے ساتھ اکتائے ہوئے بیٹھے تھے۔ یہ ڈاک کا سلسلہ بڑا پرانا تھا اور مولوی صاحب کی سٹاف ورائیٹر بلکہ سبقتیڈیٹرز سے بھی اچھی یادداشت تھی، ان کی سہولت کہ وہ یہاں بیٹھ کر جواب دیں یا گھر لے جائیں، وہ آفس میں بیٹھے عموماً گپ شپ بھی رہتی اور کام بھی سمٹ جاتا اس دن بھی وہ خطوط ان کے جوابات کو سمیٹ رہے تھے اور ان کی بڑبڑاہٹوں سے آفس بوائے لطف ٹھارہا تھا۔ اسی دوران یڈیٹر صاحب بھی وہاں آ بیٹھے! مولوی صاحب خط دیکھ رہے تھے کچھ کی میل بھی جواب طلب تھے، کہ اچانک ایک خط کو پڑھ کر غصے سے ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا انہوں نے لاجول پڑھ کر اسے تروڑ تروڑ کر پھینک دیا۔ ایڈیٹر نے حیرت سے دیکھا اور پوچھتے ہوئے وہ خط اٹھالیا۔

محترم مولوی صاحب

السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ آپ نے میرے شوہر کے خط کا چند روز پیشتر جواب دیا تھا، جواب کیا تھا؟ جہنم کے تمام دروازوں میں سے بس یہ خری بند دروازہ بھی آپ نے مجھ پر کھول دیا۔ آپ نے فرمایا کہ عورت ناقص العقل اور پیدائشی میزاج پن کی حامل ہے! میں آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔

- ۱۔ کیا وہ مرد سے زیادہ باصلاحیت عقل و فہم اور تعظیم سے آراستہ ہونی فہم میں بھی اس سے زیادہ ہو کیا وہ جب بھی ناقص العقل ہے؟
- ۲۔ اگر وہ ہر حال میں ناقص العقل ہے تو تاریخ میں بے شمار خواتین بشمول عائشہ کے پاس لوگ مرد حضرات بھی دینی فہم پانے کے لیے کیوں آتے تھے؟
- ۳۔ ناقص عقل کا مطلب عقل میں مخصوص کمی اگر حقیقت میں ایسا ہے تو موقع ملنے پر عورت ہر میدان میں مرد کے برابر کیوں کھڑی ہے؟
- ۴۔ بالفرض محال یہ مان لیا جائے کہ عورت ناقص العقل ہے تو کیا دنیا میں کوئی ایسی ناقص مشین ہے جس میں عمدہ ان پٹ ڈالا جائے اور عمدہ پروڈکشن حاصل کر لی جائے پھر تو مرد کی اپنی عقلی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔

- ۵۔ عورت کا فرض اپنے شوہر کو راضی رکھنا کیا مرد کا فرض نہیں کہ وہ بیوی کو راضی رکھے؟
- ۶۔ اور اگر بیوی کی رضا کی کوئی اہمیت نہیں تو اللہ نے اسے دس دماغ سے کیوں نوازا؟ نکاح میں اس کی رضا کو کیوں اہمیت دی؟
- ۷۔ کیا ناراض بیوی کا شوہر جہنمی نہیں مولوی صاحب؟
- ۸۔ عورت کا فرض کہ وہ مرد کا دل لہجائے پر چائے بنے سنوے؟ تو کیا وہ اپنے مرد سے یہ خواہش نہیں کر سکتی کہ تم اپنے جیسے میں میری پسند کو شال کرو؟ اور اگر جواب نہیں ہے تو پھر وہ اپنی ہر جائز خواہش کس مرد پر پوری کرے؟
- ۹۔ اور کیا مرد کی دین داری صرف دائرہ نماز، تسبیح اور کوئی مسئلہ ہونے پر مولوی سے فتویٰ لینے پر ہی مختص کیوں ہے؟ یہ سلام آگے بڑھ کر اس کے نفس اور اخلاق میں کیوں دخل نہیں ہوتا؟ وہ عورت

کو انسان سمجھنے کا ظرف کیوں نہیں پیدا کر پاتا؟

۱۰۔ ایک عورت اس مرد کے تمام رشتوں کو احسن طریقے سے نبھ کر اپنے لیے عزت و محبت و کرم کا وہ مقام وہ خاص مقام جس کی وہ اہل ہے مانگے اور مانگنے پر نہ ملے اپنے دس کو تالا لگا کر محبت کی چابی گما بیٹھے تو پھر وہ دل کا تالا کیسے کھولے؟

۱۱۔ اک طلاق زبان کی ہوتی ہے اور جب دل ناراض ہو جائے اس مقام کو چھو آئے جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے تو دل طلاق دے بیٹھتا ہے اس طلاق پر آپ کو نہ فتویٰ لگائیں گے؟

۱۲۔ اک سوال یہ بھی ہے کہ عورت اپنی تمام خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ محض ایک خامی کی بناء پر دوزخی ٹھہرائی جاتی ہے تو کیا دنیا میں کوئی ایک ایسا مرد ہے جو بشری کمزوری سے خالی ہو؟

۱۳۔ مولوی صاحب آخری سوال آپ سے یہ ہے کہ عورت کی عظمت آپ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ مرد کو دی جانے والی حوروں کی بھی سردار ہوگی لیکن جس عورت کا شوہر جہنمی ہوگا تو کیا اللہ اس کو جہنم سے نکال کر پھر اسی کے سر پر مسلط کر دے گا؟

میں جانتی ہوں آپ میرے ان سوالوں کا کبھی جواب نہیں دیں گے بلکہ مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیں گے مگر مجھے آپ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ آج کی تعلیم یافتہ عورت کیسے سوچتی ہے؟

والسلام

زینب فاطمہ

ایڈیٹر خط پڑھ کر دل کھول کر ہنسا اور بولا:

”مولوی صاحب یہ خاتون آپ کو مشکل میں ڈالے گی، دراصل آج کے مرد کی تربیت ہی ذہین عورت کے حساب سے نہیں ہوئی۔“ مولوی صاحب کا چہرہ غصے سے مزید سرخ ہوا ایسے واہیات و رکفریہ خطوط کا جواب دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ”ایڈیٹر نے پل بھر کو سوچا، اپنے میگزین کے روشن خیال پہلو کا خیل اور ایسا متضاد خط میگزین کو پرکھ جائیں گے، حساب کتاب مکمل، ایڈیٹر اک اجنبی چہرہ اوڑھ کر بور۔“ ”نہیں یہ زیادتی ہوگی آپ اس خط کو نہ شامل کریں اور جواب دیں۔“ مولوی صاحب نے ایڈیٹر کو ”سرخ مولویوں“ کی دہشت سے ڈرنا چاہا مگر ناکام رہے۔

”محترم آپ کے خط کو بعینہ ہی آپ کے خدشات کے برعکس شائع کیا جا رہا ہے آپ کے تمام تر سوالات آپ کے مزاج کی شدت اور الحاد کی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ دیں گے مساوی نعوذ باللہ اپنا تعبیری نظام لانا چاہتی ہیں اور یہ ہر لحاظ سے قابل مذمت ہے۔ مرد عورتوں کے حکم ہیں انہیں فرماں برداری کا حکم دیا گیا ہے، آپ پر آپ کے شوہر کی طاعت فرض اور ان کی خوشنودی مقدم ہے۔ رہا مسئلہ فتویٰ کا تو فتویٰ عمومی اور ظاہری معاملات پر لگایا جاتا ہے، یہ باتیں شاعری و خرافات میں تو اچھی لگتی ہیں دین کا ایسی باتوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں دین تو سچائی راستی اور اطاعت کا نام ہے، اپنے عقائد کو درست کر کے تو بہ کیجئے وہ اللہ رب العزت آپ کو معاف فرما دے گا۔“

یہ خطوط میگزین میں اک شدت آمیز بحث چھیڑ گئے۔ عجیب و غریب کالز، دھمکیاں بھی آنے لگیں۔ وہ لوگ جو خود اس درد کو بھگت رہے تھے ان کے ہمدردی بھرے خطوط ای میلز اور کالز کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میگزین کی اشاعت میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہو گیا۔ اسی بھٹ بھڑ میں اسی سلسلے کا تیسرا اور شاید آخری خط موصول ہوا تھا، یہ خط بذریعہ

ایڈیٹر اس آخری عدالت کو لکھا گیا تھا، ایڈیٹر نے خط پڑھا کچھ دیر سوچا اور پھر اسے اشاعت کیلئے گوشہ ادب میں بھجوا دیا۔
خط کیا تھا اور وہ میں ڈوبی بلکہ درد سے تھڑکی اگ پکار تھی۔

میرے پیارے اللہ!

سب ملاقاتیاں اور رشتہ تیری ہی جانب سے ہیں تو کیوں مجھے لگتا ہے کہ اپنی رحمتوں سے تو نے میرے سر پر سے ماتھ کھینچ لیا ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے بنی اسرائیل کے اک شخص نے خواہش کی تھی کہ تُو اتر کر آ کہ وہ تیری زلف سنوارے تیری خدمت کرے! اور آج اک بنی اسرائیل کی بیٹی ہے بس ہو کر تجھے پکارتی ہے کہ اس کا تیرے سوا کوئی نہیں! آج تو اتر کر آ کسی روپ میں کسی حسی شکل میں اور دل مضطر پر مرہم رکھ! اب شبہ تو اس پر قادر ہے کہ ظاہر ہوئے بغیر بھی مرمت کرے مگر آج درد اس قدر ہوا ہے کہ تو مجسم ہو۔ یہ انوکھی خواہش دس کی دیواروں سے ٹکراتی ہے اور میں اپنے سب آنسو دیا کر یہ تجھ کو تجھ پر بہا دوں! تیری ذات کا اسم عظیم تھم کر اپنے زخموں پر مرہم رکھ لوں

اے اللہ تیرے بندوں سے سواں کروں تو کفر کا فتویٰ لگتا ہے تو پھر تُو بتا میں اپنے سوالوں کو کہاں لے کر جاؤں اگر ان سوالوں کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر ان کو سوچنے کیلئے یہ صلاحیت کیوں دی تھی؟ اے اللہ بے عیب تو تُو نے دئی ذات پیدا نہیں کی تھی، اگر میری ہستی عیب دار تھی، کجی کی داخلی تھی تو تیری ذات کا تصرف و مظہر اسی عیب دار بدن کے ساتھ میں نے تیرے اذن سے ”بدن“ کو جنم دیا اور ممتا کی آفاقی حیثیت میں ”کرمد کو اس کی تمام تر خوبیوں خامیوں کے ساتھ قبول ہی نہیں کیا اپنے سر کا تاج بنایا تو پھر صرف میں کیوں اپنی کسی خامی کی وجہ سے تیرے اس معاشرے میں مغلوب ہوں؟ کیا مرد کو تو نے بے عیب پیدا کیا تھا؟ کیا تُو نے مجھے شوروں کی طرح اپنے پاؤں سے جنم دیا تھا اور مرد کو اپنے سر سے؟ میرے رب میرے سوالوں کے جواب دے ورنہ مجھ سے یہ سوچنے کی سمجھنے کی صدمیت چھین لے!

میرے اللہ میرے حصے میں جو مر تُو نے لکھ میں نے اسے ہا مقدور جان کر من و عن قبول کر لیا تن من سب کچھ دارا، اس کا دیا ہر رشتہ جیتا میں نے، میری زندگی کو، اس نے کیا۔ وہ مرد عقل شعور فہم و ادراک و علم میں مجھ سے کمتر ہونے کے باوجود میرا لک و آقا بنا رہا۔ میں نے اس کو بھی مقدر سمجھ کر سہہ لیا کہ اور اک کے جنم نہ درد ازلوں نے بہت سی ننگی حقیقتیں بھی مجھ پر منکشف کر دیں ہیں، میں جانتی ہوں کہ عورت جنس و ہوں کے اس بازار میں سب سے ارزاں شے ہے اور زندگی کے اس بدبودار حرم میں خاص و عام یکساں، درزا و برہنہ ہیں تو پھر کیا ہوا کہ میرے حصے میں اک بہت عام سا مرد آیا! مجھ جیسی عورت جس تعلق کو کسی بھی حسی رشتے کی انتہا پر جا کر گوارا کرنا پسند کرتی ہو وہ خاموشی سے اس کی خواہش پر کئی سالوں سے اس کا ستر بنی رہی۔ کیا میں مورنی سے بھی گئی گزری تھی کہ اس کا مور اس کو بھانے کیلئے پہلے رقص کرتا ہے؟ ایک ایسی عورت جو شائستہ ہو، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، خدمت گزار ہو، چھٹی ماں و پورے گھر کی نوکرائی ہو تو نے میرے سچے رب کیوں مرد کو اس کا لک بنا دیا؟ صرف اس بنا پر کہ وہ اس کی کفالت کرتا ہو؟ اور اگر وہ کفالت کا اہل نہ ہو تو؟ میرے رب تُو نے کس مصلحت کے تحت ان باتوں کو واضح نہیں کیا یا تو نے کر دیا تیرے بندوں نے چھپا لیا تو پھر میں کس درد ازلے پر جا کر اپنے سوالوں کے زہر میں بجھے تیروں کو پانی پلاؤں؟

میرے اللہ میرے حصے کی محنت چہ اگر تو نے مرد کو ”جر کی طرح کیوں مجھ پر مسلط کر دیا؟ میری محنت کیوں ضائع کر دی؟ اس کی کوئی قیمت ہی نہیں اس زندگی کے بازار میں؟ نوکرائی رکھے تو بھی پیسہ دے کر، بچوں کی آیا بھی دھن مانگے، رنڈی کے پاس جائے تو بھی پیسہ دے! اور یہ سارے کردار ایک جگہ جی راضانی محبت و وفادے کر بھی میری ہستی اتنی سب

ماہ کیوں کر دی تو نے مرد کے ہاتھوں؟ میرے اللہ یہ سوال میری ذات کے نہیں، تو آج سمجھ کہ حوا کی بیٹی سنبل بنی کھڑی ہے، لکھوں کروڑوں میل و نہار کی گردش میں اس کائناتی سمے میں حسی شکل میں اتر آجہاں صرف تو ہو اور میں ہوں! جب سب کچھ تجھ سے ہی مانگنا چاہیے تو میں نے جانا کہ سوالوں کے جواب بھی کیوں نہ تجھ سے ہی مانگوں؟ اس کائناتی لمحے میں نہیں دیکھتی ہوں کہ میرے گلے میں لاکھوں کروڑوں ساووں وزنی زنجیریں ہیں۔ میرے پاؤں ان زنجیروں سے بھی وزنی بیڑیوں میں جکڑے ہیں میرا سینہ ان پابندیوں میں ایسے جکڑا ہے کہ میں سانس بھی نہیں لے پاتی۔ میرے رب مجھے اپنی پناہوں میں لے، مجھے بتا کہ میرے وجود کو عورت کے بدن میں تو نے قید کیا یا پھر تیرے نام پر بننے والے رسوں و رواجوں نے!

اے مالک اگر یہ تیرا قانون ہے کہ میں تیری کم عقل حقیر مخلوق ہوں تو تو نے یہ سلوک میرے ساتھ کیوں کیا؟ یہ کیسا بھونڈا مذاق ہے؟ جیسے ماں بچہ جنم دے کر خود اسے اپنے جیروں سے کچل دے؟ شاید کوئی ماں ایسی شقی القلب ہوئی ہو گی مگر ماں تو محبت جیسی ہوتی ہے، ہر بچے کیسے رو دیتی ہے ہر بچے سے محبت کرتی ہے اور تو تو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے، میں بھی تو تیری تخلیق ہوں پھر کیوں اس نفرت کا تحقیر کا شکار ہوں وہ نفرت وہ حقارت جو مردوں کے اس معاشرے میں رویوں میں زباں میں کیفیت میں اعتبار میں اظہار کے ہر رخ میں چھلک چھلک جاتی ہے؟ کیوں میرے رب تو نے مجھے آدم کی ٹیڑھی پہلی سے پیدا کر کے احساس کی ہر شدت و درست عطا کر دی؟ حار نکہ ادراک کے درواہ ہوئے تو میں نے جانا کہ یہ ٹیڑھ پس تو اس بنی آدم کی تھا کیلئے ضروری تھا کہ آخر بنی آدم کو میرے وجود میں ک مختصر مدت کیلئے قیام کرنا تھا پھر مجھے اسے اپنے خون سے پہنچنا تھا، تو اے میرے رب جس جنم کی آبیاری میں میرا لہو شامل تھا اس جنم کے سارے خار میرے جسم میں کیوں آئے؟ مجھے انساں بنایا دیا دماغ دیا باطنی آنکھ کا عذاب بھی کھول دیا تو میری رضا کو کیوں مجھ جیسے کیوں بچیوں والے مرد کے تابع کر دیا۔

تیری تو جنت بھی رب کریم مجھے تیرے کرم کا نہیں ستم کا ظہار لگتی ہے۔ اب رب رحیم ایہ تیری جنت ہے یا پھر خود ستائشی کے زعم میں، رے مرد کی اپنی تخلیق کردہ ہے، میرے رب وہ حشر کی گھڑی جب اعداں تو لے جائیں گے جب جزا و سزا کا وقت آئے گا تو میں جو تمام عمر میدان حشر میں ہی کھڑی رہی کی دوبارہ توی جاؤں گی؟ توی جاؤں گی تو کیا مجھے وہاں بھی میرے حسب آرزو نہ ملے گا، وہاں بھی مجھے وہ دیا جائے گا جو مرد کی آرزو ہوگی؟

وہ سوال جو تیرے بندوں سے کر کے میں کفر کی مرتکب ٹھہری مگر اے عادل عدل تیری صفت ہے، اک جنتی عورت کا مرد اگر جہنمی ہو تو تیرا عدل اس کا کیا فیصلہ کرے گا؟ اگر ایک عورت دو یا تین مردوں کے نکاح میں رہ چکی ہو تو پھر تو روز حشر اس کا مالک کس کو ٹھہرائے گا؟ میرے مالک جب تو مجھ سے راضی ہو گیا تو کیا مجھے بھی حسب آرزو رضائل سکے گا؟ تو پھر اے رحیم تو رحیم کر ان سواووں کے بیچوں کو مرد کے دل کی مٹی میں بودے!

تیری اک عاجز و گنہگار سیدہ ہندی
ایڈیٹر نے خط ختم کیا تو اس کی آنکھیں جانے کیوں کچھ بھیگی بھیگی تھیں۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کھڑی کو کھوں دیا۔ آسمان پر بادل تھے، سے لگا یہ سوال اپنی طاقت پرواز سے اڑ کر بادلوں میں جا ملے ہیں۔ ابر رحمت پر سے گاتا تو منتخب دلوں کی مٹی میں یہ جذب ہو جائیں گے، ان بیجوں سے کوئی پھول نکلیں گی۔

☆ ☆ ☆

داستان در داستان ہے زندگی

(ناول کا ایک باب)

گرد کے بگولے

نحیہ عارف

پنجاب کے جنوبی قصبوں اور شہروں میں جون کا مہینہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ گرد کے بگولے جگہ جگہ اڑتے پھرتے ہیں۔ ان بگولوں کی ریت کا ذائقہ زبانوں پر بھی ہوتا ہے، آنکھوں میں بھی اور آواروں میں بھی۔ ریت جب اڑتی ہے تو عجب ویرانی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ زندگی کی ساری رونق، ہما بھی، شادابی چوس لے گی۔ چیزیں ایک دوسرے سے دور جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ لوگ، اشیاء اور چاہے جانے والے منظر منظر ہوتے ہوئے ہٹھکرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بسے بسے شہر خرابے سے لگنے لگتے ہیں۔ ریت کا اثر ناول پر یو جھ ڈال دیتا ہے۔ بے ثباتی کا یو جھ، فنا کا یقین، ہجر کا درد، اڑتی ہوئی ریت کے دروں کے یا مقابلہ چاری، ورنہ نفعایت کا جبر، ہستی کے بے پایاں خدا میں قناعت کی بازگشت، ریتلے علاقوں میں لوگ دکھی رہتے ہیں۔ دکھی رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنے دکھوں کے نام تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے، ان کے سبب عوامل سمجھتے اور ان کا منطقی تجزیہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ وہ تو بس دکھ کی بازو میں بھیگ جاتے ہیں۔ دکھ کسی نے کی صدا کی طرح ان کے وجود کے خالی پن سے نکل کر ادھر ادھر کو کت پھرتا ہے۔ اس کوک سے ریتلے علاقوں میں بسی بستیاں گونجتی رہتی ہیں۔

یہ بھی ایسا ہی ایک قصبہ ہے، صحرائے تھل کے کنارے، دریائے جہلم کی گزرگاہ کے قریب قریب۔ نہ پورا دشت ہے نہ کھلا ہوا گلزار۔ اس کی آبادی میں ویرانی سی ہے۔

یوں تو یہ قصبہ وقت کے کسی پچھلے منظرے میں آباد تھا اور اب اس کے لیے حال کا صیغہ استعمال کرنا درست نہ ہوگا لیکن زبان و اس کے صیغے بھی عجیب ہیں۔ وقت کو ہم نے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر رکھا ہے۔ زبان کو بھی اس تقسیم کا پابند کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن زبان یہ حکم نہیں مانتی۔ ہم دکھ قواعد مرتب کریں، زبان اپنی اور اپنے بولنے والے کی حیثیت کے مطابق یہ سارے قاعدے قانون روندتی ہوئی گزر جاتی ہے، ورنہ ایسی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر جاتی ہے، جو زمان و مکاں کی حدود سے باہر کہیں موجود ہیں۔ اپنی اصل میں کتنی ہی ناقص کیوں نہ ہو، زبان موجود کو غیر موجود اور غیر موجود کو موجود کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم زبان کو تخلیق کا آلہ سمجھتے ہیں حالانکہ زبان خود تخلیق کار ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے انسان نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا اور وہ پھر وہ اس کا خدا بن گیا۔ اس خدا نے پھر کیسے کیسے نہ خدائی کی، گزشتہ کو موجود اور موجود کو موم کو ڈار۔ جیسے یہ قصبہ، جو اب وہاں نہیں رہا لیکن اس صیغہ حال کے استعمال نے اسے پھر وہیں قائم کر دیا ہے جہاں یہ آج سے نصف صدی اور اس سے بھی پہلے موجود تھا۔

اس قصبے کے عین درمیان میں ایک بڑی شاہراہ ہے۔ شاہراہ، ان معنوں میں نہیں، جس میں ساج کل کی شاہراہیں، مثلاً شاہراہ دستور وغیرہ معروف ہیں۔ یہ شاہراہ صرف اس لیے ہے کہ اس قصبے کا یہ واحد راستہ ہے جس پر سارا دن ٹریفک رواں رستی ہے۔ اس ٹریفک میں سب سے بھاری ٹریفک دو بڑے بڑے ٹریکریں اور ایک گھوڑے والے

ٹانگے ہیں۔ ان پر سفر کرنے والے لوگ اس قصبے کی ایڈیٹ کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپنے حقے اور لاپے سمیت ٹانگے کی چھبلی نشست پر نیم درار ہو کر سفر کرتے ہیں۔ ٹانگوں کے علاوہ یہاں بار برداری کی گاڑیاں چلتی ہیں جنہیں گدھے، خچر، بیل یا اونٹ کھینچتے ہیں۔ یا پھر سائیکل دوڑتے پھرتے ہیں جن کے سامنے دھات کی انی پیالیوں جیسی گھنٹیاں لگی ہوتی ہیں اور شوخ نوجوان انہیں بدوجہ ہی بجاتے پھرتے ہیں۔

اس شاہراہ سے کئی گھنٹے چلتی ہیں جن میں سے بیشتر کچی ہیں۔ ان کچی گلیوں کے کنارے پر فصد کی ڈھیریاں ہیں جن پر مکھیوں کی کافی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں سے یہ تہہ باریک ہوتی گئی ہے اور زرد اور سواری دھبے نمایاں ہو رہے ہیں۔ ان ڈھیریوں کے ارد گرد کی جگہ پر کچھڑ کی دلدل سی بنی ہے۔ اسی دلدل کے کنارے کنارے وہ گھنڈیاں ہیں جن پر بستی کے لوگ چلتے ہیں سفید پٹریوں والے زمین دار، اونچے شعلے والے بوج، رنگین دھوٹیوں والے گواے، سیاہ فام ارائیں عورتیں، مدقوق جسموں والے ریڑھی بان، ٹانگے اور گڈے کھینچنے والے مرلے گھوڑے، اینٹوں کی ڈھیریاں لہلہے خچر اور گدھے، خارش زدہ آوارہ کتے، بڑے بڑے کالے مکوڑے، اسکول کو جاتے سیٹی بجاتے شوخ لڑکے اور گھبرا گھبرا کر پیچھے دیکھتے کالے برقعے۔ یہ سب لوگ جب ان کچی گلیوں سے گزرتے ہیں تو ان کا دھیان کنارے پر پڑی فضلے کی ڈھیریوں اور ان کے ارد گرد کی دلدل نما کچھڑ کی طرف نہیں جاتا۔ وہ اس بدبو کو بھی محسوس نہیں کرتے جس کے بھبھوکے غبار کی صورت اثر اڑ کر ان کی ذات سے پیوست ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی اس منظر کا ایک حصہ ہے اور اسے تبدیل کرنے کا خیال کبھی ان کے ذہن میں نہیں آیا۔

ان گلیوں کے دونوں طرف مکانات کی کچھ کچی اور کچھ پکی دیواریں ہیں۔ ان میں سے کچھ پر زمین سے لے کے چھت کے کنارے تک گوبر کے اپنے تپے ہیں۔ وہی اپنے، جنہیں دیکھ کر ایک فلسفی نے سوچا تھا کہ بھینس آخر اوپر تک کیسے پہنچ گئی۔ مگر یہ لوگ ایسا نہیں سوچتے۔ یہ اپنے گرد و پیش کو غور سے نہیں دیکھتے۔ (دیکھیں تو جینا مشکل نہ ہو جائے)۔ یہاں سے گزرنے والے لوگ اپنے خیالوں میں مست رہتے ہیں۔ اپنے اندروں میں غرق، ڈونگ نے ایسے لوگوں کو دروں میں کہا ہے۔ غالباً ڈونگ کا کسی ایسی بستی سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ وہ سوچتا کہ انسانوں کو جو چیز دروں میں بنا دیتی ہے وہ ان کے اندر نہیں، باہر نہیں ہوتی ہے۔

اسی کچی سڑک سے دو بچیاں اپنا پنا بستہ اٹھائے روز گزرتی ہیں۔ بستہ کیا ہے۔ اردو، حساب اور معاشرتی علوم کی ایک ایک کتاب، ایک سینٹ، ایک تختی، سیٹی، گاجنی مٹی، دو قلمیں اور یک دو ات۔ یہ چیزیں ایک چوکور کپڑے میں بندھی ہوئی ہیں جس کی گرہ کبھی کبھی عین بازار میں کھل جائے تو بڑا نقصان ہوتا ہے اور نہیں اگلے کئی دن اپنی کسی ہم جماعت کی دوات سے ڈوبے پینے پڑتے ہیں اور اس کے بدلے اس کا رعب سہنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک تو اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتی اور اسے اس میں مشکل بھی کوئی نہیں ہوتی۔ بہت سی لڑکیاں ہیں جو اس کی دوست بننا چاہتی ہیں اور اسے پنا زیر بار کر کے خوشی محسوس کرتی ہیں مگر دوسری کو یہ سہولت میسر نہیں اور اسے احساس اٹھانے سے بڑی تذلیل محسوس ہوتی ہے پھر بھی اسے اکثر اس اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس بے رحم اور نادوست ماحول میں وہ دو لڑکیاں بہت چوکنی ہو کر چلتی ہیں۔ ارد گرد دیکھتی ہوئی آتے جاتے چہروں پر نظر جم کر ان کے دلوں میں جھٹکنے کی کوشش کرتی ہوئی کہ کہیں کوئی انہیں پکڑنا تو نہیں چاہتا۔ کوئی ان کے پیچھے تو نہیں آ رہا، کسی نے انہیں دیکھ کر کوئی نا پسندیدہ اشارہ تو نہیں کیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دل ڈرے بھرے رہتے ہیں لیکن

وہ اس رستے سے گزرنا چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے وہ اپنے تصور میں کئی منظر سمیٹتی ہیں۔ یہ منظر، لگ لگ طرح کے ہوتے ہوئے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ راستہ جوان کے گھر سے اسکول تک جاتا ہے، انہیں خیال ہی خیال میں کسی اور دنیا تک لے جاتا ہے۔

ان لڑکیوں کا تعلق اس قصبے کے نچلے طبقے سے ہے۔ ان پر بڑھ بڑھ کر کئی مربع زمین کے مالک بوچوں، بھجروں اور جنوں کے اس قصبے میں ایک دھوبی اور ایک نان چھو لے کی ریزھی لگانے والے مہاجروں کی وقایہ کی ہے۔ ان کا قصبہ کی سماجی زندگی میں ہونا اور نہ ہونا برابر ہیں۔ ان کی نیلیں بھی اتنی ہی غیر اہم اور معمولی ہیں۔ وہ روز یہاں سے گزرتی ہیں لیکن کوئی ان کا نوٹس نہیں دیتا۔ نہ ان کی شکلیں ایسی دل کش اور اثر انگیز ہیں، نہ ان کے لباس میں کوئی جادو بیٹا ہے، نہ ان کی چاب ڈھاب میں شوٹی اور شرارت ہے، نہ ان کی بچا ہوں میں سترے جگمگاتے ہیں، نہ ان کے ہونٹوں سے ترنم خیز قہقہے برستے ہیں، قہقہے تو کیا، ان کے ہونٹوں پر تو ہلکی سی مسکراہٹ بھی کم ہی آتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بات بھی کم ہی کرتی ہیں۔ چپ چاپ خاموشی سے سامنے دیکھتی ہوئی وہ چلتی چلی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی ٹانگے کی آواز سن کر وہ سڑک چھوڑ کر کنارے پر ہو جاتی ہیں یا کسی سائیکل کی ٹھنکی کی تیز آواز بعض اوقات انہیں چونکا دیتی ہے۔

اس سڑک سے گزرنے والے لوگ اور وہ سب جو سڑک سے نہیں گزرتے لیکن ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس وسیع و عریض کائنات میں کہیں موجود ہیں، یہ کبھی جان پائیں گے کہ وہ یہاں سے چپ چاپ گزرتے ہوئے کیا سوچتی ہیں؟ ان کی چھوٹی چھوٹی، غیر اہم آنکھوں میں جو سائے سے لرزتے ہیں اور ان کے نو عمر ماتھوں کی ہموار سطح پر کبھی کبھی جو ٹیکریں سی نمودار ہوتی ہیں اور ان کے زرد زرد چہروں پر کبھی جو رنگ سے لہرا جاتے ہیں، ان کی تنہیم کون کر سکتا ہے۔ کوئی کرے بھی تو کیوں؟ ایسی باتیں تو مرکزی کرداروں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں اور مرکزی کردار اس جیسے تھوڑی ہوتے ہیں۔ وہ تو خام ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی بات میں خاص۔ حسن میں، دوست میں، ذہانت میں یا کسی اور صفت میں جو ان سب سے زیادہ ہوتی ہے اور جو انہیں دوسروں سے ممتاز اور نمایاں کر دیتی ہے۔ یہ دونوں بچیاں جو س گروڈا لود سڑک سے روز دو مرتبہ گزرتی ہیں، کسی حیثیت سے بھی خاص نہیں۔ نہ اپنے ماحول میں، نہ اپنی ذات میں۔ ان کا تعلق اس بھیڑ سے ہے جو کسی واقعاتی ضرورت کا پیٹ بھرنے کے لیے فلموں میں ہیرو یا ہیروئن کے ارد گرد موجود ہوتی ہے۔ اس بھیڑ میں موجود کرداروں کا کوئی نام ہوتا ہے نہ چہرہ۔ وہ فقط موجود ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے دنیا بسی ہوئی لگتی ہے۔ بھری ہوئی لگتی ہے۔ وہ فلموں کے منظر نہیں ہر منظر بنتے ہیں۔ پس منظر کا کام تو محض منظر کو اجاگر کرنا ہوتا ہے یا پھر کوئی نقاد اگر چاہے تو سیاق و سباق کی تلاش میں ان کے متعلق چند اشارے کر سکتا ہے لیکن یہ اشارے خود ان کے بارے میں کیا بتاتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔

ان دونوں بچیوں کے بارے میں ان کا ماحول کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی سہیلیاں ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ضرور ہیں لیکن یہ ساتھ ان کی خواہش نہیں، مجبوری ہے۔ خدیم محمد دھوبی اور مرزا شمیم بیگ، نان چھو لے والے کی بیویوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ دونوں اکٹھی اسکول جائیں گی کیوں کہ زمانہ ان دنوں بھی خراب تھا۔ خاص طور پر اس کے بعد جب ایک دن مرزا شمیم بیگ مہاجر کی دختر نیک اختر سیہ بی بی روتی ہوئی گھر آئی تھی کیوں کہ اسکول سے واپسی پر جب وہ تنگ سنسان گلی سے گزر رہی تھی تو کسی نے اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر خود اس کی کمر سے لگا دیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے پڑوس کا آوارہ لڑکا تھا جس نے تمبھیں پکھن رکھی تھی اور سیہ بی بی نے یہ منظر دیکھتے ہی بری طرح چلا نا شروع کر دیا تھا۔ اس

کی چٹیں سن کر وہ آوارہ لڑکا تو بھگ گیا لیکن سیمہ بی بی کو عجیب مشکل آن پڑی کیوں کہ گلی ختم ہوتے ہی ان کا مکان تھا اور اس کی ماں نے اس کی چٹیں سن لی تھیں اور اب دروازے پر آ کر اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔

”ماں! میں نے کچھ نہیں کیا! خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا!“ خوف سے اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔

”ارے! ہوا کیا؟ کچھ تو منہ سے بول نامراد!“

ماں نے ایک دھپ اس کی کمر پر لگا دی تو وہ زور زور سے رونے لگی۔

”اماں! خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے خود ہی...“

”کس نے؟“

”اماں! وہ ہے نا! گلو، اس نے خود ہی... اماں مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔ اماں، میں تو سیدھی گھر آ رہی تھی۔ میں تو

چیچے مڑ کر ہی نہیں دیکھ تھا۔ اماں! میں اسکول نہیں چھوڑ دوں گی۔ اماں، میں اب اس چھوٹی گلی سے نہیں گزروں گی، میں اس بڑی سڑک سے آیا کروں گی، میں اسکول نہیں چھوڑ دوں گی، اماں، میں نے کچھ نہیں کیا، خدا کی قسم!“

اور پہلی بار ماں نے اس کی توقع کے خلاف اسے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ برقعہ سر پر رکھ کے گلو کے گھر پہنچ گئی۔ اس روز اس نے اپنی ماں کو پہلی بار کسی سے لڑتے دیکھا۔ گلو کی ماں نے اماں کو خوب بری بھی سنیں اور اسے اور اس کے اسکول کو بھی۔ مگر اس کی اماں نے اس کا اسکول نہیں چھڑایا۔ ایک ہفتے بعد گھر کے باہر ایک بیل گاڑی آ کر رکی، جس پر ان کے گھر کا سامان لد اور وہ اونٹوں والوں کا محلہ چھوڑ کر ایک نئے محلے میں منتقل ہو گئے۔



نیا مکان ایک تنگ سی گلی میں تھا جس کے باہر لوہے کا ایک بڑا پھانک بھی تھا۔ ان کا مکان گلی میں دائیں طرف چوتھے نمبر پر تھا۔ یہ ایک پرانا تین منزلہ مکان تھا جس کی صرف ایک منزل قابل استعمال تھی اور اوپر والی دونوں منزلیں کھنڈر بن چکی تھیں۔ اس مکان کی دیواروں پر برسوں پہلے پہلی سی قلعی کی گئی تھی جو اب دھندلا کر نیالی ہو چکی تھی۔ دروازے کے دونوں طرف ایک ایک برجی سی تھی جس کے بارے میں اسے یہ سنسنی خیز بات معلوم ہوئی کہ کبھی یہاں پہرے دار بیٹھا کرتے تھے۔ یہ کسی درمیانے طبقے کے ہندو کا متروک مکان تھا۔ مکان کی نگلی منزل تین تارکے کمرے اور ایک باورچی خانے پر مشتمل تھی۔ چھوٹے سے صحن کے ایک کونے پر لٹکا تھا جس کے ارد گرد ایک قد آدم چار دیواری بھی تھی اور بغیر چھت اور دروازے کے غسل خانے کا کام دیتی تھی۔ گھر کی خواتین اس غسل خانے میں چھوٹی ضرورتوں سے فارغ ہو جاتی تھیں البتہ بڑی ضرورت کے لیے تیسری منزل کی چھت پر واقع بیت الخلا میں جانا پڑتا۔ یہ بھی ایک مرحلہ ہوتا۔ راستے میں دوسری منزل پر پڑتی تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں سایہ ہے۔ اس لیے سیمہ بی بی یہاں سے بھاگتے ہوئے گزرنے کی کوشش کرتی اور تنگ میڑھیوں پر بھاگنے سے اس کی سانس پھول جاتی۔ اس کے ہاتھ میں کچڑے لوٹے کا آدھا پانی تو اسی راستے میں بہہ جاتا۔ پانی گرنے سے میڑھیوں پر پڑی مٹی کچھڑ میں بدل جاتی اور وہاں ہی پردہ اکثر یہاں سے پھسل جاتی۔ ایک ذرا سے کام کے لیے اسے کتنی اذیت سہنی پڑتی تھی لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی تھی۔ سیمہ بی بی کو سب سے بڑی مشکل تو چھت پر پہنچنے کے بعد پیش آتی۔ بیت الخلا کے اندر جا کر جب وہ کھڑی پر کھڑی ہوتی تو اس کا سر بغیر چھت کے بیت الخلا کی دیوار سے اونچی ہو جاتا اور اس کے بالکل سامنے حاجی قیوم کی کھڑکی کھلی نظر آتی۔ وہ جونہی سیمہ کو دیکھتے تو اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاتے۔ اس کا مکان ویسے بھی سیمہ کے مکان سے اونچی تھا۔ جب وہ کھڑے ہوتے تو سیمہ

کو محسوس ہوتا کہ وہ بیت الخلا کی دیواروں کے پیچھے نہیں، بیچ بازار میں خانچہ ضرور یہ سے فارغ ہو رہی ہے۔ وہ سر جھکا کر اپنے بدن کی عریاں حصوں کو اپنے سر اور کندھوں سے چھپانے کی کوشش کرتی رہتی، خود کو ایسے زاویوں سے موڑتی کہ حاجی صاحب کی نگاہیں اس کے بدن تک نہ پہنچ پائیں اور اپنی اس کوشش میں ناکامی کا احساس اسے ایک سی شدید اذیت میں مبتلا رکھتا جس کی تبدیلی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ حاجی قیوم شہر میں جوتوں کی سب سے بڑی دکان کے مالک تھے۔ وہ ہر سال ماہ رمضان میں زکوٰۃ کے طور پر جوتوں کے سینکڑوں ڈبے محکمے میں تقسیم کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے محلے داروں کو دکان پر بھی رعایت دے دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے سارا محلہ ان کا بڑا معتقد تھا۔ خود اس کے باپ مرزا شمیم بیگ مہاجر تان چھوے وے بھی حاجی صاحب کے ارادت مند تھے۔ ان کے بارے میں سب لوگ اتنی اچھی اچھی پکیزہ باتیں کہتے تھے، وہ کس سے کہتی کہ جب وہ کھڑی پر کھڑی ہوتی ہے تو کہیں یہ سن کر بااے اسکول سے ہی نہ اٹھالیں۔

اور پھر ایک اور بات بھی تو تھی، حاجی قیوم کا ایک ہی بیٹا تھا۔ پندرہ سولہ برس کا ہوگا۔ بڑے اسکول میں پڑھتا تھا۔ گورا چٹا، گھنگھریالے بالوں اور کالی آنکھوں والا۔ روز شام کو سائیکل لہراتا ہوا وہ جب اس کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو ضرور ایک ہار گھنٹی کی آواز سن کر باہر کھلنے والی کھڑکیوں سے بہت دور، گھر کے اندر کہیں بیٹھی ہوئی سیدہ کا دل زور سے دھڑکتا اور بہت دیر تک اس کی دھڑکن ہموار نہ ہو پاتی۔ لیکن اس نے کبھی نظر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ بس کبھی کبھی وہ جاگتے میں خواب دیکھتی کہ وہ اس کی سائیکل کے اگلے ڈنڈے پر بیٹھی ہے اور اپنے بالوں میں اس کے تنفس کی خوشبو محسوس کر رہی ہے۔ کبھی کبھی ہینڈل پر دھرے اس کے بازو اسے اپنے ارد گرد حائل ہوتے ہوئے محسوس ہوتے تو وہ دل ہی دل میں کئی بار استغفار پڑھتی۔

"توبہ توبہ، استغفر اللہ! میرے اللہ! مجھے معاف کر دے۔ میری توبہ اب کبھی میں ایسے گندے خیال دل میں نہیں رکھوں گی۔"

اپنی بے شرمی کا احساس اسے اندر سے چھیلتا رہتا اور وہ احساس گناہ کی خلش میں سلگتی رہتی۔

"اماں کہیں اسے اسکول سے نہ اٹھالیں۔"

اماں ہر وقت اسی کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ کہاں بیٹھی ہے، کدھر دیکھ رہی ہے، کیوں مسکر رہی ہے، کیسے چل رہی ہے۔ اور اتنا؟ ان کے سامنے تو وہ اس کے بارے میں سوچنے سے بھی ڈرتی تھی کہ کہیں ابا اس کی سوچ نہ پڑھ لیں۔



اس کے سامنے تو ایک ہی منزل تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا۔ اس کا سب سے عزیز خواب۔ وہ اسکول جانا چاہتی تھی۔ ہر روز۔ چھٹی کے دن بھی۔ اسے چھٹیوں کے دن زہر لگتے تھے۔ اسکول جانا اسے اس قدر خیال انگیز، اس قدر مقدس محسوس ہوتا تھا کہ جس روز اسکول نہ جانا ہوتا وہ دن اپنی زندگی پر ایک سیاہ داغ معلوم ہوتا۔

جب وہ چھوٹی سی بچی تھی اور ابھی پرائمری اسکول ہی میں پڑھتی تھی ان دنوں بھی اس نے کبھی دوسرے بچوں کی طرح صبح جاگنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اماں جونہی اسے آواز دیتیں وہ اپنے بستر پر سیدھی اٹھ کر بیٹھ جاتی، جیسے پہلے سے اس انتظار میں ہو کہ کب سے آواز پڑے اور کب وہ جاگے۔ پھر وضو کر کے وہ سرین کے دروازے پر آواز دیتی یا کبھی وہ پہلے آ جاتی تو اسے دیر لگتی، پھر وہ دونوں موبی صاحب کے گھر قرآن پڑھنے چل پڑتیں۔ مولوی صاحب کے گھر کا رستہ تقریباً پندرہ بیس منٹ میں طے ہوتا۔ اس وقت کمپنی کا خا کرو ب نیم اندھیری گلیوں میں جھڑوے رہا ہوتا۔ اس کے جھاڑو

کے نشان مٹی کی گلیوں پر لہریے سے بنا دیے اور وہ دونوں بڑے شوق سے ان لہریوں پر ہراتی ہوئی چلتیں۔ ہائیں سے دائیں پھر نیم دائرہ بناتے ہوئے دائیں سے ہائیں اور پھر ای طرح قوس میں دائیں۔ انہیں اس طرح چلنے میں بہت لطف آتا اور وہ چلتے چلتے ہنستی جاتیں۔ یوں بھی گھر سے باہر ہنسنے سے دل پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔

مولوی صاحب کے گھرانے کے محلے اور آس پاس کے بیسیوں بچے جتے ہوتے۔ مولوی صاحب اس علاقے میں قرآن پڑھانے کے لیے خاص طور پر مشہور تھے۔ وہ لڑکوں کے بڑے اسکول میں ماسٹر تھے اور قرآن پڑھانے کا کوئی معروضہ نہیں لیتے تھے۔ حالانکہ ان کا تعلق ایسے فرقے سے تھا جسے بعد میں کافر قرار دے دیا گیا تھا مگر ان دنوں نہ کوئی انہیں کافر سمجھتا تھا نہ ان سے قرآن پڑھنے پر معترض ہوتا تھا بلکہ قصبے میں ان کے گھرانے کو بہت عزت حاصل تھی۔ ان کی اپنی بیٹیاں بھی پڑھی لکھی تھیں اور پرائمری اسکول میں استایاں تھیں۔ اس کی وجہ سے بھی اس گھرانے کو بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مولوی صاحب کا گھر سینڈوں کے محلے میں تھا۔ سینڈ اپنی بیٹیوں کو کسی اور کے گھر نہیں بھیجتے تھے مگر ان مولوی صاحب کے ہاں سینڈانی لڑکیاں بھی قرآن پڑھنے آتیں۔ بڑے سے کچے مچن میں ایک طرف لڑکیاں اور دوسری طرف لڑکے زور زور سے بل بل کر قرآن پڑھا کرتے۔ پیس لگتی تو قریب پڑے مٹی کے گھر سے کٹورہ بھر پانی نکال کر پی لیتے اور اگر مولوی صاحب یہ سوویانی جی پانی مانگتیں تو بریچے کی کوشش ہوتی کہ بھگ کر کٹورہ بھر لائے۔ مولوی صاحب ایک دفعہ سبق دے دیتے اور پھر کہتے اب اسے دہراتے جاؤ۔ اسے تو پہلی دفعہ ہی سبق یاد ہو جاتا مگر دہرانا لازمی ہوتا اس لیے وہ اونچی اونچی قرآن کے الفاظ ادا کرتی رہتی اور دل ہی دل میں اور اور باتیں سوچتی رہتی۔ سہیلیوں کی باتیں ہنسی مذاق کی باتیں، کہانیوں کی باتیں، شہزادیوں اور شہزادوں کی باتیں، جنگلوں اور دریاؤں کی باتیں۔ دھوپ بڑھنے لگتی تو سب بچے گوندنی کے درخت کے نیچے جمع ہو جاتے جس سے زرد زرد پکی ہوئی دس بھری گوندیاں ٹپکتیں اور بچے انہیں چٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہتے۔ مولوی صاحب کے ڈر سے کوئی انہیں ہاتھ نہ لگاتا اور ہر ایک آنکھیں بند کر کے زور زور سے دہراتا رہتا۔ الم۔ ڈالک الکتاب لاریب فیہ۔

مولوی صاحب کے گھر تک پہنچنے کا شارٹ کٹ راستہ بھی تھا۔ مگر اس کے لیے انہیں دو گھروں سے گزرنا پڑتا۔ پہلے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے اینٹوں کی بنی ہوئی، بغیر جنگلے کی سڑکیوں تھیں جو ایک کھلی چھت پر جا نکلتی تھیں۔ اس چھت کے چاروں طرف صرف ایک ایک اینٹ کے خیرے تھے اس لیے اماں ہمیشہ نصیحت کرتیں کہ چھت سے جاؤ تو کنارے تک نہ جانا، گر جاؤ گے۔ یہ چھت دوسرے کئی گھروں کی چھتوں سے منسلک تھی۔ چنانچہ وہ بڑے آرام سے ایک ایک اینٹ اونچے نیچے خیرے پھد لگتی ہوئی پچھلے مکان کی چھت پر پہنچ جاتیں اور پھر ان کی چھت ہوئی تاریک سڑکیوں سے اتر کر پچھلی گلی میں نکل آتیں۔ ساتھ ہی مولوی صاحب کا مکان تھا۔ یوں وہ ایک لمبے بھیرے سے بچ جاتیں۔ یہ گھر کیوں کے تھے۔ ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہا کرتے تھے۔ ان گھروں والے عام طور پر اجس، ناواقف رنگیروں کے گزرنے پر بالکل براندہ نہتے گھر کبھی کبھی جب کسی اور وجہ سے پچھنے یا ساتھ والے مکان والوں سے ان کی لڑائی ہو جاتی تو گھر کی عورتیں دروازے پر آ کر ایک دوسرے کو خوب کوسنے دیتیں اور پھر دھڑ دھڑ کرتی ہوئی اپنے اپنے دروازے اندر سے بند کر لیتیں۔ پھر کبھی ایک دو دن کبھی محض چند پہر کے لیے یہ شارٹ کٹ راستہ بند ہو جاتا اور ہر ایک کو لمبا بھیرا لگا کر پچھلی گلی میں جانا پڑتا۔

لیکن کبھی کبھی ویسے بھی وہ اسی بے راستے سے گزر کر مولوی صاحب کے مکان تک آتیں۔ ایسا عموماً محرم کے

دنوں میں ہوتا کیونکہ ان دنوں سیدوں کے ڈیرے پر اونچے اونچے کمروں کے دروازے کھلے ہوتے اور اندر نئے کورے نئے کھڑے ہوتے جن کی تزئین و آرائش اور صفائی ستھرائی کا کام شد و مد سے جاری ہوتا۔ ان پر گولے کناری والے دوپٹے ڈالے جاتے، رنگ برنگی جھالریں لٹکائی جاتیں، سرخ اور سبز روشنیوں کی مار کیں چڑھائی جاتیں۔ ان آرائشی بتیوں کو مرچیں کہتے تھے اور وہ ہمیشہ ان کے جسنے بجھنے کا تماشا دیکھ کر بہت حیران ہوتی۔ ایک جی جلتی اور پھر بجھ جاتی لیکن اس کے بجھنے سے پہلے ہی دوسری جل چکی ہوتی۔ یوں قطر در قطر مرچیں جلتی بجھتی رہتیں۔ اس کا جی چاہتا وہ ان بتیوں کے اندر گھس جائے اور ان کے ساتھ، انھی کی طرح جلتی اور بجھتی جائے۔

محرم کے دن اسے خاص طور پر پسند تھے۔ جوں ہی محرم کا مہینہ شروع ہوتا وہ اپنی پہلی بتول کے ساتھ روز شام کو اس کے گھر جانا شروع کر دیتی۔ بتول بہت خوبصورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں، گول مہتابی چہرہ اور گھنے کاٹے بال تھے جن کی دھوئی موٹی چوٹیاں اس کے شانوں پر دوکتیں باتیں لہرائی رہتیں۔ محرم کے پہلے تین چار دن وہ اور بتول سر شام مل کر اس کی بڑی بہنوں کے زیر نگرانی نوچے یا دکتیں اور پھر رات کو جب بڑے شاہ صاحب کے گھر کے صحن میں ماتم ہوتا تو وہ بھی ماتم کرنے والی سیدانیوں کے پیچھے کھڑی ہو کر ان کی آواز میں آواز ملانے کی کوشش کرتی۔ ماتم سے وہ عموماً گریز کرتی کیوں کہ اس نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ شہیدوں اور مرنے والوں کا ماتم کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اس سے گناہ ہوتا ہے لیکن ماتم کی آواز کا آہنگ، نوچے کی آواز اور اس کے المیہ تاثرات اس کے دل پر عجیب سا اثر قائم کر دیتے جسے لفظوں میں بیان کرنا تو کبھی لفظوں میں لا کر سوچنا بھی مشکل تھا۔ کبھی کبھی بلا ارادہ اس کا ہاتھ اٹھ جاتا، وہ خود کو اس آواز کی بہروں پر بے اختیار ہوتا دیکھتی اور جب نوچے اپنے گدنگس کو پہنچتے تو وہ بھی خود کو قطاروں میں کھڑی سیدانیوں کے ہاتھوں کی حرکات سے ہم آہنگ پاتی۔ گوری چٹی سیدانیوں کے سیاہ لباس، ان کے کھلے گریبانوں پر ماتم کے نتیجے میں ابھرتے ہوئے سرخ نشان، نوحوں کے رقت انگیز مصرعے اور ان کا اتار چڑھاؤ، نوچے پڑھنے والیوں کی آواز کا سوز اور ان کے سینوں سے نکلتی ہوئی آہیں.....

”یا حسین! شاہ حسین!“

”ہائے عباس! ہائے عباس!“

اس کا دل بیٹھا جاتا۔

محرم کے پہلے عشرے کی آخری راتوں میں تو خاص طور پر وہ کھوکھو کر رہ جاتی۔ کبھی علی اصغر کا جھول یا قاسم کی مہندی مردانے سے زنانے میں آتی تو آہوں، سسکیوں اور کراہوں کا ایک غبار سا بلند ہوتا اور اس کی ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ وہ بھی سب کے ساتھ مل کر پھوٹ پھوٹ کر روتی اور پھر چوبارے کے بند دروازے سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ چوبارے کے اندر ذاکرہ اور اس کی ساتھی، ایک دو عورتیں بند ہوتیں۔ وہ صرف مجلس کے وقت باہر آتیں۔ ان کی آمد کا خاص اعلان ہوتا۔ سب عورتیں مؤدب و منتظر نظر آنے لگتیں اور ساری نگاہیں چوبارے پر لگ جاتیں۔ یہاں تک کہ دروازہ کھلتا اور ذاکرہ تین چار عورتوں کے جلو میں اپنی مخصوص نشست کی طرف بڑھتی۔ اس کی نشست ذرا بلند و در بہت نمایاں ہوتی۔ اس کے پیچھے سفید کپڑے کا بڑا سا بیئرنگا ہوتا جس پر فرسی کے اشعار لکھے ہوتے۔

شاہ است حسین، پادشاہ است حسین
 دیں است حسین، دیں پناہ است حسین
 سر داد نہ داد دست در دست یزید
 تھا کہ بتائے لالہ است حسین

پھر مجلس شروع ہو جاتی۔ ذاکرہ کی آواز کے اتار چڑھاؤ اور الفاظ کے شکوہ سے وہ مسحور ہو جاتی۔ جوشِ خطابت
 اپنی انتہاؤں کی طرف بڑھتا تو کر بلا کے منظر نئے سرے سے جیے جاتے۔ کبھی پیاس سے حلق میں کانٹے پڑتے، کبھی
 تیروں سے مشکیزے چھنی ہو جانے کا غم جگر کو کاٹتا اور کبھی خیموں کی ستائیں اکڑتیں، کبھی بیویوں کی بے روائی خود پر وارد کر
 کے سنی پڑتی تو کبھی اپنے پیاروں کے حلقوم سے اہلتے خون کے چشمے رگ رگ میں جاری ہو جاتے۔ دکھ، اس قدر دکھ،
 اس کی پوری جان اس دکھ میں ڈوب جاتی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ گریہ اسے عمر بھر میرا ب رکھے گا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی
 تھی کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے احساسِ ام سے جڑ گئی ہے اور وہ اپنی خوشیوں کو بھی غم کی طرح منانے کی خوش گرت
 ہو گئی ہے۔



نظم جب حد سے گزر جاتی ہے

(نثری نظمیں)

شریعت کو نسل، عورت تم سے مخاطب ہے

کشور ناہید

تم بیان دیتے ہو
 دیتے ہی چلے جاتے ہو
 تمہارے سب بیانوں میں لپٹا ہوا
 عورت کا وجود ہوتا ہے
 کھنٹے ہوئے بھی تمہیں عورت دکھائی دیتی ہے
 اور سوتے میں تم عورت کے ساتھ
 وہ کچھ کر لیتے ہو
 جس کے تمن کی ہوتے ہو
 پھر صبح کو بیان تمہارے دماغ
 میں چپکا ہوا ہوتا ہے
 چار عورتوں کو متکودہ بنانے کا خواب
 دیکھتے دیکھتے
 تمہاری داڑھی کے بال سفید ہو گئے ہیں
 آنکھوں میں طلب گے ڈورے
 سرمہ لگانے کے باوجود
 سرخ نظر آتے ہیں
 مگر عورتیں بھی ہوشیار ہو گئی ہیں

سو کن کا نام سنتے ہی

ان کے ہاتھ تلواریں جاتے ہیں

تمہارا رستم زماں بننے کا خواب

ادھورا رہ جائے گا

تم بے شک عورت کے خلاف

بیان دیتے رہو

آمنہ بی بی۔ مظفر گڑھ / جتوئی میں میری بیٹی

کشور ناہید

تم ساری میری ماں جا کی
 پاگل پن اور غصے میں
 خود کو جلا لیتی ہو
 یوں نامرادوں کے دل کی مراو
 بر آتی ہے
 دنگیں پکار رہے ہیں
 کہ تم راستے کا پتھر تھیں
 دفن ہو کر بے نام رہو گی
 ہم نے تمہارے بدن کا لطف اٹھایا
 کون کم بخت ہوگا
 جو تمہارے کنول کی پتی جیسے جسم کو
 مسلنا نہیں چاہے گا
 تمہیں پتہ نہ تھا کہ مرد کی جوانی
 جانوروں کو بھی نہیں چھوڑتی ہے
 تم تو نازک کلی تھیں
 ہم شکر گزار ہیں تمہارے
 تم نے ہمیں مسرور بھی کیا

اور داغ رسوائی کو
 خود ہی مجسم کر دیا
 میں تمہاری ماں جا کی
 اور میری جیسی ماں جائیاں
 سینہ کو بی کریں
 اس سے زمانے کو
 اور کو تو الی شہر کو
 کوئی فرق نہیں پڑتا ہے

میرے گھونگھٹ میری بھوک

کشورناہید

روٹی کا ایک لقمہ
کتنا قیمتی ہوتا ہے
نہ ملے تو
ماں کا دودھ بھی سوکھ جاتا ہے
بچے کی آنکھیں، بھوک کے مارے
باہر نکال دیتا ہے
جانوروں کی پسلیوں کو بھی
بچا کر کے
مردار کر دیتا ہے
زمین کی سوکھی چھاتی کو
موروں کے لیے بھی تنگ کر دیتا ہے
زردار لوگ تمہاری غربت اور بھوک
کا تماشا دیکھنے آتے ہیں
اور لقمہ ترسے سرشار ہو کر
مطمئن لوٹ جاتے ہیں
ان کی آنکھوں میں
نہ حیا ہوتی ہے نہ غیرت

گیلی مٹی کو تم نیچوڑ کر
حلق تر کرتے ہو
تمہاری عورتوں کے گھونگھٹ دیکھ کر
ہونقوں کی طرح صوبے کے سورا
ان کا چہرہ ڈھونڈنے لگتے ہیں
خود کو سندھودیش کا سپوت کہتے ہیں
مگر دھرتی کی رسموں کو نہیں جانتے ہیں
خدا نہ کرے وہ دن آئے
کہ بھوک اُن گھونگھٹوں کو بھی کھا جائے

گوریا جینز میں شام

نصیر احمد ناصر

آج کئی دنوں بعد
میں نے گوریا جینز میں کافی پی ہے
اور آخری سب کے ساتھ
شام کو بھی انڈیل لیا ہے منہ میں
معدہ پاکیٹی تہائی سے لبالب ہو گیا ہے
اور تم کاغذی مگ ہاتھ میں پکڑے،
ہمیشہ کی طرح منہ کھولے، ساکت و صامت
میری طرف دیکھتے ہوئے
سوچ رہی ہو
کہ آفریقہ سے پہلے تھا ہوا وقت
گوریا جینز میں کیسے آ گیا ہے!
جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا
شام اسی طرح مٹ میسی تھی
تاریخ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی
زمین پر صرف جغرافیہ تھا
پرندوں اور جانوروں کا ترتیب دیا ہوا
اور وقت سایوں کی طرح چلتا تھا
اور تم یونہی حیران و پریشان
میری طرف دیکھ رہی تھیں
تم نے کبھی خود کو باخبر نہیں رکھا
تمہیں نہیں معلوم کہ آج کل
میری دنیا بہت چھوٹی ہے
عالم نبات و حشرات کی طرح
جس میں چیونٹیوں کی قطاریں ہیں
اور پرندوں کے گھونسلے ہیں
چمک دار پلاسٹک کے سانپ اور کیڑے مکوڑے ہیں
اور آنکس ایج کے زمانے سے کھیلنے والا
ایک ننھا نواسا ہے
اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟
سا بھراج کے بچے
کھلونوں سے نہیں زمانوں سے کھیلتے ہیں
اور کھیل ہی کھیل میں
تاریخ کا آغاز ہو جاتا ہے
اور خاتمہ بھی.....
پانی پر تیرتے مکانات اور آبی شاہراہیں
اور مصوروں اور مجسموں کے شہر
آباد ہوتے ہیں اور اجڑ جاتے ہیں
بادشاہوں کی میتوں کے ساتھ
کئی ہزار مصاحمین زندہ دفن کروئے جاتے ہیں

اور عہد بہ عہد صدیاں ویران ہو جاتی ہیں

تمہیں نہیں یاد کہ دوسری بار

میں نے تمہیں دشمن سرزمینوں کے عین وسط میں دیکھا تھا

زبر زمین سرنگوں میں

تھک کر چلتے ہوئے اور رینگتے ہوئے

اور غاروں کے اندر بنے ہوئے گھروں میں

جہاں سوراخوں اور چٹنیوں سے تازہ ہوا آتی تھی

گہری نیند میں بھی

خوابوں کو نیموفا ڈکیے ہوئے

اور ہونٹوں کے بچ مسکراہٹ کی لکیر کھینچی ہوئی

جیسے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو

اب تو دنیا اتنے ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے

کہ اسے دکھانے کے لئے

ہاتھوں کی لکیریں بھی نا کافی ہیں

اور اس جگہ

جہاں اب شہر آباد ہے

اور ہم بیٹھے ہوئے ہیں گلوریا جینز میں

میں نے تمہیں آخری بار دیکھا تھا

یہاں چند گھر تھے،

ایک راستہ تھا، ایک موڑ تھا، جہاں میں کھڑا تھا

بدترین شکستوں اور ہزیمتوں کے ساتھ

گلیاں سنان اور چھتیں خالی تھیں

درختوں اور مکانوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا

اور تمہاری صرف ایک جھلک تھی

دشمن نے دلوں اور ذہنوں کے سارے رابطے جام کر

دیے تھے

پہاڑوں نے ہمیں پناہ نہیں دی تھی

اور بادل بے وقت برس رہے تھے

اور آج پھر... کئی یگوں بعد

ہم ملے ہیں

گلوریا جینز میں

اور ہمیشہ کی طرح تمہیں نہیں معذور

کہ ہم ایک ہی ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتے ہیں

ہماری کوئی تاریخ ہے نہ جغرافیہ

بس ایک سوک سینٹر ہے

اور ایک قبرستان

اور گلوریا جینز میں

وقت تمہا نہیں، روشنی کی رفتار سے سڑپ رہا ہے!

روح کے پاؤں نہیں ہوتے

نصیر احمد ناصر

روح جب کسی جسم کو اورڑھتی ہے
تو اُس کے پیزوں اور جوتوں کا سائز نہیں پوچھتی
اُس کا رنگ اور حسب نسب بھی نہیں دیکھتی
اور نہ دیگر اعضا کی کارکردگی
وہ دیکھتی ہے

کہ اس جسم میں کتنا پیار ہے
اس کی بیالوجی میں کتنی محبت ہے
کتنا نمک اور کتنا گلوکوز ہے
اس کے دل میں

کتنے سمندروں کی گہرائی ہے
اور آنکھوں میں کتنے آسمانوں کی وسعت ہے،
کتنے بادل ہاکتے ہیں

اور بارشوں کے کتنے موسم ہیں
اس میں ہواداری کے کتنے راستے ہیں
کتنے دروازے اور کتنی بالکونیاں ہیں
اور آنے جانے کے لیے
اس کے آ رہا کتنی آسانی سے گزرا جاسکتا ہے
روح ہادیوں کی طرح چلتی ہے
روح کے پاؤں نہیں ہوتے!!

جیسے ایک خلا سے دوسرے خلا میں
ایک آگ سے دوسری آگ میں
ایک پانی سے دوسرے پانی میں
ایک بدن سے دوسرے بدن میں
ایک عمر سے دوسری عمر میں
جانے کتنی عمریں اسی ادھیر بن میں گزر جاتی ہیں
اور ہم ایک چھوٹی سی جست بھرتے ہوئے گھبراتے ہیں
آنکھ کھل گئی تو کیا ہوگا

جس طرح پھول کا کھلنا بہار کی علامت ہے
اس طرح آنکھ کا کھل جانا ہی محبت ہے
بند آنکھوں سے مَرا تو جاسکتا ہے
محبت نہیں کی جاسکتی
محبت موت کا التوا ہے!
محبت زندگی کا اجرا ہے!!

دنیا آب و رگل کے ذخیروں میں بٹی ہوئی ہے

(محمد یامین کے لیے)

یا مین! سرری نگر روڈ، محض ایک نظم نہیں
خوشبوؤں، گیتوں اور کہانیوں کو روک لگ چکی ہے
اڑل اور ابید کے درمیان چکراتی، لہراتی ہوئی شاہراہ ہے
اور تمھاری نظم مٹی اور کنکریٹ کے پشتوں کے سامنے
جو تمھارے دل سے شروع ہو کر صدیوں اور زمانوں کے سنگ میل طے کرتی
بے بس پانی کی طرح وقت کی سرحدی چوکیوں سے گزرتی
ڈبیر ہوتی جا رہی ہے تمھارے ہی دل کے کسی منظر پر ختم ہو جاتی ہے
اور تمھارا جہلم تمھارے جس میں جانے کتنے جہلم، کتنے نیم جہلم ہیں
اب ایک بل کھاتی پتلی ریت کی لکیر کے سوا کچھ نہیں کتنے ڈل اور کتنے سرری نگر ہیں
یا مین! کتنے ازل اور کتنے ابد ہیں
تمھارے اطراف کے مرتفع پہاڑی سلسلوں سے نکلتی لیکن دل سے باہر
ہوئی دنیا آب و رگل کے ذخیروں میں بٹی ہوئی ہے
جس پر کوئی سنگ میل نصب نہیں جہاں حدیں اور فاصلے نظموں سے نہیں
کوئی چیک پوسٹ، کوئی ٹاکا نہیں آنکھوں اور دریاؤں کے پانی سے تاپے جاتے ہیں
جس کے سنگ یا مین! سرحد کے آس پاس سے آنے والے
کوئی جہلم، کوئی نیلم نہیں بادلوں کی قندنجیں
بے محبت کی ایک دکھائی نہوینے والی کاریز ہے! اور بارش کے چھیٹے بتا رہے ہیں
کہ دشمن نے پانیوں کی جنگ جیت لی ہے

دوسرا کہتا ہے

عذرا عباس

رات کھانس رہی ہے
دن اونگھ رہا ہے
درختوں کو پالامار گیا
پھول آپس میں دست و گریبان ہیں
آنکھیں چھتیں تک رہی ہیں
اندھیروں کے بیچ ٹٹھاتی روشنی میں
کہیں شاید کوئی مر گیا
آہوں اور فغاں کے درمیان صرف سانس باقی ہے
اس کو ٹوٹنا نہیں چاہیے

ورنہ

آنے والی نسلیں
مری ہوئی اس دنیا میں داخل ہوں گی
سب جنے ہوئے ہیں
خدا سے منت سماجت میں
وہ سب جن کے آگے سے روٹیاں ہٹائی جا رہی ہیں
ان کے گداموں میں رکھتے کے لئے
جواہری قبروں کے محل تیار کر رہے ہیں

دکھ

عذرا عباس

دکھ کے کتنے ہاتھ ہوتے ہیں
اس کی کتنی آنکھیں ہیں
جو گھورتی ہیں
زمین پر بچھے ہوئے انسانوں کو
جو بھوکے رہتے ہیں
جو پانی کو بھی ترستے ہیں
دکھ چمکا ڈر بن کر
ان کے گھروں کی چھتوں سے چپک جاتا ہے
یہ دکھ ہی تو ہے
جو بچے کو ماں کے پیٹ میں ہی ماردیتا ہے
یہ دکھ زندگی کو موت کے دسترخوان پر لے جاتا ہے
دکھ کی بے شمار آنکھیں ہیں
جو تازہ رہتی رہتی ہیں
سڑکوں پہ، بازاروں میں، فٹ پاتھوں پر
چلتے پھرتے لوگوں کو
یہ جب چاہتا ہے لوگوں کو اپنی ہوس کا
نشانہ بناتا ہے

اس کے ان گنت سر ہوتے ہیں
جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں
جو پھنسا چاہتے ہیں اس سے
وہ بھی اس کی آواز کی طرف راغب ہوتے ہیں
یہاں تک کہ یہ ان کو نچوڑ نہ دے
اس کے سروں کی مدہوشی
اکثر لوگوں کے دلوں پر راج کرتی ہے
اپنی اپنی قبروں میں اترنے سے پہلے
وہ لوگ جو دکھ کے ہاتھوں مارے گئے
ان کا ایک الگ قبرستان ہے
جو دکھ کی تحویل میں ہے

یہ خواب

عذرا عباس

جب ہم اپنے خوابوں کے ادھرے پیوندوں کو سیتے ہیں
جب ہم میوے اپنی تیل گاڑیوں کو
دھول اور دھوپ میں گھسیٹ رہے ہوتے ہیں
تب ہمارے پیوند لگے خواب اس وقت بھی
مسکراتے ہیں

وہ ہمیں اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے گھورتے ہیں
وہ ہمیں اپنی مسکراہٹوں سے حوصلہ دیتے ہیں
ان کی شرارتیں ہماری طرفداری میں ہیں
وہ خوش ہوتے ہیں جب ہم ان کی پیوندکاری کرتے ہیں
ہماری ریڑھ کی ہڈی کو وہ جھکنے نہیں دیتے
وہ چھٹاؤں کی طرح ہمارے ارد گردنا چتے ہیں
اس وقت بھی جب

شاہی دسترخوانوں سے بچی ہوئی ہڈیاں چبانے والے
ہمیں اپنے جھوٹے غرور سے پچھاڑنا چاہتے ہیں
وہ ہماری بھوک کو ایک ایسی کہانی سناتے ہیں
کہ ہم بھوکے پیٹ ہی خوشگوار نیند میں اتر جاتے ہیں
ہمیں ایسا لگتا ہے

جب تک ہم ان کی پیوندکاری کرتے رہیں گے
وہ ہمیں مرنے نہیں دیں گے

سیلو یا پلا تھ کے لیے

ابراہیم احمد

ایسے منہ زور اندھیرے سے نمودار ہو کر
تم اب کیا دیکھتی ہو؟
جب ہر طرف راکھ اڑتی ہے
بے چینی سے جگہیں بدلتے ہوئے
تم کہاں جان پائیں
کہ بے پتہ دیوانگی کے لیے کچھ بھی کافی نہیں ہوتا
کانپتے ہونٹوں پر، ڈولتے پیچھے
کسی کو دکھائی نہیں دیتے
تہ خانے میں چھپ کر
خواب آور گولیاں کھا لینے سے
دنیا پیچھا کہاں چھوڑتی ہے
نہ ہڈیوں کو کاٹ دیئے والی
سرخ بستہ ہواؤں کو
پھول سے چہرے کی نیلاہٹ
گرم جوش بنا سکتی ہے
تاسف سے تم دیکھتی رہیں
مہربان آنکھوں میں، اترتی ہوئی سفاک لائق

اور لا متناہی اضطراب میں
اپنے ہونے کو لکھتی رہی
کتاب کے نام سوچتے سوچتے
ابد تک۔۔۔ نو دیتا ہوا نشان بن گئیں
کاش تم جیتے چلے جانے پر خود کو آمادہ کر سکتیں
اور ہم... کم از کم ایک مرتبہ
اس آسمان کے نیچے
ایک دوسرے کو دیکھ سکتے
درختوں کے درمیان
دھند اور مشترکہ نیند میں چلتے ہوئے
گھاس کی جڑوں میں
اتر جانے تک۔۔۔

بیباکل لڑکی

اشفاق سلیم مرزا

یہ صرف ایک میری کہانی پر موقوف نہیں
ایک ہی وقت میں
کئی اور کہانیوں میں گم رہتی تھی وہ

پاس بیٹھے ہوئے بھی
وہ ایک حیرت کدہ تھی
اُس کی آنکھیں اُفق کے اُس پار
نئے جہانوں کی تلاش میں
ہر وقت محو سفر رہتی تھیں

یوں لگتا تھا کہ یہ انجان لگن اور بے چینی
اُس کے بس میں نہیں
یہ بیباکلی اُسے لیے جاتی تھی
کبھی اس طرف، کبھی اُس طرف

کھہرنا کسی اک جگہ
اُس کا شیوہ نہ تھا
اور سمجھنا اُس کو

دوسروں کے مقدر میں نہ تھا

خامشی کی زبان

اشفاق سلیم مرزا

وہ جو ایسے سوال ہوتے ہیں
اُن کے کیا جواب ہوتے ہیں؟
وہ جو خوشبو میں بستے ہیں
اور پھولوں میں پنتے ہیں

جن کا سخن سادہ ہوتا ہے
اور حرف تازہ ہوتا ہے
اک مائوس سی خامشی میں
وہ جو ایسے سوال ہوتے ہیں
اُن کے کیا جواب ہوتے ہیں؟

کبھی ڈھونڈ لو تو آنا
پھر مجھے بھی یہ بتانا
وہ جو ایسے سوال ہوتے ہیں
کیا اُن کے بھی،
جواب ہوتے ہیں؟

واپس لانا ہے انہیں

منویر انجم

دیکھ لینا ہوگا کوئی خواب ہی
اگر کچھ اور ممکن نہ ہوا

ایک پورا دن
دیواروں سے سر ٹکراتا
سہارا لینا ممکن نہیں ہے
واپس لانا ہوگا تمہیں
اور ایک کے بعد ایک سب کو
جھگڑنے کے لئے
میرے آس پاس

واپس لانا ہے انہیں
آج رات نہیں
تو کل صبح تک
ضرور واپس لانا ہے انہیں

ایک جھٹکا لگا
اور بکھر کر دور جاتے ہوئے
معدوم ہونے لگے
سارے ستارے

پہلے ایک غائب ہوا
جو بہت قریب تھا
پھر ایک اور
اور ایک کے بعد ایک سبھی چلے گئے
چھا گیا میرے اطراف
بھیا تک اندھیرا

بدلتا پڑے گا
میرے دل کو
رات ہی رات میں

ایک زخمی دن

تنویر انجم

ایک نقصان زدہ دن
ایک زخمی دن
بہت دنوں سے کوما میں لگتا تھا
مگر ایک بار پھر کھول دی ہیں آنکھیں اس نے
اور بلایا ہے مجھے باتیں کرنے کے لئے
وہی باتیں
جو ایک لا علاج زخموں سے پھر
کوئی دن کر سکتا ہے
کئی بار تو مجبور کیا ہے میں نے اسے
اس کی آخری خواہش کے لئے
وصیت کے لئے
تاکہ سکون سے مر جائے وہ
مگر کہاں مرتے ہیں اتنی آسانی سے
یہ زخمی دن
جن سے بنی ہوئی ہے میری زندگی ایک وارڈ
سلا چکی ہوں بہت سوں کو قبرستان میں
رخصت کر چکی ہوں کچھ کو تیمارداری کر کے
مگر یہ بہت پرانا زخمی
بار بار نکل آتا ہے کوما سے
نہ مرتا ہے

نہ صحت مند ہوتا ہے
علاج تو اس کا معلوم ہے مجھے
تمہارا خون
مگر تم تو کب کے مر چکے ہو
تمہاری جگہ
کتنے لوگوں کا خون چڑھایا جا چکا ہے اسے
یا بہایا جا چکا ہے اس کے لئے
مگر پھر گھسیٹ رہا ہے یہ
میرے اور دوسروں کے
خوش و خرم دنوں کو
اپنے زخم کے چھوت میں
اور میں ڈھونڈ رہی ہوں
بے بسی کے عالم میں
کوئی خنجر
اس زخمی پاگل سے نجات پالنے کے لئے
ریگستان کے سراب سا
جھلسا رہا ہے
کسی کے پاس
ایک خنجر

ناقابل انتظام

تنویر انجم

برس رہے ہیں پیغامات
اولوں کی طرح
نامعلوم لوگوں کے
نامعلوم لوگوں کو
آ رہے ہیں پیغامات
سپر مارکیٹوں میں بیلز کے
انٹرنیٹ اور موبائل پیکیجز کے
گھروں کی تعمیر و مرمت کے ٹھیکیداروں کے
یونیورسٹیوں میں کورسز کے
ثقافتی پروگراموں کے منتظمین کے
وائیا گرا اور دوسری دواؤں کی کمپنیوں کے
ویب سائٹ پر ہمیشہ موجود بے لباس لوگوں کے
انتخابات کے امیدواروں کے
بزنس پیشکشوں کے
لاٹریوں میں کروڑوں کی رقم جیتنے کے
بڑھتی جا رہی ہے
بہت تیزی سے
ناقابل انتظام حد تک
جاک کہے گئے
نہروں اور چٹوں کی فہرست
رینگ رہے ہیں
میرے جسم پر
کچھوئے بن کر
کبھی نہ رکنے والے پیغامات
دھنس رہا ہے میرا جسم
کیڑوں کے انبار میں
بغیر پڑھے ڈیلیٹ کیے گئے پیغامات
بھنسنارہے ہیں چھروں کی طرح
فضا میں نہیں
میرے سر کے اوپر
نہیں آیا ہے
وہ پیغام
جسے تھام کر
میں اٹھ سکوں
اور جھاڑ سکوں ایک پھونک سے
تمام چھروں کو
ایک خوف ہے

یہ کوئی قیامت تو نہیں

تنویر انجم

کہیں غصے میں

یا گھبراہٹ میں

میری غلطی سے

چلا نہ گیا ہو

ہلاک کیے گئے نمبروں اور پتوں کی فہرست میں

وہ نمبر یا پتہ

جس نے آتا ہے

میرے ازلی وابدی انتظار کا حاصل

میرا نجات دہندہ پیغام

یہ کوئی پرندے تو نہیں

میرے کبوتر ہیں

یہ کوئی جانور تو نہیں

میرے گھوڑے ہیں

یہ کوئی انسان تو نہیں

میرے محبوب ہیں

یہ کوئی سیارہ تو نہیں

میری زمین ہے

یہ کوئی خدا تو نہیں

میرا کھوالا ہے

ہلاک کیے گئے نمبروں اور پتوں کی

بے حد طویل

ناقابل انتظام فہرست

ایک بار پھر

پوری کی پوری

ڈیلیٹ کروں گی

یہ کوئی قیامت تو نہیں

میری موت ہے

شاید انتظار ختم ہوا

تنویر انجم

ایک سترہ سالہ لڑکی
اور مرکزی خیالات چنے جائیں
پہلی نظم
پہلی بغاوت
پہلی محبت
شاید انتظار ختم ہوا
شاید وقت آ گیا
شاید میں زندہ ہوں

شاید انتظار ختم ہوا
شاید وقت آ گیا
کہ چالیس سال قبل
مکالموں میں اترتی
بھدا احتیاط
حرف بہ حرف
تشکیل پاتی ہوئی
میری کہنیاں
اب پیش کردی جائیں
گمشدہ کردار
پھر ڈھونڈ لیے جائیں
گزرے ہوئے زمانے
آج میں ڈھال دیے جائیں
غائب شدہ رستے
آس پاس بنایے جائیں
اور نقطہ نظر کے لئے
تلاش کی جائے

یقیناً انہوں نے مجھ پر شک کیا ہوگا

انوار فطرت

انوار فطرت

سمندر کا دل کشادہ ہے

کوئی بھی اس میں اتر سکتا ہے

کسی کو نہیں روکتا، آسمان کو بھی نہیں

اس کا ظرف دیکھو!

زمین کی مٹی سی پیالی میں سمایا ہوا ہے

لیکن میری کاغذ کی ناؤ ہر بار ڈبو دیتا ہے

با سترڈ

میں اجڑا ہوا تنہا زمانہ ہوں

چوگرد پھیپے

اواسی کے گھنگھٹاتے ویراں جہانوں کے زندان میں

بھٹکتا ہوا،

گھنی چپ اور بے انت انگلاپے کا گدھ مجھے نوچتا رہتا ہے،

سنو سنو

روحوں کی تہوں میں اتر جانے والی

میری چیخ کی بازگشتوں کا ہول سنو!

مجھے خود سے خوف آ رہا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے

میں کوئی بھولا بسراقہ ایم خدا ہوں

جس نے اپنے غضب سے مغلوب ہو کر

زمینوں کی میخیں اکھاڑ دیں،

پانیوں کا توازن بھک سے اڑا دیا،

جہانوں کے جہان ڈھنک ڈالے

بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیں

مجھے لگتا ہے میں نے

خود کو پھر تخلیق کر لیا ہے

میں دسمبر میں خوش رہتا ہوں

انوار فطرت

گمان آباد کے باشندے

انوار فطرت

دسمبر سنورے نکل کر پر پھیلاتا ہے

تو بڑا مزا آتا ہے

شہر بھر چھینکنے لگتا ہے،

اس کی آنکھیں سوچ جاتی ہیں،

ناک نلکا بن جاتی ہے،

سارے میں لرزہ طاری رہتا ہے،

تغ بیڑیوں کو کڑکا دیتی ہے،

ایندھن گیس ہوا ہو جاتی ہے،

کوئلہ کہیں منہ کالا کر جاتا ہے،

میڈیکل سنوروں پر بکنے والی ساری دوائیں نمبر دو ہیں۔

سورج روز اسے یہ سمجھانے کو آتا ہے

”دیکھو اتنی سرد مہری اچھی نہیں!“

اس پردہ بادل اوڑھ کر اور بھی غضب ناک ہو جاتا ہے

میں دسمبر میں خوش رہتا ہوں۔

اب جب وہ جانے کو ہے

تو مجھ پر لرزہ طاری ہے،

اپنی آخری رات وہ شہر بھر سے خود کو سمیٹ لے گا

اور سنور میں آ رہے گا،

جہاں میں ہوں

آگے چلوں

تو مڑ مڑ کر پیچھے دیکھنا پڑتا ہے

کہیں گمانوں کی رہ نمائی تو نہیں کر رہا

پیچھے چلوں

تو یہ خوف ستاتا ہے

کہیں گمانوں کی رہ نمائی میں تو نہیں چل رہا

درمیاں میں چلوں

تو ہجوم میں معدوم ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے

کہیں گمانوں کے درمیاں تو نہیں گھر گیا

اکیلا چلوں

تو نہ ہونے کا ڈر لاحق ہو جاتا ہے

کہیں گمان ہی تو نہیں ہوں

عورت اور مرد.....

مصطفیٰ ارباب

مرد

ایک سمت میں پیدا ہوتا ہے

عورت

مقابل سمت میں جنم لیتی ہے

وہ ہمیشہ

تلاش کے سفر میں ہوتے ہیں

مرد

عورت کی تلاش میں

دکھ کو دور یافت کر لیتا ہے

عورت

اپنے اس سے

خوشی کو جنم دیتی ہے

وقت ایک دوست کی طرح

انہیں ملا دیتا ہے

ملاقات ہمیشہ

تحفوں کا تبادلہ ہوتی ہے

عورت

مرد کو خوشی دے کر

ہمیشہ

اس کے دیے ہوئے

دکھ کے ساتھ رہتی ہے

وہ اور میں

مصطفیٰ ارباب

وہ نہیں جانتی

میں

اس سے محبت کرتا ہوں

میں

جانتا ہوں

وہ

مجھ سے نفرت کرتی ہے

یہاں

محبت چھپائی جاتی ہے

نفرت نہیں

خوابوں کا چھکڑا

مصطفیٰ ارباب

رات ہوتے ہی

خوابوں کا چھکڑا اہل پڑتا ہے

چھکڑے میں بہت سارے خواب ہوتے ہیں

خوابوں کا چھکڑا

ترتیب کے ساتھ خواب بانٹنے لگتا ہے

ہر شخص تک

اُس کا خواب پہنچ جاتا ہے

ساری رات

لوگ خواب کے خم میں رہتے ہیں

صبح کا ذب ہوتے ہی

چھکڑا خوابوں کو وصول کرتا ہے

مجھے خواب میں بھی

بہت سارے خواب ملتے ہیں

رات ہوتے ہی

خوابوں کے چھکڑے میں

مجھے جوت دیا جاتا ہے

محبت

مصطفیٰ ارباب

میرا آنسو

میری آنکھ سے نکل کر

اس کی آنکھ میں چڑا جاتا ہے

اس کے آنسو کا جگنو

اس کی آنکھ سے اڑ کر

میری آنکھ میں آ جاتا ہے

ہم

ایک دوسرے کے آنسوؤں کو

بہت سنبھال کر رکھتے ہیں

دو آنسو ہی

ہماری میرٹ ہیں

ہمارے پاس خوشی ہوتی تو

ہم

خوشی کا جادو کرتے

ہنستا ہوا آدمی

مصطفیٰ ارباب

میں ہنستا ہوں
اس وقت
جب مجھے ہنسی آتی ہے
جس وقت
مجھے رونا چاہیے
اس وقت
میں اور زیادہ ہنسنے لگتا ہوں
میری ہنسی
بہ یک وقت
خوشی اور غم کا اظہار کرتی ہے
ہنسی میرے ہونٹوں سے پھوٹتی ہے
اور آنکھوں میں رقص کرتی ہے
ہر آدمی
مجھے مسکراتا ہوا آدمی کہتا ہے
مسکراہٹ
مجبوری بن جائے تو
خوشی بے معنی ہو جاتی ہے

اس سے پہلے کہ ہم پھر سے محبت کرنے لگیں

سعید احمد (لاہور)

تمہارے بدن سے، سانپوں کی پھنکاروں سے
تمہاری مسکراہٹ سے
تمہارے بلند قہقہوں سے
تم وقت کو کھینچ لائی ہو
میری گردن میں زنجیر بندھی ہے
اس کے تالے کی چابی مگر
میرے پاس نہیں ہے
آؤ تمہیں گاڑی تک چھوڑ آؤں
اس سے پہلے کہ ہم پھر سے محبت کرنے لگیں

صدیوں کے بعد ملی ہو
کچھ اس طور سے کہ
وقت جیسے بارش کا قطرہ تھا
تم نے سوچا ہی نہیں کہ
جدا ہوئے تو بھی ایک وقت تھا
تمہارے ملنے کی ٹرپ سے
ڈر گیا ہوں میں
کہیں ایسا نہ ہو کہ
ہم پھر سے محبت کرنے لگیں
کتنی مشکلوں سے ہم محبت کے
بھیاں جنگل سے بچ کر نکلے تھے
تم کہیں مجھے واپس لینے تو نہیں آئی ہو
مجھے خوف آتا ہے
تمہارے لمبے بالوں سے
درختوں کی شاخوں سے
جنگلی بوٹیوں جیسی آنکھوں سے

زندگی

شوالہ

چل رہی ہے

اپنی رفتار سے اپنے رخ پر

کبھی تیز، کبھی مست

ہم اندازے لگاتے ہیں

سمجھتے نہیں آسمانی حقیقتیں

بات ہے صرف اتنی

گزارنا چاہتے ہیں تیزی سے جب زندگی

یہ سست رو نظر آتی ہے

جب لمحہ لمحہ جینا چاہتے ہیں

یہ بھائی نظر آتی ہے

بھول ہے ہماری

زندگی کی چال میرا ہے

ہمارے احساس سے

سروخاک

شوالہ

لامکاں میں جوتی ہیں رو میں

کچھ جنم کے عمل میں

کچھ حساب کے اشتیاق میں

چند مگر رہتی ہیں مبرا

لامکاں کے غبار سے

خود میں مست

اپنے یار کی خوشبو اوڑھے

خدا کے لیے بھی اجنبی

اگر گزر ہوں مکاں سے کبھی

اپنی خوشبو کے پیچھے چپے آنا

پتہ چل جائے گا

تیری چاہت ہے کتنی لافانی

سائے لوٹ جاتے ہیں!

شنا اللہ

شام کی تنہائی میں

روز دیکھتا ہوں

اپنے اندر سے نکلتا تیرا سایہ

جاننا ہوں کہ

انجانی قوتوں کے خوف سے

شام ڈھلتے ہی

سائے لوٹ جاتے ہیں

اپنی اصل کی جانب

اک مدت ہوئی

سوچا تھا کہ ختم ہوگی

جس نسبت سے تفریق جلے گی

میرے تیرے درمیان

نہ میری اتارا کھ ہوئی

نہ تیری اصل کی تفریق مٹی

سایہ تیرا

شام کے سناٹے میں

اجنبی جسم میں سوئے کیسے؟

وقت

شنا اللہ

دیکھتا ہوں

نکلتا ہوا مکان سے

روشنی کا ہولہ

پیچھے منجمد ہیں اپنی جگہ پہ

جد بات اور رشتے

مانند کرسیوں اور میزوں کے

یہ بھی بکھر جائیں گے

وقت کا ہاتھ جب

ان رشتوں سے پیوستہ لوگوں کو

دھکیل دے گا

نئے فرشتوں کی گود میں

رُباب

شنا اللہ

میرے ذہن کی دیوار پر

عزین ہیں

ہزاروں غنائی نوشتے

ازبر ہیں سارے

چہکنے کے لیے لیکن

بجاتا ہوں رباب

نکلتے ہیں ماتمی گیت

سمجھ میں آتا نہیں کچھ

ایسا ہوتا ہے کیوں

انجانے میں

دل کی داستان میں

یا شید

رباب بھی ہے دکھ زدہ

اس کے جانے سے

یا شید

سماعتی اعضا ہیں

اب محاسبے میں

دل کے

آؤ ذکیہ گھر بنائیں!

شنا اللہ

آؤ ذکیہ گھر بنائیں

بوائیں صحن میں

چنبیلی کا اگ ایسا پودا

شاخیں جس کی چھوٹیں

آسمان کی رفعتوں کو

پیوست ہوں جڑیں جس کی

سطح سمندر سے

اپنی مہک سے جو اک ساتھ

معطر کرے جنت اور غلیظ جہنم

کہ اُتار سکیں ہم بھی

اپنے جہنم کا بڑھتا قرض

ایک انبارِ مضامین لگا رہتا ہے

(نقد و نظر)

سراج الدین ظفر... شخص اور شاعر

پروفیسر سحر انصاری

اُردو غزل مختلف ادوار میں محبوب بھی رہی ہے اور معتبوب بھی۔ لیکن گرم و سرد زمانہ سے گزر کر جس طرح غزل آج بھی زندہ ہے اور یقیناً آئندہ بھی رہے گی، اس کی مثال کوئی دوسری صنفِ سخن پیش نہیں کر سکتی۔ غزل جس قدر عام ہے اُسی قدر اُس میں انفرادیت کا پیدا کر لینا دشوار ہے۔ جو شعراء اس معیار پر پورے اترے ہیں اُن کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ بیسویں صدی کے ہر عشرے میں کچھ منفرد غزن گو ضرور رہے ہیں۔ انہی میں ایک سراج الدین ظفر بھی تھے۔

سراج الدین ظفر سے مجھے ذاتی طور پر بھی ملاقاتوں کا شرف حاصل تھا اور ان کی شاعری کو مٹھ عروں میں سنا اور رسائل و جرائد میں پڑھا بھی ہے۔ اس لیے میں شخص اور شاعر دونوں اعتبار سے اُن کے بارے میں کچھ عرض کر سکتا ہوں۔ سراج الدین ظفر نو جوانی میں گریجویشن کے بعد فضائیہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ خود بھی مصنفہ تھیں۔ فضائیہ سے الگ ہونے کے بعد سراج الدین ظفر نے شعروادب میں زیادہ دل چسپی پیدا کر لی۔ ابتداء میں اُن کا ایک مختصر شعری مجموعہ ”زمزمہ حیات“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ظفر، مشہور شاعری ادارے فیروز سنز کے ایک منتظم بھی تھے۔ وہ مولوی فیروز الدین کے داماد تھے اور کراچی میں شوروم کی دیکھ بھال اُنہی کے ذمے تھی۔ وہ ایک خوش اخلاق، خوش پوش و خوش فکر شاعر تھے۔ مزاجاً جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، سعادت حسن منٹو اور عبد الحمید عدم کے قبیضے سے تعلق رکھتے تھے۔ اصولی انسان تھے لیکن سخت گیر نہیں۔ عموماً کانچ اور جامعات کے طلبہ یا مشاعروں کے دیگر منتظمین جب انھیں مدعو کرتے تھے تو بعض دوسرے شعراء کی طرح نہ وہ اپنی آمد کے لیے شرائط طے کرتے تھے اور نہ بے جا اہمیت جتانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہمیشہ نیکی کر کے مشاعرہ گاہ میں پہنچ جاتے تھے۔ اور کرایہ خود اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔

سراج الدین ظفر علم نجوم میں خاص دسترس رکھتے تھے۔ یک بار ۱۹۵۳ء-۱۹۵۵ء میں انہوں نے میرا بھی زائچہ تیار کیا تھا۔ بعض باتوں کے مدو یہ بھی کہا تھا کہ آپ کسی ایسے ذریعہ اظہار سے وابستہ ہوں گے جو نہ فلم ہوگی ورنہ اسٹیج لیکن ہوگا پردے ہی سے متعلق کوئی کام۔ ان دنوں ٹیلی ویژن کا دور دورہ پتا نہ تھا لیکن جب میں پہلی بار ٹی۔ وی کے ایک پروگرام میں شریک ہوا تو ان کی بات یاد آئی۔ خود اپنے لیے اُن کا مصرعہ تھا۔

کیا قیامت ہے نویں میں راہو

پھر بعض غزلوں میں نجوم کی اصطلاحیں بھی نظم کر دیتے تھے۔

شب قصر ہفتنیں پہ جو رُزِ زحل ہوا

ہم سے کشوں سے عقدِ عروں غزل ہوا

سراج الدین ظفر کے والد اور بیٹی انڈونیشیا کے لیے عازم سفر ہوئے تو ظفر نے انہیں روکنا چاہا اور نجوم کے حساب سے اس سفر کو ختم قرار دیا۔ لیکن دونوں کو ملازمت کے سلسلے میں جانا ضروری تھا۔ اس لیے روانہ ہو گئے لیکن کچھ دیر

کی پرواز کے بعد یہ طیارہ تباہ ہو گیا اور بیٹی اور داماد ہلاک ہو گئے۔

سراج الدین ظفر کا کلام حافظ، خیام اور جوش ملیح آبادی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ رند مشربی، جام و سبب، بادہ و میکدہ، حسن پرستی اور مفکرانہ اظہارات ظفر کے تخلیقی مزج کا حصہ تھے۔ شراب، سرغر، خماری اور دیگر متعلقہ تلازمات اُن کی تمام تر شاعری میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ جب اُنہوں نے نعت کہی تو اُس میں بھی اپنے ڈکشن کا اہتمام برقرار رکھا۔

سب سے جاں میں چھلکتا ہے سیبا کی طرح

کوئی شراب نہیں عشق مصطفیٰ کی طرح

سراج الدین ظفر نے بادہ و سرغر، جام و مینا کے تلازمات کثرت سے استعمالات کیے ہیں لیکن کہیں بھی یک نیت کا شکار نہیں ہوئے۔ اُن کا ایک شعری مجموعہ ”غزل و غزن“ اُن کی زندگی میں ہی دیدہ زیب انداز میں شائع ہوا تھا۔ غزال بھی اُن کی شاعری کا اہم استعارہ تھا۔ اُن کے کلام کا اندازہ ان چند اشعار سے بھی ہو جائے گا۔

فرش گل پھوٹا نہیں، رنگ و بو کی ارزانی کریں

آؤ بلقیسانِ دوراں سے سلیمانی کریں

واعظانِ شہر ہیں سب آدمیت کے مزار

لاصرافی، ان مزاروں پر گل افشانی کریں

عروں گل کہ بلا ہو گئی ہے سب کے لیے

مرے مہر دگر اُس کو ایک شب کے لیے

یوں زندگی پہ میری نظر ہے کہ جس طرح

اک جسم مر مرے کے نشیب و فراز پر

دن کو بحر و بر کا سینہ چیر کر رکھ دیجئے

اور شب کو پائے گل رویاں پہ سر رکھ دیجئے

ہم سے خلوت میں جو رہے ہو زلفائے بہار

ہم نہیں یوسف کہ غدر پاک دامانی کریں

رندی و سرمستی کے مضامین کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سراج الدین ظفر زندگی کے مسائل انسان اور کائنات کے

تعلق اور زندگی کے فکریاتی زاویوں سے بے نیاز تھے۔ اُن کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ غور و فکر کے عادی تھے اور مضمون سے مضمون اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ عمر خیام نے بھی رندی سرشاری و رخیانی مضامین کو عزیز رکھا لیکن ریاضی و نجوم میں بھی اُسے کامل دست گاہ تھی۔ مومن خان مومن کی شاعری کا اساسی رُخ عشقیہ ہے لیکن وہ بھی نجوم اور فلسفیانہ مباحث سے دل چسپی رکھتے تھے۔ سراج الدین ظفر نے بھی غزل کے ہیراے میں فلسفہ، حکمت اور فکریاتی موضوعات کو سلیقے سے برتا ہے۔

دو گھونٹ مقرر کیے قسّام ازل نے
مشکل تھا گزارا اسی تنخواہ میں کرتا
مٹی جو خدائی بھی تو رکھنے کی نہ تھی چیز
تقسیم اسے یارانِ قدح خواہ میں کرتا

وقت اپنا زر خرید تھا ہنگام سے کشی
لے لے کو طول دے کے ابد ہم نے کر دیا
تسبیح کو سیو سے بدل کر خدا کو آج
بالآخر از شمار و عدد ہم نے کر دیا

سراج الدین ظفر کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اہم اور صاحب اسلوب شاعر نہیں۔ اب بھی ادبی حلقوں میں اُن کے اشعار سنائے جاتے ہیں اور یہ شکوہ بھی عام ہے کہ ”غزال و غزل“ کا نیا ایڈیشن کیوں شائع نہیں کیا جاتا؟

سراج الدین ظفر، مرزا غالب کی طرح non-conformist کے ورروایتی اخلاق اور مصنوعی اور ریاکارانہ رویوں کے خلاف تھے۔

ہم نہیں یوسف کہ غدر پاک دامانی کریں
ظفر نے آتش اور غائب کی زمینوں میں بھی اچھی غزلیں کہی ہیں اور اپنے، سب کے مطابق غزل کے ہر مصرعے کو رواں اور پُست رکھا ہے۔

اب گیا حنا مرکبِ شاہانہ کھینچے
آگے قناتِ سبزہ بیگانہ کھینچے

ہمارے دوش پہ کھتی جو تیری زلف تو ہم
نیم صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے

ظفر نے غالب ہی کی طرح اپنی غزلیں میں Metaphysical Conceits کا خوب صورت استعمال

کیا ہے۔ اس سے اُن کے کلام میں لفظی حُسن کے ساتھ ساتھ معنوی تہ داری بھی پیدا ہوگئی ہے۔ ظفر کا ناقدانہ رویہ افراد کے خلاف نہیں بلکہ اداروں کے خلاف ہے کیوں کہ یہی منظم طور پر کسی متقی صورتِ حال کا محرک بنتے ہیں۔ کہیں کہیں طنزیہ انداز بھی کارگر ہو جاتا ہے۔

اصلاحِ اہلِ ہوش کا یارا نہیں ہمیں

اس قوم پر خدا نے اُتارا نہیں ہمیں

سراج الدین ظفر کی زندگی کا آخری بڑا اور بدگار مٹا عرصہ وہ تھا جو سکھر میں منعقد ہوا اور جس میں فیض احمد فیض، ظہیر کاشمیری، عبد الحمید عدم، ظہورِ نظر اور شاد امرتسری بھی شریک ہوئے تھے۔ سراج الدین ظفر ایک مہذب، شائستہ اور مجلسی انسان تھے۔ اُن کے لیے میر کا یہ شعر ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میر سے محبت نہیں رہی

☆ ☆ ☆

عزیز احمد کا سفرِ ناروے

مشاہدات اور تجربات کا ایک مختلف زاویہ

ڈاکٹر معین الدین عقیل

عزیز احمد اپنی تحقیقی و تصنیفی صفات و خدمات کے باعث اپنے معاصرین میں نہایت منفرد و ممتاز حیثیت کے حامل رہے ہیں۔ تخلیقی زمرے میں وہ اردو کے ایک ہند معیار ناول نگار اور افسانہ نگار کی شہرت و وقعت رکھتے ہیں، جس کے ناول: 'گریز' (۱۹۴۰ء)، 'گ' (۱۹۴۶ء)، 'ایسی بندی' (۱۹۴۷ء)، 'شبِ نیم' (۱۹۵۰ء)، 'ہوس' (۱۹۳۱ء) اور 'سرمرد اور خون' (۱۹۳۲ء) اور انہوں نے 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'، 'آبِ حیات'، 'از خرید'، 'استا پیسہ'، 'قصہ ناتمام'، 'بیکاروں بیکار'، 'غیر فن کی بند یوں پر دیکھے جاسکتے ہیں اور لازوال ہیں۔ تنقید میں "ترقی پسند ادب" (۱۹۴۶ء) اور "اقبال، نئی تشکیل" (۱۹۴۸ء) اپنے موضوعات پر سنجیدہ و حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کے اظہار اور متوازن تجزیہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ شاعری سے بھی انھیں شغف رہا اور یہ بھی ان کے تخلیقی اظہار کا ایک وسیلہ بنی۔ انھوں نے کئی عمدہ نظمیں تخلیق کیں، جن کا ایک مجموعہ "ماہِ لقا اور دوسری نظمیں" اس سے یادگار ہے۔ تاریخ سے انھیں ہمیشہ دل چسپی رہی۔ ان کی تصنیف "نسل اور انسانیت" تاریخ و تہذیب انسانی سے ان کے ابتدائی ذوق کا پتا دیتی ہے۔ ان کی ن کاوشوں نے، اور دلی و علمی موضوعات پر اس کے متعدد تحقیقی و تنقیدی مقالات و مطالعات نے، انھیں اردو ادب کی تاریخ میں ایک قابلِ رشک حیثیت دے رکھی ہے۔ لیکن محض یہ حیثیت و مقام ان کی منزل نہ تھے۔ ان کی صلاحیتوں میں انھیں مزید بلندیوں پر لے جانے کی لیاقت اور قابیلیت موجود تھی، اس لیے اس کا ذوق و شوق انھیں تخلیق و تنقید ادب سے آگے تاریخ نویسی کی جانب بے گیا اور زمانہ قیام لندن و کینیڈا کے عرصے میں ان کی مستقل توجہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی فکری و ثقافتی تاریخ کے ایک متوازن اور حقیقت پسندانہ مطالعے پر مرکوز رہی اور عالمی سطح پر ایک ممتاز مصنف و دانشور کے طور پر ان کی شہرت کا سبب بنیں۔

اس ضمن میں ان کی ان مستقل تصانیف کے علاوہ، وہ مقالات بھی انتہائی محققانہ اور جامع ہیں جو انھوں نے عالمی معیار کے تحقیقی مجلوں میں انگریزی و فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں تحریر کیے۔ افسوس کہ اس طرح کے ان کے مقالات کے مجموعے کسی نے مرتب نہ کیے۔ اردو مقالت و مضامین بھی تا حال منتشر و غیر مرتبہ ہیں۔ اردو میں ایک دو غیر معیاری مجموعے پاکستان میں شائع تو ہوئے ہیں لیکن وہ ان مقالت و مضامین کے شایانِ شان نہیں کہے جاسکتے۔ ان کی تصانیف کی ایک کتابیات 'مقتدرہ قومی زبان' (اسلام آباد) سے شائع ہوئی ہے لیکن یہ مکمل اور حتمی نہیں اور مقالات و مضامین کے لحاظ سے قطعی قابلِ ذکر نہیں۔ ان کے مقالات و مضامین، خاص طور پر جو انھوں نے اردو میں لکھے، رسائل اور مجلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے یقینی نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اردو میں اپنی معروف تصانیف سے قطع نظر،

اور اب مقالات و مضامین کے علاوہ جو ممتاز مجلوں، دور رسائل میں شائع ہوئے، عزیز احمد نے اور کیا کچھ لکھا اور وہ کہاں کہاں مزید دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہی غیر مدون مضامین و مقالات یا ان کی تحریروں میں ان کی ایک تحریر "ناروے" ہے، جسے ایک سفر نامہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور ناروے پر ایک تعارفی مضمون بھی کہا جاسکتا ہے۔

ان کی یہ تحریر دوسری جنگ عظیم کے دوران شائع ہونے والے ایک مجموعہ مضامین "جنگ روہم ملک" میں شائع ہوئی تھی، جسے میر حسن ایم اے (عثمانیہ) نے 'ادب ادب جدید' کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہو تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جنگ کے پس منظر، حالات و واقعات، مسائل اور اثرات، بعد پر جو متنوع کتابیں شائع ہوتی رہیں، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس کی ترتیب و اشاعت کا مقصد جنگ زدہ ممالک کی، بعد صورت حال اور ان کی سیاسی، معاشی اور معاشی حالت کو پیش کرنا تھا۔ اس میں جن ممالک اور علاقوں کے جائزے کو شامل کیا گیا اور ان پر مضامین لکھوائے گئے ان میں روس، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہالینڈ، ڈنمارک، بلجیم، ناروے، سوئٹزرلینڈ، رومانیہ، یونان، مصر، عراق، ایران، برما، ہندوستان اور سیام، چین، جاپان، مجمع الجزائر، فلپائن، آسٹریلیا، لاطینی امریکہ، شامل تھے۔ اس ممالک پر جن افراد نے مضامین لکھے، ان میں معروف مصنفین اور اسکالر بھی شامل تھے، جیسے پروفیسر ہارون خان شیروانی (ڈنمارک)، جادو سرزا (روس)، عزیز احمد (ناروے)، ڈاکٹر حسرت اللہ خان (مصر)، محمد بن عمر (چیکوسلواکیہ)، ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی (سوئٹزرلینڈ)، انعام اللہ خان (برما)، مولانا عبدالقدوس ہاشمی (مجمع الجزائر، ہالینڈ، فلپائن) اور خود میر حسن شامل تھے۔ میر حسن نے اپنے ایک جامع مقدمے کے علاوہ اس کتاب کے لیے تین مضامین یونان، ایران اور رومانیہ پر تحریر کیے تھے۔

عزیز احمد کا مضمون، مذکورہ کتاب کی مناسبت سے، اگرچہ راست جنگ یا جنگ زدگی سے متعلق نہیں لیکن زمانہ جنگ کے دوران ان کے مشاہدات و تجربات پر مشتمل ہے اور اس میں جزوی طور پر جنگ کے دوران ناروے کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا وہ بھی اس میں انھوں نے بیان کیے ہیں۔ بظاہر یہ سفر نامے کے طور پر اور سفر نامے کے اسلوب میں بھی نہیں لکھا گیا لیکن جن مشاہدات اور تجربات کو عزیز احمد نے اس میں تحریر کیا ہے وہ ان کے ناروے کے تین اسفار کا نتیجہ ہیں۔ یہ سفر انھوں نے گمان یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت (۱۹۴۲ء) سے پہلے، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان کیے ہوں گے، کیوں کہ وہ پہلی بار ناروے ۱۹۳۷ء میں گئے تھے اور ۱۹۳۸ء تک بغرض حصول تعلیم انگلستان میں مقیم تھے۔ اگرچہ انھوں نے ۱۹۴۲ء سے قبل، اپنی بے پناہ پسندیدگی کی وجہ سے، تین بار اس ملک کے سفر کیے لیکن یہ تحریر ان کے اولین سفری کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ اس کے آغاز میں شامل ان کے "ذاتی تاثرات" اس پہلے ہی سفر کے تاثرات میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے ہر حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اس ملک کو، اس کے انسانوں کو اور اس کی تہذیب و معاشرت اور اقدار کو پسند کرتے رہے کہ مزید اس کے سفر کے لیے اپنے آپ کو مجبور پایا۔ اپنے تاثرات اور مشاہدات کو انھوں نے مختلف موضوعات، جیسے جغرافیہ، مشہور شہر، طرز تعمیر، باشندے، گھریلو زندگی، معاشرت، غذا، لباس اور تمدنی امتیاز کے تحت، تحریر کیا ہے۔ تحریر مختصر ہے لیکن بہت معلوماتی اور جامع ہے۔ عزیز احمد کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ایک مختصر سی تحریر میں اس ملک کی تہذیب و معاشرت کو عمدگی سے بیان کر دیا ہے جو راست مشاہدے و تجربات پر مبنی ہونے کی وجہ سے قابل مطالعہ ہے اور بطور ماخذ قابل قدر ہے۔ اسے ذیل میں برائے استفادہ حوالہ نقل کیا جاتا ہے۔

ناروے

ذاتی تاثرات:

۱۹۳۷ء میں جب پہلی مرتبہ مجھے ناروے جانے کا اتفاق ہوا تو اس ملک کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ پہلے تو قدرت ہی نے کئی لحاظ سے اسے اور سب ملکوں سے مختلف اور ممتاز بنایا ہے۔ دن کے ایک بجے ہمارا جہاز بحر شمالی کی طوفانی وسعت کو طے کر کے ناروے کے ساحل کے قریب پہنچا۔ ساحل کا منظر عجیب و غریب تھا۔ بھوری بھوری چٹانیں جہاز کے دونوں طرف میلوں دور تک چلی گئی تھیں۔ کہیں یہ چٹانیں سمندر سے کچھ ہی زیادہ اونچی تھیں اور کہیں بند پہاڑ بن گئی تھیں۔ اس کٹے بھٹے ساحل کا منظر کچھ ایسا عجیب و غریب ہوتا ہے کہ الفاظ میں اس کی تصویر کھینچنی مشکل ہے۔ سمندر بل کھاتا ہوا میلوں تک خشکی کے اندر چلا جاتا ہے۔ ایسے مقاموں کو فیورڈیے کہتے ہیں۔ ناروے کے اکثر و بیشتر بڑے بڑے شہر فیورڈوں پر آباد ہیں۔ ہمارا جہاز جو نیو کاسل A سے چلا تھا ناروے کی مشہور شمال مغربی بندرگاہ برگن A کے فیورڈ میں داخل ہوا۔ بندرگاہ کا منظر اس لحاظ سے اور بھی مختلف ہوا کہ جو لوگ وہاں جہازوں کو لینے آئے تھے وہ یورپ کے اور تمام باشندوں سے بلحاظ قد، جسم، حسن اور صحت ممتاز معلوم ہو رہے تھے۔ ناروے یورپ کا سب سے شان ملک ہے۔ یہاں کے باشندوں کے ہاں عموماً ستہرے ہوتے ہیں۔ قد بہت بلند ہوتا ہے اور یہاں کے لوگ بہ اعتبار صحت اور تناسب بہت حسین معلوم ہوتے ہیں۔ حسن نسوانی میں اٹلی کے سوائے شاید یورپ کا کوئی ملک ناروے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

طرز تعمیر:

یہاں کے باشندوں کے سوا پہلی چیز، جس نے میری توجہ کو جذب کیا وہ یہاں کی عمارتوں کا طرز تعمیر تھا۔ برگن ناروے کے بڑے پرانے شہروں میں ہے اور شہر کے اکثر حصے ناروے کے بہت قدیم تمدن کی یادگار ہیں۔ مکانات کی وضع قطع انگلستان کے قصباتی مکانوں سے بہت مختلف ہے۔ ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کے طرز تعمیر کی طرح یہاں کا طرز تعمیر بھی انوکھا اور دلکش ہے۔ مکانوں کا رنگ عموماً ہلکا سرخی، نل، نارنجی یا ہلکا صوفیانہ سبزی مائل تھا۔ ناروے کے موسم اور برف باری کی فضا میں مکانوں کا رنگ خوب کھلتا ہے۔

مختصر جغرافیہ:

جنگ کے سلسلے آپ ناروے کے جغرافیہ سے تو اچھی طرح واقف ہوں گے۔ جزیرہ نمائے اسکندینیویا کے شمال حصے کو ناروے کہتے ہیں۔ اس ملک کا ساحل بہت کٹا پھٹا ہے اور ناروے کا مغربی حصہ بجائے خود ایک جزیرہ نمائے ہے۔ اس جزیرہ نمائے کے بیچوں بیچ ریڈھ کی ہڈی کی طرح پہاڑوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے جسے وسط یورپ میں آلپس لایا ہندوستان کے بیچوں بیچ بندھیا چل والا سلسلہ ناروے کے یہ پہاڑ آلپس سے بہت مختلف ہیں۔ چٹانوں پر درخت اور سبزی وغیرہ زیادہ نہیں رہتی۔ ان برف پوش اور ویران پہاڑوں پر ایک طرح کا دہشت ناک حسن برستا ہے۔ پہاڑ اس کثرت سے ہیں کہ اس کی وجہ سے ملک میں ہزار ہا چھوٹی چھوٹی جھیلیں پیدا ہو گئی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ناروے کے

پہاڑوں کی ہر گھٹی میں ایک چھوٹی سی جھیل یا قدرتی تار ب ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان جھیلوں کا پانی سردیوں میں جم جاتا ہے اور اکثر حصوں میں جولائی تک جم رہتا ہے۔ جھیلوں کی جی ہوئی سطح پر اسکیٹنگ کا بڑا لطف آتا ہے اور دنیا کے دور دراز حصوں سے سیاح اسکیٹنگ کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ پہاڑوں کی ساحت اسکیٹنگ کے لیے بہت موزوں ہے۔ ۱۹۳۶ء کے اوپیک متا بلے میں ایک ناروستانی کھڑی ہی کو اسکیٹنگ کا بہترین امتیاز حاصل ہوا تھا۔ ناروے کا جنوبی حصہ زیادہ ہموار اور زیادہ آباد ہے۔ یہیں کاشت وغیرہ بھی ہوتی ہے۔ ملک کی صنعتوں میں دو خاص طور پر ممتاز ہیں، ایک تو ماہی گیری اور اس سے متعلقہ صنعتیں دوسرے کاغذ کی صنعت۔

شمال مشرقی حصہ آدھی رات کے سورج یعنی (Midnight Sun) کے لیے مشہور ہے۔ بعض حصوں میں چھ ماہ تک سورج نہیں ٹکٹا اور ٹکٹا ہے تو چھ ماہ تک غروب نہیں ہوتا۔ سیاحوں کے غول کے غول شمالی دنیا کے اس عجوبہ یعنی چھ ماہ کے دن کو دیکھنے آتے ہیں۔ شمال میں ناروے کی مملکت بہت تنگ ہے۔ شمال کے بہت بڑے حصے میں بحر ناروگ ریلوے کے اور کوئی ریل بھی نہیں۔

مشہور شہر:

ناروے کے بڑے بڑے شہر فیوردوں پر سمندر کے کنارے آباد ہیں۔ یہ ماہی گیری یا واسکنگ قزاقوں کی بستیوں تھیں اور رفتہ رفتہ بڑھ کر شہر بن گئیں۔ ان شہروں میں سے ناروگ جو بہت شمال میں ہے اس جہ سے مشہور ہے کہ یہ ریل کے ذریعہ سویڈن کے کوئٹے کی کانوں کے علاقے سے مل ہوا ہے۔ ناروگ پر بھی شروع میں جرمنوں نے قبضہ کر لیا تھا لیکن اس کے بعد اتحادیوں نے اسے جرمنوں سے چھین لیا۔ فرانس کی شکست کے بعد جب اتحادی افواج نے ناروے کا تحلیل کیا تو بندرگاہ ناروگ بھی دوبارہ جرمنوں کے قبضے میں چلی گئی۔ ناروگ سے مغرب کی طرف آتے ہوئے شہر تروندیم ۳۱ پڑتا ہے۔ اس شہر میں بھی جو تروندیم فیورد پر واقع ہے جنگ کے دوران کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ تروندیم آبادی کے لحاظ سے ناروے میں تیسرے نمبر کا شہر ہے۔

تروندیم سے ساحل کے ساتھ ہی ساتھ ہم مغرب کی طرف بڑھیں تو برگن پہنچتے ہیں۔ برگن ناروے کا دوسرا بڑا شہر ہے اور ملک کا سب سے خوبصورت شہر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کا یہاں ہجوم رہتا تھا۔ یہاں کا مچھلی بازار دیکھنے کے لائق ہے۔ یہاں ایک میوزیم بھی ہے جس میں ناروے کے مشہور جدید مصور مونک ۱۸۸۷ء کے کئی شاہکار ہیں۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں کا ایک ہال بھی ہے جو باکون ہال کہلاتا ہے۔ شہر کے کنارے ایک پہاڑ پر جس کا نام اسکاسن ۱۵۷۱ء ہے، ایک خوبصورت ریسٹوران اور رقص گاہ ہے۔ اسکالنس سے پورے برگن فیورد اور شہر برگن کا دلکش نظارہ نظر آتا ہے۔ دور دور تک پہاڑیوں میں گھسا ہوا سمندر، سمندر میں ہزاروں کشتیاں اور جہاز اور شہر کی خوبصورت عمارتیں اس بلندی سے بہت بھی معلوم ہوتی ہیں۔

برگن سے اور جنوب کی طرف بڑھتے تو ساحل پر ایک اور بہت خوبصورت شہر ہے جس کا نام کرستان ساند ۱۶۱۱ء ہے۔ یہ ناروے کے بالکل جنوب میں ہے۔ کرستان ساند سے پھر ساحل کے ساتھ شمال مشرق کی طرف بڑھیں تو ہم اوسلو پہنچتے ہیں۔

پایہ تخت اوسلو:

اوسلو ناروے کا پایہ تخت ہے اور اوسلو فیورد پر واقع ہے۔ پہلے اس کا نام کرسٹیانیا تھا۔ چند سال قبل برس کر اوسلو رکھا گیا ہے۔ یہ ریلوں کا بہت بڑا جنکشن بھی ہے۔ یہاں سے یک پہاڑی ریل شمال میں برگن کو جاتی ہے۔ برگن جاتے ہوئے راستے میں پہاڑوں کا وہی سلسلہ ملتا ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس ریل پر سے جو مناظر نظر آتے ہیں وہ دنیا میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں۔ اگرچہ کہ یورپ کے ریلوں میں سے دو سوئٹزر لینڈ میں مونتر ۱۹۰۱ء سے برنیز ۱۹۰۲ء اور برلانڈ ۱۹۰۳ء پر سے ہوتی ہوئی انٹر لکن ۱۹۰۴ء جاتی ہے، مناظر کے لحاظ سے بے مثل سمجھی جاتی ہے۔ لیکن برگن اوسلو ریلوے بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ اوسلو سے جنوب میں کرسٹیان ساند کو اور شمال مشرق میں تروندیم اور اسٹاؤنگر ۱۹۰۳ء وغیرہ کو بھی ریلیں جاتی ہیں۔ اور جنوب میں یہیں سے سویڈن کے پایہ تخت اسٹوک ہولم ۱۹۰۳ء کو بھی ریل جاتی ہے۔ قصہ مختصر ناروے اور اسکیٹنڈی نیویا کے سیاح کے لیے یہ شہر مرکز کا کام دے سکتا ہے۔

شہر خوبصورت ہے لیکن اس کی تعمیر میں اس قدر ”ناروی پن“ نمایاں نہیں جتنا برگن میں ہے۔ اوسلو کی سب سے اہم سڑک کارل یوہانس گاٹا ۱۸۵۵ء بہت خوبصورت ہے اور ہر لحاظ سے اس کا شمار یورپ کی دارالسلطنتوں کی خاص سڑکوں میں ہو سکتا ہے۔ یہ سڑک شاہی قصر اور اس کے دلکش پارک سے شروع ہوتی ہے۔ اسی سڑک پر یونیورسٹی کی عمارت ہے جو قابل دید ہے۔ یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ناروے کے مشہور مصنف موسک کی تیر کی ہوئی کئی لا جواب تصویریں ہیں۔ عمارت بھی لا جواب ہے۔ دائیں جانب قومی تھیٹر ہے جس کے سامنے ناروے کے ”یہ نازڈرامہ نگاروں ہنرک ایسن ۱۸۶۱ء اور بیرنس تیرن بیورن ۱۸۶۷ء کے شاندار برنجی مجسمے ہیں۔ اور بھی کئی قابل دید عمارتیں اس سڑک پر ہیں اور اسی حصے میں شہر کا سب سے خوبصورت بازار ہے۔ بندرگاہ بھی خاصی اچھی ہے۔ شہر کا ایک حصہ جزیرہ نمائے بگڈو (Bygdo) ہے۔ یہاں پرواٹنگ قزاقوں کی دو یادگار کشتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کشتیوں پر ان بہادر قزاقوں نے کولمبس کی دریافت سے پہلے بحر اطلانتک کو عبور کیا تھا۔

باشندوں کی عام حالت:

اب وہاں کے باشندوں کا حال سنئے۔ جہاں تک میرا اپنا تجربہ ہے، اہل ناروے سے زیادہ خوش اخلاق اور مہمان نواز قوم یورپ بھر میں کوئی نہیں۔ لندن میں میرے ساتھ بہت سے ناروستانی احباب پڑھتے تھے۔ ان کی دعوتوں پر میں تین بار ناروے گیا اور ہر بار اس ملک کے باشندوں کی مہمان نوازی، ان کے اخلاق اور ان کے اخلاص کا اور زیادہ اور گہرا اثر لے کر واپس آیا۔ یہاں کے باشندوں میں کسی قسم کا تعصب، کسی قسم کا غرور نہیں۔ اجنبی سیاح کے لیے تو یہ ملک جنت ہے۔ اس کی اس قدر عزت و رآؤ بھگت ہوتی ہے کہ بسا اوقات وہ خود پریشان ہو جاتا ہے۔ کوئی ان کے ملک میں سفر کرتا ہے تو اس کی اس قدر خاطر تواضع کرتے ہیں گویا اُس نے ان پر یا ان کے ملک پر کوئی احسان کیا ہے۔

گھریلو زندگی:

ناروے کی گھریلو زندگی اجنبی کو بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ ایسن کے ذرموں کے ذریعے ہم لوگ ناروے

کی زندگی سے کچھ نہ کچھ روشناس ہو چکے ہیں۔ ایک چیز تو ان لوگوں میں ضرور ہے جو اہسن کے کرداروں کی بھی خصوصیت ہے۔ فطرت اس کی ذمہ دار ہے۔ بر فباری، سردی، موسم کی سختی نے یہ بات اس قوم کے افراد میں پیدا کر دی ہوگی۔ اسکیئنڈینیو کے دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی عورتوں کو اتنی آزادی حاصل ہے کہ یورپ کے کسی اور ملک میں نہیں۔ ملک پر اس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا پڑتا ہے۔

گداگری کا فقدان:

جرمنی کے حملے سے پہلے ناروے، اور سویڈن دونوں ممالک میں مزدور جماعتوں کی حکومت تھی۔ اس کا ایک نتیجہ تو میں نے یہ دیکھا کہ کہیں کسی قسم کے گداگری یا فقیر نظر نہیں آئے۔ آپ حضرات میں سے کئی جو یورپ آئے ہیں بھولے نہ ہوں گے۔ ویرس میں مومن پرناں ۲۸ کے قبوہ خانوں سے باہر نکلے یا رات کو بولوار سال مشیل ۲۹ پر گزرے تو سڑکوں پر کئی ضعیف لاجہ راہ محتاج پڑے سوتے نظر آتے ہیں، جن کا کہیں رہنے یا کھانے کا ٹھکانا نہیں۔ مشرق میں تو ن مناظر کو ہم دن رات دیکھتے ہیں لیکن یورپ کی شہنشاہیوں کے دارالخلافوں میں جہاں اتنی دولت اور شان و شوکت ہے، افلاس و گداگری کے مناظر عجیب تضاد کا سماں پیش کرتے ہیں۔ ناروے اور سویڈن میں گداگری بالکل نہیں۔ نہ وہاں بہت زیادہ امارت ہے، نہ بہت زیادہ افلاس۔ ملک کی آبادی زیادہ نہیں اور ذریعہ پیداوار اس آبادی کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔

مساوات:

ایک اور بہت بڑی چیز جو مجھے ناروے اور سویڈن میں نظر آئی، مساوات تھی۔ یہ مالی ملک حقیقی معنوں میں عمومیت کہلانے کے مستحق تھے۔ امارت یا اعلیٰ خاندانی نسل کی بنیاد پر جو تعصبات یورپ کی دوسری عمومی یا غیر عمومی حکومتوں میں ہیں، یہاں تقریباً نہیں۔ پورے ملک کی آبادی اوسط درجے کا طبقہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کم تنخواہ پر ملازمین دستیاب نہیں ہوتے۔ صرف اعلیٰ درجے کے ہونٹوں میں جو بیرونی سیاحوں کے لیے ہیں، ملازمین میزوں پر کھانا کھلاتے ہیں۔ ورنہ اس ہونٹوں میں، جن میں خاص اہل ملک ٹھہرتے ہیں، بیچ کی میز پر کھانا رکھ دیا جاتا ہے اور لوگ حسب دل خواہ خود جا جا کر اپنی پیٹوں میں کھانا نکالتے ہیں اور میزوں پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔

عمدہ کھانا:

ناروے والے کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں۔ در خاص بات یہ ہے کہ سب باشندوں کو اچھا کھانا ملتا ہے۔ مچھلی بہت سستی اور بہت کثرت سے ملتی ہے۔ لیکن ناروے یا اسکیئنڈینیو کی غذا میں خاص چیز "اسورگ بورڈ" (Smorgbord) ہے۔ یہ بارہ قسم کی چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں ترکاریاں، چھوٹی مچھلیاں اور اسی طرح کی چیزیں شامل ہیں۔ یہ Horsd'oeuvre کی طرح کا ہوتا ہے مگر اس سے کہیں زیادہ لذیذ۔ ناروے کی ایک اور غذا مجھے پسند آئی جسے کاربونیزڈ کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا بھنا ہوا قیہ کا کباب ہوتا ہے۔ ناروے والے ناشتہ بہت جم کے کرتے ہیں۔ دودھ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور پیئر بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔

اگر کوئی اجنبی کسی ناروستانی گھرانے میں مہمان ہوتا ہے تو کھانا شروع کرنے سے پہلے اس کو خوش آمدید کہنے

کے لیے ایک طرح کی شراب پی جاتی ہے جس کو Skiel کہتے ہیں۔

لباس:

ناروے کے لوگ اور خصوصاً عورتیں بہت خوش پوش ہوتی ہیں۔ لیکن سیاح کے لیے سب سے زیادہ نظر فریب یہاں کا قومی لباس ہے، جو دیہاتوں میں یا اکثر تفریحیوں میں پہنا جاتا ہے۔ اسی لباس میں لوگ دیہاتی ناچ ناچتے ہیں۔

دنیا کے تمدن کی خدمت:

ہم لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں کہ ناروے نے دنیا کے تمدن کی کتنی خدمت انجام دی ہے۔ یہاں کے مشہور موسیقی نویس گریگ ۱۸۴۳ء کے نام سے اکثر حضرات واقف ہوں گے۔ مصور مونک اور سنگ ترشی میں ویگ لانداس ۱۸۶۱ء دور کے یورپ بھر کے مناظر میں مشہور ہیں۔ ادب کی ناروے نے بہت خدمت انجام دی ہے۔ جدید ڈرامہ، جس کی بنیاد حقیقت نگاری اور نفسیات پر ہے، ناروے ہی سے شروع ہوا۔ اسن نے جدید ڈرامہ کی بنیاد ڈالی اور چیخوف ۱۸۶۴ء سے لے کر گرہارٹ ہاڈٹ ۱۸۶۳ء اور ایسن تک یورپ کے سب ڈرامہ نگار اسی کے مرہون منت ہیں۔ اگرچہ حقیقت نگاری کے ناول کی بنیاد فرانس میں ۱۸۰۳ء نے ڈالی تھی لیکن فرانس کی حقیقت نگاری میں حسن و عشق کی بہت زیادہ چاشنی تھی۔ ناروے ہی کے ایک اور بے مثل ادیب کنوٹ ہمزون ۱۸۵۵ء نے حقیقت نگاری کی اس شاخ کو فروغ دیا جس کو واقعہ نگاری یا (رپورٹج) کہا جاتا ہے۔ کنوٹ ہمزون کے علاوہ ایک اور ناروے کی خاتون سگرڈانس ڈٹ ۱۸۶۶ء کے ناول دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہ تھو وہ تمدن جس کو جرمنی کے بسوں اور لوگوں نے تباہ کر دیا۔ لیکن یہ تباہی عارضی ہے۔ ناروے کا تمدن پھر ابھرے گا اور ایک نئی زندگی اختیار کر کے پھر دنیا کی خدمت کرے گا۔

حواشی

- ۱۔ پیدائش، حیدرآباد دکن ۱۹۱۴ء، وفات نورتنو ۱۹۷۸ء، تعلیم، اڈلڈ اورنگ، بدکالچ، دہلی، آبد میں اور پھر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں حاصل کی، جہاں سے ۱۹۳۴ء میں بی اے کیا اور سرکاری وظیفے پر لندن جا کر ۱۹۳۸ء میں انگریزی ادبیات میں بی اے آنرز کیا۔ واپس آ کر جامعہ عثمانیہ میں انگریزی زبان و ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ سقوط حیدرآباد تک وہ اسی منصب پر فائز رہے لیکن اس دوران، ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک، وہ مملکت حیدرآباد کے حکمران میر عثمان علی خان (۱۹۱۱ء-۱۹۴۸ء) کے فرزند عظیم جاہ (۱۹۰۷ء-۱۹۷۰ء) کی ترک بیگم شہزادی در شہوار (۱۹۱۴ء-۲۰۰۶ء) کے اتالیق بھی رہے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان منتقل ہو گئے اور سرکاری مناصب پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سے فیلک ہو کر لندن چلے گئے جہاں تقریباً ۵ سال رہ کر ۱۹۶۲ء میں وہ کینیڈا میں انٹرنیشنل یونیورسٹی کے شعبہ مطالعات اسلامی سے وابستہ ہو گئے اور تا عمر وہیں رہے۔
- ۲۔ ان کی ایک تصانیف میں

۱۔ Studies in Islamic Culture in the Indian Environment. (۱۹۶۴ء)

۲۔ Islamic Modernism in India and Pakistan, 1857-1966. (۱۹۶۷ء)

- ۳۔ An Intellectual History of Islam in India (۱۹۶۹ء)
- ۴۔ Muslim Self-Statement in India and Pakistan 1857-1968
- بہ اشتراک: فون گرونی بام (Von Grunebaum)، (۱۹۷۰ء)
- ۵۔ Religion and Society in Pakistan، مجموعہ مقالات، مرتبہ (۱۹۷۲ء)
- ۶۔ A History of Islamic Sicily. (۱۹۷۹ء)
- ۳۔ اس کی ایک فہرست، جو حتمی نہیں، ملٹن اسرائیل (Milton Israel) کے مرتبہ اور مغرب، Islamic Society and Culture Essays in Honour of Professor Aziz Ahmed (۱۹۸۳ء) میں شامل ہے۔
- ۴۔ پیدائش ۱۹۱۰ء اور وفات ۱۹۸۰ء۔ جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۳۸ء میں اردو و سب میں ایم اے کیا۔ زمانہ طالب علمی میں "مجدد عثمانیہ" اور "مجدد کلیسیا نمین" کے مدیر رہے۔ اپنے وقت کے ممتاز مصنف اور ادیب کی شہرت کے حامل رہے۔ اس کے معاصرین میں مخدوم محی الدین، مرزا ظفر الحسن، محمد عمر مہاجر، بدر فلیسب وغیرہ اپنی ادبی حیثیت اور اپنے اپنے شعبوں میں اپنی علمی و تہذیبی خدمات کے باعث ممتاز ہوئے۔ خود میر حسن نے ابتداء ہی سے اپنے علمی اور ادبی ذوق کا ثبوت اپنے ایم اے کی سند کی تکمیل کے لیے لکھے ہوئے اپنے تحقیقی مقالے "مغربی تصانیف کے رد و تراجم" (۱۹۳۸ء) سے دیا تھا، بعد میں "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" (۱۹۳۹ء) بھی ان کی اہم تصنیف سمجھی گئی۔ ریڈیائی تقاریر کا ایک مجموعہ "ساتھس کے کرشمے" (۱۹۳۹ء) بھی انھوں نے مرتب کیا تھا۔ کچھ عرصہ بحیثیت لیکچرر مقامی کالجوں میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر شرگاہ حیدر آباد سے منسلک ہوئے اور سقوط حیدر آباد کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں خدمات انجام دیں۔ "جنگ زدہ ممالک" اور "جنگی شخصیتیں" کے علاوہ انگریزی و سب کی تاریخ اور فن سوانح نگاری کی تاریخ پر کتابیں بھی ان کے منصوبوں میں شامل تھیں۔ میر خان کی انگریزی تصنیف 'فیڈرل فائنس' کا ترجمہ بھی اس سے یاد گار ہے۔ اپنے زمانے کے ادبی رسائل "مجدد عثمانیہ"، "مجدد کلیسیا نمین" اور "سب رس" میں ان کے متعدد مضامین بھی شائع ہوئے۔ حنفیہ قتل "رد اور کارواں"، حیدر آباد، ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۶-۱۳۸، زینت ساجدہ "حیدر آباد کے ادیب"، جلد اوں، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۲۸۹
- ۵۔ اس ادارے نے، جس کے مہتمم نعام اللہ خان اور ممتاز علی خان تھے، دور یہ شاہراہ عثمانی، حیدر آباد کن پرا واقع تھا، اس وقت تک اپنی معروف مطبوعات "سوامی تہذیب کیا ہے" مرتبہ غلام، شکیب رشید، "مجموعہ تقاریر قائد ملت نوب بہادر یار جنگ" مرتبہ بہادر یار جنگ اور "پولیس کل ڈکشنری" مرتبہ مولانا عبد القدوس ہاشمی، شائع کر دی تھیں۔ ایک کتاب "جنگی شخصیتیں" بھی اس ادارے کے اشاعتی منصوبے میں شامل تھی جسے میر حسن ہی مرتب کر رہے تھے اور جس میں اس افراد کا تذکرہ مقصود تھا جن کے ہاتھوں میں جنگ کی زمام کاری تھی۔
- ۶۔ عزیز احمد، "ناروے"، ص ۸۴
- ۷۔ Furrow
- ۸۔ New Castle
- ۹۔ Bergen
- ۱۰۔ Alps

- ۱۱۔ بھارت کے صوبہ متحدہ میں دریائے گنگا اور منظر پر سے ملحق پہاڑی سلسلہ۔
- ۱۲۔ Norvik
- ۱۳۔ Trondheim
- ۱۴۔ یڈورڈ مونک (Edvard Munch)، ۱۸۶۳ء - ۱۹۴۴ء، نفسیاتی موضوعات پر تخلیقی مصوری کے لیے مشہور ہے۔
 اس کے اثرات نے یورپ میں اواخر نیسویں صدی میں فن لطیف میں علامت نگاری (Symbolism) کی بنیاد
 ڈالی اور وائل بیسویں صدی میں، نھرنے والی تاثیرت (Expressionism) کی تحریک پر اپنے قوی اثرات
 مرتسم کیے۔
- ۱۵۔ Skansin
- ۱۶۔ Kristansand
- ۱۷۔ Oslo
- ۱۸۔ Kristiana
- ۱۹۔ Montreux
- ۲۰۔ Bernese
- ۲۱۔ Berland
- ۲۲۔ Interlaken
- ۲۳۔ Stavanger
- ۲۴۔ Stockholm
- ۲۵۔ Karlyohansgata
- ۲۶۔ Henrik Johan Ibsen، ۱۸۲۸ء - ۱۹۰۶ء، عالمی شہرت کا حامل ممتاز ڈراما نگار۔
- ۲۷۔ Bjornstjerne Bjornson، ۱۸۳۲ء - ۱۹۱۰ء، ناروے کا ممتاز ڈراما نگار، ۱۹۰۳ء میں ادب کا نوبل انعام
 حاصل کیا۔
- ۲۸۔ عزیز احمد نے نقیوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن غالباً مراد Montparnasse ہے۔
- ۲۹۔ یہاں بھی غالباً مراد: Boulevard San Michel ہے۔
- ۳۰۔ Edvard Grieg، ۱۸۴۲ء - ۱۹۰۷ء۔
- ۳۱۔ Gastav Vegeland، ۱۸۶۹ء - ۱۹۴۳ء۔
- ۳۲۔ Anton Chekhov، ۱۸۶۰ء - ۱۹۰۳ء۔
- ۳۳۔ یقیناً مراد Gerhart Hauptmann، ۱۸۶۲ء - ۱۹۴۶ء، سے ہے، جرمن ڈراما نگار۔ ۱۹۱۳ء میں ادب کا نوبل
 یافتہ۔
- ۳۴۔ Emile Edouard Zola، ۱۸۴۰ء - ۱۹۰۲ء۔
- ۳۵۔ مراد Knut Hamsun، ۱۸۵۹ء - ۱۹۵۲ء۔
- ۳۶۔ مراد Sigrid Undset، ۱۸۸۲ء - ۱۹۴۹ء۔

نصیر احمد ناصر

گلزار

پانی کی ایک عادت ہے۔ جاتی نہیں! ایک بوند ہو یا ایک جھیل۔ جو دیکھے اُس کا عکس اُتار لیتا ہے۔ جتنا نظر آئے وہ ریفلکٹ (reflect) کرتا ہے۔

ایسی ہی ایک سمندر بھری بوند سے جس کا نام نصیر احمد ناصر ہے۔ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے لمحے کا عکس اُتارتا ہے اور نظم کر لیتا ہے اور اُن لمحوں میں بس پوری زندگی محفوظ کر لیتا ہے۔ وہ اپنی نظموں کی نوک سے ہادلوں میں چھید کرتا ہے۔ بارش ٹپکتا ہے۔ اور کسی ایک ہرے پتے پر بارش کی بوند پکڑ کر، اُسے پورے جنگل کی کہانی سنا دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی نظمیں ہیں اُس کی۔ وہ ہم سب سے بسکی سلوک کرتا ہے۔ میں اُسے پڑھتے ہوئے خود کو اُس کی ہتھیلی پر تیرتی ہوئی بوند محسوس کرتا ہوں۔

نصیر احمد ناصر کی نظموں سے گزرنا، احساسات کی ندی سے گزرنا ہے۔ اُس میں آپ تیز قدم نہیں چل سکتے۔ اُسے پڑھتے ہوئے بار بار زکن پڑتا ہے اور جب تک ایک نظم پڑھ کر، احساس میں پوری طرح جذب نہیں ہو جاتی، آپ صفحہ نہیں پٹ پاتے۔ میں اُس کی نظموں کو ہونٹوں پر رکھ کر بہت دیر سے دیر سے سپ (sip) کرتا ہوں۔ یہ سفید مونچھوں والا میرا دوست کمال کاشعر ہے۔ میں ہمیشہ اُس کی شبیہوں اور ستاروں سے پہچانتا تھا!

خُدا، میرے لفظوں کو جگنو بنادے
خُدا، میری باتوں کو تلی بنادے
خُدا، مرے قدموں کو رستہ بنادے
خُدا، مجھ کو پھولوں کی خوشبو بنا کر ہوا میں اُڑادے
خُدا، موجیے کی طرح مسکر دے
خُدا، میری آنکھوں کو نظمیں بنادے
خُدا، میری نظمیں کہیں دُور دیسوں کو جاتے
پرندوں کی ڈاریں بنادے

میں نے اُن پرندوں کو دانہ دکھا کر اپنی مچھت پر اُتار ہے۔ اُن کے پروں کو سہلایا ہے اور پُچھا ہے۔ مگر دیکھئے تو یہ شخص کہاں کہاں پر جا کر نظم کو ڈھونڈتا ہے۔
نظم اُس کی خوبصورت ناک ہے

تربوز کی قاشوں سے دونوں ہونٹ اس کے نظم ہیں
آنکھوں میں پھیلا صاف ستھرا آسمان بھی نظم ہے۔

نظم بچوں کی شرارت،
نظم زخمی عورتوں کی گفتگو ہے
نظم اچھے دوستوں کے ساتھ گزری شام ہے
نظم وینٹک لاونج میں بیٹھی مسافر لڑکیوں کے ہاتھ کا سامان ہے۔

ٹورچر چیمبر میں قیدی کی گٹھلی سی چیخ بھی تو نظم ہے
ناصر اپنے دماغ کے سرے ”اینٹناز“ (antenas) کھلے رکھتا ہے۔ اُسے سب دکھائی دیتا ہے۔ سب
سنائی دیتا ہے۔ جو آنکھ میں ہے اور جو آنکھ سے اوجھل ہے وہ بھی۔ ناصر آن سطحوں پر سفر کرتا ہے جو نظر اور سوچ کے درمیان
بہتی ہیں۔ وہ سطحیں کبھی نظر آتی ہیں، کبھی نہیں آتیں۔ پڑھتے ہوئے بس ایک کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔
ابھی غم گیرے مٹی،

درختوں کی جڑوں کو پھونکتی ہے

پانیوں کا رکھ

ابھی دیوار کے پیچھے کی مٹی تک نہیں پہنچا
رہیں نے آسمان کا غم زدہ چہرہ نہیں دیکھا
ابھی دیو رکورونائیس آیا

یہ آج کی، اس دور کی، جدید شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ احساس بھی نئے ہیں اور ان کا اظہار بھی نیا ہے۔
ناصر بڑے تحمل سے بات کرتے ہیں۔ بڑے دھیرے سے بات کی پرتوں کو کھولتے ہیں وہ چوتکتے نہیں،

چونکا دیتے ہیں

”مجھ کو اپنی موت کی دستک نے زندہ کر دیا ہے!“

اور اُسے زندہ رہنے کی جلدی پڑ گئی ہے۔ کس، نادلی سے وہ اپنے سارے کام نپٹانے لگا ہے۔ وہ سارے کام اُس کی شاعری
کا مجموعہ ہیں۔

دوڑتا پھرتا ہوں

سارے کام نپٹانے کی جلدی ہے۔۔۔۔۔

پہاڑوں، درجیلوں کی غموٹی سے

قدیمی گیت سننے ہیں، پرانے داستانی بھید لینے ہیں

درختوں سے غموکاری کی بابت پوچھتا ہے

مت نئی شکلیں بناتے بادلوں کو دیکھنا ہے

خوش نوا چٹھے پرندوں سے
آڑن پھل کا پتا معلوم کرتا ہے...

عروسی تیل کے پھولوں کو چٹھو نا ہے
درو دیوار سے باتیں بھی کرتی ہیں
ابھی کتنے ملاقی منتظر ہیں
ایک لمبی لسٹ ہے آنکھوں میں نا دیدہ نظاروں کی

سمندر نے بلایا ہے
جزیرے اور ساحل بھی
کئی قرون سے مجھ کو یاد کرتے ہیں...
خزانوں کو اگلنے کے لیے
بے تاب ہیں رقبے طلسمی سرزمینوں کے
سفر کے راستے معلوم ہیں،
نقشے پڑانے کا ٹھہ کے صندوق میں محفوظ ہیں سب
دیوبانی بھی سمجھتا ہوں
مگر مصروف ہوں

ناصر بھی کبھی سدھ رتھ کی طرح بات کرتا ہے اور مجھے اُس پر گوتھ ہونے کا شک ہونے لگتا ہے۔ وہ دونوں ایک
نہیں ہیں۔ ایک تلاش میں ہے اور ایک نے کچھ درد حاصل کر لیے ہیں۔ لیکن وہ دونوں مجھے یک ہی ناصر میں نظر آتے
ہیں

ایک زمیں کے ٹکڑے سے بھی
کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے
گندم، چاول، دال، مکا
ہنری، پتے، ساگ، سلا
چوکھر، بھوسہ، چاراء، کھاد
جس کو روگ اناج کا لاگے
چھین سے وہ پھر سوئے نہ جاگے...

لنٹن کو پلٹ کر دیکھو تو جاگنے کی کیفیت نظر آتی ہے

رات کے لمبے کناروں سے پھسل کر

دن بکھرتے جا رہے ہیں
درد کے بٹے سے ملنے والی چیزیں
کس قدر بے کار ہیں

ناصر کی شاعری میں چپ چاپ بہتا ایک اور عنصر ہے جو نظر نہیں آتا۔ لیکن کچھ دیر پڑھتے رہے تو محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ وقت ہے!

ناصر کی شاعری میں وقت چاروں طرف سفر کرتا ہے۔ داکیں، بانیں، آگے اور پیچھے۔ کبھی آگے چلتے ہوئے پیچھے دیکھتا ہے۔ کبھی آگے دیکھتے ہوئے پیچھے چلتے لگتا ہے۔ لیکن ایک بات عجیب ہے جو مجھے ہر بار ناصر کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ وہ نوسٹالجیا (Nostalgia) ہے۔ نوسٹالجیا کا تعلق اکثر ماضی سے ہوتا ہے۔ لیکن اُس کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی نظر آتا ہے۔ حال ہو، ماضی ہو، یا سامنے کا سفر! مثال دوں؟

جب دُکھ کی بو جھل شام، بغیر دس سے اترے

دُور سے آنے والے رستوں پر

بانجھ مناظر آنکھ چھوئی تھیلیں

اودھیا توں میں رکھی آنکھوں پر

خوابوں کی مٹی جم جائے

تم کچھ مت لکھنا!!

تشبیہوں، استعاروں کا انداز زرا لا ہے اور نہایت منفرد! الفاظ کا پختا و روزمرہ کی زبان سے اٹھایا ہوا۔ خواہ وہ انگریزی ہی کیوں نہ ہو۔ اُس میں حد قافی زبانوں کا اثر بھی نظر آتا ہے اور بدلتی ہوئی جدید اردو کا بھی۔ بیک وقت اُس کا لہجہ جدید بھی ہے۔ روایتی بھی۔ Urban بھی Rural بھی۔ اپنے وقت کی پُر ری تہذیب کو سمیٹے ہوئے۔ نظم کا ہر مصرع پُر ری طرح کسا ہوا ملتا ہے۔ کبھی کوئی غلط ایسا نہیں کہ وزن پُر را کرنے کے لیے بٹہ رکھ دیا۔ ہر نظم اپنے قد پر پابند ہے۔ Over saying کا کبھی کوئی اندیشہ نہیں۔ کبھی نظم پڑھتے ہوئے، کسی کاوش یا effort کا حس نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کہ یہ بات بس یوں ہی تھی، اور ایسے ہی کہی جاسکتی ہے۔ چاہے وہ کتنی بھی abstract کیوں نہ ہو:

ریل کی سیٹی

ہوا کے پیٹ میں

سُوراج کرتی جا رہی ہے!

اور دیکھیے

رات کی دیوار پر

چاک سے لکھ روشنی

شکل سُورج کی بنا

اردو میں ماڈرن شاعری کی اس سے اچھی مثال نہیں مل سکتی۔ میں ہمیشہ سے مداح تھا اس شاعر کا۔ انہیں پڑھتا

بھی رہا۔ خط و کتابت بھی رہی۔ اُن کے رسالے ”تسہیر“ میں لکھتا بھی رہا۔ کوئی اُمید نہیں تھی کہ کبھی ملاقات بھی ہوگی۔
میں وطن سے چھوٹا ہوا، اُتاشی دوران سے، جتنا میرا وطن!

ایک بار وقت نے پہلو بدلا۔ میں رہور گیا۔ اور پانچ گھنٹے کا سفر کر کے، جہلم کا پل گور کے، دینہ پہنچا۔ اپنا
پیدائشی گھر دیکھنے۔ اپنے جنم کی مٹی چھونے۔ آٹھ سال کا تھا جب نکلا تھا۔ ستر سال کے بعد لوٹا۔
’دینہ ٹیشن پر گیا۔ کچھ احباب ملے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑا۔
’میں فیسرا احمد ناصر“۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ اُس کے چہرے پر روشن سفید بوٹھیں تھیں!
اس سے زیادہ خوبصورت surprise مجھے زندگی میں کبھی نہیں ملا تھا!
زندگی کتنی سچی ہے۔ جو ایسے دوست دیتی ہے۔ اور ایسے شاعر!!

☆.....☆.....☆

اُردو غزل اکیسویں صدی میں

(ظفر اقبال، نئی غزل اور مابعد)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

۱۸۵۷ء کے بعد غزل میں پہلی بڑی تبدیلی حالی کی غزل میں رونما ہوئی تھی۔ پنجاب بک ڈپو اور انجمن پنجاب کے اثرات کے سبب حالی کی غزل روایتی موضوعات کے حسن سے بغاوت کر کے بے حد سادگی کا رنگ اختیار کر گئی تھیں۔ بیسویں صدی نے قبال کی شکل میں اردو غزل کو بلند آہنگ فلسفہ و فکر اور تہذیب کی صورت میں دیکھا۔ غزل اس سے پہلے اس شعری صورت کا تجربہ نہ کر سکی تھی۔ اردو غزل میں یہ بہت بڑا تجربہ تھا۔ اس دور میں حسرت نے روایت کے امتزاجی رنگوں سے غزل کو خوش گوار طرہ پر بیہ رنگوں کا روپ دیا۔ سن سینتالیس سے کچھ پہلے فیض نے غنائیت، رومانس اور کلاسیکی آہنگ کے امتزاج سے غزل میں سیاسی و سماجی موضوعات پیدا کیے۔ غزل اپنے کلاسیکی موضوعات میں ۱۹۴۷ء کے بعد آہستہ آہستہ تبدیلیوں کا عمل خد ہر کرتی ہے اور اب جدید غزل دو صدیوں کو عبور کر کے اکیسویں صدی کا سفر طے کر رہی ہے۔ ہم نے اس مقالہ میں اکیسویں صدی میں غزل کے امکانات اور اس کی بدلتی ہوئی شکلوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

بیسویں صدی نے غزل کی روایت میں حسرت، فراق، فیض، ناصراًظمی اور شیر نیازی جیسے شعرا کی روایت کو دیکھا تھا۔ ان شعرا نے غزل کی جمالیات کی پیروی کی تھی اور حسن و عشق کے معاملات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے شعری اسلوب، موضوعات اور مضامین کلاسیکی غزل کی چھتری تلے لکھے جا رہے تھے۔

بیسویں صدی کے آخری دور میں غزل کی دنیا میں اگر کوئی تجربہ ہو تو وہ ظفر اقبال کی شاعری کا تجربہ تھا۔ ”آپ رواں“ میں غزل کا رنگ بدلتا ہوا نظر آیا تھا۔ میں یہاں اس کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کروں گا۔ یہ اشعار غزل کی روایتی نفا میں ایک مختلف طرز احساس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم غزل کے جہانِ دگر میں سانس لے رہے ہیں۔

پریوں ایسا روپ ہے جس کا ہر کوں جیسا ناؤں
سارے دھندے چھوڑ چھاڑ کے چلیے اس کے گاؤں
پکی سڑکوں والے شہر میں کس سے ملنے جائیں
ہولے سے بھی پاؤں پرے تو بیچ اٹھتی ہیں کھڑاؤں
پیا سا گوا جھنگل کے چٹھے میں ڈوب مرا
دیوانہ کر دیتی ہے پیڑوں کو مہکتی چھاؤں

بیسویں صدی کے آخری حصے میں غزل کی روایتی کائنات کو بدلتے دار شخص ظفر قبال ہی تھا۔ غزل کی روایت

میں اس کے دوسرے مجموعے ”گلافتاب“ کو تبدیلی کی بڑی عدم قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں ایک پارسٹس الرحمن فاروقی نے لکھا تھا کہ دیوان غائب کی اشاعت اول (۱۸۳۱ء) کے بعد، رد و غزل کی تاریخ میں دوسرا انقلابی قدم ”گلافتاب“ کی اشاعت (۱۹۴۴) تھی۔ (اب تک ج۔ ۱، ص ۳۷)

ظفر اقبال نے لائینی سماجی صورت حال کو غزل میں پیش کیا اور لسانی جرأت کا وہ بے مثال مظاہرہ کیا جس کی مثال بیسویں صدی میں نظر نہ آسکتی تھی۔ اس کے فن کا نقطہ خروج غزل کی رد و تشکیل تھا۔

”آپ رواں“ کا تجربہ غزل کے معنی، موضوعاتی اور مجموعی اسلوب سے دور ہونے کا تھا جہاں بیسویں صدی میں پیدا ہونے والی غزل کے مانوس روایتی لب و لہجہ کے مقابلے میں وہ الگ کھڑا نظر آتا ہے۔

”گلافتاب“ میں غزل کی ڈیزھائینٹ کی مسجد بنا کر ظفر اقبال اس مسجد کے پتھروں سے پنا سر پھوڑا بنا رہا۔ سر پھوڑے کا جو عمل سن ساٹھ کی دہائی کے وسط میں ظاہر ہوا تھا وہ اب تک کی غزلوں میں بدستور جاری ہے۔ ان ڈیزھائینٹ برسوں میں وہ کتنا بوجھان ہوا ہے یا اس نے روایت کا کتنا خون بہایا ہے اس کا اندازہ وہی ہوگا کہ جس کے ضخیم مجموعوں سے اپنا سر نکراتے رہے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ظفر اقبال غزل کا وہ شاعر ہے جس نے روایت کو لب و لہجہ کی ہے اپنا سر پھوڑا ہے اور قارئین کے سر پر بھی اپنے تجربے کی کاری ضربیں لگائی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس خون ریزی کا حاصل کیا ہے؟ یہ حاصل وہ بڑے شعری مجموعے ہیں جن میں غزل کو جیٹا غزل بنا دیا گیا ہے اور نئے مکانات کی دنیا کو تخلیق کیا گیا ہے۔

ظفر اقبال نے غزل کا ایک بڑا تجربہ پیش کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس تجربہ کو اس کے عہد نے کس حد تک قبول کیا ہے؟ کیا اس کا تجربہ آگے بڑھتا نظر آتا ہے؟ یہ تجربہ روایت کا حصہ بن سکا ہے یا نہیں؟ یا پھر یہ اپنے عہد کے حصار ہی میں سمٹ کر رہ گیا ہے؟ تاریخ کا عمل بڑا بے رحم و ر تاریخ کا فیصلہ بڑا غیر جانب دار ہوتا ہے یہ بہت کچھ منادیتا ہے یا کچھ حصہ روایت کے طور پر قبول کر دیتا ہے۔

ظفر اقبال کی غزل کا تجربہ مکانات کو مانوس شکلوں اور معروف تصورات سے ہٹ کر دیکھنے کی سعی کا ہے۔ غزل گو شعرا صدیوں تک مکانات، حیات اور دنیا کو لگے بندھے انداز، ایک جیسے محسوسات اور روایت کی ہی بنائی، مرتب شدہ اور طے شدہ شکلوں میں دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔

غزل اپنے شعری تجربات میں مشترکہ تجربوں یا تجربہ کے اشتراک کا سفر طے کرتی رہی ہے۔ کسی ایک دور کے شاعر یا مخصوص تجربہ کی مشترکہ جہتوں میں چلتے رہے ہیں۔ لوگ کسی، انفرادی تجربہ کی بجائے اپنے دور سے ملنے والے مشترکہ تجربوں ہی کو استعمال کر کے غزل کوئی کرتے رہتے تھے۔

ظفر اقبال میں روایتی تجربہ کے اشتراک سے بننے والی دنیا موجود نہیں ہے۔ اس کی دنیا اس کے منفرد وژن کی دین ہے۔ اس کی سعی حیات و مکانات کو نئی شکلوں میں دیکھنے، وزن سے ہمیشہ نئی معنویت دریافت کرنے میں ہے۔

اس کی غزل غزل کی ڈی کنٹرکشن ہے۔ مگر یہ محض توڑ پھوڑ نہیں ہے۔ اس نے غزل کو ڈی کنٹرکٹ کر کے اسے کنٹرکٹ بھی کیا ہے۔ یہ ایک لب و لہجہ ہے جو ”گلافتاب“ سے شروع ہوا تھا اور ”اب تک“ کی چوتھی جلد تک آ پہنچا ہے۔

ظفر اقبال کی لسانی توڑ پھوڑ، لسانی تشکیلات کا ایک کام یا تجربہ ہے۔ لسانی تشکیلات کے شعرا میں سے شاید ہی کسی اور شاعر نے اتنی استقامت اتنی جرأت اور اتنے تسلسل کے ساتھ لسانی تجربات کیے ہوں تخلیقی طور پر وہ کبھی بھی

تھکن، جمود یا رکنے کی منزل کا شکار نہیں ہوا۔

ہاں یہ لگ بات ہے کہ اس نے ماضی قریب میں اپنے شعری اعمال کی طرف رجوع بھی کیا ہے ورنہ سانی تشکیلات کے تجربوں کو واپس بھی لے لیا ہے اگر آپ اس قصے سے دل چسپی رکھتے ہوں تو افتخار جالب کے مضمون ”ظفر قبّال بیک ٹوسا ہی وال“ اور خود غفر اقبال کا وہ کالم بھی دیکھ لیجیے جو روزنامہ ”دنیا“ میں شائع ہوا تھا۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا ظفر قبّال کی شاعری، بڑی شاعری ہے؟ اسی طرح جیسے ولی، میر، غالب اور قبّال کی شاعری بڑی شاعری کی مثال ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم بڑی شاعری کس شاعری کو کہہ سکتے ہیں بڑی شاعری یقینی طور پر خیال، فکر، جذبے، احساس اور متحیدہ کے عمل سے بنتی ہے۔ ولی کی شاعری اسلوب اور جمالیات کے تجربے سے بنتی ہے۔ میر کی شاعری کو بڑا بنانے میں اس کے جذبہ و احساس کی حدت اور حساسیت اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ غالب کا متحیدہ اس کی شاعری کو بڑا بناتا ہے اور اقبال کی شاعری اپنے فکر و فلسفہ اور شعری کرافٹ کی برتری سے بڑی شاعری بن جاتی ہے میرے سامنے اب یہ سوال کھڑا ہے کہ کیا ظفر اقبال کی شاعری کو بڑی شاعری کا درجہ حاصل ہے؟ میرے خیال میں تجربہ کے اعتبار سے یہ شاعری بڑی ہے مگر بڑی شاعری کی عمومی تعریف پر یہ پوری نہیں اترتی۔ جدید غزل کے بارے میں میرا تجربہ یہ ہے کہ سن ساٹھ کی نئی شاعری کے نادر تجربے کا ایک نتیجہ جدید غزل ہے جس کی ابتدا ساٹھ کے وسط میں ہوئی تھی۔ اس عہد کی غزل کوئی شاعری کی دین سمجھنا چاہیے۔ جدید غزل کے ریفرنس کا context نئی شاعری ہی ہے۔ اگر آپ غور کریں تو سن ساٹھ کے نئے شاعروں کی لسانی تشکیلات کی تحریک ہی نے غزل کے کلاسیکی اسلوب اور لسانی ساخت کو جھنجھوڑا تھا جس سے غزل کی کاسمیک، فرمانبرداری اور مودب و مہذب شعری لغت میں بہت تیزی سے تبدیلی کا عمل شروع ہوا تھا۔ اس عمل کی حساسیت کا اولین بڑا تجربہ ظفر اقبال کی ”گلاب“ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ تجربہ واقعتاً تھلکہ خیز تھا جس سے غزل کے قلعہ میں کھرام چمکی اور پورا برصغیر چیخ و پکار کرنے لگا تھا۔ ”گلاب“ میں غزل کے متعین شدہ معنوی سلسلوں سے انحراف کیا گیا تھا اور نئے معنوی سلسلوں کی تخلیق کی کوشش کی گئی تھی۔ اردو غزل کے قارئین اس صدمے کے لیے تیار نہ تھے۔ میرے خیال میں یہ کسی ثقافتی صدمے سے کم نہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ غزل کی قلب، مہیت ہو گئی ہے۔ ”گلاب“ کی لسانی توڑ پھوڑ سے لوگ زیادہ پریشان ہوئے تھے۔ زبان کی اس نئی ساخت سے روایتی غزل کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا رہا ہے کہ ظفر اقبال نے شعور کی طور پر ایسا کیا تھا۔ اس سے غزل کی روایت آباد تو نہیں ہوئی البتہ اس کی شکل بگڑ گئی۔ وہ روایت سے اس قدر دور بہت گئی تھی کہ غزل کا غزلیہ رنگ برقرار نہ رہ سکا۔ نئی نظم کے شعرائے لفظوں کا ایک نیا کھیل تو کھیلے تھے مگر لفظوں کو اس طرح مطلق الغنائی سے استعمال نہیں کیا تھا۔ یہاں شعرا دیکھیے۔

نرم نیرنگیاں نیرنگ چھب دید
نقش دکھ دوراں دیدار نے کا
تھڑکیاں لنگر ان گھر حمل ہول
چکواں، گولواں پرکار نے کا
نفل شکنی کفر شکنی برابر
چتر کچھ لکھنے راستے ہوار نے کا
لج جت لکھنے لکھنے لکھنے لکھنے

گرہاں گیرنا درکارنے کا
 کھڑے کھیتاں اڑ رہیاں تناظر
 سبز سوج سراب اطوار نے کا
 کھڑک کھڑکا دھڑک دھڑکا اہر پل
 مزہ مدھم پریشاں پارنے کا
 سفر سینواں اس پیش پکار
 سمندر سامنے مجھ پارنے کا
 اڑنا بوسہ مزن چمھی
 اندھیر آنگن الف انوارنے کا
 کڑک بجلی بھڑک شعلہ دھڑک دھوپ
 بدن بادل اند کہسارنے کا

کیا اس سہنی توڑ پھوڑ کا کوئی اثر ہو میرے خیال میں ایب بہت محدود سطح پر ہوا۔ بستہ ہوا یہ کہ شاعری نا شاعری بن گئی اور غزل نا غزل کا روپ اختیار کر گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی لسانی تجربہ کو اول و آخر شعری تجربے کے قریب قریب تو ضرور ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شعری تجربہ شعریت سے محروم ہے تو پھر اس تجربہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اس لیے کہ شاعری لکھنے کا مقصد شعریت ہے۔ اگر شاعر کوئی معنوی یا لسانی تجربہ کرتا ہے تو اس تجربے میں شعری محاسن کو حاضر ہونا چاہیے۔ ظفر اقبال نے اپنے زور دار تجربے کے زور میں شعری محسن کو غائب کر دیا ہے۔ اس سے ملتی جلتی ایک شعری سرکس انشاء نے بھی شروع کی تھی اس شعری سرکس میں غفلتوں پر قدرت کا بے پندہ اظہار تو ہوا تھا مگر شاعری کہیں چھپ گئی تھی۔ میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ”گلا افتاب“ تمام تر اس تجربے کا نام نہیں ہے اس میں غزل کی بدلتی ہوئی روایت کے بہت خوب صورت شعر بھی موجود تھے۔ یہ شعر غزل کی روایت کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے

میں لڑکھڑاتا پھرا باغ کے برابر میں
 کھلی ہوئی تھی کوئی شہ ہوا کے ساغر میں
 وہی پہاڑ وہی ندیاں، وہی دریا
 بھرا تھا رنگ زمیں آسمان کے منظر میں

لوٹتے پتوں کا موسم ہر طرف چھایا ہوا
 چاند مرجھایا ہوا پھول گہنایا ہوا
 کون سے عکس عجب کا خنجر ہوں صبح سے
 راہ پر بیٹھ ہوں آئینہ ہے چمکایا ہوا
 آگ جنگل میں لگی ہے سات دریاؤں کے پار
 اور کوئی شہر میں پھرتا ہے گھبرایا ہوا

گزر گیا ہے نظر سے کوئی سراب ایسا
 کہ دشت و در میں دھندلکا ہے خواب آب ایسا
 خزاں کی شام تھی یا عکس تو بہار کوئی
 کہ ابر شاخ ہوا پر کھلا گلاب ایسا
 چھٹی ہوئی سی چٹائیں لکھے ہوئے سے درخت
 کھلا تھا سامنے منظر کوئی کتاب ایسا
 بکھیر دی ہیں ظفر کہ چیاں تمازت گی
 فضا میں توڑ کے آئینہ آفتاب ایسا

ظفر اقبال ایک بڑا قادر الکلام شاعر ہے۔ بیسویں صدی کے آخری ادوار میں اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک اس سے بڑا کوئی دوسرا بڑا گو شاعر نظر نہیں آتا۔ اس کی کلیات کے چار بڑے ضخیم شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور پانچواں تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔

وہ شاعر جس کی چار شعری جلدیں اپنے پشتہ کے اعتبار سے ایک فن بھرپور مت کی حامل نظر آتی ہیں کیا اس کثیر الکلام شاعر کو ہم بڑا شاعر کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کثرت کلام سے شاعر بڑا کہہوا سکتا ہے؟ میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے اور شاید آپ بھی اسی طرح سے سوچتے ہوں گے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ جیسے میر کے بارے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس کے کلام میں پست شعر بہت پست ہیں اور بلند بہت بلند ہیں۔ مجھے کچھ ایسی ہی صورت حال ظفر اقبال کے ہاں نظر آتی ہے۔ دراصل قدرت کے منبع فیاض سے اسے پرگوئی کی بے پناہ قوت ملی ہے اتنی قوت کہ جو نامتناہی معلوم ہوتی ہے۔ قدرت کی سی لامتناہی فیاضی نے اس کے ہاں بعض مسائل پیدا کر دیے ہیں جس نے ایسے اشعار کے نگار گانے سے گریز نہیں کیا جو معنویت، شعریت اور کیفیت سے عاری نظر آتے ہیں اس کی یہ پرگوئی ایک عذاب بن گئی ہے مثلاً یہ شعر دیکھتے جاسیے

وہ تو میرے قریب تھا
 میں ہی اس سے دور تھا
 کبھی تھا خانپور میں
 کبھی بہاولپور تھا

کیا کوئی دیکھتا راستا
 تھا وہی دودھیا راستا
 راستے تھے کئی اس طرف
 اور انھیں کانٹا راستا
 چاند کے پیچھے پیچھے وہی

چاندنی سے انا راستا
 کب سے خالی پڑا ہے یونہی
 روشنی سے بھرا راستا
 یہ بچھائے ہوئے ماہ و سال
 یہ بنایا ہوا راستا

کبھی انار درخت ہیں
 کبھی شرار درخت ہیں
 پو سی پھوٹ رہی، کیا
 صبح آوار درخت ہیں
 آسمان پر اُگے ہوئے
 سدا بہار درخت ہیں
 ہیں اقرار درخت یہ
 یا انکار درخت ہیں
 اپنے تو اس دھوپ میں
 بس دوچار درخت ہیں
 ایک قطار میں ہی ظفر
 تین ہزار درخت ہیں

ظفر اقبال نے اپنے روزنامہ ”دنیا“ والے ایک کالم میں ایک خاتون کا ذکر کیا ہے جس نے ان کی غزل سے
 پھاؤں اور سبز یوں کے اشعار نکالے ہیں۔ میں یہاں غزلوں کے مذکورہ شعراء درج کروں گا۔ کیا کہاں ہے ظفر اقبال کا کہ
 اس نے غزل کو کبھی پھل منڈی میں بدم دیا ہے اور کبھی سبزی منڈی میں

میرے نسخے میں ہے شامل ترے رخسار کا سیب
 اور یہ ہوٹ کا چامن بھی مجھے چاہیے ہے

ریلے غضب تھے ظفر اس کے ہوٹ
 وہ شہوت مند میں گھل دیر تک

کھاپے کیا کہ پھل کے انگو
 تھوڑے کھٹے ہیں، تھوڑے کچے ہیں

کھلائیں اس کو اوکاڑے کے امرد
اگر آئے صلاح الدین محمود

چھلکے سے پھسلے ظفر
کھا کر کیلا پیار کا

بیڑ تو آم کا نہیں، لیکن
شاخ پر آم سے لگے ہوئے ہیں

روٹی تھی اس کے تھیلے میں
روٹی پر بھنڈی توری تھی

عربی غاری کا ایم۔ اے ہوں
ساگ کو کہنا چاہتا ہوں سیاغ

جسے کہتے نہیں قبولتے ہیں
شعر ہے وہ سڑا ہوا آلو

کلیں بہ کے کھنڈا
ظفرا یار کریلے

ستویں وار وٹاؤں
پہلی وار کریلے

دی ہیں یہ گاجریں خدا نے
رکھ ہاتھ میں صبح و شام دوبا

ظفر اقبال کے اثرات بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے شاعروں پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی غزل نے اپنے معاصر شعرا اور نقادوں میں شدید غصے اور جھنجھلاہٹ کی کیفیت پیدا کیں۔ میرے خیال میں

کسی بھی اور بجنس شاعر میں اس قسم کی شعری داروات عام طور پر پائی جاتی ہے۔ سنجیدہ شاعروں اور نقادوں نے اس کی شاعری کو نا شاعری قرار دیا۔ یہ رد عمل کی تیز دند شکل تھی۔ مگر اسی دور کے بعض شاعر غزل کے اس نئے کرافٹ سے متاثر ہوئے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے بدترین مخالفین نے بھی اس کے کرافٹ کو سنجیدگی سے ضرور دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے متاثر ہونے والے شعر میں پاکستان سے زیادہ ہندوستان کے شاعر تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان شاعروں کے شعری باطن شاعر کی تبدیلی کے منتظر تھے اور جو ہی یہ تبدیلی ظفر اقبال کی شکل میں نظر آئی یہ لوگ تیزی سے اس کے رستے پر چلتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کی شاعری کو انٹنی غزل بھی کہا گیا اور نئی غزل بھی۔ بہر حال ان شعرا کی غزل نے نئی غزل کے طرز احساس کی روپورے برصغیر میں دوڑا دی۔ انہوں نے روایتی غزل سے انکار کیا۔ غزل کی شعری لغت سے بغاوت کی اور اپنے لیے نئی شعری لغت وضع کی۔ اس غزل نے روزمرہ زندگی کے حادثات، واقعات، مشاہدات اور باطنی دنیا کے آشوب کو دکھانے کے لیے نئے پیرائے اختیار کیے۔ وہ اپنی غزلوں میں غیر روایتی طرز احساس سے کام لیتے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ غزل کی روایتی لغت ان کے نئے تہذیبی، سماجی، اور نفسیاتی تجربات کا اظہار کرنے سے قاصر ہے یہی تبدیلی نئی غزل کی بنیاد بن گئی تھی۔ میں یہاں ان شعرا کا ذکر کروں گا اور ان کے کلام کے منتخب نمونے بھی درج کروں گا جن سے یہ وضاحت ہو سکے گی کہ نئی غزل یا انٹنی غزل کے یہ شاعر کیا کہنا چاہتے تھے:

اک لڑکا تھا اک لڑکی تھی
آگے اللہ کی مرضی تھی
پہلا پھول نکلا تھا دل میں
لہو میں خوشبو دوڑ گئی تھی
پہلا سانس یا تھا سکھ کا
پہلی بار ہوا چلی تھی
اب کیا جانے لیکن پہلے
چاند پہ اک بڑھیا رہتی تھی
یہ بازار کہاں تھا پہلے
یہاں تو پہلے ایک گلی تھی
پانی میں بجلی کا گھر تھا
پتھر میں چنگاری چھپی تھی
(محمد علوی)

خودکلامی کی غزل

گھورتا کیا ہے کہنے کتے
سوگھتا کیا ہے کہنے کتے
چاندنی اوڑھ سو گئی بہتی

جاگتا کیا ہے کہینے کتے
 شب کی خاموشی من سکے تو من
 بھونکتا کیا ہے کہینے کتے
 یہ تو تیری ہی اپنی ہڈی ہے
 چٹا کیا ہے کہینے کتے
 غیر کا فکس آکھنے میں کہاں
 نوچتا کیا ہے کہینے کتے
 تیرے حائے کا تجھ پہ پاؤں پڑا
 کاٹا کیا ہے کہینے کتے
 تیری منزل ہنوز کوسوں دور
 بانپتا کیا ہے کہینے کتے
 سامنا کر تمام دنیا کا
 بھاگتا کیا ہے کہینے کتے
 سوچنے کا کوئی علاج نہیں
 سوچتا کیا ہے کہینے کتے
 دیکھ ساری خدائی چاگ اٹھی
 اونگھتا کیا ہے کہینے کتے
 (عادل منصور)

یہ کہا سکتا ہے کہ ظفر اقبال کی ”گل قباب“ نے غزنو کو شعرا کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ ان کو غم راہی کا راستہ بھی دکھایا اور بہت سے شاعر اس کی غم راہیوں کی زد میں آ گئے۔ غم راہی کا یہ دروازہ پہلی بار ظفر اقبال نے ہی نہیں کھولا تھا اس سے پہلے میر تقی اور راشد بھی جدید شعرا کو اس دروازے کا رستہ دکھا چکے تھے۔ غم راہی کے اس سفر سے خوف زدہ نقادوں اور شاعروں نے راستی کا جو سیدھا راستہ دکھایا تھا اس راستے کے آثار اگر آپ دیکھنا چاہیں تو فرقت کا کوروی کی کتاب ”مداوا“ دیکھ لیجئے۔ ”مداوا“ میں جس چیز کو غم راہی سمجھا گیا تھا وہی راستہ سیدھا راستہ تھا اور فرقت جیسے لوگوں کی راستی کا دروازہ سراسر غم راہی کا دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ بیسویں صدی میں ظفر اقبال نے جو شرارت ”گل قباب“ کی شکل میں کی تھی اس نے غزل کی تھکی ہاری، مضحک اور بانیتی ہوئی روایت کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ غزنو کی تہذیب رسم عاشقی کی روایت تھر تھرا اٹھی تھی۔ بڑی تیزی کے ساتھ کتنے ہی شاعر ظفر اقبال کے سحرانہ حصار میں کھنچے چلے آئے تھے۔ ب حسن و عشق، کوچہ جاناں، وصل و فراق، روایتی تنہائی اور محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے اور خود اذیتی کی سرشاری کی تہذیب تمام ہوتی گئی۔ اور غزل پہلی بار روزمرہ زندگی کے محسوسات، تجربات اور مشاہدات کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ اس حوالے سے غزل کی جو روایت بنی وہ غزل کے مخصوص کلچر سے جنم لینے والی روایت سے بہت مختلف ہوتی چلی گئی۔ محمد علوی، عادل منصور، زریب

غوری، ہانی اور دوسرے کئی شاعر اس روایت کے چرکار ہو گئے۔ یہ اپنی غزل کی روایت تھی جو بیسویں صدی کے دور آخر تک چلتی رہی اور پھر بالآخر یہ اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی۔ اس قسم کی غزل مجھے اکیسویں صدی میں داخل ہوتی تو نظر آتی ہے مگر آثار یہ کہتے ہیں کہ غزل کا یہ قرینہ تھکن کا شکار ہو گیا ہے۔ اور اس کی روایت تیزی سے کم زور ہوتی چلی جائے گی۔

ظفر اقبال پر تخلیقی تھکن کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ قدرت کلام اور پرمگوئی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ چار ضخیم مجموعوں کو جنم دینے کے بعد بھی ان کے تخلیقی سرچشمے تسلسل کے ساتھ اگلے رہتے ہیں۔ مگر ان کی پرمگوئی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ عامیہ اشعار کی بھرمار اور چھوٹے چھوٹے تجربوں کے شعر چھوٹے چھوٹے تخلیقی مظاہر کی صورت میں نظر آ رہے ہیں جن کے سبب شاعری کا معیار بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ وہ ”آپ رواں“ کی شاعری سے بہت دور ہوتے گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اکیسویں صدی میں ان کی شاعری تیزی سے زوال کی طرف جا رہی ہے۔ ”آپ رواں“ اور ”گل قلاب“ بندی کے سفر کی داستان سناتی ہے اور اکیسویں صدی کی یہ شاعری پستی کے سفر کا اظہار کرتی ہے۔

بیسویں صدی کے ریل آخر سے غزل کی ڈی کنسنٹریشن کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک جاری ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ غزل کی مخصوص روایت بہت حد تک نئی شکلوں میں منقلب بھی ہوئی ہے۔ میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ غزل کا یہ رنگ اپنے اندر اور باہر غزل کی انحراد و پود جی، ماتھا جی، غزل کے کلچر تہذیب اور جغرافیہ کو پس منظر میں رکھتے ہوئے نئے شعری تجربہ کو پیش کرتا ہے۔ اس میں غزل کے ماضی کی بازیافت تو ہے مگر تجربہ کے نئے قرینے سے نئی صورت میں داخل رہے ہیں۔ ماضی کی بازیافت کے حوالے سے جدید غزل گوشہ عریض نے عہد کا ادراک کرتے ہیں۔ حاس کی آوازوں میں ماضی کی بازگشتیں بھی سنائی دیتی ہیں اور یوں روایت ایک تخلیقی اظہار میں پنا آپ ظاہر کرتی ہے۔ سرے خیال میں غزل کے یہ رنگ اکیسویں صدی میں اس کے تخلیقی اظہار کی رہبری کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکیسویں صدی کے دورانیے میں غزل اپنے نئے رنگ اختیار کرے گی۔ اس کی نئی شکلیں ماضی کی غزل سے دور ہوتی جائیں گی مگر غزل چاہے جس قدر بھی بدل جائے وہ کسی نہ کسی صورت میں اپنے رنگوں، اپنے کلچر اور اپنی دیومالا کو نئی مدتوں نئے تہذیبوں اور نئے ستاروں کے ذریعے ظاہر کرتی رہے گی۔ غزل کی شعری روایت اتنی گہری ہے کہ اکیسویں صدی کے ناجائز آشوب و ادات کے بحران کے ظہار کے لیے اپنی وراثت سے رجوع کرتی رہے گی۔ بیسویں صدی کی غزل نے اپنی غزل یا ظفر اقبال کی مینا غزل کے شدید جھٹکے اپنی روایت کے shock absorbers کی مدد سے برداشت کیے ہیں۔ میں یہاں بیسویں صدی کے آخری دور اور اکیسویں صدی کے آغاز میں جنم لینے والی غزل کے کچھ نمونے یہاں پیش کروں گا۔ میری رائے میں اکیسویں صدی کی غزل کم و بیش ان ہی نمونوں سے ملے جلتے طرز احساس اور اسالیب کو پیش کرتی رہے گی۔

غزل کے نئے رجحان یا نئے رویے اور قرینہ کی بات یہ بنتی ہے کہ نئی غزل کا شاعر یہ محسوس کرتا ہے کہ سماجیات کا عمل بدل چکا ہے۔ جب سماجیات کا عمل بدلا ہے تو تبدیلیوں کا ایک نیا سلسلہ وجود میں آ گیا ہے۔ طرز احساس بدلا ہے۔ ادراک کی نئی سطح سامنے آئی ہے۔ مظہریات کو دیکھنے والی آنکھ نئے زاویوں سے دیکھ رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ لفظ کے استعمال کا طریقہ بدلا ہے۔ نئی سیاق مندی یہ ہے کہ لفظ کے مقبول اور تسلیم شدہ تہذیبوں، طے شدہ راہوں، ظہار کے بنے بنائے معنوں اور لفظ سے برآمد ہونے والی معنویت کی مقرر شدہ شکلوں کی نفی کی جائے۔ نئی غزل کا شاعر ان کلشز (Cliches) کو توڑ کر کسی نئی معنویت کو ظہور میں لاسکتا ہے۔ غزل کے وہ شاعر جو یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ میں ان کو نئی

غزل کا شاعر کہتا ہوں اور یہی غزل بیسویں صدی کے رستے پر ہمیں نظر آتی ہے۔ اور ہماری انگلی پکڑ کر ہمارا تعارف ان شعرا سے کراتی ہے۔

علی بن متقی رویا
وہی چپ تھا وہی رویا
عجب آشوب عرفاں میں
فدا گم تھی کہ جی رویا
یقین مسماں موسم کا
کھنڈر خود سے تہی رویا
اذاں زینہ اتر آئی
سکوت باطنی رویا
خلا ہر ذات کے اندر
منا جس نے وہی رویا
ندی پانی بہت روئی
عقیدہ روشنی رویا
سحر دم کون روتا ہے
علی بن متقی رویا
(بانی)

اشک دامن میں بھرے خواب کمر پر رکھا
بھر قدم ہم نے تری راہ گزر پر رکھا
چلتے چلتے جو تھکے پاؤں تو ہم بیٹھ گئے
نیند گنہری پہ دھری خواب شجر پر رکھا
جانے کس دم نکل آئے ترے رخسار کی دھوپ
مدتوں دھیان ترے سایہ در پر رکھا
جاتے موسم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا مشتاق
رہ گیا ساغر گل سبز تر پر رکھا
(احمد مشتاق)

پانی میں عکس اور کسی آسمان کا ہے
یہ ناؤ کون سی ہے یہ دریا کہاں کا ہے
دیوار پر کھلے ہیں نئے موسموں کے پھول

سایہ زمین پر کسی پچھنے مکان کا ہے
 چاروں طرف ہیں سبز سلاخیں بہار کی
 جن میں گھر ہوا کوئی موسم خراں کا ہے
 سب کچھ بدل گیا ہے تو آسمان مگر
 بدل وہی ہیں رنگ وہی آسمان کا ہے
 دل میں خیال شہر تمنا تھا جس جگہ
 واں اب مل اک سفر رانیاں کا ہے
 (احمد شاق)

حصہ ہوش میں خوابوں کے در رکھے گئے ہیں
 کوئی رستہ نہیں ہے اور سفر رکھے گئے ہیں
 بستی دھوپ آگن میں سٹ گر ہو رہی ہے
 ہوا کے دوش پہ بیڑوں کے سر رکھے گئے ہیں
 ازل سے بھاگتا ہوں اپنے ہی سائے کے پیچھے
 تعقب میں مرے شام و سحر رکھے گئے ہیں
 چڑھا ہے دن نکل آئے ہیں بازاروں میں سائے
 مگر جو جسم تھے سارے وہ گھر رکھے گئے ہیں
 چٹا ہے ریزہ ریزہ ہم نے اپنی خواہشوں کو
 یہ ٹوٹے آئینے تھے جوڑ کر رکھے گئے ہیں
 (سرمد صہبائی)

بھرے پرے ہوئے سب باغ و باغ تھے اس دن
 گلی میں پھول، گھروں میں چراغ تھے اس دن
 اڑا لیا تھا کسی نے خمار آنکھوں میں
 تھی صبا گل سے ایسا تھے اس دن
 شکستہ حال پڑا تھا میں اپنے بستر پر
 کھلے ہوئے بھی رنگ فراغ تھے اس دن
 کہیں لباس بدلتے ہوئے ستارے تھے
 کہیں نکلتے ہوئے خانہ باغ تھے اس دن

ہمیں وہ ڈھونڈ نہ پایا تھا رات بھر ساجد
کہ ہم اسی کی طرح بے سراغ تھے اسی دن
(غلام حسین ساجد)

ان اونچی سرخ فصیلوں کا دروازہ کس پر وا ہو گا
گھوڑے کی باگیں تھامے ہوئے شہزادہ سوچ رہا ہو گا
دو رویہ گلاب کے پودوں پر رنگوں کی بہار بجی ہو گی
پتھر کی کالی میٹھیوں پر اک دیا ابھی جلتا ہو گا
مٹی کے نقش پیاووں پر صدیوں کی گرد جھی ہو گی
اُڑ جانے والے پرندے کا پنجرہ کیسا لگتا ہو گا
اُڑتے بالوں کی اوٹ کیے، ہاتھوں میں زرد چراغ لیے
اسی ٹھنڈے فرش کے صحرا پر کوئی ننگے پیر چلا ہو گا
خاموش چراگاہوں کے لیے کوئی بادل ایسا گیت لکھوں
انہی دھوپ بھرے میدانوں میں کہیں بھیڑوں کا گلہ ہو گا
(ثروت حسین)

مکاں کی چار دیواری سے باہر قرطبہ تھا
اب کی رات تھی اور اس کے اندر قرطبہ تھا
میں دیوار نقاشوں ہنر مندوں کے سر تھے
پھر اک در تھا لہو کا اور میں در قرطبہ تھا
کنوؤں میں زہر تھا، گھوڑے سواروں سے الگ تھے
دریدہ شال اوڑھے، خاک بر سر قرطبہ تھا
(عبدالطہ راجح)

میں نے کہا تھا: آج نہ جائیں، گھوڑے بے حد تھکے ہوئے ہیں
اس نے کہا تھا: جانا طے ہے، دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں
میں نے کہا تھا: دائیں طرف کی گھاٹی میں ہم چھپ جاتے ہیں
اس نے کہا تھا: ناممکن ہے، تیروں میں ہم گھرے ہوئے ہیں
میں نے کہا تھا: غار میں کانٹیں بھرت رُت کی پہلی راتیں
اس نے کہا تھا: اس کے بلوں میں سانپ اور بچھو چھپے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا: پیاس کے مارے کالی رویت پر مر جائیں گے
 اس نے کہا تھا: ٹھیک ہے لیکن، دو مشکیزے بھرے ہوئے ہیں
 میں نے کہا تھا: اس سے آگے چھپنے کی کیا صورت ہوگی؟
 اس نے کہا تھا: ڈرتے کیوں ہو؟ آگے تلے بنے ہوئے ہیں
 (معین نظامی)

خفہ اقبال اور انجی غزل کی روایت کے متوازی ۲۰ صدی کے آخر میں غزل کی یہ روایت بھی خاموشی سے پنا
 سفر شروع کرنے لگی تھی۔ یہ جدید غزل کی دو متوازن روایت تھی جس نے غزل کے پرانے کلچر، پرانی دیو ما، تہذیب و رسم
 عاشقی و رے کدہ کی روایات کو یک طرفہ رکھ دیا تھا اور دور حاضر کے تہذیبی اور سماجی تجربہ کو بنیاد بنا کر اپنے منفرد شعری
 اظہار کو دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان لوگوں نے غزل کی روایت کو یکسر رد نہیں کیا تھا۔ ان کے فہم و ران کے تہذیبی
 شعور میں یہ روایت ایک نئی صورت میں ظہور پذیر ہوئی تھی۔ ان کے ہاں زندگی کے مراحل میں پیش آنے والی و رواتیں
 ایک نئے طرز احساس کا اظہار کرتی تھیں۔ انہوں نے شعری لغت کی پرانی تفہیم اور غزلوں کے مخصوص تلازموں کو رد کر کے
 اپنی غزل کے لیے نئے شعری باطن کی تخلیق کی تھی۔ ان کے فن کی خوب صورتی یہ ہے کہ نئے طرز احساس کے پس منظر میں
 بڑی خاموشی کے ساتھ غزل کی کلاسیکی روایت کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ کلاسیکی منظر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ غزل کا
 جغرافیہ بھی نظر آتا ہے۔ غزل کی جمالیات کا عکس بھی جھلکتا ہے اور غزل کی مخصوص تہذیبی شائستگی بھی اپنے آثار کے ساتھ
 ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ان شعرا میں کہیں کہیں نئی نظم کے اثرات بھی ابھرتے تھے۔ نئی شعری لغت میں نئی نظم واضح طور پر اپنے
 آپ دکھاتی تھی۔ وہ غزل گو جنہوں نے غزل کی اس نئی روایت کو فروغ دیا۔ ان میں احمد مشتاق، جاوید شاہین، سلیم شاہد،
 ندیم حسین، ساجد، سرمد صہبائی، ثروت حسین، محمد اظہار الحق اور دوسرے بہت سے شعرا شامل ہیں۔

میری نظر میں اکیسویں صدی میں غزل کی مذکورہ روایت مقبول رہے گی۔ صورت حال کچھ بھی ہو غزل کو نئے
 تجربات کے جھٹکے ضرور برداشت کرنے پڑیں گے، جیسا کہ ۱۹۷۰ سے پہلے اور اس کے بعد ہوا تھا۔ مگر مجموعی طور پر غزل اپنی
 تہذیبی روایت کے عکس سے آزد نہ ہو سکے گی وہ جدید تر موضوعات کا اظہار بھی کرے گی وہ انسانی زندگی کے چچ در چچ اور
 گنگلک مسائل کو بھی بیان کرے گی مگر کلاسیکی روایت کے عکس پس منظر میں ضرور دیکھے جاسکیں گے۔ یہ غزل اپنے ماضی کی
 غزل سے مختلف ہوتی جائے گی مگر ماضی سے تسرکاری نہ ہوگی۔ غزل کی تکنیک میں ماضی کسی نہ کسی شکل میں، ہمارنگ دکھاتا
 رہے گا۔ دراصل غزل مکمل طور پر ماضی کے ذائقے سے محروم ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

(اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کے سینار اردو ادب اکیسویں صدی میں پڑھا گیا، مئی ۲۰۱۴ء)



یگانہ کی مثالی انا: ایک تجزیہ

ڈاکٹر نجیب جمال

ستراط اپنے آپ کو بڑبکھی (GADFLY) کہہ کرتا تھا اس کے خیال میں ہر سوسائٹی میں بڑبکھی کو زی طور پر ہونا چاہیے جو لوگوں کو مسلسل کاٹی رہے اور انہیں اپنی کمزوریوں، بکجیوں اور کوتاہیوں کا احساس دلا کر اپنے گریبان میں بھانکنے اور غور و فکر پر مجبور کرتی رہے وہ اپنے دشمنوں سے بھی کہا کرتا تھا کہ ”کسی شخص کو اختلاف رائے یا تنقید کے الزام میں قتل کر دینے سے کوئی سیاسی، یا معاشرتی عقدہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ (۱)

یگانہ کی شخصیت، کردار اور ان کے خارجی، حول کو سمجھنے میں ستراط کا قول بنیادی اشارہ فراہم کرتا ہے یہ امر واقع ہے کہ فن کار اپنی ذات کا بھرم قائم رکھنے کی سعی کرتا ہے اور اس حوالے سے اپنی انفرادیت کو چمکاتا ہے۔ یگانہ کا مزاج بھی لڑکپن ہی سے ایک خاص سانچے میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یگانہ ہی کے لفظوں میں ”غلامانہ ذہنیت سے میری طبیعت ہمیشہ نفرت کرتی رہی ہے جب سے میں نے ہوش سنبھال ہے مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی غلامانہ ذہنیت کا مجھ پر غلبہ ہوا ہو یا کسی کے آگے جھکنے کا میلان پایا گیا ہو۔“ (۲)

یگانہ کے بیان اور ان کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آخر عمر تک اپنی ’انا‘ کی پرورش کی اور بزرگم خود ان کا ذاتی جوہر چمکاتا گیا۔ خود ستراٹھی کا یہی وہ احساس ہے جس کی بہتات کبھی کبھی تاریک رہوں میں مارے جانے کا سبب بنتی ہے۔ یگانہ کا فلسفہ، خود فضیلت اگرچہ اپنی ایک تاویل رکھتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے خود ساختہ فلسفے کی روشنی میں ان کی شخصیت کا مطالعہ خود ان کی شخصیت کو مسخ کر سکتا ہے۔ یگانہ کو بجا طور پر جاننے کے لیے ان کی شخصیت کا مطالعہ ان کے سب سے پہلے میں موجود ”جرات گشتار اور ہمت کردار“ سے ہونا چاہیے۔ یگانہ کی زندگی کے حالات و واقعات سے پتا چلتا ہے کہ اختلاف رائے کو اپنا حق سمجھ کر محفوظ رکھتے تھے درجوبات ان کے دل و نظر پر چڑھ کر کھری رہتی تھی وہ اسے برملا کہنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے شاید اسی لیے اپنے لہجے کی تندگی کی وجہ سے انہوں نے ہمیشہ خسارے کا سودا کیا اور انہیں اختلاف رائے کے جرم میں اپنی زندگی میں کئی بار قتل ہونا پڑا تاہم وہ زندگی سے بھگے واووں میں سے نہیں تھے۔ ان کی طبیعت میں پیکار کا جوہر تھا اور وہ ستراط کی بڑبکھی کی طرح تنگ نظری اور تعصبات کی چست قبا پہننے والوں کو برا بر کاٹتے رہے۔ یگانہ کا ایک شعر ہے

علاج اہل ہوں زہر خند مردانہ

ہلسی ہلسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا

اپنے اس رویے کی وجہ سے وہ انتہا رحسین کے لفظوں میں ”فرقہ دہمتیہ“ کے آدمی نظر آتے ہیں“ (۳) یگانہ کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ زمانے سے ان کی بارمانے کی ان سے نیچے نہیں سکی درس کی بنیادی وجہ ان کے خیال میں یہ تھی کہ انہیں تمام عمر ایسے ”ناموافق و نامساعد حالات“ کا سامنا رہا جن میں زندگی کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ یگانہ کا ایک دکھ یہ بھی تھا کہ وہ زمانے کے ہاتھوں بری طرح نظر انداز کیے گئے تھے۔ ایک وقت میں تو عدم

قبولیت و رعام مدت نے انہیں بے توازن بھی کر دیا تھا اور وہ اپنے تئیں 'خاصہ خاصان ادب' لکھنے لگے تھے۔ تاہم یہ بھی درست ہے کہ یگانہ مستقبل کو ایک ایسی کسوٹی سمجھتے تھے جس پر وہ دوران کافن کسا جائے گا۔ اپنا کریکٹر کے تحت انہوں نے تفصیل سے اپنے خیارات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں شاعرا اپنے زمانے سے بہت پہلے پیدا ہوتا ہے اور مخالف ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے اس لیے مشکلوں کا شکار رہتا ہے۔ اس کا رمانہ تو بہت دنوں بعد آتا ہے۔

یگانہ کی شخصیت کا مطالعہ دراصل ایک مضطرب و ربے چین روح کا مطالعہ ہے۔ ان کی زندگی میں اُردو نیت اور فرخی کا ایک محد تلاش کیا جائے تو ایسی ہوتی ہے۔ ابتدا میں وہ علاج کی غرض سے اور پھر تلاش معاش کے سلسلے میں عظیم آباد سے لکھنؤ آئے۔ یہاں کار جہاں دراز تھا اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ یگانہ لکھنؤ والوں کی اجتماعی نفسیات سے آگاہ نہیں تھے۔ درحقیقت لکھنؤ کے لوگ باہر سے آنے والوں کے لیے اپنے اندر کشادگی نہیں رکھتے تھے۔ لکھنؤ آنے کے بعد یگانہ بالا اہتمام مشغروں میں شریک ہونے لگے مگر انہیں متوقع پذیرائی نہ مل سکی۔ یہاں انہیں معروضات کی نئی نئی اشکال کا دراک ہونے لگا۔ لکھنؤ میں قیام کے آغاز ہی سے نظر انداز کیے جانے کی حکمت عملی کا شکار ہو کر ان کی شعری صلاحیتیں تصادف اور تصادم کی فضا میں پروان چڑھنے لگیں۔ مغل ہونے کے ناتے سے کسی کے گے سر نہ جھکانا ان کا طبعی خاصہ تھا۔ نتیجہ یہ ہو کہ یگانہ اور شعرائے لکھنؤ کے درمیان اجنبیت اور مغائرت کی دیوار اٹھ گئی جو رفتہ رفتہ بند ہوتی گئی۔ اوریوں ادبی اختلاف نے بتدریج ذاتی کشیدگی اور تنازعے کی صورت اختیار کر لی۔

یگانہ جس طرح لکھنؤ کے بااثر علمی و ادبی حلقے سے الگ کر دیے گئے تھے اس نے ان کی انا پسند طبیعت میں جولانی پیدا کر دی اور وہ انتہا پسند ہوتے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر یکے بعد دیگرے محاذ کھتے چلے گئے۔ یگانہ اکیلے ہونے کے باوجود ہر محاذ پر ڈٹے رہے اور اس کے رویے میں شدت آتی چلی گئی تاہم یہ شدت شعرائے لکھنؤ کے اجتماعی رویے کے سامنے بے حد معمولی معلوم ہوتی ہے۔ اسی اجتماعی یلغار نے ایک صاحب مطالعہ شخص کی تنقیدی صلاحیتوں کو دبا کر اس کے ہاتھ میں کند، ہتھیار تھما دیا تھا جس نے اس کے انتقامی رویے کو بے بسی کا عبرت انگیز تراشہ بنا دیا۔ تاہم غنیمت ہو کہ یگانہ کے اندر جھنے والا ارؤ ان کے شعر میں "آتش سیال" بن گیا۔

یہ درست ہے کہ نقادوں نے جو یک طرفہ اور جانبدارانہ رویہ یگانہ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں روار کھا اس کی ذمہ داری خود یگانہ پر بھی عاید ہوتی ہے تاہم لکھنؤ کی سوسائٹی کے اخلاقی اور شعری معیاروں کو بھی دیکھنا چاہیے کہ جس کے اوزان کچھ اس طرح ترتیب دیئے گئے تھے کہ اس میں ترمیم کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی تھی، کجایہ نہ کوئی باہر سے آکر ان معیاروں میں تبدیلی کی جسارت کرے۔ یگانہ کا قصور بھی یہی تھا کہ ان کی ذات پورے سماج کے مقابل آگئی تھی۔ ان کا سامنا ایک نرگسی سماج سے تھا لکھنؤ کی ادبی اور ثقافتی فضا پر لکھنؤ کے شعرا کا تسلط تھا اور اس پر یگانہ پر بہاری ہونے کا شبہ لگا ہوا تھا۔ شعرائے لکھنؤ کو زبان کے معاملے میں کسی اور معیار کی لسانی سند کی ضرورت نہیں تھی پھر بھلا یگانہ کون ہوتے تھے زبان کی غلطیوں کا شمار کرنے والے اور عرض و قواعد کی گرداں کرنے والے چنانچہ ان کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ بن گیا۔ یگانہ تو پہلے ہی اپنی افتاد طبع کے تابع تھے۔ ان کے مزاج میں جھکنے کا عنصر سرے سے ہی ناپید تھا یوں ان کی ذات میں انا کے جوہر کا ارتقاع ہو جس نے رفتہ رفتہ خود پسندی اور خود ستائشی کی راہ اختیار کی اور انہیں اظہار فضیلت پر کسایا۔ یگانہ کی بڑھی ہوئی مانیت دراصل "مثالی تا" (EGO IDEAL) کی ایک شکل تھی جس کے بارے میں فرائیڈ نے لکھا ہے۔

"A man when he can not be satisfied with his ego itself may nevertheless be able to find

satisfaction in the ego ideal which has been
deferentiated out of the ego" (4)

یگانہ کے یہاں الفت ذات کا پہلو تعلق کی حد سے بھی کچھ بڑھا ہوا دکھائی دیتا ہے تو اس کا سبب ان کے معاشی حالات، سماجی تحریکات (TABOOS)، حریقوں سے لڑائی، ناقدری زمانہ، زعم فن، زبان دانی پر فخر اور تقاضہ فطرت ہے جو شخصیت اور ان کی نشوونما میں عمل انگیز (CATALYST) کا کام کرتے ہیں۔

لکھنؤ کی پوری تہذیب ہی نرگسی تہذیب تھی جس کی تشکیل میں سماجی، اقتصادی، تاریخی، نفسی و جنسی نوعیت کے بہت سے عوامل کارفرما تھے اور شاید یہ برصغیر کا اکلوتا سماج تھا جو اجتماعی طور پر خود نگر تھا۔ یوں جب ایک انسانیت پسند شخص نے ایک نرگسی سماج کے دامن کو حریفانہ کھینچنا تو پورے ماحول میں رتھاش پیدا ہو گیا۔

یگانہ اس امید کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے کہ یہاں روزگار کے مواقع بھی زیادہ تھے اور شعرواد کا میدان بھی کشادہ تھا مگر جب وہ مشاعروں میں شریک ہوئے، ورکلام سنا یا تو دادر سے زیادہ سب دادر پائی۔ ضیا عظیم آبادی کے شغلوں میں،

”مذاقی اڑانے والوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ صحیح قدر دین بھی گم ہو گئے، ان کا اعتماد متزلزل ہو گیا اور

سچی سے بھی ان کے شعر کی کوئی دودھ دیتا تو وہ مشکوک ہو جاتے تھے یا یہ سوچنے لگتے تھے کہ اتنا باغ

نظر بھی کوئی ہے۔“ (۵)

یوں یگانہ کے اندر شعور، احساس اور جہت کی کشش نے رفتہ رفتہ اتنا زور پکڑا کہ ایک وقت میں تو (گو یہ وقت بہت بعد میں آیا) ایمین اور اقدار کی عمارت بھی ڈھیر ہو گئی۔ یگانہ کو اپنے رویے اور اپنے تصورات کے پرچار کی قیمت بے روزگاری، معاشی تنگ دستی اور تنہا رہ جانے کی صورت میں ادا کرنا پڑی اور یوں ان کی ذات سماجی ہنگام اور اجتماعی مضرت کی بھیئت چڑھ گئی جس کے رد عمل میں ان کی ذات میں موجود خود پرستی کے رجحانات قدم قدم پر دوسروں کی نزکیت سے متصادم ہوتے رہے۔ بعد میں جس طرح یگانہ ظہار فضیلت کرتے رہے وہ سب دراصل ان کے حالات کار و عمل اور ان کی مزاحمت کا ایک انداز تھا۔ جس میں غیر ضروری شدت پیدا ہوتی چلی گئی تھی۔

ڈاکٹر اوزیر آغا کا یہ تجربہ درست ہے کہ:

”کسی حساس کتری کے تحت یگانہ تحفظ ذات کے عمل میں مبتلا ہوا اور اس نے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔“ (۶)

یگانہ کی خود نمائی کی سب سے واضح مثال آیات وجدانی کے محاضرات میں جنہیں یگانہ نے مرزا مراد بیگ شیرازی کے بھیس میں لکھا۔ متوقع طور پر محاضرات پر سخت رد عمل ظاہر ہوا۔ یہاں تک کہ یگانہ کے بعض مداحوں نے بھی اس بد مذاقی کا نوٹس لیا۔ ”نیرنگ خیال، ہور کا تبصرہ لکھتا ہے۔“ ”ہیں بار بار افسوس آتا ہے کہ یہ محاضرات یاس کے پاکیزہ کلام پر دھبہ لگا رہے ہیں اور اس طرح آیات وجدانی کا نقاد کتاب کے بیشتر حصہ کو برا کہہ کر مجبوراً یاس پر حرف گیری کرنے کا مجرم بنتا ہے۔“ (۷)

یگانہ کے قدردان تو موجود تھے مگر یگانہ نے جس طرح اپنی شاعری کو محی ضرات کے فریم میں جڑنے کی کوشش کی اس نے مذاق سلیم کو بری طرح متاثر کیا تاہم جب ان کے عزیز دوست مالک رام نے یگانہ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو یگانہ نے جواب دیا ”آئندہ ایڈیشن میں اسے حذف کرا دوں گا۔“ (۸)

چنانچہ جب ۱۹۳۳ء میں یگانہ نے آیات وجدانی کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو محی ضرات حذف کر دیئے اس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ یگانہ کلی طور پر غیر چمکدار رویہ کے حامل نہیں تھے بد قسمتی سے ان کی خاطر خواہ پذیرائی کرنے والے بہت کم لوگ تھے اتنے کم کہ چہرے پہنچانے کے لیے انہیں لائٹس کی ضرورت پیش آتی تھی۔ (۹)

شعرا نے لکھنؤ کے محاسمانہ رویے نے ہی یاس عظیم آبادی کو یگانہ لکھنؤی بنا دیا تھا۔ ویسے بھی 'یاس' ہونا ان کے اوصاف ظاہری و باطنی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کی خود پرستی نے 'خطبہ عظمت' کا روپ دھاریا ورا نہوں نے پنا سلسلہ نسب چنگیز خاں سے جوڑ کر مزاج میں مقدور بھر چنگیزیت کو شامل کر لیا۔ ۹۳۳ میں یگانہ نے 'ترانہ شائع کیا تو اس کے آخر میں انہوں نے 'مراجیہ' کے عنوان سے چند باعین شامل کیس جن میں غالب کی جھوکی گئی تھی دراصل انہوں نے اپنے "حول کے مکروہات و خرافات سے ٹکر لینے کے لیے اپنی داخلی آویزشوں کو مرتفع کر کے غالب پر مرکوز کر دیا تھا ورنہ ان کا یہ غالب اسد اللہ خاں غالب نہ ہو کر ایک مجموعی نام تھا ان کے حریفوں کا۔" (۱۰)

ان رہا عیوں کے رد عمل میں یگانہ کی مخالفت لکھنؤ تک محدود نہ رہی بلکہ اطراف ہندوستان میں پھیل گئی۔ ۱۹۳۴ میں ساقی دہلی کے اپریل اور مئی کے شماروں میں یگانہ کے خد ف مضامین، خطوط اور کارٹون شائع کیے گئے جس کے نتیجے میں وہ 'یگانہ چنگیزی' سے 'غالب شکن' بن بیٹھے مگر پھر آہستہ آہستہ یہ طوفان بھی تھم گیا اور جب یگانہ نے آیات و جدائی کا تیسرا ایڈیشن (۱۹۴۶) شائع کیا تو اس میں شامل محاضرات کا لب و لہجہ نسبتاً دھیمہ اور مستعد تھا خصوصاً غالب کے بارے میں وہ شدت باقی نہیں رہی تھی جو آیات و جدائی، طبع اول کے محاضرات 'غالب شکن'، طبع اول اور 'غالب شکن' دو آتشہ میں تھی۔ اس عرصے میں وہ پنجاب میں فروغ پانے والی آزاد نظم کے خد ف برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ غالب کی مثل کا داخل دفتر کیا جانا (۱۱) یگانہ کی ذہنی فعالیت کی دلیل ہے۔

یگانہ کے بارے میں شاید سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ غالب کے سخت دشمن تھے۔ یہ درست ہے کہ ایک زمانے میں اس کی ہر بات غالب کی تنقید سے شروع ہوتی تھی اور اسی پر تان نوختی تھی مگر ن کا یہ رویہ مستقل نہیں تھا محض حالات کا رد عمل تھا۔ یہ حالات ہی تھے جو ہمیشہ ان کے لیے ناموفق رہے اور وہ اپنے زخم سہلاتے سہلاتے اذیت پسند ہو گئے تھے تاہم وہ طبیعتاً ایذا پسند نہیں تھے۔ وہ "اپنی ذات کا چراغ جلانے ہوئے اس کی مدہم روشنی میں اپنے آپ کو پوچھ رہے تھے۔" (۱۲)

اسی رویے نے ان کی خود پسندی کو بڑھا دیا اور انہوں نے صوفی کی طرح اپنی خودی کو مٹانے کے بجائے اپنے آپ کو 'دی آرچ آرٹسٹ آف انڈیا'، ابوالمعالی، امام الغزل اور علیہا السلام سمجھنا شروع کر دیا۔

یگانہ کی 'انفرادی انا' کی انتہائی صورت ان کی چنگیزیت تھی جو ان کے راستے کا بھری پتھر ثابت ہوئی اور جس کے سبب انہوں نے اپنے آپ کو مٹانے کا خود ہی بندوبست کر لیا تھا تاہم یگانہ مٹنے اور مرنے میں تیار قائم کر کے زمانے کے جبر اور اپنے اختیار کا تقابل کرتے رہے:

زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

خود ان کی اپنے بارے میں یہ رائے رہی کہ "اپنے تئیں (مگر انہیں) مٹانا میرزا یگانہ کی پرانی عادت ہے۔ وہ دنوں ہاتھوں سے اپنے تئیں مٹاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کہاں تک مٹتے ہیں۔" (۱۳) یگانہ مٹنے کا ذکر بھی دم ختم کے ساتھ کرتے ہیں ان کے جسم میں طاقت نہ سہی لفظوں میں طاقت ضرور ہے۔ خود یگانہ کا لفظ چہرہ نما ہے جس میں شخصیت (PERSONA) بھی موجود ہے اور برتاؤ (BEHAVIOUR) بھی۔

یگانہ کی بیگانہ روی کا بھی بہت چرچا ہے خود یگانہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے
شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا داندہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی
ڈاکٹر فخر حسین نے یگانہ کی بیگانہ روی کا تجزیہ کرتے ہوئے درج ذیل محرکات کا ذکر کیا ہے۔

(۱) سخت مزاجی کے باعث اپنے ماحول سے منسلک نہ ہونا۔

(۲) اس کے پائیدار طبیعت میں سنجائی کا عود کر آنا۔

(۳) یوں مجموعی طور پر جھنجھلاہٹ بلکہ چار حاضریہ رجحان کا ابھر آنا۔

ڈاکٹر فخر حسین کے مطابق انہوں نے بارہ سال کی عمر میں آیات وجدانی کو پڑھا تھا۔ اس وقت تو بہت سے
طوفان ساحل سے ٹکرا کر ٹھنڈے پڑ چکے تھے یگانہ حیدر آباد چلے گئے تھے لکھنؤ میں ان کی آمد سے لے کر اودھ اخبار کی
ملازمت سے برطرفی تک اور پھر تلاش معاش میں گنگر پھر نے تک کشمکش اور تباہی کی ایک طویل کہانی ہے۔ ڈاکٹر فخر حسین
کا یہ کہنا بھی حالات و واقعات سے ناواقفیت کی بنا پر ہے کہ ”یگانہ تو اپنی ناراضی کا اظہار برملا کرتے رہے جب کہ لکھنؤ کے
شعرا اپنی بےزاری کا اظہار انہیں نظر انداز کر گئے دیتے رہے۔“ (۱۵)

راقم کے خیال میں ڈاکٹر فخر حسین مشاعروں میں یگانہ کے بارے میں پڑھی جانے والی، بھڑوں اور لکھنؤ میں
منعقد ہونے والے مشاعروں میں یگانہ کے مقاطعے اور عمر کے آخری حصے میں سر بازار رسوا ہونے کے ذہنی اثرات سے
واقف ہوتے تو ان کا تجزیہ مختلف ہوتا اور انہیں یہ اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہ آتی کہ یگانہ کے لیے لکھنؤ، محلہ شاہ تنخ اور
بعد میں ٹاپے والی گلی (سردار بہادر روڈ) میں کیوں سمٹ کر محبوس ہو گیا تھا۔ نظیر صدیقی یگانہ کو پیش آنے والے تمام حالات
و واقعات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

”تعصب اور حسد کی ساری قوتیں ان کے خلاف صف آرا تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ
انہیں اپنی جگر کاویوں کے صلے میں تعریف و تحسین کے بجائے قدم قدم پر تضحیک و توہین کا سامنا
کرنا پڑا۔ انہیں جیل خانے بھجوانے کی کوشش کی گئی ان کے ذریعہ معاش پر محبوس کیا گیا جو کامیاب
رہا۔ ان کے داندہ میں کو منظوم گایاں دی گئیں۔ ان کے قدردانوں پر آوازے کسے گئے۔ مہذب
مخفوں میں ان کے سامنے ان کی جو پڑھی گئی اور بقول راوی پڑھنے والے نے کڑک کڑک کر جھو
پڑھی اور سننے والوں نے لہک لہک کے داد دی۔ مشاعروں میں ان کا بائیکاٹ کیا گیا یہ سب کچھ
لکھنؤ میں ہو جو تہذیب و شناسائی کا مرکز رہا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ لکھنؤ کے شیخ پر یگانہ کی توہین و
تذلیل کا ڈراما ہوتا رہا بلکہ اس ڈرامے کو وہاں کے سنجیدہ اور بااثر حضرات خاموش تماشائی کی
حیثیت سے دیکھتے رہے اور اس وقت بھی دیکھتے رہے جب یہ ڈراما اپنے نقطہ عروج پر پہنچا یعنی
یگانہ کو اس کی زندگی کے آخری دور میں جوتوں کا ہار پہنا کر اور ان کے منہ پر کاٹک لگا کر شہر میں ان کا
جلوس نکالا گیا۔“ (۱۶)

یگانہ دنیا کی دھنم طرازیوں کو ہنسی سے اڑا دینے کے فن سے ناواقف، چھل اور حس مزاج سے بہت حد تک نا آشنا
تھے نتیجہ ظاہر ہے کہ غم و غصے کی نئی نہ صرف ان کے ذہن تک پہنچی بلکہ رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ یگانہ کا ایک شعر ہے۔
شریت کا گھونٹ جان کے پیچے ہیں خون دل غم کھاتے کھاتے منہ کا مزہ تک بگڑ گیا

تاہم باوجود اس رویے کے ان کے یہاں زندگی سے بے رغبتی، نفرت یا مرگ پسندی کا رجحان پیدا نہیں ہوا بلکہ چینی کی اُمنگ نے اُن سے ایسے اشعار کہلاوائے جو تشکیک کے بجائے زندگی پر ان کے یقین اور عقائد کے مظہر ہیں۔ ان اشعار میں ان کی وہی مردانہ شخصیت غائب ہے جو عزم اور پامردی جیسے عناصر رکھتی ہے اور جس کے بارے میں ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

"The foremost quality of his mind is strength
Firm, resolute, even stubborn and unbending in
life, he is no less so in poetry." (۱۷)

چند اشعار دیکھیے

دین سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں
غضب کی دھوم شہستان روزگار میں ہے
منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے
چپے چپو جہاں لے جائے دلولہ دل کا
واللہ کیا کشش ہے اس اجڑے دیار میں
کشش بد کی تماشائے ناگوار میں ہے
شور جس سے دل نہ رہا اختیار میں
دلیل راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا
ان اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یگانہ دنیا کو لائق تمنا، ورشایون آرزو سمجھتے تھے۔ وہ طبعاً تنہائی پسند یا مردم بے زار نہیں تھے البتہ مروجہ گزیرہ ضرور تھے۔ تنہائی کا عذاب بھی اسی سبب سے تھا چنانچہ زندگی کے بارے میں ان کے طنز آمیز یا تمسخر آمیز رویے کے پیچھے حالات کے ڈسے ہوئے ایک فرد کی سوچ متی ہے جسے عام طور پر ان کے غم و غصے کے اظہار پر محمول کیا جاتا ہے مثال کے طور پر ان کے ایسے اشعار:

انوکھی معرفت اندھوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے
خدا کے سامنے دامن پہارنے والے
حقیقت تھی جو کل تک آج باطل ہوتی جاتی ہے
وہ ہاتھ تھک گئے کیا مال مارنے والے
یہ واقعہ ہے کہ شاعری میں نسبتاً کھرے، غیر حفر، نہ اندر کسی قدر تلخ لہجے کے باوجود یگانہ ایک مخصوص لحن رکھتے تھے حامد علی خاں نے "نثر یا س" (صفحہ ۷) کے دیباچے میں، مجنوں گور کھپوری نے "غزل سرا" (صفحہ ۶۷) میں، مالک رام نے "وہ صورتیں الہی" (صفحہ ۱۴۰-۱۴۱) میں، مرزا جعفر حسین نے "ادبیات و شخصیات" (صفحہ ۹-۹۱) میں، صبا کبر آبادی نے "تخلیقی ادب" (۴)، (صفحہ ۲۴۳) میں اور رم لعل نے خبرنامہ اتر پردیش اردو اکادمی بابت ماہ جنوری فروری ۱۹۸۵ء (صفحہ ۱۳) میں یگانہ کے مترنم لحن اور ن کی ایک ایک، دا اور ایک انوٹ کی تفصیلات درج کی ہیں۔ مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں "اس کا انداز یہ تھا کہ وہ خود وجد میں آ کر لحن سے اپنی غزل سناتے تھے۔ ان کی آواز میں گد ز تھا اور ایک مخصوص دھیمی گرج کے ساتھ فطری ترنم تھا کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمدن شعریت ہیں۔ پہلے مصرع کو عموماً دوسرے پڑھتے دوسری مرتبہ اس طرح جھوم کر پڑھتے کہ مصرع کا اثر دو آتش ہو جاتا تھا۔ مجمع کو مسخر کر لیتے اور اپنا وجد دوسروں پر بھی طاری کر دیتے تھے۔ وجدانیت اور محویت سب معین پر چھا جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زیادہ تر ہر مٹا عرہ لوٹ کر اٹھتے تھے۔ راقم نے یاس سے بہتر کسی کو غزل پڑھتے نہیں سنا یہ وہ ہنر تھا جو ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ وجدان کی جگہ اب غنائیت نے لے لی لیکن وہ بات کہیں کہ شعر کی معنویت اور اس کی خوبیاں طرر ادا کے بل بوتے پر سننے والوں کے دل و دماغ میں ترچا نہیں۔" (۱۸)

یہ دونوں باتیں بالکل متضاد معلوم ہوتی ہیں کہ ایک طرف تو ہر خندا اور طنز منتشی کا انداز اور دوسری طرف مترنم لہجہ اور جذب کی کیفیت۔ چنانچہ توقف کرنا چاہیے کہ جس شخص کے لہجے کی حلاوت کا ایک زمانہ قائل رہا ہو اس کے دہن کی

کڑواٹ اس کے بولوں میں گھسنے کی یقیناً کوئی توجہ رہی ہوگی۔

یگانہ ابتدا میں واجبی خود شناسی کے حامل تھے مگر حیات کی مستقل سازگاری کی وجہ سے اس واجبی خود شناسی نے رفتہ رفتہ خود نگری اور خود پرستی کی صورت اختیار کی اور وہ ذات اور حالات سے اوپر اٹھنے کی کوشش میں اپنی حد سے گزر گئے۔ 'انا' کی جنگ میں شکست و ریخت، ان کا مقدر رہی جس کی وجہ سے ان کے یہاں جبر کے مضامین نے اہمیت اختیار کی اور نتیجہ کبھی جذباتی بحران تو کبھی ذہنی انتشار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شخصی سطح پر جنم لینے والے تصادمات یگانہ کو نمود ذات اور تعلقی ذات کی طرف دھکیں لے گئے۔ یوں یگانہ کے ذہنی تضادات نمایاں ہونے شروع ہوئے جس نے وراثتی عقیدے اور ذاتی عقیدے کی کشمکش کے نتیجے میں جنم لینے والی خوفناک صورت پکڑی۔ مجتبیٰ حسین کے لفظوں میں "شعور کی سفاکی اور ظاہر داری سے کسر محرومی یگانہ ہی کا روپ دھار سکتی تھی۔ یہی شخصیت جو ایک مخفی قوت رکھتی تھی منافقت اور ظاہر داری سے نفرت کرتی تھی۔" (۱۹) یگانہ ہر طرح کی تقلید، منافقت اور ظاہر داری سے بے زار تھے اور گوشہ گیری، قناعت، گدائی، سپردگی اور تسلیم و رضا کی تمام رسموں کے مخالف تھے۔ ان کے علاوہ جن قدیمی مظاہر کے خداف انہوں نے کھل کر احتجاج کیا ان میں ریا کاری اور خبط مذہب سرفہرست ہیں۔ انکار یگانہ کی طبیعت کا خاصہ تھا ان کے دوا شعار دیکھئے۔

بندگی کا جھوٹا دوس کیوں کر اس سے بھتر ہے کیجئے انکار
چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے مل جائے گی رہ راست گم راہ تو ہو
گویا ن کی فکر نے ایک ٹیڑھے پیچیدہ اور خطرناک راستے کا انتخاب کیا تھا۔ ان کے تخیل کی قوت خدا سے بھی ٹکرائی اور خدائی سے بھی۔ مذہب سے ان کا کبھی نباہ نہ ہوسکا۔ وہ مذہب کو آرتھ اور زندگی دونوں کا دشمن تصور کرنے لگے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی تھی کہ وہ سپردگی اور تسلیم و رضا کے قائل نہ تھے اور دوسری بڑی وجہ مذہب کو اپنے اپنی شکنجے میں کسے وال خبط مذہب تھا۔

تشکیک کا رجحان تو غالب کے یہاں بھی ہے مگر یگانہ نے جس طرح مذہب کے بارے میں اپنے بعض تشکیکات کو طنزیہ اسلوب میں ڈھال دیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خبط مذہب کو نشانہ بناتے بناتے مذہب اور اعتقادات کے بارے میں ناگوار طرز بیان تک پہنچ گئے تھے اور یہ سب کچھ یگانہ کی اس نہایت پسندانہ افتاد طبع کی وجہ سے ہوا جسے خود ستائی کے پردے میں شدید احساس محرومی اور ذہنی انتشار نے جنم دیا تھا اور وہ کہنے لگے تھے:

میں پیسیر نہیں یگانہ سہی اس سے کیا کسر شان میں آئی

ان نتائج پر پہنچنے کے بعد یگانہ اور مذہب میں تضادم ہو گیا "یگانہ کی عمر بھر کی سرکشی کو، جوان کی توانائی کا ایک بنیادی عنصر ہے مذہب سپردگی میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ یگانہ کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ جس شخصیت کو انہوں نے شدید تنگ دستی، کس پرسی اور کرب ناک تنہائی کے عالم میں محفوظ رکھا، جوان کی سب سے بڑی متاع اور سب سے بڑا سہارا تھی، مذہب اسے نرمائے اور پنانے پر تیار ہو تھا۔ یگانہ اس ایسی متاع کو کسی قیمت پر کھوٹا نہیں چاہتے تھے۔ (۲۰) یوں یگانہ کی تشکیک رفتہ رفتہ الحاد کے سانچے میں ڈھلتی گئی۔

بہر صورت مذہب سے یگانہ کی بے زاری کا محرک ان کا وہ باطن تھا جس سے ان کا نبہ نہ ہو سکا تو وہ، حول اور زمانے کی مسلمہ اقدار پر برس پڑے۔ ڈکٹر فاخر حسین کے خیال میں "کرید کر دیکھا جائے تو یگانہ کے کلام میں مذہب سے انحراف کے باوجود، مذہبی احساس ضرور کارفرما نظر آتا ہے یعنی یہ کہ مذہب سے بے زاری زیادہ ہے اور الٰہی دکم۔" (۲۱)

ڈاکٹر ناز حسین اسے مذہبی توہمات پر عقل سلیم کا حجاج قرار دیتے ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ یگانہ کے ذہنی انتشار نے نہیں رفتہ رفتہ تلخ کلامی، ہربانی اور دریدہ ذہنی تک پہنچا دیا۔ اس وقت یگانہ کی عمر لگ بھگ ستر سال تھی جب ان کی منتشر ذہنی حاست کی پیداوار بعض تحریریں منظر عام پر آ گئیں جس کے نتیجے میں ان کی ذہنی حالت کا لحاظ کیے بغیر مجھے حسین کے لفظوں میں ”ایک لشکر نے ان کے گھر پر یلغار کر دی اور پھر اس ”انسان نما شیطان“ کو گدھے پر بٹھایا گیا جو توں کا ہار پہنایا گیا اس کا منہ کالا کیا گیا (روسیہ تو پہلے ہی سے تھے) اور لکھنؤ کی سڑکوں پر اس کو پھرایا گیا۔“ (۲۲)

یگانہ کی شخصیت اور کردار کا جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان کے ذاتی محاسن، کردار کی صحت، طرز معاشرت، استغناء، خود داری، لطف صحبت، شاعرانہ زندگی کے اطوار اور حقیقی زندگی کے معاملات میں ان کی دیانت داری اور ثابت قدمی جیسے پہلوؤں پر توجہ نہ دی جائے۔ طرہ از اس بعض معاشقی حسیثتوں میں جیسے بحیثیت انسان، بحیثیت خاوند، بحیثیت باپ بحیثیت دوست، بحیثیت دشمن، بحیثیت شاگرد اور بحیثیت استاد ان کی مختلف النوع شخصیت کا احاطہ نہ کیا جائے۔

یگانہ کی انفرادیت ان کے عزم و اعتماد کا مظہر تھی ورنہ یہی ان کا کردار تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسی بات ضرور تھی جو دشمنوں اور دوستوں کو برابر متوجہ کرتی رہی اور وہ ”یگانہ لکھنؤی“ ہونے کے جرم میں دنیا بھر کی سڑاؤں کے مستوجب ٹھہرے۔“ (۲۳)

یگانہ کا رویہ اپنے اہل خانہ، اپنے احباب اور اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ محبت کے پھیلاؤ اور گہرائی پر ان کا ہمیشہ اصرار رہا۔ ان کی بظاہر سرد مہر بے زاری میں مردم گزیدگی کا پہلو ملتا ہے۔ ان کا تیز و تند لہجہ ان لوگوں کے لیے تھا جو ان کی چٹانیت کو بے گانگی میں بدلنے کے درپے تھے۔ وہ زندگی سے اچھے ضرور ہیں مگر زندگی سے نفرت نہیں کرتے۔ ذاتی زندگی میں کردار کی مستقل سزا جی اور شخصیت کے منفرد تصور نہیں بتدریج یا س عظیم ہادی، مرزا یگانہ لکھنؤی اور مرزا یگانہ چنگیزی کے قالب میں ڈھالتے چلے گئے اور یوں ان کا ایک روپ زہر خند مردانہ، سے عدج ایل ہوس کرتا دکھائی دیتا ہے تو دوسرا روپ جراح کے ہاتھ میں نشتر کا جواں فراہم کرتا ہے۔

حواشی

- (۱) بحوالہ، روایات فلسفہ صفحہ ۳۲، مصنف علی عباس چل پوری، مطبوعہ: اشفاق لاہور، دسمبر ۱۹۶۹ء
- (۲) بحوالہ، ”این کیری کٹر“، بیاض یگانہ مملوک بلندا قبل صفحہ ۸۳
- (۳) بحوالہ، ”نظار حسین کا کام“ باتیں اور حقائق، ”روزنامہ مشرق“ لاہور (ادبی ایڈیشن) صفحہ ۸ اشاعت، ۱۰ فروری ۱۹۸۱ء
- (۴) Group psychology and the Analysis of Ego
Translated by James Strachy, page 42
First published in English 1922 Fifth Edition
London the Hogarth press.
- (۵) بحوالہ، میرزا یگانہ چنگیزی حیات و شاعری صفحہ ۵۳، مطبوعہ اردو پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۸۰ء
- (۶) بحوالہ، اردو شاعری کا مزاج، صفحہ ۲۶۸، مطبوعہ جدید ناشرین لاہور مئی ۱۹۶۵ء
- (۷) بحوالہ، ”نیرنگ خیال“ صفحہ ۱۷، لاہور جون کی ۱۹۶۷ء

- (۸) بحوالہ وہ صورتیں الٹی صفحہ ۱۵ مطبوعہ مکتبہ اردو ادب، لاہور طبع دوم ۱۹۸۳ء
- (۹) راہی معصوم رضا نے اپنی کتاب ”یاس یگانہ“ چنگیزی“ مطبوعہ شاہین پبلشرز، الہ آباد، اگست ۱۹۶۷ء میں رضا انصاری مدیر رسالہ اکادمی لکھنؤ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”فرنگی محل میں یگانہ بنا کلام نہ رہے تھے جب انہوں نے یہ شعر پڑھا
- چیت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے میں کہاں کہاں بارے والا (صفحہ ۳۹)
- تو رضا صاحب نے اس شعر کی تعریف کی۔ یگانہ پڑھتے پڑھتے رک گئے اور لائین اٹھا آئے اور انہیں غور سے دیکھنے لگے۔
- (۱۰) بحوالہ ڈاکٹر تارا چند رستوگی کا مضمون ”غالب کو میکس اور یگانہ“ مطبوعہ اردو ادب نئی دہلی شمارہ (۱) (۲) صفحہ ۱۱۶ ۱۹۸۶ء
- (۱۱) بحوالہ، یگانہ کا خط بنام شعلہ محررہ ۱۱ اگست ۱۹۳۵ء، مطبوعہ تخلیقی دپ (۲) صفحہ ۴۸ یگانہ نے لکھا تھا ”ارے میاں اب لکھنؤ درغاب کے معاملے کو کیا تارہ کرو گے وہ دہنوں بت ٹوٹ چکے دونوں مقدمے فیصل ہو کر مجلس داخل دفتر ہو چکیں۔“
- (۱۲) بحوالہ، مجھے نہیں کا خط بنام راقم محررہ ۴۷ جون ۱۹۲۵ء
- (۱۳) بحوالہ یگانہ کا پنے بارے میں مضمون ”میرزا یگانہ چنگیزی“ مطبوعہ آج کل دہلی، صفحہ ۳۴، ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء
- (۱۴) بحوالہ، مضمون ”یگانہ یگانہ“ مطبوعہ فنون لاہور، صفحہ ۲۲، جنوری ۱۹۶۴ء
- (۱۵) ایضاً صفحہ ۲۳۰
- (۱۶) بحوالہ، تاثرات و تعصبات (صفحہ ۱۸-۱۹) مطبوعہ شعبہ تحقیق و شاعرت مدرسہ عالیہ ہما کا طبع اول، ستمبر ۱۹۶۲ء
- (۱۷) A History of Urdu Literature, Page 509, Oxford University Press Karachi Second Edition 1985
- (۱۸) بحوالہ، نیم رخ صفحہ ۱۷ مطبوعہ پاک پبلشرز لنڈہ کراچی، فروری ۱۹۷۸ء
- (۱۹) یگانہ نے پوری غزل بلند اقبال (بنت یگانہ) کے نام خط محررہ ۲۴ جولائی ۱۹۴۲ء میں درج کی تھی۔ مذکورہ شعر کے حوالے سے یگانہ نے لکھا تھا ”بندہ ب کے بعض حقائق پر میں نے جو کچھ اظہار خیال کیا ہے آئندہ کوئی جو میر پیدا ہوگا تو میرے ہی خیالات کی تصبیغ کرے گا خواہ میرے خیالات باطل اور اس تک پہنچیں یا خود اس کے دس میں پیدا ہوں“ (اصل خط بلند، قباں کی ملکیت ہے)
- (۲۰) بحوالہ، نیم رخ صفحہ ۵۵-۵۶
- (۲۱) بحوالہ، ”یگانہ یگانہ“ فنون لاہور جنوری ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۳۳
- (۲۲) بحوالہ، نیم رخ صفحہ ۵۶-۵۷
- (۲۳) بحوالہ، ابوالفضل صدیقی کا غیر مطبوعہ مضمون ۲

مجید امجد کی نظم کی جمالیات

ثقافت و فطرت کے سیاق میں

ناصر عباس میر

جدید اردو نظم کی جمالیات و شعریات چار اہم ثقافتی سرچشموں سے سیراب ہوئی ہے۔ حجاز، عجم، قدیم ہندوستان اور وادی سندھ، خصوصاً پنجاب۔ اقبال کی نظم حجاز کی طرف رجوع کرتی ہے، راشد کی نظم عجم کی جانب جھکاؤ رکھتی ہے، میراجی کی نظم کا بڑا حصہ قدیم ہندوستان کی اسطری لٹریچر سے رشتہ قائم کرتا ہے، اور مجید امجد کی نظم بڑی حد تک وادی سندھ کی تہذیب سے رشتہ استوار کرتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں ان شعرا کے حادی رجحان کا ذکر مقصود ہے، وگرنہ جدید اردو نظم کے یہ چاروں ثقافتی سرچشمے، ایک دوسرے کے ہم قرین ہیں اسی لیے اقبال کی شاعری کے کچھ پہلوؤں کی گنگا جمنی تہذیب سے بھی متعلق ہیں، خصوصاً بانگ درا کی بعض نظمیں (جیسے ہما، آفتاب، ترانہ، ہندی، سوامی رام تیرتھ وغیرہ)۔ میراجی کے یہاں عجمی ثقافتی عناصر بھی ہیں۔ مجید امجد کی نظموں اور غزلوں میں بھی کہیں کہیں عجمی ثقافتی پہلوؤں کا ظہور ہوا ہے۔ نیز یہ شعرا (سوائے اقبال کے) نظم کی پورپی، جدید شعریات سے بھی متعلق ہیں۔ جدید اردو نظم کے مذکورہ رجحان کی ایک وجہ جو بالکل سامنے کی ہے یہ ہے کہ اردو زبان اور شاعری کی تاریخ کثیر الثقافتی عناصر کو جذب کرنے سے عبارت ہے۔ دوسری وجہ شناخت کے مسئلے تھے جو نوآبادیات اور جدیدیت کے زیر اثر پیدا ہوئے، نوآبادیاتی صورت حال نے جڑوں سے کٹنے کا احساس پیدا کیا، اور جدیدیت نے مفارقت و بیگانگی کے احساس میں مبتلا کیا۔

تہذیبی شناخت کے سلسلے میں دو اہم قائل توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا رخ ماضی کی جانب ہوتا ہے، دوسری یہ کہ تہذیبی شناخت کا سوال، کم زکم تخلیقی فنون میں، ایک جذباتی مسئلے کی صورت اختیار کرتا ہے، تخلیق کار اپنی نجی، محدود ذات میں ایک گہری دراز سی محسوس کرتا ہے جو اسے قدیم، اجتماعی، ثقافتی ذات کے نیم تاریک دیار تک لے جاتی ہے۔ تخلیق کار ایک طرح سے 'گھروہی، یہاں کی گود میں پہنچنے' کا سفر اختیار کرتا ہے، فرسوش شدہ زمانوں، کھوئی ہوئی ثقافتی اوضاع کو از سر نو حاصل کرتا، سنو رتا، معنی خیز بناتا یعنی reclaim کرتا ہے، اور اس سارے عمل میں وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ، باطن کی تمام ممکنہ گہرائی کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ (اگر ایسا نہیں کر پاتا تو اس کا مطلب ہے کہ اسے شناخت کا سوال درپیش ہی نہیں، یا پھر وہ اس تخلیقی استعداد سے محروم ہے جو تہذیبی شناخت کے سوال سے جھو جھنے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے)۔ تہذیبی شناخت کے عمل میں عموماً، قدیم زمانوں کی نسائی شبیہ قائم کی جاتی ہے، اہرتی، ماں کی کوکھ کی، یعنی ایک طرح کی آرکی ٹائپل شبیہ۔ لہذا جدید اردو نظم کی شعریات کا جو چہرہ مبرہ بنا، اس کے خدوخال میں ایک طرف کثیر الثقافتیت شامل ہے اور دوسری طرف تہذیبی شناخت۔ یعنی ایک حصہ قدیم، بشریاتی ہے، اور دوسرا نیا، یا معاصر۔ اپنے قدیم، بشریاتی حصے کی وجہ سے اردو نظم ایک مرکزی دھارے کی تشکیل کرتی ہے، اور اپنے نئے حصے کی بنا پر چھوٹے، ذیلی، نیم خود مختار دھاروں میں بٹ جاتی ہے۔ اردو نظم کا یہی نیا حصہ شاعروں کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی، انفرادی، نیم خود مختار، قالیم

شعری وجود میں۔ لیکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال، راشد، میراجی اور مجید امجد کی شعری اقامت، اپنے اسالیب و موضوعات کی بنا پر نیم خود مختار ہیں۔

مجید امجد کی نظم کے وادی سندھ سے تعلق کا پہلی مرتبہ ذکر یحییٰ امجد نے کیا۔ لکھتے ہیں
یہ [مجید امجد کی] پاکستانی جمالیات ہے۔ وادی سندھ کی جمالیات ہے۔ اس میں
ہزاروں سال کا تہذیبی رچاؤ ہے، جس کی جڑیں اپنی زمین میں ہیں، ایران، توران
دلی اور لکھنؤ میں نہیں۔!

یحییٰ امجد نے مجید امجد کی شاعری کی ثقافتی جڑوں کی نشان دہی ایک سادہ، عمومی اصول کے تحت کی۔ انھوں نے
امجد کی شاعری میں مقامی، قصباتی زندگی، زرعی علامتوں، ہڑپہ وغیرہ کے ذکر سے یہ کلی نتیجہ اخذ کیا کہ امجد کی پوری شاعری
وادی سندھ کی تہذیب کی ترجمان ہے۔ چونکہ پاکستان جغرافیائی طور پر وادی سندھ میں واقع ہے، اس لیے یحییٰ امجد نے
یہ رائے بھی قائم کر لی کہ مجید امجد کی شاعری پاکستانی تہذیب کی جمالیات کی حامل بھی ہے۔ بدشہ امجد کی شعری جمالیات کا
اہم حصہ وادی سندھ کی تہذیب کو از سر نو معنی خیز بنانے سے عبارت ہے، مگر پوری وادی سندھ کی تہذیب کو نہیں، اس کے ایک
حصے، پنجاب کی قصباتی زندگی کو، نیز امجد کی پوری شاعری دہلی، قصباتی زندگی کی ترجمان نہیں۔ درست کہ مجید امجد کی کثر
نظموں میں پنجاب کی قصباتی زندگی، زرعی معاشرت، فطرت، مقامی پرندوں، فصلوں اور پے ہوئے طبقوں کی حالت کا
ذکر ہوا ہے۔ لیکن بعض نظموں میں بڑے شہر (خصوصاً لاہور) کی معاشرتی زندگی (نظم 'لاہور' اس سینیڈ پریا' بارش کے
بعد) اور ثقافتی، تاریخی مظاہر (جیسے نظم 'مقبرہ جہانگیر') کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ نظموں میں امجد نے جدید
شہری زندگی پر بھی لکھا ہے۔ 'طلوعِ فرض'، 'پناہی'، 'جہاں قیصر و جم میں'، 'آؤ گراف'، 'ہیٹل میں' جیسی نظمیں شہری مقامیت
کی حامل ہیں۔ نیز مجید امجد نے دہلی و لکھنؤ، یا نجی میراث کو یک سرے میں نہیں کیا۔ فرق ناز، دوش غم، چراغ
طور، ابر صبح، شوخ لالہ، قام، پارہ ہائے سخال، دھارا، دوشیزا، بہار، دسج گل، اندوزِ حنا، مجبوری، افتادِ مقصد، سلطنتِ غم و اقلیم
طرب، شہستانِ ابد، گہوار کا حسن و افسوں، ضمیر فرشتہ صید جیسی تمثیلات و تراکیب کی خاطر برتری ہیں، جون کی نظموں، غزلوں
میں ظاہر ہوئی ہیں؟ قصہ یہ ہے کہ مجید امجد کی نظم اردو شاعری کی کثیر الثقافتیہ کو قبول کرتی ہے، مگر اپنے ہم عصر شعرا کے
مقابلے میں، امجد کی امتیازی شناخت جس ثقافتی رجحان سے قائم ہوتی ہے، یا جسے ہم نظم میں مجید امجد کے دستخط کہہ سکتے
ہیں، وہ وادی سندھ کے کچھ حصوں کی خاموشی کو زبان دینے سے عبارت ہے۔

ایک اور بات جسے یحییٰ امجد پوری طرح واضح نہیں کر سکے، وہ یہ ہے کہ مجید امجد نے وادی سندھ کی تہذیب کی
بازیافت، جدید شاعری کی حیثیت کے تحت کی ہے۔ جدید حیثیت اور قدیم تہذیب کا تعلق یحییٰ امجد کی نظروں سے اوجھل رہا ہے
۔ جدید حیثیت ماضی کا احیا نہیں کرتی، ماضی کو از سر نو با معنی بناتی یعنی reclaim کرتی ہے۔ ماضی کا شدت پسندانہ احیا
، وقت کے خاص تصور کا اسیر ہوتا ہے۔ اس تصور کے مطابق گزرا ہوا مجید، پتھر کی طرح ساکت و جامد، ورا یک خاص مقام پر
ایستاد ہوتا ہے، ناقابلِ شکست انداز میں۔ لہذا اسے، اس کی حقیقی شکل میں واپس لایا جاسکتا ہے۔ حیا پسندوں کی نظر خود
اس تصور وقت کے تضاد پر نہیں جاتی کہ اگر ماضی ساکت و جامد ہے تو ماضی ہے ہی نہیں، حال ہے، لہذا اس کے احیا کی
ضرورت ہی کیا ہے احیا تو اس شے کا کیا جاتا ہے، جو کھو گئی ہو، ہاتھ سے پھسل گئی ہو۔ دوسری طرف ماضی کو از سر نو با معنی اسی
وقت بنایا جاسکتا ہے جب یہ سمجھا جائے کہ جو کچھ وقت کے ہاتھ سے، یادداشت سے پھسل گیا تھا یا تاریخ کے معروف

ہیائیوں میں کھو گیا تھا، اس کی بازیافت انہی قرأت کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔ کیا وقت واپس نہیں آ سکتا، مگر مجھے وقت کی نفی معنویت قائم ہو سکتی ہے۔ مجید امجد اپنی بہترین نظموں میں قدیم تہذیب کا احیا نہیں کرتے، اسے جدید حیثیت کی مدد سے، نئے سرے سے با معنی بناتے ہیں۔

محدودہ بریں مجید امجد ایک قدیمی، فرسوش کردہ تہذیب کی بازیافت، محض نا تنجیائی انداز میں بھی نہیں کرتے۔ اگر ایسا کرتے تو ان کی نظم بیانہ نظم بن کر رہ جاتی، ان کے یہاں گھر واپسی، ماں کی آغوش میں پہنچنے کا فکار نہ، اسطوری رویہ ظاہر نہ ہوتا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی مانند ان کی نظم بھی صرف حاشیائی طبقتوں ان کی اسٹگوں، رسوں ریتوں کی محاکات تک محدود ہوتی۔ بیانہ، محاکاتی نظموں کی اہمیت عمرانی مطالعات میں زیادہ ہوتی ہے۔ بیانہ، محاکاتی شاعری حقیقت کی نقل کرتی ہے، یہ حقیقت کا متبادل تصور دیتی ہے، حقیقت خلق نہیں کرتی؛ جدید شاعری حقیقت خلق کرتی ہے، یا کم از کم اس کو اپنا مقصود بناتی ہے، حقیقت خلق کرے کے سلسلے میں جدید شاعری کوئی بھی قدم اٹھانے پر آمادہ رہتی ہے وہ موجود حقیقت کو مسخ کر سکتی ہے، اس سے گریز اختیار کر سکتی ہے، یا اس سے ماورا جاسکتی ہے۔ دوسری طرف بیانہ شاعری ہمیں حقیقت کا علم دے سکتی ہے، حقیقت کی بصیرت نہیں، یہ بصیرت محض نئے، مجرد خیال کی صورت نہیں ہوتی؛ یہ ایک وقت حس، تخیلی یا حقیقی، چادوئی عاصر کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ کبھی تو نث طغییز ہوتی ہے اور کبھی صدمہ انگیز، اور کبھی نشاط و صدمے کی متضاد کیفیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسی شاعری ہمیں جھنجھوڑتی ہے، کبھی اپنی غیر روایتی زبان سے، کبھی ہمارے احساسات کے سچوں کو توڑے سے۔ جدید شاعری کا بڑا حصہ انہی متضاد کیفیات سے ترتیب پاتا ہے۔ لہذا، مجید امجد کی نظم ہمیں واوی سندھ (یعنی دہلی، قصبائی زندگی) کی تہذیب کے بعض پہلوؤں کی حقیقت کی بصیرت دیتی ہے، جو بہ یک وقت نث طغییز و صدمہ انگیز ہے۔ حقیقتاً امجد مقامی تہذیب کی حقیقت کی نقل پیش نہیں کرتے، اسے اپنی جدید حیثیت کی مدد سے خلق کرتے ہیں، اور اس ضمن میں وہ مقامی تہذیب کے رنگ بیانوں سے گریز اختیار کرنے یا ان کی رد تشکیل کرنے میں حرج نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی نظموں میں واوی سندھ کی تہذیب کا کوئی پر شکوہ، مثالی تصور نہیں ملتا، قدامت کے ساتھ معصومیت کا تصور عموماً وابستہ ہوتا ہے (قدیم تہذیب کو انسانیت کا بچپن خیال کیا جاتا ہے، اور بچپن معصومیت کا حامل زمانہ ہوتا ہے) اس تصور کی وجہ سے قدیم تہذیب مثلاً، منرہ، درشی کبھی جانے لگتی ہے۔ مجید امجد قدامت سے معصومیت کو الگ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس تہذیب کے درمندانہ طبقوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی درمندی کی جڑیں بھی اسی تہذیب میں ہیں۔ امجد کی نظم میں بڑے کے جس کتبے کی قرأت کی گئی ہے، اس میں تین تیل ہیں، تیل کو کھینچنے والے دو تیل اور ایک ہالی۔ تیل بڑ پائی، زرعی تہذیب کی مرکزی قوت اور بنیادی علامت ہے، امجد اس علامت کی رد تشکیل کرتے ہیں۔ تیل کی اسطوری عظمت اس وقت معرض التوا میں پڑ جاتی ہے، جب تیل کی حکمران ہستی، یعنی کساں بھی تیل کا 'مرتہ' حاصل کر رہا ہے۔ بڑ پائی کی یہ بصیرت صدمہ انگیز ہے۔ یہی کچھ نظم 'کنواں' میں ہے۔ کنواں بھی بڑ پائی، زرعی تہذیب کی اہم قوت و علامت ہے، کنواں بھی تیل پر منحصر ہے۔ بڑ پائی تہذیب میں 'تیل' زمین میں مسلسل بل چلائے جا رہے ہیں، اور اس تہذیب کا کنواں بھی مسلسل چل رہا ہے، مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں، نہ فصلیں، نہ خرمن، نہ دانہ۔ دل کو چیر ڈالنے والی ویرانی، اور تخیل کھلسا ڈالنے والی بیادانی ہے۔ بڑ پائی تہذیب کی یہ وہ معنویت ہے جو امجد اپنی نظم میں قائم کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ معنویت، یا بصیرت بھی صدمہ انگیز ہے۔

واضح رہے کہ حقیقت کی نقل، یا حقیقت کی بصیرت کا تعلق شاعر کے میاں طبع سے کم اور اس شعریات سے زیادہ

ہے جسے کوئی شاعر مستعار لیتا یا خود خلق کرتا ہے۔ نظیر نے کلاسیکی شعریات کے تحت نظمیں لکھیں، جس میں شاعر ایک ناظر ہوتا ہے، جب کہ امجد نے جدید شعریات کو راہ نما بنایا، جس میں شاعر اشیاء، زمانوں، سماج کا ناظر نہیں ہوتا، ان سب کو اپنی جان پر تھیلتا ہے؛ زائد اس کے اندر کو روندتے ہوئے گزرتا ہے، اس کی روح میں رکھ ہوتا، اور اس کی روح کو رکھ کرتا ہے۔ اس کے باطن میں اشیاء زندہ ہو جاتی ہیں، شیا کے نئے ہو لے بنتے بگڑتے ہیں، شیا اور ہو لے شاعر سے کلام کرتے ہیں، جدید شاعر ایک سے زیادہ زندگیوں بسر کرتا ہے، ایک سے زیادہ لوگوں کے دکھ بھوگتا ہے، اور ایک سے زیادہ زمانوں میں جیتا، مرتا ہے۔ جدید شاعر کے لیے کوئی شے معروضی ہوتی ہے، اندر کی تخلیقی۔

اور مرد دل۔

بچتے جگہوں کی راکھ میں لت پت

(حرف اول)

ہاں اسی گم سم اندھیرے میں ابھی
بیٹھ کر وہ راکھ چننی ہے ہمیں
راکھ ان دنیاؤں کی، جو حل ہوتی ہیں
راکھ، جس میں راکھ نہیں شبنمیں
زیست کی چٹکوں سے ٹپ ٹپ پھوٹی
جانے کب سے جذب ہوتی آئی ہیں
کتنی ردھیں، ان زمانوں کا خمیر
اپنے اشکوں میں سموتی آئی ہیں

(ایک نظم)

ہمارا جدید شاعر آزادی اور مجبوری کی عجیب و غریب مناقض (پیراڈاکس) صورت حال میں مبتلا ہوتا ہے ایک سے زیادہ زندگیوں بسر کرنے کی آزادی اور ایک سے زیادہ زمانوں کی راکھ چننے کی مجبوری، اور ان بچتے جگہوں میں راکھ ہوتی راحوں کے دکھ بھوگنے کی مجبوری۔ آزادی کا کیف اور مجبوری کا الم، جدید شاعر کی تقدیر ہے۔ جدید عہد کے بعض شعرا اپنی اس تقدیر سے بھاگتے بھی ہیں۔ وہ گزرے جگہوں کی راکھ نہیں چننے، کسی ایک گزرے زمانے کا مثالیہ تشکیل دیتے اور اس کے احیا کی سعی کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس آزادی کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے معذوری ظاہر کرتے ہیں، جو کئی زندگیاں بسر کرنے، اور کئی قرون کی تاریکیوں میں راہیں ٹٹولنے سے عبارت ہے۔ حقیقتاً وہ ایک سے زیادہ زندگیوں بسر کرنے کی اذیت اٹھانے کے بجائے، ایک (خیالی) زندگی کے سطحی نشاط میں گم رہتے ہیں۔ وہ کسی خاص عہد کے ناسمجیا میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ان کا رشتہ تاریخ سے تو استوار ہو جاتا ہے، مگر ثقافت سے نہیں۔ کئی زمانوں کی راکھ چننے کا مطلب ثقافت، اور ثقافتی آرکی ٹائپ سے تعلق قائم کرنا ہے۔ جدید شاعری (اور فکشن) میں اساطیر کی طرف میلان کا ایک سبب یہی ہے۔

جدید شاعری کے مذکورہ میلان کو ہم کثیر جذبیت (multivalence) کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ کثیر جذبیت کا سادہ لفظوں میں مفہوم یہ ہے کہ تخلیقی شعور کو کسی ایک جذبے، کسی ایک زمانے، کسی ایک عہد، کسی خاص تصور یا آئیڈیالوجی کا پابند نہ کیا جائے۔ اس کا دوسرا مطلب، انا اور مجھ، موجود کی جبریت سے آزادی ہے۔ یہ آزادی، ذات اور

وقت کے خاص تصور میں ایقان کے بغیر ممکن نہیں۔ مجید امجد کے یہاں ہمیں ذات اور وقت کے خاص تصورات ملتے ہیں۔ مجید امجد لمحہء موجود پر ماضی کے خستہ انوں کی پرچھائیاں مسلسل دیکھتے ہیں، یعنی ن کے لیے لمحہء موجود کا تجربہ، ایک خاص ثانیے کا نہیں ہے، جو نثری، کھوئی ہوئی، راکھ شدہ صدیوں سے بیگانہ، محض ہوا سے ہم لمحہء موجود کی جبریت سے آزادی کا نام دے سکتے ہیں۔ اسی طرح مجید امجد کے یہاں ہمیں ذات کا جو تصور ملتا ہے، وہ انا کی محدودیت کا حامل نہیں، بلکہ کائناتی عظمت کا حامل ہے۔ یہ تصور مہاتما بدھ کے ذات کے تصور کے کافی قریب لگتا ہے۔ لطف اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بدھ کا تصور ذات، جدید حسیت کے لیے ذرا جھنجھی نہیں۔

شیر افضل جعفری نے مجید امجد کو کوئی سدھارتھ کہا تھا۔ ان کے پیش نظر مجید امجد کی شخصیت تھی جو درویش نہ تھی اور، علاقائی دنیوی سے بے نیاز تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجید امجد کی سدھارتھ سے من بہت کہیں گہری سطح پر ہے۔ یوں بھی درویشی، بڑی شاعری کی کوئی لازمی شرط نہیں، اور نہ طبیعت کا استغنا، غیر معمولی شعری تخیل کی ضمانت ہوتا ہے۔ مجید امجد کا بدھ سے اگر کوئی گہرا، بنیادی نوعیت کا تعلق قائم ہوتا ہے تو وہ ذات کے عرفان کی نسبت سے ہے۔ سی۔ جی، ٹرونگ نے بدھ کے تصور ذات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذات (self)، دیوتاؤں سے بھی بلند مرتبہ ہے۔ یہ انسانی وجود اور بحیثیت مجموعی دنیا کا جوہر ہے۔ بدھ نے انسانی شعور کی کائناتی عظمت کو سمجھا، اور سی بنا پر یہ منکشف ہوا کہ اگر آدمی اس روشنی کو بچھا دے گا تو دنیا عدم میں غرق ہو جائے گی ۲۔ ذات کا یہی تصور ہمیں امجد کی شاعری کی اساس کے طور پر نظر آتا ہے، اور مجید امجد جس جدید حسیت کے حامل ہیں، یہ تصور ذات اس سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ امجد ہر بات، شے، واقعے، تجربے کو دیوتاؤں سے بھی بلند ذات کی رو سے دیکھتے ہیں، یعنی اسے بھوگتے ہیں، دیوتا دکھ نہیں بھوگتے، کم از کم انسانی دکھ نہیں بھوگتے۔ دکھ سے لائق، دیوتا کی شان استغنا کہلاتی ہے۔ دکھ سے انسانی ذات کی نسبت ہی سے دیوتاؤں سے بڑھ کر عظیم بناتی ہے۔ یہ نرگسیت نہیں۔ نرگسیت میں آدمی اپنی محدود انا کی محبت کا قیدی ہوتا ہے، جب کہ ذات کی کائناتی عظمت کا تصور آدمی کو اس بات کی تحریک دیتا ہے کہ وہ دیگر اشیاء، افراد، زمانوں سے ہم احساسی (empathy) کا رشتہ قائم کرے، علیحدگی، اجنبیت، بیگانگی، تنہائی کو ختم کرے۔ مجید امجد کی نظم میں پرندوں، جانوروں، درختوں، لوگوں کے دکھ کو شدت سے محسوس کرنے کا جو رویہ ہے، وہ ذات کے اسی تصور کی وجہ سے ہے۔ علیحدگی، تنہائی، مغائرت اور بیگانگی، جدید ادب کی روح میں اتری ہوئی ہیں۔ مجید امجد کی شاعری میں بھی ان سب کا ادراک موجود ہے۔ دیگر جدید شاعروں کے مقابلے میں امجد کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تنہائی و مغائرت کو نہ تو ایک ناگزیر حقیقت سمجھتے ہیں، اور نہ انھیں انسانی ذات کی عظمت سے بڑا سمجھتے ہیں۔ تنہائی و مغائرت کو ان کی پوری شدت سے معرض ادراک میں لانے کے باوجود، ان کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ اس بنا پر اس کے یہاں انسانی وجود کی عظمت و تکریم کا ایک انوکھا تصور ظاہر ہوا ہے۔

طلوع صبح کہاں، ہم طلوع ہوتے گئے

ہمارا قافلہ ہے دریا روانہ رہا

تنہائی و مغائرت کے ضمن میں جدید ادب میں تین طرح کے رد اعمال ملتے ہیں۔ انھیں جدید انسان کی تقدیر سمجھنا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا، انھیں انسانی تجربے کی راہ میں آنے والی ایک ایسی تاریخی حقیقت سمجھنا، جو انسانی ارادے سے بڑی ہیں، انھیں چھ تخلیق کاروں، فلسفیوں کے غیر حقیقی تصورات قرار دینا۔ پہلا رد عمل (جسے وجودیوں نے خاص طور پر پیش کیا) انسانی وجود کی نوعیت، بے معنویت، کرب کو اجاگر کرتا ہے۔ تیسرا رد عمل اشتراکی ادیبوں اور اسدی

ادب کی تحریک سے وابستہ نقادوں نے پیش کیا۔ جب کہ دوسرا رد عمل ہمیں مجید امجد کے یہاں ملتا ہے۔ اردو شاعری میں مجید امجد کے سوا کسی جدید شاعر نے یہ بات واضح نہیں کی کہ مغائرت، تنہائی اور دکھ کے تجربے ہی میں ان کا خاتمہ موجود ہے۔ موت کی طرح، مجید امجد تنہائی و مغائرت کی ملکیت کو تسلیم کرنے میں یقین رکھتے ہیں، ان کی ملکیت ہی ان پر اختیار دیتی ہے۔ بظاہر اس کا تعلق تقدیر پرستی سے محسوس ہوتا ہے، اور اس کی تہ میں مذہبی تسلیم و رضا کی تلقین نظر آتی ہے۔ 'خدا، اچھوت ماں کا تصور اور پنواڑی' کی سرسری قرأت سے بھی یہی رائے قائم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ جدید افسانے میں انتقد حسین اور جدید نظم میں مجید امجد انسانی وجود کی اقدار تاریکی کے اندر اترنے کو اخذ روشنی کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں امجد کی نظم 'جارب کش' غیر معمولی ہمت کی حامل ہے۔

آسمانوں کے تلے تلخ و سیہ راہوں پر
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ اگر تو چن لے
کوئی اک غم تری قسمت کو بدل سکتا ہے

غم کو چننا، اسے اپنی گرفت میں لینا ہے، اور غم کو نہ چننا، غم سے فرار ہے۔ جب تک غم گرفت سے باہر ہے، اس سے مغائرت موجود ہے، اور مغائرت ہی دکھ کو جنم دیتی ہے۔ مغائرت کا دکھ، تقسیم و علیحدگی کا دکھ ہے۔ آدمی اپنے ہی اصل وجود سے علیحدہ ہوتا اور دکھ بھوگتا ہے۔ مجید امجد کوئی سادہ کلیہ پیش نہیں کرتے کہ غم کو گرفت میں لے لینے سے غم کی جگہ نشاٹ لے لیتا ہے، یا مغائرت و تنہائی کا سامنا کرنے سے، وصل کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں دوسرے درجے کے لکھنے والوں کے یہاں اس طرح کے متعدد کلیے نظر آتے ہیں۔ ان کلیوں سے ایک سطحی رجحانیت تو پیدا ہوتی ہے، انسانی ہستی کی گہری بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔ مجید امجد تنہائی، مغائرت، یا غم میں نشاٹ تلاش نہیں کرتے، بلکہ ان کی ملکیت قبول کر کے، وجود کی مکمل آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ اپنے آخری دور کی ایک نظم 'اپنے لیکھ' میں یہی حقیت واضح کرتے ہیں: "آخر جینا تو ہے، اور جینے کے جتنوں میں زخمی جیونئی کی بے بس آگاہی بھی عقل کل ہے،" زخمی جیونئی کی، اند انسان جب زخم کے ساتھ جینے کی حقیقت کی آگاہی حاصل کرتا ہے تو گویا اپنے وجود کی مکمل سچائی کی بصیرت پاتا ہے۔ وجود کی اصل زخم ہے، اس کا اگر کوئی ند مال ہے تو اس اصل کا عرفان ہے۔ پیش نظر ہے کہ مجید امجد کے یہاں ذات کا عرفان کوئی منطقی عمل نہیں، منطقی عمل وجود کے زخم کی بے داغ حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ اس کا خیال کر سکتا ہے، اور خیال عارضی، تغیر پذیر ہوتا ہے، نیز خیال اپنے معروض سے جد علیحدہ ہو جانے، اور ایک الگ دنیا بسا لینے کی صفت رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں ایک نئی قسم کی مغائرت کی بنیاد رکھتا ہے۔ دوسری طرف وجود کی اصل کا مکمل عرفان، وجود سے علیحدہ نہیں ہوتا، وجود کا خیال اور احساس، وجود سے الگ نہیں ہوتا۔ اس طور امجد کی نظم ثقافتی آرکی ٹائپل طریق اختیار کرتی ہے: یعنی انسانی وجود کی حقیقت کو زمانوں پر پھیپے ہوئے، قدیم، انسانی اجتماعی، ثقافتی تجربوں سے جڑے ہوئے دیکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ن کی نظم بوگوس کی بجائے میتھوس سے کام لیتی ہے، بوگوس منطقی، عقلی طریقہ ہے، اور میتھوس اساطیری، کہانی طریقہ ہے۔ بوگوس اگر فقط معنی ہے، تو میتھوس لفظ ہے، جس سے معنی اسی طرح وابستہ ہے، جیسے گوشت سے ناخن۔ وجود کی حالت، خواہ وہ تنہائی سے عبارت ہو، دکھ سے مملو ہو، یا مغائرت میں گہری ہوئی ہو، امجد کی نظم میں اس کا اظہار جمالیاتی ثقافتی تجربے کی صورت ہوتا ہے، امجد کی شعری جمالیات، آرکی ٹائپل، اسطوری ہے۔ امجد اشیاء، افراد، واقعات کو جمالیاتی اسطورہ میں بدل لیتے ہیں۔ وہ جارب کش ہو، کٹے ہوئے پیڑ ہوں، ہڑپ کے دھول پھینکتے

کسان ہوں، بجلی کے تاروں پر جھولتی رالی ہو، یا زخمی چیونٹی، امجدان کا واقعاتی احوال نہیں لکھتے، ان پر گزرنے والی حالت کا اسطوری پیدائش کی شکل دیتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس اسطوری پیدائش کی تشکیل میں وہ ذات شامل ہے، جو کائناتی عظمت کی حامل ہے۔

ایک بار پھر نظم بڑے کا کتبہ یاد کیجیے۔ پوری نظم میں تین کا ہندسہ ایک عجب اسطوری شان سے ظاہر ہوا ہے۔ نظم کا عنوان تین لفظوں پر مشتمل ہے۔ نظم تین تین مصرعوں کے تین بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کے الگ الگ تین قافیے ہیں۔ پہلے بند میں تین کا اسطوری، جمالیاتی کردار دکھائیے۔

بہتی راوی تیرے تٹ چہ کھیت اور پھول اور پھل
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھل مل
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی، اک ہالی، اک مل

راوی کے تٹ پر تین طرح کی چیزیں ہیں کھیت، پھول اور پھل، یعنی ہاتھ حیات کے تین مراحل۔ یہ تہذیب تین ہزار برس پرانی ہے (یہاں امجد سے سہو ہوا ہے، یہ تہذیب پانچ ہزار برس پرانی ہے)۔ بیلوں کی جیوٹ جوڑی کے علاوہ ہالی اور مل کر تین کردار بنتے ہیں۔ اگلے بند میں سنگ، مٹی اور آگ کی تثلیث کا بیان ہے، اور آخری بند میں، جو نظم کا کلائمکس ہے، تہتی دھوپ میں تین تیل ہیں، دو تیل اور ایک تیل جیسا ہالی۔ اس کے علاوہ نظم کے تین بند، تین زمانوں کو پیش کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ابتدائی، قدیمی سرسبز و شاداب زمانہ، پتھر کے خداؤں کا وسطی زمانہ اور تہتی دھوپ میں جانوروں کی طرح کام کرتے کسانوں کا زمانہ، یعنی موجودہ زمانہ۔ اسی طرح نظم تین دنیاؤں کو پیش کرتی ہے۔ نباتات کی دنیا، پتھروں کے خداؤں کی دنیا اور جانوروں، اور ان کی طرح جیتے مرنے والوں کی دنیا۔ یوں پوری نظم میں تین ایک آرکی ٹائپل عدد کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔

ایک وحدت کی علامت، دو محسوسات کی اور تین تکمیلیت کی علامت ہے۔ تین میں وقت کی ماضی، حال و مستقبل میں تقسیم ضم ہو جاتی ہے۔ تین، نہیں، ثواب اور وہ کی تکمیلی حالت ہے تمام انسانی رشتے انہی تین اسمائے ضمیر سے پہچانے جاتے ہیں۔ انسانی وجود جسم، ذہن اور روح کی تثلیث کا حامل ہے۔ آرٹ میں دو کا ہندسہ مربع کی نمائندگی کرتا ہے، اور تین کا ہندسہ مکعب (cube) کی۔ مکعب ایک ٹھوس جمالیاتی شبیہ ہے۔ تین کے ہندسے کے یہ تمام معانی نظم میں موجود ہیں یا نہیں، اس کا جواب ہم نظم کی جمالیاتی ہیئت ہی میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ایک بات بالکل واضح ہے کہ تین کی جمالیاتی معنویت امجد کے پیش نظر ضرور موجود رہی ہے۔ امجد نے نظم کی ہیئت میں تین کی تکرار کا باقاعدہ اہتمام کیا ہے، اور ایک ایسے عمدہ انداز میں کہ نظم کی رواں قرأت میں اس اہتمام کا احساس تک نہیں ہوتا۔ امجد کی شعوری فکرانہ سعی، نظم کی تکمیلی حالت میں محسوس ہوتی ہے، کرافٹ، نظم کے آرٹ میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ یہ ہر کیف تین کی جمالیاتی معنویت ہی سے اسطوری تلازمات ہو رہے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ تین کا ہندسہ اپنی مسلسل تکرار کے باوجود نظم کی یکتائی و وحدت میں خلل نہیں ڈالتا، اس نظم جس غیر معمولی وحدت خیال، وحدت احساس اور وحدت وجود کی حامل ہے، وہ تین کی جمالیاتی تکرار سے ممکن ہوئی ہے، یہ غیر معمولی پس اسطوری معجزہ ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تین، نظم سے بڑھ بھی ہے، یعنی نظم کی خارجی ہیئت کا حصہ ہے، اور نظم میں گندھا ہوا بھی ہے، حتیٰ نظم کی داخلی، نامیاتی ہیئت کا حصہ بھی ہے۔

اس نظم کو ہم بڑپائی تہذیب کی ایک جدید اسطورہ کہہ سکتے ہیں، جس میں تیل کا اسطوری تصور تشکیل دینے والا

کردار خود نیل میں بدل گیا ہے۔ جدید اسطورہ انسانی عظمت کا پر شکوہ تصور تشکیل نہیں دیتی۔ موت اور زوال، جدید ادب کے بنیادی موضوع ہیں۔ اسی لیے مجید امجد بہتی راوی کے تحت پر ہزاروں برس سے آباد تہذیب کا قصیدہ نہیں، بلکہ کتبہ لکھتے ہیں۔ نیز آدمی کا نیل میں بدسنا، اسی جدید اسطوری روش کے عین مطابق ہے، جس میں آدمی کیڑے یا بندر میں بدل جاتا ہے۔ آدمی کا کیڑے، بندر یا نیل میں بدن بہ یک وقت آدمی کے زوال اور موت کی علامت ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جدید ادب کی اس اسطورہ میں بھی 'تمین' بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک آدمی، دوسرا کیڑا، بندر یا نیل اور تیسرا انسان کا دیکھنا سے بڑھ کر عظمت کا تصور۔ آدمی و اس کا تصور عظمت غیب میں، جب کہ کیڑا، بندر یا نیل سامنے موجود ہیں۔ ہم جدید ادب کی اس اسطورہ کی تفہیم میں صدمے کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ صدمہ ہوتا ہی اس لیے ہے کہ ہم انسانی عظمت کا تصور رکھتے ہیں، اور انسان کی حقیقی صورت حال اور تصور عظمت میں علیحدگی محسوس کرتے ہیں۔ آپ اس تصور عظمت کو ایک طرف کیجیے، پھر دیکھیے کہ آدمی کا کیڑے یا نیل میں بدلنا ایک معمول کا واقعہ لگے گا، جس سے نہ حیرت پیدا ہوگی، نہ صدمہ، اور نہ ہی آرت۔

امجد نے قصباتی، فطری زندگی کی خاموشی کو سنا اور سمجھا ہے۔ اردو نظم قصباتی و فطری زندگی کے ذکر سے خالی نہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل کے روحانی شعر کی نظموں میں ہمیں فطرت کے مظاہر کا یہی ملتا ہے۔ خود امجد کے معاصر میراجی کی نظم میں جنگل کی فضا ظاہر ہوئی ہے۔ اس ضمن میں امجد کی نظم کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں صرف قصباتی و فطری زندگی کی آواز نہیں ملتی، بلکہ اس آواز کا کرب بھی موجود ہے، جس کا تجربہ جدید انسان نے کیا ہے۔ دوسرے غظفوں میں امجد کی نظم میں دو آوازیں بہ یک وقت موجود ہیں۔ ایک فطرت کی قدیمی، اصلی، اساطیری آواز، اور دوسری جدید عہد کے انسان کی غم آلود آواز۔ اس ضمن میں نظم بن کی چیز یا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس غم کا منظر سرکنڈوں کا جنگل (جو پنجاب میں بہ کثرت ہیں) ہے، شہر اور گاؤں سے دور، خالص فطرت۔ اسی طرح کا جنگل جس کے بارے خود امجد نے کہا ہے:

تم کتنے خوش نصیب ہو آزاد جنگلو
اب تک تمہیں چھوا نہیں انسان کے ہات نے
اب تک تمہاری صبح کو دھندلا نہیں کیا
تہذیب کے نظام کی تاریک برات نے
اچھے ہو تم کہ تم کو پریشاں نہیں کیا
انسانیت کے دل کی کسی واردات نے
ان وسعتوں میں کلبہ و ایوان کوئی نہیں
ان کنکروں میں بندہ و سلطان کوئی نہیں
(گازی میں)

گویا جنگل، فطرت کی قدیمی، اصلی، خالص، اساطیری دنیا ہے۔ اس دنیا کا خاص پن اس لیے باقی ہے کہ اسے انسان کے ہاتھ نے نہیں چھوا۔ انسان کے ہاتھ نے تہذیب کا نظام پیدا کیا ہے، اور اس نظام نے بندہ و سلطان اور کلبہ و ایوان کی تفریق کو جنم دیا ہے۔ ایک حد تک جنگل کا یہ وہی تصور ہے، جسے روحانی شعرا نے ایک مثالی و آدرشی دنیا، یا جنت کے مسائل سمجھا، اور شہری تہذیب سے اکتا کر جس میں پناہ لینے کی آرزو کی۔ اقبال کی نظم ایک آرزو اس کی نہایت عمدہ مثال

ہے۔ امجد کے یہاں اس جنگل میں پناہ لینے کے بجائے، اس کی خالص، قدیم، اساطیری زبان کو سننے اور سمجھنے کی سعی متی ہے۔ بن کی چڑیا میں امجد کہتے ہیں کہ سرکنڈوں کے بن کی چڑیا، صبح سویرے من کی بات بتاتی ہے۔ جس بانی میں چڑیا اپنے من کا بھید کھولتی ہے، اسے امجد نے 'بھمی چونچ' چوں چوں کی چونچل بانی کہا ہے، لیکن اس کی بانی کو کوئی نہیں سمجھتا۔ نہ انسان، اور نہ جنگل۔

کون بنے، ہاں کون بنے، راگ اس کے البیلے
سب کے سب بہرے میدان، وادی، دریا نیلے
ظالم تنہائی کا جادو ویرانوں پر کھیلے!
دور سراپوں کی جھمیل روحوں پر آگ اٹھیلے!

چڑیا گاؤں اور شہروں میں بھی پائی جاتی ہے، مگر اس نظم میں امجد نے بن کی چڑیا کا قصہ لکھا ہے۔ اگر گاؤں یا شہر کی چڑیا کے بیلے راگ کے سلسے میں سب کو بہرہ کہا جاتا تو نظم سانی سے سمجھ میں آ جاتی۔ یہ راگ بات ہے کہ اس صورت میں نظم فطرت سے انسان کی بیگانگی کا پناہوا مرثیہ بن کر رہ جاتی۔ بن کی چڑیا جنگل میں، یعنی اپنے اصلی گھر میں، اپنے ازلی ابدی وطن میں ہے، پھر کیوں اس کی بانی کو سمجھنے والا کوئی نہیں؟ جس کی بانی اس کے اہل وطن بھی نہ سمجھتے ہوں، یا سمجھنے کے باوجود بہرے پن کا مظاہرہ کرتے ہوں، اس سے زیادہ تنہا کون ہو سکتا ہے البتہ اسواں یہ ہے کہ یہ کس بن کی چڑیا ہے، جس کا اظہار جنگل کی ویرانی کو اور بڑھ رہا ہے؟ روایتی طور پر پرندے روح کی علامت سمجھے جاتے ہیں کہ یہ زمین سے بلند ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور ان کی پرواز کا رخ آسمان کی طرف ہوتا ہے۔ یہ روایتی علامتی مفہوم نظم میں ظاہر ہو رہا ہے یا نہیں، اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اساطیر اور شاعری میں پرندے کی موجودگی ہمیشہ علامتی حیثیت رکھتی ہے۔ علامت میں حقیقی و تخیلی عناصر کا امتزاج ہوتا ہے۔ حقیقی عناصر اجتماعی، یکساں، عمومی ہوتے ہیں، جب کہ تخیلی عناصر انفرادی، نئے، اختراعی اور آرکی ٹائپل ہوتے ہیں۔ شاعری حقیقی، اجتماعی، یکساں، عمومی معنی سے وجود میں نہیں آتی۔ بن کی چڑیا کی علامت کا حقیقی معنی تو پنجاب کی دیہی ثقافت ہے، جسے پنجاب ہی میں لکھی جانے والی اردو نظم کے مرکز میں جگہ نہیں ملی، امجد کی نظم اس کی خاموشی کی آواز بنتی ہے! جب کہ بن کی چڑیا کے تخیلی معنی آرکی ٹائپل ہیں۔ ان کا تعلق بہ یک وقت ثقافتی اور جماعتی لا شعور سے ہے۔ چڑیا انسانی ہستی کے نسائی آرکی ٹائپل پہلو کی علامت ہے اس کے من کا بھید، گیت میں چھپا ہے۔ یہ سراپا راگ ہے، آرٹ کی کسی قدیم دیوی کی مانند۔ سرکنڈوں کا جنگل، انسانی سائیکس کا وہ خطہ ہے جس میں گویا ہونے والی چڑیا کی بانی، انسانی شعور کے وہ منطقے سمجھنے سے قاصر ہیں، جنہیں شاعر نے میدان، وادی، دریا اور ٹپے کے علامتی نام دیے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ہستی دو دنیاؤں کی ساخت کا تجربہ کرتی ہے۔ ایک اصل، قدیم، باورائے وقت، اساطیری، خالص دنیا جو سائیکس کی انتہائی گہرائیوں میں مضمر ہے، اور دوسری شعور کی، باہر کی، مدنی، عمرانی، تاریخ اور وقت کی حامل دنیا۔ ایک کے پاس بھید، احساس ہے، اور دوسری کے پاس واقعات، حادثات، تاریخ ہے۔ دونوں کے پاس اپنی اپنی بانی ہے، مگر ایک کی بانی، جسی، اساطیری، علامتی ہے اور دوسری کی زبان منطقی ہے۔ چنانچہ چڑیا کی چونچل بانی کرنوں پر رقصاں ہوتی ہے، جو یک کھل اساطیری، شاعرانہ تمشاں ہے۔ خالص صوت اور روشنی کے امتزاج کی حامل۔ لفظ کے مقابلے میں خالص صوت، وقت سے باہر ہے، ابدی ہے۔ لفظ، تاریخ کے جبر کا شکار ہے اس کا سنگی، یث، تاریخ کی طرح تغیر پذیر رہتا ہے، لیکن خالص صوت، یعنی چڑیا کی چونچل بانی کبھی نہیں بدلتی۔ سائیکس کی گہرائی

سے برآمد ہونے والی خالص، غنائی صوت روشن ضمیری عطا کرتی ہے، اور چڑیا کی خالص، غنائی صوت کا کرونوں پر قصاں ہونا یہی علامتی مفہوم رکھتا ہے۔۳۔

مجید امجد اپنی نظموں میں جس دنیا کی تصویر کھینچتے ہیں وہ صرف انسان اور اس کی آرزوؤں کا جہان نہیں۔ درخت، فصلیں، پرندے، جانور اس دنیا کا حصہ ہی نہیں بلکہ برابر کے حقوق رکھنے والے باشندے ہیں۔ اس ضمن میں مجید امجد کا رویہ خاصی حد تک قدیم اساطیری انسان کا ہے۔ اساطیری انسان ہر شے کو نہ صرف اپنی ہی طرح زندہ محسوس کرتا تھا، بلکہ اپنی دنیا میں ان کے وجود کو نہایت معنی خیز بھی سمجھتا تھا، درخت، جانور، پرندے اس کے خاندان کے افراد کی مانند ہوا کرتے۔ تاہم جب انھیں دیوتا کی حیثیت مل جاتی تو ان کا مرتبہ انسانوں سے بھی بڑھ جاتا۔ فوق انسانی حیثیت اختیار کرنے کے باوجود اساطیری عہد کا انسان انھیں اپنی دنیا سے الگ نہ سمجھتا انھیں اس کی عدستی اساطیری حیثیت کی بنا پر انسانی دنیا کے لیے حدود و قدس اور معنی خیز سمجھ جاتا۔ مجید امجد اساطیری زمانے کے انسان کی طرح درختوں، پرندوں، جانوروں کو اپنی دنیا کے باشندے سمجھتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ایک احساس ایسا ہے جو اساطیر میں موجود نہیں، امجد کی شاعری میں ہے۔ امجد کو یہ حساس کھائے جاتا ہے کہ معاصر انسانی دنیا نے نباتاتی و حیوانی حیات سے مفارقت برتی ہے، اور سنگد، نہ سلوک روا رکھا ہے، گویا جدید عہد نے اساطیری، قدیمی تصورات سے خود کو علیحدہ کر لیا ہے۔ یہ احساس ’توسیع شہر، مسلخ‘ اور ’بارش‘ جیسی نظموں میں نہایت شدت کے ساتھ جا گر ہوا ہے۔ درختوں کا کٹنا، جانوروں کا ذبح ہونا، اور جانوروں کو بار بار بردار بناؤ لے مجید امجد کے دل پر آ رہے چلاتا ہے۔ یوں امجد ان مخلوقات سے جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ دکھ کی ہم احساسی کا ہے۔ لیکن یہاں بھی ہمیں ایک ممکنہ مغالطے سے بچنے کی ضرورت ہے۔ امجد نباتاتی و حیوانی حیات کو انسانی صفات سے متصف نہیں کرتے۔ وہ چیزوں کی اپنی بانی کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں، کٹتے درختوں، ذبح ہوتے اور بوجھ کھینچتے جانوروں کا رعب محسوس کرتے ہیں، وہ ان مخلوقات پر رحم نہیں کھاتے، ان کے ’حقیقی دکھ‘ میں شرکت کرتے ہیں، انسانی دنیا سے ان کی درپردہ Displacement پر ان کی داخلی نفسی حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے میر تقی میر کی نظموں میں جانوروں کی ترجمانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جانوروں کو انسانی صفات سے متصف کرتے ہیں:

کہا جاسکتا ہے کہ میر نے جانور کو انسان کی سی صفات سے متصف کر کے کچھ کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اگر جانور کو مریدانہ اور برتری کی نظر سے دیکھنا غلط ہے (نظیر اکبر آبادی کی طرف اشارہ ہے) تو اسے انسان صفت (Anthropomorphic) بتانا بھی غلط ہے۔ یہ بات صحیح ہے، لیکن یہ نکتہ ملحوظ رکھیے کہ جانوروں سے دلچسپی رکھنا، ان کے وجود کو وجود ماننا، ان کے حقوق کا قائل ہونا، ان کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، یعنی ان کے ساتھ ایک وردی (Empathy) رکھنا مریدانہ دلچسپی یا کارآمد ہونے کے باعث ان کو مطیع بنانے سے بدرجہا بہتر ہے۔ میر کی ایک وردی (Empathy) شہ و مظاہر سے ن کی محبت کی دلیل ہے، اور اس صفت میں اردو کا کوئی شاعر ان کا ہم سر نہیں۔۴۔

فاروقی صاحب کی نظر سے امجد کی نظمیں نہیں گزریں، وگرنہ وہ دعویٰ نہ کرتے کہ اشیاء و مظاہر سے محبت میں اردو

کا کوئی شاعر میر کا ہمسر نہیں۔ میر بلاشبہ اردو کے عظیم شاعر ہیں، لیکن نباتاتی و حیوانی حیات سے محبت میں امجد میر صاحب سے بڑھ کر ہیں۔ جانوروں کے ضمن میں دونوں شعرا کے احساسات کا فرق دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ فاروقی صاحب نے میر کی مثنوی 'موتنی ملی' سے چند اشعار میر کی ایک دردی کی شہادت کے طور پر پیش کیے ہیں۔ پہلے وہ ملاحظہ کیجیے۔

بلیاں ہوتی ہیں اچھی ہر کہیں
یہ تماشا سا ہے ملی تو نہیں
گرد رو ہاندے تو چہرہ حور کا
چاندنی میں ہو تو جھہ نور کا
بلی کا ہونا نہیں اسلوب یہ
ہے کہودی چشم یک محبوب یہ
دیکھے جس دم یک ذرا کوئی اس کو گھور
چشم شور آفتاب اس دم ہو کور
داغ گلزاری سے اس کے تازہ باغ
اس زمان تیرہ کی چشم و چراغ
کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفس
کیا مصاحب بے بدل کیسی جلیس
یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز
آنکھ دوڑے ہی نہ ہو کیسی ہے چیز

آپ نے ملاحظہ کیا، میر صاحب کے یہ اشعار بلی کی طرح میں ہیں۔ جن صفات کی بنا پر بلی کے لیے تحسینی کلمات منظوم کیے گئے ہیں، وہ دراصل انسانی صفات ہیں۔ اعلیٰ دماغ، نفس طبیعت انسانی صفات ہیں۔ میر صاحب نے بلی کو انسانی نظر سے دیکھا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک شے کے بجائے ایک وجود نظر آتی ہے، لیکن اس وجود پر انسانی اوصاف کی پرچھائیاں اس قدر ہیں کہ بلی کی اپنی حقیقی شناخت کہیں دب گئی ہے۔ اب مجید امجد کی نظم 'پارکش' دیکھیے

چینتے پیسے، پتہ پتھر ملا، چتے بچتے سم
تپتے ہو کی رو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان
بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جنورا ترا یہ جتن
کالی کھال کے نیچے گرم گھٹھے ماس کا مان

لیکن حیری یہ ابلتی آنکھیں، آگ بھری پر آب
سارا بوجھ اور سارا کشت ان آنکھوں کی تقدیر
لاکھوں گیانی، من میں ڈوب کے ڈھونڈیں جگ کے بھید
کوئی تری آنکھوں سے بھی دیکھے دنیا کی تصویر!

کہا جاسکتا ہے کہ میر صاحب نے ایک پالتو جانور پر نظم لکھی اور امجد نے بار بار جانور پر اس لیے ایک نظم میں مدح ہی مدح ہے اور دوسری میں دکھ ہی دکھ۔ بلاشبہ یہ فرق پیش نظر رکھا جانا چاہیے، لیکن یہ فرق بھی سامنے رہنا چاہیے کہ امجد نے بوجھ کھینچتے جانور کی حقیقی صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے، جب کہ میر صاحب نے بی کا مثالی تصور پیش کیا ہے، ایک نظم میں غلو آمیز استعارے ہیں اور دوسری میں جچی تلی تشبیہات ہیں۔ امجد کی دو بندوں کی یہ نظم جس فنی کمال کے ساتھ پتھر پٹی سڑک پر بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے، گرتے سنبھلتے گھوڑے یا خچر کی تصویر پیش کرتی ہے، وہ داد سے بالاتر ہے۔ پورا شعری بیانیہ جانور کی حالت پر مرکوز ہے نظم کا مشکل ہی نہیں خود نظم بوجھ کھینچتے جانور کو مخاطب کرتی ہے، اس کی ابلی آ نکھوں میں جھانکتی ہے جن میں آنکھیں آنسو میں نظم انھی آنسوؤں کی زبان سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ آنکھیں آنسو اس لیے ہیں کہ جانور کو اپنی دنیا کا حصہ نہیں سمجھا گیا، اسے اپنی دنیا سے باہر سمجھا گیا ہے، جسے تسخیر کیا جاتا ہے، جسے اپنے مفاد کے لیے بروے کار لیا جاتا ہے، دہریوں اسے ایک وجود کے بجائے، ایک شے سمجھا جاتا ہے۔ امجد کی نظم نہ صرف گھوڑے یا خچر کو ایک وجود سمجھتی ہے، دہرائی ہی دنیا کا حصہ سمجھے جانے پر اصرار کرتی ہے بلکہ اسے ایک منفرد وجود بھی قرار دیتی ہے، جس کے پاس دنیا کو دیکھنے کے لیے ایک اپنی نظر بھی ہے۔ نظم ن سب گمانوں پر ایک لطیف طنز کرتی ہے جو اپنے من میں ڈوب کر جگ کے بھید پاتے ہیں، لیکن جگ کے بھید میں، کرب سے، ابلی آنکھوں کے درد کا بھید شامل نہیں۔ چنانچہ جگ کے گیان پر ایک سوالیہ نشان قائم ہوتا ہے۔ وہ کیا گیان ہے جو ایک زندہ وجود کی آنکھیں آنکھوں کی تحریر نہیں پڑھ سکتا؟ کیا امجد یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جانوروں کے ساتھ سنگدرد نہ سلوک کا اصل باعث ہمارے گیان ہے جو دراصل 'انسان مرکز' ہے؟ ہم اپنے وجود کی معرفت میں بھی ایک قسم کی نرگسیت کا شکار ہوتے ہیں، اور اپنے من میں جس جگ کے بھید پاتے ہیں، وہ جگ ہم سے شروع ہوتا اور ہم پر ختم ہوتا ہے۔ مجید امجد گمانوں کو متوجہ کرتے ہیں کہ کوئی تو ایسا صاحب دل و نظر سامنے آئے جو ابلی، آگ بھری پر آب، آنکھوں سے دنیا کی تصویر دیکھے۔ یہ تصویر کیسی ہوگی؟ امجد یہ سوال کھد چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اس سوال کے ممکنہ جواب کی طرف اشارے نظم ہی میں موجود ہیں۔ نظم یہ عندیہ دیتی ہے کہ گیانی کو اپنے من کی جانب مرکوز آنکھوں سے دست کش ہونا پڑے گا، تاکہ وہ اپنی پیشانی پر بارکش کی، باہر کی طرف دیکھتی ابلی آنکھیں چسپاں کر سکے۔ بارکش کے پاس بھی ایک گیان ہے، جو اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا ہے۔ انسان، جانور کو غیر سمجھتا ہے، اسی لیے اس سے بارکش کا کام بیٹا ہے، اگر اس 'غیر' کی نظر سے دنیا کو دیکھے گا تو اسے اپنا وجود، اپنا گیان 'غیر' لگے گا۔ غم اور غصے سے ابلی آنکھوں کے سامنے دنیا کیسی لگے گی؟ اس وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اس نظم میں بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جانور پر رحم اور ترس نہیں کھایا گیا، (البتہ ایک احساسی نظم میں موجود ہے) نہ چابک مارنے والے کو بر بھلا کہا گیا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ہوتیں تو نظم ایک سیدھی سادھی احتجاجی تحریر میں بدل جاتی۔

اصل، خاص، قدیمی، ابدی آواز کا منبع اجتماعی انسانی سائیکس کی گہرائی ہے، یہ انسانی سائیکس میں ایک لافانی آواز ہے، اس تک رسائی کا مطلب، انسانی ہستی ہی میں مضمر ایک دیوتائی عنصر تک رسائی ہے، ایک اعتبار سے یہ بشری حد سے باہر قدم رکھتا ہے، اور دوسرے اعتبار سے بشری حد کو وسعت و ارتقا سے ہمکنار کرنا ہے۔ چنانچہ یہ شاعرانہ، جمالیاتی عمل خود بہ خود قدیم، اسطوری جہت حاصل کر لیتا ہے۔ اس تجربے کی حامل شاعری کی تمثیلیں خالص حسی ہوتی ہیں، مگر ان کی یہ اسطور سازی کا سلامتی نظام وجود میں آ جاتا ہے۔ مجید امجد کے یہاں اصل، قدیمی، ابدی حقیقت کو مس

کرنے کی کیفیت کی نظموں میں ملتی ہے، تاہم کہیں یہ آواز ہے، کہیں رنگ، کہیں خوشبو، کہیں نور و روشنی، اور کہیں رس ہے۔ مثلاً 'پیش رو' میں یہ نسو کی قوت ہے، اور صاحب کا فروٹ فارم میں اس کا اظہار رس کی صورت ہوا ہے۔ 'بن کی چڑیا' میں آواز علت مت ہے اور صاحب کا فروٹ فارم میں رس، اور اسی نسبت سے نظم میں حسی عد متیں برتی گئی ہیں۔

نظم صاحب کا فروٹ فارم پہلی سطح پر تو اپنی دھرتی، اپنی مٹی کے اثبات سے جہارت ہے۔ نظم کی دوسری سطح اس اثبات کی نوعیت ہے۔ شاعر نے کسی سیاسی نظریے یا مذہبی آئیڈیالوجی کے تحت اپنی مٹی کا اثبات نہیں کیا؛ دھرتی کا اثبات، دھرتی سے ماورا ہو کر نہیں کیا۔ دھرتی سے ماورا آئیڈیالوجی، دھرتی پر چارے کی رلا، ہموار کرتی ہے، یعنی سے محض ایک شے سمجھتی ہے۔ شے کو قبضے میں لیا جاتا، اس کا خون چوسا جاتا، اپنی طاقت و دولت میں ضا ف کیا جاتا ہے۔ جب کہ دھرتی کو اس کے فطری، حقیقی اوصاف کے ساتھ قبول کرنا ایک جمالیاتی رویہ ہے، اس کے حسن کی سٹائش ہے، اور اس سے حفظ کشید کرنا ہے۔ چوں کہ آدمی حیاتیاتی سطح پر دھرتی سے بندھا ہے، آدمی خاک کا پتلا ہے، اسی خاک سے آدمی کی حیات ہے، اور اسی میں وہ بالآخر جاتا ہے، اس لیے آدمی اور دھرتی میں حقیقتاً کوئی بیگانگی نہیں۔ لیکن آدمی مٹی پر چارہ چاہتا ہے۔ اسی خیال کو کبیر نے ایک دوہے میں نظم کیا ہے۔

مائی کہے کھار سے ٹو کا روندھے موئے
اک دن ایسا ہوئے گا میں روندھوں گی توئے

مجید امجد مٹی، جینی، پٹی اصل کا اثبات کرتے ہیں۔ یہ اثبات بھی خیال کی سطح پر نہیں، فن کی سطح پر ہے۔ اسی لیے نظم میں دھرتی ایک نسائی آرکی ٹائپل ایج میں ڈھتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ اتفاق نہیں کہ اس نظم کی، ابتدائی مائیں بھی نسائی، میج ہی ابھارتی ہیں۔ "یہ دھوپ، جس کا مہینہ نچل رہا ہے مس ہے... برتوں کا رس ہے"۔ نیز پوری نظم میں ہر تمثال متحرک ہے؛ اس میں ایک زندہ وجود کی حرکت کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ حرکت رقص یعنی فن کی حرکت ہے۔ درج ذیل مصرعوں کو پڑھیے اور بھری تمثالوں کی رقص کیفیت کا نظارہ کیجیے۔

تمام چاندی جو زم سٹی نے پھونٹے بور کی چٹکتی چنبیوں میں انڈیل دی ہے
تمام سونا جو پانیوں، شبنموں، شگوفوں میں بہہ کے ان زرد سنگتروں سے اہل پڑا ہے
تمام دھرتی کا دھن جو بھیدوں کے بھیس میں دور دور تک سرور الیوں پر بکھر گیا ہے

رس نظم کی کلیدی علامت ہے۔ رس پھوں سے حاصل ہونے والا سیال مادہ ہے، رتوں کی پر بہار حاست ہے، یہ معرفت کا نچوڑ ہے، یہ آرٹ کی نشاۃ کیفیت ہے، ایک طرح کی کثیر جذبیت اس لفظ میں سرایت کیے ہوئے ہے، ورنہ یہ کثیر جذبیت امجد کی اس نظم میں بھی ہے۔ پوری نظم ایک عجب رواں، نشاطیہ کیفیت کی حامل ہے۔ یہ کیفیت نظم کی حسی تمثالوں سے چھن چھن کر آ رہی ہے، بالکل ایسے جیسے دھرتی کے اندر کا سونا، چاندی، یعنی سارا دھن پھلوں، پھولوں، پتیوں، ڈالیوں میں بھرا یا ہے۔ دھرتی کی قوت نمو کا بے محابا اظہار ہو رہا ہے۔ رنگ، خوشبو، روشنی اور اس کے متعلقات (جیسے دھوپ، آگ، دیا) کی تمثالیں اس نظم کی بنیادی تمثالیں ہیں۔ یہ سب غیر تاریخی، یعنی فطری ہیں اور اسی لیے وقت کو مات دینے کا مفہوم رکھتی ہیں۔

سہو میں بھر لو، یہ مدھ، یہ مدرا، کہ اس کی ہر بوند سال بھر صراحیوں میں دیے جلانے
یہی قرینہ ہے زندگی کا، اسی طرح سے لپکتے، قرونوں کے اس چمن میں نہ جانے کب سے

ہزار ہا تپتے پیلے سورج، اندھا رہے ہیں وہ کچھلا تانبہ، وہ دھوپ، جس کا مہینہ - نچل

دلوں سے مس ہے، وہ زہر جس میں دکھوں کا رس ہے

جو ہو سکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل

کبھی کبھی ایک بوند اس کی، کسی نوا میں دیا جلانے

تو وقت کی پیگ جھول جائے

گویا پھوٹوں، پھلوں سے لبریز دھرتی ایک سے خانے کی طرح ہے جس کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے کھلے ہیں؛ اگر اس سے خانے سے فیض یاب ہوا جائے تو وقت، تاریخ، لمحہ، حاضر کے استبداد کو شکست دی جاسکتی ہے۔ رس سے ذات کے سہو کو بھر لینے کا تجربہ، نشاط انگیز ہے۔ یہ نشاط صرف دھرتی کے رس سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ خالص شاعری یعنی آرت کے رس سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ یوں نظم میں جس کی دونوں اہم قسمیں ظاہر ہو رہی ہیں، فطرت کا حسن اور فن کا حسن، رس، حسن کی ان دونوں قسموں کو محیط ہے۔ شاعر کا کمال یہ نہیں کہ اس نے فطرت اور فن کے جمال کو یک جا کیا ہے؛ بلکہ ایک ب چیزوں کو جمع کرنا، ورنہ ان میں سے ایک چیز کی کیفیت کی شدت کو، دوسری یکساں چیز کی مدد سے بڑھانا تو کوئی کام نہیں۔ یہ کام تو معمولی تخیل کا شاعر بھی کر سکتا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ متضاد اشیاء کو یک جا کیا جائے، یا یکساں اشیاء میں تضادات کا انکشاف کیا جائے، اور پھر یکسانیت و تضاد کے معرض التوا میں رہنے کا منظر اجاگر کیا جائے، تاکہ معنی در معنی، کیفیت در کیفیت کی صورت پیدا ہو سکے۔ فن کا کام کسی ایک معنی یا کیفیت کی بحالی شعلگی پیدا کرنا نہیں، بلکہ معانی یا کیفیات کی ایک ایسی جلی پیدا کرنا ہے، جو انسان کو اپنے باطن کی گہرائیوں میں دور تک، اور وقت کی پہنائیوں میں دور تک لے جاسکے۔ یہی کام امجد نے اس نظم میں کیا ہے۔ تیس مصرعوں کی، اس نظم کے ٹھارہ مصرعے فطرت کے حسن کی محاکات کرتے ہیں۔ نیسویں مصرعے میں اچانک ایک بانگ سا جھنکا لگتا ہے، فطرت کے رس کے ساتھ ہی، ہر بھرے دکھوں کے رس کا ذکر ہوتا ہے۔ قاری ایک لمحے کو رکتا ہے، اب تک وہ رس کے ایک نشاط انگیز، مدد بھرے تصور کی رو میں بہت چل آ رہا تھا کہ اچانک وہ زہر، جس میں دکھوں کا رس ہے اسے روک لیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے یہ کس دکھ کا زہر ہے، جسے نظم کا مشکلم رتوں کے، مرث کے ساتھ اپنے من کی چھاگل میں بھر لینے کی ترغیب دے رہا ہے؟

جو ہو سکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل

کبھی کبھی ایک بوند اس کی، کسی نوا میں دیا جلانے

تو وقت کی پیگ جھول جائے

یہ ایک اعتبار سے وہی بات ہے جسے امجد نے نظم جا روپ کش میں پیش کیا تھا، کہ کوئی ایک غم انسان کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ دکھ کا زہر کسی شخص کی، فتنے یا صدمے کا نہیں، خود حیات کا دکھ ہے، اپنے ہونے کا دکھ ہے جو دھوپ کے مہینے آنچل کی طرح دلوں سے مس ہے، یعنی دکھ، اور نشاط سے انسان کا رشتہ ازلی وابدی ہے۔ اب تک نظم میں رس، رتوں کی پر بہار حالت کا مفہوم لیے ہوئے تھا، اب اس میں ہستی کی معرفت کا مفہوم شامل ہو گیا ہے۔ رس کے یہ دونوں مفہیم بہ یک وقت اشتراک و تضاد رکھتے ہیں۔ ایک رتوں کا، مدد بھرا رس ہے، اور دوسرا زہر بھرے دکھوں کا رس ہے، یوں دونوں تضاد ہیں۔ ایک دھرتی کی 'سائیکی' یعنی اصل سے پھوٹا ہے، اور دوسرا انسانی سائیکی کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے، یوں دونوں مشترک اصل رکھتے ہیں، اور یہی مشترک اصل انسان کو دھرتی اور اس کے جملہ مظاہر جیسے نباتات، پرندوں، جانوروں سے

ہم رشتہ کرتی ہے۔ (فطرت کی سائیکس اور اپنی سائیکس کی طرف رجوع گھر واپسی یہاں کی گود میں واپسی کا تجربہ بھی ہے)۔ یہ وجود کی وہی مکمل معرفت ہے، جسے مجید امجد نے اپنی دوسری نظموں میں بھی پیش کیا ہے۔ وجود کا مکمل عرفان اس کا سوا کیا ہو سکتا ہے کہ تضادات کو ایک ساتھ گرفت میں لیا جائے، ان کو تحلیل کرنے، یا ان کا نکار کرنے کے بجائے، انہیں تسلیم کیا جائے۔ رتوں کے رس کے ساتھ، دکھ کے زہر کی آگ سے من کی چھ گل بھر لینا، دراصل تضاد کو تسلیم کرنا ہے۔

یہاں پہنچ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظم صاحب کے فروٹ فارم کو بیان نہیں کر رہی ہے، اور نہ صاحب کے فروٹ فارم سے شاعری کشید کر رہی ہے۔ اس نظم میں شاعری کا علاقہ شریع ہی وہاں سے ہوتا ہے، جہاں سے کسی صاحب جاگیر کا فروٹ فارم ہماری نظروں سے اوجھل ہونے لگتا ہے، صاحب کا فروٹ فارم، دھرتی کی، حیات کی، ہر شے کی ازلی ابدی قوت نمو کے بے محابا اظہار کی ترجمانی کرنے لگتا ہے، اور اس صاحب کا سہ خانہ بن جاتا ہے جس کے بارے میں کبیر نے کہا ہے:

صاحب میرا ایک ہے دو جا کہا نہ جائے

دو جا صاحب جو کہوں صاحب گھرا رسائے

صاحب اور فروٹ فارم کے معانی اور مراتب بدل جاتے ہیں۔ فروٹ فارم تو ظاہری performance ہے، رس کی، حسن کی، نشاط کی۔ رس گر امر کی طرح ہے، جو ساری 'پرفارمنس' کی اصل ہے۔ رس اپنا اظہار 'پرفارمنس' میں کرتا ہے۔ امجد کی نظم رس اور اس کی 'پرفارمنس' دونوں کی بہ یک وقت حامل ہے، اور اسی لیے ان دونوں پر غائب ہے، اور دونوں سے زائد، اور کافی الگ بھی۔

دھرتی کی قوت نمو، اس کی سائیکس، اس کی اصل ہے، جو زلی، ابدی، تقدیری ہے، در یہ غیب میں ہے؛ جب کہ پھل، پھول، پیتاں، ڈالیاں، دھرتی کا ظاہر و موجودگی ہیں، اور اس کا حسن ہیں، اور اسی لیے عارضی ہیں۔ امجد کی نظم کا آرٹ ابدی اور عارضی کے تضاد کو کچھ ایسی فنی ہنرمندی سے باقی رکھتا ہے کہ تضاد تو باقی رہتا ہے، مگر مغائرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح رس، فروٹ فارم کی پرفارمنس میں سرایت کر جانے کے باوجود، اپنی الگ پہچان باقی رکھتا ہے، مگر رس اور پرفارمنس میں مغائرت باقی نہیں رہتی، اسی طرح ازلی، ابدی حسن اپنے عارضی مظاہر میں سرایت کرتا ہے تو دونوں کی مغائرت ختم ہو جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ غیب میں بھی رہتا (دھرتی کا دھن ہزاروں بھیس میں رونما ہونے کے باوجود خراج نہیں ہو جاتا) ہے، اس لیے عارضی مظاہر حسن سے اس کا فرق بھی باقی رہتا ہے۔ یوں مجید امجد اپنی شاعری میں ایک ایسی جمالیات کو خلق کرتے ہیں جو حسن کی موجودگی کا حسی ادراک بھی کراتی ہے، "ور حسن کی ایک علیحدہ، خود مختار، بے کنار کائنات کی طرف دھیان بھی منتقل کرتی ہے۔ جس اپنے طمع سے وابستہ بھی رہتا ہے، اور فطرت کے پت پت میں، شاعری کی تمثالوں میں، مصرعوں کے آہنگ میں، اور ان سب سے پیدا ہونے والی انسانی وجود کی مکمل معرفت میں بھی سرایت کیے ہوتا ہے!"

حواشی

۱۔ یحییٰ امجد، "پاکستانی عوامی، دہلی کلچرل پبلیشرز"، مشہورہ: "مجید امجد ایک مطالعہ (مرتب حکمت ادیب)، جھنگ ادبی

اکادمی جھنگ، ۱۹۹۴ء، جس ۳۶۷

۲۔ ی، جی، ڈرونک، Memories, Dreams, Reflections، ونٹاژ بکس، نیو یارک، ۱۹۸۹ء، ص ۲۷۸

۳۔ مجید محمد نے جنوری ۱۹۶۹ء میں چڑیا پر دو مزید نظمیں تخلیق کیں۔ اسے ری چڑیا اور بہار کی چڑیا۔ دونوں نظموں میں چڑیاؤں کو اپنی دنیا کا حصہ سمجھا گیا ہے۔ پہلی نظم میں کمرے کے رہزن میں مقیم چڑیا کو مخاطب کیا گیا ہے، اسے مطلع کیا گیا ہے کہ ڈسٹن آنکھیں اس کی ٹانگ میں ہیں، اور اسے چمکانے والے ایک جگہ اس کا پیری ہے۔ اس لیے وہ بن بیویوں میں چلی جائے۔ اس نظم میں بھی یہ نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ نہ فی دنیا نے چڑیا کو پنہاں نہیں ہے۔ بہار کی چڑیا میں نوجوان چڑیا کی جوڑے کی کتھا لکھی گئی ہے۔

۴۔ شمس الرحمن فاروقی، ”میر صاحب کا زندہ بچا نب گھر“، مشورہ، خطبات، شعبہ، اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ (مرتبین خاند محمود، شہپر رسول) مکتبہ جامعہ، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۶۴

☆.....☆.....☆

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے ویس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پیسل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

فیض کی شاعری میں تلازماتِ عشق

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان

اردو شاعری کا محور و مرکز ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور وہ ہے ”عشق“۔ ”عشق“ اصداً عربی زبان کی اصطلاح ہے جو آپ جانتے ہیں کہ محض گل و بلبل کی جھوٹی چکی کہانیوں تک محدود نہیں ہے۔ عشق تو ایک فلسفہ ہے، ایک اندازِ فکر ہے ایک طریقِ حیات ہے۔ عطیہ خداوندی ہے۔ یک رحمت ایزدی ہے جو انسان کے دس پر ناز ہوئی۔ ادب کے طالب علم عشق کی اصطلاح سے، اس کی وسعتوں سے، اس کے تلازمات، مترادفات اور علامات سے خوب خوب واقف ہیں۔ ایک طرف محبوب، حسن، ناز و بے گانگی اس کے تلازمات ہیں تو دوسری طرف عاشق، عبودیت اور عارفیت کے تصورات بھی عشق کے تصور سے جڑے ہوئے ہیں۔ محبت، الفت، پیار اور مہر تو خیر عشق کے مترادفات ہیں ہی شوق، تمنا، جستجو، جنون، جذب، غم، ہر مستی آرزو، امید جیسی کیفیات دراصل عشق کے ایسے تلازمات ہیں جنہیں تقریباً مترادف ہی سمجھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ بے لگی و بختوں، گل و بلبل، باد و ساغر جیسی بے شمار تراکیب ہیں جو عشق کے تصور سے جڑی ہوئی ہیں۔ اپنے تمام مترادفات، تلازمات اور تراکیب کے ساتھ ”عشق“ کا فلسفہ اردو شاعری کی رگوں میں لبو کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔ بعض اوقات عشق کو مجازی اور حقیقی کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن سب ہی جانتے ہیں کہ مجاز اور حقیقت میں برائے نام ہی فاصلہ موجود ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مجاز ہی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے حقیقت تک پہنچنے کی پہلی سیر ہی عشق مجازی ہی ہے۔ گویا ”عشق“ کا دائرہ کار اس قدر وسیع و عریض ہے کہ روحانی اور مادی، دونوں دنیاؤں پر محیط ہے اس ہمہ گیر اور عمومی تصور میں سے ہر دور اور ہر معاشرے نے اپنے لیے چند مخصوص تلازمات کا انتخاب کیا اور ان کی مدد سے اپنا گویا ایک ضمنی تصور عشق ترتیب دیا۔ یہ ضمنی تصورات ایک وسیع تر تصور عشق کا حصہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں کیونکہ ایک گروہ میں چند مخصوص تلازمات عشق، دیگر عمومی تلازمات عشق پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ یہی مخصوص تلازمات اس گروہ کے عشقیہ فلسفے کی تفسیر کرتے ہیں جو دوسرے گروہ سے مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو شاعری کو ہی دیکھ لیجیے۔

اردو شاعری کے دکنی عہد میں عورت، حسن، سراپا اور جنس کے تلازمات عشق نمایاں رہے۔ اس تصور میں مقامی عشقیہ روایت کے اثرات بھی حد درجہ اہمیت کے حامل تھے۔ مقامی روایات میں تصور عشق کا ایک اہم تلازمہ عورت تھی۔ اس تصور میں کام، دھرم کا حصہ تھا اور جنسی عمل کو مذہبی تقدس حاصل تھا۔ ان مقامی روایات نے فارسی ادب سے آنے والی عشقیہ روایات سے ملنے کے بعد ایک نئی صورت اختیار کی اور دکنی عہد ہی وہ دور تھا جب ہر سطح پر مقامی اور فارسی روایات کی آمیزش، ور پھر آمیزش ہوتی نظر آئی۔

ولی کے بعد فارسی روایات، کا اثر کچھ زیادہ ہو لیکن شلی بند میں جہد ہی اردو شاعری نے پناہ ملائی

خود تعمیر کیا اور اس کے بعد اردو شعر، میں ایسی خود اعتمادی نظر آئی کہ انہوں نے اپنے شاعرانہ بچے وضع کیے۔ عشق گرچہ بنیادی موضوع رہا لیکن ہر شاعر اپنے مخصوص تلازمات عشق کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف نظر آیا۔ میر تقی میر، درد اور مرزا رفیع سودا ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن تینوں کا لب و لہجہ تصور عشق، انداز فکر، طریق زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان تینوں شعرا نے اردو شاعری کو تین اہم لہجے عطا کیے ان کے تلازمات عشق تلاش کیجیے تو اندر وہ ہوگا کہ میر جن تلازمات کو اہمیت دیتے ہیں وہ ان تلازمات سے مختلف ہیں جنہیں سودا کے ہاں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

درد صوفی ہیں۔ ان کے نزدیک عشق دراصل عشق حقیقی کا ہی نام ہے۔ ان کے ہاں درد، غم، مجاز، حقیقت، حسن، جبر، وحدت اور کثرت، حجاب، رضامندی اور احساسِ سپردگی جیسے تلازمات عشق کے تصور سے وابستہ ہیں۔

میر تقی میر کا تو بنیادی حور، وہ ہی عشق ہے ہم جسے عاشقانہ لہجہ کہتے ہیں وہ میر کا ہی لہجہ ہے۔ نہیں بچپن سے ہی عشق کی تعلیم ملی۔ والد اور پھر سید امان اللہ کی صحبت، اس کے ساتھ دینی سے حالات، ان سب چیزوں نے دل کر میر کے دل میں عشق کی زبردست آگ روشن کر دی تھی۔ میر کی شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کیا، عشق کی دیگر ممکنہ جہتیں بھی آپس میں مدغم نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر کے ہاں عشق ہی مقصود بالذات ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میر نے مثنویات میں تو عشق کی اہمیت اور فلسفے پر خاصی گفتگو کی ہے لیکن غزلیات میں بیشتر اوقات صرف عدم تشبیہات اور تلازمات کی مدد سے عاشقانہ لہجہ تعمیر کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق مجازی و عشق حقیقی، غم جاناں اور غم دوراں مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور اس طرح کے شعرا میں جو بظاہر دل سے متعلق ہیں کہ

دل وہ مگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاو گے سنو ہو یہ بہتی اجاڑ کے

یا یہ کہ

دل بے خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

ۛ

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن و احوال نے

ایسے اشعار میں انگلی رکھنا مشکل ہے کہ کہاں دل کا ذکر ہے اور کہاں دلی کا غم، اتنا خود داری انسان دوستی تصوف، احساسِ زیاں میر کے عشق کے بنیادی تلازمات ہیں۔

اسی عہد کے شاعر سودا بھی ہیں۔ قصیدہ گوئی میں ان کے موضوعات بیشتر خارجی نوعیت کے رہے۔ لیکن غزلیات میں ان کا محور عشق ہی ہے۔ البتہ نہ ہی وہ میر کا درد مندانہ عاشقانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں، نہ درد کی طرح راضی بہ رضا ہو جانے کا Temperament رکھتے ہیں لہذا سودا کے عشق کی بات ہوگی تو ذہن میں انحراف،

بھاوت، مدکار، چیلنج، پیکار، طنز اور بلند آہنگی جیسے تلازمات ابھریں گے۔ لکھنؤ کے اسکول میں محبوب، نظر، ادا، جسم، نشہ و وصل جیسے تلازمات کو بنیادی ہیئت حاصل رہی۔ اس کے بعد آنے والوں میں غالب، جیسے شاعر ہے۔ غم، تصوف، جسم، داخل، خارج، محبوب حسن، نیرنگی دوراں، انسان دوستی، بے باکی، انا، عاشق، شگفتگی، قوت، تجسس، شوق، تمنہ جیسے تصورات غالب کے تصور عشق کے اہم لوازم ہیں۔ غالب نے غم جہاں کے لیے غم رورگار کی اصطلاح استعمال کی اور بظاہر اسے غم یا ر سے جدا کرنے کی کوشش کی لیکن حقیقت ہے کہ انہوں نے دونوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ وہ عشق کو اجتماعیت سے یوں جوڑ دیتے ہیں کہ داخل و خارج کا فرق مٹ جاتا ہے اور شعر کا رشتہ محبوب کے ساتھ سیاست دوراں سے بھی جڑ جاتا ہے۔
یہ اشعار دیکھیے۔

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھاؤں
نگیاں نگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

قد و گیسو میں قیاس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دام و برسن کی آزمائش ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ سب اشعار دردِ دل، قد و گیسو، جنون جیسے عاشقانہ تلازمات کے باوجود سیاسی مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ گو یا مرزا غالب کا عشق نجی ہونے کے باوجود عصرِ حاضر کے مسائل سے بھی جڑا نظر آتا ہے۔ غالب کا عشق سب سے مختلف جدید تر اور اپنے عہد سے ہم آہنگ ہے۔

غالب کے بعد عشق کا ایک نہایت متحرک اور طاقتور تصور قبائل کے ہاں نظر آیا۔ اقبال نے اپنے بے مختلف تلازمات عشق کا انتخاب کیا۔ احساسِ غم کی جگہ تڑپ اور سوز، جبر و فنا کی بجائے احساسِ خودی اور حریت، موت کے بجائے زندگی ان کے عشقیہ تلازمات ہیں۔ اقبال کا عشق ایک طرف خدا سے ہمکلام ہے تو دوسری طرف سیاسی اور سماجی مسائل سے بھی منسلک ہے۔ وہ عشق حقیقی کے ذریعے قوم کے عصری مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ قوت، حرکت، زندہ دلی، وسعتِ کائنات، مریض و مومن، خودی، انقلاب، معرکہ آرائی جیسے تصورات اقبال کے تلازمات عشق ہیں۔

میر، درد، سودا، غالب اور قبائل کے علاوہ انیس، جوش، نظیر اکبر آبادی یا کسی بھی اہم شاعر کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو یہی بات سامنے آئے گی کہ شاعر ”عشقیہ تلازمات“ کے دفتر سے اپنی آفتابِ طبع اور اپنے ماحول کے مطابق چند تلازمات کو نمایاں کرتا ہے یا دیگر تلازمات پر فوقیت دیتا ہے۔ اور پھر تخلیقی قوت و وجدان کے بل پر ان تلازمات کو تہہ داری، پیچیدگی اور نئی معنویت بھی عطا کر سکتا ہے۔ اس طرح عام سے تلازمے خاص بن جاتے

ہیں بلکہ بعض اوقات تو شاعری کی ملکیت ہی ہو جاتے ہیں۔

اس پس منظر میں فیض احمد فیض کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو پہلی چیز تو یہ نظر آتی ہے کہ احساس ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض اردو شاعری کے عاشقانہ مزاج، ”عشق“ کے مشرقی اور مغربی تصورات اور اس میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں سے کبھی طرح واقف تھے۔ اردو شاعری کی عشقیہ روایت سے انہوں نے میر کی درد مندی اور انسان دوستی، سودا کی بے اطمینانی، درد کی درویشی، غالب کا سماجی شعور اور اقبال کی، انقلاب پسندی کے اثرات قبول کیے اور پھر انہیں اپنے رنگ میں، اپنے لہجے میں، اپنے ڈکشن اور اپنے استعارات و علامت کے ساتھ پیش کیا۔ جس طرح میر کے ہاں دل و روتی میں فرق کرنا ممکن نہیں اسی طرح فیض کے ہاں محبوب اور وطن میں تفریق باقی نہ رہی۔ غالب کی طرح فیض کا سلسلہ بھی قد و گیسو سے دار و رس تک پھیلا ہوا ہے۔ اقبال کی طرح فیض بھی زندگی کو تبدیل کرنے کے خواہش مند ہیں لیکن ان سب ممالکوں کے باوجود فیض نہ میر ہیں، نہ غالب نہ اقبال وہ اپنی ایک علیحدہ شناخت۔ ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند ہیں لیکن ان کی محبت، کیا ترقی پسند اور کیا دیگر مکتبہ فکر، سب کو اپنے دائرہ اثر میں رکھتی ہے۔ یہی فیض کا مزاج تھا یہی ان کی شاعری کا بھی مزاج ہے۔ اور یہی اردو شاعری کا بھی مزاج ہے۔

اردو شاعری کی روایت کے مطابق فیض احمد فیض کی شاعری کا مرکز و محور ”عشق“ ہے۔ فیض عشق، پیار، محبت، مہر اور لفت جیسے مترادفات بھی استعمال کرتے ہیں لیکن عشق یا اس کے مترادفات کی بے جا تکرار ان کے ہاں موجود نہیں۔ زیادہ تر وہ ”عشق“ کے غلازمات و اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں، ورنہ ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ زبان، یہ گفتگو یہ کیفیت کسی عشق کی ہیں۔

فیض کے ہاں عشق یا اس کے مترادفات اور غلازے اکہرے نہیں رہتے بلکہ اکثر تہہ دار ہوتے ہیں۔ بیشتر غلازمات عشق، فیض کے ہاں خود اپنے آپ میں استعارے Metaphor کی شکل اختیار کر بیٹے ہیں اور یوں فیض کی شاعری کے غلازمات عشق ایک اعتبار سے فیض کی ملکیت نظر آتے ہیں۔ ایسی ملکیت جو ذاتی ہوتے بھی اشتراکی ہے۔

حسن اور عشق کے روایتی موضوع کو فیض یوں ادا کرتے ہیں کہ

حسن مرہون جوش بادۂ ناز
عشق منت کش فسون نیاز
(نقش فریادی)

اور ایک مقام پر عشق کو ایک مذہبی تہذیب کے ساتھ اس طرح جوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کہا کریں فرض ہے اوا سے نماز
(نقش فریادی)

تخلیقی سفر کی ابتدا میں فیض کو یہ احساس ہے کہ عشق تکمیل ذات کے لیے ضروری ہے اس

لیے فرمایا کہ

اپنی ہیکل کر رہا ہوں میں
 درت تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں
 (نقش فریادی)

اس کے بعد جب فیض کی ذات کا رشتہ ساج سے مضبوط ہوتا چلا گیا تو ترک محبت کا
 اعلان بھی کیا اور یہ بھی کہا کہ

آہ کہ آج ختم ہوئی داستان عشق
 اب ختم عاشقی کے فہائے منائیں ہم
 (نقش فریادی)

لیکن پھر جلد ہی انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ داستان عشق کا انجام نہیں آغاز ہے اور
 شاعری تو ہے ہی سراسر عاشقی اسی ہے، فیض نے نیا ارادہ باندھا اور کہا
 ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
 جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے ہیں گے
 اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
 ویرانی دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

(لوح و قلم۔ دست صبا)

فیض کے غم عشق نے ویرانی دوراں پہ ہر کرم یہ کیا کہ اسے اپنے اندر ضم کر لیا اور فیض نے ”دو عشق“
 جیسی نظم لکھی جس میں غم وطن اور غم جاناں دونوں کا تذکرہ ہے اور فیض کہتے ہیں کہ
 اس عشق نہ اُس عشق یہ نادم ہے مگر دل
 ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

(دو عشق۔ دست صبا)

س کے بعد تو نشانِ دہی مشکل ہے کہ غم جاناں کا ذکر ہے یا غم دوراں کا۔ محبوب کا تذکرہ ہے یا وطن کا۔ انفرادی
 تجربہ ہے یا اجتماعی کیفیت۔ ”عشق“ ایک بڑی اکائی بن گیا اور فیض نے اس میں سب کچھ سودیا۔ اس کے بعد فیض کے
 عشق کا یہ انداز ہوا کہ کہتے ہیں

فیض آتے ہیں رو عشق میں جو سخت مقام
 آنے والوں سے کہو، ہم تو گزر جائیں گے
 (غبارِ ایام)

اور یہ شعر تو زبانِ زرد عام ہے کہ

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہے لگا دو ڈر کیسا
 گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں
 (زنداں نامہ)

یہاں عشق نظریہ بھی ہے اور تحریک بھی۔ ایک، اعتبار سے دیکھیے تو مجازی دوسرے راوی سے دیکھیے تو ایک تصوفانہ تفہیم بھی ممکن ہے۔ اس عشق کے بارے میں فیض کہتے ہیں کہ

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز بن جائے
(نقش فریادی)

ایک اور جگہ عشق کے ساتھ راز کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں

سوزش درد دل کے معلوم
کس کو معلوم کسی کے عشق کا راز
(نقش فریادی)

اور پھر یہ بھی کہا کہ

اس عشق خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے
(جو میرا تمہارا رشتہ ہے۔ غبار ایام)

عشق کا یہ راز، یہ حجاب یہ دل میں اسے نہیں رکھنے کی بات۔ کیا اس کی تصوفانہ تفہیم صرف اس لیے نہ کی جائے کہ فیض خود صوفی نہیں تھے؟ چاہیے، مان لیا کہ یہ عشق کا راز تخلیق کائنات کا راز نہیں۔ ہستی کے عدم اور وجود کا راز نہیں، زندگی کا راز نہیں لیکن عشق کے اسی راز نے فیض کو آتش بھڑکھا یہی حق ہے یہی سچ ہے۔ اسی سچ جو ایک دن ظاہر ہوگا فیض کہتے ہیں کہ

عشق کا سر نہاں، جہاں تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور پیش مٹ جائے
حرف حق، دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے
(دعا۔۔۔ سر وادی سینا)

اس جگہ عشق کا اقرار اور ”حق کا اظہار“ دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور تقدس کا تصوفانہ تلازمہ عشق سے وابستہ نظر آتا ہے۔ فیض کے کلام کی تصوفانہ تفہیم کسی کو عجیب اس لیے معلوم نہیں ہوتی یا نہیں ہونی چاہیے کہ تصوف ایک سطح پر مذہبی ریاکاری کے خلاف احتجاج بھی تو ہے اور فیض اگرچہ صوفی نہیں تھے لیکن ان کی انسان دوستی اور وسیع الشربہ صوفی سے کم بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تازہ کتاب ”فیض درد اور درمہار کا شاعر“ میں ڈاکٹر صاحب نے فیض پر تصوف کے اثرات کی بات چھیڑی ہے اور ثابت کیا ہے کہ خواجہ غلام فرید، سلطان باہو اور دیگر پنجابی صوفی شعرا سے فیض نے اثرات قبول کیے۔

شاید یہ پنجابی، اردو اور فارسی شاعری کی تصوفانہ روایت سے گہری واقفیت کا ہی نتیجہ تھا کہ فیض نے

شاعری میں عاشقانہ لہجہ اختیار کیا اور ”عشق“ کو مرکزی اہمیت دی ”عشق“ کا سب سے نمایاں تلامذہ ”غم“ نہ صرف فیض کی شاعری میں بار بار نظر آتا ہے بلکہ اس کے مترادفات دکھ، رنج، درد، سوز وغیرہ بھی فیض کے کلام میں جگہ جگہ موجود ہیں اور بعض تو اپنے آپ میں استعارہ بھی ہیں۔

یہ غم الفت ہی ہے جو فیض کو نیا زاویہ نظر بخشتا ہے۔ رقیب کو فیض عزیز رکھتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گمنواؤں تو گمنوا نہ سکوں
(رقیب سے۔ نقش فریادی)

اسی طرح ایک اور جگہ غم کے ساتھ احسان کا علاوہ موجود ہے کہتے ہیں

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے
(نقش فریادی)

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا غم جاناں اور غم دوراں میں بدلتی طور پر کشمکش بھی رہی۔ نقش فریادی کے پہلے ہی صفحے پر یہ قطعہ درج ہے کہ

دل رہیں غم جہاں ہے آج
ہر نفس تشنہ تھاں ہے آج
سخت ویراں ہے محض ہستی
ے غم دوست تو کہاں ہے آج
(نقش فریادی)

اسی طرح یہ شعر بھی دیکھے کہتے ہیں:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
(نقش فریادی)

اور یہ مشہور مصرعہ بھی کہا کہ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
(نقش فریادی)

لیکن جلد ہی اس کشمکش سے نکلے اور ادراک غم کی منزل تک پہنچے۔ اب غم اپنے آپ میں اس قدر اہمیت اختیار کر گیا کہ جاناں، درد و دوراں کی تفریق مٹ گئی۔ اس غم کی طلب کبھی حافظ کے رنگ میں کی و رکھا

عشق میں گیا ہے غم کے علاوہ
خواجہ من کچھ اس سے زیادہ
(مرے دل مرے مسافر)

اور یوں بھی گویا ہوئے کہ

فیض تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آدھا کے دیکھ لیا
(نقش فریادی)

غم کی یہ اہمیت اور یہ طلب اس لیے نہیں کہ فیض غم پسند تھے بلکہ اس کے پیچھے تو فیض کا یہ ادراک تھا کہ غم ہی ان بن کو ان بن سے جوڑ دیتا ہے سو اسی غم اور اسی درد کے ذریعے فیض نے جڑ سے کل کی طرف مراجعت کی اور ذات کا رشتہ اجتماع سے جوڑ دیا۔ کہتے ہیں

بہت گراں ہے یہ عیش تنہا، کہیں سبک تر کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے
(دست صبا)

تو پھر جب یہ دریافت ہو گیا کہ درد مندی سے ہی دنیا کو رفیق بنایا جاسکتا ہے، فرد کو سماج، اور نظریے کو تحریک میں ڈھالا جاسکتا ہے تو پھر فیض کا یہ انداز ہوا کہ

غم جہاں ہوا غم یار ہو کہ حیر مہم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشودہ رکھتے ہیں
(دست صبا)

اور سرِ دادی بینا کا حساب دیکھیے تو وہ ہے

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

اور یوں فیض اپنی شاعری اور اپنا غم اور اپنی شاعری عصرِ رواں کے نام کر دیتے ہیں اور عصرِ رواں کے غم کے حوالے سے ان سب کے نام کر دیتے ہیں جو فیض کے اصل مخاطب ہیں۔ جن سے فیض درد مندی کا رشتہ استوار رکھتے ہیں۔

درد مندی کا یہ رشتہ محض ہمدردی تک محدود نہیں رہا بلکہ فیض اس کا سلسلہ امید تک لے گئے۔ یہ امید غم سے گزر جانے کی ہے۔ امید زندگی بدل جانے کی ہے یہ امید اور اس امید سے جڑی انتظار کی کیفیت فیض کے عشق کا ایک اور اہم تلازمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غم اور انتظار دونوں ہی عشق کی بنیادی کیفیت ہیں اور ایک دوسرے سے ان کی ازلی اور ابدی وابستگی ہے اور روایت کچھ یوں ہے کہ عاشق امید لگاتا ہے، انتظار کرتا ہے اور باتِ خرابا امید ہو کر غم کو گلے لگا لیتا ہے۔ یوں معاملات محبت ایک امید سے شروع ہوتے ہیں اور انتظار سے گزر کر غم کی منزل تک پہنچے ہیں، فیض کے ہاں یہ road map اس کے برعکس ہے ان کے عشق کے اصل معاملات ادراکِ غم سے شروع ہوتے ہیں اور انتظار سے گزرنے کے بعد یومِ سراو جزا تک پہنچتے ہیں۔ لیکن فیض

کا غم، انتظار کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی انتظار کی کیفیت غم کے احساس کا نتیجہ ہے۔ گویا ”انتظار“ کا ر فضول نہیں اپنے آپ میں ایک استعارہ ہے ایک metaphor ہے۔ یقین کا امید کا، Survival، جد جہد اور Struggle کا ریاضت، ثابت قدمی، حوصلے اور عزم کا۔ اسی لیے فیض کے عشق کا ایک بنیادی تلازمہ وہ انتظار ہے جو غم کی دین ہے ”انتظار“ کی کیفیت جگہ جگہ فیض کے کلام میں موجود ہے۔ غزل کے حوالے سے بات کی جائے تو فیض کے چند مشہور شعر فوراً ذہن میں آتے ہیں جیسے

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو حیرتی رہگزر بھی نہیں
(نقش قریادی)

یا یہ کہ

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
(دست صبا)

اور یہ شعر

روشن روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
(طوق و دار کا موسم۔ دست صبا)

اور یہ شعر بھی زبانِ رودعام ہے

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
(دست صبا)

لیکن پھر اس انتظار کو ایک نیا مفہوم ملتا ہے اور صورت یوں بنتی ہے کہ
تری کج ادائی سے ہار کے شب انتظار چلی گی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غم گسار چلے گئے
(دست تہ سنگ)

یا یہ کہ

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے
(زنداں نامہ)

یہ تو غزلیات کے چند اشعار تھے نظم میں فیض کا ”انتظار“ کا تصور اور اس کا ارتقا حقیقی رنگ میں نظر آتا ہے۔ جس طرح ”رقیب“ کے تصور کو فیض کے ہاں ایک نئی معنویت ملی اسی طرح ”انتظار“ کی کیفیت کو بھی فیض

نے نیارنگ دیا جیسا کہ اوپر کیا گیا ہے ”انتظار“ فیض کا ایک استعارہ ہے۔ ان اشعار کے ساتھ فیض شام و سحر اور سفر جیسے حرکات جوڑ کر ایک نیارنگ دیتے ہیں۔

نقش فریادی کی بتدائی چند نظموں میں انتظار کی وہی روایتی کیفیت موجود ہے۔ مثال کے طور پر نظم ”انتظار“ جس میں کہتے ہیں۔

قسم تہری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
عط تھا دعویٰ صبر و شکیب آ جاؤ
قرار خاطر بیتاب کہتا ہوں میں
(انتظار۔ نقش فریادی)

یہ تہہ نجوم میں ہی انتظار کی کیفیت ایک جمالیاتی فضا تعمیر کرتی ہے کہتے ہیں
= نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حسن ہے مصروف انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ایک گل کہ ہے ناواقف بہار ابھی
(تہہ نجوم)

اور ”پاس“ میں یہ انتظار بالآخر کاوش بے حصوں قرار پاتا ہے۔ اور فیض کہتے ہیں

انتظار فضول رہنے سے
راٹو الفت بنانے والے
باغ غم سے گراہنے والے
کاوش بے حصول رہنے سے

(پاس۔ نقش فریادی)

کچھ ہی کیفیت نظم تنہائی میں بھی ہے جس کے ”خری دو مصرعے، اس طرح ہیں

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر دو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(تنہائی۔ نقش فریادی)

اور کہیں کہیں یہ احساس بھی ہے کہ

وہ انتظار کی راتیں۔ طویل تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں وہ غمیں با نہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں میرے ندیم

(میرے ندیم۔ نقش فریادی)

یہ سب نقش فریادی کی مثالیں ہیں ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں انتظار محض ایک کیفیت سے بڑھ کر

ریاضت بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ عزم، حوصلہ اور ثابت قدمی کے ملازمات جڑ جاتے ہیں یہ وہ ریاضت ہے جس کی راہ شوق میں ہر قدم پر ضرورت پڑتی ہے مثال کے طور پر ان کی نظم ”چند روز اور مری جان۔۔۔“ کی ابتدا میں انتظار کی کیفیت کچھ یوں ہے کہ

جسم پر قید ہے، جذبات پہ رنجریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
پنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قید ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
(نقش فریادی)

لیکن ”جے چل کر اس انتظار میں ایک امید کی کرن بھی نظر آئی۔ ایک ایسی امید کی کرن جس کی بنیاد ارادے اور عمل پر رکھی گئی ہے۔“ کہتے ہیں۔

عرصہ دہر کی تجھی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
جیسی ہاتھوں کا بے نام گراغاڑ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
(نقش فریادی)

یہاں ”انتظار“ سے ”امید“ اور یقین کا رشتہ موجود ہے اور نظم کی کنسرکشن فیض کے غم اور اس سے پیدا ہونے والی انتظار کی کیفیت کو یقین اور امید اور ارادے کے ملازمات کے ذریعے سبق دیتی ہے۔

ایک ہی نظم نہیں فیض کی بیشتر نظموں میں ”انتظار“ امید اور یقین سے جڑا نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فیض کے ہاں ”انتظار“ کی کیفیت نے ایک نیا مفہوم حاصل کر لیا ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ اوپر کہا گیا یہی ہے کہ انتظار کی کیفیت غم کا سبب نہیں بلکہ غم کی دین ہے۔ فیض خود بھی یہی کہتے ہیں کہ

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے

عموماً انتظار کی کیفیت میں سکوت اور جمود کا احساس شدت سے موجود ہوتا ہے۔ وقت کے ٹھہر جانے کا احساس، انتظار کی کیفیت کا لازمہ ہے لیکن فیض کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ انتظار کو ایک متحرک عمل بنا دیتے ہیں اس کے ہاں عاشق محبوب انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھ نہیں ہوتا بلکہ مسلسل منزل کی جانب سفر میں رہتا ہے کہ ادراکثریوں معوم ہوتا ہے کہ ایک قافلہ رواں دواں ہے مثلاً فیض کے چند مصرعے دیکھیے

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
(صبح آزادی۔ دستِ صبا)

یہ یہ کہ

کلتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
(ترنہ۔ دست صبا)

یا پھر یہ کہ

رختِ دل باندھ لو دلِ فگار و چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں پار و چلو
(آج بازار میں پابجولاں چلو۔ دستِ تہہ سنگ)

”انتظار“ کی کیفیت کے ساتھ فیض کے کلام میں اکثر سفر، حرکت، قافلہ کے تذکرات تسلسل کے ساتھ
ابھرتے ہیں اور یوں ”انتظار“ اپنے آپ میں جدوجہد، تحریک اور Struggle کا استعارہ بن جاتا ہے۔ ایک ایسی
جدوجہد جس کا مقصد روشنی کا حصول ہے۔ یہ ”انتظار“ ایک کوشش ہے شب کو ٹھکست دینے کی اور اسی لیے بار بار ”امید
سحر“ کا تذکرہ فیض کے کلام میں موجود ہے۔ کبھی فیض اس انتظار کی کیفیت میں دل کو حوصلہ دیتے اور کہتے ہیں کہ

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غارِ بے خیار و سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بے تاب ٹھہر
(اے دل بے تاب ٹھہر۔ دست صبا)

اپنے دل کو تسلی دینا تو شاید ایک عام سی بات ہے فیض تو محبوب کا بھی حوصلہ بڑھاتے ہیں کہ ان کا
محبوب ایک فرد نہیں پورا سماج ہے وطن ہے۔ اس لیے کہتے ہیں۔

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل ہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردِ لیل و نہار رکھتے ہیں
(غار میں تیری گلیوں کے۔ دست صبا)

اور یہ انداز دیکھئے کہ

جا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صہوتِ ہزار کا موسم

آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہتر دنیا چھوڑ جانے کی یہ خواہش فیض کے ہاں انتظار کے
Images کی صورت میں ابھرتی ہے کہیں ایک مسافر کی صورت میں جو منزل کا منتظر ہے، کہیں ایک تیدی جو
آزادی ملتے کے انتظار میں ہے کہیں بیدار آنکھیں جو امید سحر سے روشن ہیں اور کہیں وہ کسان جو بیج بونے کے

بعد فصل بہار نے کا انتظار کرتا ہے۔
یہ اشعار دیکھیے۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہوگی
سنے تھے وہ آئیں گے، سننے تھے سحر ہوگی

کب مہکے گی فصل گل، کب جھکے گا میخانہ
کب صبح خن ہوگی، کب شام نظر ہوگی
اور ”فصل امیدوں کی ہدم“ تو گویا ایک مکمل فلسفہ حیات ہے۔ چند سطر میں دیکھیے۔

کھیتی کے کونوں گھدروں میں
پھر اپنے لبو کی کھاد بھرو
پھر مٹی پینچو اشکوں سے
پھر اگلی رت کی فکر کرو
پھر اگلی رت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو بھی کچھ کرتا ہے

مندرجہ بالا اشعار میں اور فیض کے کلام میں دیگر مقامات پر دن اور رات کے Images جو بار بار
ابھرتے ہیں وہ حق و باطل، رہ و منزل کی علامت تو ہیں ہی لیکن ساتھ ہی وہ انتظار کی گراں باری کو کم کرنے میں بھی
معاون ہیں کیونکہ دن اور رات کا وقفہ بظاہر یہ ایک مختصر Timepam ہے جبکہ حقیقتاً انتظار کی یہ ایک انتہائی
طویل رات ہے چونکہ رات خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو بہر حال اس کی صبح ضرور طلوع ہوتی ہے اس لیے امید
فرد ابھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ فیض کے ہاں موجود ہے۔ اور دیکھیے ان اشعار میں کس کامیابی سے اس شب
کی گرانی کو محض ایک ساعت اور وہ بھی رات کی آخری ساعت قرار دیتے ہیں۔

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرق صبح پر چمکے گا تاہم ہم بھی دیکھیں گے

(سر مقتل۔۔ دست مہر)

یہ معلوم ہوتا ہے کہ فیض اس انتظار کی ریاضت کو یا اس جدوجہد کو باقاعدہ قاری کے مزاج کا حصہ
بنادینا چاہتے ہیں جس طرح کہ وہ خود فیض کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ فیض چاہتے تو ”انتظار“ کی کیفیت میں
پوشیدہ انقلابی Excitement کو Thrill بنا سکتے تھے۔ نعرہ بنا سکتے تھے۔ مناظرہ بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے
ایسا نہیں کیا۔ فیض کی شخصیت اور ان کے کلام میں جو نفیسی ہے، در ٹھہراؤ ہے شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ

اپنے نظریات کو مکمل طور پر شخصیت کا حصہ بنا چکے تھے اور داخلی طور پر اس کشمکش سے آزاد ہو چکے تھے جو غم دوراں اور غم جاناں کے درمیان یا پھر نظریے اور عقائد کے مابین رونما ہوتی ہے اور اسی لیے وہ انتھرا اور امید کی ان کیفیات کو جس طرح عاشقانہ ملازمت کے طور پر پیش کرتے ہیں اتنی ہی سہولت کے ساتھ وہ ان کیفیات کے ساتھ مذہبی ملازمت بھی وابستہ کر دیتے ہیں۔

فیض کے علمی پس منظر اور ان کے زیر مطالعہ رہنے والے مصنفین کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ”انتظار“ کا ایک رنگ فیض نے ”عشق“ کے تجربات سے سیکھا تو دوسرا رنگ انہوں نے مذہبی اعتقادات میں بھی دریافت کیا اور پھر ان دونوں رنگوں کو مدد کر ایسی تصویر بنائی جس کی سیاہی تفہیم بھی ممکن تھی مثال کے طور پر دیکھیے ایک نظم میں کہتے ہیں

ہم جیتیں گے
حقا ہم جیتیں گے
قَدْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّقَ الْبَاطِلُ
فرمودہ ربیب اکبر
ہے جنت اپنے پاؤں تلے
اور سایہ رحمت سر پر ہے
پھر کیا ڈر ہے
ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے

(ایک تراشہ مجاہدین فلسطین کے لیے۔۔۔ غبارِ یام)

یادہ مشہور زمانہ نظم ”توبقی وجہ و زہک“ جس میں قیامت کا نقشہ کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں ہم دیکھیں گے

جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہل صفا، مردود، حرم
سند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی

(مرے دل مرے مسافر)

اسی طرح یوم حساب کا منظر دیکھیے:
 ہر اک اولی الامر کو صدا دو
 کہ اپنی فرما عمل سنبھالے
 اٹھے گا جب مجمع ہر فروشاں
 پڑیں گے دارورسن کے لالے
 کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے

ان مثالوں میں دیکھیے کہ ”انتظار“ کی وہ صورت جو مذہب کے توسط سے انسانی نفسیات کا حصہ بنتی چلی آئی ہے، اس صورت کو کس کامیابی سے فیض نے اپنی جدوجہد کا حصہ بنا لیا ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں ایک ایسے دن کے طلوع ہونے کا یقین دلایا گیا ہے کہ جس دن حق کی بالآخر فتح ہوگی، باطل مٹ جائے گا اور مظلوموں کی دہر سی ہوگی۔ اور اس دن کے ساتھ کسی مسیحا کا، کسی Saviour کا جو حق کا پرچم بلند کرے گا۔ فیض بڑی کامیابی سے انسان کے، اس ازل اور شاید ابدی انتظار کو اپنی Struggle سے مربوط کر دیتے ہیں۔ البتہ ایک چھوٹی سی deviation انحراف فیض کے ہاں ضرور موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت منتظر۔ ان کا Saviour آسمان سے نہیں اترتا بلکہ زمین سے بلند ہوتا ہے۔ اسی لیے فیض کہتے ہیں۔

ام نصیبوں، جگر نگاروں،
 کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
 جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
 سحر کا روشن افق یہیں ہے

اور یہ کہ

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
 یہیں عذاب و ثواب ہوگا
 یہیں سے اٹھے گا شور و محشر
 یہیں پہ رोज حساب ہوگا

اس اعتبار سے دیکھیے تو عشق کے دو اہم تلازمات غم اور انتظار کے ذریعے فیض ماضی، حال اور مستقبل کو یک دوسرے سے جوڑ دیتے ہیں انہیں یقین ہے کہ ایک دن یہ غم جو عصرِ رواں کا غم ہے ایک دن ماضی بن جائے گا۔ ظ۔ نصاریٰ نے فیض کے کلام میں تین عناصر کی نشاندہی کی ہے، انتظار، شام ورتہائی اور لکھا ہے کہ تہائی کا احساس، شام کا وقت اور انتظار کی کیفیت۔ یہ سب ایک ہی پرسوز کھرا سیکم ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ فیض صاحب کے کلام میں متعدد دگر سیکیں موجود ہیں کہ فیض صاحب ایک مامر مصور کی طرح رنگ اور رنگوں کے مختلف Shades سے خوب واقف تھے وہ اردو کے ن چند شعرا میں سے ہیں جو مصوری، فوٹو گرافی، نغمگی (جسے شاید موسیقی کہا جاسکتا ہے) جیسے فنون کا شاعری سے ربط پیدا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض کے کلام میں جو Inter-art Corelation ہے وہ

ایک علیحدہ مقالے کی متقاضی ہے۔ اس جگہ تو صرف فیض کی شاعری کے رنگ کے حوالے سے چند باتیں کرنا مقصود ہے کیونکہ فیض کی شاعری کا رنگ، جو کہ سب جانتے ہیں سرخ رنگ ہے، ان کے عشق کا بڑا علامہ ہے۔

اگرچہ درد و غم، انتظار و یقین کے علاوہ کئی دیگر عشقانہ تلازمات فیض کے کلام میں ابھرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خمریات کو ہی دیکھیے۔ جام، مینا، شراب جیسی اصطلاحات فیض کے ہاں متعدد بار نظر آتی ہیں اسی طرح ہجر و دواں، عارض و گیسو، شام و سحر جسے تلازمات، خصوصاً وہ جو تلازمات اپنے اندر سی سی تفہیم کی بھی قوت رکھتے ہیں، فیض کے ہاں ابھرتے ہیں اور اپنے آپ میں ایک علامت بن جاتے ہیں۔ لیکن سرخ رنگ اپنی جگہ ایک علامت تو ہے ہی، عشق کا علامہ بھی ہے اور فیض کی شاعری کا حاوی رنگ بھی ہے۔

سرخ رنگ ایک طرف کیونکہ اور انقلاب کا رنگ ہے تو دوسری جانب عشق کا رنگ بھی ہے۔ جیسا کہ بار بار کہا جا چکا ہے کہ فیض کے تلازمات اکہرے نہیں ہوتے۔ تہہ دار اور پہلو دار ہوتے ہیں۔ اسی طرح سرخ رنگ جو خود ایک علامہ، عشق ہے۔ اپنے تمام تر تلازمات کے ساتھ فیض کے ہاں موجود ہے۔ شراب، گلاب، بہار، عارض محبوب، لبو، مقتل، پرچم سب ہی کا رنگ سرخ ہے۔ اس سرخ رنگ کو غم اور انتظار کے ساتھ جوڑ کر دیکھیے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ عشق کی منزل کیا ہے۔ وہ انتظار تھا جس کا وہ بھی سحر ہے۔ یقین کے ساتھ انتظار کی کیفیت میں رنگا ہوا فیض کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے۔ کہتے ہیں۔

درد آئے گا وہ پاؤں لیے سرخ چراغ

وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دس سے پڑے

(درد آئے گا وہ پاؤں لیے سرخ چراغ)

ان دو سطروں میں درد اور سرخ چراغ کے مابین اگر کوئی رشتہ ہے تو یقین اور امید کا ہے۔ یہی تین تلازمات ہیں جو فیض کے عشق کی تصویر مکمل کرتے ہیں۔

سبز، زرد، سنہرے، سیاہ رنگ بھی ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک نظم ”رنگ ہے دل کا مرے“ پیش کی جاتی ہے اس کی چند سطور دیکھیے

چمکی رنگ کبھی، راحت دیدار کا رنگ

سرمئی رنگ کہ ہے ساعیہ ہزار کا رنگ

زرد، پتوں کا، خس و خوار کا رنگ

سرخ، پھولوں کا دیکھتے ہوئے گلزار کا رنگ

(دست تہہ رنگ)

لیکن وہ رنگ جو فیض کے کلام میں بار بار نظر آتا ہے سرخ رنگ ہے۔ اس سرخ رنگ کی بے شمار عشقانہ تمثیلات فیض کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ ایک جمالیاتی تمثیل تو محبوب کا عارض و رخسار ہی ہے کہتے ہیں۔

کس طرح عارض محبوب کا شفاف بور

یک بیک بادِ احمر سے دہک جاتا ہے

کیسے گلچیں گے لیے جھکتی ہے خود شاخ گلاب

کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
(میرے ہمدام میرے دوست۔ دوست صبا)

اور کبھی اس طرح کہا کہ

صبح پھولی تو آسمان پہ ترے
رنگ رخسار کی پھو بار گری
(زنداں نامہ)

حد تو یہ ہے کہ اسی رنگ کی وجہ سے لب و رخسار ایک تصوفانہ رنگ، اختیار کرتے ہیں دیکھیے۔

پھر برق فروزاں ہے سر وادی سین
پھر رنگ پہ ہے شعلہ رخسار، حقیقت

محبوب کے لب و رخسار سے آگے بڑھتے تو محبوب کی قبا و رعاشق کے ہو کا بھی رنگ سرخ ہی نظر آتا
ہے چند مثالیں دیکھیں۔

ن کی نظر میں کیا کریں پیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرف قبا کر چکے ہیں ہم
(دست صبا)

پو کے مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ قام کہتے ہیں
(دست صبا)

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے درپے میں
ہر ایک اپنے میجا کے خوں کا رنگ لیے
(درپے۔ زنداں نامہ)

اور رنگ حنا کا تذکرہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کچ سے پھولے گی کرن رنگ حنا کی

یا یہ بند دیکھیے۔

دوستو، کوئے جاناں کی نا مہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار
اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھلے گا نہ کیا؟
اس کعبہ ناز میں پر کوئی لالہ زار
(تم کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں۔ دست تہہ رنگ)

مندرجہ بالا اشعار میں اور اسی طرح کے کئی دیگر اشعار گرچہ سرخ رنگ کا راست تذکرہ نہیں لیکن

عارض، لب و رخسار، شراب شفق، لہو، گلزار، دلہ زار، بہار اور حنا کا رنگ سرخ کے عد وہ اور کی ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں فیض سرخ رنگ کا راست استعمال بھی کرتے ہیں جیسے ”ہوں“ میں کہا کہ

دیکھ کہ آہن گر گی دکان میں
تند ہیں شمعے سرخ ہے آہن
کھینے لگے قصوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
(بول۔ نقش فریادی)

ایک جگہ سرخ رنگ کی باقاعدہ Interpretation بھی ملتی ہے جب فیض لکھتے ہیں کہ۔
مویج خوں جب تک رواں رہتی ہے اس کا سرخ رنگ

جذبہ شوق کی شہادت

درد، غیظ و غم کا رنگ

اور تھم جائے تو کجلا کر

فقط نفرت کا شب کا موت کا

ہر اک رنگ کے ماتم کا رنگ

یہ سرخ رنگ کا تذکرہ تھا لیکن ایسے راست تذکرے فیض کے ہاں بہت کم ملیں گے۔ بیشتر اوقات وہ اس رنگ کو دریافت کرنے کا کام قاری پر چھوڑ دیتے ہیں چند مثالیں دیکھئے

اور اب ہیئت ہے، راہگور، رنگ فلک

رنگ ہے دل کا مرے ”خون جگر ہونے تک“

(رنگ ہے دل کا مرے)

ویر سے منزل دل میں کوئی آیا نہ گیا

فرقت درد میں بے آب ہو تھنہ و داغ

کس سے کہیے کہ ہرے رنگ میں زخموں کے داغ

(ملاقات مری۔ دست تہہ رنگ)

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے

طرح طرح کی طلب تیرے رنگ لب سے ہے

جو رنگ ہر وہ و دیوار پر پریشاں ہے

یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

(سرود ادی سینا)

خاک رہ آج لیے پھرتی ہے لب و لہار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم

بے پیہ ہوں اگر لطف کرو آخر شب
شیشے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ
(سرودائی مینا)

شک خوں تاب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل گئی ہے

اوپر درج کیے تمام اشعار میں فیض نے کسی رنگ کا ذکر کیا ہے لیکن ذرا ان اشعار کو ایک بار پھر بغور پڑھیے اور بتائیے کہ کہا جس رنگ کا تذکرہ فیض ان اشعار میں کر رہے ہیں، کیا وہ سرخ کے علاوہ بھی کوئی دوسرا رنگ ہو سکتا ہے یہی نہیں فیض کی Imagery پر ایک نظر ڈالیے 'گلزار ہوتی شام'، 'طیش کی آتش جوار'، 'جوش غضب کا تکار'، 'دہکتا ہوا گلزار'، 'لہو کی بہار'، 'خوناب جگر'، 'لہو کے دریدہ علم' وغیرہ۔ ان سب پیکروں پر ایک سرخی سی طاری نظر آتی ہے۔ میر کا یہ شعر فیض پر بھی صادق آتا ہے کہ

دل بے خوں کی ایک گلابی سے
عمر پر ہم رہے شرابی سے
(میر)

اسے فیض کی جادوگری کہیے یا مصوری کہ ہماری توجہ یا Focus اصل تصویر پر رہتا ہے اور ہم غور ہی نہیں کرتے یا شاید ہم پہلے ہی بہت اچھی طرح واقف ہیں کہ اس تصویر کا پس منظر سرخ ہے۔ اگر یہ پروپیگنڈا ہے تو نہایت کامیاب اور اگر یہ شاعری ہے تو نہایت فسوں کا۔ یہ فسوں کاری نہیں تو در کیا ہے کہ صبح آزادی جیسی سیاسی نظم داغ، رز، فلک، غم، دل، دیار حسن، حسینان نور، وصال، اہل درد، نشاط و صل، عذاب جگر، جگر، نظر اور دوس جیسی، اشتقانہ تلازمات سے معمور ہونے کے باوجود سیاسی ہی رہتی ہے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فیض، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں شاعر ہیں۔ سیاست دان نہیں۔ ان کے شعر لاکھ خواص پسند ہوں ان کی اصل گفتگو عوام سے ہے۔ پوسٹ مینوں سے، کلرکوں سے، مائیں گھروں سے مزدوروں سے اور کسانوں سے ہے۔ وہ تبدیلی چاہتے ہیں جو دیر پا ہو نہ کہ فوری رد عمل جو Sustain نہ کیا جاسکے۔ وہ مجمع کٹھا کرنے کے بجائے دوستوں رفیقوں کی محفل سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں تحریک چلانا چاہتے ہیں جو معنی خیر تبدیلیاں زندگی میں لے کر آئے۔ اور اس دیر پا Sustainable انقلابی تبدیلی کے لیے فیض جوش خطابت کے بجائے لطافت کو ہنر بناتے ہیں۔ کیونکہ بات سبک اور لطیف نہ ہو تو بہت جلد حسیات پر بوجھ بن جاتی ہے۔ لہذا فیض راست اظہار کے بجائے، نوس عشقیہ تلازمات کا، ایک نظم تیار کرتے ہیں جس میں ایک تصور دوسرے سے، ایک خیال دوسرے خیال سے اور ایک Idea دوسرے Idea سے جڑتا چلا جاتا ہے۔ کبھی باہمی مشابہت کے ذریعے اور کبھی تضاد کے ذریعے اس تصورات میں ایک باہمی ربط بن جاتا ہے اور یوں زندگی

کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ زندگی جو غم، انتظار اور انقلاب کا نام ہے۔ جنہیں ہم ماضی، حال اور مستقبل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس زندگی کا محور و مرکز بالآخر محبت ہی ہے۔ جیسا کہ فیض نے کہا

غم جہاں ہو، رُخ یار ہو کہ دستِ عدو
سوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

کتابیات

- ۱۔ نسخہ ہائے وفا۔ فیض احمد فیض۔ مکتبہ کارواں، لاہور
- ۲۔ رمایہ، غائب۔ فیض نسر۔ کراچی۔ فروری ۱۹۸۳ء
- ۳۔ فیض احمد فیض۔ درو اور درماں کا شاعر، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، لاہور ۲۰۱۱ء
- ۴۔ فیض نبی۔ ڈاکٹر تقی عابدی۔ لاہور ۲۰۱۱ء

☆.....☆.....☆

اُردو افسانے کا نیا تناظر

محمد حمید شاہد

صاحب! کون کہتا ہے کہ یہ معنی کی تالیف اور تجسیم کا زمانہ ہے، یہ تو تہذیب کے بکھرنے اور تہذیبی وجود کے ادھرنے کا زمانہ ہے۔ تخلیق کے نسب نامہ سے اس کے محرک اور مصنف کے تخلیقی شعور اور لاشعور کو کاٹ پھینکنے کا زمانہ، دہشت کی ایک اپنی تہذیب ہوتی ہے، اس میں خوف اوپر سے برستا ہے جیسے ذروں سے نشانے باندھ کر بارود پھینکا گیا ہو جو ہمارے بچ میں پھٹ پڑتا ہے یا جیسے کسی نے کمر بندگی جیکٹ سے خود واڑا لیا ہو، تو اس دہشت میں جو زبان ترتیب پاتی ہے وہ ہماری زبان ہوگئی ہے، معنویت کے انتشار کی زبان۔ مفہوم کی fragmentation اور disintegration میں شہادت جیسے مذہبی تہذیب والے لفظ کی معنویاتی روح خطا ہوگئی ہے۔ عجب معنوی ناز کی کا زمانہ ہے کہ دہشت ہمارے وجود میں اندر تک مسمیٰ اتھل پھٹل مچا رہی ہے مگر ہم اس کا ڈھنگ سے چہرہ پہچاننے میں ناکام ہیں۔ ہماری وہ زبان جو انتظار حسین، عبداللہ حسین، انور سجاد، خالدہ حسین اور حتیٰ کہ محمد غنیایہ تک ایک زبان تھی کہ اس میں ہماری صدیوں کی تہذیب بولنے لگی تھی جی ایک زبان مثبت اظہار کے منصب سے دست بردار ہوگئی ہے۔ ایسے میں نئی تنقید بتا رہی ہے کہ ایسا ہوتا، ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے مسلسل مشورہ رہا کہ ان معنی کو چھوڑ دو جو غلط کے اندر بیستے ہیں اور معنی کے ان امکانات کو بھی چھوڑ دو جو گزرتے وقت کا تجربہ ہموکی صورت اس سے دست کر دیتا ہے کہ اس مابعد زمانے میں معنویت صرف نفی اور افتراک کی دین ہوا کرتی ہے۔ سو ایسے زمانے میں کہ کھجور کی گہائیوں میں جھانکنے کا دستور فرسودہ ہو چکا، ثقافتی لہریں ہمیں پھنک کر گزرتی ہیں تو بدن میں کوئی جھرجھری نہیں ہوتی۔ وجود اور جوہر کے درمیان اگر کوئی تعلق تھا تو وہ کچھ دھماکے کی طرح یا تو ٹوٹ گیا ہے یا ٹوٹنا ہوا لگتا ہے۔ موت کی دہشت ہمارے وجودوں میں اُتری ہوئی تھی۔ یہ دہشت اکیلے نہیں ہے اس کے ساتھ بے پناہ مایوسی اور بوریات کی اطالت بھی ہے۔ عین ایسے زمانے میں ہم گزر چکے ماضی قریب کے چند باکمال افسانہ نگاروں سے اُردو افسانے کا تناظر قائم کر رہے ہیں۔ جی ہمارا موضوع یہ بتانا ہے کہ یہ تناظر ہمیں اُردو افسانے اور ایک خاص زمانے کے افسانہ نگاروں کا کرنا ہوگا۔ یہ خوشی کا مقام ہے۔ آج کے روز مجھل ستن اہم نہیں رہا اسے تخلیق کرنے والے بھی اہم ہو گئے ہیں۔ وہ بھی اور ان لکھنے والوں کی عطا کی ہوئی ارادی اور غیر ارادی معنویت بھی کہ جب ہم ایک خاص زمانی وقفے کے لکھنے والوں کو یاد کر رہے ہیں تو ان کے وقت کا جی الٹنا بھی لازم ہے اور اس مکان کا جس کو چھو کر گزرا ہوا وقت گزرتا تھا، پئی اس خاص معنویت کے ساتھ جو تخلیقی لفظ کے آفاق پر طلوع ہوئی تھی۔

انتظار حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”گلی کو پے“ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا تاہم اس کتاب میں شامل افسانہ ”استاد“ تقسیم سے پہلے میرٹھ میں لکھا جا چکا تھا جسے انہوں نے وہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پڑھا۔ باقی سب افسانے وہ یسٹ لاہور میں بیٹھ کر لکھتے رہے اور لکھ رہے ہیں۔ انہیں جس کام نے منفر د کیا، اتنا کہ اب وہ اُردو فکشن کا ایک مستقل باب ہو گئے ہیں وہ ”آخری آدمی“، ”زرد کتا“، ”کچھوے“ اور ”شیر افسوس“ جیسے افسانے ہیں۔ ایک خاص نوع کے تہذیبی شعور سے اُردو کا دامن بھر دینے والے افسانے۔ نئی تنقید کے تناظر میں دیکھیں تو انتظار حسین کچھ اور پرانی وضع

کے آدمی لگتے ہیں کہ وہ اپنے افسانے کا رشتہ سمعی روایت سے جوڑتے ہیں، جی قصہ کہانی کی روایت سے اور مصر ہیں کہ افسانے کی اصل روایت تو یہی ہے۔ اس روایت سے وفاداری کا دم بھرتے ہوئے ایک زمانے میں اس کا بار بار پیچھے دیکھتے سمجھ میں آتا ہے۔ سو یوں ہے کہ انتظار صاحب کو پڑھتے ہوئے تہذیبی حوالے جی اٹھتے ہیں اور یہی تہذیبی روایت قصہ کہانی کی روایت سے جوڑ جاتی ہے۔ نئی حیات کے آدمی کی بجائے تہذیبی آدمی ان کے ہاں زیادہ، حق اُتار رہا ہے تو یوں نہیں کہ انہوں نے نئے آدمی کو اس پرانے آدمی کے مقابل رکھ کر نہیں دیکھا۔

”ایک چیز نو مڑی کا بچہ ایسی اُس کے منہ سے نکل پڑی۔ اُس نے اُسے دیکھا اور پاؤں کے نیچے ڈال کر روندنے لگا، مگر وہ جتنا روندتا تھا اتنا وہ بچہ بڑا ہو جاتا تھا۔“ جب آپ یہ واقعہ بیان فرما چکے تو میں نے سوال کیا ”یا شیخ لومڑی کے بچے کی راز کیا ہے اور اس کے روندے جانے سے بڑے ہونے میں کیا بھید مخفی ہے؟“ تب شیخ عثمان کیوڑ نے ارشاد فرمایا کہ بومڑی کا بچہ تیرا نفس امارہ ہے۔ تیرا نفس امارہ جتنا روندنا جائے گا، موٹا ہوگا۔“ (نزدک / انتظار حسین)

”اُداس نسلیں“، ”باگھ“، ”رات“، ”قید“ اور ”نادار بوگ“ جیسے ناول، ناولٹ لکھ کر شہرت پانے والے عبداللہ حسیں کا قصہ یہ ہے کہ ناول نگاری کے مقابلے میں اس کی افسانہ نگاری کا کم کم تذکرہ ہوتا ہے۔ عبداللہ حسیں کی افسانہ نگاری کی مقدار کم سہی لیکن کم لائق اعتنا نہیں ہے۔ ردِ واقفانے کے قاری کو ”جد وطن“، ”ندی“، ”سمندر“، ”مہاجرین“ اور ”ڈھوپ“ کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ یہ کہانیاں ۱۹۸۸ء میں چھپنے والے ان کے مجموعے ”نشیب“ میں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کے علاوہ دو ناولٹ ”نشیب“ اور ”وادی کا سفر“ بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ عبداللہ حسیں کی ان کہانیوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور بیان کا سلیقہ بھی۔

”اور پارتن کہتا ہے۔“ جب میں اپنا ذاتی آرکسٹرا لے کر عالمی دورے پر آؤں گا تو صرف تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے پیش پر فورمنس دوں گا۔ رائل کمانڈ پر فورمنس“ اور بلا نکا کہتی ہے۔ ”یاد رکھنا ایک نہ ایک روز میرا جہاز تمہارے ساحل پر آگئے گا۔ میرا انتظار کرنا۔“ اور جین کھنڈ خاموش کھڑی اپنے بیٹھے تبسم کے ہاتھ دیکھ جاتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو ”ہم بڑے اچھے لوگ ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا خدا تمہارا بھد کرے۔“ پھر ہاتھ ملتے ہیں اور رومیاں ملتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چہرے اُداس ہو جاتے ہیں، پھر مسکراتے ہیں، پھر اُداس ہو جاتے ہیں، پھر ہجوم میں غائب ہو جاتے ہیں، پھر باہر نکل آتے ہیں، پھر دور ہو جاتے ہیں، پھر کچھ پتا نہیں چلتا، گاڑی موڑ کاتی ہے اور سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے۔“ (ندی / عبداللہ حسیں)

تویوں ہے جو کچھ پیچھے رہ جاتا ہے وہ عبداللہ حسیں کے ہاں بہت اہم ہو جاتا ہے اور اسی سے وہ اپنی فکشن کا خام مواد لے رہے ہیں۔

ڈاکٹر انور سجاد کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”چوراہا“ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کے فسانے کو ٹمس الرحمن فاروقی نے ایک زمانے میں بہت مانا اور کہا تھا کہ انہوں نے افسانوی زبان کے ان مکانات کو روشن کیا تھا جن کے ذریعے افسانے کی تعمیر ناممکن ہو سکتی تھی۔ اب جب کہ فکشن کی اپنی زبان الگ شناخت بنا چکی اور شاعری کی زبان افسانے میں الگ بھگ متروک ہو گئی ہے، فاروقی صاحب نے تعمیر نو کے لوازم کو آئکنے کے لیے خود جو افسانے اور ناول لکھا اس میں

تہذیبی ماضی بہت اہم ہو گیا ہے اور اسی تحقیقی مواد نے ان کی فکشن کی اپنی زبان ترتیب دے کر ہمیں سمجھایا ہے کہ محض زبان نہیں، زبان کے پیچھے کچھ اور محرکات فکشن کے باب میں اہم ہوتے ہیں۔ اور ہاں بتاتا چوں کہ انور سجاد اپنے افسانوں میں ایک سطح پر سماج سے بالکل ویسا ہی رشتہ قائم کرتے ہیں، جو یک زمانے میں ترقی پسندوں کا وصف ہوا کرتا تھا۔ وہی جبر اور اس کے مقابل ہو جانے کی ذہن۔ مگر وہ یوں مختلف ہوتے رہے ہیں کہ لکھتے ہوئے وہ آدمی کا باطن بھی متن کا حصہ بناتے رہے ہیں۔ انور سجاد کے ہاں کرافٹ حاوی رہتا ہے۔ ”کوئیل“، ”ور“، ”گائے“ جیسے افسانوں میں اس کرافٹ کے نمایاں وصف کو دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ فکر نہیں جتنی نہیں ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ ان دنوں عناصر کو زبان کے جمالیاتی جوہر سے ان کے ہاں ہم ہوتا دیکھا جاسکتا ہے۔

”خدا جانے نکلے کو کیا ہوا تھا۔ ایک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھگا بھگا گھر میں گیا اور بابا کی دو تالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنوں میں بھگتا ہوا بابا ہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔ اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا پتھر انرک سے باہر گائے کے گرے ہوئے پٹوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے، باہر منہ نکال کر پتھر سے کود کچھ رہی تھی۔ (گائے: اکثر انور سجاد)

میں بہ اصرار کہوں گا کہ خالدہ حسین کا شمار ان افسانہ نگاروں میں کیا ہی نہیں جاسکتا جو اپنے ادھر ادھر بکھرے ہوئے مظاہر زندگی کے ملائم اور چکنے حصوں پر پھسلتے اور پھسلتے رہتے ہیں اور نہ ہی یہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو تلخ زندگی کے خارجی نوکیلے اور کھر دے حصوں پر ہی سر کو پھوڑ لینے کو تخلیقیت گردانتے ہیں۔ خالدہ حسین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مادی تفہیم سے آگے نکل جاتی ہے اور زندگی کے ہر مظہر کے باطن اور خارج میں جاری واقعے کی ہر لہر کی روح پر دستک دے آتی ہے۔ وہ مسلسل اس کوشش میں رہتی ہے کہ تہہ میں ترے اور نظر نے یا محسوس ہونے والے کی ماہیت دراصل کو پا لے۔ خالدہ حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”پیچون“ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ”دروازہ“ کی اشاعت کے بعد اس کے افسانے پر قبویہ اور پیچون کا دروازہ کھل چکا تھا اور لطف یہ ہے کہ ابھی تک اس کا قلم اسی طرح مختلف کہانی لکھے چلا جا رہا ہے۔ کہانی ”سلسلہ“ میں دید کے ساتھ ناؤ کا بھید بہت پُر لطف ہو جاتا ہے۔

”ہاں سب کچھ ہنگامی کے لیے گردش میں تھا۔ مگر خود اس کے لیے ہر شے جامد اور بے جاں تھی۔ کوئی کسی کی دید میں شامل نہیں ہو سکتا۔ کوئی کسی کے حال کا سا جھمی نہیں ہو سکتا۔ سب اپنے اپنے دائرے میں تیرتے ہیں۔ تو پھر ہر ایک کی حقیقت الگ ہے۔ اس وقت بھی اس نے سپاٹ بے داغ چھت کو نگاہوں سے چاروں کھونٹ کھنکال ڈالا۔ اب وہاں پر کچھ بھی نہ تھا۔ ہوتا بھی تو وہ صرف اس کے لیے تھا۔ وحید کے لیے، کسی کے لیے بھی نہ تھا۔ چنانچہ وہ کھپتے چھپتے حروف، وہ ابجد صرف اس کی دید تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ کسی سے بات نہ کرے گی۔ اور وہ اسی طرح ذبے پاؤں، وقت بے وقت چلتے۔ خالی شفاف پس منظر میں۔ جوں جوں وہ اپنی نگاہ فاصلے پر مرکوز کرتی چلی جاتی، ان کا حجم بڑھتا چلا جاتا۔ ان کی گولائیاں اور مخروطی لکیریں کسی پختہ ہاتھ کی کاریگری تھیں۔ وہ کیا کہتے تھے۔ ایک رزش سر سے ہوتی پاؤں کے انگوٹھے تک پھیل جاتی۔ صرف

میں۔ میں ہی کیوں۔ اور پھر یہ بھی تو نہیں کہ اصل میں شے کی ہوتی ہے اور ہمیں کیا نظر آتی ہے۔“
(سلسلہ خالدہ حسین)

منشیاد کا پسند افسانہ ساتھ کی دہائی کے ختم ہونے سے پہلے شائع ہو چکا تھا تاہم ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”بند مٹھی میں جگنو“ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ منشیاد نے مسلسل لکھا اور ہر طرح کی کہانی لکھی تاہم خاص اور سیدھے سادے پیانے کی کہانی نہیں مرغوب رہی ہے۔ جب علامتی افسانے کی واہ واہ ہو رہی تھی تو اس وسیع کو بھی انہوں نے کامیابی سے برتا۔ منشیاد کی بیشتر کہانیاں اس کے لیے ریز مر رہ جاتی ہیں جس میں وہ ماضی اور دینی و عیب کی رمزیں دیکھتے رہے اور نئی زندگی کی انجھنیں سلجھانے کے جتن کرتے رہے۔ ”ماس ورمسی“، ”خدا اندر خلا“، ”وقت سمندر“، ”درخت آدمی“، ”زور کی آواز“ کی اشاعت کے ساتھ منشیاد کا شمار اردو کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ ”تمنا“ اور ”خواب سرائے“ منشیاد کے افسانوں کے دیگر اہم مجموعے ہیں۔ تہذیبی قدر زمین و انسان سے ان کی کٹ منٹ بہت گہری و مضبوط ہے جس نے ان کی کہانی میں ایک عجیب طرح کی اثر انگیزی کا وصف رنگ دیا ہے۔

”اس کی چڑی ادھیڑ کر ڈھولک بنادی گئی ہے۔ ڈھولک پر تھاپ پڑتی ہے تو اس کی چڑی ڈکھنے لگتی ہے۔ اگلے روز اس کی آنکھ کھلتی ہے تو چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوتی ہے۔ اس کے سیاہ میسے جسم پر کھیں بھننا رہی ہیں۔ اس کے ہاتھ اور سر کے بال دھوسے اٹے ہوئے ہیں۔ پھر اس کی نظر کدال پر پڑتی ہے۔ ایک فاتحہ نہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔ اسے لگتا ہے نوراں کی ڈولی نکلے وقت جو کائنات سے لبو لبہن کر رہا تھا اب اس کے دل سے نکل گیا ہے۔ اسے یہ سوچ کر بڑی طمانیت ہوئی کہ اب اس کے ماں باپ کی قبروں پر ہر جمعرات کو فاتحہ اور قرآن خوانی ہوگی اور اگر بتیاں سنگتی و ردیئے جلتے رہا کریں گے۔ خوشی اور فتح کے احساس سے اس کا سینہ تن جاتا ہے۔ وہ بوٹی کا پیالہ پیتا ہے پھر خود سے کہتا ہے کوڈ فقیرا فکر نہ کر بد بختا کون خود کو دیکھتا ہے اور دیکھ بھی لے تو کون پہچان سکتا ہے۔ امیر اور فقیر کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں تو ایک جیسی ہوتی ہیں۔“ (مکھی کی قبریں منشیاد)

جی صاحب اردو افسانے کے اسی تناظر میں دیکھتے ہیں تو افسانہ سمعی رویت اور قصے کہانی سے جڑنے میں عار محسوس نہیں کرتا، تہذیبی روایت متن کو متشکل کرتی ہے اور معنیاتی توسیع کو ممکن بناتی ہے، باطن کی واردات عدت میں ڈھکتی ہے یوں کہ آدمی بہر حال متن کے مرکز میں رہتا ہے حاشیے پر نہیں دھکیلا جاتا۔ فلشن لکھنا دیدنا دید کے ایک سلسلہ کو باطن میں رواں کرنا ہوتا ہے یا اس صورت حال سے جڑنا جس میں امیر اور فقیر کی ہڈیاں ایک سی ہو جاتی ہیں۔

مگر صاحب، نیاز مانہ گیا ہے، اس میں بھی امیر اور فقیر کی ہڈیاں، بلکہ خون اور اچھلتے بدنوں کے لوتھڑے ایک ہی دھماکے میں ایک سے ہو سکتے ہیں مگر یہ یوں پہلے زمانے سے مختلف ہے کہ اس میں ظالم اور مظلوم کی پہچان مٹ گئی ہے، کون جہنم واصل ہوا کون جنت کی حوروں سے انکھیلیاں کرے گا کوئی نہیں جانتا۔ ہم غیر کی قبر میں اپنا قومی مردہ گھسیڑنے پر تلے بیٹھے ہیں، اور ان کی اس نہ ختم ہونے والی جنگ نے ہمیں اندر سے سفاک بنا دیا ہے، ہمیں خبر ہی نہ ہوئی جہاں کرتے کرتے ہم کب دہشت گرد بن گئے۔ اس سب نے فلشن کا بیانیہ، اس کے موضوعات اور اس کے سروکاروں کو

بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ بدل جانے والا فلکشن کا تخلیقی بیانیہ بہ ہر حال، اس چتر بنانے سے الگ اور ممتاز ہے، جسے آج کا میڈیا تشکیل دے رہا ہے۔ عین ایسے زمانے میں کہ جب سخی پھیلنا ہو تو نور جیسی اجلی چادر پر مرے ہوئے ٹھہر کر دم ان کے پوری سکریں پر لاش کی طرح پھیلا لیا جاتا ہے اور انہی نیت کو بے وقعت دکھانا ہو تو لبوں میں تھڑے انسان کو زوم ڈٹ کر کے ٹھہر بنا دینے کا چین عام ہو جائے تو تخلیقی عمل سے اپنے وجود کا قیام اور مراتب وجود کی تعیین بہت کٹھن کام ہو جاتا ہے، سو آج کے ناظر میں بات کریں گے تو ہمیں ہم عصر افسانہ نگار کی مشکلات کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا۔ آج کا افسانہ نگار گزشتہ مہد کے افسانے سے جڑا ہوا ہے اور اس تخلیقی عمل سے بھی کہ جس میں افسانہ لکھنا امکانات کا نامتو سلسلے کا نام ہو جاتا ہے۔ سو یوں ہے کہ افسانے پر بات کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی جانا ہو گا کہ معنی کے انتشار کے زمانے میں یہ مربوط معنویت کی تشکیل کا قرینہ ہے۔ مرکزیت، کلیت اور مسلمات سے انحراف کے مہد میں تخلیقیت کی کل سے جڑ کر تخلیقی سلامتی اور بقا کی راہ کی تلاش ہے۔ بجا کہ تخلیق سے ہر افتراق ہے، مرکزیت ہے، اضافیت اور تکثیریت ہے، مادر پدر آزاد دہلی رو یہ ہے، ایسا رویہ کہ جس میں کچھ بھی حتمی نہیں ہے اگر حتمی ہے تو روایت سے تصادم ہے، مابعد طبیعیات سے تصادم ہے، تاریخ کے دھارے میں یقینی اکھاڑ پھچاڑ ہے، انہیں اور رکھا بڑا ہوں پر آج کی تخلیق کو شعور سے جڑنا ہے اور لاشعور سے بھی، اسے اپنا یہیہ تشکیل دینے کے لیے س تہذیبی دانش کے حوالے سے چوکس رہنا ہے کہ جس کے روشن چہرے پر آج کی نام نہاد قوت کی میڈیا کی دانش کی سیاہی پوتی جا رہی ہے۔ یہ آج کی حقیقت ہے گزرے ہوئے کل کی نہیں۔ یاد رہے حقیقت اس لیے حقیقت ہوتی ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں بیانیہ میں اہل رہی ہوتی ہے۔ نئے مہد کی حقیقت فطرت کے تابع نہیں ہے، اس کے پاس کوئی کتاب کوئی مہا بیانیہ نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ سب ہمارے وجود سے الگ ہے، بلکہ اس سے متصادم ہے۔ ہمارے وجود سے کیا خود فطرت سے متصادم ہے۔ ایسے میں افسانہ اور اس کا تخلیقی عمل ہی ہے جو صورت حال کی تفہیم نہ کر پانے والے انسانی شعور و لاشعور کو ایک ناروا ابو جہ بننے سے روک سکتا ہے۔ کہ تخلیقی عمل امکانات کی پوشیدہ جہتوں کو کھول کر اس بو جہ کو تو نائی میں بدل دینے کا نام ہوا کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کا افسانہ نہ صرف انتظار حسین، عبدالقد حسین، نور سجاد، خالدہ حسین ورنشا یاد سے جڑنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا، نیر مسعود، اسد محمد خاں، رشید امجد بلکہ انتظار سے بھی پہلوں یعنی پریم چند سے منو تک سب کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ اس نے ترقی پسندوں اور علامت نگاروں کی طرح اپنے سے ماقبل افسانے کی رد نہیں کیا تاہم اپنے لیے الگ راہ نکال ہے۔ آج کے افسانہ نگار یہ جان گیا ہے کہ وہاں مجھے کی سفاک حقیقت کو لکھتے ہوئے جہاں لیتی بعد کو کس جہت سے برآمد کرنا ہوتا ہے۔ جہاں جہاں دبشت کی آگ برس رہی ہے وہاں وہاں اس میں سب کچھ خفی کہ انہی نیت اور اس کی مسلہ اقدار بھی راکھ ہوتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں کہانی کے برہم ہونے اور اس کے پرانی روش سے ہٹ کر چلنے کو سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ماننا ہو گا کہ تخلیقی تجربہ عین میں وراثت میں نہیں ملتا۔ جسے آپ روایت کہتے ہیں وہ بھی جامد نہیں ہوتی وقت دونوں میں حک و اضافہ کرتا رہتا ہے یہی کاٹ پھانس کہانی کا روپ بدل دیتی ہے۔ اس کہانی کا روپ جو فی لاصل زندگی کی جستجو کا نام ہے۔ جی ہاں برستی اور امانتی موت کے اندر سے زندگی کی جستجو اور سانسوں کے آہنگ کی تلاش۔ یہی آہنگ آج کا افسانہ معاشرے کے پھیلاؤ سے کشید کرتا ہے۔ معاشرہ جو پیسے بہت پھیلا ہوا اور سکڑا ہوا بھی کہ اب سرحدوں والی شناخت بے معنی ہو رہی ہے۔ گلوبل ویلجنگ نئی دنیا میں اب اندر کے دکھوں سے کہیں بڑے دکھ باہر سے آتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک تخلیق کار جو اس سب کچھ کو اپنی حسوں پر گدھوں اور چیلوں کی طرح چھپتے دیکھتا ہے، اسے اپنے تخلیقی تجربے سے الگ کیسے رکھ سکتا ہے۔ اس کی حسیں کیوں

کر معطل رہ سکتی ہیں۔ لہذا آج کے جیتے جاگتے سوالات آج کے فکشن کو متشکل کر رہے ہیں۔ اردو افسانے کا ایک ناظر جہاں انتظار حسین، عبداللہ حسین، نور سجاد، خالدہ حسین اور نشا یاد سے جتا ہے وہیں آج کے افسانے کا ناظر اس زمانے سے جوڑ کر مکمل ہوتا ہے جس میں جب سور سورگ کے اندر گھس کر سارے کھیت کھوڑا میں تو ”سورگ میں سور“ لکھنا پڑتا ہے، ادھر ٹوٹن ناور میں طیارے ٹکرائیں تو دھڑ دھڑا رگھن ”مرگ زار“ ہو جاتا ہے اور ہماری ننگوں کے ٹوٹنے اور بدنوں کے ”لوٹھ“ ہونے کی کہانی قرطاس پر اپنی شبہات مکمل کرتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں شمس الرحمن فاروقی کو اپنی بات کہنے کے لیے فکشن کا بیانیہ زیادہ موزوں لگتا ہے اور فہمیدہ ریاض سے لے کر شبنم فکلیں اور وحید احمد تک شاعری کے ساتھ ساتھ فکشن کا تخلیقی تجربہ لائق اعتنا ہو جاتا ہے۔ خود شمس الرحمن فاروقی سے اسلم سراج الدین، خالد طور، سید راشد اشرف تک سب اسی عرصہ میں فکشن کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہی زمانہ ہے کہ آصف فرخی کو بن کے رہے گا، لکھ کر پاکستان بننے کے ناظر میں آج کے سوالات اٹھنا پڑتے ہیں۔ نیو فرائیڈ کو ”ہرف“ کے ذریعہ اس بے حسی کو نشان زد کرنا پڑتا ہے جو طاقت اور قوت کا نشان ہو جانے والوں کا دتیرہ ہو گیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے ”دیوسوں میں“ لکھا، امجد طفیل نے ”کھینچے ہوئے مجھے کفر“ اور نیلیم احمد بشیر نے ”قیمتی“ تو یوں ہے کہ نظریے کی تنی طنز میں ڈھیلی ہوتی محسوس ہوتی ہیں اور وجود کے کنسترو میں کھنکھتے سوالات رہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حامد جاوید نے جسے ”تفریح کی ایک دو پہر“ کہا ہے اس میں تو لگتا ہے سورج سوانیزے پر چمک رہا ہے۔ مبین مرزا کا افسانہ ”قید سے بھاگتے ہوئے“ محض قید سے بھاگنے والوں کی کہانی نہیں رہتا، طاقت ور کے حیلوں، چاب باز یوں اور اس باب میں سفاکیت کی بارودی پاڑھ بچھ لینے والوں کی باطنی کیمسٹری کھوں کر رکھ دیتا ہے۔ اے خیام نے ”خالی ہاتھ“ لکھا تو دہشت زدگی اور حسرت زدگی کو ہم کر دیا، مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ”فرکس، کیمسٹری، الجبرا“ نئی نفسیات کی اُتھل پتھل دکھاتا ہے تو رفاقت حیات کا ”چریا ملک“ ملک اور ملت کے پیے دی جانے والی قربانیوں کی بے توقیری کا نوحہ ہے، شمیم منظر کا ”مسدود راستہ“ ہو یا حامد سراج کا ”برائے فروخت“، یعقوب شاہ غشبین کا ”سب مر گئے“ اخلاق احمد کا ”مارٹن کوائرز کا ماسٹر“، آمنہ مفتی کا ”خدا سے پیر کر دو“، زین فکلیں کا ”کا جوفینی کی بوتل“ سب آج کا تخلیقی بیانیہ مرتب کرتے ہیں۔ انتظار حسین سے منشا یاد تک کا دور ہو یا اس سے پہلے پریم چند سے منشا تک کا زمانہ یا پھر آج کا تخلیقی تجربہ۔ واقعہ یہ ہے کہ تخلیقی دتیرے، وقت اور پلوں کے نیچے سے بہتے پانیوں میں یہی قدر مشترک ٹھہرتی ہے کہ جہاں سے یہ پانی گزر جاتے ہیں، اپنے حصے کی تاریخ بھی رقم کر جاتے ہیں۔ اردو افسانہ نئے عہد سے پوست تجربے سے ہی شناخت مکمل کرتا ہے۔ سو اس تجربے کو بھی نگاہ میں رکھیے کہ اسی سے اردو افسانے کا ناظر لہجہ موجود تک مکمل ہوتا ہے۔

☆ ☆

اُردو غزل کی ہیئت: تجربات وامکانات

ڈاکٹر عبد سیال

جدید شاعری میں ہیئتِ تجربات بھی دراصل تجدید کے اسی عمل کا حصہ ہیں، جس میں قدیم شعری سانچوں کو جدید دور کے پیچیدہ مسائل کے اظہار کے لیے ناکافی سمجھ کر انھیں بدلنے کی کوششیں کی گئیں۔ غزل کی ہیئت صدیوں سے متعین اور ناقابلِ تبدیل سمجھی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ مختار صدیقی غزل کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

--- دوسری خصوصیت غزل کا سخت ضدی ہونا اور اس کا بغیرِ پن ہے کہ اس ضد اور ہٹ کے چہرے کو نہ کوئی بدسکا، نہ کوئی ان سے عہدہ برآ ہو سکا، صدیوں ہر کسی کو اس ضد اور ہٹ کے سامنے جھکنا ہی پڑا۔ غزل کے عاشقانِ صدق جو لوگ گزرے ہیں، اب ہیں یا آئندہ ہوں گے، وہ تو اس ضد اور ہٹ کے سامنے نیاز آ گئے ہوں ہی۔ لیکن طرزِ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی عظمتِ ذہن اور عظمتِ جذبہ کی بدولت، غزل کے مالک بھی کہلائے، ان کو بھی اس ضد پر مالکانہ حقوق نصیب نہ ہو سکے۔ ان کو بھی سر تسلیم خم کر کے صبر پر فیصلہ کیے ہی جاتی۔ اس خصوصیت کو غزل کے علمایہ کہیں گے کہ ہر کسی نے غزل کی مخصوص فارم کی ضرورت پابندی کی۔ (۱)

ساتھ کی دہائی میں غزل کے تجربات کا باقاعدہ آغاز ہونے سے پہلے بھی غزل کی ہیئت کے متعلق بحثیں ادبی حلقوں میں چلتی رہیں۔ ہیئت کا تصور بظاہر سادہ لیکن باطن حاصلاً پیچیدہ ہے۔ ریاض احمد ہیئت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”لفوی اعتبار سے ہیئت ایک ایسی خارجی شکل کا نام ہے جو کسی چیز کی انفرادیت کی حدود کو متعین کرتی ہے۔ چنانچہ فنی اعتبار سے ہیئت، ظہار کی خارجی صورت کا نام ہے“ (۲)۔ غزل کے حوالے سے دیکھا جائے تو قدیم علمائے غزل نے ردیف کی شمولیت کو بھی غزل میں ایک ہیئتِ تجربہ ہی قرار دیا ہے کیونکہ عربی قصیدے میں ردیف کا رواج نہیں تھا۔ (۳) یوں ہیئت کے مفہوم میں غزل کی صرف خارجی شکل نہیں بلکہ مصرعے کی داخلی ہئت بھی شامل ہے۔ اس لیے غزل میں ہیئتِ تجربات کو دو حصوں سے دیکھنا پڑے گا۔ اول، غزل کی ہیئت میں تبدیلی کے تجربات اور دوم، غزل میں داخلی اور ترکیبی تجربات۔

مظہر امام، غزل کی ہیئت میں تبدیلی کے تجربات کے نام ہیں۔ کرشن موہن، علیم صبا نویدی، ظہیر غازی پوری، فرحت قادری، پرویز رحمانی، منظر عاشق ہرگانوی، فارغ بخاری، قتیل شفائی، مقصود حسنی اور بعض دیگر شعرا نے اس رجحان کی پیروی کی اور مختلف جہتوں سے آگے بڑھایا۔ مظہر امام نے آزاد غزل کا جو تجربہ کیا اس کا بنیادی خیال آزاد نظم سے ماخوذ ہے لہذا آزاد غزل کی پہچان کے باقی حوالے تو وہی ہیں جو پابند غزل کے ہیں تاہم اس میں مصرعوں کی لمبائی میں کمی بیشی کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ اس غزل کے نمونے کے چند اشعار یہ ہیں:

پھول ہوز ہر میں ڈوبا ہوا پتھر نہ سہی
دوستو امیرا بھی کچھ حق تو ہے چھپ کر سہی، کھل کر نہ سہی
مسئلہ یہ ہے کہ ب یودھ کو کس طرح سے حاصل ہونجات
مسئلہ موت کا اور زیست کا چکر نہ سہی
آمرے جسم تک آ، اپر طرح دار کی طرح
یہ تو معلوم ہے تو جھانک نہ پائے گی مری روح کے اندر۔۔۔ نہ سہی

آزاد غزل کا تجربہ کرنے والے دیگر شعرا نے تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اسی طرح کی ہئیت میں اشعار لکھے
ہیں۔ مثلاً کرشن موہن کی بعض غزلوں میں پہلے مصرعے میں بحر کے کچھ ارکان کم ہیں جبکہ مصرع ثانی مکمل بحر میں ہے۔
دوسری صورت میں مصرع اولیٰ مکمل بحر میں اور مصرع ثانی کے ارکان کی تعداد کم ہے۔ علیم صبا نویدی نے اور پھر قنیل شغلی
نے بھی تقریباً یہی انداز اختیار کیا ہے۔ علیم صبا نویدی نے ابستہ بعض غزلوں میں تمام شعروں کے مصرع اولیٰ کے ارکان میں
ایک جیسی کمی کی ہے۔ ان تینوں شعرا کی آزاد غزلوں کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

وصل رنگیں کا جزا اتنا نہ لوٹ
آگئی وہوش کا رشتہ ہی جس سے جائے جھوٹ
موت ظلمت، زندگی نورِ بدام
کس قدر سنگیں ہے یہ بج، کس قدر رنگیں یہ جھوٹ

(کرشن موہن)

نہستی کے وہم نے مدت سے کر رکھا ہے تنگ
راس آتا ہی نہیں ہستی کا رنگ
درد سے کیوں بھر نہ آئے رنگ دنیا دیکھ کر
کرشن موہن ادل نہیں ہے خشت و سنگ

(کرشن موہن)

روشنی چھین کے لے جاؤ تو کچھ بات بنے
مجھ کو تڑپاؤ تو کچھ بات بنے
زینہ زینہ مری سوچوں کی طرح
آسمانوں سے اتر آؤ تو کچھ بات بنے

(علیم صبا نویدی)

شکوہ کیا تقدیر کا
جب نہیں حیرا من کا غد مری تصویر کا

نوتا جاتا ہوں میں
زخم خوردہ، رافغم میں ہے قدم تدبیر کا

(علیم صبا نویری)

گنگنا تاتا ہے لہو یوں ہری شریانوں میں
جیسے قیدی کوئی زندہ نوں میں
کتنی تقسیم سے اندر سے وہ جان محفل
اک سہا تے سلیمانوں میں

(قتیل شفائی)

ظہیر غازی پوری کا غزیہ۔ تجربہ دار سا مختلف ہے۔ ان کی آزاد غزل میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں ارکان کی تعداد برابر ہے۔ تاہم غزل کے تمام اشعار میں بحر کی حوالہ یک ہی نہیں ہے۔ مثالاً مد خطہ ہو

صبح سے گزرو تو آنگن آئے گا
روشنی کا ایک مسکن آئے گا
قتل احساسات کا الزام مجھ کو دیں مگر
تذکرہ تو آپ کا بھی اجڑا آئے گا
فکر کی ہر راہ میں
مقتل فن آئے گا

فرحت قادری نے بھی اپنی آزاد غزلوں میں کم و بیش انہی بیبتوں کو برتا ہے جو اوپر بیان ہوئیں۔ تاہم ان کی غزلوں میں ایک شکل منفرد ہے۔ آزاد غزل کی اس شکل میں پہلا مصرع بحر کے ایک رکن سے شروع ہوتا ہے اور ہر اگلے مصرعے میں ایک رکن کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں غزل کی شکل اس طرح بنتی ہے

یقین ہے
جہاں کچھ نہیں ہے
خلاؤں کا دامن ہے خالی
جو میں ڈھونڈتا ہوں وہ زیرِ زمیں ہے
مرے خواب اب پلتے پلتے جواں ہو گئے ہیں
ہر اک سانس میں ایسی شورش ہے گویا لبِ آتشیں ہے
مثالوں کی دنیا میں ہر شے کی تشبیہ ممکن ہے مل جائے لیکن
ہری دھڑکنوں کا جو عالم ہے اس کی زمانے میں تشبیہ کوئی نہیں ہے

فرحت قادری نے اسی عمل کو معکوس کرتے ہوئے یعنی پورے مصرعے سے آغاز کر کے ہر اگلے مصرعے میں ایک رکن کم

کرتے ہوئے بھی آزاد غزل کا تجربہ کیا ہے۔

خاطر غزنوی کی 'مطالعائی غزل' بھی ہیئت کا تجربہ ہے۔ اس ہیئت میں تمام اشعار مطلعوں پر مشتمل ہیں جن میں قافیے بدلتے ہیں جبکہ ردیف وہی ہے۔

ہر زخم ہوا زخم کا مرہم ، اسے کہنا
ہوٹوں پہ نہیں ہے مرے اب دم، اسے کہنا
پوچے ہیں جوانی میں بہت صفت ، اسے کہنا
اب بیت گئی کفر کی وہ رت ، اسے کہنا
اپنائی ہے کچھ اور ہی دنیا ، اسے کہنا
اب آ گیا تنہائی میں جینا ، اسے کہنا

فارغ بخبری کا نام بھی غزل میں ہنکتی تجربات کرنے والے شعرا میں بہت کم ہے۔ ان کا مجموعہ 'کلام غزلیہ' پورے کا پورا ہنکتی تجربات پر مبنی غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کے ہاں غزل میں پانچ انواع کے ہنکتی تجربات ملتے ہیں۔ ان میں سے چار تو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہیں۔ ان سے غزل کی بنیادی ساخت ہی قابل شناخت نہیں رہتی۔ تاہم ایک تجربہ ایسا ہے جسے دوسرے چند شعرا نے بھی اپنایا ہے اور اسے 'نثر غزل' کا نام دیا ہے۔ یہ غزل کی ایک ایسی ہیئت ہے جس میں ایک ہی بحر سے تعلق رکھنے فریاد کو اکٹھا کر دیا جاتا ہے۔ مثال دیکھیے

نظر نہ آئی کبھی اپنے گھر کی تاریکی
جلا رہا ہوں میں کب سے چراغ راہوں میں
چمن میں رہتے ہوئے ایسی فطرت ہے کہ اب
قفس میں بھی ہمیں ہوتی ہے تیلیوں کی تلاش
وہ اتنی نازک و نرم و گداز ہے کہ اگر
بریف کیس میں آ جائے تو عجب بھی نہیں

ہیئت کے لحاظ سے بشیر بدر کا ایک اور تجربہ 'نثری غزل' کا ہے۔ انھوں نے غزل کی شناخت ہیئت کی بجائے اس کی تہذیبی خصوصیات کی بنا پر کی ہے اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ غزل کا تہذیبی جوہر اگر نثری جملوں کی صورت میں ادا ہو جائے تو وزن کی قید بھی اٹھا دینی چاہیے۔ بشیر بدر کے ساتھ دیگر کچھ شعرا نے بھی اس انداز کی 'غزلیں' کہنے کی کوشش کی ہے۔ مثالیں دیکھیے

میں اپنی زبان کاٹ کر ہتھیلی پر رکھوں گا
برفانی گدھ اسے بھپٹ کر آسمان پر چلا جائے گا
دن کے خارش زدہ کتے میری ہڈیاں چھوڑیں گے
بوڑھا بابا میرے زخموں پر آگ کا مرہم لگائے جائے گا

لیکن رات کے سینے میں سیٹیاں چٹیں گی
 اور انجن صبح کے منہ پر کالک مل کر چلا جائے گا
 (بشیر بدر)

آؤ ہم خود کو دستوں سے جوڑ دیں
 فاصلے محدود ذہنوں کی ایجاد ہیں
 (ظفر صہبائی)

نہ ہوا تو ہی قدم رنجہ مثالی رہگذر
 دیدہ شوق سے پھر کس نے نکالی رہگذر
 (ظفر صہبائی)

آزاد غزل کی اختراع اور فروغ کے کئی جواز اور وجوہات پیش کی گئی ہیں جن میں سے بعض مضحکہ خیز حد تک عجیب ہیں۔ مثلاً فرحت قادری کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

بات دراصل یہ ہے کہ روز بروز انسان کل پسند ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں ہر شخص مشین بن گیا ہے۔ فرصت کے اوقات کم ہیں۔ اب وہ فراغت کا زمانہ نہیں رہا کہ ایک شاعر مجر و وزن اور ردیف و قوافی کی الجھنوں میں ہفتوں سرگرداں رہے۔ آؤ، نظم کی ایجاد نے شاعروں کی الجھنیں کافی حد تک کم کر دی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح پابند غزل گوئی کے مقابلہ میں آزاد غزل گوئی کافی سہل ہے اور کم سے کم وقت میں پانچ چھ اشعار کی غزل تیار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز بروز آزاد غزل کہنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ (۴)

گویا غزل کہنا کوئی فریضہ ہے جس کی ادائیگی ہر حالت میں ضروری ہے ورنہ کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے کہ جلد سے جلد پانچ چھ اشعار کی غزل تیار ہو جائے اور جلد ہی دور کا سہل پسند اور عظیم الفرصت انسان اس فریضے کی انجام دہی سے عہدہ برآ ہو سکے۔

غزل کے ان ہستی تجربوں کا بنیادی محرک، جیسا کہ غزل میں ہیئت کے تجربے کرنے والے شعرا و ناقدین کا کہنا ہے، نظم کی مختلف ہیئتوں کا فروغ ہے۔ اسی لیے ان تجربوں کے نام نظم کی اصناف کے نام پر آزاد غزل، معزی غزل، نثری غزل وغیرہ رکھے گئے۔ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ایک مغالطے کا پیدا کردہ ہے جس کا شکار اردو شاعری کے بعض ناقدین ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اردو نظم نے پابند نظم کی پابندیوں سے رفتہ رفتہ گریز پائی اختیار کی۔ پہلے قافیہ و ردیف کی قید سے نجات حاصل کی گئی اور معزی نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ پھر بحر کی یکساں طوالت سے جان چھڑ کر مصرعے چھوٹے بڑے کیے گئے تو آؤ، نظم رائج ہوئی۔ اور آخر کار وزن کی پابندی بھی اٹھا دی گئی تو نثری نظم لکھی جانے لگی۔ بظاہر یہاں لگتا ہے لیکن دراصل ایسا ہے نہیں۔ نظم کے اس ارتقائی سفر میں ایسا نہیں کہ آزاد نظم، پابند نظم کی ہیئت کو توڑ کر وجود میں لائی گئی ہو۔ ہمارے ہاں

پابند نظم پہلے سے موجود تھی۔ آزاد نظم اپنی اسی بنی بنائی حالت میں مغرب سے آئی۔ ہم نے اس ہیئت کو اپنایا اور قبول کیا ہے، ایجو ورا اختراع نہیں کیا۔ یہی حال معرکی اور معرکی نظم کا ہے۔ یہ ہیکتیں بنیادی طور پر مغربی ادب کی مقبول ہیکتیں ہیں۔ غزل کا وجود، اس کی معروف ہیئت کے ساتھ، فارسی، اردو اور برصغیر کی دیگر چند زبانوں کے علاوہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملا۔ اس لیے نظم کے طرز پر اس میں ایسی ہیئتوں کی تلاش جو نظم کے مماثل ہوں، ایک بے معنی عمل ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ نظم کی یہ تمام ہیئتیں الگ الگ اصناف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے جب معرکی نظم اپنے مصرعوں کی طوالت میں کمی بیشی کرتی ہے تو وہ معرکی نظم نہیں رہتی بلکہ آزاد نظم بن جاتی ہے جو ایک الگ صنف ہے۔ اسی طرح جب آزاد نظم وزن کی پابند نہیں رہتی تو وہ آزاد نظم بھی نہیں رہتی بلکہ ایک اور صنف معرکی نظم (گر یہ کوئی صنف ہے تو؟) بن جاتی ہے۔ اس بحث سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر غزل کی ہیئت، جو اس کی بنیادی شناخت ہے، کے بنیادی عناصر میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے تو جو کچھ بنے گا وہ کوئی اور صنف تو ہو سکتی ہے، غزل نہیں۔

غزل کی ہیئت میں جن تجربات کی گنجائش نکلتی ہے وہ داخلی اور تزئینی ہیں اور ان کا تعلق مصرعے کی ہیئت کے اندرونی نظام سے ہے۔ اس کی طرف فارسی اور اردو غزل کے شعرا نے ہر دور میں توجہ کی ہے۔ چنانچہ حافظ سے لے کر بیدل اور میر سے لے کر مجید امجد تک ہر دور کے غزل گوؤں نے ان ہیئتی تجربات میں اپنی فنکارانہ آماج کا مظاہرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

سانھ کی وہائی میں جب اردو غزل کی ہیئت میں خارجی تبدیلی کے تجربے شروع ہوئے۔۔۔ بعض ایسی کوششیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں جن میں ہیئت غزل کے بنیادی فریم کو تو متاثر نہیں کیا گیا البتہ اسے داخلی طور پر راستہ کر کے ایک تزئینی ٹوکا سامان ضرور کیا گیا ہے۔۔۔ ہیئت کی خارجی تبدیلی کے متنوع رنگوں کی آب و تاب صنف غزل کو ایک حیرت افزا تابندگی سے ہم کنار کر رہی ہے۔ (۵)

جدیدیت کے دور سے تعلق رکھنے والے چند غزل گوؤں کے ہاں داخلی و تزئینی ہیئتی تجربات کی مثالیں ذیل میں دی گئی ہیں۔ یہاں یہ ثابت کرنا مقصود نہیں اور نہ ایسا ہے کہ ان شعرا کے ہاں پہلی مرتبہ ایسی کوششیں ملتی ہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ جدید دور کے غزل گوؤں کے ہاں نیرنگی ہیئت کی مثالیں موجود ہیں۔

مجید امجد کی غزلیں داخلی ہیئت کے تجربات کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ وہ، بقول خود، نظم کی گونا گوں اشکال کے سودائی رہے ہیں (۶) اور نظم میں ان کے ہیئتی تجربات اس قدر متنوع اور تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ اردو کے کسی اور نظم نگار کے ہاں شاید ہی ملیں۔ ان کی یہی ہیئتی تجربہ پسندی ان کی غزلوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر نواز علی لکھتے ہیں کہ ”مجید امجد اجتہادِ رسچہ کی تکمیل پسندی کا قائل تھا۔ جب وہ لکھنے بیٹھتا تھا تو شاید یہ طے کر لیتا تھا کہ جیسے وہ غزل میں بھی نئی ہیئت تراشنے جا رہا ہے۔ وہ ہمیشہ معنی، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے ایک نیا تجربہ کرتا تھا“۔ (۷) مجید امجد کی ایک ذوقا فہم غزل کے چند شعر دیکھیے۔

مبھوں کی وادیوں میں گلوں کے پڑاؤ تھے
 دور ، ایک ہانسری پہ یہ دھن ، ”پھر کب آؤ گے“
 ک بات رہ گئی کہ جو دل میں ، نہ لب پہ تھی
 اس اک خن کے ، وقت کے سینے پہ گھاؤ تھے
 کیا رو تھی ، جو نشیبِ افق سے مری طرف
 ٹہری ، پلٹ پلٹ کے ندی کے بہاؤ سے

مجید امجد کے ہاں ایک اور التزام رموزِ اوقاف کا ایسا استعساں ہے جو گفتگو میں سانس لینے کے وقفے، سوچنے کے وقفے اور لہجے کا تعین کرتا ہے۔ مجید امجد کی غزلیں وزن کے عمومی بہاؤ میں پڑھنے سے اپنا پورا تاثر آشکار نہیں کرتیں بلکہ انھیں ان مخصوص رموزِ اوقاف کے ساتھ پڑھنے سے ان کے معنی اور لہجہ واضح ہوتا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار دیکھیے:

میں روتا رہا اور بہاروں کے رنگ
 نکھرتے گئے ۔۔۔ دن گزرتے گئے

حیری آہٹ قدم قدم ۔۔۔ اور میں
 اس معیت میں بھی رہا ، تنہا

رک کے اس دھارے میں کچھ سوچ ۔۔۔ اک یہ اچھا سا خیال
 جو جڑے حق میں ہے ۔۔۔ کیسا ہے ، جڑے دل کے لیے

نظم میں ن۔م۔م۔م۔ راشد و بعض دیگر شعرا کے ہاں لہجے کے اس تعین کا التزام ملتا ہے۔ مجید امجد کے علاوہ دیگر شعرا کے ہاں بھی اس تجربے کی مثالیں موجود ہیں۔

جون ایلیا اور شبیر شاہد کے ہاں ایسی غزلیں ملتی ہیں جن میں ایک ہی مصرعے کو ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے طور پر دہرایا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جون ایلیا نے تمام اشعار مطلع کی طرح ہم قافیہ کہے ہیں جبکہ شبیر شاہد کے ہاں اس کا التزام نہیں ابتہ شبیر شاہد نے ہر شعر کے پہلے مصرعے میں بھی ایک انگ قافیہ کا اہتمام رکھا ہے۔ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آفرینش ہی فن کی ہے ایجاد
 یہی بابا الف کا ہے ارشاد
 فن ہے اپنے زیاد سے بھی زیاد
 یہی بابا الف کا ہے ارشاد

ہے گماں ہی گمان کی بنیاد
 یہی بابا اہل کا ہے ارشاد
 (جون ایلیا)

سنو یہ آواز دور کی لہر کی صدا ہے
 اٹھاؤ لنگر کہ پھر سمندر بلا رہا ہے
 ہوا موفی ہے کھول دو بادبان سارے
 اٹھاؤ لنگر کہ پھر سمندر بلا رہا ہے
 چلو کہ ساگر کی اور بنے لگے ہیں تارے
 اٹھاؤ لنگر کہ پھر سمندر بلا رہا ہے
 (شبیر شاہد)

غزل کا مصرع اولیٰ عموماً قافیہ اور ردیف کی پابندی سے آذر رکھا جاتا ہے لیکن جدید دور کے بعض شعرا کے ہاں
 غزل کے پہلے مصرعوں میں بھی ایک الگ قافیہ و ردیف کے نظام کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ بہت ہنر آزمایا ہے۔
 مختار صدیقی اور غلام محمد قاصر کے ہاں اس تجربے کی مثالیں دیکھیے۔

نورِ سحر کہاں ہے اگر شامِ غم مٹنی
 کب انکسائے تھ کہ جو خوسے ستم مٹنی
 پھیرا بہار کا تو برس دو برس میں ہے
 یہ چال ہے خزاں کی جو رک رک کے تھم گئی
 ہاں طرح آشیوں بھی انھی خار و خس میں ہے
 بجلی جہاں پہ خام برنج گرم گئی
 (مختار صدیقی)

کھلے تھے لفظ گدبوں کی دامن کے لیے
 لبوں کی سرخی سلاخی نہ تھی خزاں کے لیے
 ندی میں چاند نکلاتا ہے انعکاس کے پھول
 ازل سے بہتی شعاعوں کے کارواں کے لیے
 میرے بدن پہ متعش خرمے لباس کے پھول
 یہ ریگ زاہر ہے توسیع گلستاں کے لیے

(غلام محمد قاصر)

غزل کے ہر شعر کی ابتدا کسی خاص لفظ یا کلمے سے کرنے کا تجربہ بھی ملتا ہے۔ مثلاً صوفی تبسم نے ایک غزل کے

ہر شعر کے دونوں مصرعوں کی ابتدا ایک ہی کلمے سے کی ہے۔ یہی طرح جمال احسانی نے ایک غزل کے تمام اشعار کے پہلے مصرعوں کی ابتدا ایک لفظ سے اور دوسرے مصرعے کی ابتدا ایک ورغفہ سے کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکبہ نہ کر سکو
ایسا نہ ہو یہ درد بنے درد لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مدادا نہ کر سکو
اللہ کرے جہاں کو بھری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو
(صوفی تبسم)

اک ندی موج در موج پہلو بدلتی رہی
ایک کشتی بڑے رکھ رکھاؤ سے چلتی رہی
اک پرندہ ہوا آبِ روانے کی خواہش میں گم
ایک ٹہنی کے دکھ میں ہوا ہاتھ ملتی رہی
اک ستارہ کہیں آسمان پر الجھتا رہا
ایک انگنائی میں رات بھر آگ جلتی رہی
(جمال احسانی)

کیف انصاری کے ہاں ایک ایسا تجربہ ملتا ہے جو بے پناہ قادر الکلامی اور ہنرمندی کا تقاضا کرتا ہے۔ انھوں نے مصرع کے درمیان میں ردیف اور اس کے دونوں طرف قافیہ رکھے ہیں۔ ردیف سے پہلے ایک قافیہ اور ردیف کے بعد دوسرا مسلسل قافیہ ہیں۔ غزل کے دو شعر دیکھیے۔

زیر سفر سے دُور ہوا عرصہ ہوا
پچھلی کے ہنر سے دُور ہوا خدشہ فنا
دارِ محوم جب سے ہے موسم کے سامنے
حرفِ شجر سے دُور ہوا لہجہ صبا
کیوں منتظر کھڑے ہیں کینران و چوہدر
اپنے تو سر سے دُور ہوا سایہ ہما
(کیف انصاری)

کچھ شعرا نے ایسی غزلیں کہی ہیں جن میں مصرعِ اولیٰ کے آخری کلمے کو مصرعِ ثانی کے پہلے کلمے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کیف انصاری اور ریاض الرحمن ساغر کے ہاں ایسے تجربات کی مثالیں مدِ حلقہ ہوں

یہ قحط لفظوں کا چُپ کے اندر چھپائے رکھنا
 چھپائے رکھنا ، بھرم نہ اپنا گنوائے رکھنا
 سفر میں محسوس کرنا خود کو گھروں میں رہ کر
 گھروں میں رہ کر سفر کی باتیں سنائے رکھنا
 حفاظت خواب کی طلب سے یہی ہے بہتر
 یہی ہے بہتر کہ نرم ہلکوں کے سائے رکھنا
 (کیف انصاری)

ایک نگر میں چلتے چلتے آخر شام ہوئی
 آخر شام ہوئی اور ساغر اپنے نام ہوئی
 ٹوٹے پن پر واز سے چھڑے ایک پرندے کے
 اک پرندے کی ہر کوشش بھی ناکام ہوئی
 ایک درختچے کی سرگوشی گلیوں نے سن لی
 گلیوں نے سن لی اور سادے شہر میں عام ہوئی
 (ریاض الرحمن ساغر)

اردو غزل میں اس نوع کے تزئینی تجربات پہلے ادوار کی طرح جدیدیت کے دور سے تعلق رکھنے والے متعدد شاعروں نے بھی کیے۔ غزل کا فریم تو وہی رہا تاہم اس کے اندر سچے ہوئے الفاظ و کلمات اپنی ترتیب بدل بدل کر نئے پس کا تاثر قائم کرتے رہے۔ یوں غزل کی بنیاد یک حوالے سے قائم بھی رہی اور دوسرے حوالے سے بدلتی بھی رہی۔ اب تک کے تجربات بتاتے ہیں کہ غزل کی شناخت اور اس کے جمالیاتی پیکر کو برقرار رکھتے ہوئے بیت کی تبدیلی اسی قدر ممکن ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ مختار صدیقی، ابتدائی، ”جلتی بجھتی“ نکلیں، ارشد ادا احمد، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰
- ۲۔ ریاض احمد، ”تقیدی مسائل“، اردو بک شاں، لاہور، ۹۶۱ء، ص ۱۳۸
- ۳۔ نجم الغنی رامپوری، موبوی، ”بحر الفصاحت“، جلد سوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۱
- ۴۔ فرحت قادری، ”آزاد غزل“، وقت کی ضرورت، ”مشمول“ آزاد غزل، شہنشاہ کی حدود میں
- ۵۔ مرتبہ: علیم حبیب نویدی، انجمن مصنفین اردو، تامل ناڈو، مدراس، بھارت، ۱۹۸۳ء، ص ۱۶۲، ۱۶۳
- ۵۔ طارق ہاشمی، ڈکٹر، ”اردو غزل میں اسلوب، زبان اور بیت کے تجربات“، ”مق“۔ برائے پی ایچ ڈی، اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۸
- ۶۔ مجید امجد للیب، ”محب رفت“، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۸۱ء
- ۷۔ نواز شعلی، ڈاکٹر، ”مجید امجد کی غزل: بنیاد اور اظہار کا تنوع“، ”مشمول“ ”جدید اردو غزل“، مرتبہ: خدا بخش اور نیل، پبلک لائبریری، پٹنہ، شکارہ، ۱۳۲۰ھ، اکتوبر۔ دسمبر، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۳



اُردو ادب پر پنجابی ثقافت کے اثرات

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

پنجاب زمین کے ان خطوں میں شامل ہے جنہیں انسانوں کے اولین مسکن و مامن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ پنجاب میں انسان کی آباد کاری کے نقوش صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ اور مؤرخین نے پنجاب کے خطے میں بیس لاکھ سال قبل کی انسانی آبادیوں کا سراغ لگا کر پورے عالم کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اگر آثار شناسوں کی اس کھوج کو محض ان کا اندازہ یا قیاس جان کر نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی پنجاب میں انسانی آبادی کی قدمست چار ہزار سال تک جا پہنچتی ہے۔ یہ چار ہزار سال کی پرانی آبادی ”سواں تہذیب“ کی صورت میں اپنے واضح آثار اور روشن نقش و نگار کے ساتھ موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ڈی میرا، ڈاکٹر پیٹرسن اور دوسرے علمائے آثاریات نے اس تہذیب کے حوالے سے گراں قدر کام کیا ہے۔ پنجاب کا خطہ پتھر اور دھات کے مختلف ادوار کے نقش و نگار اور رنگ و آہنگ کا بھی امین ہے۔ یہاں سے ملنے والے پتھر اور دھات کے مختلف زمانوں کے آلات، گھریلو اشیاء کے برتن، زیورات، ہتھیار، مورتیاں، بت اور سکے اس دھرتی کی تداومت کی داستان سناتے ہیں۔ اس خطہ زمین پر بڑی بڑی آبادیوں یا شہری معاشرہ کی داغ بیل ڈالنے کے واضح ثبوت ابتدائی ہڑپائی عہد سے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عہد ۳۰۰۰ ق م سے ۲۳۵۰ ق م تک مقرر کیا گیا ہے۔ پانی کی کثرت کے باعث اس دور کے لوگ اجتماعی طور پر زراعت کے پتے کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ اس خطے کو سب سے پہلے کن لوگوں نے آباد کیا؟ کون کون سی قومیں آریا کی آمد سے پہلے یہاں زندگی کرتی رہیں؟ ان کے مشغل کیا تھے؟ ان کا طرز بود و باش کیسا تھا؟ وہ کون سی زبانیں اور بولیاں بولتے تھے؟ یہ اور اس طرح کے کئی سوال ہنوز جواب طلب اور کھنہ تحقیق ہیں۔ موہن جو داز اور دوسرے علاقوں سے ملنے والے اکثر کتبے اور تحریریں ابھی ناخوانا ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب یہ تحریریں بولنے لگیں گی اور اس عہد کا منظر نامہ پوری طرح روشن اور صاف دکھائی دینے لگے گا۔ آریاؤں کی آمد اور ان کے بعد کا منظر پوری طرح تابانی میں ہے۔ آریا کا اولین مرکز پنجاب ہی تھا جسے انھوں نے ”سپت سندھو“ یعنی سات دریاؤں کی زمین کا نام دیا۔ یہاں دید لکھے گئے جن میں اس خطے کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کی جھلکیاں محفوظ ہیں۔ ان کے بعد یہاں یونانی آئے، چندر گپت موریا کا خاندان برسر اقتدار رہا، باختری یونانی حکومت کرتے رہے، ساکا، پارٹھی، کشاں، کنشک، ساسانی اور ہنن اس خطے پر اقتدار کے نشے میں سرمست رہے۔ مسلمانوں، انگریزوں اور سکھوں نے بھی اس خطے پر حکمرانی کی۔ ”ہر کہ آمد غارت نوسخت“ کے مصداق یہاں آنے والوں نے اپنے طرز زیست کو یہاں رواج دینے کا جتن کیا، مقامی لوگوں کو اپنے رسوم و قیود کا پابند بنانے کی کوشش کی۔ یہ خطہ مختلف مذہبوں، ملتوں، نسلوں اور فکروں کی آمج گاہ بنا رہا۔ یہاں کی تہذیب و معاشرت، رہن سہن اور یہاں کی ثقافت گزرے زمانوں کے رنگوں کی امین اور وارث ہے۔ مختلف نسلوں، مذہبوں اور نظریوں کے امتزاج نے یہاں کی تہذیب و ثقافت کو ہمہ رنگی کی بذت سے ہم کنار کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ پنجاب کی ثقافت دنیا کی متون ثقافتوں میں شامل ہے۔ ثقافت کا گھیرا پوری انسانی زندگی اور اس کے اعمال و افعال کو محیط ہے۔ ڈاکٹر

جہیل جالسی کے بقول:

”کلچر کُل کا نام ہے جس میں مذہب و عقاید، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر، رسم و رواج، افعال، ارادی اور قانون، صرف اوقات اور وہ ساری عادات شامل ہیں جن کا انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اسباب کرتا ہے اور جن کے برتنے سے معاشرے کے منفرد و مختلف افراد اور طبقوں میں اشتراک و مماثلت، وحدت اور یک جہتی پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کے ذریعے انسان کو وحشیہ نہ بنے اور انسانیت میں تعمیر پیدا ہو جاتی ہے۔ کلچر میں زندگی کے مختلف مشاغل، ہنر اور علوم و فنون و اعلیٰ درجے پر پہنچنا، نئی چیزوں کی اصلاح کرنا، تنگ نظری اور تعصب کو دور کرنا، غیرت و خودداری، ایثار و وفاداری پیدا کرنا، معاشرت میں حسن و لطافت، اخلاق میں تہذیب، عادات میں شائستگی، لب و لہجہ میں نرمی، اپنی چیزوں، روایات اور تاریخ کو عزت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کو بلندی پر لے جانا بھی شامل ہیں۔“ (۱)

کلچر یا ثقافت کی تشکیل و ترتیب مذہب، تاریخ اور جغرافیہ سے عبارت ہے۔ ہر علاقے کی ثقافت دوسرے علاقوں کی ثقافت سے مختلف اور منفرد ہوتی ہے۔ کلچر کسی قوم یا معاشرے کی شناخت اور شخص کا ذریعہ ہوتا ہے اور یہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔ کلچر میں ہر عہد اور زمانے کا رنگ شامل ہو کر اس کے دائرے کو وسعت سے ہم کنار کرتا ہے مگر یہ ایک خاص زمین یا ایک مخصوص جغرافیہ کی حریم سے قدم باہر نہیں نکالتا۔ پنجاب کے خطے میں آباد ہونے والی مختلف قوموں کے اثرات سے یہاں کی تہذیب و ثقافت وسعت آگیا ہوئی اور ان کے نشانات اور امتیازات کو اب بھی واضح کیا جاسکتا ہے مگر یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا کہ یہاں کی سرزمین مکمل طور پر کسی دوسری زمین کے کلچر کی حامل ہے۔ کلچر کسی مخصوص جغرافیہ میں خود بخود نمود کرتا ہے، بیرونی اثرات سے اسے تعلق نہیں رہ سکتا مگر اس کے اثرات کو اپنے دامن میں جذب کر کے اپنے وجود کا حصہ بنالیتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کلچر کی زمین سے وابستگی کے متعلق رقم طراز ہیں:

”کلچر نہ تو دوسری اشیاء کی طرح درآمد کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے آرڈر پر تیار کرنا ہی ممکن ہے۔ کلچر تو ایک خاص خطہ زمین میں موجود مختلف عناصر کی آمیزش اور آمیزش سے خود بخود ایک خاص رنگ اختیار کرتا ہے۔ ان عناصر میں ہوا، پانی، موسم، زمین کی خاصیت اور خون کا گروپ یہ سب چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ لہذا کسی خطہ زمین کے کلچر کو دوسری ثقافتوں سے جدا کر کے دکھانا ممکن ہے۔“ (۲)

پنجاب کی اس رنگارنگ ثقافت کی تعمیر و تشکیل میں کئی صدیوں کا فیضان جھلکتا ہے۔ یہاں کے رسم و رواج، اعمال و افعال، اقدار و روایات، ملبوسات، زیورات، میلانات، رویوں اور عادتوں میں ہمہ رنگی اسی رنگی ثقافت کا نتیجہ ہے۔ یہاں پر وہان چڑھنے والی زبانیں اور زبانیں بھی تنوع کے اسی ذائقے سے سرشار اور لذت یاب ہیں۔ ہماری قومی زبان اردو کی ساخت پر ساخت اور تعمیر و تشکیل میں جن علاقوں نے نمایاں طور پر حصہ لیا، پنجاب ان میں سرفہرست دکھائی دیتا ہے بلکہ صرف محمود شیرانی اور کئی دوسرے اہل دانش پنجاب کو اردو کی جنم بھومی قرار دیتے ہیں۔ اردو زبان کی ساخت، اس کے الفاظ کی وضع قطع، تراکیب کی تراش خراش، فقرہوں کی بناوٹ اور حصوں کے دروست میں پنجاب اور پنجابی زبان کا حسن و صفا طور پر اپنی جھلک دکھانا نظر آتا ہے۔ اگر بے نظر انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو شعر و ادب کی تخلیق میں بھی پنجاب اور اہل پنجاب کا حصہ دوسرے علاقوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ تخلیق کار معاشرے کا آئینہ بردار اور ارد گرد کی

زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک مخصوص ثقافتی حصار میں رہتے ہوئے وہ اس کے ثقافتی اثرات سے دامن بھی
 لے۔ اردو کی تعمیر و تشکیل اور اس کے شعر و ادب کے ارتقا میں بلاشبہ دوسرے علاقوں اور زبانوں نے بھی اپنا فعل کر دار ادا
 کیا اور وہاں کے ثقافتی عناصر نے اس کے حسن کو سنوارنے اور سجانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر بیشتر علاقوں کے ثقافتی
 عناصر ایک مخصوص عہد تک اس میں چمکے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نقش و نگار مدھم ہوتے چنے گئے۔ پنجاب کا رنگ
 و آہنگ چوں کہ اردو کے خمیر میں گندھا ہوا ہے اس لیے اس کی تابانی کبھی ماند نہ پڑی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں
 اضافہ ہوا۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے اردو شعرا و ادبا کی تخلیقات میں تو اس خطے کی تہذیب و ثقافت اپنے تمام تر رنگوں
 کے ساتھ جلوہ فگن ہے ہی دوسرے جغرافیوں، اور ثقافتوں کے حامل اردو تخلیق کاروں کے ہاں بھی پنجابی ثقافت کا جادو سر
 چڑھ کر بولتا ہے۔ انشا اللہ خاں کا یہ کہنا:

سُنا یہ رات کو قصہ جو ہیر راجھے کا

تو اہل اردو کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

محض روایتی قصے کی سحر طرازی، عشقیہ واردات کی موزوں ترسیل اور شعر و ادب کے تخلیقی عناصر کے بر محل استعمال کو خراج
 نہیں بلکہ اہل پنجاب کی تہذیبی و ثقافتی ہمہ رنگی اور اقدار و روایت کے جمالیاتی زاویوں کی تحسین بھی ہے۔

اردو شعر و ادب اپنے آغاز سے لے کر آج تک پنجاب کی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر ثقافت کے حسن و جمال کا اسیر
 ہے۔ بابا فرید شکر گنج سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک اردو شعر و ادب جن جن راستوں سے گزرا، جن دیوار و اصوار
 میں پھلتا پھولتا رہا، پنجاب کی ثقافت برابر اس پر سایہ فگن رہی اور اس کے رگ و ریشے میں اتر کر اس کی رعنائی و در دل
 پذیرائی میں اضافہ کرتی رہی۔ اردو شعر و ادب کی اس پوری داستان کو سامنے رکھ کر اس کے وجود میں سانس لیتی پنجاب کی
 ثقافت کو بین کرنے کا محل نہیں، بنگلی وقت کے پیش نظر محض بیسویں صدی کے اردو شعر و ادب پر ایک اجمالی اور سرسری نگاہ
 ڈالتے ہیں۔

بیسویں صدی کا اردو ادب نئے رنگوں اور نئے ذائقوں کا امین ہے۔ اس صدی میں نئے علوم و فنون کے دروا
 ہوئے، نئے موضوعات، نئی اصناف، نئے خیالات، نئے اسالیب بیان اور نئے طرز احساس نے دنیا کی سب زبانوں اور
 ان کے شعر و ادب کو نئے آفاق کی بشارت دی۔ اردو شعر و ادب نے بھی زمانوں کے تقاضوں کے مطابق اپنے دامن کو
 وسعت آشنہ کیا۔ بیسویں صدی میں اردو شعر و ادب کا بڑا مرکز پنجاب رہا۔ معیار اور مقدار ہر دو اعتبار سے پنجاب کے اردو
 تخلیق کاروں نے قابل قدر ادب تخلیق کیا۔ جدید نثری اصناف جیسے افسانہ، ناول، ڈراما اور انشائیہ کی تخلیق میں اہل پنجاب
 کے اردو تخلیق کاروں کے فعال کردار نے ان اصناف کو بھسنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ ان اصناف میں پنجاب کی تہذیب
 و ثقافت کا رنگ تمام تر جلوہ سار، نیوں کے ساتھ شامل ہے۔ یہاں کے مناظر، دریا، میدان، صحرا، وادیاں، سبزہ زار اور
 ہرے بھرے لہلہاتے کھیت، یہاں کی بستیوں کے گھبرو، الحزنیہ ریں، یہاں کے حجرے، چوپالیں، پگھٹ، ترنجن، کھیاں
 اور گلیاں، خواب، تمنائیں، ریمیں، ریتیں، قد ریں اور دیگر جملگاتے نقوش نے جدید اردو نثر کے دامن پر وہ نمل بوٹے
 کاڑھے جو دامن قلب و نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے اور گوش و ہوش کی دنیا کو سیراب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جدید افسانہ
 نگاروں میں منٹو، بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، شفاق احمد، غلام عباس سے فضا یو، احمد دود اور جدید تر
 افسانہ نگاروں کے فسانوں میں پنجاب پورے رنگوں کے ساتھ سانس بیٹا اور اس کی ہمہ رنگ ثقافت اپنے تمام زاویوں کے

ساتھ عکس نگار دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگاری کے میدان میں ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ سے لے کر جدید ناول نگاروں تک سبھی کے ناولوں میں پنجاب کے مناظر، کردار، رسم رواج، پوشاکیں، پہناوے، زیورات اور ہنستی ہستی زندگی کے تمام خدو خال جذب و خیال کو نئے ذائقوں سے آشنائے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ امجد اسلام امجد، اشفاق احمد، ڈاکٹر طارق عزیز، منو بھائی، عطا الحق قاسمی، اصغر ندیم سید و دوسرے ڈراما نگاروں نے پنجاب کی معاشرت اور یہاں کے وسیب کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنا کر جدید اردو ڈرامے کی ثروت میں اضافہ کیا۔ ان ڈراموں میں پنجاب کے بڑے بوڑھے، بچے، عورتیں، پرندے، جانور، ٹاپتے گاتے دریا اور بھنگڑا ڈانستے کھیت کھلیاں سب کچھ موجود ہے۔

بیسویں صدی کی اردو شاعری بھی پنجاب کے تہذیبی و ثقافتی عناصر سے مالا مال اور گلشن بہ کنار ہوئی ہے۔ اردو غزل جسے شاعری کی آبرو اور انتہاؤں کی انتہا کہا جاتا ہے، طویل سفر کر کے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اور دکن، گجرات، دہلی، لکھنؤ اور رام پور کے منطقوں سے گزرتی جب پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوتی ہے تو اس کا دامن نئے رنگوں، نئے موضوعات، نئے سلیب اور نئی لفظیات سے سج جاتا ہے۔ پنجاب میں لکھی جانے والی اردو غزل اپنے رنگ روپ اور سج و سج کے اعتبار سے الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ جدید اور جدید تر غزل گو شاعروں نے پنجاب کے ثقافتی حسن کو غزل کے دامن میں سجانے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ باقی صدیقی، سراج الدین ظفر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شیر افضل جعفری، ناصر کاظمی، منیر نیازی، ناصر شہزاد، ظفر اقبال، احمد ندیم قاسمی، علی اکبر عباس اور دوسرے غزل گو شاعروں کے ہاں پنجاب کی تہذیب و ثقافت پورے وقار کے ساتھ عکس ریز ہے۔ شیر افضل جعفری کا یہ کہنا

دے کے اردو کو جھنگ رنگ افضل

ہم نے کوثر میں چاندنی گھولی

محض تعالیٰ یا دعویٰ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے بد شہہ پنجاب کے ثقافتی رس کو اردو غزل میں شامل کر کے اس کی تاثیر کو چوکھا کر دیا ہے۔ پنجاب کے ثقافتی رنگ و آہنگ میں مملو یہ اشعار دیکھیے۔

ارم کے پھول، ازل کا نکھار، طور کی نو

نخی چناب کی وادی میں آ کے جھنگ ہوئے

☆

جنی کا بھرپور شباب

جیسے جے جے دتی ہے

☆

میری سرمستی کے آگے جھکری

کانچ کی نازک توپلی دنگ ہے

علی اکبر عباس نے رچنا کی صورت میں بھرپور تجربہ کر کے اردو غزل کے دامن کو یک منفر داور نئے ذائقے سے مالا مال کر دیا۔ رچنا کی شاعری وسطی پنجاب کے خوش رنگ مناظر سے پوری طرح متجلی نظر آتی ہے۔ غلام حسین ساجد نے درست کہا ہے کہ ”رچنا ایک شعری کارنامہ ہے، جس کے ذریعے علی اکبر عباس نے اردو غزل کے آوارہ صفت رویوں کو ایک گھر دے دیا۔“ (۳) اس شعری تجربے میں سانس پیتا منظر نامہ غزل کی پوری تاریخ میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔ چند

دن چڑھا گلی آباد ہوئی بڑھیوں کی جی چپال بھلا
گودوں میں پوتے پوتیوں کی کبھی ناک ہے کبھی رل بھلا

کوئی چہرہ ڈاؤ لوگڑ کاٹے، کوئی بالوں کی ری باٹے
کوئی کہیں کے بھل باندھے تو کوئی لگ جائے اس کے نال بھلا

کوئی چھاج چکیر بٹے بیٹھی، یا رنگی بیوں کی پٹکھی
کوئی چاول پھٹکے صاف کرے کوئی پچے پیٹھ کے دال بھلا

کچھ دکھ شکھ بچھلے ویلے کے، کچھ یادیں الٹے عمروں کی
سب اگلی کچھلی باتوں تک پھپھے باتوں کا جال بھلا

جدید رد و نظم نے ہنستی، موضوعاتی اور سالیبی رنگوں کے ساتھ بیسویں صدی میں پروان چڑھی۔ جدید نظم گو
شاعروں نے پنجاب کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو اپنی نظموں میں گودھ کر احس و خیال کی نئی لٹ فتوں کو دریافت
کیا۔ اقبال، ظفر علی خان، ملک چند محروم، اختر شیرانی، خوشی محمد ناظر، حفیظ جاندھری، احسان دانش، تھدق حسین خالد،
میراجی، ن م راشد، مجید امجد، مفتی رصیدی، فیض احمد فیض، منیر نیازی، قیوم نظر، سید منیر جعفری، جعفر طاہر، اختر حسین
جعفری سے جدید نظم گوؤں تک سب کے ہاں پنجاب کے تمدنی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی رنگ تمام تر خوب صورتیوں
کے ساتھ ضو قلم ہیں۔ منیر جعفری کی نظم ”پچھٹ“ دیکھیے، پنجاب کا حسن سادہ کتنے رنگوں کے ساتھ قلب دنیا کی دنیا کو
اپنا ایر کرتا ہے:

گاؤں کا پچھٹ یہ پانی والوں کی ٹوبیاں
بیٹھے بیٹھے قہقہے یہ پیاری پیاری بویاں
وہ رنگے ہاتھوں میں پانی کھینچنے کی سخت ڈور
سادہ وبے فکر دد شیراؤں کا مصوم شور
نئی پھلی شوخ کچی چڑیوں کے نرم راگ
یہ امنڈتی زندگی یہ ریں بھرے لہجوں کی آگ
چاندنی کی بالیاں، سونے کے رخساروں کے پاس
بچے ہمدیوں کے تمدن کی طرح سادہ لباس
سر سے پا تک ایک متوالی ہنسی چھائی ہوئی
جسم کے ہر دو ٹکٹے کو نیند سی آئی ہوئی

چال میں الہڑ غزالوں کے قبیلے کا غرور
ہائے ان سانسوں کی گرمی، ہائے ان ہاتھوں کا نور
سر پہ مٹی کے گھڑے، لب پر تبسم کی پھوار
یہ سرے پنجاب کے رنگین و روشن شاہ کار
دودھ سی اجلی طبیعت، شہد کا رس بات میں
مسکراتے چاند تارے، زندگی کی رات میں

دیگر اردو شعری اصناف میں پنجاب کے تہذیبی و ثقافتی رنگوں سے تیل بونے کاڑھنے کے علاوہ پنجاب کی مخصوص صنف شعر جیسے کافی، ڈھولا، ماہیا اور سی حرفی کو بھی اردو تخلیق کاروں نے اپنے شعری تجربے کا حصہ بنایا۔ یہ اصناف اگرچہ قبول عام کے درجے پر سرفراز نہ ہو سکیں تاہم ان کے نفرادی تجربوں نے شعروادب کو نئے امکان کی بشارت ضرور دی۔ اختر شیرانی، چراغ حسن حسرت، مختار صدیقی، شریف کنجاہی، سرمد صہبائی، شہزاد قیصر اور دیگر شعرا نے ان اصناف میں پنجاب کے ثقافتی منظر نامے کو جانے کا کامیاب جتن کیا۔ جدید جاپانی صنف شعر ہائیکو اگرچہ پوری اردو دنیا میں تخلیق ہو رہی ہے مگر اس صنف کے اہم تر شعرا کا تعلق پنجاب سے ہے۔ یہ صنف چوں کہ پنجاب لوک صنف ”ماہیا“ سے کسی قدر مماثل ہے، اس لیے اس کی تخلیق میں پنجاب کا ثقافتی رنگ زیادہ گہرائی کے ساتھ موج زن ہے۔

اردو ادب کی خوش رنگی اور دل آویزی میں پنجاب کی ثقافت نے گہرے، دور رس اور دیر پا اثرات مرتب کیے۔ مختلف اردو اصناف شعر و نثر میں پنجاب کی مٹی پنا جادو جگائی اور قلب و نظر کی دنیا کو پنا سیر کرتی دکھائی دیتی ہے۔



حوالہ جات:

(۱) جمیل جالبی۔۔ پاکستانی کلچر، ص ۴۲

(۲) ڈاکٹر وریا غا، دائرے اور ٹکیریں، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۲ء، ص ۱۶۲۔

(۳) ”رس و چٹا کا“ مضمون مشمولہ ماہنامہ شام و بحر، لاہور، مئی ۱۹۹۴ء، ص ۸۔

نظیر اکبر آبادی کا تصور انسان

ڈاکٹر طارق ہاشمی

اردو شاعری کے جمالیاتی معیارات کے پیمانے نے جب موضوعاتی نظم کو قطعی طور پر قابلِ اہمیت خیال نہیں کر رہے تھے، نظیر اکبر آبادی نے اسے لائقِ لحاظ سے سمجھا اور ایک وسیع سطح پر تخلیقی سرمایہ بہم پہنچایا۔

ادبی پیرایہ اظہار کے اصطلاحی مفہوم کے طور پر نظم سے مراد اگرچہ ہر نوعیت کا منظوم سرمایہ ہے تاہم اردو شاعری میں غزل کی الگ شناخت قائم ہونے سے اس صنف میں ہونے والی شاعری کو نظم نہیں کہا جاتا رہا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کلہاڑی دور میں نظم کا ارتقا کچھ مخصوص یا غیر موضوعاتی صنفِ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی یا شہرِ شوب وغیرہ کا مرہون منت رہا۔ نظم کا وہ مفہوم جو اردو شاعری میں انیسویں صدی کے نظمیہ مشاعروں سے مروج ہوا، قدیم اردو شاعری میں بہت کم رواج پاسکا۔

غزل کے اندر قطع بند یا مسلسل غزل کے ذریعے کسی موضوع پر کچھ اشعار، اس طرح شہرِ شوب کی روایت کے تحت شہر کی صورت حال پر کچھ منظوم اظہار خیال کی صورت میں موضوعاتی نظم کی کچھ ابتدائی صورتیں ضرور سامنے آتی ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک درست ہے کہ:

”اردو شاعری میں منظومات یا نظم نگاری کے تجربات دہائی دور سے شروع ہو گئے تھے۔“ (۱)

لیکن ان تجربات نے انیسویں صدی کے رائج خریک کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی ورنہ اس دور میں زیادہ تر غزل یا مخصوص اصنافِ سخن کا رواج ہی پختہ رہا۔

نظم کے سفر میں نظیر کی اہمیت جہاں فنی اور ہنسی سطح پر ہے، وہاں یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ نظیر نے انسانی معاشرے، اس کی متنوع دلچسپیوں اور ثقافتی رعنائی کو اپنی منظومات کا موضوع بنایا اور میوٹھیلوں کی تمثالوں کے ذریعے بینِ اسطور یہ پیغام دیا کہ زندگی یہ رونق صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان امتیازات اور تفریقات کو ترک کر کے مساوت پر مبنی نظامِ حیات کو فروغ دیں چنانچہ وہ اپنی شاعری میں ایک ایسے فرد کی تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو مذہب و ملت کے مصنوعی امتیازات سے ماورائیک انسان ہو اور وہ خود شناسی سے خدا شناسی تک کے سفر کو تقسیم پر مبنی تعلیمات کی بجائے اتحاد اور اکائی کے پیغام کی روشنی میں طے کرے۔

اخلاقی لحاظ سے انسان کے بارے میں نظیر نے جس نوع کے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ان تصورات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں جو اردو غزل کے شعرا کے ہاں مدِ نظر کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن منظوماتِ نظیر میں ان تصورات کی شرح و تفصیل کے باعث وہ قدرے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ نظم کا پیرایہ اظہار بھی ہے جس میں مذکورہ شرح و تفصیل کی گنجائش بھی وسیع تر ہوتی ہے۔

منظوماتِ نظیر میں سماجی طور پر طبقہ کی تفریق کے نظریے کی سختی سے نفی کی گئی ہے۔ وہ مگرچہ انسان کو ایک کل کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں اور ہر روپ سے محبت ان کے عقیدے کا حصہ ہے تاہم اگر کسی بنیاد پر کوئی طبقہ تشکیل پائے اور وہ خود کو دوسرے پر فائق و برتر خیال کرے تو نظیر کے ہاں طنز و تضحیک کا نشانہ ضرور بنتا ہے۔ وہ انسان کے ہر رنگ اور تہے

کی تصویر کشی کرتے ہوئے بڑے لطیف پیرائے میں مساوات بشر کا خیال عام کرتے ہیں۔ یہ کہنا بہر طور پر بجا معلوم ہوتا ہے کہ منظوماتِ نظیر میں:

”انسان کی عظمت کے سامنے طبقات کے تفوق اور پستی کا سر جھکتا ہے۔ ہر شخص جو ایک مرد اور ایک

عورت سے پیدا ہوا ہے وہ آدمی ہے اور اسی احساس کی تفسیر نظیر کے بہت سے خیالات ہیں۔“ (۲)

نظیر کے مذکورہ احساس کی جھلکیاں اگرچہ بیشتر منظومات میں دکھائی دیتی ہیں تاہم ”آدمی نامہ“ اور وہ نظمیں بطور خاص لائقِ ذکر ہیں جس میں فلسفہٴ فنا بیان کیا گیا ہے۔ نظم ”موت کا دھڑکا“ سے قطع نظر اسی سلسلے کی تمام تر عظمتوں میں نظیر نے موت کو محض فنا کے معنوں میں نہیں بلکہ مساوات کا بھی استعارہ قرار دیا ہے یعنی انسان کی جو بھی حیثیت ہے وہی اس کی زندگی تک ہے مگر جب موت آتی ہے تو اس کی صرف ایک ہی حیثیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ انسان کی ہے جو اس دایرہ فانی سے کوچ کر رہا ہے۔ درج ذیل بند ملاحظہ ہو جس میں نظیر نے مقامی ثقافتی پیرائے میں انسان کی زندگی اور موت کی ایک عذمتی تشبہ پیش کی ہے۔

تھا جب تک خاصہ دودھ بنا تھی کیا کیا کچھ اس میں چیز دھری

براق ملدی ماکن تھا اور گھویا گاڑھا اور تری

جب پھٹ کر ٹکڑے دودھ ہوا پھر کہاں گئی وہ چکنائی

نہ دودھ رہا نہ دہی رہا نہ روغن مسکہ چھاچھ مہی

مائی کی مائی آگ آگن جل نیر پون کی پون ہوئی

اب کس سے پوچھے کون ہوا اور کس سے کہیے کون ہوئی (۳)

پہنا کسی نے خوب لباس عطر بھرا

یا چیتھڑوں کی گدڑی کوئی اوڑھ کر پھرا

آخر کو جب اجل کی چلی آن کر ہوا

پوسلے کے جھونپڑے کو کوئی چھوڑ کر مرا

باغ و مکان محل کوئی بنوا کر مر گیا

بیتا رہا کوئی نہ ہر اک آ کے مر گیا (۴)

نظیر کی نظموں ”عالم گزراں“، ”کل من علیہا فتن“، ”مراتبِ دنیا محض بے ثبات ہیں“، ”رہے نام اللہ کا“، ”ہلسم زندگی“، ”فنا“، ”انسان خاک کا پتلا ہے“، ”بعد از فنا“، ”سفرِ آخرت کی تیاری“ اور ”بنجارہ“ انسان کے اندر اسی اوراک کو روشن کرنے کی سعی ہیں کہ دنیا قائم رہنے والی نہیں اور ہر چیز فنا اور بے ثباتی کا شکار ہونے والی ہے۔ انسان بھی خاک سے تشکیل پایا ہے اور جب ہر چیز کو فنا ہے تو انسان نے بھی ایک دن خاک کا دوبارہ حصہ بن جانا ہے اگر کسی کو بچا ہے تو وہ صرف ذاتِ واحد خدا تعالیٰ ہے۔

دنیا میں کوئی خاص، نہ کوئی عام رہے گا

نہ صاحبِ مقدور نہ ناکام رہے گا

زردار نہ بے زرہ نہ پیدانجام رہے گا
شادی نہ غم گردش ایام رہے گا
نہ عیش، نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا (۵)

انسانی زندگی دکھوں سے عبرت ہے اور دکھ سے وابستہ ہو کر انسان خود کو آدھا محسوس کرتا ہے مگر نظیر نے انہماک حیات کے تصور کے ذریعے تکمیل ذات کا فلسفہ بیان پیش کیا ہے۔ وہ جس ذات کو باقی خیال کرتا ہے اس کی رضا کو انسان کی تکمیل کا ذریعہ بھی سمجھتا ہے۔ انسان جب تک اس کی رضا کو تسلیم نہیں کرتا اوہ ادھورا رہتا ہے اور اس رضا پر راضی ہو جانے سے وہ ایک مکمل انسان کا شرف حاصل کرتا ہے۔

پورے انسان کا یہ تصور اس لحاظ سے لائق اعتراض ضرور ہے کہ ہر حال میں خوش رہنے کی تلقین کے ذریعے انسان کے اندر جہد و عمل کی قوت کو کمزور کرنے کی بھی ایک کوشش دکھائی دیتی ہے لیکن اس فلسفہ کا دوسرا زوئیہ انسان کے اندر ہوئے مال و زر سے گریز کا پیغام بھی ہے کہ یہ ہوا و ہوس زندگی کے مقصد حقیقی سے دور ہو جانے کی سعی مذموم ہے۔ نظیر کے نزدیک انسان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنی رضا کو خدا کی رضا سے ہم آہنگ نہیں کر لیتا۔
طبقاتی تفریق کے سلسلے میں نظیر کی نظم ”آدمی نامہ“ ایک معتبر حوالہ ہے۔ جس میں انسان کے کئی ایک روپ دکھائے گئے ہیں مگر کسی روپ سے روگردانی یا انکار نہیں ہے بلکہ قبولیت کا پہلو ہے۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کلّے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ہاں آدمی ہی غار ہے اور آدمی ہی نور
ہاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں یا ظہور
شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور

اور ہادی رہتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی (۶)

طبقاتی تقسیم و تفریق کی تردید کے ساتھ ساتھ نظیر نے تلاشِ درد کے عمل میں انسان کی مذہبی تقسیم کو بھی تقسیم کی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی منظومات میں جس وسیع انشربلی کو فروغ دینا چاہتے ہیں وہ محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ ایک قدر ہے جو اتحاد و نوع انسانی کے لیے یک پاسدار بنیاد فراہم کرتی ہے۔ نظیر کے ہاں یہ مرد لچپ ہے کہ وہ حضرت داتا گنج بخش کو ”گرد“ کہہ کر پکارتے ہیں اور بابا نامک کو ”شاہ“ کہہ کر وہ جہاں اسدی تہواروں پر نظم لکھتے ہیں وہاں دیگر مذاہب کی رسوم و روایات کی مدح خوانی بھی کرتے ہیں۔ نظیر کو اگر کبیر داس سے نسبت دی گئی ہے تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔

”ہندوستانی تہذیب کی روح جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی رہے ہوئے ہیں ان کی روح میں

سمائی ہوئی تھی۔ ن کی شاعری میں اسی لیے سب مذاہب کے پیشروں کی روح موجود ہے۔“ (۷)

وہ اس روح کو انسانی معاشرے کے وجود میں بھی موجزن دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اسی طرح ہی اس کا وہ مردہ پن ختم ہوگا جو عام فردی اختلافات سے لے کر عظیم عالمی جنگوں تک کے باعث پیدا ہوا۔ نظیر انسان کو اس کی کسی محدود فکر کے تناظر میں ایک جزوی حیثیت میں نہیں دیکھتا بلکہ بقول نیاز فتح پوری۔

”انسان کا مطالعہ وہ انسان کل کی حیثیت سے کرنا ہے۔“ (۸)

انسان کل کی یہی وہ سوچ ہے جس کے باعث وہ اختلاف میں بھی اتفاق کا رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ نظیر کے نزدیک زندہ معاشرے میں فکری اختلافات تو ہو سکتے ہیں مگر اس کی بنیاد پر انسانی کشتِ بخون ایک شیطانی فعل ہے۔

نظیر کے ہاں فکری اختلاف کو ہوا دینے کے بجائے اصل حیات تک پہنچنے کا پیغام ہے اور یہ اصل حیات خود وجود انسانی ہے۔ وہ اسے ایک ایسا گل قرار دیتے ہیں جس کے اندر پورے گلزار کی بہار ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی کون الصغیر ہے جس کے اندر کائنات اکبر سمائی ہوئی ہے۔ مگر انسان اپنے وجود کی اس چھوٹی سی کائنات میں جہاں کبیر کی تصویر صرف اس صورت میں دیکھ سکتا ہے، جب وہ اپنے آئینہ دل کی طرف توجہ کرے گا۔

نظیر اکبر آبادی کی نظم ”آئینہ“ میں انسان کو ’س کی ذات کے موسم کی رعنائی دیکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جو بہار انسان کے وجود میں ہے وہ اسی کے خارج میں پائی جانے والی کائنات کے کسی گوشے میں نہیں اور اگر کہیں ہے تو وہ محض جزو ہے اس بہار کا جو باطن انسانی میں جلوہ گر ہے۔ یہ نظم خودی کا وہ پیغام ہے جو بعد ازاں اقباں کے ہاں ایک پورے فلسفہ حیات کی صورت میں تشکیل پاتا ہے۔ اس نظم میں لفاظی و اسلوبِ اظہار کی نوعیت بھی اس امر کی دلیل فراہم کرتی ہے کہ اقباں نے اپنے فلسفہ خودی کے اظہار کے لیے بیاں کے جو وسائل فراہم کیے ان پر نظیر کی مذکورہ نظم کے اثرات واضح ہیں۔

ے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ

صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ

خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ

زلف دراز و طرہ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنے چشم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل! تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بیلا، گلاب، سیوتی، نسرین و نسرین

داؤدی، جوی، لالہ و ارنبیل و پامن

جتنی جہاں میں پھول ہے پھولوں کی انجمن

یہ سب تجھی میں پھول رہے ہیں چمن چمن

ہر لحظہ اپنے چشم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل! تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغ و مہن کے غنچے و گل میں نہ ہو اسیر

قمری کی سن صغیر، نہ بلبل کی سن صغیر

اپنے تئیں تو دیکھ گہ گیا ہے ارے نظیر
ہیں حرف من حرف کے یہی معنی ارے نظیر

ہر لحظہ اپنے چشم کے نقش و نگار دیکھ
ارے گل! تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ^(۱۰)

منظوماتِ نظیر میں انسانی معشوقہ کی تصویر کشی تہذیبی اور ثقافتی تماشوں کے ذریعے کی گئی ہے اور جماع کی عکس بندی کرتے ہوئے وہ ایک ایسے فرد کی تصویر بھرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مذہبی منافرت اور طبقاتی امتیاز کے رنگ سے پاک ہو۔ وہ دنیا میں یک بھر پور وقت گزارنے والا ہو اور رعنائی کائنات سے انبساط حاصل کرنے والا ہو مگر اس انبساط میں اس طرح جتن نہ ہو کہ اس کے اندر خود غرضی کا عنصر پیدا ہو۔ نیز اسے اس ذات کا خیال نہ ہو جس کی طرف اسے لوٹ کر جانا ہے۔ نظیر انبساطِ حیات کا عقیدہ رکھتے ہیں مگر مذمتِ دنیا بھی کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں فنائے زندگی پر ایک پورا سلسلہ منظومات موجود ہے۔ لہذا وہ تربیتِ نفس اور تسلیم و رضا کا پیغام بھی دیتے ہیں۔

وجودِ انسانی کی کائناتِ اصغر میں جہانِ اکبر کا عکس دیکھنے کی دعوت فکرِ نظیر کا ایک عرفانی پہلو ہے۔ وہ یہی وہ نکتہ ہے جو ان کی شاعری میں تلاشِ فرد کے سلسلے میں بنیادی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں ایک ایسے انسان کے ظہور کا خواب دیکھتے ہیں۔ جو ہوس دنیا میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی ذات کے تخلیقی جوہر پر ایسا اعتماد کرتا ہے کہ اسے اپنا آپ ایک کل کائنات نظر آئے اور وہ گلزارِ بہشت و بود کے گل و برگ کی آرزو کرتے بجائے اپنے جوہرِ تخلیق کی بنیاد پر خود ایک چمنستان بن جائے۔

مشکِ تار و مشکِ نغن بھی تجھی میں ہے
یقوتِ سرخ و لعلِ یمن بھی تجھی میں ہے
نسرین و موتیا و سمن بھی تجھی میں ہے
القصدہ گیا کہوں میں چمن بھی تجھی میں ہے^(۱۱)

حوالہ جات و حواشی

- ۱۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر انتخاب زریں۔ اردو نظم، جلالت پبشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۔
 - ۲۔ عبدالمومن غاروٹی: دیباچہ کلیاتِ نظیر اکبر آبادی (مرتبہ عبدالباری سی)، نولکھور پریس، تھنٹو، ۱۹۵۱ء، گیارھویں اشاعت، ص ۸۸۔
 - ۳۔ کلیاتِ نظیر، ص ۵۲۲۔
 - ۴۔ ایضاً، ص ۵۲۵۔
 - ۵۔ ایضاً، ص ۵۲۳۔
 - ۶۔ ایضاً، ص ۶۵۹۔
- نظیر کا مصرعہ

ع. یا اب آدمی ہی نور ہے اور آدمی ہی نار

اور اقبالؒ کے مصرعے

ع. یہ خاک کی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ تاری ہے

- کے مابین فکر کے ساتھ ساتھ لفظ کا اشتراک بھی لازمی توجہ ہے۔
- ۷۔ جمیل چاچی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد سوم) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۱۔
- ۸۔ نیاز فتح پوری، ”انتقادیات“، ادارہ ادب عالیہ، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۲۵۸۔
- ۹۔ کلیہ تنظیر، ص ۶۲۲۔
- ۱۰۔ یہاں بھی نظیر اور اقبال کے مابین فکر اور بیان کا اشتراک توجہ چاہتا ہے:
- نظیر: لے آئے کو ہاتھ میں نور ہار پار دیکھ
صورت میں پنی قدرت پروردگار دیکھ
اقبال: چنگام ہست و بود نہ بیگانہ وار، کچھ
ہے دیکھے کی چیز اسے بار بار دیکھ
- ۱۱۔ نظیر کی مذکورہ نظم کا عنوان ”آئینہ“ ہے، اور اقبال کی نظم ”روحِ ارضی آدم کا استہاں کرتی ہے“ میں بھی اقبال کہتے ہیں
- آئینہ: تکام میں آج اپنی ادا دیکھ

☆ ☆ ☆

تہذیبِ مغرب اور احیائے اسلامی کے امکانات

(اقبال اور علی شریعتی کے حوالے سے)

ڈاکٹر ناہید قمر

ادب کی جمالیات کے چند اساسی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی ایک واضح تاریخی بنیاد ہونے کے باوجود اسے تاریخی دستاویز نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ تاریخ کا مفہوم اگر خارج کی دنیا کے کسی سلسلہ واقعات تک محدود کر دیا جائے تو اس سے تاریخ کی بنیادی سچائیوں کی شناخت ممکن نہیں ہو سکتی۔ قبل کی شاعری کی ارضی بنیادیں بہت واضح ہیں، لیکن اقدار کے حوالے سے جہاں کہیں وہ اب بنیادوں سے ماورا ہوتے ہیں وہاں اس کے افکار کی درست تاظر میں تفہیم کے لیے یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ بڑا اختلافی شعور تخلیقی اظہار کے مسلمات کا پابند نہیں ہوتا۔ اقبال نے بھی فکری، لسانی، جذباتی اور حیاتی سطحوں پر اپنے شعور کو صرف مذہبی شاعری تک محدود نہیں رہنے دیا۔ اردو کے تمام شعراء کی بہ نسبت اقبال کے یہاں تاریخ کا حوالہ زیادہ منظم اور نمایاں ہے۔ بیسویں صدی کی انسانی صورتحال کو تاریخ نے جو پس منظر مہیا کیا تھا۔ گزشتہ صدیوں کے دوران جو بڑے واقعات رونما ہوتے تھے۔ انسانی فکر اور عمل کی دنیا میں جو انقلاب آئے تھے، اور زندگی کو برتنے کے آداب و انداز پر جن باتوں کے اثرات پڑے تھے۔ ان سب کا مجموعی اور ک۔ قبل کی شاعری میں بہت واضح ہے۔ اقبال کا شعور افکار و احساسات کی متعدد سطحیں رکھتا ہے۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں کہ اقبال نے مشرق و مغرب کے مسئلوں کو زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھا تھا۔ بلکہ اقبال کے ذہن اور شخصیت کی تعمیر جن عنصر کی مدد سے ہوئی، وہ بہت مختلف تھے۔ قبل کی ذہنی زندگی کے ابتدائی اور تشکیلی دور میں مشرق و مغرب کی تقریباً تمام اہم روایات ایک ساتھ ٹرانڈ رہی ہیں۔ ہندوستان میں یہ دور ایک نئے قومی شعور کے فروغ کا دور تھا۔ جب ہندو برطانوی اقتدار کی نوا بادیاتی قدروں سے بیزاری ایک اجتماعی جدوجہد کی راہ ہموار کرتا جا رہی تھی۔ مغرب میں تہذیبی و معاشرتی سطح پر گہری ابتری کے آثار نمایاں تھے۔ اور دوسری طرف اقبال کے ذہن میں ایک ایسے معاشرے کا خواب جنم لے رہا تھا جس کی تعمیر ساجی انصاف، معاشی عدم استحصال اور انسان دوستانہ قدروں پر رکھی گئی ہو۔ لیکن تاریخ کو اپنی شاعری کا بنیادی حوالہ بنانے کے باوجود اقبال کی شاعری زمان کے جبر پر قابو پانے کی ایک جستجو کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی تفہیم محض معین اور معلوم اصطلاحات کے ذریعے ممکن نہیں۔ اس کے لیے تاریخ اور بعد تاریخ کے مفہوم تک رسائی کے ساتھ ساتھ شعری اظہار کے ان امکانات کی پہچان بھی ضروری ہے جو اردو کی ادبی روایت میں صرف اقبال کے ذریعے متعارف ہوئے۔ اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ایک عالمگیر سیاق میں اپنے تاریخی اور تہذیبی رشتوں کی بازیافت کا خواب دیکھا ہے۔ اسی لیے اقبال کا مخاطب ایک سطح پر اپنی قوم یا ملت کے بجائے سارے یشتیا، بلکہ ساری دنیا سے تھا۔

احیائے ملت کے حوالے سے دیکھا جائے تو پانچویں صدی میں امام غزالی اور ان کے بعد ابن تیمیہ قرآنی نظریات کو بنیاد بنانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ جلال الدین اکبر کے عہد میں جب بہت سے لادینی افکار اسلام میں

داخل ہو گئے تھے تو حضرت مجدد الف ثانی نے احیائے ملت کی خاطر اسلامی معاشرے کو ہندو اثرات سے پاک کرنے کی کوششیں کیں۔ بعد ازاں انگریز ستعمار کے غلبے کی صورت میں آنے والی مذہبی، ثقافتی اور معاشی برکشتگی کا پیشگی ادراک کرتے ہوئے سراج الدولہ، حیدر علی ورنپو سلطان نے انگریز استعمار کے خاتمے کے لیے مقدور بھر کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھرنے کے بعد انیسویں صدی میں عالم اسلام کو اپنے تہذیبی تشخص کو بچانے کی فکر ہوئی۔ مغربی تہذیب کی سیاسی، ثقافتی و اقتصادی یغیر کے نتیجے میں پنے ممکنہ تہذیبی انہدام کے خطرے کے پیش نظر پوری دنیا کے مسلمانوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی تحریک احیائے فکر دین کے اثرات مسلم معاشرے پر بالعموم اور مسلم مفکرین پر بالخصوص مرتب ہوئے۔ فکر اسلامی کی تاریخ میں شاہ ولی اللہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جہتہد کے ضمن میں اپنے دور کے علماء سے برملا عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں نے سماجی ذمہ داریوں اور معاشرتی توازن کے قیام پر زور دیا۔ اس ضمن میں سید احمد شہید اور اسماعیل شہید کی کاوشوں کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ اس انقلابی فکر کی روایت میں مزید تعمیری اور مثبت تغیر کا احساس انیسویں صدی کے آخر میں سلفیہ تحریک کے بانی سید جمال الدین افغانی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے آزادی کی جستجو میں چراغ راہ ثابت ہوئے۔ علاوہ ازیں عالم اسلام میں ترکی میں سعید حلیم پاشا، شام میں رشید رضا، مصر میں مفتی محمد عبیدہ، سعودی عرب میں محمد بن عبدالوہاب، سوڈان میں مہدی سوڈانی اور وسطی ایشیا میں امام شامل جیسی عظیم شخصیات اپنے اپنے انداز سے متحرک ہوئیں۔ اس سب کے پیش نظر تین مقاصد تھے۔

۱۔ مغرب کی اسلام کے خلاف نظریاتی جنگ میں اسلامی عقائد و نظریات کا دفاع، اسلامی علوم کی اجتہاد کے ذریعے جدید تعبیر، اور اس مقصد کے لیے اداروں کا قیام۔

۲۔ مغربی علوم و فنون کی تدریس، ان کی زبانوں پر دسترس، سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کے لیے اداروں کا قیام۔

۳۔ مسلمانوں کی سیاسی آزادی کے لیے عالمگیر جدوجہد، سیاسی جماعتوں، سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کا قیام، مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بیداری۔

انقلابی فکر کی اس روایت کا اہم ترین نام علامہ اقبال کا ہے جنہوں نے نئی بنیادوں پر اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں (نثر، شاعری و خطوط) میں مسلمانوں کو ایک عظیم تہذیب کا وارث قرار دیتے ہوئے زواں مغرب کے مصنف فریڈرک شینگلر کے اس تصور کو رد کر دیا کہ مسلم تہذیب کا احیا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اقبال نے اس مغربی تہذیب پر جس سے مسلمان ذہنی طور پر مرعوب تھے، اپنی شاعری میں شدید تنقید کی، جس کی ایک اہم مثال ان کی نظم 'سینن' ہے۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ خلقت
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گر جوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاہات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت
 پیتے ہیں، لہو دیتے ہیں تعلیم مساوت
 بے کاری و عریانی دے خواری و افلاس
 کیا کم ہیں فرنگی بدنیت کے فتوحات (۱)
 پھر اس کے اسباب کی بھی نشاندہی کرتے ہیں:

وہ قوم کہ فیضانِ سہوی سے ہو محروم
 حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
 ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
 احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (۲)
 پھر ابلیس کی زبانی جہاں نظم میں مت اسلامیہ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
 جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
 خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
 کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
 جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایوم ہے
 مزدکیتِ فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے (۳)
 (ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)

۱۹۳۶ء کی اس نظم کا یہ حصہ، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد نائن ایون کی صورتحال کا بیا سید ہے اور ابلیس کی زبان سے
 ادا ہونے والے لفظوں میں گویا کہ آج کی مغربی تہذیب اپنے اندیشوں کا اظہار کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق اور
 مغرب کی آویزش کا جو تماشا اس وقت ہمارے سامنے ہے، اقبال کے تخلیقی وجد نے اس کا ادراک بہت پہلے کر لیا تھا۔
 عالم اسلام میں روشن فکری کی یہ روایت اقبال کے بعد ڈاکٹر علی شریعتی نے آگے بڑھائی ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا موضوع بھی
 تہذیبِ مغرب اور احیائے ملتِ اسلامیہ کے مکانات کے ضمن میں اقبال اور علی شریعتی کے افکار کے جائزے
 پر مبنی ہے۔

تہذیبی حوالے سے یہ سواں آج بھی بحثِ طرب ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمانانِ عالم اس ترقی یافتہ دور میں
 بھی تہذیبی ابتداء، فکری انحطاط، نفاقِ باہمی اور عوامی سیاست میں اپنی موثر نمائندگی سے محرومی جیسے کہنہ مسائل سے اب تک
 نجات نہیں پاسکے، جس کا احساس اقبال نے شدت سے دلایا اور ان سے نجات کی راہ بھی دکھائی۔ یہ دیرینہ مسائل گزرتے
 وقت کے ساتھ نہ صرف مزید مہلک ہوئے ہیں، بلکہ عالمی سیاسی منظر نامے میں مزید کئی مسائل کا موجب بھی بنے ہیں جن کا
 اقبال کے زمانے میں شاید تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گلوبلائزیشن کا سماجی و ثقافتی یجنڈا، بے رحم صارفیت، عالمی معیشت
 کی نئی منڈیاں، نائن ایون کے بعد مسلمانوں کے حوالے سے بنیاد پرستی اور تہذیبی تصادم کے نظریات کا پرچار وغیرہ جیسے
 مسائل آج دیئے اسلام کے ہم ترین مسائل ہیں۔ دوسری طرف سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ مسلمانانِ عالم اس انقلاب

سے کیوں کوسوں دور ہیں جو قبل کا مطمع نظر تھا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ عام اسلام اپنی دنیا خود تخلیق کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم سائنس، آرٹ، تہذیب، معیشت اور سیاست میں اپنی نفسی توانائیاں اور اپنے طبعی وسائل اپنے مقامی علم کی تخلیق میں صرف کرنے کی بجائے دوسروں کے پیدا کردہ علم کے رد عمل میں خرچ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک حقیقی اور پختہ زندگی جینے کی بجائے دوسروں کے ہمارے بارے میں طے کردہ تصورات کے مطابق جیے جا رہے ہیں۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانان عالم نے دیگر روشن خیال مسمم مفکرین کی طرح کیا پیغام اقبال کے سلسلے میں بھی بے بھری کا ثبوت دیا ہے، جہاں تک اقبال سے ہمارے تعلق کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں کم از کم ایک بات بالکل واضح ہے کہ اس خطے کے مسلمانوں کو جب بھی اپنی دیرینہ تباہی کا احساس شدید ہوتا ہے۔ یا انہیں فکری و تہذیبی منطقوں میں رہنمائی حاصل کرنے کی طلب ہوتی ہے تو وہ اقبال سے رجوع کرتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کے تہذیبی و ملی وجود پر جو تاریکی مستط ہے اس کا پردہ اقبال ہی چاک کر سکتے ہیں۔ اور یہ امید کی ایک ایسی کرن ہے جو ہمیں مستقبل سے مکمل طور پر ہوش ہونے سے بچاتی ہے۔ گزشتہ چھ سات عشروں میں دنیا بہت زیادہ تبدیل ہو چکی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ایک نئے نوآبادیاتی دور کا آغاز، سرد جنگ کا آغاز، سرد جنگ کا خاتمہ، روس میں اشتراکیت کی ناکامی کے بعد سرمایہ داریت اور اسلام کا تصادم، تہذیبوں کی عالمی بحث، اس سب تبدیلیوں کے تناظر میں عالم اسلام کی صورتحال اس صورتحال سے یکسر مختلف ہونا چاہیے تھی جو اقبال کے دور یعنی سامراجی دور میں تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام مسلمان ممالک نے نوآبادیاتی آقاؤں سے آزادی تو حاصل کر لی مگر نوآبادیاتی عہد کے حکومتی نظام کو قائم رکھا اور پرانے (یورپ) اور نئے استعمار (امریکہ) کا ان حکومتوں میں اقتداری عمل دخل بھی برقرار رہا۔ لہذا اقبال کے ابتلائے ملت اسلامیہ کے ضمن میں تصورات اس نئے تناظر میں ایک بار پھر غور طلب ہیں۔

شمیم حنفی اس حوالے سے اپنی تصنیف 'اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ' میں لکھتے ہیں:

"اقبال کی شخصیت دنیا کی دو جلیل القدر تہذیبوں کی ہم کلامی کا نتیجہ ہے۔ سو اقبال کو سمجھنا کئی معنوں میں خود اپنے آپ کو اور اپنے زمانے کو سمجھنے کی ایک کوشش بھی ہے۔ بصیرت کی جس گہرائی اور فکری استحکام کے ساتھ اقبال نے بیسویں صدی کی زندگی اور انسان کے ارتقاء اور زواہ کا احاطہ کیا ہے، اور متنوع فکری، جذباتی، کے ذریعے جس طرح اپنے رد و پیش کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ انہیں مشرق و مغرب کی آویزش اور اپنے گم شدہ تصورات کے تشخیص اور بازیافت کا سب سے محکم وکیل اور مفسر بناتی ہیں۔" (۴)

ڈاکٹر علی شریعتی کے یہاں بھی افکار اقبال کے ضمن میں اس امر کی تائید ملتی ہے:

"میرے عقیدے کے مطابق یہ سوچ کہ ہمیں مغربی تہذیبی یا غار کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اپنی تاریخی اصل پر بھروسہ کر کے اپنے آپ کو پھر سے کشف کرنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا نعرہ ہے کہ سب سے زیادہ اسلامی معشروں میں اپنایا گیا ہے اور اس کی اولین آواز سید جمال الدین اسد آبادی کے حلق سے انیسویں صدی کے آخر میں بلند ہوئی۔۔۔ اور

اسلامی دنیا میں اس نسل کی سب سے بڑی شخصیت علامہ اقبال تھے جو کہ
اسلام کو بھی خوب پہچانتے تھے اور مغرب کو بھی۔ وہ دو تہذیبوں کے آدمی
اور پہلو دار شخصیت کے حامل تھے۔ وہ فلسفی، سیاست دان، اسلام فہم، یورپ
شناس، شاعر، عارف اور ایسے مرد مبارک تھے کہ جنہوں نے اپنے فلسفہ
خودی کے ذریعے گہری اسلام شناسی کی فلسفیانہ بنیادیں فراہم
کیں۔ (۵)

عام تصور کے مطابق اقبال ملت اسلامیہ کے ترجمان ہیں۔ مگر وہ کس مفہوم میں ترجمان ہیں اس پر بہت کم توجہ
دی گئی ہے۔ اور اس نکتے کو نظر انداز کر کے نہ تو ہم ملت اسلامیہ کے ضمن میں اقبال کا حقیقی موقف جان سکتے ہیں اور نہ ہی
متذکرہ بالا سوالات کے جواب تلاش کر سکتے ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری (۶)

یہاں تقابل مذہبی یا فرقہ دارانہ نہیں بلکہ قوم مغرب کے سیاسی تصورات سے ملت اسلامیہ کی ترجیحات کو الگ
اور ممتاز کرنے کا ذریعہ ہے۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کا تصور اس وقت تشکیل دیا جب مسلمانان عالم ایک غیر معمولی بحران
سے دوچار تھے۔ یہ بحران شناخت کا تھا۔ مسلمانان عالم ایک قابل رشک تاریخ کے حامل ہونے کے باوجود بیسویں صدی
کے اوائل میں سیاسی و معاشی آزادی سے محروم اور معاصر عالمی تناظر میں غم و فن کے حوالے سے پسماندہ تھے۔ معاصر عالمی
سیاست، تہذیب، علم، آرٹ اور سائنس میں مسلمانوں کی کوئی شناخت نہیں تھی، اور سب سے تشویشناک صورتحال یہ تھی کہ
نئے سیاسی، سماجی اور علمی تصورات کی تشکیل پر بھی محض مغرب (یورپ) کی اجارہ داری تھی مسلمانان عالم ان تصورات کے
محض صارف تھے۔ انہی تصورات میں سے ایک اہم تصور قومیت کا تھا جسے یورپ کی استعماری طاقتوں نے نوآبادیاتی
مقاصد کے حصول کے لیے تشکیل دیا تھا۔ اقبال پہلے ایشیائی دانشور ہیں جنہوں نے یورپ کی اس حکمت عملی کو سمجھا اور
مسلمانان عالم کو بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں وطنی قومیت سے تصور ملت کی طرف رجوع
دراصل استعمار کی حکمت عملیوں (جسے اقبال حکمت فرنگ کا نام دیتے ہیں) کو سمجھنے اور ان پر تنقید کے ذریعے ملت اسلامیہ کو
ان کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھنے کی تدبیر تھی۔

- ۱۔ اپنی اصلیت یہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گھل کو پریشاں کاروان یو ہوا (۷)
- ۲۔ نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر فرد مندان مغرب کو
ہوں کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے (۸)

ہمیشہ خفی اس تناظر میں اپنے مضمون، اقبال ایک نئی تعبیر کی ضرورت میں لکھتے ہیں۔

”مغرب اقبال کے لیے ایک سامراجی طاقت کے بجائے دراصل ایک تہذیبی اقتدار اور استحصال کی علامت تھی۔ مشرقی اقوام میں مغربی سائنس اور ٹیکنالوجیکل ترقی پر مبنی تہذیب سے مرعوبیت بلکہ خوف زدگی کا جو رجحان پنپ رہا تھا، اپنی نظم و نثر کے ذریعے اقبال نے پورے مشرق کو اس سے بچانے کی کوشش کی۔ اقبال کے یہاں، اسی لیے آزادی کا جو تصور ملتا ہے اس کی اساسی دراصل تہذیبی، اخلاقی اور روحانی ہے۔“ (۹)

اقبال کا تصور ملت، دوسری، اقوام کی تفہیم یا ر کی نفی سے عبارت نہیں۔ اقبال نے جہاں ملت اسلامیہ کی عظمت کا قصیدہ لکھا ہے وہاں دوسری اقوام سے اس ف صے کو بھی قائم رکھا ہے جو دونوں کے نظریاتی خدوخال واضح کر سکے۔ مگر اسے ایسی خلیج نہیں بننے دیا کہ دونوں میں رکالے کی راہ مسدود ہو جائے۔ اور یہی وہ ف صہ ہے جس میں ملتوں، نظریات اور افراد کی شناخت ممکن ہوتی ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں ملکیت، ملائیت اور تصوف کی ایک مخصوص تعبیر پر جس شدت سے تنقید کرتے ہیں، اسی شدت سے مغربی تہذیب، سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے بعض عناصر پر معترض ہوتے ہیں اور دونوں صورتوں میں اسلام کی بنیاد کو متیار بناتے ہیں۔ اور مسلمانان عالم کی تقدیر سے پوری انہ نیت کی تقدیر کو وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ مسلمانان عالم کے مسئلہ، ان کی تاریخ اور ان کے اتحاد سے متعلق ہے یا مسلمانوں پر مغربی استعمار کی حیرہ دستوں پر احتجاج ہے

تری حریف ہے یا رب سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی اٹلیں آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار اٹلیں

(سیاست افرنگ) (۱۰)

شریعتی کہتے ہیں کہ استعمار کی اسلام دشمنی کی وجہ اسلام کی استعمار مخالفانہ استعداد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

”جب استعمار ایشیائی اور افریقی ممالک میں ان کو فتح کرنے کے لیے داخل ہوا تو اس پر منکشف ہوا کہ اسلام محض ایک باطنی اور اخلاقی نظام یا محض ایمان بالغیب نہیں ہے بلکہ اس نے اسلام کو اپنے معاشرے پر حکمران اور ہمہ پہور مہری کرنے والی ایک جارحانہ دیوار کے طور پر اپنے بالقابل پایا۔ اسلام اور اس کی تاریخ سے واقفیت پانے کی وجہ سے، نیز اسلامی طرز فکر کی اسی حرکی خصوصیت کی بنا پر استعمار اسلام کو سب سے زیادہ مفلوج کرنا چاہتا ہے۔ وہ ملت اسلامیہ سے اس کی حرکی خصوصیت چھین کر سکون و آرام سے اس کی سرزمینوں کو فتح کرنا چاہتا ہے۔“ (۱۱)

اقبال کے دور کے استعمار کی توسیعی صورت آج کی امریکی تہذیب ہے جو دنیا کی واحد سپر پاور بننے کے جنون

میں اپنی تہذیبی اقدار کو زبردستی، لٹکیر بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ اور یہی تہذیب اپنی سیاسی، عسکری اور معاشی طاقت کی بنا پر اس وقت کسی نہ کسی شکل میں پوری دنیا خصوصاً عالم اسلام پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ تہذیب بیسویں صدی کے نصف آخر یعنی قیام پاکستان کے بعد ابھر کر سامنے آنے والی اقدار و روایات پر بنیاد رکھتی ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو مغربی تہذیب کا بیج امریکی سر زمین میں نہیں پھوٹا بلکہ یورپی ممالک سے وہاں ورآ کر پھیل گیا۔ اور خود یورپی ممالک کی تہذیب جسے اقبال نے مجموعی طور پر مغربی تہذیب کے نام سے یاد کیا ہے۔ یونانی فلسفیانہ افکار، گلیکسانی نظام عقائد اور مسلمان عربوں کے ذوق تحقیق و تجربہ کی آمیزش سے تیار ہوئی ہے۔ اس امر کا اعتراف بریٹانٹ نے اپنی تصنیف ”تشکیل انسانیت“ میں کیا ہے۔ (۱۲)

ہر تہذیب کی عمارت چند اساسی نظریات و افکار پر استوار ہوتی ہے جن کی مدد سے تہذیب کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ کسی قوم کی تہذیب کے اجزاء میں اس کا طرز تمدن، طرز حکومت، نظام تعلیم، نظام افکار و عقائد، قوانین و روایات اور عمومی معاشرتی رویے شامل ہوتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام اجزاء کسی باطنی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں یا وہ کون سی مشترکہ فکر یا رویہ ہے جو کسی قوم کے تمام تہذیبی مظاہر کا پس منظر تشکیل دیتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو مغربی تہذیب کی بنیاد جس نظریے پر ہے وہ اپنی نوعیت میں خالصتاً اقتصادی یا مادی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس تہذیب کے تمام تر مظاہر خواہ وہ مجرد ہوں یا مجسم، جس بنیادی مقصد کے تحت مشکل ہوتے ہیں وہ نفع اندوزی یا مادی وسائل کا حصول ہے۔ اس رویے کا اظہار زندگی کے ہر شعبے و در مغربی تہذیب کے ہر مظہر میں ہو رہا ہے۔

فکری یا نظریاتی اعتبار سے یہ تہذیب اپنی جن خصوصیات پر فخر کرتی ہے اور انہیں دنیا بھر میں پھیلا نا چاہتی ہے وہ جمہوریت، آزادی، مساوات اور انسانی حقوق کی حفاظت ہیں لیکن گران تمام دعوؤں کا جائزہ لیا جائے تو بالکل متضاد صورت سامنے آتی ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (۱۳)

اس تہذیب کی بنیاد مادہ پرستی اور انسان محور فکر پر ہے۔ یہ ایک عالمگیر تہذیب بننے کی دعویدار ہے لیکن خود اس تہذیب کے مرکز میں ایک عالمگیر معاشرت کا کوئی اصول کارفرما نہیں اس لیے یہ تہذیب نہ صرف غیر متوازن ہے بلکہ غیر فطری بھی ہے۔ اس حوالے سے اقبال کے کلام میں بے شمار اشارے ملتے ہیں۔

شفق نہیں مغربی افق پر، یہ جوئے خوں ہے، یہ جوئے خوں ہے

طلوع فردا کا منتظر رہ کہہ دوں و امروز ہے فساد

وہ فکر گستاخ جس نے ہریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو

اسی کی چیتاب بکلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

ہوائیں ان کی، فضا کی ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے

گرہ بہنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ!

جہان تو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالم حیر مر رہا ہے

جسے فرنگی مقاموں نے، بنا دیا ہے قمار خانہ (زمانہ) (۱۴)

اقبال نے اپنی پیغمبر نہ بصیرت کے سبب آج سے ایک صدی پیشتر ہی اندازہ کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب جس سمت میں چھوٹ رہی ہے بالآخر اس کا نچر مہتابی ہوگا۔ مغربی تہذیب کو تنقید کا نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ اس عقلی اور سائنسی ترقی کو سراہا بھی ہے جس نے یورپ کو پوری دنیا میں مرکزی اہمیت عطا کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اقبال نے اس تہذیب کے بے روح ہونے کا سوال بڑے شد و مد سے اٹھایا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر اس تہذیب نے مادہ پرستی سے نجات حاصل نہ کی تو اس کی جہی و سائنسی ترقی بھی اس کے لیے ایک وبال بن جائے گی۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک عقیدہ اگر صرف موردی تجربہ بن کر رہ جائے تو وجود منور نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک روحانی تنگ و دو بھی ضروری ہے۔ اس تنگ و دو کا مرکزی نقطہ اللہ ہے۔ یہ انسانی شعور کا اعلانیہ بھی ہے، گویا کائنات کی تعمیر کا بنیادی راستہ خودی کی تعمیر سے ہو کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں مروج ہونے والے وہ تمام تصورات اور نظریے جو اجتماعی مقاصد اور فلاح کے نام پر ایک نوع کی فرد کشی کے مرتکب ہوتے ہیں، اقبال کی فکر سے مناسبت نہیں رکھتے۔ اقبال ایسے تمام تازہ خداؤں کے منکر ہیں۔ وطن پرستی، عدم قایمیت، رنگ و نسل، زبان، قومیت اسی طرح جدید انسان کی ذہنی قیادت کا دعویٰ کرنے والی طاقتیں سائنس، نیکین لوجی، جمہوریت یہ سب اسی دیواستبداد کی نئی صورتیں ہیں۔ تہذیب مغرب کی بے راہ روی اور بے زمامی کا اصل سبب اللہ سے دوری ہے۔ تمدنی روایات اور فنون کے معاملے میں بھی اقبال نے مغربی تہذیب کے طرز عمل سے خداف کیا ہے۔ وہ اسلامی ہیومنزم پر اعتقاد رکھتے تھے اور صرف ان فنون کو مفید خیال کرتے ہیں جو انسانی سیرت و کردار کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر اقبال دانش افروز کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر انہوں نے عقل کو عشق کے تابع کرنے اور مادیت کو روحانیت سے آشنا کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں عقل و خرد کی آزادی بالآخر ایسی زیرکی بدل جاتی ہے اور اہلیست کے مختلف مظاہر کا مشاہدہ گزشتہ صدی کے دوران کیا جا سکتا ہے۔

مغربی انکار و تمدن کے مطالعے کے بعد اقبال اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اپنی تمام تر عقلی و سائنسی ترقی کے باوجود یہ تہذیب ایک بے روح قالب ہے اور اگر اسے زندگی کے روحانی پہلو سے آشنا نہ کیا گیا تو یہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ یہاں سول یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تہذیبی ڈھانچہ خود اپنی تباہی کا باعث بنتا ہے تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلا کو کس طرح پر کیا جائے گا۔ اس سوال کے جواب میں اقبال نے اسلامی تہذیب کے احیاء کا تصور پیش کیا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کس طرح عصر حاضر کی غالب تہذیب کا درجہ حاصل کر سکتی ہے جبکہ فی الوقت یہ تہذیب صرف اصولی طور پر زندہ ہے اور عملی طور پر اس نظام کی مکمل صورت پذیری تاریخ میں شان و نامور ہی نظر آتی ہے۔ تاہم جزوی طور پر اس کے مختلف پہلو مسلمان قوموں کے طرز معاشرت کا کسی نہ کسی حوالے سے حصہ ضرور رہے ہیں۔ اسلامی تہذیب کے حیا کے حوالے سے جو سوالات فی الفور سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو تہذیب ڈیڑھ ہزار سال تک کسی ایک مسموم اثر میں بھی اپنی حقیقی شکل میں کلی طور پر نافذ نہیں ہو سکی۔ کیا وہ آج ایک عالمگیر تہذیبی خلا کو پورا کر سکتی ہے۔ پھر یہ کہ اسلامی تہذیب سے مراد اگر مسلمانوں کی تہذیب ہے تو کون سے مسلمانوں کی تہذیب کو نمائندہ اسلامی تہذیب قرار دیا جاسکتا ہے؟ عربوں کی تہذیب، ایرانی مسلمانوں کی تہذیب، برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیب، یا دنیا کے دیگر مذاہب میں بسنے والے مسلمانوں کی تہذیب؟ نیز فقہی و مسلکی اختلافات جس تہذیبی رنگارنگی کو جنم دیتے ہیں اس سے کس طور پر نمٹا جاسکتا ہے؟ اسلامی تہذیب کے تصور پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام ایک دین یا عقیدے کا نام ہے جبکہ تہذیب ایک روہ انسانی کے اجتماعی اعمال و افعال سے عبارت ہے۔ اگر اسلامی تہذیب سے مراد مسلمان قوم کا طرز فکر

و عمل ہے تو تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ عمل دیگر اقوام کے تہذیبی اثرات سے آلودہ ہوتا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کے ظاہری تمدنی، تہذیبی ڈھنگ میں یکسانیت نہیں ملتی۔ فکر اقبال میں ان تمام سوالوں کے جوابات مل جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب دراصل ایک بڑے اور وسیع تر نظریاتی ڈھانچے کا نام ہے۔ اس ڈھانچے کے اساسی اجزاء میں وہ افکار و عقائد شامل ہیں جن کی باہمی ترکیب اور ان کے درمیان موجود خدا کو زبانی و مکانی تقاضوں کے تحت پر کر کے تہذیب کے خدوخال متعین کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ مختلف جغرافیائی خطوں اور زمانوں کے باوجود اسلامی تہذیب کی روح مشترک رہتی ہے۔

اسلامی تہذیب فکری طور پر توحید، رسالت اور آخرت کے تصور پر بنی درکھتی ہے۔ ان تصورات پر یقین رکھنے کے چند ایک لازمی ثمرات ہیں۔ پہلا یہ کہ توحید یعنی وحدت کا تصور بنی نوع انسان کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے جس کے نتیجے میں ایسی اخوت اور مساوات جنم لیتی ہے جو جدید تہذیب میں انسانوں کے مابین مسافت پیدا کرنے والے تمام نظریات کا ابطال کر دیتی ہے۔ ان میں نیشنل ازم یا جغرافیائی وطنیت کا تصور بھی ہے اور رنگ، نسل و زبان کے امتیازات بھی، رسالت کا منصب اس تہذیب کو ایک ایسی مرکزیت عطا کرتا ہے جو اس تہذیب کے ماننے والوں کو نہ صرف اس مرکز سے بلکہ ایک دوسرے سے بھی پیوست رکھتی ہے۔ معاشرتی سطح پر یہ ایک یہ نظام ہے جس کی بنیاد مادہ پرستی نہیں بلکہ ایک قسم کی روحانیت پر ہے جس کی تفہیم ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی معاشرت کا تصور پیش کرتا ہے جس میں اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی مفاد کو قربان کیا جاسکتا ہے اور فرد اس قربانی کے صلے میں اپنے معاشرے سے باہمی تعاون اور یکجہنگت حاصل کرتا ہے، اور ایثار اور مفاہمت کی اس فضا سے فرد اور معاشرے دونوں کی ذہنی و نفسی نشوونما میں مدد ملتی ہے۔ یہ تہذیب سرمایہ کو انسانی عزت و فخر کی کسوٹی قرار نہیں دیتی بلکہ شخص فضا کل کو اہمیت دیتی ہے۔ شخصی فضائل میں بھی وہ فضائل زیادہ قابل قدر ہیں جن میں فرد اپنی بجائے معاشرے کے دیگر افراد کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل رہتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تہذیب میں معاشرے کے ہر فرد کے دوسرے افراد پر حقوق بھی ہیں اور ان سے وابستہ فرائض بھی۔ نیز ان حقوق و فرائض کا واضح تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ والدین، اولاد، زوجین، عزیز واقارب، مساکین، رعایا، مزدور اور ملازمین کے حقوق، اسلام ان بنیادی انسانی حقوق کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ اس کا تمام تر تہذیبی ڈھانچہ ان حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔

ان حقوق و فرائض میں سب سے اہم فرض جو حق بھی ہے، علم اور شعور کا حصول ہے۔ فکر کو اسلامی تہذیب کے اساسی عمل کی حیثیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کا حوالہ بار بار آیا ہے (افلا تعفرون) اس فکر کا تعلق کائنات کے مادی مظاہر سے بھی ہے اور روحانی پہلو سے بھی۔ اقبال اپنے خطبے 'اسلامی ثقافت کی روح' میں لکھتے ہیں کہ وحی کے بعد علم کے سب سے بڑے، خد مشاہدہ کائنات اور مطالعہ تاریخ ہیں۔

"مشاہدات باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علم انسانی کا۔ قرآن پاک کے نزدیک اس کے دوسرے چشمے اور ہیں۔ ایک عالم فطرت، دوسرا عالم تاریخ، جن سے استفادہ کرنے میں عالم اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔" (۱۵)

گویا سائنسی اور تجرباتی علم کی ابتدا اسلامی تعلیمات عام ہونے کے نتیجے میں ہوئی۔ علم کا حصول بذات خود ایک

فضیلت ہے اور یہ کسی خارجی یا مادی مقصد کے حصول کا وسیع نہیں۔ تاہم اس علم کے مادی ثمرات سے بہرہ مند ہونے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یعنی مادی مقاصد کا حصول اسلامی تہذیب کا مرکزی محرک نہیں لیکن مادی وسائل کے حصول کو ممنوع بھی قرار نہیں دیا گیا۔ عیسائی تعلیمات کے برعکس اسلام تسخیر کائنات اور اس سے استفادے کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ لیکن اس سے حاصل شدہ فوائد میں پورے معاشرے کو شریک کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ یہی دین اسلام میں علم نافع کا تصور ہے۔ یعنی اسلام میں نفع کی حدود میں انسانی ذہن کی تربیت، ارتقاء و اور وسعت کے ساتھ ساتھ عمل کی اہمیت بھی شامل ہے۔ یعنی مختلف مراحل سے حاصل شدہ علم کو، جماعتی مفاد کے لیے بروئے کار کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا دوسرا بڑا جز اس کا اصول حرکت ہے جسے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اصول اسلامی تہذیب میں ارتقاء کا ایسا تصور پیش کرتا ہے جو ہر زمانے اور ہر دور کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی قوت عطا کرتا ہے۔ اس طرح کم و بیش اس تمام سوالات و اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے جو اسلامی تہذیب کے متعلق وقت فوقتاً مغرب اور مغربی ذرائع ابلاغ کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے تمدنی مظاہر میں اختلاف کے باوجود ان کے درمیان ایک گہرا اشتراک فکر و عمل بھی ہمیشہ موجود رہا ہے۔ نیز یہ کہ مسلمان اقوام نے تاریخ کے مختلف ادوار میں جس قدر خود کو اسلامی تہذیب کے اساسی تصورات سے قریب تر رکھا ہے اسی قدر اس میں دوسری مسلمان اقوام سے مشابہت گہری رہی ہے اور جس تناسب سے وہ ان اساسی نظریات سے دور رہی ہیں اسی قدر ان میں اجنبیت کے عناصر پیدا ہوتے گئے ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اقبال اسلامی تہذیب کے احیاء کے آرزو مند ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ احیائے تہذیب اسلامی یا احیائے ملت اسلامیہ کا یہ خواب کیسے پورا ہو سکتا ہے؟

سیموئیل ہنٹنگٹن کے نظریے کے مطابق اکیسویں صدی تہذیبوں کے تصادم کی صدی ہے اور فوکویاما کے مطابق تاریخ کے خاتمے کی۔ سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے تو اکیسویں صدی کے بین الاقوامی نظام میں چھ (۶) طاقتوں پر مشتمل نظام تشکیل دیتے ہوئے عالم اسلام کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ ہنٹنگٹن کو بھی یہ غلط فہمی ہے کہ مستقبل میں مسلم دنیاؤں کے ابھرنے کے امکانات، یوں کن ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے اس امر کا بھی ادراک ہے کہ ترقیاتی محل وقوع، کثیر آبادیوں والا اسلام اور تیل کی دولت سے، بالامال ہلاک طاقت کا نیا توازن قائم کرے گا کہ بوسنیا، وسطی ایشیا، فلسطین یا کشمیر میں ہوئے والے تہذیبوں کے خونی تصادم زیادہ بڑی جنگوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ (۱۶)

ہنٹنگٹن کو عالمی سماج اور ثقافت میں خود امریکی شناخت بھی گم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کی اساس کسی آفاقی اصول اور نظریے پر نہیں بلکہ امریکہ و یورپ کے نسلی تفاخر پر ہے۔ وہ مائیکل ڈیلنر کے حوالے سے لکھتا ہے۔

”حقیقی دشمنوں کی عدم موجودگی میں سچے دوست بھی نہیں ہوا کرتے۔

جب تک ہم ان سے عزت نہیں کرتے جو کہ ہم میں سے نہیں تو ہم انہوں

سے محبت نہیں کر سکتے۔ یہ وہ پرانی سچائیاں ہیں جنہیں ہم ایک صدی کے

بعد دریافت کر رہے ہیں، اور زیادہ جذباتی بازاری زبان میں۔ جو لوگ

انہیں روکرتے ہیں وہ اپنے حامدان کو روکرتے ہیں، اپنے ورثے کو، اپنی

ثقافت کو، اپنی پیدائش کے حق کو، عین اپنے آپ کو۔ انہیں بس یونہی

معاف نہیں کر دیا جائے گا۔ ان سچائیوں میں موجود تلخ حقیقت کو یہ ست

دانوں اور عالموں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تشخص کو تلاش کرنے اور نسل پرستی کو دوبارہ وجود میں لانے والے لوگوں کے لیے دشمنوں کا ہونا لازمی ہے اور سب سے ممکنہ طور پر خطرناک دشمنیاں دنیا کی بڑی تہذیبوں کے مابین کسی خطویہ کے آر پار موجود ہیں۔“ (۱۷)

چنانچہ ہیننگٹن کے نظریے کی بنیاد پر امریکہ نے اپنی شناخت کو برقرار رکھنے اور اپنی نسلی برتری کی بقا کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو اپنا دشمن قرار دے دیا اور اس تصور کو دوسم دے دیا کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار یوسفی! (۱۸)

اور اس کی وجہ ہیننگٹن کے الفاظ میں یہ ہے:

”تہذیبوں کے درمیان طاقت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے۔ مغرب اپنا اثر و رسوخ کھو رہا ہے۔ ایشیائی تہذیبیں اپنی معاشی، فوجی اور سیاسی قوت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ اسلام میں آبادی کے اضافے سے مسلم ملکوں اور پڑوسیوں کے لیے عدم استحکام پیدا کرنے والے عوامل فردغ پارہے ہیں۔ نیز غیر مغربی تہذیبیں عمومی طور پر اپنی ثقافتی اقدار کا دوبارہ اثبات کر رہی ہیں۔“ (۱۹)

اس تناظر میں احیائے اسلام اور احیائے ملت کے امکانات پر نظر ڈالی جائے تو دیکھا یہ ہوگا کہ جس ضمن میں اقبال اور علی شریعتی کا نقطہ نظر کیا ہے۔ علی شریعتی کہتے ہیں:

”ایک ایسے روشن خیال کی حیثیت سے جو اپنے دور کا ذمہ دار ہو، اپنے زمانے اور اپنی نسل کا ذمہ دار ہو، ہمیں اپنی ذمہ داری کا تعین کرنا چاہیے اور وہ اجتماعی کردار جو ایشیائی یا اسلامی معاشرے کے روشن خیال پڑھے لکھے اور بالکل مکمل لوگوں کی ذمہ داری ہے، کا تعین کیا جائے۔۔۔ کہ ہر ایک سوسائٹی اپنی تاریخ اور تہذیبی بنیاد پر روشن خیال بنے اور اپنی تہذیب، تاریخ اور عوامی زبان کی بنیادوں پر اپنی روشن خیالی اور رسالت کے کردار کو ادا کرے اور اس کی بنیادیں تین ماٹو ہونے چاہیں: (۱) تاریخ (۲) تہذیب (۳) عوامی زبان۔“ (۲۰)

اقبال کہتے ہیں:

الف:
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے عارت گہ باطل بھی تو

- بے خبر تو جو ہر آئینہ ایام ہے۔۔۔^۱
- تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے (۲۱)
- ب۔ ”انسانیت کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور ایسے عالمگیر نوعیت کے بنیادی اصول جو روحانی بنیادوں پر انسانی سماج کی نشوونما میں رہنما ہوں۔“ (۲۲)
- ج۔ ”اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمنِ اقوام جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسخیم کیا ہے تو محض سہوتِ تعارف کے لیے۔ اس لیے نہیں کہ اس کے رکان پنا اجتماعی مطمح نظر محدود کر لیں۔“ (۲۳)

اقبال نے انسانیت کے عالمگیر اتحاد کے لیے، خوت اور بھائی چارے کی اس فضا کی تشکیل کو ضروری قرار دیا ہے جو اسلامی تہذیب کی روح ہے۔ لہذا اقبال کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اسلامی تہذیب کا احیاء کسی تہذیبی تصادم کا نہیں بلکہ تہذیبی ادغام کا نتیجہ ہوگا۔ ادغام سے مراد یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے باطنی ڈھانچے کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے اور اس کی ضمنی تفصیلات وقت اور زمینی ضروریات کے تحت طے کر لی جائیں۔ اس مقصد کے لیے اسلام کی روح کو سمجھنا ضروری ہے۔ اسی نکتے کی طرف شمیم حسنی نے اپنے ایک مضمون میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے

”اقبال مشرق اور مغرب کو شعور کے دو مختلف مظاہر فکر کے دو مختلف اسایب اور زندگی کے دو مختلف زاویوں کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ایک متوازن بصیرت اور متانت آمیز شعور کے ساتھ اقبال نے اپنے آپ کو، اپنے عہد کو، تاریخ کو، کائنات کو، عام انسانی معاشرے کو ایک ساتھ مخاطب کیا ہے۔ اس لیے مشرق و مغرب کا ان کا ادراک دراصل تاریخ سے مکالمے کی ایک صورت ہے۔ اپنے خطبات میں اقبال نے واضح لفظوں میں کہا ہے کہ انسانیت کی نجات کے لیے تغیر اور دوام کی اقدار، یا دوسرے لفظوں میں مشرق و مغرب کے بعض رویوں کا باہمی ادغام ناگزیر ہے۔“ (۲۴)

احیائے ملت اور احیائے اسلامی کے ضمن میں اقبال اور علی شریعتی کے افکار کے جائزے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اگر تخلیق کائنات کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی و ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اسلام محض انسان کی خلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں ایک بتدریج مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدیں کر اس میں خاص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ ہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانانِ عالم اپنی تاریخ سے آگاہ اور مربوط رہتے ہوئے اسلامی اقدار کے احیاء اور بقا کے لیے سرگرم عمل رہیں۔ نیز معاصر قومی اور بین الاقوامی صورتحال کا جائزہ اس امکان کی

طرف اشارہ کرتا ہے کہ بنی نوع انسان کو جلد یا بدیر اس نتیجے پر پہنچنا ہی ہے کہ انسانیت کی بقا اور ارتقا کا محفوظ ترین راستہ وہی ہے جسے سادہ متنی و راہن کا راستہ کہا گیا ہے، نہ کہ وہ جو قصہ دم اور انسانیت کی نفی کا ہے۔

حواشی

- ۱۔ "کلیات اقبال" ص ۲۳۳، ۲۳۴
- ۲۔ ایضاً ص ۲۳۴
- ۳۔ ایضاً ص ۳۵۳
- ۴۔ "اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ"، بشیم خفی، "گادری باز یافت"، گراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۸
- ۵۔ "علی شریعتی کے انقلابی افکار اور قبال"، پروفیسر شبیر افضل خان، پورب گادری اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
- ۶۔ "کلیات اقبال" ص ۱۵۷
- ۷۔ ایضاً ص ۱۲۰
- ۸۔ ایضاً ص ۱۷۳
- ۹۔ "اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ" ص ۱۳۵
- ۱۰۔ "کلیات اقبال" ص ۳۳۳
- ۱۱۔ "علی شریعتی کے انقلابی افکار اور قبال" ص ۳۵۴
- ۱۲۔ "تشکیل جدید الہیات، اسلامیہ مترجم، نذیر نیازی، بزم، قبال لاہور، طبع سو ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۹
- ۱۳۔ "کلیات اقبال" ص ۳۵۲
- ۱۴۔ ایضاً ص ۴۵۶
- ۱۵۔ "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" ص ۱۹۶
- ۱۶۔ "تہذیبوں کا قصہ دم"، سیموئل ہننگٹن، مترجم عبدالحجید طہر، نگارشات لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۸
- ۱۷۔ ایضاً ص ۳۵
- ۱۸۔ "کلیات اقبال" ص ۴۰
- ۱۹۔ "تہذیبوں کا قصہ دم" ص ۳۵
- ۲۰۔ "علی شریعتی کے انقلابی افکار اور قبال" ص ۱۱۷
- ۲۱۔ "کلیات اقبال" ص ۱۴۱
- ۲۲۔ "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" ص ۲۳۴
- ۲۳۔ ایضاً ص ۲۳۶
- ۲۴۔ "اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ" ص ۱۳۶

ناول: عصری آگہی کی یافت کا بنیادی ماخذ

سید کامران عباس کاظمی

کہانی سے انسان کی دلچسپی اور اس مشغلے سے اس کا کاغذ، اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ کی سنجیدگی اور اس کے فکر کی منطق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ انسان اپنی حیات اجتماعی کے بالکل ابتدائی دور میں فطرت کی جس قوتوں سے خبردار نہ تھا اور برسرِ پیکار تھا، اس پیکار اور کشمکش میں اسے سختی کی جن منزلوں سے گزر کر رفیع و ظفر کا روئے تاباں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوتی تھی، اس کی رودادیں اس کے لیے قدرِ مکرر کی چاشنی تھی۔ کام وہاں کو اس چاشنی سے آشنا کرنے کی خواہش لے اے آپ اپنی دہرائے کا عادی بنایا۔ یہی کہانی کہنے یا داستان سر کی کا آغاز ہے۔ ۱

انسان جب فطرت کے مقابل آیا اور اسے تسخیر کرنے کی صلاحیت سے آشنا ہوا یا جب وہ دن بھر کے شکار سے تھک کر رات کو جنگلی جانوروں کے خوف سے رات بھر جاگتا تو وہ رات گزارنے کی خاطر ایک دوسرے کو قصے سناتا یا شکار کے واقعات سناتا۔ یہیں سے اس نے اپنے خواب بھی بیان کرنے شروع کیے ہوں گے تو قصہ گوئی میں تخیل کے عنصر کا اضافہ ہوا ہوگا۔ اسی طرح اس نے کوشش کی ہوگی کہ سامعین کو اپنی باتوں میں نگہ رکھے تو بیان کی چاشنی قصے کا مقدور بنی ہوگئی۔ دن بھر کا تھکا ہارا انسان کسی ایسے مشغلے کی جستجو میں تھا کہ وقتی طور پر ہی کسی دن بھر کے فطرت کے پیدا کردہ آرام و مصائب کو فراموش کر دے اور کسی رومان خیز فضا میں خود کو گم کر دے یہیں سے قصہ گوئی کا آغاز ہوا۔

انسان اپنی فطرت میں خود پرست ہے اور اس کی دلچسپی کا محور وہ واقعات یا شیا ہوتی ہیں جو اس کی ذات سے متعلق ہوں۔ اسے اپنی زندگی سے متعلق واقعات بہت دلچسپ محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مشکلات کو اپنے تخیل میں سہولت میں بدلتے دیکھتے ہے اور پھر وہی خواہش کو فروغ دیتا ہے اور حسبِ منشا زندگی کی آرزو کا اپنے وسائل میں اظہار کرتا ہے۔ انسان کا یہی ابدی ادغ اور اظہار قصہ گوئی یا کہانی کا سبب بنا۔ گویا افسانے ہمارا ادبی خواب ہیں۔ افسانہ یا کہانی انسانی فطرت کی عکاسی کا نام ہے۔ جس میں واقعات ایک تسلسل سے آتے ہیں اور ان واقعات میں انسانی جذبات و خیالات رنگ آمیزی کرتے ہیں جو انسان کے ذوقِ تجسس کی آبیاری کرتے ہیں۔ تجسس کی بنیاد انسانی تخیل پر ہے اور تخیل دراصل عناصر کی نئی ترتیب ہوتی ہے۔ گویا انسانی زندگی میں بنیادی ہیئت ”قصہ“ کو حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر فاروق عثمان

اس بات کا تعین کرنا کہ سب سے پہلی کہانی کسی نے سنائی اور کہاں پر سنائی ایک ناممکن بات ہے البتہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ انسانی فطرت اور کہانی سننے کے عمل کا انوکھا رشتہ اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ اسے وجود میں لے کے یہ انسانی معاشرے کو ایک خاص درجہ تک کے ارتقاء کی ضرورت نہیں پڑی ہوگی۔ ۲

یعنی قصہ کہنے کی صلاحیت انسان میں نطق کی صلاحیت کے ساتھ ہی وجود میں آگئی۔ قصہ کہنے کی دو وجوہات

ہو سکتی ہیں۔ فطرت کے مقابل آنے سے گریز نے انسان کو تخیل میں پناہ لینے پر مجبور کیا ہوگا۔ یعنی نا آسودہ خارجی، حوالے سے معروضی عوامل نے داخلیت پسندی پیدا کر دی ہوگی اور دوسری صورت برعکس بھی ہو سکتی ہے کیونکہ قصہ انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث بھی تھا۔ وہ نا آسودہ آرزؤں کی تشنگی بھی کرتا تھا۔ قصہ ہی کی بدولت ایک نسل نے اپنے کارنامے دوسری نسل کو منتقل کیے۔ انسانی تجربہ، مشاہدات یا دانش قصہ ہی کی بدولت آئندہ نسوں کو منتقل ہوئی۔ قصے کا بنیادی عنصر دلچسپی کا برقرار رکھنا یا تجسس تھا۔ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ قصہ کی بنیت میں تبدیلی آتی گئی۔ حکایت، کہانی، داستان اور جدید دور میں ناول اور افسانہ سب کا ماخذ دراصل قصہ ہی ہے۔ ابتدا میں سیر و شکار کے قصے تخلیق ہوئے۔ ممکن ہے صنف لطیف نے عشق و محبت کے قصوں کو فروغ دیا ہو۔ کیونکہ مرد تو شکار پر چسپے گئے اور گروہ کی خواتین اپنے اپنے پسندیدہ مردوں کی بہداری اور ان کے ساتھ اپنے حسن و عشق کے معاملات ایک دوسرے سے بیان کرنے لگیں۔ اس طرح انسان نے اپنی نطق کے ذخیرہ الفاظ کو بڑھایا، تخیل میں جدت پیدا کی، تجسس برقرار رکھنے کے لیے شدت جذبات بڑھائے جس سے احساس بڑھا۔ یوں انسان کے ادراک، شعور اور قوت استدلال کو فروغ حاصل ہوا۔ بعد ازاں مذہب کی ایجاد نے مذہبی قصص اور مافوق الفطرت قصص کو فروغ دیا۔ نوبت یہاں جا رسید کہ جب انسانی فکر نے نئے تصورات کو جنم دیا تو ان کے اظہار کے لیے بھی قصوں کا سہارا لیا اور ان نئے افکار کا قصوں پر اثر ہوا اور ان سے مخصوص خلاقیت کا کام لیا جانے لگا۔ گویا قصے بھی مختلف ادوار میں اصول مذہب و مدن، سیاست، اخلاقیات، عقل اور سائنس سے متاثر ہوئے اور ان میں نت نئی اختراعات ہونے لگیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قصہ گوئی کی داستان کافی طویل ہے۔ قصہ یا کہانی میں کوئی بیچ و خم نہیں ہوتا۔ اس کی ایک خوبی عام فہم اور رواں ہونا ہے اور اس کی دلچسپی کا مدار فقط واقعات پر ہوتا ہے۔ زمان و مکان کا تصور ان میں ناپید ہوتا ہے، ہندوستان میں اس طرح کی کہانیوں کی روایت ”رگ وید“ اور بعد ازاں گوتم بدھ کی ”پالی باتک“ سے آغاز ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری افسانہ، داستان، قصہ، حکایت اور کہانی کو برصغیر کی مخصوص فنون میں باہم مترادف معانی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان کا مفہوم قطعی طور پر متعین نہیں ہے۔ ثبوت میں ہم چند داستانوں کے نام پیش کرتے ہیں جنہیں ان میں سے ہر غلطی کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ مثلاً افسانہ عجیب، داستان امیر حمزہ، قصہ گل و صنوبر، حکایت ابلیس یا حکایات سخن سنچ اور طوطا کہانی یا رانی کیکلی اور کنوراو دے بھٹن کی کہانی، چونکہ یہ سب کی سب داستانیں ہیں اس لیے یہ الفاظ باہم متبادل ہیں۔ ۳

بالعموم مختصر قصے کو کہانی اور طویل قصہ جس میں کہانیوں کی تعداد بھی زیادہ ہو داستان کے نام سے موسوم ہوا۔ کہانی، حکایت اور داستان و قصہ کی مختصر تعریفات جن کا تعین سہیل بخاری نے کیا ہے، بالترتیب درج ذیل ہیں کہانی سے مراد وہ افسانہ ہوتا ہے جو زبانیاں بیان کیا جائے، حکایت کا لفظ بھی کہانی کا مترادف ہے۔ ۴ داستان میں واقعات کی تعداد کہانی سے زیادہ ہوتی ہے، بلکہ ایک داستان میں کتنی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ۵ کہانی اور داستان ممکن ہیں کہ فرضی ہوں اور بالعموم فرضی ہوتی ہیں یا مجبوس صداقت کی حامل ہوتی ہیں۔ البتہ قصہ کے ساتھ معاملہ مختلف ہو سکتا ہے۔

قصے کے لفظ سے افسانے کی وہ قسم مراد لی جاتی ہے۔ جس پر کبھی کبھی تاریخییت کا بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ یعنی کبھی تو قصہ کسی واقعے پر مبنی ہوتا ہے جسے سچا واقعہ کہتے ہیں اور کبھی اس میں محض فرضی واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو فرضی قصہ کہلاتا ہے۔ ۶

ہندوستان زرعی معاشرت ہے۔ زرعی معاشرہ میں تبدیلی کا عمل سست رفتار ہوتا ہے البتہ زرعی سماج میں مذاہب کی نمود جلد ہوتی ہے۔ ہندوستانی مذہب میں قصوں کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ ”رگ وید“ اور دیگر ”ویدوں“ سے کہانی یا حکایت کا آغاز ہوتا ہے جن میں قصہ اور روایتی مکالمے کے اشارے ملتے ہیں۔ مہا بھارت اور رامائن وغیرہ میں قصہ کی طوالت اور تیسری صدی قبل مسیح تک کی ہندوستانی معاشرت ان سے بخوبی جھلکتی ہے۔ بعد ازاں گوتم بدھ کی ”پالی جاتک“ کہانیاں قصہ گوئی کے روایتی اخلاقی پہلو کو مزید نمایاں کرتی ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت عام بوں چال کی زبان کا استعمال ہے۔ داستان کا تعلق ویدوں کے بہت بعد کے دور سے ہے۔ داستان کی بنیاد بھی قصہ پر ہوتی ہے۔ لیکن ترتیب میں اس کا نمبر مختصر کہانی کے بعد آتا ہے۔ داستان کی تعریف کرتے ہوئے مؤلف ”کشاف تنقیدی اصطلاحات“ لکھتے ہیں ”داستان کسی خیالی اور مثالی دنیا کی وہ کہانی ہے جو محبت، مہم جوئی اور سحر و طلسم جیسے غیر معمولی عناصر پر مشتمل اور مصنف کے آزاد اور زرخیز تخیل کی تخلیق ہو۔“ داستان عموماً طویل ہوتی ہے کیونکہ داستان کا بنیادی عنصر خواب و خیال ہے۔ اسی لیے داستانوں میں فوق الفطرت عناصر کی بہت نظر آتی ہے۔ جن، پریاں، ور پریوں کے عاشق دیو، زمان و مکان سے آزاد، دشمن اور، مافوق الفطرت قوتیں رکھنے والے دانشور بوزھے، عجیب الخلقت ہستیاں کردار قصہ کا کام دیتے ہیں۔ قاری کی ان سے دلچسپی موجود ہوتی ہے لیکن وہ انہیں حقیقی خیال نہیں کرتا۔ لیکن زندگی کی تلخی کو وہ کسی حد تک بھول جاتا تھا اور جب ہندوستان میں سامری دور میں داستان پر غیر اعدائیہ پابندی لگی بلکہ باقاعدہ سامراج نے مجمع باری سے منع کر دیا تو اس کے پیچھے یہی محرکات شامل تھے کہ داستان گو باقاعدہ مجمع رگا کر اشراروں کنایوں میں مزاحمتی رویوں کو فروغ دیتا ہے۔ بقول علی عباس حسینی

داستان گو نے اپنی قوت تخلیق کے ذریعے ہمارے لیے ایک ایسا طلسماتی عالم تیار کر دیا ہے جو ہماری دھنوں بھری دنیا سے بالکل الگ چیز ہے لیکن اسی کے ساتھ محترمین کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا قصہ بالکل خلا میں نہیں پیدا ہوا۔ داستان گویا دنیا میں پیدا ہوا اور اس نے الفاظ ہی دنیا کے استعمال کیے ہیں۔ اس لیے عہد یا سہوار تصنیف میں اس معاشرت کی تصویر بھی کھینچ گئی جس میں اس کا مصنف ہزار داستان فریادی تھا۔ ۸

داستان باقاعدہ ایک صنف ہے اور اس کا مخصوص فن ہے۔ داستان خواب اور طلسم کی دنیا ہے۔ داستان کا مقصد بھی قصہ یا کہانی کا بیان ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سکیل بخاری لکھتے ہیں جہاں تک داستان کی اصل غایت کا تعلق ہے وہ کہانی کی غایت سے مختلف نہیں ہے بلکہ داستان کہانی کی ترقی یافتہ شکل ہونے کے لحاظ سے تفسیر طبع کا زیادہ سامان فراہم کرتی ہے۔ چونکہ داستان کی دلچسپی اس کے واقعات پر منحصر ہوتی ہے اس میں کہانی سے زیادہ واقعات ہوتے ہیں اس لیے اس کی دلچسپی بھی کہانی کی بہ نسبت زیادہ دیر تک قائم رہتی ہے۔ ۹

داستان گوئی کا رواج صدیوں سے انسانی سماج میں موجود ہے اور یہ انسان کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی عکاسی بھی کرتی رہی ہے۔ جدید عہد میں داستان نے مغرب میں ایک نئی صورت بدلی۔ صنعتی تمدن میں خیال آرائی کی گنجائش کم ہو گئی اور زندگی کی حقیقی تصویر کشی کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح داستان اپنا پیرہن بدل کر ناول کا روپ اختیار کر گئی۔ ناول جدید عہد کی صنف ادب ہے۔ ناول قصے اور کہانی سے مختلف ہے۔ کیونکہ قصہ اور کہانی تو انسان کے ساتھ وجود میں آئے مگر ناول کا آغاز انسانی سماج کی ترقی کے ایک خاص عہد سے ہوا۔ ”ناول اور داستان کے اجزائے ترکیبی میں بنیادی فرق نہیں صرف زمانے اور انسانی شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت بدلتی گئی۔“^{۱۰}

داستان میں اور داستان گو ایک خاص عہد کے پروردہ تھے۔ یعنی داستان کو شہنشاہیت اور جاگیرداری سماج میں فروغ ملا ہے۔ اس لیے داستان کا ماحول بھی وہی ہے جو درباروں کا نظر آتا ہے۔ خود اردو کی تحریری داستانوں میں ان کے تخلیق کاروں کا عہد صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ ”باغ و بہار“ دلی کی معاشرت کی عکاسی کرتی ہے تو ”فسانہ عجائب“ میں لکھنوی نوابین کے دربار، محفیس، طرز بود و باش، عادات و رسومات، تزئین و آرائش کے سامان موجود ہیں گویا یہ مکمل لکھنوی طرز معاشرت کی عکاس ہے۔ تاہم داستان تنہا قی، فرضی اور ماورائی عنصر کی حامل ہوتی ہے البتہ جب انسانی شعور میں انقلاب آفریں تبدیلی آئی اور ناول کی صنف کو فروغ ہوا تو ناول کے اپنے مطالبات تھے جو داستان کے قریب ہونے کے باوجود الگ بھی تھے۔ ناول میں ماورائیت کے بجائے رضیت نے جگہ لے لی۔ تخیل کے بجائے حقیقت نگاری کا چلن ہوا اور واقعیت نگاری کو فروغ ہوا جبکہ داستان کی بنیادی صفت رنگین بیانی کی جگہ سادگی کا مطالبہ بڑھا۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام۔

داستان تخیل کے بعد کی منزل ہے مگر یہ حقیقی زندگی سے اور زیادہ دور ہو جاتی ہے۔ البتہ مقصد کے اعتبار سے یہ ناول سے زیادہ قریب آ جاتی ہے۔ داستان کا مقصد تلقین اخلاق نہیں بلکہ تفریح طبع ہوتا ہے۔^{۱۱}

ڈاکٹر عبدالسلام کے اس اقتباس کے آخری حصے سے اختلاف ممکن ہے۔ کیونکہ ناول کا مقصد محض تفریح طبع نہیں ہے بلکہ یہ چونکہ حقیقی زندگی کا عکاس ہے اس لیے یہ زندگی آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی آموز بھی ہو سکتا ہے۔ ناول جدید صنف ادب ہے اور اس کا جنم جدید صنعتی معاشرے کے بسن سے ہوا۔ برصغیر میں ناول بطور صنف کے مغربی ادب سے براہ راست اردو میں آیا۔

اردو میں جو اصناف ادب یورپ سے آئے ہیں۔ ان میں ناول شاید سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ناول ایسی صنف ادب ہے جس سے ہر فرد لطف اندوز ہو سکتا ہے اور ہمارا عام ناظر زیادہ تر ناول ہی پڑھتا ہے۔^{۱۲}

داستان اور ناول کے اجمالی جائزے کے بعد ناول کی چند متفرق تعریفات کا جائزہ اس امر کی وضاحت کے لیے ذیل میں ضروری ہے تاکہ عصریت یا عصری آگہی اور ناول کے تعلق کا جائزہ لیا جاسکے۔ کیونکہ عصری آگہی کی یافت کا بہترین ماخذ ناول ہی ہے اور ناول کی تعریفات بھی اس عقدے کی گرہ کشی میں معاون کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً سیم اختر ناول کی تعریف کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ناول سے مراد ایسی تحریر ہے جو شعور زیست کے ساتھ شعار زیست بھی دے۔ جو کرداروں کے حوالہ سے انسانی سائنسی کا سینڈ کیپ منور کرے، جو توقعات کے محرک بننے والے عوامل کی نشاندہی کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان اور انسانی سماج کا Perisepic مطالعہ پیش کرے۔ ۱۳

درج بالا اقتباس ناول اور سماجی و معاشرتی زندگی کے گہرے تحقق کو بھی واضح کرتا ہے اور داستان اور ناول کے مابین موجود امتیاز کی بھی وضاحت کرتا ہے۔ کیونکہ داستان کا تعلق خیالی اور مثالی دنیا سے ہوتا ہے اور حقیقی خارجی زندگی کی جھلک اس میں کم ہوتی ہے۔ جبکہ ناول کا قصہ فرضی ہونے کے باوجود حقیقی اور سماجی زندگی سے گہری مشابہت کا حامل ہوتا ہے۔ ناول کی تمام تعریفات میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ حقیقی زندگی کی تصویر کشی ہے، مثلاً ڈاکٹر ابوالیث صدیقی لکھتے ہیں:

ناول سے مراد سادہ زبان میں ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمولی واقعات اور روزانہ پیش آنے والے معاملات کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ یہ دلچسپی پلاٹ، منظر نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ناول کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں پلاٹ اور کردار نگاری خاص طور پر اہم ہیں۔ ۱۴

ناول کی اس تعریف میں بنیادی عنصر ناول کا زندگی سے تعلق ہے۔ زندگی کے تمام موضوعات چاہے وہ جس بھی نوعیت کے ہوں ناول کا موضوع بنیں گے۔ گویا ناول زندگی کی متنوع خصوصیات کو پیش کرنے کا اہم وسیلہ ہے۔ زندگی کے ہر طرح کے حقائق کا فہم حاصل کرنے اور ان کے ابلاغ کے لیے ناول سے بہترین الوقت کوئی صنف نہیں ہے۔ ناول کو زندگی کی حقیقی تصویر کشی کا نمائندہ قرار دیتے ہوئے علی عباس حسینی نے انگلستان کے معروف ادیب ایچ، جی، ویلز کے حوالے سے لکھا ہے

ہر اچھے ناول کی پیچون اس کی حقیقت نگاری ہے۔ اس کی غرض زندگی کی نمائش ہے۔ اس کو حقیقی زندگی اور سچے واقعات پیش کرنا چاہیے نہ کہ ایسی زندگی اور واقعات جو کتابوں سے لیے گئے ہوں۔ ۱۵

اس اقتباس سے ایک امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ ناول کی واحد شہخت اس کی حقیقت نگاری ہے۔ یعنی ناول زندگی کے حقیقی واقعات سے جس قدر قریب ہوگا اتنا ہی کامیاب ناول قرار پائے گا۔ ناول اور زندگی کے گہرے تعلق کی وضاحت، نسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں ناول کی تعریف کے ضمن میں یوں کی گئی ہے:

A fictitious prose narrative of tale or considerable length (now usually one long enough to fill one or more volumes) in which characters and actions representative of the real life of past or present times are portrayed in a plot of more or less complexity.

ناول ایک ایسا نثری بیان ہے جس میں انسانی تجربات اور رویوں کو واضح کیا جاتا ہے اور حقیقت نگاری اس کی شرط اولین ہے۔ گویا ناول میں زندگی کے بارے میں کوئی حقیقی نظریہ زندگی موجود ہوتا ہے اور ناول میں یہ نظریہ کہانی یا قصہ میں آمنت ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔ ناول کی دیگر تعریفات کا جائزہ دیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام ایک نتیجہ تک پہنچتے ہیں جسے اس مقالہ کے لیے حتمی تصور کیا جائے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

(ناول کی) تمام تعریفوں کو سامنے رکھنے سے چند باتیں برآمد ہوتی ہیں کہ ناول کا موضوع

انسانی زندگی ہے۔ ناول نگار مختلف انسانوں کے معاملات، ان کے تعلقات، ان کے احساسات، ان کی محبتوں، خفوتوں، غریبوں اور ان کے ماحول کو موضوعی یا معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ فکشن ہے۔ فکشن حقیقت کا متضاد نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ۷

ناول زندگی کے رائج تصورات یا رویوں میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے یا تبدیلی کی کوشش کرتا ہے۔ گویا ناول نہ صرف اپنے عصر کی عکاسی سے، اثر پذیر ہوتا ہے بلکہ اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ ناول کے منصب اور عصریت کے پہلو سے شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

ناول۔۔۔ انسان کے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اضافہ اس معنی میں نہیں ہوتا کہ (مثلاً) جسے علم ہندسہ میں فیثاغورث کی اشکال (Pythagorean Theorems) نہ آتی ہوں تو کوئی ناول ایسا ہو سکتا ہوگا جو اپنے قاری کو یہ علم سکھا دے۔ ناول ہمارے علم میں اس قسم کا اضافہ کرنے کا دعویدار ہے کہ (مثلاً) ہم اس سے انسان کی صورت حال، یا انسانی روح یا انسانی دماغ میں واقع ہونے والی باتوں کے بارے میں کچھ روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً ”گنودان“ (پریم چند) سے ہمیں اعداد و شمار تو نہیں مل سکتے کہ کسی گاؤں میں کتنے انسان مقرض تھے، اور ان کا مجموعی قرض کتنا تھا؟ لیکن یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے کسانوں کے دل و دماغ پر کیا گزرتی ہوگی، ان کا آپسی تعامل کیسا ہوتا ہوگا وغیرہ۔ یعنی ”گنودان“ کے ذریعہ ہم مقرض کسانوں کی شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ۸

ناول مبصر حیات ہے۔ زندگی کے گونا گوں مناظر اور مظاہر، سماجی ماحول کے مسائل، معاشرتی حدود و قیود، تاریخی تناظر، سیاسی و ثقافتی اور تمدنی صورتحال کی عکاسی ناول کا موضوع ہوتے ہیں۔ یعنی ناول کا مطالعہ محض تفریح طبع کی چیز نہیں بلکہ ناول میں انسانی زندگی کا تہذیبی، تاریخی، تمدنی اور نفسیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ناول کا فن تفصیل، صراحت اور جزئیات نگاری کا فن ہے۔ ناول میں فن کار کو گہرے اور شدید احساس کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ موضوع زندگی کو تمام جزئیات کے ساتھ پیش کر سکے۔ ناول میں زندگی کی مکمل عکاسی کے کیا معنی ہیں؟ اس کی وضاحت مصنفین ”ناول کیا ہے؟“ اس طرح کرتے ہیں:

ناول زندگی کا نقشہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اس ناول نگار نے کسی زندہ کردار کا ہو بہو نقشہ پیش کر دیا ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ ناول کا مواد وہ زندگی ہے جس کو اس نے، اپنے احساسات و خیالات کے مطابق پیش کیا ہے۔ ۱۹

ناول نگار کا مشاہدہ بلکہ نظریہ حیات ناول کی تشکیل میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ناول انسانی زندگی کا بھرپور مطالعہ ہوتا ہے۔ یعنی ناول محض زندگی کے اہم واقعات کا بیان نہیں بلکہ ناول نگار کے تجربے اور مشاہدے سے اخذ کردہ زندگی کی ایسی حقیقی تصویر کا اظہار ہے جو خارج میں بھی محسوس کی جاسکے اس طرح ناول زندگی کی تصویر محض نہیں رہتا بلکہ تفسیر حیات بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر سراج الزمان کا خیال ہے:

(ناول میں) زندگی کی عام حقیقتوں کی سچائیاں ایسے انداز میں واضح کی جاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو اور گہرا شعور ہو جائے۔ اس کے کردار غور و فکر کے لیے زندگی کا ایسا قماش (Pattern) پیش کرتے ہیں جو زندگی کا مماثل نہیں بلکہ زندگی کی سچائیوں کا ترجمان ہے۔ ناول زندگی کی کاربن کاپی بلکہ زندگی کے ایسے تصور کا اظہار ہے جس نے ان سچائیوں کی عمومیت کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ۲۰

ناول اپنے تخلیق کار کے تجربے اور مشاہدے کا پھول ہوتا ہے۔ اچھا ناول حیات و ممات کا گہرا ادراک مہیا کرتا ہے۔ ناول نگار کا سبق ہر وقت معروض میں موجود زندگی سے ہوتا ہے۔ زندگی کو کیسے ہونا چاہیے یا زندگی کیسی ہوتی ہے، یہ سب تصویریں ناول نگار اپنے عین مشاہدے اور وسیع تجربے کے ذریعے دکھاتا ہے۔ لیکن زندگی کے بیان میں تخلیق کار واعظ کا روپ نہیں دھارتا بلکہ اپنا نقطہ نظر کرداروں کے مکالمہ اور دیگر ذرائع کی کیفیت کے ذریعے سامنے لاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

ناول زندگی کا جز نہیں کل ہے یہ، یک یا ایک سے زیادہ زمانوں کا عکس پیش کرتا ہے۔ یعنی اس میں ایک وسیع سیاسی، معاشی اور معاشرتی، تہذیبی زندگی کو سمیٹنے کی غیر معمولی قوت ہوتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ناول نگار اپنے مخصوص وژن یا نقطہ نگاہ سے پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ گویا ناول ایک اہم اور بڑی صنف ادب ہے جو ہمیں زندگی کی بصیرت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ۲۱

درج بالا اقتباس سے ناول اور عصری آگہی کے عناصر کے باہمی تعلق کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ ناول جس زندگی کو اپنے پھیلاؤ کا حصہ بناتا ہے وہ زندگی ایک یا ایک سے زائد عہد پر محیط ہو سکتی ہے۔ ناول زندگی کے وسیع تاثر میں تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنالیتا ہے اور تمدن، تہذیب اور سیاست کو بھی۔ اور ناول جس عہد کو موضوع بنائے گا اس کی روح عصر بھی اس سے صاف جھلکے گی۔ ناول ہی عصریت کے اظہار کا بہترین نمائندہ ہے۔ ناول میں عصریت کے اظہار کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ناول تاریخ، نفسیات، تمدن، تہذیب اور سیاست و معاشرت اور فلسفہ و دیگر عمرانی علوم کا بدل ہے لیکن ناول کا پھیلاؤ اتنا وسیع ہے کہ اس میں یہ تمام علوم سما جاتے ہیں۔ بلکہ یہ تمام علوم اپنی مخصوص حدود و قیود کے باعث زندگی کے بطنوں کے بہت سے راز افشا نہیں کر سکتے فقط ادب ایسا ذریعہ ہے اور بالخصوص ناول جو زندگی کی ہمدردی کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ بقول امجد طفیل

معاصر عالمی صورت حال سمجھنے کے لیے جہاں دیگر علوم و فنون ہماری مدد کر سکتے ہیں وہاں ادب ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم عالمی صورت حال کے گوشوں تک بھی رسائی حاصل کر سکتے ہیں جہاں تک دیگر علوم اپنی جکڑ بند یوں کے باعث پہنچنے سے قاصر ہیں۔ ۲۲

ادب اور بالخصوص ناول کسی بھی خاص عہد جس میں وہ تخلیق ہوا ہو یا جسے اس نے موضوع بنایا ہو، کی معاشرت کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ بہترین ناول کچی زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور ناول کا قصہ حقیقی زندگی سے ہی اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ناول حقیقت نگاری کا مرفوع ہوتا ہے اور ناول میں حقیقت نگاری کیسی ہوتی ہے اس کی وضاحت، بیچ جی ویلز کے حوالے سے ڈاکٹر احراز نقوی نے یوں کی ہے:

در اصل یہ حقیقت نگاری مشاہدہ اور ذہنی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا میں یہ حقیقت نگاری نہیں پیدا ہوتی بلکہ زندگی اور تسکین کے گہرے مطالعہ اور عمیق تجزیہ سے پیدا ہوتی ہے۔ عصری بیانات اور معاشی رجحانات سے زندگی اپنی رفتار میں متغیر ہوتی رہتی ہے اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ناول نگار فرد کے ذریعے انسانی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ انسانوں کو اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح کہ وہ ہوتے ہیں۔ ۲۳

ناول میں زندگی اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ناول نگار سماجی رشتوں میں پوشیدہ معنویت کو محسوس کرتا ہے اور زندگی کے پہ در پہ واقعات کو اپنے تجربے کا حصہ بناتا ہے اور پھر اپنے مشاہدات کو اپنے تخلیقی عمل میں ڈھال کر ناول کا روپ دیتا ہے۔ اہستہ انسانی مشاہدات کی بساط جتنی بھی وسیع ہوگی اس کی ایک حد ہے سو مشاق ناول نگار اپنی حدود سے آگاہ ہوتا ہے اور سماج سے کشید کیے گئے تجربات اور مشاہدات کو فنی پختگی سے بیان کی گرفت میں لے آتا ہے ورنہ دوسری صورت میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً رد ناول نگاری میں پریم چند ایک حقیقت نگار ناوں نگار ہیں۔ وہ جب دیہاتی زندگی کا منظر دکھاتے ہیں تو بہت کامیاب رہتے ہیں لیکن جب وہ اپنے کرداروں کو لے کر کسی قریبی شہر سے ہی گزرتے ہیں تو خود بھی کرداروں کی طرح بھٹک پاتے ہیں۔ مثلاً ”گنودان“ کا بہترین حصہ وہی ہے جہاں تک دیہات کی منظر کشی ہے مگر ”ہوری“ کے جیسے ”گوبر“ کے شہر تھے ہی پریم چند شہر کی سی و سماجی زندگی کی عکاسی کرنے لگتے ہیں تو مشاہدے کی کمی اور تجربے کی عدم موجودگی کے باعث شہر کے تمام کردار غیر حقیقی نظر آتے لگتے ہیں۔ ایسی ہی مثال ”نسبہ آزاد“ اور ”امراؤ جان ادا“ سے بھی دی جاسکتی ہے۔ یعنی ناول نگار کا اپنے موضوع عہد کے تمام رجحانات، فکریات، رویوں اور معاشرت کی دیگر کیفیتوں سے کما حقہ گام ہونا ضروری ہے ورنہ بقول ڈاکٹر عبد السلام جہاں ناول نگار ایسی زندگی اور ایسے ماحول کے بارے میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے جس سے کہ اسے کما حقہ واقفیت نہ ہو تو وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ناکام رہتا ہے۔ مشاہدے اور تجربے کی کمی کو کوئی چیز پورا نہیں کر سکتی۔ ۲۴

ناول اپنے اس دور کی مکمل تاریخ ہوگا جو دور اس کا موضوع ہوگا۔ اپنے موضوع عہد کی کامل تصویر ناوں کا بنیادی مقصد ہے اس میں اپنے موضوع عہد کے افکار و خیالات، قوانین، رسوم و رواج، عادات و اطوار، اشخاص کا رہن سہن، تصور مذہب و زندگی، نفرت و محبت کی نئی تصویریں نظر آتی ہیں۔ جہاں ناول نگار محض تخیل کو بروئے کار لائے گا وہ فن ناول نگاری سے دور جا پڑے گا ورنہ محض شاعری کرنے لگے گا۔ علی عباس حسینی اس امر کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

ناول نگار تخیل محض سے کام لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے قصے کی بنیاد روزمرہ کی زندگی ہوگی، یہی ہماری آپ کی دلچسپیاں اور تفریحیں، پریشانیوں اور مصیبتیں، بزدلیاں اور جراتیں، کامیابیاں اور ہزیمتیں، نارک مزاحیاں اور نخوتیں، سرگرنیاں اور مروٹیں، مہربانیاں اور کدورتیں۔ وہ ہمارے افعال و کردار کی توضیح، توجیہ و تھیل کرے گا۔ اس کی غرض کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ”ادب برائے ادب“ نہ ہوگی۔ اس کا مضمون نظر ہر آن ”دب برائے زندگی“ ہی رہے گا۔ ۲۵

واقیعت نگاری اور حقیقت نگاری کے باوجود چونکہ ناول کی بنیاد قصہ یا جہاں پر ہوتی ہے سو تخیل کی آمیزش کے بغیر

تحریر ایک خشک تاریخ بن کر رہ جائے گی یا محض صحافتی واقعہ نگاری کا درجہ اختیار کر لے گی۔ کہانی یا قصہ کی دلچسپی کا انحصار بہر حال تخلیق کار کے تخیل کا مرہون منت ہے۔ جیسا کہ ”کشاف اصطلاحات تنقید“ میں وضاحت کی گئی ہے

ناول بلا خر قصہ کہانی ہی کی ایک شکل ہے۔ چنانچہ ہر کہانی کی طرح ناول میں بھی تخیل کی اہمیت مسمرہ ہے۔ مصنف خواہ اپنے تجربات، مشاہدات یا تاریخی مواد پر اپنے ناول کی بنیاد رکھے پھر بھی وہ تخیل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فطرت و واقعات کو ادبی تقاضوں اور فنی ضروریات کے مطابق ڈھال کر پیش نہیں کرتی۔ اگر ناول خالص تاریخ ہو تو ناول اور تاریخ میں فرق ہی کیا رہا؟ ۲۶۹

یہاں ایک اور امر بھی قابل توجہ ہے کہ جب یہ کہہ جاتا ہے کہ ناول کا موضوع زندگی ہے تو بالعموم اس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ ناول زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لے گا۔ یہ نقطہ نظر کلی اعتبار سے درست نہیں۔ کیونکہ فن کار گو کہ ناول کی بنیاد زندگی کے واقعات پر ہی رکھے گا لیکن وہ کرداروں کی یا سماج کی مکمل عکاسی سے بوجہ قاصر رہے گا جب یہ ہے کہ اس کے کردار اور اس کے تجربے میں آیا ہوا سماج مکمل سماج نہیں بلکہ سماج کا ایک جز ہوگا۔

ناول زندگی کی وسعت کو اپنے پھیلاؤ میں سمیٹتا ہے۔ یعنی زندگی کو ادب کے سانچے میں یوں ڈھالنا کہ اس کی وسعت اور گہرائی اس میں سما جائے۔ ایب طرف اصناف ادب میں فقط ناول کے پاس ہی ہے۔ زندگی اپنا ایک پھیلاؤ رکھتی ہے۔ گہرائی اور الجھنوں کی حامل بھی ہے اور اس کی حدود بے کنار ہیں۔ سوز زندگی کے ناپہلوؤں پر جتنا بھی غور کیا جائے اس کی حدود میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تخلیق کار کی قوت مشاہدہ کا امتحان شروع ہو جاتا ہے کہ وہ اس پھیلاؤ اور الجھن کو کتنی خوبی سے اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بناتا ہے۔ لیکن مکمل اور جامع زندگی اور اس کے موضوعات کی وسعتوں اور بولمونی کو یک تخلیق کار کے لیے ممکن نہیں کہ وہ یہ سب کچھ اپنے حیطہ تخلیق میں لے آئے۔ وقار عظیم اہل قلم کے لیے دیکھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

ناول نگار پوری انسانی زندگی کے پھیلاؤ، گہرائی اور الجھن کا احاطہ کرنے پر قادر نہیں۔ یہ بات کسی ایک آدمی کے بس کی ہے ہی نہیں۔ اس لیے جو کوئی زندگی کے مشاہدے اور مصوری کا بھرپور حق ادا کرنا چاہے اسے انسانی زندگی کے کسی محدود پہلو کا انتخاب کرنا پڑتا ہے یوں اس محدود پہلو میں بھی زندگی کی وہ بنیادی صفات (پھیلاؤ، گہرائی اور پیچیدگی) موجود ہوتی ہیں اور اس لیے فنکار کی عظمت کے امتحان کے لیے زندگی کا یہ محدود اور مخصوص پہلو بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو پوری زندگی۔ ۲۷

اس جائزے سے یہ نتیجہ نکالنا مقصود تھا کہ کسی خاص عصر کی شناخت اس عصر کے حساس لکھنے والوں کی تخلیقات میں ہی جوہر ہوگی۔ جدید عہد میں ناول کی صنف آنے کے بعد کسی بھی عصر کا واضح اخبار اس صنف میں ہونے لگا ہے۔ اردو ناول نگاروں کے ناول اس سر کے گواہ ہیں کہ وہ اپنے عہد کے مرد و زن، فکار و خیالات کے عہد وہ اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کے بھی آئینہ دار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تک، الو قار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷

- ۲۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بکس، ملتان، طبع اوس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۶
- ۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، معتقدہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۳۴
- ۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، ص ۳۵
- ۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، ص ۳۵
- ۶۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، ص ۳۵
- ۷۔ حفیظ صدیقی، ابوالعجاز، کشف تنقیدی اصطلاحات، ص ۷۷
- ۸۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تنقید اور تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۸
- ۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، ص ۳۵
- ۱۰۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقید اور تاریخ، اردو اکیڈمی، لاہور، ہار اول، ۱۹۵۱ء، ص ۱۰
- ۱۱۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۵
- ۱۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، سید نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟ اردو اکادمی، لاہور، مارچ ۱۹۶۴ء، ص ۱۵
- ۱۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان اور ناول، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۳
- ۱۴۔ ابوالیث صدیقی، ڈاکٹر، اردو ادبی تاریخ کا خاکہ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع دس، س ن، ص ۱۶۸
- ۱۵۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ص ۳۸
- 16 Encycloppedia Britanica, Nepolean Qzanalyois Vol 16, p 673
- ۱۷۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، فن ناول نگاری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵
- ۱۸۔ شمس الرحمن فاروقی، سحری، شہابی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اول، نظری مباحث، قومی کونسل برائے فروغ ادب و زبان، نئی دہلی، طبع اول، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲۶، ۳۲۷
- ۱۹۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، سید نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟ ص ۶۲
- ۲۰۔ مسیح الزمان، ڈاکٹر، ناول کی تنقید، مشمولہ شب خون، مدیر شمس، الرحمان فاروقی، لاہور، مارچ ۱۹۶۷ء، ص ۵
- ۲۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادگی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، طبع دوم، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰
- ۲۲۔ امجد طفیل، ادب کا عالمی دریچہ Narratives, PVT, Ltd، ۲۰۱۴ء، ص ۷
- ۲۳۔ احراز فتویٰ، ڈاکٹر، چند رتن ناتھ سرشار، حیثیت ناول نگار، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، طبع اول، ۲۰۰۶ء، ص ۸۵
- ۲۴۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، فن ناول نگاری، ص ۲۲
- ۲۵۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ص ۴۲
- ۲۶۔ حفیظ صدیقی، ابوالعجاز، کشف تنقیدی اصطلاحات، ص ۱۹۲
- ۲۷۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تک، ص ۶۹

ہندوستان کی تہذیبی تاریخ اور قرۃ العین حیدر

ڈاکٹر رحمت علی شاد

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال والدین سید سجاد حیدر میدرم ورنڈرز ہراسجاد کے گھر ۲۰۔ جنوری ۱۹۲۸ء کو جنم لینے والی اردو فکشن کی عظیم ادیبہ قرۃ العین حیدر کو ایک نابغہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ انہیں ابتدا ہی سے ایسی آسائشیں میسر آئیں جو بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوا کرتی ہیں۔ معاشی خوش حالی، مہذب ماحول، آزادی فکر، خاندانی حسب و نسب، بہت ہی خوب صورت مقامات کی سیر، جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے سے میل جول، گھر میں کتب کی بہتات انہیں تو قرۃ العین بنائی تھی۔ ان کی شخصیت اور ان کے تخیل میں تنوع اور ہمہ جہتی موجود تھی۔ انہوں نے پاک و ہند ہی نہیں بلکہ فکر انسانی کو جتنا کچھ دیا وہ انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

مصنفہ نے چار افسانوی مجموعے ستاروں سے آگے ۱۹۴۷ء، شیشے کے گھر ۱۹۵۳ء، پت جھڑکی آواز ۱۹۶۶ء اور روشنی کی رفتار ۱۹۸۲ء، پانچ ناولت پیتا ہرن ۱۹۶۰ء، چائے کے باغ ۱۹۶۳ء، ہاؤسنگ سوسائٹی ۱۹۶۶ء، اگلے جنم مو ہے بیٹا نہ کچھ ۱۹۷۷ء اور دلربا ۱۹۷۶ء اور سات ناول میرے بھی صنم خانے ۱۹۴۹ء، سفینہ غم دس ۱۹۵۲ء، آگ کا دریا ۱۹۵۹ء، آخر شب کے ہم سفر ۱۹۷۹ء، کار جہاں دراز ہے (تین صدیوں) ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۹ء، ۲۰۰۲ء، گردش رنگ چمن ۱۹۸۷ء اور چاندنی بیگم ۱۹۹۰ء کے علاوہ بچوں کا ادب، تراجم، صحافت نگاری، مصوری، فوٹو گرافی، فلم سازی، موسیقی، خاکہ نگاری، سفر نامے اور رپورٹاژ وغیرہ تحریر کر کے اردو زبان و ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ مصنفہ کے تخلیقی ادب نے روح عصر کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی ترجمانی کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ یعنی ان کے ہاں تاریخ و تہذیب کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ صدیوں پر محیط اس تاریخی و تہذیبی ارتقا کے سفر میں فطری تہذیبوں اور تغیرات کے زیر اثر مختلف تہذیبوں کے خدو خال اور نقوش مسلسل بننے اور بگڑتے رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مختلف تہذیبوں، جن میں ہندی تہذیب، مسلم تہذیب، مشترکہ تہذیب، مغربی تہذیب اور اینگلو انڈین تہذیب کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اردو فکشن میں دیومالا کی، مذہبی، سائنسی، فلسفیانہ، وقت کی جبریت، شعور کی رد اور تاریخ و تہذیب پر مبنی تصورات پر بحث کی ہے۔ مصنفہ کے ہاں تحقیق کے اہم محرکات دو عالمی جنگیں، تقسیم ہند، محبوب باپ کی وفات کے اثرات اور بیسویں صدی کے عام ذہنی رویے ہیں۔ ان کے ہاں تقسیم ہند کے نتیجے میں مشترکہ تہذیب کے ٹکڑاؤ کے ایسے کے ساتھ ساتھ اپنا شخص اور اپنی جڑوں کی تلاش کا عمل بھی نظر آتا ہے۔ وہ خود لکھتی ہیں:

”ہم جہاں رہتے ہیں، جہاں ہماری جڑیں ہیں، ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں وہ خطہ

جس نے ہمیں جنم دیا ہمیشہ ہمارا ذاتی معاشرہ ہے گا۔۔۔۔۔ پریشانی یہ ہے کہ نئی نسل جو کرشن چندر کا

نام بھی سننے کو تیار نہیں اس لیے کہ وہ ہندو ہے اسے اردو کے لسانی اور تہذیبی ورثے کے متعلق کیا بتایا

جائے گا؟ مستقبل کا پاکستانی ادب کس ورثے کو اپنا گردانے گا؟“۔ (۱)

تاریخ روایات کہن اور نقوش پاریدہ کا ہی خزانہ نہیں بلکہ ذہنی و فکری، جذباتی و تہذیبی اور معاشرتی و ثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے۔ بر عظیم کی سرزمین مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایسا مجموعہ رہا ہے جس میں مختلف تہذیبوں کی کشمکش،

عروج و زوال، فکری تغیرات اور تبدیلیوں کی بدولت ان کے خدوخال اور نقوش بننے اور بگڑتے رہے ہیں۔ اپنے وسیع کیونوں کی بدولت مصنف نے تاریخ و تہذیب کے عروج و زوال کی داستان اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ہاں ہمیں تہذیبی تاریخ کی ایک مکمل تصویر دکھائی دیتی ہے۔ تہذیبی تاریخ کے ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک انسان مختلف ادوار سے گزر چکا ہے۔ تہذیب و ثقافت کا یہ قافلہ بڑھتا رہا اور تاریخ بنتی رہی۔ قرۃ العین حیدر کے فکرو فن میں تاریخ اور تہذیب کے متنوع رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا مطالعہ محض ایک عہد یا ایک تہذیب کا مطالعہ نہیں بلکہ کئی عہدوں اور کئی تہذیبوں پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جڑوں کی تلاش میں مصنف نے واقعہ کر بلا سے لے کر اب تک ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

”قرۃ العین حیدر اپنی جڑوں اور حقیقت کی دوسری جہات و رتبوں کی تلاش کے لیے دس کی مشعل جلا کر وقت کی اندرونی ہفت خواں طے کرتے کرتے ۴۰ء کے دمشق میں امام زید بن زین عابدین تک جا پہنچتی ہیں۔ (۲)

مصنف کا گہرا نہ قدیم و جدید کی آمیزش اور مشرق و مغرب کا حسین سنگم تھا۔ بر عظیم کا تاریخی و رشتہ تاریخی و تہذیبی یگانگت اور وحدت قرۃ العین حیدر کو بہت عزیز تھیں۔ مشترکہ تہذیبی ورثے کی تباہی کا شدید دکھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ بر عظیم کی تاریخ و تہذیب کے ساتھ ان کا جذباتی، ذہنی اور نظریاتی گھاؤ تھا اسی لیے تقسیم ہند کو انہوں نے کسی صورت قبول نہیں کیا۔ مصنف کے فن میں علیٰ تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور وہ اس تخیل کی بدولت بہت اونچی اڑتی تھیں، اس پرواز میں بعض اوقات ایسی منزلیں بھی آ جاتی ہیں کہ ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کا تہذیبی و تاریخی اور فنی و فکری تخیل بہت پیچیدہ تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا تصور تاریخ و تہذیب اور ان کا فکری کیون بہت وسیع و جامع اور واضح تھا، اسی لیے انہوں نے اپنے صفحہ ادب میں وسیع و بے دریغ دنیا بے فن کو خلق کیا۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں انسانی قدروں اور رشتوں کا زوال اور ہجرتوں کا احوال ہے وہ تقسیم کے خلاف تھیں کیوں کہ طاقت کے زور پر ہونے والی تقسیم انہیں غیر فطری لگتی تھی وہ اس لیے کہ تقسیم کی آمدھی نے ’س تہذیبی عمارت و رخت کو اکھاڑ پھینکا جو لوگوں کو اپنے اسد ف کی زمینوں اور اپنے تہذیبی و ثقافتی مراکز سے جوڑے ہوئے تھا، اس طرح سے وہ لوگ اپنی جڑوں سے کٹ گئے۔ ان کا تشخص، ان کی زبان، ان کی تہذیب اور ان کے کلچر کو تقسیم نے زبردست نقصان پہنچایا، جس سے وراثتیں ایک طرف رہ گئیں اور وارث سرحد کی دوسری طرف چلے گئے۔ اس بارے میں پروفیسر ریکس فاطمہ کی رائے ہے:

”مشترکہ معاشرت تقسیم کر دی گئی یعنی یہ دونوں ملک آدھے ہیں وراثتیں سرحد کے ایک طرف ہیں اور وارث سرحدوں کی دوسری طرف۔ اس سلسل کا کیا جرم تھا؟ یہی کہ صدیوں سے ساتھ رہنے کے باوجود تاریخ کے جبر نے انہیں علیحدہ کر دیا تھا یہ وہ جڑوں سے بچے تھے جن کی آ نول نال ایک تھی۔“ (۳)

مصنف نے وقت کو بنیادی استعارہ بنا کر ہندوستان کی تہذیب و تاریخ کو بیان کیا ہے۔ وقت اور فنا کا تصور سارے ناؤں میں ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ مصنف کے نزدیک وقت ایک ظالم و رجا بر طاقت ہے جو چیزوں اور چہروں بلکہ جو کچھ بھی اس کی پینٹ میں آ جائے بگاڑ کے رکھ دیتا ہے اسی لیے مصنف کی تحریروں میں تاریخ بھی زمانی جبر کے گر گھومتی نظر آتی ہے یعنی ہم کہہ سکتے ہیں تاریخ جو ظالم اور سفاک ہے وہ وقت کے جلو میں تہذیب کے نقوش بناتی اور بگاڑتی چلی جاتی ہے۔ وقت کے سفر کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس کے سامنے فرد کی حیثیت ایک جھکے کی سی رہ جاتی ہے یعنی ان کے کردار

تاریخی جبر کا شکار ہیں۔ وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں۔ کوئی منطق، کوئی طاقت، وقت پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ مصنفہ بتاتی ہیں:

”گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے۔ کبھی کبھی لہریں اسے بہا لے جاتی ہیں پھر اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔“ (۴)

مصنفہ کے پہلے نسلی مجموعے ”ستاروں سے گئے“ کی کائنات بہت محدود ہے۔ اس میں یادیں، رفاقتیں، دایمے خواب، خیال اور خواہشات کے پینے کا ہی دور دورہ ہے۔ ”میرے بھی صنم خانے“ اودھ کی مٹی ہوئی تہذیب و ثقافت اور تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تہذیبی بحران کا عکاس ہے، جس میں ”راستہ و پیراستہ ایوانوں میں صوفوں پر بیٹھے انقلابی مضامین لکھنے والے تعلقہ دار طبقے کی آرزوؤں، امنگوں اور خواہشوں کا الیہ بیان ہوا ہے۔ یہ سب کردار اپنی ذات کے جزیروں میں بری طرح قید ہیں اور ان کی ذات کی اسیری انہیں کھل کر اظہارِ محبت تک نہیں کرنے دیتی۔ مذکورہ ناول کا اصل موضوع دو تہذیبوں کے مابین کش مکش، تقسیم کا عمل اور فسادات ہیں۔ ”سفید غم دل“ اودھ کے تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور اعلیٰ حیم یا فتنہ لوگوں کی تہذیب و ثقافت مصنوعی، کھوکھلی اور ظاہری نمود و نمائش پر مبنی ہے۔ مذکورہ ناول ایک کمزور ناول کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ہم اسے پہلے ناول کی توسیع بھی کہہ سکتے ہیں جس میں سوانحی حالات کا آزادانہ استعمال ہے۔ ”ٹھٹھے کے گھر“ کی کہانیوں میں خواب و خواہشات اور دایموں سے پرے زندگی کی حقیقتیں، فنی بالیدگی، فنی چٹنگی اور جدید دور کی الجھی ہوئی پیچیدہ دنیا ہے۔

اردو فکشن میں سنگ میل کی حیثیت رکھنے والے ناول ”آگ کا دریا“ ہے جو ہندوستانی تہذیبی تاریخ کی تفہیم اور مکمل داستان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فنی شہکار کا درجہ بھی رکھتا ہے جو اپنے وسیع کیوس کی بدولت اردو زبان کا ایک بڑا ناول گردانا جاتا ہے۔ جس کی تعریف میں بھی اور مخالفت میں بھی بے تحاشا لکھا گیا، بہر حال یہ بات تو طے ہے کہ اس ناول سے قبل کی تخلیقات فکری اٹھان کے ایسے سرچشمے قرار دیے جاسکتے ہیں جو آگ کے دریا میں شامل ہو جاتے ہیں اور آگ کے دریا میں فن کی موجیں اپنے عروج پر ٹھٹھکیں مارتی، ڈھائی ہزار سالہ ہندوستانی تہذیبی تاریخ کو اپنے پیٹ میں لیتی ہیں۔ صدیوں پر پھیلی یہ داستان دراصل ایک طویل ہنسی سفر ہے جس کا اصل موضوع وقت اور انسان ہے۔ آگ کا دریا کی تفہیم کے لیے ہندوستانی تہذیب کے اس تاریخی سفر کو تین اہم اور بڑے ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ویدک کال سے شروع ہو کر مور یہ خاندان تک آتا ہے جو تاریخی اعتبار سے ہندو دھرم اور بدھ مت کا دور ہے۔ اس دور کا نمائندہ گوتم بھیم ہے۔ دوسرے دور وسطی اور اسلامی دور ہے جو مسلمانوں کی آمد سے لے کر مغلیہ دور کے خاتمہ تک رہتا ہے، جس کا ترجمان ابوالکھیر محمد الہ دین ہے۔ تیسرا دور جدید لکھنؤ سے تقسیم ہند تک آتا ہے۔ سرل ہیشیلے اس مشترکہ تہذیب کا نمائندہ ہے۔ ان تینوں کرداروں کے متعلق محمود فاروقی کہتے ہیں

”ناول کا تانا بانا تین کرداروں کے اطراف بنا گیا ہے۔ گوتم، کمال، سر۔ یہ نام محض تین شخصوں کے نام

نہیں بلکہ تین قوموں، تین زبانوں، تین تہذیبوں کے نام ہیں۔ ہندو مسلمان اور انگریز۔“ (۵)

”سیتا برن“ ایک ایسا ناول ہے جو عورت کی بے بسی، مجبوری اور استحصال کے گرد گھومتا ہے اس میں تاریخی و تہذیبی شعور، یادوں کی صورت میں پنہاں ہے۔ اسطوری داستان رمان میں سیتا کا برن راون کرتا ہے بالکل اسی طرح ہندوستانی معاشرے میں عورت کا استحصال مرد کرتے ہیں۔ مصنفہ کا یہ ناول خدائی، سیاہی اور سماجی گراؤ کی ایک عمدہ پیش کش ہے۔ ”چائے کے باغ“ جس میں دو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی نقاب کشائی ملتی ہے۔ ایک

طرف غریب اور مزدور طبقہ جو مشرقی پاکستان اور آسام کی سرحد پر چائے کے باغوں میں مزدوری کرتا ہے لیکن تقسیم ہند کے نتیجے میں وہ لوگ بے وطن ہو گئے کیوں کہ پاکستان والے انہیں ہندوستانی اور ہندوستان والے انہیں پاکستانی سمجھتے تھے۔ دوسری طرف طبقہ امرا ہے جو ہر قسم کی تہذیب اور اخلاقی اقدار سے عاری لوگ تھے۔ ان کی زندگیاں تضاد سے بھری ہوئی، لامرکزیت اور روحانی کھوکھلے پن کا شکار نظر آتی ہیں۔ دونوں طبقات کے مابین زندگی کی اصل روح (سکون) کا فقدان نظر آتا ہے۔ "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اقتصاد کی صورت حال ہے جس میں تہذیب و ثقافت کے شکنجے، جاگیردار طبقے کا زوال، نو دولتیں طبقے کا عروج اور سرمایہ دار طبقے کی ضمیر فروری اور بے حسی کا احوال ہے۔

"دلربا" ناولٹ منٹے ہوئے جاگیردارانہ سماج کی داستان ہے جس میں ہندوستانی شوہر کی دنیا کے ارتقا و زوال کو بیان کیا گیا ہے۔ دلربا کا کردار دوسلوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے جو ایک طرف زوال پذیر جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری طرف ایک طوائف گھنار کے ساتھ مل کر حمیدہ سے دلربا بن جاتی ہے۔ "اگلے جنم مو ہے بھیا نہ کیجیو" اودھ کے زواں آمادہ معاشرے میں یہ ہندوستان کی مجبور و بے بس، مفلس اور کچلی ہوئی عورت کی دل دہا دینے والی داستان غم ہے۔ یہ ایک بد نصیب کنبے کی کہانی ہے۔ اس خاندان نے تلخ زندگی گزاری۔ اس تجربے نے ان کے لہجے میں تلخی پیدا کر دی یہاں تک کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے کے متعلق سوچنے لگتے ہیں۔ امجد طفیل، مصنفہ کے ناولٹوں پر رائے دیتے ہیں۔

"ان کے ناولٹ دلربا، سیتا برن، چائے کے باغ اور اگلے جنم مو ہے بھیا نہ کیجیو میں معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں، مربوط اخلاقی اقدار سے عدم اطمینان، جدید مادی و صنعتی ترقی کی وجہ سے انسانی دکھوں کے کم نہ ہونے جدید عورت کے ایسے اور تشخص کی تلاش جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا اور آخر میں قرہ العین حیدر نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان کے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے، یہاں وہ ہمیں وجودی فلسفے سے متاثر نظر آتی ہیں"۔ (۶)

"پت جھڑکی آواز" میں موجود تنقیدی زاویے مصنفہ کی فکری ثلاث وقت، ہجرت اور انسان کو بیان کرتے ہیں جن میں شامل تنہائی، دکھ، کرب، جلد وطنی، انسانی استحصال، عورت کی سماجی حیثیت، مشترکہ تہذیب کا انہدام، سیاسی، معاشی صورت حال اور ان سے پیدا ہوتی مجبوریاں ہیں۔ مذکورہ افسانوی مجموعے میں فنی استحکام، فنی باریک بینی اور فنی پختگی کا عمل نمایاں ہے۔ "آخر شب کے ہم سفر" اس ناؤں میں تاریخ اور وقت کے تناظر میں حیات و کائنات کی فلسفیانہ پیش کش ہے۔ یہ بنگال کے نورسٹوں کی وہ اندہ دہاک داستان ہے جو بنگلہ دیش میں عصر حاضر کی بے مثال الم ناک پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ مصنفہ نے انقلابی نظریات اور وہشت پسند تحریکوں سے وابستہ لیڈروں کا بھنڈا پھوڑ کر ان کی اصیت سامنے لانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ جب تک اس کے پاس کچھ نہ تھا وہ سرمایہ داروں کے خلاف زہرا گلتے رہے لیکن جو نہیں ان کے حالات تبدیل ہوئے وہ ابن الوقت بن گئے۔

"کار جہاں دراز ہے" تین جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم سوانحی ناول ۱۲ صدی سے لے کر عہد جدید تک کے مصنفہ کے خاندانی حالات و واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مصنفہ نے ان حالات و واقعات کو س طرح ایک لڑی میں پرویا ہے کہ لڑی کے ایک سرے پر وہ خود موجود ہیں و دوسرا سرا صدیوں پہلے میدان کر بد تک جاتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے خاندان کے تناظر میں صدیوں پر محیط برعظیم کی سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ بصورت "کار جہاں دراز ہے" بیان کی ہے۔ "روشنی کی رفتار" میں شامل افسانوں میں رومانویت سے حقیقت پسندی تک کا یہ سفر موضوعاتی تنوع کے ساتھ

مذکورہ کہانیوں کے منظر نامے کو مختلف جہتوں سے آشکرتا ہے۔ علمی، تاریخی اور تہذیبی عوامل مصنف کے افسانوں کا خاصہ ہیں۔ سابقہ معاشروں کی دو صورتیں جو ہماری تاریخ و تہذیب اور ثقافت کا حصہ رہی ہیں مگر وقت کی جبریت کی بدولت نئی صورت اختیار کرتی گئیں وہ تمام صورتیں ان کہانیوں میں بہترین انداز میں موجود ہیں۔ ”گردش رنگ چمن“ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد معاشرے میں طبقاتی حد بندی اس طرح وجود آئیں کہ بادشاہ فقیر ہو گئے اور فقیر بادشاہ بن گئے۔ سب کچھ تبدیل ہو گیا اور جس کی زد میں آ کر شریف گھرانوں کی لڑکیاں طوائف بننے پر مجبور ہو گئیں۔ مصنف نے اس ناول میں تقدیر کے نکتے اور جبر و نسل در نسل منتقل ہوتے دکھا کر انسان کو مجبور محض اور چار ہوتے دکھایا ہے۔ تہذیبی تبدیلیوں کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کی بدولت مذکورہ ناول کا بنیادی موضوع تاریخ و تہذیب ہی ہو سکتا ہے مصنف نے اس کہانی کے ذریعے اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش کی ہے۔ وقت، تاریخ اور تہذیب کی آمیزش اور اپنے تاریخی شعور کی بدولت انہوں نے کئی نسلوں کی کہانی بیان کی ہے۔ ”چاندنی بیگم“ میں مصنف نے زمین اور اس کی ملکیت کے جھگڑوں کو بنیادی استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ مذکورہ ناول کا بنیادی ڈھانچہ زیادہ منظم اور مربوط نظر نہیں آتا حتیٰ کہ ناول کی ہیروئن چاندنی بیگم بھی اپنے مفقودی کردار کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ مذکورہ ناول میں اسے مجبور، بے بس اور غریب بنا کر پیش کرنے کا مقصد غریبوں کے ساتھ امرا کے رویوں کو منظر عام پر لانا ہے اور دولت کے بغیر انسان کی مجبوری بے بسی اور بے توقیری کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ ناول روایتی اور فارمولائی ناول نہیں ہے اس لیے یہ ناول ہیروئن کے جسمانی وجود کے بغیر ہی محض اس کی یادوں کے ذریعے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں کے متعلق ڈاکٹر رشید مجتبیٰ لکھتے ہیں

”قرۃ العین حیدر ایک صاحب اسلوب ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں کے سفر کا آغاز مرے بھی صنم

خانے سے ہوا تھا اور یہ ناول اپنی طرز کا ایک نیا تجربہ تھا۔ ان کا شاعرانہ اسلوب آگ کا دریا سے ہوتا ہوا

گردش رنگ چمن تک اپنی کئی بہاریں دکھاتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک تخلیقی زبان لکھتی تھیں۔“ (۷)

قرۃ العین حیدر ایک ہمہ جہت شخصیت تھیں۔ جیسے جیسے ان کی تحریروں کو پڑھتے جائیں دیسے دیسے فکر و شعور کے نئے نئے دروازے ہوتے چلے جاتے ہیں کیوں کہ ان کا کام اتنی وسعت، بولکھنی اور اتنے پھیلاؤ کا حامل ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انہوں نے متنوع جہات میں طبع آزمائی کر کے اپنی خدمات ذہنی کی بدولت اپنے جینون رائٹر ہونے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ بہت ساری اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے باوجود نیائے ادب میں بحیثیت گلشن نگار ہی ان کا تشخص بھر کر سامنے آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بڑے محنت و انداز میں زندگی کی ابدی صدقوں کی طرف سفر کیا ہے اور وہ سفر جو اہند لکوں، واہموں اور خواب و خواہشات سے شروع ہوا تھا وہ حقیقت اور فنی پختگی کا روپ دھار کر مصنف کے فکری کینوس کو وسیع تر کر دیکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی 80 سالہ زندگی میں بہترین ادب تخلیق کرتے ہوئے اردو گلشن کے میدان میں تدریجی ارتقا کے حوالے سے کچھ نئی چوٹیاں سر کی ہیں کیوں کہ ان کے ہاں سماجی آگہی اور تاریخی بصیرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے مطالعے، تجل اور تاریخ و تہذیب سے وابستگی کے متعلق ڈاکٹر مجتبیٰ لکھتے ہیں

”ان کی تاریخی تہذیبی معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ جہاں انہوں نے جدید انسان کو مختلف

حیثیتوں سے عصری حقائق زندگی کا ترجمان بنا کر پیش کیا وہیں ان کے بلند پرواز تخیل نے وقت کی

دیواریں پھاند کر صدیوں پرانی تاریخ و تہذیب و کلچر کا احاطہ بھی کر لیا۔ ان کی فکر راسا یونان، مصر،

بابل، چین ایران، مغرب و مشرق، شمال و جنوب سب پر محیط ہے۔ وہ اساطیری قصوں،

روایت، عقائد، توہمات اور حکایات کے ذریعے ہماری تہذیبی جڑوں کی تلاش کرتی ہیں۔ (۸)

قرۃ العین حیدر نے اپنے منفرد اسلوب کی بدولت اردو فکشن میں موضوعاتی وسعت پیدا کی ہے۔ وقت، تاریخ و تہذیب کی آمیزش اور اپنے تاریخی شعور سے انہوں نے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کی کہانی بیان کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے مطالعے کی وسعت اور مشاہدے کی باریک بینی، ان کے تخلیقی عمل میں شامل ہو کر ان کے اسلوب کو مزید تقویت بخشتی ہے۔ واقعات اور کرداروں کے حوالے سے ایک عہد کو دوسرے عہد سے وہ اس طرح آہستہ کرتی تھیں کہ ان کا یہ فن ان کا منفرد اسلوب بن جاتا ہے۔

ساری زندگی صرف اور صرف وہ کی خدمت کرنے والی اور متعدد اعزازات و انعامات سے نوازی جانے والی قرۃ العین حیدر، آخر کار ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء کی رات ساڑھے تین بجے کیلاش ہاسپٹل نویڈ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں اور انہیں جامعہ میا سہیلہ نئی دہلی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا جہاں بہت سی علمی و ادبی عظیم شخصیات دفن ہیں جن میں مختار احمد انصاری، عابد حسین، صالحہ عابد حسین، غلام السیدین، غلام الشکیلین، پروفیسر نور الحسن، بیگم انیس قدوائی، شفیق الرحمن قدوائی، سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر شامل ہیں۔ مصنفہ کو نکھنو کے حسان بن سلیم یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

وہ وجہ افتخار جہاں سے گزر گئی
فکشن کی تاجدار جہاں سے گزر گئی
حسان جس کے ہاتھوں میں فن کی لگام تھی
وہ فن کی شہسوار جہاں سے گزر گئی

حوالہ جات

- ۱۔ قرۃ العین حیدر، "نقوش" لاہور خاص نمبر دسمبر ۱۹۵۹ء، ص: ۲۹۳
- ۲۔ فتح محمد ملک، مضمون "قرۃ العین، اپنی تلاش میں" مشمولہ "قرۃ العین حیدر۔ خصوصی مطالعہ" (مرتبہ) ڈاکٹر عامر سہیل، بکس ملتان ۲۰۰۳ء، ص: ۵۵۹
- ۳۔ رئیس قاطر، پروفیسر، "قرۃ العین حیدر کے افسانے، ایک تنقیدی تجزیاتی مطالعہ" انجمن ترقی اردو کراچی ۲۰۱۰ء، ص: ۸۹
- ۴۔ قرۃ العین حیدر، "آگ کا دریا" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۰۵
- ۵۔ محمود فاروقی، مضمون "قرۃ العین حیدر کے دو کردار" مشمولہ "قرۃ العین حیدر اردو فکشن کے تناظر میں" از حسن ظہیر (مرتبہ) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۲۰۰۷ء، ص: ۱۳۳
- ۶۔ امجد طفیل، "قرۃ العین حیدر شخص کی تلاش میں" پاکستان بکس اینڈ سٹریسی سائڈ ٹڈز، ۱۹۹۱ء، ص: ۹۵
- ۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، مضمون "گردش رنگ چمن، ایک جائزہ" مشمولہ "قرۃ العین حیدر، خصوصی مطالعہ" (مرتبہ) ڈاکٹر عامر سہیل، بکس ملتان ۲۰۰۳ء، ص: ۳۷۷
- ۸۔ گلہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، "اردو مختصر افسانہ، فنی و فکری مطالعہ" ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نومبر ۱۹۸۶ء، ص: ۱۱۹

جدیدیت: مباحث و مسائل کا ایک تحقیقی تناظر

نیاز سوانی

”جدیدیت“ کا لفظ ”انگریزی اصطلاح“ ”ماڈرنٹی“ (Modernity) کے اردو متبادل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک زبان کی کسی اصطلاح کا بعینہ مفہوم کسی دوسری زبان کا کوئی ایک لفظ مکمل طور پر ادا نہیں کر سکتا، خاص طور پر ایسی اصطلاحات جو اپنا خاص تاریخی، سماجی اور تہذیبی پس منظر رکھتی ہیں، عام طور پر ناقابل ترجمہ ہوتی ہیں۔ کسی اجنبی زبان کے الفاظ و اصطلاحات کا مطلب معلوم کرنے کا عام اور سادہ طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان میں اس لفظ کا متبادل اور ہم معنی لفظ تلاش کیا جائے۔ بد قسمتی سے یہ طریقہ علمی حلقوں، خصوصاً فلسفیانہ موضوعات اور اصطلاحات کی تفہیم کے ضمن میں غیر معتبر قرار پایا ہے۔ تہذیبی و تاریخی تصورات کا اصل زبان میں باقاعدہ اور دقت نظر سے مطالعہ کیے بغیر محض سادہ ترجمے کی بنیاد پر استعمال، ان تصورات کی تفہیم کو نہ صرف مشکل بنا سکتا ہے بلکہ مزید پیچیدگی اور غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ فرڈی نینڈ ڈی سوسیر (Ferdinand de Saussure، ۱۸۵۷ء-۱۹۱۳ء) نے لسانی نظام کو ایک معاشن عمل کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس کے پیش کردہ تصور *Langue* کے مطابق زبان کے داخلی اصول اور شعریات ایک طویل عرصے بعد وضع ہوتے ہیں۔ ہر زبان اپنے دخل میں نشانات و علامات اور تصورات کی لگ دنیا اور پس منظر رکھتی ہے۔ تاریخ، جغرافیہ اور تہذیب کے اختلاف کے سبب زبانیں ہر جذبے کے بیاں کے لیے اپنا مختلف اور منفرد پیرایہ اظہار رکھتی ہیں۔ خوشی اور غم کے تجربات اور واقعات کی روایتی سے فہم اخذ کرنے کا انداز ہر زبان کا جدا ہے۔ کسی زبان میں ترجمے کے ذریعے اصل زبان کے متن کے بارے میں جو معنویات مبیہ ہوتی ہیں وہ باواسطہ ہوتی ہیں اور ان پر کلیتاً انحصار نہیں کیا جاسکتا، ترجمے کے الفاظ اور جملے اگر اصل عبارت سے قریب ہوں تب بھی وہ زیادہ سے زیادہ جزوی مطابقت ظاہر کرتے ہیں۔ وگنسن (Ludwig Wittgenstein، ۱۸۹۸ء-۱۹۵۱ء) کا کہنا ہے کہ کسی مخصوص طرز زندگی یا تصور کا اس کی زبان کے باہر سے تجزیہ ناممکن ہے، اسے صرف اندر سے، اس کی اپنی اصطلاحات اور لفظیات کی رو سے سمجھا جاسکتا ہے۔

آج کل کی زبان زد عام اصطلاحات، بیک ہیومن رائٹس (Basic Human Rights)، کانسنیشن (Constitution)، فریڈم (Democracy)، آرڈی ہو کریسی (Democracy) کو بالترتیب بنیادی انسانی حقوق دستور، آزادی اور جمہوریت کی شکل میں ترجمے کے ذریعے اپنالایا گیا ہے مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ان مفہیم پر محض سادہ ترجمے کی بنا پر حکم لگانا عمود غلط فہمیوں کی بنیاد بنتا ہے۔ جدیدیت کی اصطلاح کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے۔ اس طرح کی مغربی اصطلاحات ہمارے سیاق و سباق اور تہذیب و ثقافت میں استعمال نہیں ہوئیں اور نہ ہی یہ اصطلاحات ہمارے تاریخی اور علمی شعور کا حصہ ہیں لہذا ان کی تفہیم دقت نظر اور تاریخی تناظر کے ادراک کے بغیر نامکمل رہے گی۔ جدیدیت کی اصطلاح یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے دوران پرورش پانے والی ایک بہت بڑی تبدیلی کی مظہر ہے جو اٹھارہویں صدی میں عروج پر پہنچی۔ کہ اس دور میں تہذیب سے برآمد ہونے والی اصطلاح مگر اس کے مفہوم کے تعین کے

وقت انتہائی سادگی سے اسے محض "نئی چیز" کے مترادف سمجھ جاتا ہے۔ اس "نئی چیز" کے مفہوم میں ترقی یافتہ فطری، غیر اقداری (Value Neutral) اور بہتر ہونے کے تمام معانی مے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔

جدیدیت کی جنم بھومی یعنی یورپ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ماڈرنٹی یا روشن خیالی کوئی نیا، فطری اور ترقی یافتہ تصور نہیں اور نہ ہی یہ کوئی غیر اقداری تصور و اصطلاح ہے بلکہ قدیم ترین یونانی تہذیب کے تصور انسان، تصور تہذیب اور تصور کائنات طرف مراجعت اور اس کے نئے سرے سے احیاء کا نام جدیدیت ہے۔

آگے بڑھنے سے پیش تر یہاں وسیع البیاد یا روح جدیدیت (Modernity)، جمالیاتی جدیدیت (Modernism) اور تجدید کاری (Modernization) میں فرق کی وضاحت ضروری ہے۔ یورپ میں قرون وسطی (Middle Ages) کے بعد مذہب سے بغاوت کے نتیجے میں جنم لینے والی حاوی فکر یا ذریعہ علم (Episteme) نے نئے نئے فروعات میں اپنا ظہور کیا:

۱۔ وسیع تر جدیدیت یا راج جدیدیت (Modernity)

۲۔ جمالیاتی جدیدیت (Modernism)

۳۔ تجدید کاری (Modernization)

نشأۃ الثانیہ کے بعد مغرب کی فکر میں پیدا ہونے والی بنیادی تبدیلی کا نام وسیع تر جدیدیت یا روح جدیدیت (Modernity) ہے۔ تجدید کاری (Modernization) اور جمالیاتی جدیدیت (Modernism)، روح جدیدیت (Modernity) سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں۔

جدیدیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان اپنی ذات سے باہر سے عائد کردہ کسی مقتدرہ کے حکم یا کسی بالاتر ہستی کے پیغام (وحی) کو تسلیم نہ کرے بلکہ ہر چیز کے حسن و قبح کا فیصلہ اپنی عقل اور تجربے کی روشنی میں کرے۔ یہ تجربہ یا توانا انسان کا اپنا ہو گا یا پھر کسی اور کے تجربے کو انسان اس شرط پر قبول کر لے گا کہ وہ اسے اپنے تجربے کی بنیاد پر رد کر سکے۔ جدیدیت قائم ہی اپنے بنیادی نظریے یعنی انسان پرستی پر ہے، جس کی نقادی روح نے اسے خدا مرکز کائنات سے نکال کر انسان مرکز کائنات کا یقین دریا۔ جدیدیت کی ساری ہریں اسی انسان پرستی کی فضاء سے گزرتی ہیں۔ جدیدیت کے محطے (Discourse) میں انسان کا موضوع صرف انسان اور اس کی فردیت (Individualism) ہے۔

جرگن ہمبرماس (Jürgen Habermas) (۱۹۲۹ء -) کا خیال ہے کہ روشن خیالی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ماضی کے کسی حوالے کی محتاج نہیں بلکہ وہ اپنا حوالہ خود ہے۔ روشن خیالی سے قبل کے تصورات اپنے جواز کے لیے کسی نہ کسی حوالے کی محتاج رہے ہیں مگر روشن خیالی نے اپنے تصورات کے لیے ماضی کا کوئی حوالہ استعمال نہیں کیا، ہمبرماس کے الفاظ میں:

It has to create its own normativity out of itself.

ترجمہ "روشن خیالی کو اپنا معیار خود اپنے اندر سے تخلیق کرنا ہے۔"

ہمبرماس کے اس تجزیے کے علی الرغم حقیقت یہ ہے کہ روشن خیالی نے اپنا جواز قدیم ترین اور انسان پرست یونانی تہذیب میں تلاش کر لیا تھا۔ یہ جواز کیا تھا؟ یہ جواز عیسائیت کی علمیت کو رد کر کے انسان، اور اس کی عقل اور تجربے کو ذریعہ علم مانا تھا۔ اب خدا پرستی کی جگہ انسان پرستی نے لے لی۔ معاد کے بجائے معاش قابل ترجیح قرار پائی۔ انجیل کی جگہ عقل انسانی

یا سائنس ذریعہ علم قرار پائی۔ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مطابق جدیدیت نام ہے مذہب اور اس کی روایات کو سائنسی عقلیت کے تابع کرنے کا۔ مگر یہ ساری تبدیلی دوچار برس کا قصہ نہیں بلکہ یورپ کی تاریخ میں صدیوں کے دوران انجام پذیر ہونے والا وہ عمل ہے جو چودھویں و پندرہویں صدی کے درمیان (بطور مثال تھی) شروع ہو کر نیسویں صدی میں جدیدیت یا ماڈرنی کی شکل میں عروج پر جا پہنچا۔ اس دوران قدیم (عیسائیت) کو رد کر کے قدیم ترین (یونانی عیسیت) کی بازیافت کی گئی۔ یہ بات نہیں کہ قرون وسطی کے یورپ میں یونانی علوم کو بھلا دیا گیا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی یونانی علوم چونکہ وحی الہی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے اس لیے قرون وسطی کا یورپ انہیں ثانوی اہمیت دیتا تھا اور اس دور میں اصل اہمیت مذہبی علوم کو حاصل تھی ۱۰۔ نشاۃ الثانیہ عیسائیت سے تصادم اور انسان پرستی کی بنیاد قرار پانے کے نتیجے میں اپنے اندر مذہب بیزاری کا عمومی رجحان رکھتی تھی لہذا اس نے عیسائیت سے یونانی دور کی طرف مراجعت اختیار کر لی، اسی یونانی تہذیب کی طرف جو ہر معاملے کو انسان کے پیمانے سے دیکھتی تھی نہ کہ ساوی بدیت کی کسوٹی پر۔ قدیم ترین یونانی تہذیب کی طرف جدیدیت کی مراجعت اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ جدیدیت نئی چیز کا نام نہیں بلکہ دراصل یہ رجعت پسندی کے نئے رجحان کا نام ہے۔

اردو ادب میں جدیدیت کے بڑے نقاد محمد حسن عسکری، (۱۹۱۹ء - ۱۹۷۸ء) نے یورپی نشاۃ الثانیہ کو جدیدیت کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے ۱۱۔ نشاۃ الثانیہ (جوروشن خیالی کی بنیاد ہے) نے پہلے یورپ کی عیسیت اور پھر اس کی زندگی کے حقیقی پیراڈائم (Paradigm) کو تبدیل کر دیا۔ نشاۃ الثانیہ نے روشن خیالی کو جنم دے کر ایک اہم سنگ میل طے کیا۔ اسی روشن خیالی کی کوکھ سے جدیدیت نے جنم لیا ۱۲۔ روشن خیالی اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے اپنی امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی مرکزی خصوصیات انساں پرستی (Humanism)، عقلیت (Rationalism) اور انساں کی ذات سے باہر ہر قسم کے ذریعہ علم اور اتھارٹی کا انکار ہیں وریبھی مغرب کی آزادی (Freedom) کا حقیقی مفہوم ہے۔ یہ تینوں خصوصیات باہم مربوط اور پیوست ہیں۔ انساں پرستی (Humanism) اس بات کی متقاضی ہے کہ علم کا واحد معیار انسانی عقل یا اس کے نتیجے میں تشکیل پانے والی تجربی سائنس کو مانا جائے نہ کہ وحی یا انساں کی ذات سے باہر کوئی اور ذریعہ علم، انساں اور اس کی عقل کو سب کچھ مان لینے کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ انساں اپنے علاوہ کسی مقتدر یا بااثر ہستی کا محتاج نہ رہے، یہیں سے آزادی (Freedom) روشن خیالی یا جدیدیت کا نقطہء سکہ قرار پاتی ہے۔ ان تینوں خصوصیات کا باہمی ربط یہی ہے۔ بڑے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۴ء - ۱۹۶۱ء) نے (Humanism) کی وضاحت کرتے ہوئے اسے ایسا مذہب انساںیت قرار دیا ہے جس کی رو سے انساں کی ذات کائنات کا مرکز ہے، گویا یہ کائنات (Human Centric) ہے نہ کہ خدا مرکز (God Centric)۔ اس مسلک انساںیت کے تقاضے یہ ہیں؟ مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ عالم، خرت کے بجائے عالم طبیعی (Physical World) کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش اس مسلک انساںیت کا تقاضہ ہے۔ مولوی صاحب اس تصور کے مرکزی خیال کی وضاحت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں مذہب انساںیت کا چر و کسی مافوق الادراک ہستی اور وجود (خدا، وحی فرشتے، جن، جنت اور دوزخ) کا قائل نہیں ہوتا بلکہ انساں کی دنیاوی فلاح کی کوشش کو ذریعہ نجات سمجھتا ہے ۱۳۔

یورپی نشاۃ الثانیہ نے اپنے فکری ظہور کے ساتھ کائنات سے متعلق تصورات ہی بدل دیے۔ یہ ہر حوالے سے ایک تبدیلی عظیم (Great Transformation) قرار پائی۔ قرون وسطی کا انساں طبیعی دنیا کو ایک مابعد الطبیعیاتی

حقیقت کا ظہور قرار دیتا تھا۔ نشاۃ الثانیہ (Renaissance) نے اسے ہار کر یا کہ حقیقت صرف وہی ہے جسے انسانی حواس کے ذریعے سمجھا جاسکے۔ اس طرح غیر محسوس ندر میں مابعد الطبیعیات کے مسائل لایعنی قرار پائے اور اس دنیا (This World) کو اس دنیا (That World) سے برتر قرار دیا جانے لگا۔ جدیدیت کی عقلیت پسندی ہر اس اتھارٹی اور روایت کا بطلان کرتی ہے جو عقل کی میز پر پورا نہ اترے۔ الہام کے بجائے عقل انسانی سے رائے قائم کرنا اور حقیقی علم کا ذریعہ وحی یا کسی مافوق الفطرت ہستی کو سمجھنے کے بجائے انسانی عقل کو سمجھنا عقلیت (Rationalism) کا حقیقی مفہوم ہے۔

یورپی نشاۃ الثانیہ سے شروع ہونے والا جدیدیت کا سفر اٹھارہویں صدی میں روشن خیالی کی منزل پر پہنچ گیا۔ اس دور ن پانچویں صدی قبل مسیح کے سوفسطائی فلسفی پروٹاگوراس (Protagoras) کا قول کہ انسان ہر چیز کو اپنے لیے مپانہ ہے (Man is the measure of all things) زبردست اہمیت اختیار کر گیا۔، نچیل، کلیب اور پوپ کے بجائے انسانی عقل، علم کا ذریعہ قرار پائی۔ کرسٹوفر ولکومب (Christopher L.C.E. Witcombe) نے کہا کہ خدا نہیں بلکہ انسان ہی ہر چیز کا منتہائے مقصود ہے۔

یہاں یک تاریخی نقطہ فنی کا ازالہ ضروری ہے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جدیدیت (Modernity) محض عیسائیت کے خلاف ایک رد عمل ہے جب کہ یہ حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت (Modernity) فی نفسہ بر مذہب اور اس کی عطا کردہ اقدار کے خلاف، یک بغاوت ہے جو مذہب خاص طور پر الہامی مذہب کے علی الرغم اپنی طہیت، اپنی اخلاقیات، اپنا تصور کائنات اور سب سے بڑھ کر اپنا تصور انسان رکھتی ہے سی مریم جیلہ (۱۹۳۴ء - ۲۰۱۲ء) نے اسے مذہب کے خلاف ایک مسلح بغاوت قرار دیا۔

انسان پرستی کی وضاحت اور ترویج کے سلسلے میں جرمن فلسفی ایمانوئل کانٹ (Emanuel Kant، ۱۷۲۴ء - ۱۸۰۴ء) نے روشن خیالی یا جدیدیت کی بہترین تفسیر پیش کر کے مادی ذریعہ علم کو جھٹلایا اور عقل کل کے مقابلے میں "شعور انسانی" کو جملہ مسائل کے حل میں بنیادی اہمیت دی۔ اس کے بعد یورپی نسان نے فردن وسطی کی حاوی فکر یعنی عیسائیت کو نظر انداز کر کے محض اپنی مادی خوش حالی کے لیے تسخیر کائنات کی تگ و دو شروع کی۔ کائنات میں انسان کے اس بڑھتے ہوئے اور مسلسل عمل دخل نے سیکولرزم، وجودیت (Existentialism) اور فردیت (Individualism) جیسے افکار کو فروغ دیا۔ کانٹ نے اپنے مضمون "Was ist Aufklärung?" "روشن خیالی کیا ہے؟" کے افتتاحی جیراگراف میں اس روشن خیالی کو کسی بیرونی ذریعے (مثلاً وحی) سے انسان کی آزادی کا عمل قرار دیا ہے۔ کانٹ نے لکھا:

ترجمہ "روشن خیالی اس ذہنی ناچنگلی سے انسان کی نجات کا نام ہے جو اس نے اپنے آپ پر خود مسلط کر رکھی تھی۔ یہ ذہنی ناچنگلی دراصل دوسروں کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل و فہم کو استعمال نہ کر سکتے کی کیفیت ہے مگر اس کی وجہ انسانی عقل و فہم کا عدم وجود نہیں بلکہ انسان کے اندر اس جرات اور پختہ ارادہ کی کمی ہے جو اسے کسی اور کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل استعمال کرنے کے قابل بنا سکے" ۱۸۔

کانٹ کا یہ مضمون جدیدیت کی حقیقت اور اس کی حرکیات (Dynamics) پر حرف "خرکی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون کی تفصیلات پڑھ کر کانٹ کو رائدین جدیدیت کا امام مانتا پڑتا ہے۔ دور حاضر میں فرانس سے تعلق رکھنے

والے بڑے مابعد جدیدی (Post Modernist) مفکر مشل فوکو (Michel Foucault، ۱۹۲۶ء - ۱۹۸۴ء) نے کائنات کے مذکورہ مقالے کی تشریح کرتے ہوئے اس مقالے کو ایک زمانے کا نہیں بلکہ صدیوں سے یکساں اہمیت کا حامل ایک ایسا مقالہ قرار دیا ہے جو آج تک اہمیت اور آفاقی نوعیت رکھتا ہے۔

یورپی نشاۃ الثانیہ سے موجودہ جدیدیت تک کا سفر تہذیبی و تاریخی تغیر کی داستان ہے۔ مارشل برمن (Marshall Berman، ۱۹۲۰ء - ۲۰۰۳ء) نے اس سفر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ ابتدائی جدیدیت (۱۳۵۳ء تا ۱۷۸۹ء)

۲۔ کلاسیکی جدیدیت (۱۷۸۹ء تا ۱۹۰۰ء)

۳۔ موجودہ جدیدیت (۱۹۰۰ء تا حال)

مغربی مفکرین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط یا اختتام سے جو دور شروع ہوا ہے وہ جدیدیت ہی کا ایک حصہ ہے جسے سیال جدیدیت (Liquid Modernity) کہنا چاہیے۔ دوسری طرف مابعد جدیدیت کی فکر کے حامین کا کہنا ہے کہ جدیدیت کا دور بیسویں صدی کے وسط میں اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے اور اس کے بعد جو دور شروع ہوا ہے وہ مابعد جدیدیت (Post Modernity) کا دور ہے۔ بہر حال زیادہ تر مغربی مفکرین مؤخر اندک رائے سے متفق نظر آتے ہیں۔

یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے زیر اثر مندرجہ ذیل تاریخ ساز انقلابی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں:

(۱) مذہبی معاشرے کا ردِ دہشت اختیار کر لینا

(۲) زرعی معاشرے کی صنعتی و سرمایہ دارانہ معاشرے میں تبدیلی

(۳) پوپ کے اقتدار کی جگہ قومی ریاستوں کی تشکیل

مندرجہ بالا ہر تبدیلی الگ تفصیلی مقالے کی مستقاضی ہے مگر یہاں ان تبدیلیوں متعلق چند شرے کیے جاسکیں گے۔

(۱) لادینی معاشرے کا قیام (Secularization):

یورپ کی دو بڑی تحریکیں یعنی نشاۃ الثانیہ (Renaissance) اور اصلاح مذہب (Reformation) ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے زیر اثر مرتب ہونے والے نتائج میں سرفہرست نتیجہ یورپ کے مذہبی معاشرے کی جگہ لادینی معاشرے کا قیام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب یورپی معاشروں نے رہنمائی کے لیے مذہبی ذرائع کے بجائے عقل انسانی کو علم کے حقیقی ذریعے کے طور پر قبول کر لیا۔ یورپ کے معاشرے میں ہونے والی بقیہ بڑی بڑی تبدیلیاں اسی بنیادی تبدیلی کا براہ راست نتیجہ تھیں۔

(۲) صنعتی و سرمایہ دارانہ معاشرے کا قیام (Industrialization):

یورپ میں صنعتی و سرمایہ دارانہ معاشرے کے قیام کی حوصلہ افزائی قرون وسطیٰ میں ناممکن تھی کیوں قرون وسطیٰ کا مذہبی پس منظر اس کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ مذہبی یورپ فطرت اور خدائی دعوے شرتی اقدار کو اہمیت دیتا تھا جبکہ صنعتی و سرمایہ دارانہ عمل میں ان باتوں کا زوال لازمی امر تھا۔ بہرحال یورپ کے مذہبی پس منظر کے کمزور ہوتے ہی یہ معاشرتی تبدیلی

یورپ اور پھر دنیا بھر کا مقدر ٹھہری۔ انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے پر اس تبدیلی کے مثبت و منفی اثرات مرتب ہوئے۔ سماجیات، ماحولیات، معاشیات اور فنون لطیفہ فرض کوئی بھی شعبہ زندگی تبدیلی کے عمل سے محفوظ نہ رہ سکا۔ آج کے جدید طرز زندگی کے مثبت و منفی اثرات کی بنا اس تبدیلی نے رکھ دی۔

(۳) قومی ریاستوں (Nation States) کا قیام:

نشأۃ الثانیہ سے قبل کے یورپ میں اگرچہ بادشاہتیں قائم تھیں مگر ان کے بادشاہ پوپ کے زیر نگرانی فعال تھے۔ حکمرانوں کا عزل و نصب کلیسا کی غشا پر منحصر تھا، حتیٰ کہ پوپ کسی غیر اخلاقی حرکت پر بادشاہوں کو سزا دینے کا بھی مجاز تھا۔ یورپ کا ہر حکمران، اپنی حکمرانی کی سند پوپ سے حاصل کرتا تھا۔ یہ سب کچھ محض رسمی نہ تھا بلکہ حقیقی اقتدار کلیسا ہی کا قائم تھا۔ نشأۃ الثانیہ کے دوران یورپی حکمرانوں نے کلیسا کی غلامی کا طوق اتار پھینکا۔ قومی ریاستوں کے قیام کا مرحلہ، نور دور تھا مگر اس کی بنیادی ایسٹ رکھی جا چکی تھی۔ قومی ریاستوں کی جانب اس سفر نے فرد کی آزادی کے منصوبے کو مہمیز دی۔ جدید ریاستوں کے ادراک اور تصور نے انسانی آزادی کے لیے آلہ کار کے طور پر کام کیا اور بلتخر ۱۶۴۸ء میں یورپی طاقتوں کے مابین ہونے والے امن کے تاریخی معاہدہ ویسٹ فیلیا (Peace Treaty of Westphalia) نے اس ضمن میں اہم سنگ میل طے کرتے ہوئے قومی ریاست کی راہ ہموار کر دی۔ جمہوریت (Democracy)، انسانی حقوق (Human Rights) اور دستوریت (Constitutionalism) جیسے تصورات کا ظہور قومی ریاست کے ارتقاء کے مرہون منت ہے۔ بہر حال جدید قومی ریاستوں کے قیام نے قوم پرستی (Nationalism) کے تصور اور اس کے ارتقاء کے ضمن میں عمل انگیز کا کام کیا۔ قوم پرستی کا لازمی نتیجہ یورپی اقوام کے درمیان حسد و حرص کی فضا کو جنم دینے کا باعث ہوا۔ نوآبادیاتی دور اسی حسد و حرص کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس دور نے اس جلتی آگ پر تیل ڈالا۔ اپنی حرص کی تسکیں کی خاطر یورپی قوام نے نوآبادیات میں انسانی قتل عام سے بھی دریغ نہ کیا۔ مشہور امریکی دانش ور پرافیسر مائیکل مین (Michael Mann، ۱۹۴۲ء -) اپنی شہرہ آفاق تصنیف (The Dark Side of Democracy) میں رقم طراز ہیں کہ جدیدیت نے قتل عام کو نسلی صفائی کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلا یا جس کی واضح ترین شکل جمہوریت ہے اور نسلی صفائی نے جمہوری قومی ریاست ایجاد کی ۲۲۔

نوآبادیات بنانے کے عمل میں پیچھے رہ جانے والی یورپی اقوام نے بھی کچھ عرصے کے بعد انگلزی کی اور لوٹ مار کے اس عمل میں اپنا حصہ طلب کیا۔ اس صورت حال نے مزید پیچیدگی اختیار کی اور ملت خریورپی اقوام اور دنیا ویکے بعد دیگرے دو عظیم جنگوں کا سامن کرنا پڑا جن کے بھیا تک اثرات سے دنیا متا دیر پیچھا نہ چھڑا سکی۔

انسان پرست نظر آنے والی جدیدیت کے مطابق سائنس آفاقی اخلاقیات، قانون اور آرٹ اپنی اندرونی منطق کے مطابق خود مملکتی ہیں۔ اس منصوب کا مقصد سائنس، انسانی عقلیت اور آزادی کے کلچر کا نساں کی روزمرہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال تھا۔ جدیدیت چونکہ اپنی ایک مادی بنیاد رکھتی ہے لہذا انسان پرستی کے جدید نظریہ میں نساں کی مادی اور جنسی خواہشات کی آزادانہ تسکیں کو بردست اہمیت حاصل ہوئی مگر انسان پرستی کا یہ دعویٰ بھی ایک فریب ثابت ہوا کیوں کہ جدیدیت نے انسان کی مادی خواہشات کی تسکین کرنے کے بجائے انہیں مزید بڑھانے اور مصنوعی خواہشات پیدا کرنے کی ایک پوری صنعت (مثبتہا بازی) تشکیل دے کر ان کی عدم تسکین کے مزید سامان فراہم

کر دیے۔

اب جدیدیت کے سب سے بڑے دعوے یعنی انسان پرستی نے عملی طور پر سرمایہ پرستی کی شکل اختیار کر کے تلخ نتائج سے دنیا کو آگاہ کیا۔ انسان پرست کہلے جانے والی جدیدیت کے انسان کش نتائج قوم پرستی، سرمایہ داری، کمیونزم اور فاشزم کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ جدیدیت کے بعد دیگرے اپنے اپنے ہر دعوے میں ناکام ثابت ہوئی جس نے اسے خود اس کی جہنم بھومی یعنی یورپ میں غیر مقبول کر دیا۔ جدیدیت اپنے منطقی نتائج کا بوجھ نہ سہار سکی اور اپنی ہی جلدی ہو آگ کی راکھ تلے دب گئی۔ جدیدیت کے بدیہی نتائج اور اس کے منصوبے کی ناکامی نے ما بعد جدیدیت (Post Modernity) کو جنم دیا، جس نے جدیدیت کے تمام آفاقی دعوؤں (Meta Narratives) پر سوالیہ نشان لگانے کے بعد ان کی تخریب (Deconstruction) کر کے جدیدیت کو اسی کے دلائل سے فکری میدان میں شکست دے دی۔

جدیدیت سے ما بعد جدیدیت کے اس فکری سفر میں جدیدیت کے قائم کردہ ادارے اپنی اپنی جگہ برقرار رہے مگر ان سب کی افادیت مشکوک ہو گئی۔ جدیدیت کی مرتب کردہ تاریخ اب طاقت و مغرب کا نقطہ نظر کہلائی جو مغرب کی تکنیکی ترقی، سرمایہ داری اور نوآبادیاتی دور کا بڑا فریب بیانیہ ہے۔ اب سائنس کی معروضیت پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا گیا جو کل بھی جدیدیت کا سب سے موثر ہتھیار تھا اور آج بھی ہے۔ جدیدیت کی حیثیت ایک عقلی نظریہ کے بجائے معے (Myth) سے زیادہ ندری ہے۔

جدیدیت کی اساس پر قائم شدہ نظام میں ان ممنوعی خواہشات کی تکمیل زیادہ سے زیادہ سرمائے کے ذریعے ہی ممکن ہے لہذا اس کا براہ راست نتیجہ مغرب کی طرف سے پوری دنیا کو اپنی کالونی بنانے (Colonization) اور دو عظیم جنگوں کی صورت میں نکلا۔ جدیدیت کے اس بدیہی نتیجے نے اس کے چہرے سے نساں پرستی کی نقاب اتار پھینکی اور انسانیت نوازی کے جدید منصوبے کو پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے خس و خاشاک کی طرح بہا دیا، مگر ابھی شوق کے مرحلے باقی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد روشن خیالی اور نشاۃ الثانیہ کا مثالی انسان (Man of Renaissance) دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں میں مصروف ہو گیا۔ سائنس اس کے جنگی عزائم کی آراء کا ثابت ہوئی اخلاقیات سیاہی اور قوم پرستانہ تعصبات کی نذر ہو گئی۔ قانون طاقت و رکاک حکم بن گیا۔ آرٹ حیوانی جبلت سے مغلوب ہو گیا اور انسانی قد ریں پامال ہو گئیں اور جدیدیت کا یہ شان دار منصوبہ ہیروشیما، ناگاساکی اور یورپ کے کروڑوں دم توڑتے انسانوں اور بے رحم بارود کے بوجھ تلے ہیر ہو گیا۔ اس طرح انسان پرستی کی تحریک اپنے معکوس ہدف تک پہنچ گئی ۱۹۳۳ء۔ یورپ میں دو عظیم جنگوں کے بعد کا یہ وقت جدیدیت کے منصوبے سے عمومی بیزاری کا تھا، اور اس کے منصوبے پر شکوک و شبہات کے اظہار کا بھی یہی وقت ہے۔

جدیدیت اور تجدید کاری (Modernization) کے منصوبے نے جس طرح کرہ ارض کو مجروح و مضروب کیا اس نے جدیدیت کے انسان دوست اور انسان مرکز (Human Centric) ہونے کی حیثیت کو بھی گہنا دیا۔ جدیدیت کے بیش تر کارنامے جمہوریت، ترقی، انسانی حقوق، ٹیکنالوجی اور شہریانے کا عمل (Urbanization) اپنے نتائج کے حوالے سے ناقابل دفاع ثابت ہوئے۔ مختصر یہ کہ جدیدیت، انسانی فلاح اور حریت و آزادی کو آگے بڑھانے کے بجائے انسانی ٹھوسی اور تابع داری کا ایک طریقہ کار بن کر رہ گئی اور بقول حنا آرینت (Hannah Arendt)، ۱۹۰۶ء - ۱۹۷۵ء) جدید اور جو انسانی تخلیقی قوت کی اتنی بے مثل اور امید افزاء کامرانیوں سے شروع ہوا اس کا خاتمہ

اتنی حاصل اور مہلک ترین مجبوریت میں ہوا کہ تاریخ میں اس کی مثال مناسبتاً ہے ۲۴۔ دیوندر امر نے جدیدیت اور اس کے زیر اثر ریاستہائے نظریات کی ناکامی کی بناء پر اس کے پورے منصوبے کو نہ صرف ناکام قرار دیا بلکہ جدیدیت کی آفاقی صداقت، مطلق اقدار اور معروضیت کو مشکوک قرار دیا ۲۵۔ پروٹسٹنٹ اور جدید مغربی مفکرین نے قرون وسطی (Middle Ages) یورپ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہوئے اسے تاریک خیال، جاہل، فرسودہ اور پس ماندہ قرار دیا مگر قرون وسطی اور جدیدیت کے حامل مغرب کا تقابل کسی طرح بھی جدید مغرب کو قرون وسطی سے فائق اور بہتر ثابت نہیں کرتا بلکہ ایسا ہر تقابل قرون وسطی کی یورپ پر فوقیت کو واضح کرتا ہے۔ جدیدیت فی نفسہ انسان کی کلی آزادی کی داعی ہے۔ اس آزادی کے منطقی نتائج یورپی اقوام کے درمیان طاقت اور دولت کی بڑھتی ہوئی ہوس کی صورت میں نکلے جنہوں نے پوری دنیا کو مغربی طاقتوں شکنجے میں کس کر انہیں مغرب کی کالونی بنادیا۔ اسی ہوس کا ایک منطقی نتیجہ انسانوں کے قتل عام کی صورت میں برآمد ہوا۔ امریکہ کے سرخ ہندیوں (Red Indians) اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں (Aborgines) کی نسلی صفائی اور دو عظیم جنگوں میں مرنے والے انسانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچا دی گئی۔

مائیکل مین نے جدیدیت کے ہاتھوں ہونے والے قتل عام پر اپنی تحقیقی تصنیف (The Dark Side of Democracy) میں جدیدیت اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی مغربی تہذیب کے انسان کی قتل عام سے براہ راست تعلق کو واضح کیا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر امریکہ، جرمنی، یوگوسلاویہ، اسرائیل اور روانڈا میں ہونے والی کروڑوں ہلاکتوں کی تفصیلات روح فرسا و تفصیل طلب ہیں۔ یہاں جدیدیت اور انسان کی قتل عام میں پائے جانے والے قریبی تعلق کے بارے میں چند اشارے کیے جا سکیں گے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف نے یہ معنی خیز بات کہی کہ انسان کی قتل عام یا نسلی صفائی (Ethnic Cleansing) کا تعلق جدید مغربی تہذیب کے باہر سے یا کسی قدیم دور سے نہیں بلکہ یہ برائی خود اسی تہذیب کی پیدا کردہ ہے ۲۶۔

آگے چل کر مصنف جدیدیت اور قتل عام کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ہٹلر اور اس کے نسل پرست ساتھی جرمنی میں وہی کچھ ہی تو کر رہے تھے جو امریکیوں نے جدید امریکی ریاست کی بنیاد رکھتے ہوئے ریڈ انڈینز کے ساتھ کیا تھا ۲۷۔

قرون وسطی ۵۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کے ہزار سالہ دور پر مشتمل ہے مگر جدیدیت نے اپنے ڈھائی سو سالہ دور میں جس قدر قتل عام کیا، قرون وسطی کا انسان اپنی تمام تر تاریک خیالی درجہات کے باوصف اس کا عشر عشر بھی نہ کر سکا۔ خاندانی نظام و اقدار اور کردار و حویلیت کی تباہی اس پر مستزاد ہے۔ دور کیوں جائیں دور جدید غیو اور مرکی افواج نے افغانستان اور عراق میں معصوم بچوں اور عورتوں کے جس قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے ان افواج کو جاہل اور تاریک خیال کون کہہ سکتا ہے مگر قتل و بربریت کی یہ تاریخ قرون وسطی کے تاریک خیال، جاہل اور مذہبی انسان کے ہاتھوں نہیں بلکہ جدید ترقی یافتہ، روشن خیال، ترقی پسند اور جمہوری مغرب کے ہاتھوں رقم کی جارہی ہے۔ دراصل قرون وسطی کی ظالمانہ تصویر پیش کرنے کے بعد جدیدیت نے اپنے تمام جرائم سمیت اس تصویر کے پیچھے اپنے مکروہ چہرے کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ مگر جدیدیت کے بدیہی نتائج نے ایسی ہر کوشش کو ناکام بنادیا ہے۔

حالی سے لے کر حال تک ہم نے پیر وئی مغرب کا حق ادا کرنے کی بہتر سے بہتر سعی کی ہے۔ مغرب سے جدیدیت کی آمد کے بعد سے ہم نے بھی مغربی دانش کے ہمراہ اس کی تعریف و دفاع کا حق ادا کیا ہے مگر بعد میں جب خود

مغرب نے جدیدیت کے نتائج و عواقب کا جائزہ لینے کے بعد اس سے اعراض اور بیزاری کی روش اختیار کی تو ہمارے ہاں بھی جدیدیت گریز رجحان کا آغاز انہی دانشور حضرات کے ہاتھوں ہوا جو اب تک جدیدیت کے پر جوش وکیل تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب میں ہونے والی نظریاتی الٹ پٹ میں ہم محض تمثیلی و رمقد کا کردار کب تک ادا کریں گے اور کیا جبروی مغرب کے بارے میں حالی کا مشورہ کسی آفاقی حقیقت کا آئینہ دار ہے جسے ہر حال میں اپنانا ضروری ہے؟ اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہم روایت، اقدار، تاریخ، فہم اور تہذیب سے محروم محض افراد کا ایک گروہ ہیں جو مغرب سے بلند ہونے والے ہر نعرے پر سرد ہنستے رہیں۔ اس سوال کا جواب ہمارے لیے جدیدیت سے متعلق فکر و عمل کے نئی راہوں کا تعین کرے گا۔

حوالہ جات:

- ۱۔ فہیم اعظمی، "آراء-۲"، مکتبہ صریح، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۲
- ۲۔ ناصر عباس نیر، "جدید و مابعد جدید تنقید"، انجمن ترقی، اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۸۹
- ۳۔ ڈاکٹر منظور احمد، "۲۰۰۳ء مابعد جدیدیت"، مطبوعات نیازیہ، کراچی، ص ۷
- ۴۔ ایضاً، ص ۸
- ۵۔ ناصر عباس نیر، ص ۲۳
- ۶۔ سلیم احمد، "مضامین سلیم احمد"، (مرتبہ جمالیاتی پٹی)، کادری بازیافت، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹۱
- ۷۔ ضمیر علی بدایونی، "جدیدیت و مابعد جدیدیت"، اختر مطبوعات، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۷۰
- ۸۔ جرگن ہابرماس (Habermass, Jurgen)، The Philosophical Discourse of Modernity، گیمبرج، ۱۹۸۷ء، ص ۷
- ۹۔ سیدک مین آر۔ اے (Selugman R A)، Encyclopedia of Social Sciences، نیویارک، ۱۹۵۹ء، ص ۵۶۳
- ۱۰۔ محمد حسن عسکری، "جدیدیت"، ادارہ فروغ اسلام، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۳۹
- ۱۱۔ ایضاً
- ۱۲۔ فہیم اعظمی، ص ۱۳۶
- ۱۳۔ مودوی عبدالحق، "The Standard English-Urdu Dictionary"، انجمن ترقی، اردو کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۵۴۸
- ۱۴۔ ناصر عباس نیر، ص ۳۱
- ۱۵۔ <http://witcombe.sbc.edu/modernism/roots.html>
- ۱۶۔ مریم جمیل، Islam And Modernism، محمد یوسف خان پرنٹرز، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۶
- ۱۷۔ www.english.upenn.edu/~mgamer/Etexts/kant.html
- ۱۸۔ http://foucault.info/documents/whatisEnlightenment/foucault_whatIsEnlightenment_en.html

- ۱۹۔ <http://en.wikipedia.org/wiki/Modernity>
- ۲۰۔ ایضاً
- ۲۱۔ ایضاً
- ۲۲۔ مائیکل مین (Mann, Michael)، The Dark Side of Democracy، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، ۲۰۰۵ء، دہرچہ ۹
- ۲۳۔ حفصہ علی بدایونی، ص ۳۷۵
- ۲۴۔ دیوید رائس، ”مابعد جدیدیت یا جدیدیت تحریر ثانی“، مشمولہ ”جدیدیت کا تنقیدی تناظر“، مرتبہ، اشتیاق احمد، بیت الحکمت لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۷
- ۲۵۔ ایضاً، ص ۲۲۳
- ۲۶۔ مائیکل مین، دہرچہ ۹
- ۲۷۔ ایضاً

حسنِ لیلیٰ ہے، دشتِ مجنوں ہے

(غزلیں)

ظفر اقبال

اک عمر ہوئی جس میں خسارے سے لگا ہوں
 پکڑا ہے وہی کام دوبارے سے لگا ہوں
 رُکنا تو مرے بس میں ہے، جس جگہ بھی رُک جاؤں
 آگے میں اگر تیرے اشارے سے لگا ہوں
 آواز تو آتی ہے، دکھائی نہیں دیتا
 وہ کون ہے میں جس کے پکارے سے لگا ہوں
 حاصل بھی ہو کچھ، اس سے نہیں کوئی سروکار
 تھوڑے پہ تسلی نہیں، سارے پہ لگا ہوں
 بھٹکا ہوا ہے خود ہی، کہاں سمت بھجائے
 ایسے کسی گمراہ ستارے سے لگا ہوں
 اپنا بھی کیے رکھتا ہوں کچھ اس کے علاوہ
 ظاہر میں تو میں کام تمہارے سے لگا ہوں
 پیچیدہ ہے اتنا کہ سمجھ کچھ نہیں آتی
 بس دیکھتا جاتا ہوں، نظارے سے لگا ہوں
 اپنی اسے ہمت ہی سمجھتا ہوں، ورنہ
 اُترا ہے یہ پانی تو کنارے سے لگا ہوں
 میں دوش ہوا پر کوئی خس تھا، ظفر آخر
 اُڑتا ہوا جو آ کے شرارے سے لگا ہو

ظفر اقبال

ہوتا رہتا ہے گزارہ کہ ابھی کافی ہے
 یعنی اشیائے ضرورت میں کمی کافی ہے
 دل کو رہتی ہے جو اکثر یہ پریشانی سی
 کبھی کم پڑتی ہے یکسر تو کبھی کافی ہے
 سوچتے رہتے ہیں اس کو، یہ محبت ہے اگر
 اپنے جھے گی یہی تھی، سو یہی کافی ہے
 تیری قربت سے بھی کیا ہے ابھی لینا دینا
 کہ سر دست یہ بیگانہ روی کافی ہے
 یاد آتی ہے محبت وہ ہڈانی بھی ہمیں
 حق تو یہ ہے کہ مصیبت یہ تھی کافی ہے
 کچھ بتاتے ہی نہیں شرم کے مارے، ورنہ
 چوٹ اس بار لگی ہے تو لگی کافی ہے
 اپنے ہی ساتھ ہوا بیٹھنا اُلٹنا اپنا
 اور صحبت یہ بُری ہو کہ بھی، کافی ہے
 دُھند ایسی ہے کہ آگے نہیں بڑھنے دیتی
 کہ یہ دیوار سی رستے میں کھڑی کافی ہے
 دل کو خوراک تو کچھ ملتی ہی رہتی ہے، ظفر
 بے رخی اتنی زیادہ نہ سہی، کافی ہے

ظفر اقبال

اپنا نہیں کچھ بھی تو پرایا ہی بہت ہے
آنکھیں ہی بہت ہیں، یہ تماشا ہی بہت ہے
پھر کیا ہے جو وہ شوخ ہمارا نہیں ہوتا
ہم ہو گئے ہیں اُس کے تو اتنا ہی بہت ہے
یہ عمر زیادہ طلبی کی بھی نہیں اب
ہوتا ہے گزارہ تو گزارہ ہی بہت ہے
پانی نہ سسکی، شور تو دیتا ہے سُٹائی
چڑھتا ہوا یہ دور کا دریا ہی بہت ہے
ہم ہیں کہ سرِ راہ اسی کام میں لگ جائیں
کیا کیجیے، رونا ہمیں آتا ہی بہت ہے
ہوتی ہے محبت میں قناعت بھی کوئی چیز
ویسا نہیں موجود تو ایسا ہی بہت ہے
کچھ ہم بھی خریداروں میں شامل تو ہیں، لیکن
سودا یہ ترے سُخن کا مہنگا ہی بہت ہے
کچھ اُدب کے مرنے کو سمندر نہیں درکار
ہو مکتہ ارادہ تو کنارہ ہی بہت ہے
کچھ سمت ہی سوجھے، ظفر، اس تیرہ شمی میں
سُورج نہیں ملتا تو ستارہ ہی بہت ہے

ظفر اقبال

آکٹے پہ اتنا جو غبار آیا ہوا ہے
کیسا یہ طبیعت میں نکھار آیا ہوا ہے
سر پر سے جھٹک دی ہے کسی رنج کی گٹھڑی
آسمان ہے سفر، اور، قرار آیا ہوا ہے
مہکے ہوئے سے ہیں جو فراغت کے یہ گل پھول
ہر سمت عجب رنگ۔ بہار آیا ہوا ہے
اس درجہ سہولت سے رواں ہے جو مسافر
ہر مرحلہ سخت گزار آیا ہوا ہے
پانی بھی ہے خاموش، کنارے بھی سدا مت
دریائے محبت میں اُتار آیا ہوا ہے
روکی ہوئی ہے خود کوئی چلتی ہوئی تصویر
منظر کوئی بے نقش و نگار آیا ہوا ہے
ہر طرح کے خواب اور خیالات سے خالی
کیا سلسلہ لیل و نہار آیا ہوا ہے
کچھ رہ گیا ہے دُور حماقت کا زمانہ
کچھ عقل کے اندر بھی سدھار آیا ہوا ہے
بھولا ہوا ہے شہر کا نقشہ ہی ظفر کو
حالانکہ یہاں پر کئی بار آیا ہوا ہے

احسان اکبر

ہر اک کا ظرف جدا ہے مرا سہو مرا دل
مرا جہاں مری دنیاے چار سو مرا دل
جواں رہا کہ رہا اہل آرزو مرا دل
وہ رہنما مرا ساتھی، مرا عدو، مرا دل
یہ فاصلے تو رقیبوں کے ہیں بڑھائے ہوئے
دگرہ میں تجھے جاں کی طرح تھا، تو مرا دل
اداس کر گئی اک موجِ سرور مہری یار
رہا ہے ورنہ سدا وقفِ ہاؤ ہو مرا دل
گریز میں تھا شکوہ جہان گزراں سے
تلاشِ خیر کی، مصروفِ جستجو مرا دل
وہ بات بات میں تیرا ہی دیکھتا تھا منہ
ترے خیال سے رکھتا تھا گفتگو مرا دل

احسان اکبر

زمین بچانے کا اپنا ہی فیصلہ نہیں تھا
زمانہ ورنہ زمانہ ہی تھا خدا نہیں تھا
رقیب تھا جو مرے ہم قدم یہ حالت تھی
کہ اک قدم جو اٹھایا تو دوسرا نہیں تھا
یہی وہ ہاتھ کہ اٹھے نہ جو سوال کے ساتھ
انہی لبوں پہ خن بھیک مانگتا نہیں تھا
یہ دیکھنا ہے کہ گھر کس کی ذمہ داری ہے
سوال اس کا نہیں کوئی گھر پہ تھا نہیں تھا
تمام مذہبی آتے گئے تصور میں
خصوصاً آپ نے تھے ذکرِ آپ کا نہیں تھا
وطن کی دولتیں، اس کا مفاد، لوگ، وقار
خواص و عام میں کوئی بھی دیکھتا نہیں تھا
ہر اک نے مانگی ہے احسان چھاؤں اپنے ہاں
گلی کا پیڑ کسی گھر کا مسئلہ نہیں تھا

انور شعور

بالآخر اُسے ہم نے پایا ضرور
 لگی دیر لیکن وہ آیا ضرور
 نہ تھا پاس گو بے کسی میں کوئی
 کسی نے میرا ڈکھ بتایا ضرور
 جو تیری خوشی، وہ ہماری خوشی
 ہمیں غم پہ غم دے دیا ضرور
 جسے ہم نے گمراہ دیکھا اُسے
 بُرا اور اچھا بتایا ضرور
 کوئی فوت ہوتا تھا، یادش بخیر
 تو آتا تھا اپنا پرایا ضرور
 کہاں دکھ سکے شیخ ثابت قدم
 مجھے راستے پر لگایا ضرور
 ترقی نہ کرنے کا ماہر ہوں میں
 جو موقع ملا وہ گنوا یا ضرور
 ہوئے ٹرخرو وہ ہمیں مار کر
 ہمارا لٹو رنگ لایا ضرور
 بچایا نہیں ہم نے مالِ حرام
 کھلایا ضرور اور کھلایا ضرور
 سنا نام جب بھی کسی زہر کا
 شعور آپ نے آزمایا ضرور

انور شعور

کام آئی مشق ماہ و سال کی
 ہو گئی عادت ہمیں ہر حال کی
 جان لیں تو لوگ جلنا چھوڑ دی
 ہے وہ حالت اس بلند اقبال کی
 نقل کرتے ہیں مصور آپ کے
 قد و قامت اور خذ و خال کی
 تھی دوائے مے ہمیں اتنی مفید
 ہم نے پوری عمر استعمال کی
 عرش تک جاتی ہے اے صیاد آہ
 طائرانِ بے پر و بے بال کی
 عمدہ گانے شوق سے سنتے ہیں سب
 ہو نہ ہو کوئی سمجھ سُر تال کی
 رات کو کرتے ہیں ہم فکرِ سخن
 اور دن کو فکر آئے دال کی
 ہوتی ہے کنبوں کی قسمت شعور
 مال و زر ہوتے ہوئے کنگال کی

سرمد صہبائی

بناتی ہے نظر تصویر آب آہستہ آہستہ
کہ ہے پھر تشنگی جو سراب آہستہ آہستہ
اکیلی شام یوں گلیوں مکاؤں سے گزرتی ہے
پھرے سینے میں جیسے اضطراب آہستہ آہستہ
شب تنہا بچانے میں کسے آواز دیتا ہوں
نجانے کون دیتا ہے جواب آہستہ آہستہ
تیرے ہوتے ہوئے دنیا کا ہم کو غم نہ تھا لیکن
ہوا پھر ایک یہ غم بے حساب آہستہ آہستہ
ہوئی رنگیں کسی کے پر تو دیدار سے چلمن
پلک نہتی رہی اک تار خواب آہستہ آہستہ
تری کھڑکی پہ تجھ کو دیکھنے جب رات رکتی ہے
گزرتا ہے گل سے ، ہتاب آہستہ آہستہ
کسے نئی فرصت اجراں کسے یوں عشق لاحق تھا
ہوا ہے حال اس دل کا خراب آہستہ آہستہ
اڑاتا ہے مجھے رخش جنوں دوش قیامت پر
کہ برق تیز تر ہے ہمرکاب آہستہ آہستہ
ہمیں مرنے کی خواہش اور وہ مرنے نہیں دیتا
عجب ظالم ہے دیتا ہے عذاب آہستہ آہستہ
فماہر لمس تھا بہتا گیا عمردن کی مستی میں
ہوئی یہ بے کراں موج شراب آہستہ آہستہ
کہاں ہم اور کہاں یہ عالم حجر بیاں سرمد
کوئی پڑھتا ہے اس دل کی کتاب آہستہ آہستہ

سرمد صہبائی

گھٹلا ہے سینہ گل، ہے چراغ مشکبہ عریاں
کوئی پہلوئے شب میں ہو رہا ہے ٹوٹو عریاں
کلی کے نرم تالو میں کوئی نقشِ دمیدہ ہے
حجابِ نیم وا میں ہے کوئی شوقِ ٹٹو عریاں
ہمکتی ہے بلوغت کی مہک اس گنجِ کم سن میں
خیم زہرہ پہ ہوتا ہے غبارِ سبز ٹٹو عریاں
عجب اک خلوتِ دیدار میں گم ہو گئیں آنکھیں
دم حیرت نہیں گھٹتا کہ یہ میں ہوں کہ ٹٹو عریاں
پری ہے یا بلا کوئی لیے پھرتی ہے جو ہم کو
کہیں ظاہر کہیں غائب کبھی اوجھل کبھو عریاں
اڑی آپ بدن اُس تنگی پوشاک سے باہر
ہوئی پھر بھیدی صہبا سے جام و سبو عریاں
اسی چشمِ فسوں سے جسم و جاں کی رت بدلتی ہے
کعبِ دستِ جہا میں ہے گلِ صد آرزو عریاں
خرامِ یار میں سنبھلے کہاں وہ مضطرب آنچل
کبھی سید شریں عریاں کبھی چاک ٹٹو عریاں
تڑپ کر موجِ زریں ساقِ ساحل سے پھتی ہے
کنارِ آب جب ہوتا ہے میرا ماہِ زو عریاں
یہاں پردے ہزاروں ہیں کسی کو کیا دکھائی دے
وگرنہ رات دن سرمد پھرے ہے گوبلو عریاں

محمد اظہار الحق

تلازمے شاعری کے سب رفتگاں سے لیں گے
سرشک بلبل سے، رنگِ رُخِ زعفران سے لیں گے
لیں گے آئندگاں کو تہریز اور حب میں
گئے ہوؤں کی نشانیاں اصفہاں سے لیں گے
الگ بنائیں گے ہم کہیں کائنات اپنی
زمین سے معشوق لیں گے، چاند آسمان سے لیں گے
بیاں کریں گے دراصل رخسار کی حکایت
مگر ذرا اک گنا یہ آبِ رواں سے لیں گے
جو راستہ بھول بھی گئے دھبے بے کسی میں
مدد بھٹکتے ہوئے کسی کارواں سے لیں گے
ہمیں بنائیں گے مشت بھر خاک سے مکرر
یہ مشت بھر خاک، جسم کے خاکداں سے لیں گے
میں ان کے کھنکول میں زمینیں تو ڈال دوں گا
مگر یہ دریوزہ گر مضامیں کہاں سے لیں گے
سگانِ دربار کون ہیں قدر کرنے والے
ہم اپنا اکرام اپنے خواندگاں سے لیں گے

محمد اظہار الحق

چہار جانب سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں
کوئی محافظ تو ہے جو اب تک بچا ہوا ہوں
مجھے پہنچتا ہے شام تک دوسرے کنارے
نہ جانے کیوں خیمہ بدن میں رکا ہوا ہوں
دعا کرو بن سکوں گلوبند عاشقوں کا
میں تارِ افسوس سے غموں پر گڑھا ہوا ہوں
میں اسمِ اعظم ہوں، یا شبِ قدر، جو بھی کچھ ہوں
عیوں نہیں! آجوں کے اندر مٹھا ہوا ہوں
کبھی مرے سامنے ہیں عفریت دست بستہ
کبھی میں دھیمک زدہ عصا پر کھڑا ہوا ہوں
زہے وہ مہماں جو آسمان سے اتر رہا ہے
میں پائداں بن کے سامنے خود جھکا ہوا ہوں
میں اپنے ہی در پہ اپنے مٹنے کا منتظر ہوں
ملوں گا لیکن ابھی تو باہر گیا ہوا ہوں
مجھے بتایا گیا تھا پرہیز مہِ رُخوں سے
میں کر نہ پایا سو عشق میں مبتلا ہوا ہوں
اب اس کا کیا ذکر چاند تھا یا چراغ تھا میں
جہیں تھا یا کوئی چشم، اب تو بجھا ہوا ہوں

صابر ظفر

وہ ڈوبوئے گل ہے دُعا ماورائے گل
خوشبو کی طرح کرتا ہوں مددِ خداے گل
بکھرے جو گل تو صرفِ نظراب کریں بطور
وہ بلبلیں کہاں جو پکاریں کہ ہائے گل
گل چور پھر رہے ہی گلستاں میں جا بجا
حتیٰ کہ باغبان کی بیٹی بڑائے گل
کچھ پتیاں ہوائے اڑائیں میری طرف
دل چیرتی رہی سرِ مقتلِ صداے گل
گل کی طرح تو ہو نہیں سکتا وہ سُرخ رو
ہے اور جائے خار تو ہے اور جائے گل
بہتا ہوا جدھر برا لختِ جگر گیا
میں نے اُسی طرف، بہنور اندر بہائے گل
کھلتا اگر ہے بخول تو مڑ جانے کے لیے
گویا ہے یہ گلشنِ غنچہ، سزائے گل
گلچیں بھی ایک ہے تو مسیحا بھی ایک ہے
ہم تو دوائے دل ہی کو سمجھیں دوائے گل
پڑمرہ ہیں جو خانہ بدوشوں کی شکل میں
فٹ پاتھ پر نجانے وہ کس نے گرائے گل

اس گلشنِ جہاں میں مرے یار کے سوا
کوئی مجھے گلاب سے بہتر دکھائے گل
حیرت ہے اُس کو سایہ گل کی ہے آرزو
کھلتا ہے جس کی شفقتوں کے سائے گل
میں باغ میں رہوں بھی تو اب کس کے واسطے
کچھ اجنبی پرندے ہیں اور کچھ پرانے گل
سُورج مکھی ہی گھومے ہے سُورج کے ساتھ ساتھ
ورنہ کسی کے واسطے سر کب گھٹمائے گل
شبِ نیم سے لُوحِ گل پہ میں لکھتا ہوں صبحِ دم
پڑھتا ہے کون میری لکھت کو سوائے گل
بے نور ہے تو آج بھی زُمر ہے گریہ ناک
یعنی کہاں ہوا عرقِ گل، شقائے گل
نسبت نہیں تھی پہلے تو دل کو کسی سے بھی
اب جو لہو لہو ہے تو ہے آشنائے گل
آئے نہ آبِ گل میں ظفرِ رنگِ گل بھی
صدِ بچ و تاب چاہے کسی طور دکھائے گل

نصیر احمد ناصر

ہجر میں بھی وصال ہیں مجھ میں
روح پرور کمال ہیں مجھ میں
سارے زیور، ظروف چاندی کے
ٹھیکرے ہیں، سفال ہیں مجھ میں
چند ذرات چکنی مٹی کے
آئے کی مثال ہیں مجھ میں
کتے بچے اچھلتے پھرتے ہیں
کتے بوڑھے ٹدھال ہیں مجھ میں
اس لیے اس قدر چمکتا ہوں
کچھ ستارہ جمال ہیں مجھ میں
مجھ میں مشرق ہے اور مغرب بھی
سب جنوب و شمال ہیں مجھ میں
جانے کیا کیا اٹھائے پھرتا ہوں
جانے کیا کیا وبال ہیں مجھ میں
اُن گنت جانور، درندے ہیں
آدی خال خال ہیں مجھ میں
خود سے لڑتا سرشت ہے میری
الف جنگ و جدال ہیں مجھ میں
کھینچتی ہے کشش زمینوں کی
کائناتی اچھال ہیں مجھ میں
کیمیائی عمل میں ہوں اب تک
ارتقائی اُبال ہیں مجھ میں

میرے اندر سماج ہے پورا
سارے رشتے بحال ہیں مجھ میں
مجھ میں تاریخ کی اُداسی ہے
فلسے پائمال ہیں مجھ میں
میں زمانے کا پیش رو ساتھی
وقتِ رفتہ کے سال ہیں مجھ میں
مجھ میں تاریخ کی قدامت ہے
سب عروج و زوال ہیں مجھ میں
جو ابھی خام، نیم پختہ ہیں
وہ زمانے بھی پال ہیں مجھ میں
میں کہ صدیوں کا ٹکبوتی ہوں
تاہ پختہ کے جال ہیں مجھ میں
ایک دن مجھ کو سوچ کر دیکھو
کیسے کیسے خیال ہیں مجھ میں
میں ازاں کا ذہن پٹواری
فرد اور انتقال ہیں مجھ میں
گھر بناو یا بیج ڈالو انہیں
چند مرے، کنال ہیں مجھ میں
مجھ سے پوچھو نہ زندگی کیا ہے
مرگ آسا ملال ہیں مجھ میں
مشتعل ہو کے مجھ سے مت ملنا
چوبِ خستہ کے ٹال ہیں مجھ میں

ایک انگینت چاہیے مجھ کو
 کتنے ڈھیروں زغال ہیں مجھ میں
 مجھ میں ہولی منا کے دیکھو تو
 سر سے پا تک گلال ہیں مجھ میں
 درد ہے اب نہ چوٹ باقی ہے
 چند شیشے کے بال ہیں مجھ میں
 شوق پرواز دانگی ہے مرا
 کچھ پرندے اکال ہیں مجھ میں
 خشک و تر کا عظیم خطہ ہوں
 ست سمندر و شمال ہیں مجھ میں
 مجھ میں ڈبکی لگا کے دیکھو تو
 کتنے بے تھاہ تال ہیں مجھ میں
 اس قدر مجھ میں ریگ زار بھی ہیں
 جس قدر ورش کال ہیں مجھ میں
 اتنا گنجان ہو گیا ہوں میں
 راستے بھی محال ہیں مجھ میں
 اصل کیا ہے، سمجھ نہیں آتی
 اس قدر گول مال ہیں مجھ میں
 کچھ زمانے بعید ہیں مجھ سے
 کچھ زمانوں کے حال ہیں مجھ میں
 کچھ تو ہیں نیلگوں ہمیشہ سے
 کچھ ہرے اور لال ہیں مجھ میں

کچھ تناور تھے، کاٹ ڈالے گئے
 کچھ شجر نونہال ہیں مجھ میں
 میری اس بات کا یقین کرو
 سر بسر احتمال ہیں مجھ میں
 جن کا ہلنا نہیں جواب کہیں
 ایسے کتنے سوال ہیں مجھ میں
 میں زمیں کا حقیر و درباری
 سونے چاندی کے تھال ہیں مجھ میں
 کس بلا کا اذیت ہوں میں
 زخم بھی اندمال ہیں مجھ میں
 مجھ کو مجھ سے ڈراتے رجتے ہیں
 بھوت، روحیں، کراں ہیں مجھ میں
 میری پہچان چند برتن ہیں
 چند اچھے کھال ہیں مجھ میں
 مجھ میں آباد ہے ابھی گاؤں
 کھیت، بٹے، کمال ہیں مجھ میں
 یوں ہوا میرا جسم سہلائے
 جیسے ریشم کے باں ہیں مجھ میں
 خواہشوں کا عزار ہوں ناصر
 لوگ غور دھال ہیں مجھ میں

خالد اقبال یا سر

پکڑ کے ہاتھ قدم قدم مجھے لے گیا
 ترا خیال، مرا قلم مجھے لے گیا
 زکا ہوا تھا جو تیرے گوشہ چشم پر
 بہا کے ساتھ وہ بوند غم مجھے لے گیا
 ہزار غم تھے اکیلی جاں کو لگے ہوئے
 نہ جانے کب کوئی ایک غم مجھے لے گیا
 ستم بلا کے ہٹا سکے نہ مقام سے
 تری جبین کا خفیف خم مجھے لے گیا
 پہنچ سکا نہ کوئی جہاں پہ وہاں وہاں
 مرا گمن، ترا بھرم مجھے لے گیا
 میں دم بخود وہیں رہ گیا جسے دیکھ کر
 صنم کدے سے وہی صنم مجھے لے گیا
 اسیری تھی وہ کہ ہماری یہ پتا نہیں
 نگاہ کا تری جامِ جم مجھے لے گیا
 کوئی خبر نہ یہاں وہاں کی مجھے رہی
 ترا جمال، تری قسم! مجھے لے گیا
 خموشیاں بھی تری غضب تھیں مرے لیے
 کلام کا ترے زبردِ ہم مجھے لے گیا

اُلجھ گیا تری مرکبوں کے رچاؤ میں
 ترا وہ بھڑ سبھاؤ، سم مجھے لے گیا
 کہاں کہاں نہ تری شبیہ لیے پھری
 کہاں کہاں نہ مرا شکم مجھے لے گیا
 زکا نہ رودکب عمر خود سے مرے لیے
 بھٹک بھٹک کے سوئے عدم مجھے لے گیا
 نکل گیا تھا میں دور اپنی زمین سے
 تلاش کر کے مرا کٹم مجھے لے گیا

شعیب بن عزیز

دلہا آباد کا برباد بھی ہونا ضروری ہے
جسے پانا ضروری ہے اُسے کھونا ضروری ہے
مکمل کس طرح ہو گا تڑشا برق و باراں کا
ترا ہنسنا ضروری ہے، مرا ہونا ضروری ہے
بہت سی سُرخ آنکھیں شہر میں اچھی نہیں لگتیں
ترے جاگے ہوؤں کا دیر تک سونا ضروری ہے
کسی کی یاد سے اس عمر میں دل کی ملاقاتیں
ٹھٹھرتی شام میں اک دھوپ کا کونہ ضروری ہے
یہ خود سر وقت لے جائے کہانی کو کہاں جانے
مصنف کا کسی کردار میں ہونا ضروری ہے
جناب دل بہت نازاں نہ ہوں داغِ محبت پر
یہ دُنیا ہے یہاں یہ داغ دھونا بھی ضروری ہے

شعیب بن عزیز

مجھے اُس سے کوئی خطرہ نہیں ہے
کہ میرا دوست مجھ جیسا نہیں ہے
یہ کس بستی میں لے آیا ہے رستہ
درختوں کا جہاں سایہ نہیں ہے
ہوا ڈر ڈر کے چلتی ہے یہاں پر
یہاں دریا ہے جو بہتا نہیں ہے
کسی چہرے سے لب گھرچے ہوئے ہیں
کسی آواز کا چہرہ نہیں ہے
لکھا رکھا ہے عہدِ ترکِ الفت
مگر دل دستخط کرتا نہیں ہے

حمیدہ شاہین

میرے جوتے مرے اپنے ہی لہو سے تر ہیں
چار سو گنگ درتچے ہیں، مقفل در ہیں
اک روایت میں کہا تھا تری بستی نے مجھے
بے خطر آ، کہ یہاں سب ترے اپنے گھر ہیں
ہم یہاں کیوں ہیں، اُسی شخص نے پوچھا ہم سے
جس کو معلوم تھا، ہم اس کے بھروسے پر ہیں
اپنے شانوں پہ نکلی چھت کو بتاؤں کیسے
میری درزوں میں چھپے نم سے مجھے کیا ڈر ہیں
جا بنا لے بری پٹری سے تو دستار نئی
یہ بلائیں مجھے کافی ہیں، جو میرے سر ہیں
ہم نے رکھ دی ہیں تماشے کی آنی پر آنکھیں
تجربہ تھی کہ یہاں آپ تماشا گر ہیں
سورۃ الناس کے ہالے میں کھڑی ہوں غم صم
ہر طرف مست گن شور مچاتے شر ہیں
دھوپ نے پہلے قدم پر ہی بتایا تھا مجھے
کون سے بیڑ یہاں صاحب کزدفر ہیں

حمیدہ شاہین

بچے ہمیں رہے ہیں خدوخال اب و جد
اب ان کے ہاتھ میں ہے نظام قبول و رد
جننے لگی ہے گرو تغافل متون پر
اب حاشیہ فروش دکھائیں گے شد و مد
ہر بات پر سند ہے محائف کی تیرے پاس
پھر کیا دلیل اور کہوں کی ہے رڈ و کد
اعداد نے ہمیں تو لگائی ہے ایسی چُپ
بس میں شمار ہے نہ تصرف میں کوئی حد
تاریخ کو دکان سمجھتے ہیں بد قلم
کیسے ملا جلا کے سجائے ہیں ٹیک و بد
ہر سمت ہے ستائش پیہم کا انعقاد
سب ایک دوسرے کا بڑھائیں مقام و قد
وعدوں معاہدوں کا ، امیدوں کا سلسلہ
اک مستقل فریب ، مسلسل حصار و زد

نسیم سحر

کیسی خوشبو مرے وجود میں ہے!
یوں لگے، تو مرے وجود میں ہے
جانبِ دشت کھینچتا ہے مجھے
کوئی آہو مرے وجود میں ہے
میں تو بکھرا ہوا ہوں صدیوں سے
کوئی یکسو مرے وجود میں ہے
لئے جاتا ہے مجھ کو سوائے فلک
جو پکھیز و مرے وجود میں ہے
جانے کب آنکھ تک پہنچ پائے!
یہ جو آنسو مرے وجود میں ہے
آج میں لکھ رہا ہوں اور ہی کچھ
آج باہو مرے وجود میں ہے
روشنی کی طلب نہیں ہے مجھے
ایک جگہ مرے وجود میں ہے
ترک دنیا پہ ہے مصر کب سے
یہ جو سادھو مرے وجود میں ہے
میں ہوں پنجاب سے نسیم سحر
اور اردو مرے وجود میں ہے

نسیم سحر

کیسی پیغام رسانی، سائیں؟
حال کہا ہے زبانی، سائیں!
آئے کچھ مجھ میں روانی، سائیں
بھج اس سمت بھی پانی، سائیں!
علم تیرا بھی سر آنکھوں پہ، مگر
دل نے کچھ اور ہے ٹھانی، سائیں
بالکا تیرا جو رہتا تھا یہاں
کر گیا نقل مکانی، سائیں
تو تو واحد ہے، میں یہ ماننا ہوں
ہے کوئی میرا بھی ثانی، سائیں؟
کیا ملا تجھ کو بھی ایسا کر کے؟
خاک کیوں دشت کی چھانی، سائیں
وہ ہوا جو تجھے معلوم نہ تھا
کیا ہوئی وہ ہمہ دانی، سائیں؟
پھاڑ دے اپنے یہ بوسیدہ ورق
اب کوئی اور کہانی، سائیں
کچھ ادھر کی بھی خبر ہے کہ نہیں؟
یہ تو تھا عالم فانی، سائیں

انجم خلیق

بس کہ مرنے پر نہیں تیار ہم
اس لیے زندہ ہیں ہمارا صرار ہم
ایک جرمِ زیست کی پاداش میں
دار پر کھینچے گئے سو بار ہم
صبح سے تا شام، اک عرصہ ہوا
چاہتے ہیں روند یہ دیوار ہم
آشنا یارب نہ مل جائے کوئی
بیچنے کو لائے ہیں دستار ہم
آپ کی حیرت بجا، لیکن جناب
کر بھی سکتے تھے کبھی انکار ہم
سب مظاہر کیا تھا ہو جائیں گے
پھول، جھرنے، ثابت و سیار ہم
اک تو انجمِ دل ہے خود ایذا طلب
اور پھر اس کے مشیرِ کار ہم

طارق نعیم

میں کائنات سے پہلے جہاں جہاں گیا تھا
ترا خیال مرے ساتھ ہی وہاں گیا تھا
مہ و نجوم کو دیکھوں تو یاد پڑتا ہے
یہیں کہیں سے کبھی میرا کارواں گیا تھا
اڑان روک کے یکدم مجھے گزرنا پڑا
پروں کے زور سے ورنہ یہ آسماں گیا تھا
تم آئے تھے تو مجھے مل کے ہی چلے جاتے
یہیں زمین پہ تھا اور میں کہاں گیا تھا
پلٹ کے دیکھ نہ لیتا اگر وہ جاتے ہوئے
تو میرا جان سے جانا بھی رایگاں گیا تھا
اسے زمانہ ہوا تھا ہدف بنائے ہوئے
ذرا میں آنکھ جھپکتا تو وہ نشاں گیا تھا
کسی میں تاب نہیں تھی کلام گزرنے کی
میں ایک بار ستاروں کے درمیاں گیا تھا
اڑی ہوئی تھی ہوا سے مکالے کی خبر
دیا کچھ اور نہ جلتا تو بادباں گیا تھا

شاہین عباس

ہم اپنے غیب کا غوغا ہی جا بہ جا کریں گے
کہاں کہاں پہ نہیں ہم ، یہ سب پتا کریں گے
سکوت ذہن نشیں کر رہے ہیں شہر کے لوگ
یہ ان کہانیوں کو جمع کر کے کیا کریں گے
کنار خواب رواں ، ہم مغالطے میں رہے
جب اُوک خالی کریں گے تو بھر لیا کریں گے
نہ ہم سے وصل کھل ہوا نہ ہجر ہوا
ہمارے ساتھ بدن کیا معاملہ کریں گے
یہ اک ہجوم جو میں بھی ہوں اور تو بھی ہے
رہے گا ایک ہی ، اور ایک کو بڑا کریں گے
پھر اک سرے سے ملا دیں گے جا کے اگلا سرا
ہم اپنے ممکن و موجود کو نیا کریں گے
میں جن گھروں میں رہا بھی ہوں اور نہیں بھی رہا
وہ بدلہ لینے پہ آئے تو جانے کیا کریں گے
ذرا سا خود پہ نہیں ہیں تو آ ملے ہیں ، سواب
ہنسی کو پورا کریں گے ، بلا جُلا کریں گے

شاہین عباس

سب جانتے ہوئے بھی میں انجان کب ہوا
اچھا بھلا مقیم تھا ، مہمان کب ہوا
وہ تو زمانے آ گئے خود چل کے اٹے پاؤں
ورنہ کسے پتہ تھا کہ نقصان کب ہوا
جسموں کے جسم لگ گئے اور کچھ نہ بن پڑا
جو ہجر تھا ، حجاب تھا ، پہچان کب ہوا
مٹی کو سب خبر ہے ، بتاتی نہیں مگر
یہ شہر میرے حق میں بیابان کب ہوا
ہونا پڑا ہے بارہا ، یعنی ہزار ہا
ہونا اس ایک بار کا آسمان کب ہوا
سرگوشیاں ہوئیں کہ یہاں ہو گیا ہے کچھ
میں جا چکا جہان سے ، اعلان کب ہوا
گٹھڑی بھی سرگی سر پہ رہی ، گھر بھی آ گیا
اب کیا کہوں میں بے سرو سامان کب ہوا

خاور اعجاز

ہر جگہ ٹیل و قال کرتا ہوں
بات پر حسبِ حال کرتا ہوں
تل برابر ہے گفتگو میری
اس لیے خال خال کرتا ہوں
منہ پہ کہتا ہوں جو بھی کہتا ہو
کوئی دھوکہ نہ چال کرتا ہوں
جی رہا ہوں اور پھر آپ پوچھے ہیں
عشق میں کیا کمال کرتا ہوں
کہہ تو سکتا ہو عین بھی سب لیکن
دوستوں کا خیال کرتا ہوں
کوئی بھی کام مجھ کو راس نہیں
حد سے حد ایک سال کرتا ہوں
پوچھتے کیا ہو کاروبار مرا
نہیں غزل کو غزال کرتا ہوں
صدیاں برباد کر چکا ہوں اور
سامتوں کا ملال کرتا ہوں

احمد حسین مجاہد

برف پر آگ جلاتا ہوں ، اُلجھ جاتا ہوں
تجھ کو کیا یاد دلاتا ہوں ؟ اُلجھ جاتا ہوں
کتنے آباد ہیں یہ دونوں کنارے میرے
اک ذرا موج میں آتا ہوں ، اُلجھ جاتا ہوں
اب ہے یہ فکر کہ ہو اُس کی تواضع کیسے
دودھ میں شہد ملاتا ہوں ، اُلجھ جاتا ہوں
مجھ سے بنتے نہیں باہل کے معلق باغات
تیری تصویر بناتا ہوں ، اُلجھ جاتا ہوں
یہ نہ ہو تجھ کو نظر آئے بس اپنی صورت
آئینہ تجھ کو دکھاتا ہوں ، اُلجھ جاتا ہوں
میرے ہاتھوں سے چپک جاتے ہیں اک خوف کے سانس
پاؤں سے چاک گھماتا ہوں ، اُلجھ جاتا ہوں
تجھ پہ کھلتے ہی نہیں یہ مرے آتش پارے
میں تجھے شعر سناتا ہوں ، اُلجھ جاتا ہوں

ناصر علی سیّد

بلا کی دھوپ ہے، شاید نہ تاب لائے ہوا
چنے گی، دیکھنا ڈر ڈر کے سائے سائے ہوا
عجیب موسم جاں ہے کہ دھڑکتیں رو دیں
زوال لحوں کی رگ رگ میں سرسرائے ہوا
بہت ہی کھلتی سی رنگت کے شام لحوں کو
نظر یہ کس کی لگی ہے کہ خوں اڑائے ہوا
ذرا سی دیر کو رکتی، تو پوچھ بھی لیتا
لگا کے آگ تو بس بھاگتی ہی جائے ہوا
یہ خشک آنکھوں میں دریا کہاں سے آیا ہے
یہ کون آگ کو دل کی دکھائے جائے ہوا
یہ کیسی وادی، نفرت میں قافلہ اترتا
کہ شمعیں پیار کی پل پل بجھاتی جائے ہوا
مکان دل میں تھکن ہے کہ بڑھتی جاتی ہے
دریچے سینے کے کھولو کہ آئے جائے ہوا

انجم بارہ بنکوی

جھوٹی باتیں جھوٹے لوگ
سبتے رہیں گے سچے لوگ
ہریالی پر بولیں گے
ساوان کے سب اندھے لوگ
دو پیسے میں مہنگے ہیں
کرواروں کے سستے لوگ
میری گزارش کیا سنتے
اونچے قد کے چھوٹے لوگ
غیر تو آنسو پونچھیں گے
دھوکہ دیں گے اپنے لوگ
ایک جگہ کم ملتے ہیں
اتنے سارے اچھے لوگ
اس جیون میں گھوم چکے
آدھی دنیا پورے لوگ
برسوں میں پھر دیکھیں ہیں
ان آنکھوں نے نئے نئے لوگ
ہر بستی میں ہوتے ہی
بھولے بھالے پیارے لوگ
صدیوں پہلے ہوتے تھے
اپنی دھن کے پتے لوگ
ہر محفل میں کرتے ہیں
اوجھی حرکت اوجھے لوگ

نرجس افروز زیدی

عابدہ تقی

میری آنکھوں سے جو بیزار ہوا چاہتا ہے
دل اسی خواب میں سرشار ہوا چاہتا ہے
پاؤں میں آبلے پھولوں سے بھی پڑ جاتے ہیں
کس لیے دشت سبکار ہوا چاہتا ہے
پھر بھی اے موسم رفتہ تجھے آواز تو دوں
مجھ کو معلوم ہے انکار ہوا چاہتا ہے
آنکھ پابند تماشہ ہے دگر نہ یہ کھیل
اب مرے واسطے بیکار ہوا چاہتا ہے
مجھ کو بے ساختہ دنیا پہ ہنسی آئی ہے
یعنی اب گریہ لگاتار ہوا چاہتا ہے
میں کہاں تک نظر انداز کروں گی اس کو
جو تماشہ ہنس دیوار ہوا چاہتا ہے
اے خدا مجھ کو دوبارہ نئی مٹی سے بنا
یہ لبادہ مرا آزار ہوا چاہتا ہے
ایک دلچسپ حکایت ہے محبت اور دل
اس حکایت کا گرفتار ہوا چاہتا ہے
میں خسارے میں ہوں لیکن تجھے دیکھا تو لگا
اس خسارے سے مجھے پیار ہوا چاہتا ہے

نہ تھا ممکن جو اس امکان سے آئی ہوئی ہوں
اس کنارے پہ میں طوفان سے آئی ہوئی ہوں
یونہی پھیلاؤ نہ رہ رہ کے پھسلنے کا ہراس
میں تو چوٹی پہ بھی ڈھلوان سے آئی ہوئی ہوں
تم کہانی میں ہو اک عارضی کردار مگر
میں رہوں گی کہ میں عنوان سے آئی ہوئی ہوں
میں کسی گوزدہ نامت کی محتاج نہیں
دام دریا میں دل و جان سے آئی ہوئی ہوں
ایک خطبے سے بدل آئی ہوں طاقت کا نصاب
تخت کو جیت کے زندان سے آئی ہوئی ہوں
کوچہ عشق میں اک تم کہ یقین سے خالی
میں عقیدہ لیے ایمان سے آئی ہوئی ہوں
اب غلافوں میں نہیں زندہ حقیقت رہتی
باہر اس واسطے زندان سے آئی ہوئی ہوں

صائمہ علی زیدی

مجھ سے بھی سوا ہیں ہیں غم ہوا کے
 ٹھہرے نہ کہیں قدم ہوا کے
 کس قریہ آب و گل سے آئی
 عارض ہیں جو اب بھی نم ہوا کے
 بکھرا گئی میرے پھول سارے
 دیکھے تو کوئی ستم ہوا کے
 یہ بیڑ نہیں کٹے ہیں اب کے
 گھر ڈھے گئے دم بہ دم ہوا کے
 لے آتی ہے ساتھ تیری خوشبو
 دل پہ ہیں بڑے کرم ہوا کے
 داں پہنچیں کہانیاں ہماری
 جس جا بھی پڑے قدم ہوا کے

صائمہ علی زیدی

زخمِ سحر کا رنگ اور، نشتِ شام اور ہے
 اب کے جنوں میں وحشت ماہِ تمام اور ہے
 عشق ہے کیا، کمالِ دل، عشق ہے کیا، غزالِ دل
 اس کا جہلِ زمِ جدا، اس کا خرام اور ہے
 جادہ فکر و فن پہ یہ کس کی صدا کے نقش ہیں
 تابشِ حرف ہے سوا، رنگِ دوام اور ہے
 بادہ کشانِ شعر کو درِ مئے خن سے کیا
 منصبِ خاص ہے الگ، شہرتِ عام اور ہے
 سیرِ چمن میں بھی وہی، ہجر کے بن میں بھی وہی
 لالہ بھی گل سہی مگر اس کا مقام اور ہے
 کہنے لگی ہوئے شب، چشمِ چراغ کی ہو خیر
 حُسنِ سحر کے باب میں نیتِ بام اور ہے
 اک سرے دل کی آرزو، اک مری آرزو کا دل
 اس کا مقام دل میں ہے، اُس کا مقام اور ہے

صدف مرزا

مگر ہواؤں کے لہجے میں ہے نمی اب تک
وہ اک ذرا سی جو رنجش تھی گزرے وقتوں کی
نہ بھول پائے اسے آپ؟ واقعی؟ اب تک؟
تمام لوگ، مقامات، سب ہی ہیں موجود
کہانی کار! کھلتی ہے اک کی اب تک
بدن ہے نیلا اسی زہر سے تعلق کا
صدف وہ بات رہی ہے جو آن کہی اب تک

فضائیں رقص کناں، اور نے وہی اب تک
کسی کے ہونٹوں کو چھوتی ہے بانسری اب تک
سبق وہ دیتے ہیں توحید کے مجھے ہر دم
سجائے پھرتے ہی جو دل میں مورتی اب تک
مرے عصائے محبت کا معجزہ ہے یہی
ہے اپنی سوچ میں گم میرا سامری اب تک
بتا رہے ہیں جو صدیوں سے چڑھ کے منبر پر
حقوق، قبلہ! وہ سارے ہیں کاغذی اب تک
سو اب روا ہے کہ دیکھے وہ سرکشی میری
سمجھ ہی پایا نہ جو رنگِ عاجزی اب تک
مرے جنوں میں بھی اب تک کی نمی آئی
خیال اس کا بھی شاید ہے منطقی اب تک
تلاشت ہے ستاروں پہ جو، بتاؤ اسے
بھٹکتی پھرتی ہے غاروں میں زندگی اب تک
یہاں کسی کی بھی جاں کو اماں ملے گی نہیں
عجیب نعرے لگاتے ہیں متقی اب تک
ابھی تلک دل مضطر کی آس باقی ہے
کسی کی آنکھ میں مخنی ہے دبیری اب تک
یقین نہیں ہے جنہیں اپنے دل کی میت پر
بدل رہے ہیں وہ اندازِ بندگی اب تک
میں جانتی ہوں کہ اُس نے بھلا دیا ہے مجھے

جنید آذر

اُٹھ..... کوچہ خمار سے رختِ سفر اُٹھا
 اے یادِ یار زانوئے حسرت سے سہرا اُٹھا
 اب ڈھونڈ کوئی اور سہولت قیام کی
 نوکِ مژہ پہ خاکہ دیوار و در اُٹھا
 یہ کیا کہ روز و شب ترے در پر پڑے رہیں
 اے دل گزیدہ شام! قبائے سحر اُٹھا
 رکھ دھیان! زخمِ جاں میں خیانت نہ ہو کہیں
 کاندھے پہ بارِ عشق ڈرا سوچ کر اُٹھا
 لے چل بدن کا شور ہوا میں سمیٹ کر
 بکھرے ہوئے سکوت میں لہجے سے ڈرا اُٹھا
 میں دیکھنے لگا ہوں خلاؤں کے اُس طرف
 اک اور آسمان مری آنکھ پر اُٹھا
 جن کو نگل چکی مری بینائیوں کی رو
 اُن منظروں سے اب مری گردِ نظر اُٹھا
 یہ جست میں نے تیری ہی ترغیب پر بھری
 لازم ہے اب یہ تجھ پہ مرے بال و پیر اُٹھا

ہے منتظر کہیں پہ ترا مہر خوش یقیں
 چشمِ گماں سے پردہ شام و سحر اُٹھا
 پیشانی قلم پہ اسیری کی مہر ہے
 شوقِ شرف میں تہمتِ کارِ ہنر اُٹھا
 چل..... ہاندھ اپنے پاؤں سے آوارگی کے میل
 آذرِ فریب لطفِ جنوں عمر بھر اُٹھا

کاشف حسین غائر

ٹھیک کہتے ہیں سبھی عشق پریشانی ہے
ہاں مگر پہلے مجھے کون سی آسانی ہے
غیر ممکن ہوئی جاتی ہے دوانے کی شناخت
اس قدر عام یہاں چاک گریبانی ہے
میری اس بات کی تائید کرے گی دنیا
میں نے دنیا کی کوئی بات نہیں مانی ہے
وہ اندھیرا ہے میں خود کو بھی نظر آتا نہیں
تو مجھے دیکھ رہا ہے، مجھے حیرانی ہے
عشق میں ہوتا ہے ہر کام ہی اُلٹا سیدھا
آسمان میں نے بچھایا ہے، زمیں تانی ہے
دھیان جاتا ہے برابر اسی منظر کی طرف
یہ تصور اسی تصویر کا زندانی ہے
رات بھر جاگتا رہتا ہوں میں غائر، جیسے
میرے ذمے ہی ستاروں کی نگہبانی ہے

کاشف حسین غائر

ہوا کا رنگ سر رہ گزار ایسا ہوا
کہ میری خاک سے پیدا غبار ایسا ہوا
بس ایک روز کھلی مجھ پہ اپنی بیکاری
اور اس کے بعد میں مصروف کار ایسا ہوا
پھر اُس کے بعد کچھ اپنا سراغ مل نہ سکا
میں اپنی قید سے اک دن فرار ایسا ہوا
میں دشت ہجر کو تو بے کنار سمجھتا تھا
مگر یہ دشت بھی اک روز پار ایسا ہوا
خفا خفا سے تھے اُس شہر کے در و دیوار
میں ایک عمر میں لوٹا تو پار ایسا ہوا
میں اپنی فتح کے آثار دیکھ کر خوش تھا
مگر قریب سے پھر ایک وار۔۔۔ ایسا ہوا

اختر رضا سلیمی

بروئے کار سب امکان لایا
بالآخر غیب پر ایمان لایا
مگر خود کو بدل پایا نہیں ہے
بہت تبدیلیاں انسان لایا
کھٹی آنکھوں سے سب نے جاتے دیکھا
جسے میں خواب کے دوران لایا
اٹھا لائے تھے اپنے آنے سب
بس اک میں دیدۂ حیران لایا
خدا کی ذات مجھ پر تب کھلی تھی
جب اپنے آپ پر ایمان لایا
بس آنکھیں ہیں اور ان میں خواب ہیں کچھ
وہاں سے میں یہی سامان لایا
غزل میں بس وہی زندہ رہے گا
جو ساتھ اپنے کوئی امکان لایا

شاہد ذکی

بس روح بچ ہے باقی کہانی فریب ہے
جو کچھ بھی ہے زمینی — زمانی فریب ہے
رنگ اپنے اپنے وقت پہ کھلتے ہیں آنکھ پر
اول فریب ہے کوئی ثانی فریب ہے
سوداگرانِ فعلگی شر کے دوش پر
مشکیزگاں سے جھانکتا پانی فریب ہے
اس گھومتی زمیں پہ دوبارہ ملیں گے ہم
ہجرت فرارِ نقل مکانی فریب ہے
دریا کی اصل تیرتی لاشوں سے پوچھیے
ٹھہراؤ ایک چال روانی فریب ہے
اب شام ہو گئی ہے تو سورج کو روئے
ہم نے کہا نہ تھا کہ جوانی فریب ہے
بار و بار سے سے کسی کا گزر نہیں
آسندگان کے حق میں نشانی فریب ہے
علم اک حجاب اور حواس آئینے کا رنگ
نسیان حق ہے یاد وہابی فریب ہے
تجسیم کر کے خواب کی دنیا ہے جادواں
تسلیم کر کے عالم فانی فریب ہے
شاہد دروغ گوئی گلزار پر نہ جا
تتلی سے پوچھ رنگ نشانی فریب ہے

شہناز پروین سحر

کسی کتاب پرانی میں رکھ کے آتے ہیں
حقیقتوں کو کہانی میں رکھ کے آتے ہیں
یہ کچھ خیال بڑھاپا خراب کر دیں گے
چلوں ان کو جوانی میں رکھ کے آتے ہیں
ترے خیال کی مچھلی تڑپ رہی ہے ابھی
اٹھو اس کو بھی پانی میں رکھ کے آتے ہیں
بڑی تپش ہے ترے گاٹ دار لہجہ میں
تجھے بھی رات سہانی میں رکھ کے آتے ہیں
بس اک ستارہ سا آنسو پلک سے لپٹا ہے
یہ کھم گیا ہے روائی میں رکھ کے آتے ہیں
یہ خشک پھول ہیں خوشبو کہاں سے آئے گی
انہیں تو رات کی رانی میں رکھ کے آتے ہیں
وہ داستان سرائے میں جا کے رہنے لگا
اسے کتاب کہانی میں رکھ کے آتے ہیں
یہ مور پتکھ تنہی نے کبھی دیا تھا مجھے
اب اس کی یاد نشانی میں رکھ کے آتے ہیں
وہ اس خرابے میں کب تک پڑا رہے گا سحر
اسے بھی عالم فانی میں رکھ کے آتے ہیں

عنبریں حبیب عنبر

دل کو دنیا کا آسرا بھی نہیں
اور دنیا سے کچھ رگلہ بھی نہیں
کوئی تو ہو کہ دل کی بات کہیں
گھر میں گیا کوئی آئینہ بھی نہیں
آپ تک جا نہیں رہی تھی صدا
اس لیے میں نے کچھ کہا بھی نہیں
رہط کا اب کوئی تکلف کیوں
دل سے جب دل کا رابطہ بھی نہیں
ایک لمحے میں ختم تھی دنیا
اور کہنے کو کچھ ہوا بھی نہی
خیمہ خواب اُٹ گیا کیسے
یہ مرا دل ہے کربلا بھی نہیں
پاؤں کیوں ہیں لہو لہو آخر
جب کہ پُر خار راستہ بھی نہیں

شہزاد نیر

آپ دل جوئی کی رحمت نہ اٹھائیں، جائیں
رو کے بیٹھا ہوں نہ اب اور رلائیں، جائیں
مجھ سے کیا ملنا کہ میں خود سے جدا بیٹھا ہوں
آپ آ جائیں، مجھے مجھ سے ملائیں، جائیں
حجرۂ چشم تو اوروں کے لیے بند کیا
آپ تو مالک و مختار ہیں، آئیں، جائیں
اتنا سالسوں سے خفا ہوں کہ نہیں مانوں گا
لوگ رورو کے نہ اب مجھ کو منائیں، جائیں
اور بھی آئے تھے درمانِ محبت لے کر
آپ بھی آئیں، نیا زخم لگائیں، جائیں
زندگی اتوڑنے دکاں کھول کے لکھ رکھا ہے
اپنی مرضی کا کوئی رنج اٹھائیں، جائیں
ہر طرف خون کے چھینٹے ہیں ہمارے گھر میں
کون سا ورد کرائیں کہ بلائیں، جائیں
آمد و رفت کو اک دنیا پڑی ہے تیر
دل کی بستی کو نہ بازار بنائیں، جائیں

شہزاد نیر

جہاں کم سخن سے ایسا کام کیسے ہو گیا
میں خوگرِ کلام بے کلام کیسے ہو گیا
محبوبوں کے سلسلے تہی پہ کیسے رُک گئے
مسافروں کا اس گلی قیام کیسے ہو گیا
یہ لختِ لختِ روشنی تھیں کہاں سے مل گئی
کرن کرن کا رُخ پہ انتظام کیسے ہو گیا
جو خوتے احتیاط پر تمہارا اختیار ہے
تو روئے بے نیاز لالہ فام کیسے ہو گیا
تمام راستوں پہ وہ چلا قدم سنبھال کر
بدن کے راستے پہ بے لگام کیسے ہو گیا
سکوت کے سکون کی کماٹی کیسے لٹ گئی
سخن کا اضطراب میرے نام کیسے ہو گیا
وحید و سجد آئو، ارے حد کو دوڑو
میں غرقِ حد سبوتا تھا، تشنہ کام کیسے ہو گیا
وہ دیدلا وجود کس نظر کی گھاٹ اتر گئی
یہ عمر بھر کا کام تھا، تمام کیسے ہو گیا
زمین کو جانتے ہوئے، فلک کو تانتے ہوئے
میں آپ ہی مام تھا، غلام کیسے ہو گیا
نہیں نہیں کوئی نہیں، کوئی نہیں، کہیں نہیں
گمان تھا، یقین کا امام کیسے ہو گیا
ضرور کچھ غلط لکھا گیا شرف کے باب میں
یہ نور کا انتظام، احرام کیسے ہو گیا
یہ جوئے درد کس طرح زمین جاں پہ پڑی
فصیل ضبطِ غم کا انہدام کیسے ہو گیا

کلیم احسان بٹ

شان و خنجر و تلوار بستہ
 نکل آیا ہوں میں ہتھیار بستہ
 یہی خانہ بدوشی زندگی ہے
 سفر میں ہوں درو دیوار بستہ
 جسے ہم خامشی سمجھے ہوئے ہیں
 وہی ہے شوخی گفتار بستہ
 کبھی تو خوبی مضمون کھولے
 ہمارے نامہ زرتار بستہ
 چمن میں چھپاتے سب پرندے
 چمن سے اڑ گئے منقار بستہ
 یہ اس بستی میں کیونکر آگئے ہیں
 یہ حضرت کون ہیں دستار بستہ
 کبھی رندوں میں آکر بیٹھنا تم
 اٹھے گا پردہ اسرار بستہ

شمشیر حیدر

پیرہن وقت بدلتا ہوا رہ جاتا ہے
 خواب تعبیر میں ڈھلتا ہوا رہ جاتا ہے
 تجھ سے ملنے بھی چلا آتا ہوں ملنا بھی نہیں
 دل تو سینے میں مچلتا ہوا رہ جاتا ہوا
 ہوش آتا ہے تو ہوتی ہے کہاں اپنی طرف
 اور پھر تیر لگتا ہوا رہ جاتا ہے
 کار دنیا کی طرح کار محبت بھی یہاں
 کام ہے کام سو چلتا ہوا رہ جاتا ہے
 دیکھ کر آئینے سے اتنے مراسم تیرے
 ہاتھ اپنے کوئی ملتا ہوا رہ جاتا ہے
 تم تو بادل کی طرح آتے ہو چھپ جاتے ہو
 دشت مجھ میں مرا جلتا ہوا رہ جاتا ہے

علاؤ الدین ہمد خانزادہ

تنویر سیٹھی

اُن کی جبین ناز پہ ایسے لکھا ہوں میں
گویا زباں پہ حرفِ کمر رہا ہوں میں
اُن کا کرم رہا ہے کہ خود پہ کھلا ہوں میں
مجھ کو خیر نہیں تھی کہ اتنا بُرا ہوں میں
خاموشیوں کے شور میں لبِ بنگلی مری
آواز، احتجاج، تکلم، صدا ہوں میں
سب ہجر سب وصال تو بے معنی ہو گئے
اُن سے ملا ہوں جب سے تو خود سے جدا ہوں میں
بحرِ خودی میں جب سے ہوا غوطہ زن تو پھر
تنہا ہوں سوچتا ہوں کوئی دوسرا ہوں میں
ہے عقل کا فریب نمایاں قلوب پر
یوں شانِ عاشقی کی نئی انتہا ہوں میں
بندہ ہوں بندگی سے بہت دور ہو گیا
خود کو بھگت رہا ہوں کہ ایسی سزا ہوں میں
وہ حسن بے مثال ہیں میں عشقِ لازوال
وہ حکم ہیں مجھے تو انہیں التجا ہوں میں
ہمد کسی کی یاد میں اکثر تمام رات
مدت ہوئی کہ سویا نہیں جاگتا ہوں میں

گئے شجر کی طرح آسمان ہوتا ہے
کہ تیرا دھیان مرا سائبان ہوتا ہے
میں کس سے عشق کروں اور چھوڑ دوں کس کو
ہر ایک شخص پہ تیرا گمان ہوتا ہے
کہانیوں میں تسلسل کے ساتھ رہتا ہوں
کہ میں نہیں تو مرا غم بیان ہوتا ہے
ہمارے گھر کو جلاتا ہے روشنی کے لئے
چراغ جب بھی کوئی مہربان ہوتا ہے
میں اس کی بات سمجھتا ہوں اور وہ میری
اکیلا بیڑ مرا ہم زبان ہوتا ہے
کسی کا دکھ ہو پرندے اکٹھے ہوتے ہیں
کہ خاندان تو پھر خاندان ہوتا ہے

قرطاس پہ جہانِ دگر ہیں.....

(تراجم)

نوبل انعام یافتہ مصنف

Henrik Pontoppidan

1857-1943

صدف مرزا، ڈنمارک

اس نے زیادہ تر ناول کو ہی اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اس نے Georg Brandes جارج برانڈس (کنو پغانس) اور ماڈرن بریک تھرو یعنی جدید پیش قدمی کی تحریک اور کے نظریات کے تحت حالات حاضرہ کے موضوعات پر قلم اٹھایا اور سماجی اور معاشی تنقید اور تاثر سے بھرپور نثر ہی اس کی پہچان ہے۔ 1917ء میں اس کو اور Karl Gjellerup کھارل کیسٹپ کو نوبل پرائز سے نوازا گیا۔

ہنرک، ایک کثیر لعیال پوری کے گھر پیدا ہوا۔ اگرچہ خاندان میں پیسے سے بھی کئی نامور لوگ موجود تھے۔ نام کو اس دور کے تھوخر کے ذریعہ اظہار کے طور پر لاطینی زبان میں بدل دیا گیا تھا۔ ان کا خاندانی نام Broby یعنی شہر (کے پاس) پل۔ اس نام کو اس زمانے کے بارکی طبقے کی خود ستانی اور خود نمائی کے رواج کے زیر اثر براہ راست لاطینی زبان میں (Pons Oppidum) میں بدلا گیا۔ ہنرک نے خود اپنے خاندان کے اس انداز کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا۔

رومانوی دور کے زیر اثر ڈینش ادب پر حسن و نزاکت اور خوبصورتی کی فضا طاری تھی جسے جارج برانڈس کے خطبات نے مرتعش کر دیا اس کا مطالبہ تھا کہ اس دور کا ادیب اب نرم گرم پچھونوں اور مسکور کن دل آویز چمنستان سے باہر نکل کر اپنے گرد و پیش میں بکھرے کریمہ اور برہنہ سچ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے اور اس کے خلاف قلم اٹھائے۔

اس کے افسانوں کے مجموعے Fra Hytterne ”جھونپڑوں سے“ میں شامل افسانوں میں دیہات کی زندگی کی منظر کشی اور وہ قانون اور ان کی اور دوس کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کی داستانیں ایک گہرے طنز کی چھین کے ساتھ نہایت بے باکی سے بیان کی گئی ہیں۔

جاگیردارانہ اور آمرانہ معاشرے میں طاقت اور وسائل پر ایک طبقے کی خدائی اور حکمرانی کے خلاف اس نے صدائے احتجاج بلند کی۔ شدید زہر آمیز لہجہ و غریبوں کا استحصال کرنے والے ہاتھوں کے لیے بھرپور جارحانہ تھکے تھے تو اس مصنف کی پہچان ہیں۔ اگرچہ اس کی زبان عام سادہ اور سلیس ہے اور اس نے استعارات و تشبیہات کے اثر دھار میں اپنے مضمون کے مطالب کو کھونے نہیں دیا اس کے باوجود اس کے اسلوب میں ایک گہرائی و دردمندی ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس کی اکثر تصانیف کو اس کی اپنی ذاتی زندگی کا بیان ہی کہا جاتا ہے۔ اپنے والد کی سخت گیر طبیعت اور عیسائیت کے اندھ دھند پرچار کے رد عمل کے طور پر اس نے اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے اپنی مرضی سے انجینئرنگ کی تعلیم کو منتخب کیا۔ اس تعلیم کے دوران ہی کے آخر میں اپنے ساتھ ہونے والے غیر منصفانہ سوک اور ایک دوسرے نا اہل طالب

علم کو خود پر فوقیت دینے کی زیادتی کے باعث اس نے اس شعبے کو خیر باد کہہ دیا۔

وہ ایک عام آدمی کی زندگی میں مذہب کے آمرانہ تسلط کے خلاف تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں انسانوں کو اپنا محکوم بنانے کے لیے عیسائیت کی دخل اندازی پر بھی اس نے کڑی نکتہ چینی کی جس کے نتیجے میں اس پر عقیدے کی توہین کا فتویٰ بھی لگایا گیا۔

یہ افسانہ ”ایک خوابناک دیہاتی زندگی“ اس زمانے کے ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ تحریر نہ صرف اپنے عنوان کے اعتبار سے طنزیہ ہے بلکہ اس کی تفصیلات اپنے دور کی مکمل عکاسی کرتی ہیں اور بد قسمتی سے دور حاضر میں برصغیر کے دیہات ابھی تک اسی زندگی کے دھڑے پر آنکھوں پر پٹی باندھے کواہو کے ٹیل کی طرح گھومے چلے جا رہے ہیں۔ ایک ایسا نظام جہاں جاگیردار، وڈیرے، زمیندار اور جرگے انہوں کی زندگیوں میں کن فیکون کے مالک ہیں۔ اس طرز حیات میں عورت کی وقعت اور حیثیت جا نور سے زیادہ نہیں ہے۔

افسانے میں مصنف ہاریوں اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور طبقے کی عورتوں کے لیے ”کتی“ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس صورتوں کی تطبیق مشرقی معاشرے کے ساتھ کی جائے تو ”رندی اور کجھری“ کے لفظ کا حقد ترجمانی کریں گے۔ ہنرک کی کہانیوں میں ایک ایسا معاشرہ سانس لیتا ہے جہاں شوہروں کے سامنے ان کی بیویوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور وہ سب سیئے اور آنکھیں بند کیے گزر جاتے ہیں۔

1881ء میں اس کی شادی ہوئی لیکن وہ ذہنی طور پر کبھی اس تعلق سے خوش نہیں تھا۔ 1892ء میں زردو جی بندھن سے آزاد ہو گیا۔ البتہ اپنی دوسری شادی کے بعد اس کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی۔ اس کی تخلیقات کے موضوعات بھی سوب کی سنگینی سے رہائی پا گئے۔ اپنی شادی کی سورت جوہی پر اس نے اپنی زندگی کا پہلا مثبت انجام لیے ہوئے ایک ناول لکھا۔

البتہ 1928ء میں اپنی بیوی کے انتقال کے بعد اس کے قلم پر بھی سوگواری چھا گئی اور اس کے افسانے انسانک انجام سے دوچار ہونے لگے۔

انجینئرنگ کی تعلیم چھوڑ کر دوب کی دنیا کو اپنانے کے اس فیصلے کی اس کے اپنے خاندان نے مخالفت کی لیکن ہنرک نے آخری سانس تک اپنا ناتہ اپنے قلم سے جوڑے رکھا۔



ایک خوابناک دیہاتی زندگی

ہنرک پھون چھوٹی تین

ترجمہ: صدف مرزا، ڈنمارک

فصلوں کی کٹائی کے بعد جب موسم گرما کے پرندے بھی دور دراز کو ہجرت کر چکے ہیں۔ بیج اور اناج وغیرہ سب جب کھلیانوں میں سمیٹ دیا جاتا ہے اور لوگ موسم سرما کی شدت کو خوش آمدید کہنے کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ اچانک وہ ایک تسلسل کے ساتھ سورج کی تابانی سے منور دن کو مسرت آمیز حیرت سے دیکھتے ہیں۔

نہیں کوئلیں اور اناج کے دانے جو ایک عرصہ دراز سے زمستانی خشونت کے سامنے سرنگوں ہو کر کہیں کچھڑ کے نیچے منہ چھپائے تھے۔ اچانک کروٹ لے کر اٹھے اور گڑھوں کے کناروں اور کئی ہوئی فصلوں کے بعد ڈنھل بھرے کھیتوں سے ہر استغاب بھری شادمانی سے گرد و پیش پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

لیکن اچانک ایک رات ملک بھر پر برفانی سردی نے حملہ کر دیا اور لوگ جو صبح کھڑکی سے باہر پھولوں کو کھلکھلاتا دیکھتے تھے اب درختوں کے سر جھکائے ہوئے پڑھوڑے پتوں کو دیکھتے۔ خوبصورت نظاروں کو طوفانی ہوائیں اڑا لے گئیں۔ چراگاہیں مغموم ہو گئیں اور سیاہ مندم کے گھیت مریض نظر آنے لگے۔ کتوبر کی گہری دھند کے ساتھ آہستہ روی سے موسم سرما رو بائی قمری رنگ سے ہوئے سرخی مائل بھورے جنگلوں پر چھانے لگا۔

لیکن جاگیردار اپنے پر قیش گھر کی گرم نشست گاہ میں استراحت فرما رہا ہے اور اس کی بیوی بھی نرم گرم جوتا پہن کر ہنگامہ خیز موسم گرما کے سماں کی باقیات سمیٹنے میں مصروف ہے۔ انہیں غسرت سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ تو آرام سے بیٹھ کر خداوند کے بابرکت اور طویل موسم سرما کے آرام سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ موسم ان کو کوئی زحمت نہیں دیتا بلکہ اناج کو بھوسے سے لگ کرنے والی مشین کی سرخی گنگناہٹ اور بھوسے سے غذا لگ کرنے والے تختے پر مزدوروں کے کام کاج کی مصروف اور دلپذیر آوازوں سے مزید حظ اٹھاتے ہیں۔

البتہ موسم گرما کا ایک ادھورا تقاضا تھا جو ابھی ان کو مکمل کرنا تھا اور وہ تھا نیگل کا عظیم الشان جشن۔ امیر میں مونس کا خوب روٹ، الاغ ملازمین کے لیے بنی کوٹھڑیوں کی کھڑکی کے پیچھے کھڑا دوپہر کی نیند کے بعد اگلڑائی لے رہا تھا۔

اس نے گھر میں کام کرنے والی خادماہ این کو راہداری سے گزر کر اصطبل کی جانب جاتے ہوئے دیکھا جہاں ایک بیمار گائے بندھی تھی جس کے تھنوں میں تکلیف تھی اور جس کا دودھ بہ تین گھنٹے کے بعد دوہنا تھا۔ الاغ نے پائپ پینا بند کیا اور دروازے کے پیچھے لگی کیل سے اپنی ٹوپی تاری اور باہر کی طرف چل دیا۔

اصطبل میں پہنچ کر وہ این کے عین پیچھے جا کھڑا ہوا۔

این نے دودھ دوہنے کا برتن ہاتھ سے رکھ دیا تھا اور آرام سے بیٹھ کر کام کرنے کے لیے اپنا ہادہ اوپر اٹھ کر لمبی

جواب کا ایک قسمہ باندھ رہی تھی۔

الاعو اسے پیچھے جا کر اس کی ناگہانوں کو تھمنا چاہتا تھا لیکن اچانک ہی این پیچھے مڑی اور جونہی اس نے دیکھا کہ پیچھے کون ہے تو اس نے فوراً اس سے پیچھے کیا اور شرم سے سرخ ہو گئی۔

”تم ڈری تو نہیں؟“ الاعو نے کہا اور بدستور دروازے میں ہی کھڑا رہا۔

”نہیں“ این نے درشتی سے کہا اور دودھ دوہنے کا برتن، ٹھا کر کھاد سے بھری کھری کی طرف چل پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دامن سینٹ کر گھٹنوں کے درمیان رکھا اور ایک سرخ گائے کے پیچھے جا بیٹھی۔ جیسے ہی اس نے گائے کا تھن اپنے ہاتھ میں تھاما، گائے نے سر موڑ کر اذیت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

این اٹھارہ برس کی ایک فریبہ لڑکی تھی جسے دھتھانوں کے اس ڈیرے پر لڑکے اور مرد بکھی سکون سے نہ رہنے دیتے۔ وہ قریبی مکی بستی جسے ”اوہوسین“ کہا جاتا رہتی تھی۔ اس بستی میں کھیتوں اور گھروں میں کام کرنے والے مزدور رہتے تھے۔

این اتنی مسکین اور ژویدہ مرد کھائی دیتی تھی کہ سب ضمیر کی مدد کے بغیر اس کے ساتھ جیسا چاہتے سلوک کرتے اور ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ مرد اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے بدن کے ابھار پر چٹکی نہ کاٹتے ہوں۔ اگرچہ اب تک یہ شیطانی تعاقب اس کو اپنی ہوس کا نشانہ تو نہ بنا سکا تھا لیکن اس طرز سلوک نے اس کی ذات میں ایک غصہ بالخصوص اس کی نظر میں ایک سخت پیدا کر دی تھی۔ وہ قریب سے گزرتے ہوئے مردوں کی دست دراری سے محتاط رہنے کی کوشش کرتی ہے۔

الاعو نے جس دن سے اس کو قص کی محفل میں دیکھا تھا، اسی دن سے اس کو اپنی قانونی جا گیر سمجھنے لگا تھا۔ اگرچہ وہ اس بات سے بخوبی باخبر تھا کہ این کی بات کھیتوں میں کام کرنے والے ایک لڑکے کا تھن سے ملے ہو چکی ہے۔ مچھیس ایک فرد مایہ مسکین سا لڑکا تھا جس سے سب لوگ ہر طرح کا چھوٹا موٹا اور مشقت بھرا کام کرواتے جیسے بیت الخلا کی صفائی، کچڑ بھرے جو ہڑوں اور تار بول کی صفائی وغیرہ۔

اب واقعہ یہ نہیں تھا کہ این حسن و جمال کا مرقع تھی۔ وہ اپنے پرانے اونٹنی روہاں جس کی بدوضع گرہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگی تھی، گائے کے نیچے سر نہوڑائے بیٹھی ہوئی وہ انسان کی بجائے ایک بھوتنی ہی لگتی۔

لیکن الاعو بھی ٹھان چکا تھا کہ اسے ہر صورت میں حاصل کر کے رہے گا۔ پچھلے دنوں اس نے مزید پیش قدمی کی۔ وہ دونوں ہاتھ پا جاے کی جیبوں میں ڈالے اور پاؤں آگے پیارے اس کے برابر ہی بیمار گائے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

پائپ ہنوز اس کے منہ میں دبا آگے پیچھے ہو رہا تھا۔

اس ننھی چھت کے نیچے جہاں تیرہ بتی ہوئی گائیں اپنی چٹکی ہوئی دیں پنی کمر پر، رہ رہی تھیں، موسم گرما کی ملکی سی حدت تھی۔ اس نیم تاریک کمرے میں مویشیوں کے بھپ اڑاتے گوبر ملے پانی کی تیز ناگوار بدبو تھی جس میں گاجروں اور چھندروں کی بو بھی شامل تھی۔

وہ دونوں وہاں تنہا تھے۔ الاعو کی ذری حرکت پر اس کے بدن میں ایک تھر تھری سی ہوتی اور اس کے فریبہ ہاتھوں تک بھی اس کی لہر پہنچتی، بیمار گائے نے دوبارہ سر موڑ کر ایک صابری اذیت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ الاعو نے اس

کے رویے کی جھجک کو دیکھا اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”آسانی سے دودھ دوہنے دیتی ہے“

اس نے گائے کے حوالے سے اپنا پامپ منہ سے نکالے بغیر کہا

”ہاں“

اس نے ایک مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ دیر تک اسے دیکھا

اصطبل کی کھڑکی سے جھانکتی سورج کی ایک شعاع چوڑی پٹی کی صورت میں، لاعو کے زردی، مکمل گھنگریالے بالوں پر پڑی ہوئی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ پیچھے کو مڑی ہوئی ٹوپی میں سے جھانک رہی تھی۔

اچانک اس نے دیکھا کہ این کے بالائی بدن میں ایک لرزاہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے غور سے دیکھا تو آنسوؤں کے قطرے اس کے گدے لرزشیروں پر راستہ بنا رہے تھے۔

”اوہ، کیا ہوا ہے؟“ اس نے بالٹا خراپا پمپ اپنے منہ سے نکال ہی دیا۔

این نے گائے کا تھن بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اپنا رومال سے بندھا ہوا سر اپنے بازو پر رکھ لیا۔ تھوڑی سی دیر بعد الاعو کو اس کی شوں شوں کی آواز سنائی دی۔

”خدا مجھے پوچھے..... تمہارا تو دماغ پھر گیا ہے۔ این کیا ہوا ہے؟“

”تم میری جان چھوڑ دو، میں نے تم میں سے کسی سے بھی کبھی کچھ نہیں کہا۔ تم لوگ میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

”خدا یا! ننھی این! جہاں تک میں جانتا ہوں، میں نے تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ مسئلہ کیا ہے۔ میں تو

تم سے صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ کل مائیکل کی ضیافت میں تم پر میری ہرقص بننا پسند کر دی۔ یہ تو کوئی ایسی بری بات نہیں کہ اس کے لیے رونا دھونا مچایا جائے۔ خیر اب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اچھے دوست تو رہ سکتے ہیں نا“

وہ جانے کے لیے مڑا۔

اتنے میں این خاموش ہو چکی تھی اور اس نے الاعو کی بات واضح طور پر سننے کے لیے اپنا سر بازو سے اٹھایا تھا۔

لیکن اسی اثنا میں باہر سے قدموں کی آہٹ ابھری۔

الاعو سرعت سے کھڑکی سے نکلا اور عقی دروازے سے باہر کھسک گیا۔

قدموں کی آہٹ الاعو کے ہا کی تھی جو در پہر کے طویل قیولے سے فرغت پا کر اس جانب آ رہا تھا۔ وہ پرسوج

انداز میں اپنا ہیٹ لیے گھر کی اونچی پتھریلی سیڑھیوں پر سب سے نچلی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ اپنے پامپ کی نوک سے کان کے پیچھے کھجا رہا تھا۔

الاعو کا پامپ ایک قبوں صورت آدمی تھا جس کا شیو کیا ہو چکنا چہرہ اور سرخ سو بچے ہوئے ہونٹ ہمیشہ ایسے محسوس

ہوتے جیسے ان پر چربی کی تہہ جمائی گئی ہو۔ اس کی تنگ پیشانی پر چھوٹے گھنے گھنگریالے بال تھے جو اس کے سر کے پیچھے تک جاتے ہوئے قلموں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

وہ چند لمحے وہیں اپنی سوچوں میں ڈوبا کھڑا رہا کہ اسی اثناء میں دروازے سے گاؤں کا چرواہا، ”چھوٹا راس“

اندرا آیا۔ اس کے کندھے پر بیٹھ تھا۔ وہ بارہ تیرہ برس کا ایک مدقوق سا بچہ تھا جس کے شانے قدرے مڑے ہوئے اور گھٹنے جھکے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر ایک پرانی فوجی ٹوپی تھی جو اس کے سردی سے نیلے پڑتے کانوں کو ڈھانپنے ہوئے تھی۔

پیروں میں بھاری لوہے سے منڈھی لکڑی کی کھڑاؤں تھیں اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں سیاہ اور سخت گھٹی زمین پر شلجم (اور اس قبیل کی مہریاں) کھود کر کڑی ہوئی تھیں۔

جب وہ اندر آیا تو اس نے بچہ دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا اور سر کندھوں میں دبائے کسی بوڑھے ہاری کی طرح لمبے قدموں سے چل پڑا۔ ابھی اس نے ذرا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس نے بچے کے گرنے کی آواز سنی۔ وہ فوراً سڑ اور بچے کو واپس اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

”ہاں چھوٹے لاؤس“ بالکل ٹھیک ایسے ہی کام ہوتا چاہیے، اس کے مالک نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا اور اپنا بالآ خراپنا ہیٹ سر پر پہن ہی لیا۔ چھوٹے لاؤس نے اپنا سریوں اوپر اٹھایا جیسے پہلی مرتبہ اس کی موجودگی کو محسوس کیا ہو۔

طویل دوپہر کے آرام کی سستی پر غالب آنے کے بعد اس نے اپنا پائپ جلیا اور کھلے دروازے میں کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ اپنے مزدوروں کو کھیتوں میں مل چلا تے دیکھ سکتا تھا لیکن اس وقت دھنداتی گہری تھی کہ نہ ن مشکل سے گلی کی کڑ تک ہی دیکھ پاتا تھا۔

صرف جنوب کی طرف ایک بوڑھے ہاری کی جھلک دکھائی دی جو اپنی میڑھی میڑھی ریڑھی کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ ایک سریل جھکی کمر والا گھوڑا اس ریڑھی کو گندم کی کٹی ہوئی فصل کے ڈنٹھلوں کے درمیان بقدر استطاعت کھینچ کھانچ کر چلا رہا تھا۔

چار دن کی مسلسل بارش کی وجہ سے کچھڑ نے پورے شہر کی بری حالت کر دی تھی۔ گلی کی کڑ سے موٹی ہلنوں کی ایک قطار بڑی سہولت سے منگتے ہوئے راستے کے درمیان آئی، دو بڑے اطمینان سے سڑک پر پھیلی کچھڑ میں دھبہ دھبہ کرنے لگی۔ شہر کے نمبردار کے مرغے کی بانگ کے علاوہ چارو خاموشی کا راج تھا۔

اچانک گندم کی دھندائی کرنے والے تحتے کے پیچھے کوئی دھند میں کوئی کھانا۔

چار غریب عورتیں کمر پر بھاری گٹھے لادے خاموشی سے ایک دوسرے کے پیچھے قطار کی صورت میں چلی رہی تھیں۔ کچھڑ میں سے گزرتے ہوئے شراپ شراپ کی آواز کے ساتھ چھینٹے اڑاڑ کران کے لبادے کے نیچے ٹانگوں پر پڑ رہے تھے۔

”کام میں خدا کی مدد شامل ہو“

میس مونس نے با آواز بلند کہا۔ وہ ہمیشہ غریبوں کے لیے ایک ہمدردانہ اور مشفقانہ جذبہ رکھتا تھا۔

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہر عورت نے زیر سب اس کا فردا فردا شکر یہ ادا کیا۔

لیکن سب سے آخر میں گزرنے والی عورت اس کی طرف آئی۔ اپنی کمر سے بھاری بوجھ اتار کر زمین پر رکھا جبکہ بائی خاموشی سے اپنے راستے پر چلی گئیں۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھے ہائے وائے کرتی، پھولے سسوں کے ساتھ گٹھے پر بیٹھ گئی۔

یہاں کی سب تھی۔ وہ دراز قد اور ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ زردی مانل بھور اور کسی حنوط شدہ مٹی کی طرح تھا۔ اس کے چہرے سے پسینہ اور گرد بہہ رہی تھی۔ اس کے کمزور جسم کے گرد لپٹا بادہ بھگ چکا تھا۔ اس کے کپڑے کے بنے ہوئے گیسے لمبے جوتے سوتی دھاگے کے ساتھ اس کی ٹانگوں سے بندھے تھے۔ جب وہ بیٹھی تو اس کی چھینٹے پڑی

پنڈلیوں پر ابھری ہوئی گانٹھوں بھری نیس بھی دکھائی دینے لگیں۔

اور یہ تم ہو.....؟ این کی ماں؟ تم جنگل سے آ رہی ہو؟

عورت نے صرف مرہانے پر اکتفا کیا

ابھی تک اس کی سانس اتنی بحال نہیں ہوئی تھی کہ وہ بات چیت کر سکے۔

”ویستا جنگل سے؟“

”ہاں“

”اوہ..... اچھا اچھا..... اور گھر میں کیا حال احوال ہے؟“

”بس اللہ رحم کرے“ عورت نے ”وہ بھری اور اپنے لباس کے کونے سے اپنا کیچی رنگ کا چہرہ صاف کرنے

لگی۔

اچانک میس نے اپنا پاپ منہ سے کار اور آنکھیں پھڑکرا سے سر تاپا دیکھا۔

”اوہ خدا مجھے مزادے (اللہ معاف کرے) کیا تم دوبارہ صمل سے ہو؟“

عورت نے خود کو خشک کرنا چھوڑ، لباس کے دامن سے اپنی ناک صاف کی اور جواب دیئے بغیر اپنا سر ہاتھوں

سے تھام لیا۔

”کیا یہ گیارھواں بچہ ہے؟“

”ہاں۔ گیارھواں ہی ہے“

”ہاں مگر خداوند یسوع مسیح، مصیبتوں سے بچائے، کیا تم دونوں کبھی اس سلسلے کا ختم نہیں ہونے دو

گئے؟ ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔“

”ہاں میس مولس۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ سب کیا چکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں دنیا میں تم جیسے لوگ جو

بچوں کو سب کچھ دے سکتے ہیں کم بچے پیدا کرتے ہیں اور ہم جیسے رزائل صرف بستر کے کنارے ذکر بھی لے لیں تو بچہ پیدا

ہو جاتا ہے۔“

میس کو اپنے منہ سے پاپ دوبارہ نکالنا پڑا۔ وہ عورت کی بات پر ہنسے بغیر نہیں رہ سکا۔

لیکن اتنے میں عورت نے اس پر ایک جھٹی ہوئی نظر ڈالی اور کہا:

”ہاں میس مولسن اتم یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہو۔ تمہیں پتا ہونا چاہئے کہ اگر تم اس وقت میری جان چھوڑ

دیتے تو آج سب کچھ مختلف ہوتا“

”اوہ اچھا اچھا زمیندار کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور اس نے خوف آمیز حقیقت کے ساتھ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی،

ہمیں پرانی باتوں کے تذکرے سے گریز کرنا چاہئے مجھے معلوم ہے اور میں نے کئی مرتبہ تمہاری مدد بھی کی ہے۔“

عورت نے کچھ ناقابل فہم لفظ بڑبڑائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی مشکل سے اس نے گٹھا اٹھا کر دوپارہ کمر پر

رکھا۔

”اچھا، میرین، خدا حافظ۔ میس نے پیچھے سے ہانک مگائی۔

”کل، ٹیکل کے جشن کے لیے ضرور آنا اور اپنے سارے بچوں کو بھی لیتی آنا۔ میں کوشش کروں گا کہ کل تمہیں

کسی چیز کی کمی نہ ہونے پائے۔

این کی ماں اور اس کا شوہر نشیبی ہستی میں جسے "اوہوسین" کہا جاتا رہا کٹ پھٹا ہوا تھا۔ یہ ہستی ایک بڑے متعفن دلدلی جوہر کے احاطے میں آباد تھی جس میں ایک چھوٹی رستی ہوئی ندی بھی آکر ملتی تھی۔

اگرچہ ایک کلیسا اور آٹھ دس ڈیروں پر مبنی یہ شہر آسودگی اور سہولت کے ساتھ بندوبست پر آباد تھا۔ یہ چڑھائی اسے جنوب مغربی ہواؤں کی تندگی سے بچا لیتی تھی۔ بالخصوص موسم بہار میں جب ان زمینداروں کے پھلدار درخت پھولوں سے مد جاتے اور چڑھائی کا سارا راستہ سرسبز و شاداب ہو جاتا۔ کلیسا کی چھت پر برق بجائے گھونسلے بناتے تو شہر کا نظارہ خوابوں کی جنت سا ہو جاتا۔

عرصہ دراز سے یہ شہر عام راستوں سے ہٹ کر ایک پرسکون تنہائی میں آباد تھا۔ ابھی تک اس تک روحانی تحریکوں کی پہنچ نہیں تھی جو ملک بھر میں باقی جگہوں پر لوگوں کے درمیان بدامنی، کینہ اور خاصیت پھیلا رہی تھیں۔

کبھی کبھار جب زمینوں کی قیمت زیادہ ہوتی اور فصلیں بہتر ہوتیں تو ایک آدھ ڈیرے کی تعمیر نو ہوتی۔ اس کا فرش پتھروں کی بجائے لکڑی کا بنا دیا جاتا، دیواروں اور فرش پر تیل کی پاش کی جاتی اور مہانگی کا نیا فرنیچر رکھا جاتا لیکن تبدیلی کا یہ عمل رفتہ رفتہ ہوتا اور کوئی بھی شعوری طور پر یہ بات محسوس نہ کر سکتا تھا کہ یہ شہر اب بالکل اس غریب اور مفلوک الحال شہر سے مختلف ہو گیا ہے جو صرف چند نسلیں قبل یہاں نظر انداز کی گئی زمین پر آباد تھا۔ وہ زمانہ جب اپنی زمینوں سے فصلیں حاصل کرنے کے لیے خود زمینداروں اور ان کی بیویوں کو بھی اپنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔

جب کہ اوہوسین کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا تھا۔ ان کی اقدار بھی وہی رہیں۔ وہ اسی مٹی گارے کے بنے جھونپڑوں میں رہتے اور تلاء و آزمائش کے وقت ایک دوسرے کی مدد کو پہنچتے تھے۔ ایک جڑی ہوئی چھت اور ایک دوسرے سے ملتی دیوار کے ساتھ ہی وہ آپس میں دکھ بٹا سکتے تھے۔

روح رکھنے والے وجود جو اپنی پیشایاں جوڑ کر اپنی سرنوشت پر صرف ماتم ہی کر سکتے تھے۔

دروازے کی دہلیزوں کے قریب خدا کی رحمت، بد حال کائی زدہ بچے بیٹھے تھے جو ن غریبوں کے گھاس پھوس کے بنے برائے بستروں سے یوں برآمد ہوتے ہیں جیسے انڈوں میں سے جانور پیدا ہوں۔ جب کہ بالائی علاقے میں رہنے والے جاگیرداروں کے ڈیرے پر اونچے درجے کی دائمی اعلیٰ درجے کی سل پروان چڑھتی ہے جبکہ ان جھونپڑوں میں لیے بازو اور نامکمل بد وضع شائقوں کے درمیان بڑے خالی سروں والے بے حال بچوں کی ایک کھیپ پیدا ہوتی جیسے انڈے کے چھلکے چٹختے سے جسم لیتی ہے اور ان کے مقدر میں ان جاگیرداروں کی زمینوں اور دلدلی جوہروں میں اپنی "اقدار" کو پروان چڑھانا ہے۔

لیکن کبھی کبھار خصوصاً جب موسم سرما کی آمد قریب ہوتی اور جسم فصلوں کی کنائی کی جاں توڑ مشقت سے چور ہوتے۔

جب وڈیرے اپنے لدے ہوئے کھلیانوں اور گوداموں میں، اپنے نرم گرم مسکن میں آرام دہ زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے تو ان جھونپڑوں کے مکینوں میں سے کوئی بھیگی ہوئی تاریکی میں اپنے ننگے فرشوں والے گھر میں گرتے پڑتے پہنچتے ان کے خالی سروں میں ایک سرکش باغی سوچ یا سینے سے اٹھتی ایک صدا ایک جاگداز درد، ایک چیخ جو شدت سے گونجنا چاہتی لیکن یہ چیخ کبھی بلند نہ ہو پاتی۔ یہ ایک لختے کے بے ابھرتی اور پھر کسی نئی مشقت میں گم ہو جاتی کسی

چھوٹی سی ندی کی طرح جو رستی ہوئی گہری مدد مل میں مدغم اپنا وجود کھودیتی۔

اندردھواں بھرے مہمان خانوں میں میزیں بچی تھیں۔ جھنڈوں سے آراستہ رقص کے کمروں میں جو ابھی ان لوگوں کے لیے نشست گاہ کا کام دے رہے تھے جو یہ تو کھانا کھا چکے تھے یا ابھی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

اگرچہ کمروں میں کھانے کی دو میزیں لگائی گئی تھیں اس کے باوجود لوگوں کو گروہوں کی صورت میں کھانا ملا۔ اوہوسین کی ہستی کے لوگ، عمر رسیدہ بوڑھوں سے لے کر تین ہفتے کے شیرخوار بچوں تک اس ضیافت میں شریک تھے۔ حتیٰ کہ بستر مرگ سے بھی مریض اپنے قدموں پر اٹھ کھڑے تاکہ وہ بھی اس دعوت کی رونق میں شامل ہو سکیں جس کا چرچا گزشتہ کئی ہفتوں سے ہو رہا تھا اور پچھلے چوبیس گھنٹوں میں زور و شور سے جس کی تیاری ہو رہی تھی۔

جن کمروں میں کھانا کھایا جا رہا تھا وہاں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کے باوجود خاموشی تھی۔ لوگ بڑی خاموشی سے بس کھانا کھا رہے تھے۔

مٹی کی بڑی طشتریوں اور ڈونگوں میں سوپ، بکرے کا گوشت اور بھاپ اڑاتے آلوؤں پر مشتمل کھانا لایا جا رہا تھا لیکن جیسے کسی جادوئی زور سے محووں میں برتن خالی ہو جاتے۔ زمینداروں کی بیویاں جو ذاتی طور پر تو اس عملی کام میں کوئی حصہ نہیں لے رہی تھیں لیکن وہ ان کمروں میں چلتی پھرتی کام کرنے والی لڑکیوں کو تیزی سے کھانا پیش کرنے کے احکامات دے رہی تھیں۔

تازہ تازہ تلنے کی خوشبو براغدی اور بیڑ کی مہک میں مدغم ہو کر لگا تارا ان لوگوں کو مزید ناخوش کر رہی تھی جو ابھی کھانے کے انتظار میں اپنے گزرگاتے شکموں پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔

پرانے زمانے میں اس ضیافت کو ہمیشہ مقدس مائیکل کے نام کی شام کے ساتھ منایا جاتا تھا لیکن بعد میں جزائر پودوں کی کاشت کے جدید انداز اور توسیع کی وجہ سے زمین داروں نے اپنے فائدے اور اپنے اخراجات بچانے کی خاطر اس ضیافت کو فصلوں کے اختتام تک مؤخر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس جشن کا انعقاد اپنے اپنے ڈیروں کی بجائے اس سرائے میں رکھ دیا تاکہ فصل ان کے آراستہ پیراستہ ڈیرے تک نہ جائے اور انفرادی ضیافتوں کی بجائے سب زمیندار مل کر ایک ہی بڑا جشن منایا کریں۔ اب تین گھنٹوں کے مسلسل طہم کے بعد بھی ابھی تک ان کمروں میں کھانے کا دور چل رہا تھا۔ اگرچہ اب کھانے کی میزوں کے گرد زیادہ لوگ نہیں بیٹھے تھے اس کے باوجود اندر بڑے کمرے اور باہر راہداری میں اثر دھام بڑھتا ہی جا رہا تھا اور کیف و شادمانی کے عالم میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سب لوگ بشمول جاگیرداروں کے ایک سرخوشی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ اکثر لوگوں پر سرور ورنشے کا غلبہ تھا جسے اوہوسین کی زبان میں Maddonnert (من) کہا جاتا تھا۔ لڑکے سر پر الٹی طرف پہنی ٹوپیوں کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ چند ایک چھوٹے جاگیردار جن کے ہاتھ کہیں سے ایک لائیسر ہاتھ آگیا تھا ہا ہراپنے پاجاموں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنی توندیں ہارنکالے، مسایوں کے گھر دوسرے علاقوں سے اتفاقہ طور پر ہی آئی گاڑیوں کو ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اوپر رقص کے کمرے میں اس سارے شور شرابے سے بے نیاز ایک عمر رسیدہ آدمی اپنی بڑی بڑی بے رنگ، نیم کور آنکھوں کے ساتھ ہوا میں گھور رہا تھا۔ اس کا لمبا کوٹ جس کی سلاخیاں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے سفید ہو چکی تھیں، اوپر اس کی گردن سے لے کر نیچے ایز یوں تک اس کے بدن پر مطلق تھا۔ نید پاجامہ، یک بوری کی طرح اس کی تڑی مڑی ٹانگوں

کے گرد لٹک رہا تھا۔ البتہ اپنی عمر کے باوجود اس کے ہاں ابھی تک بھورے تھے اور صرف ٹوپی کے بالے سے باہر ذرا تلکھے سے بھرے تھے۔

میس مونسن جو کہ پورے جشن کا میزبان بنا ہوا تھا اس کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔

”اچھا۔۔۔ تو تم یہاں ہو نہیں پا چھٹیس۔۔۔ کچھ کھایا پیا بھی ہے۔“
تم کل اپنی محبوبہ کے ساتھ باہر گئے تھے میرا مطلب ہے لڑکے کے ساتھ کھیتوں میں گئے تھے؟“

بڑھا آدمی جو اچانک سہم گیا تھا اپنے بڑے بھورے ہاتھوں کا چھبسا بنا کر، ناقابل فہم انداز میں بڑبڑاتے ہوئے منہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک عمر رسیدہ شکل و صورت سے خاومد کھائی دینے والی لیکن جالی کے لباس میں ملبوس خالی خالی بھوری آنکھوں والی ایک عورت، عورتوں کے ٹوے سے نکل کر ان کی طرف آئی اور اپنا ہاتھ اس کی آستین پر رکھا۔

”وہ کہہ رہا ہے کہ کل تم، لڑکے کے ساتھ باہر کھیتوں میں گئے تھے؟“
”ہاں ہاں۔۔۔ اب اس نے بیٹھی ہوئی اور تقریباً ناقابل سمجھ آواز میں کہا۔“

”لیکن بہت ہی آہستہ روی سے کام ہوا۔ بہت ہی آہستہ۔“
”ہاں، لاؤ لے اب بوڑھی بھی تو ہو گئی ہے نا نہیں پا چھٹیس۔“

”وہ کہہ رہا ہے کہ لاؤ لے بوڑھی ہے“ عورت نے مینس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دہرایا۔ وہ اس سے تھوڑی چھوٹی تھی۔

”ہاں، یہ تو کہا جاسکتا ہے“ اس نے جواب دیا اور اپنے چھوٹے سے سر کو ہلایا۔
”اب وہ زیادہ کام کرنے کا قابل بھی تو نہیں رہی مینس مونسن۔ بیچاری مریل چنجر۔۔۔ اب اس کی کارکردگی بہتر بھی نہیں بنائی جاسکتی مینس مونسن۔“

”ہاں بھئی لیکن وہ ہے بھی تو چھوٹی اور کچھ زیادہ ضروریات بھی نہیں ہیں اسکی۔ تم اسے دانہ دلاؤ دیتے ہو نا؟“

تین منٹیں بھر کر مینس مونسن تین منٹیں۔ اور ہاں چاہک بھی“ اس نے جیسے چنے اور روٹنے کی درمیان کیفیت میں کہا۔

”ہاں، وہ بوڑھی ہو چکی ہے مینس۔ اب اس سے زیادہ توقع بھی تو نہیں کی جاسکتی۔“
”وہ کہہ رہا ہے کہ لاؤ لے بوڑھی ہو چکی ہے“ عورت نے کہا۔ وہ باری باری سوالیہ انداز میں دونوں کی جانب

دیکھ رہی تھی۔
لیکن جب وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی تو اس نے ساری گفتگو خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔

”ہاں ہاں۔۔۔ جد ہی ہم سب بھی ضعیف اور ناتواں ہو جائیں گے مینس مونسن۔ لیکن انہن کو شکایت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ہمارا آقا تو ہم سب کا خیال رکھتا ہے۔ چھوٹے، بڑے، سب کا اور اگرچہ اب ہر ایک کی ہر خواہش تو

پوری نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس شکرگزاری کے لیے بہت کچھ ہے لیکن جب نسن بوڑھا ہو جاتا ہے تو تھوڑی مشکل تو ہو ہی جاتی ہے نا

ہر چیز ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور انسان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کہاں جائے خیر

”کوئی بات نہیں میٹے تمہارے پاس مائٹھنکس تو ہے نا“

”مائٹھنکس“ اس نے آہستگی سے دہرایا اور پھر اپنے پیرن کے کونے کو ہاتھ میں لیے، (جسے وہ بات

کرتے ہوئے ضروری طور پر انگلیوں سے مردھرتی رہتی تھی) بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... خدا جانتا ہے.... مجھ نہیں پتا لیکن یہ بات تو ہے“

اس نے کہا اور ایک نیم خوف اور تجسس سے زمیندار کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ مائٹھنکس بہت عجیب ہو گیا ہے اور پھر یہ برنڈی۔ میں مونسن“

اچانک اس کی آواز میں ایک خوف سا در آیا

”اگر اسے کچھ ہو جائے.... تو ہمارے پاس تو صرف وہی ہے۔“

”نہ نہ میٹے ہمیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے جلو اب اندر جاؤ۔ ایک پیالی کافی یا شربت پیو اور

خوش رہو آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا“

میں مونسن نے کہا اور ساتھ ہی اپنے پسندیدہ نذر میں اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور انہیں اپنے ساتھ اندر

کمرے میں لے گیا۔

اسی دوران ان کے گرد ہلکے پھلکے رقص کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو جلد ہی عروج پر آ کر پوری رقص گاہ میں پھیل گیا۔

چھت اور دیواروں پر دیب جلا دیئے گئے تھے۔ بوڑھے اپنے کوٹ اتار کر پھینکنے لگے در سب سے پہلی اور بہترین ”کتیا“

کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کی مزاحمت کے باوجود سرد را بنسٹا سے بھری چیخیں مارتے چل پڑے۔ کمرے کے ایک کونے

میں ذرا اونچی پر دو دالکن نواز بیٹھے دالکن بجا رہے تھے۔ ان کے بدن پسینے سے شرابور تھے۔

دیوار کے ساتھ لمبائی میں لگی نشستوں پر بیٹھے لوگ رقص دیکھنے میں محو تھے۔ یہیں پر ایک مضحکہ خیز شکل رکھنے والا

لڑکا جس کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا، بیٹھا اپنی بڑی بڑی ساکت آنکھوں کے ساتھ لگا تار این کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میس

مولس کے خوب روپے کے ساتھ محور رقص تھی۔

وہ اگرچہ کوتاہ قامت تھا لیکن اس کے گھٹنوں پر رکھے غیر معمولی طور پر بڑے ہاتھ نیلا ہٹ آ میز سرخی لیے ہوئے

تھے۔

اس کے کندھوں پر پتلے سیدھے بالوں والا ایک بہت بڑا سردھرا تھا۔

یہ مائٹھنکس تھا۔

اس نشست کے عین سامنے کی نشستوں میں سے ایک پر اس کی ماں بیٹھی تھی اس کی گود میں مائٹھنکس کے اوتگھٹتے

ہوئے باپ کا ہاتھ تھا جسے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔

اتنے میں داخلی دروازے کی طرف حرکت ہوئی۔ یہاں سے رئیس پادری کا سفید وجود دکھائی دیا۔ اس کے

ساتھ اس کی بھری بھر کم اہلیہ زمینداروں، وراثت کی بیویوں کے جلو میں نمودار ہوئے۔ ایک لمحے تک خاموشی وجد کے سے عالم میں رقص کو دیکھنے کے بعد اس نے اپنی باہر کست خواہش کا اظہار کیا کہ اسے اس مجھے سے چند غلط کہنے ہیں۔ اس اثنا میں میس مونسن اسے قنطیر کی ہوئی شراب Punch کا گلاس پیش کر چکا تھا۔ موسیقی کو بند کرنے کا اشارہ کر دیا گیا اور ہال میں مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ رقص کرنے والے جوڑوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا لیکن وہ رقص کے اسی دائرے میں کھڑے رہے انہیں یہ سننے کی کوئی خاص تمن نہیں تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

اس کی تقریر حرف بحرف وہی تھی جو کہ گزشتہ دس برسوں میں اس موقع پر پیش کی جا رہی تھی۔ یہ رٹی رٹائی تقریر اب تک اس پر ایسی رقت طاری کر دیتی کہ اس کی آواز بھیگ جاتی اور اس کی خوبصورت آنکھیں شک آلود ہو جاتیں۔ اس نے کہا کہ وہ بہت فخر و انہماک کے ساتھ اس مجھے کو دیکھتا ہے جس میں سب امراء اور غریب، چھوٹے بڑے ایک ہی سر سے کے ساتھ خوشگوار فصل کی کٹائی کے بعد بلند و بالا ہستی کے حضور شکرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ ان خوبصورت نیوں کے درمیان بس امن کے اس گہوارے کو حاسدین کی نظر اور شرانگیز شیاطین سے پنی پناہ میں رکھے اور اس بھائی چارے کی فضا کو مستحکم کر دے۔

آخر میں اس نے ایک مصنوعی وقفہ کیا اور ایک چھوٹا سا قدم آگے بڑھایا اور ایک بٹپ کی سی شاں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”میں نے سنا ہے کہ

”عزیز دوستو! اس نے کہا اور اپنے ہاتھ سے مجھے کو اوپر ایک معتبر انداز اشارہ کیا۔

میں نے سنا ہے کہ مجھے بتایا گیا ہے کچھ لوگ اس جگہ کو ملک کے ”مردہ نقاط“ کہہ کر پکارتے ہیں۔

”خدا ہی ہے جس نے ہمیں مرگ عظیم سے حیات بخشی اور وہی ہے جو ہمیں موت سے رہا کرے گا“

یہ موڑ بھی سامعین کے لیے نیا نہیں تھا لیکن وہ بادب فرش پر نظریں گاڑے سنتے رہے۔ اب وہ ہال میں گیا

تاکہ ان سب سے انفرادی طور پر مل سکے۔

تقریر کے بعد موسیقی ایک نئی زندگی کے ساتھ دوبارہ جاگ اٹھی جبکہ پادری وراثت کی بیوی ان زمینداروں اور ان کی بیویوں کے گھرے میں سرائے کے ذاتی کمرے کی طرف چل دیا جہاں شام کے کھانے کی میز کو پر شکوہ انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ میز پر بھنی ہوئی بٹن، روایتی انداز میں ٹھنڈی پیش کی جانے والی مرغیاں، مرغوانی شراب اور آلو بخارے بھری پیٹری موجود تھی۔

پادری کی تقریر کے دوران اناعوام اور این ہال سے غائب ہو چکے تھے۔

ماچھیس کی ماں ہر اسماں بیٹھی ان دونوں کے اور اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کہ خود بھی ہال سے

جا چکا تھا۔

شراب کے ہلکے سے نشے میں وہ اپنا ہلتا ہوا سر لے کر انہیں ہر طرف تلاش کر رہا تھا۔ کمروں کی طرف اور باہر باغ میں اس نے ہر تار یک گوشہ چھان مارا لیکن اسے کچھ بھی دکھائی یا سنائی نہ دیا۔

پھر وہ آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ راستے میں وہ میس مونسن کے ڈیرے کے قریب سے

گزارا جو کہ بند گودام کے عقب میں واقع ایسے لگتا تھا جیسے تاریک ٹکرانی کے میناروں کے حصار میں ہو۔
 اس نے اپنے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں کو تخت سے مٹھیوں کی صورت بھینچ لیا۔ بے دردی سے اپنے ہونٹوں کو کاٹا۔
 کیسا ہو کہ ایک طوفانی رات کوئی س گھاس پھوس کی چھت کو پھونک ڈالے؟ تاریکی میں اس کے ہونٹ لٹکے ہوئے تھے۔

اس سوچ نے اسے ایک لمحہ کو مسرت بخشی۔ وہ چشم تصور میں س بھڑکتی آگ کو دیکھنے لگا۔ ساری مخلوق اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ زمینداروں کا سا شہر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ وہ اپنی سوچوں کی پچھل اور اپنے سینے میں چھپتی اس صدا سے واقف تھا جو ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتی تھی۔ ایسا کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا لیکن اس سوچ سے آگے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس سے آگے کبھی کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ اسے بہت اچھی طرح علم تھا کہ اس جشن سے اگلے روز سب کچھ ختم ہو جائے گا اور مٹی کے ایک دن وہ اور این رشتہ ازدواج میں بندھ جائیں گے۔

اور پھر ایک روز جب میں منوسن کی یہ جاگیر اس کے بیٹے کے ہاتھ آ جائے گی تو وہ اپنی بی بی اوئی جریس پہنے، اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے کر اس کے پاس کوئی کام حاصل کرنے کی التجا کر آئے گا۔ کوئی بھی کام، گائیوں کی غلاظت دھونے، کچھڑ بھرے جوہروں کی صفائی یا سور کے گوشت کے پارچے بنانے کا کام اور پھر یہی ہوا۔

Henrik Pontoppidan's 'Idyl'

Sandinge Menighed. En Fortælling (1883)

سے پیا گیا نیا اور مختصر رزلن (صدف مرزا)



پتھر

تحریر: رچرڈ شیلٹن (Richard Shelton)

ترجمہ: احمد صغیر صدیقی

یہ میری ایک پسندیدہ عادت ہے، گرمیوں کی راتوں میں، میں اکثر یہاں ہر نکل جاتا ہوں اور پتھروں کو اُگتے دیکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ یہاں صحرا میں عہدگی سے اُگتے ہیں کیونکہ یہاں گرمی بھی ہوتی ہے اور خشکی بھی جبکہ دوسرے مقامات پر ایسا نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے اُگاؤ میں کثرت کا سبب وہ نوجوان پتھر ہوں جو ذرا مستور اور سرگرم ہوتے ہیں۔

نوجوان پتھر کچھ زیادہ ہی متحرک ہونے کے عادی ہوتے ہیں جبکہ یہ بات اُن کے بڑوں کی نگاہ میں مناسب نہیں ہوتی۔ بہت سے نوجوان پتھروں کے اندرونی خفیہ خواہش ہوتی ہے جو کبھی اُن کے اجداد کے دلوں میں ہوتی تھی مگر جسے وہ زمانہ ہوا بھلا چکے ہیں اور چونکہ یہ خواہش پانی کی محتاج ہے عموماً اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ پرانے پتھر پانی کو پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں ”پانی تو ہر جگہ چیز ہے کبھی کسی جگہ نہیں رکھا اسی لیے کچھ سیکھ بھی نہیں پاتا۔“ لیکن نوجوان پتھر بھی ایک ہی ہوتے ہیں یہ بڑی خاموشی سے، نظر میں آئے بغیر، خود کو ایسی جگہ آہستہ آہستہ پہنچا دیتے ہیں جہاں کبھی بارش، کبھی کبھی آندھی وغیرہ کی وجہ سے انہیں کوئی پانی کا چھوٹا سا ریل مل جاتا ہے جو، نہیں کبھی کسی، اونچی ڈھلوان سے نیچے گرا دیتا ہے یا کسی اور جگہ پہنچا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں چھپے ہوئے خطرات کے باوجود انہیں سفر کی خواہش رہتی ہے وہ دنیا دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر کسی جگہ اپنے اصل مسکن سے کہیں دور، قیم کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی نسل کی فروغ کے لیے اپنے اجداد کی محکومی سے پرے۔ ورنہ باوجود اس کے کہ پتھروں میں خاندانی رابطہ ہلاکا ہوتا ہے، ان میں سے بہت سے نوجوان پتھر بالآخر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے جسموں پر ان کوششوں کے نقصانات بھی ہوتے ہیں جو وہ عمر میں اپنے سے چھوٹوں کو دکھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انہوں نے کبھی کوئی بڑا سفر کیا تھا کسی بڑے آبتار، کسی بڑے دریا کے ساتھ چلے تھے یا صرف دس پندرہ گز دور تک لڑھکے تھے کہ یہ بھی ایک قابلِ غما فاصلہ ہے۔ پھر جیسے جیسے وہ پرانے ہوتے جاتے ہیں وہ اپنے مہمائی قہے کہنا بند کر دیتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ پرانے پتھر بے حد محبت پسند ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں کسی بھی قسم کی حرکت یا تو خطرناک ہوتی ہے یا پھر ایک فضلِ مذموم۔ وہ جہاں ہوتے ہیں وہیں پڑے رہتے ہیں اور اکثر پھوٹے رہتے ہیں۔ مونا پہ، حقیقتاً ان کے ہاں بڑائی کی علامت ہوتا ہے۔

اور گرمیوں کی راتوں میں جبکہ کم عمر پتھر سو چکے ہوتے ہیں، ان کے بڑے ایک نہایت سنجیدہ اور خامے خوف ناک موضوع پر گفتگو کرتے ہیں، یعنی چاند کے بارے میں جس کے بارے میں بات کرتے ہوئے کوئی اپنی آواز اونچی کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں ”دیکھو یہ کتنا روشن ہے اور کس طرح آسمان میں چل

رہا ہے۔ ہمیشہ شکل بدلتا ہوا“ کوئی بات شروع کرتا ہے۔
 پھر دوسرے کی سرگوشی ابھرتی ہے اور کبھی تم نے محسوس کیا کہ یہ کس طرح ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے؟ جیسے
 چاہتا ہے کہ ہم بھی اسی کی پیروی کریں۔“ اور پھر ایک تیسری سرگوشی کہتی ہے۔
 ”یہ بھی ایک پتھر ہے، سنکا ہوا۔“

(امریکی کہانی)



پاتال

تخلیق: نور الہدی شاہ

ترجمہ: شاہد حسنی

موت کی جانب جانے والے سارے راستے۔

اور ان راستوں پہ چھوٹے چھوٹے قدموں چلتی ہوئی زندگی۔

کوئلہ کی سیاہ سڑک تپ کر دھکتی ہوئی آگ اگلتا آسمان سناٹا۔ قدم بہ قدم سنگ سنگ چلتے ہوئے

مرد اور عورت۔

”دیکھو تو کتنی خوش نم رہے یہ کائنات کتنا سکون ہے فہم کائنات میں، کتنا دل کش ہے سب کچھ۔ تم، میں اور یہ لمحے جو ہمارے ہاتھوں کی انگلیوں کے خلا سے گزر جاتے ہیں۔ تم کہہ کرتے تھے ناکہ کہیں بھی امن نہیں ہے مگر جانے کیوں مجھے چاروں اور امن ہی امن معلوم پڑتا ہے بولتے بولتے وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔ ”یوں غور سے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟“ نہیں مجھے اس طرح گھور کر نہ دیکھا کرو، موت جیسی اس نظر سے۔“ چلتے چلتے وہ اس کا ہاتھ تھام کر ٹھہر جاتی ہے اور رد عمل میں مرد کا گھورنے کا انداز اور زیادہ سرد ہوتا ہوا موت کی مانند برف کی مانند عورت اپنے اندر رگوں تک اور لہو کے قطروں تک سرد بہت زیادہ ٹھنڈا سج دریا اترتا محسوس کرتی ہے۔ وہ اک بار پھر بڑبڑاتی ہے۔

”مدتوں سے میرے دل میں اک چھوٹے سے پرسکون گھر کا جو پہنا پل رہا ہے، کیا اسے کبھی بھی تعبیر نہیں ملے گی!!؟ آواز ٹوٹنے سے پہلے خاموش ہو جاتی ہے۔

”گھر!!“ رہبر میں ڈوبی مسکراہٹ مرد کے ہونٹوں پر عود کر آتی۔ ”میں سوچتا ہوں، کیا ہر دیوار پنہا گاہ بن سکتی ہے! کیا ہر گھر میں انسان رہتے ہیں؟“ کتنے گھر ایسے ہیں جن میں انسان جانوروں کی طرح درجہ نورانہ توں کی طرح رہتے ہیں۔ کیا اتنی اونچی دیوار بھی اٹھائی جاسکتی ہے، جس کو موت بھی عبور نہ کر سکے!!“ ”کہو!“ بولتے بولتے جیسے گیلی لکڑیوں کا دھواں کھیوں میں بھر جاتا ہے۔ وہ دایاں ہاتھ آنکھوں پر رکھ دیتا ہے۔ دونوں کے مابین ان گنت بل سکوت کا راج رہتا ہے۔ اس خاموشی کے آخری پل میں وہ جیسے سسک پڑتی ہے۔ ”میں میں تمہیں ہوش بھی ہے کہ کہ تمہارے بچے کی ماں بنے وان ہوں۔“ عورت کی بات سنتے ہی آنکھوں پر سے بیاں ہاتھ ڈھلک جاتا ہے۔ نگاہ اس کے نینوں میں الجھ جاتی ہے۔ جیسے رکت پانی میں پتھر گرنے کی شراپ ہو۔

”نہیں۔ تو“ وہ بس اتنا ہی پوچھ پاتا ہے۔

”نہیں کیوں؟ کیا تم نے میرے ساتھ راتیں بسر نہیں کی ہیں!! کیا تم نے کبھی بھی مجھے چھوا تک نہیں ہے؟“ دکھ اور کرب کے مارے آنکھیں جھلک جاتی ہیں۔ مرد کوئی بھی جواب نہیں دیتا۔ چپ ہے پتھر کی طرح۔

”تمہیں تمہیں شک پہنچا ہے کیا؟ وہ بھرتی ہوئی آواز میں پوچھتی ہے۔

”ہاں سکوت میں سسکی۔ دھیرے دھیرے نگاہوں کے سامنے اس کا چہرہ دھندلانے لگتا ہے۔
 ”تم کہا کرتے تھے ناں کہ عورت کے پیٹ میں پلتا بچہ، اس کائنات کی سب سے پیاری تخلیق ہے۔ کہا کرتے تھے ناں؟“

”ہاں.....“ پھر اک طویل خاموشی۔ وہ خلا میں گھورتا رہتا ہے۔
 ”پھر تمہیں اتنا شاک کیوں پہنچا، اس بچے کا سن کر؟“ زمانے سے ڈرتے ہو، مرد ہو کر؟ اور میں عورت ہوتے ہوئے بھی تم نہیں جانتے کہ اس بچے کا پنہ تو میرے خون کی بوند بوند میں سانس لیتا ہے اور اور ”آواز درمیان میں ہی چھلتی ہو جاتی ہے، کچے دھاگے کی طرح“
 ”سنو.....“ مرد کی سرگوشی۔

وہ کوئی بھی جواب نہیں دیتی۔ مرد اس کا ہاتھ تھام کر دوبارہ پکارتا ہے۔
 ”سنو اس دور میں، جب انسان انسان کا گوشت کھا رہا ہے اور موت چاروں اطراف پر پھیلانے کھڑی ہے، یہ میں کیا ہمیں حق ہے کسی انسان کو جہنم دینے کا؟“

جواب میں اس کے نینوں میں، بھرتے ہیں حیرتوں کے پہاڑ، جیسے وہ کچھ بھی نہ سمجھ رہی ہو۔
 ”میں سوچ رہا ہوں تمہارے پیٹ میں یہ جو بچہ ہے، کیا یہ اس بارود کے دور میں کسی بھیانک جنگ کے شعلوں میں جل کر بھسم ہونے کے لیے جہنم لے گا؟ اور اور اتنی بھوک ہے اس وسیع و خریض سنسار میں۔ جانے روز کتنے بچے بھوک سے مرتے ہیں اور تم، بھوک سے مرنے والے بچوں کی فہرست میں ایک اور نام شامل کرنا چاہتی ہو کیا؟“

”بس کرو“ نفرت اور ذہن کے مارے وہ گھٹی گھٹی چیخ مارتی ہے۔
 ”بولتے دو مجھے“ دوبارہ بولتے ہوئے وہ زیادہ سنگدل محسوس ہوتا ہے، ”تمہیں اندازہ ہیں کہ اس دھرتی پر کتنا بڑا جہنم بھڑکنے والا ہے اور موت کتنی بھیانک ہو چکی ہے۔ ہلو پوائزن کی طرح جیتا اور مرتا ہوا اس زمانے اور آنے والے زمانوں کا انسان اور اور پناہ گاہ کہیں بھی نہیں ہے۔“

”پاگل ہو گئے ہو تم“ اب وہ اپنے دل میں پہلی بار اس کے لیے نفرت کا ہلکا سا احساس محسوس کرتی ہے۔
 ”ہر وہ انسان جو خود کو اس دوزخ میں ایڈجسٹ نہیں کر سکے گا، سو یا تو پاگل ہو جائے گا یا خودکشی کی موت مرے گا مگر میں بھی تو کچھ بھی کر نہیں سکوں گا۔ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ اس نائنک کو چپ چاپ دیکھ رہا ہوں..... بے بسی کے ساتھ۔“

لیکن عورت کو اس کا چہرہ اس کورے کا غلجیسا لگتا ہے جس پر کچھ بھی نہ لکھا ہو۔
 ”تم مجھے سن رہی ہونا؟“

”تمہیں سننے کے لیے جو حوصلہ چاہیے، وہ مجھ میں کہاں ہے! پھر بھی شاید تمہیں سن ہی تو رہی ہوں؟“
 ”ایسی کوئی ہمت تو مجھ میں بھی نہیں ہے۔ تبھی تو تمہیں پاگل پاگل لگتا ہوں مگر سنو تو! تم کیوں ہر انسان کو پیدائشی موت کے اس کنویں میں پھینکنا چاہتی ہو، جس کے باہر کھڑے تمہاری تالیاں بھر رہے ہیں!“
 ”پھر؟“ وہ تھکی ہوئی، ٹوٹی بکھرنی آواز میں جیسے پاتاں سے بول رہی ہو۔

”پھر! پھر تم ابارشن کرالو“

”نہیں“ وہ بھنوروں اور پاتالوں کی ساری قوت یکجا کر کے چلانا چاہتی ہے۔

”نہیں۔ نہیں۔ ن۔ ن۔ ہ۔ ہ۔ کی۔ کی۔ س۔ س۔“ کھیوں میں اتر آئے والے

کرب کے آثار مزید شدید ہو جاتے ہیں۔

”او۔ تم تو عورت ہونا!۔ موتی جیسا کلیجہ ہوتا ہے عورت کا۔ پھر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو!۔ سنو۔ اس

لامحدود دھرتی پر کہیں بھی کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ ہماری کمرؤں کے ساتھ ہم باندھے گئے ہیں اور کون جانے کس گھڑی

سب کچھ بھسم ہو جائے، ایک ہی دھماکے سے۔ تم میں۔ اور وہ بھی“

اور وہ اداسی کے عالم میں بولتی ہے، موسم کی مانند قطرہ قطرہ پگھلتی ہوئی آواز میں۔

”دکھ یہ ہے کہ تم میں وہ سندر جذبات ہیں ہی نہیں، جو کسی تخلیق کار کے دل میں موجزن ہوتے ہیں مجھے تو

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے ننھے ننھے پیروں کے ساتھ میرے انگ انگ میں دوڑتا پھرتا ہے۔ اس کے ہاتھ

میرے پورے وجود کو چھوتے ہیں اور اور میں تو اپنے پستانوں پر اس کے دودھ سے تریوں کا مس بھی محسوس

کرتی ہوں۔۔۔“

”اور یہی تو دکھ ہے کہ پھر بھی پھر بھی تم اسے جنم دینا چاہتی ہو! دیکھو، بھوک بے

روزگاری بارود کے جلتے الڈ، شکستیں اور چاروں اطراف پھیلے ہوئے فنا کے سیاہ اور بھیا تک ہیولے۔ اس کے

عدوہ رکھائی کیا ہے اس اتنی بڑی دنیا میں! کیا یہی سب کچھ دینے کے واسطے جنم دوگی، س؟“

اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ منوں میں صدیوں کی چاہت بجھنے لگتی ہے اور دس میں نفرت اُمنڈ آتی ہے اس

کیلئے۔

”تمہارے سینے میں دل کب دھڑکتا ہے بھلا! تمہارے سینے میں دس کی جگہ پتھر ہے آئی سی

ہیٹ! ہاں سن لو نفرت ہے مجھے تم سے نفرت ہ۔ س۔ ت۔ م۔ س۔ س۔“

سکوت میں سسکیاں۔۔۔ وہ جاننے کے لیے قدم اٹھاتی ہے۔

”جاری ہو کیا۔۔۔؟“

”ہاں“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ پناہ گاہ کہیں بھی نہیں ہے۔۔۔ یولو!“

”پناہ گاہیں تو انسان کے دل میں ہوتی ہیں۔ جسے اپنے دل میں پناہ مل جائے نا، سارا کرفارض پناہ گاہ بن جاتا

ہے اس کیلئے۔“

وہ جانے کے لیے قدم بڑھاتی ہے اور اس کے اندر کچھ ترخ سا جاتا ہے۔ مرد ڈگ بھرتا ہوا اس کے سامنے

آکھڑا ہوتا ہے، راستہ روک کر۔

”تاں۔ جاؤ۔۔۔“

”رکنے کو جواز ہی کیا پچ ہے!“ تمہارے دس کی ساری خوب صورتیاں جمود کا شکار ہو چکی ہیں اور اب مجھے تم

پر موت کا گمان ہوتا ہے۔ بد صورت موت جو ساری خوب صورتیاں اجاڑ دینا چاہتی ہے آئی ہیٹ یو“

بس وہ مال کے ساتھ مسکرا دیتا ہے۔ سامنے ہی وہ موڑ ہے جہاں سے اس کا لگ راستہ شروع ہوتا ہے۔
 ”الوداع یہاں سے ہی سوٹ جاؤ۔ میرا پیچھا مت کرنا۔ جب تمہارا دل آئینے کی طرح چمکنے لگے گا
 جب تمہیں زندگی پر اعتماد ہو جائے گا تب میں اور وہ کسی نہ کسی موڑ پر تمہیں مل جائیں گے۔“
 وہ کچھ بھی جواب نہیں دیتا۔ بہت جھڑپھسی نظروں سے اسے موڑ مڑتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ عورت
 حدِ نگاہ سے آگے بڑھ جاتی ہے اور مرد درخت کے نیچے کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیتا ہے۔
 اگلے پل

اسے اپنے عقب میں بم پھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ ورا آنکھوں کے سامنے وہی حائل عورت اسی بچے کو جنم دیتی دکھائی
 دیتی ہے، چاروں جانب بچے کی کلکاریاں جلنے لگتی ہیں جیسے۔

(سندھی کہانی)



قدیم چینی شاعری سے انتخاب

لی پو/ نامعلوم شاعر
مترجم: یونس خان

(۱)

ملی جو پھولوں کو پانی دیتا ہے،
اُسے اس کی مناسب اجرت دی جاتی ہے
کتنا امیر ہے وہ باغیاں، اختیار میں
جس کے ہے مجھے پانی دینا۔
اک اکیلاتا بنے کے جیسا سنہری پھول
اپنی نگہداشت کے بدلے، بہت اچھی قیمت چکائے گا
اُس عورت نے جو اس کے اوپر خرچ کیا ہے، وہ آسکتی ہے
اُس کی عظمت بن کر۔ اُس کے بالوں میں
لیکن کیا وہ ایک شعر کے مول کو پرکھ سکتی ہے
وہ اپنے آپ سے بھی بلند تر ہے
کہ وہ زمین بھگوتی ہے اور خشک کرتی ہے
جس کے اوپر پھول کھدا ہے؟
سبز گھاس، شی چوآن، پانی کی دھار
بلند سورج کے سمندر کی طرف،
کیا اُس لڑکی نے جس نے میرا چہرہ خشک کر دیا ہے،
میرے چہرے کو سوچا ہے یا مجھے؟

☆ مرچ مصالحے اور تکی کا چینی پکوان

اور جب پانی گھڑی خوشامد کرے گی
 اُس لمحے جب محبوب ملتے ہیں
 میں انتظار کر رہا ہوں گا شبنم کی طرح
 اُس کے پاؤں پہ پڑے آنسوؤں میں۔

(۲)

چیری کے زمیں سے اٹھے ہوئے چوں کے رُخ
 بہار میں، ستاروں کا نقاب بنانے کے لئے
 پھل، گرمیوں میں لودیتے ہوئے، ایک تھنہ
 جو محبوب کینڈر کو نشان زدہ کرتے ہیں۔
 خزاں میں، پتے درختوں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں
 اور قالین بچھا دیتے ہیں تمہارے پاؤں کے لئے
 مچال اُتار دیتے ہیں، سردیوں کی برہنگی کے لئے،
 شاخیں جو اپنے سبزے کے فریب میں ہیں
 وعدے کیے ہوئے، جو وعدے عورتیں کرتی ہیں۔
 ابدی جوانی، ازلی جمال،
 ہمیشہ کے لیے، وہ جیسی بھی ہے
 ایک نظم ایک چہرے کے پیچھے مرتب کی ہوئی۔
 اس بے سردیاں ٹھنڈک دیتی ہوئیں لیٹی ہیں
 درختوں اور عورتوں کی بے وقائی کے لیے

(۳)

میں اپنی گتیا میں واپس آ گیا ہوں
 سکون سے بیٹھا میں اپنے لوگوں کو دیکھتا ہوں
 اپنے ناتبدیل ہونے والے کاموں کی طرف جاتے ہوئے

گل داؤدی کی چائے سے میں نے تازہ توانائی حاصل کی
 دیواروں کو یاد کر کے میں سفر نہ کرنے کا عہد کرتا ہوں
 نیلے آسمان میں سورج میرا خوشی سے استقبال کرتا ہے
 میرا آتش دان خالی ہے لیکن دروازے کے پاس لکڑیوں کا ڈھیر ہے
 میری بیوی مجھے تازہ غیرا ہم خبر سنا تی ہے
 الماری کی طرف جاتے ہوئے جہاں کاغذ، برش
 اور سیاہی رکھی ہے،
 میں قناعت کی مدح میں ان مطروں کا آغاز کرتا ہوں
 قادر پیگ نے کہا: اُس وقت میں بڑا جوان تھا

(۴)

عقب میں میرے غروب ہوتا ہوا آفتاب قرمزی ہے، قرمزی۔
 جاڑے کے موسم میں یہاں کوئی جھینگ نہیں ہے
 پہرے دار اپنے ترخے ہوئے جس پر تھپ دیتا ہے،
 سرد مہر سپاہی سرد مہر انداز میں بات کرتے ہیں
 عقب میں میرے غروب ہوتا ہوا آفتاب قرمزی ہے، قرمزی۔
 یہاں، اس سورج سے پرے، شہنشاہ، تم کرتا ہے
 میرے عقب میں پہاڑیوں کی پوری سرخ ہو چکی ہیں۔
 رخصت ہوتے ہوئے خورشید کی طرف میں نگاہ نہیں کرتا
 میرے خیالات افلاک کے وارث کی طرف نہیں ہیں
 سرخ ہو چکی چوٹیوں سے پرے چانگ اُن غلط بیانی کرتا ہے:
 تم ہمیشہ جھوٹ بولتے ہو، میری پہنچ سے باہر
 عقب میں میرے غروب ہوتا ہوا آفتاب قرمزی ہے، قرمزی۔
 ایک لشکری پیش بیویوں کے متعلق بتانے کے لیے آتا ہے،
 غروب آفتاب کے وقت ایک پرندہ پرواز کرتا ہے میرے ماضی میں۔

پہاڑیوں کی چھاتیاں اب بادامی ہیں
 صرف پہاڑوں کی پور میں یادوں کی طرح چمکتی ہیں۔
 قرطاس پر میرا برش آہستگی سے چلتا ہے
 سرکاری قیام گاہ کی پانی گھڑی ہچکچاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
 سورج کی نصف روشنی چلی گئی ہے
 پہاڑی کی تمام چھاتیاں تاریک ہو گئی ہیں
 رات ریختی ہوئی ہمارے درمیان آ گئی ہے
 دن نے ابھی آتا ہے۔
 میرے عقب میں سورج لہو، لہو ہے۔
 پر تاریکی میں سفر کے میل تہ میل نہیں ہوتے
 ایک دن میں واپس لوٹوں گا۔
 میرے عقب میں صرف سرخ آسمان ہے۔

(۵)

سنہری چکورا اور اس کی ساتھی
 باجرے میں چھپے ہوئے ہیں
 کون تیرا انداز اتنی بے رحمی سے نفرت کرے گا
 چکور کو حلال کرنے کے لئے؟
 سنہری چکور بچوں کے لیے نسل کشی کرتا ہے
 پانی سے بھرے چاول کے کھیت سے پرے
 اگر جال زور زور سے ملتے ہیں تو وہ کیوں خوفزدہ ہوتے ہیں
 اپنی سرسراتی ہوئی جنت کے پار؟
 سنہری چکور زور اڑ جاتا ہے
 مغرب کی طرف اپنے پھڑ پھڑاتے ہوئے پروں کی آواز کے ساتھ
 چکنی مٹی میں چھپا شکاری نہیں رہے گا

سہری چکور کا گھونسلہ ڈھونڈنے کے لئے
 گھونسلہ خواب کی طرح ہے یعنی کہ
 وہ نہیں ہے، اور ہو بھی نہیں سکتا
 امید اور تخیل کے تنکوں سے بنا ہوا
 پیار کے اخلاص اور محبت کی طرح

(۶)

افلاک امرا لود ہیں، میرے دماغ میں
 شہنشاہ کی خود پسند گھڑسوار فوج میدان جنگ بناتی ہے
 افسوس، یہ گھڑیاں پسا ہو جاؤ نہیں کہتے۔
 یہ افسوسناک ہے کہ ایک رات کی خوشی کے لیے
 مجھے صبح کے ناشتے کی قربانی دینی پڑے گی

(۷)

جوانی میں، لوگ شراب نوشی کرتے ہیں
 مبادا وہ سوچتے لگیں
 تصورات کے لیے (وہ جانتے ہیں)۔
 بڑھاپے میں، لوگ شراب نوشی کرتے ہیں
 یہ دیکھنے کے لیے (وہ سوچتے ہیں)،
 ایک چہرہ ہر شخص یاد رکھتا ہے
 آگ کی چنگاری میں

(۸)

دس نہ ختم ہونے والے سماں اب علیحدہ کرتے ہیں زندہ اور مردہ کو،
 میں نے اس کے متعلق کبھی سوچا نہیں ہے، لیکن میں اسے کبھی بھول نہیں پایا۔
 اس کی تنہا قبر ایک ہزاروں کے فاصصے پر ہے، میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں سرد ہوئی لیٹی ہے۔

ہم ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے اگر ہم دوبارہ مل جائیں
 میرا تمام چہرہ گرد آلود اور میری عبادت گاہ گھر سے دودھیا ہے۔
 رات کی گہرائی میں، اچانک ایک خواب مجھے اپنے وطن میں لے جاتا ہے،
 وہ درپے کے پاس بیٹھی، اپنے پہناوے کا چناؤ کرتی ہوئی سنگھار میں مصروف ہے۔
 ہم ایک بھی لفظ کہے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے تھے، اب ہزاروں آنسو بہہ رہے ہیں۔
 مجھے یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ میں اس دل توڑنے والی جگہ کے متعلق ہر سال سوچوں گا۔
 جہاں رات میں چاند پوری آب و تاب سے چمکتا ہے اور چیرہ کے درخت مزار کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۹)

ریشم کے کیڑے بڑے ہو رہے ہیں،
 گندم نصف چلی،
 بے قابو بارش پہاڑ کے قریب برس رہی ہے،
 نہ گسان کھیت میں کام کر سکتے ہیں،
 نہ ہی خواتین شہوت اکٹھے کرتی ہیں،
 تمام لسانی اور خوانی عبا میں ملبوس دیوان خانے میں بلند جگہ پر بیٹھے ہیں۔

(۱۰)

مشرقی ڈھلوان پر ایک تنہا بوڑھا، بیمار آدمی،
 میرے کمر زدہ بال ہوا میں بے پرواہی سے اڑ رہے ہیں۔
 میرا بیٹا، غلطی سے، میرے سرخ و سپید چہرے سے خوش ہوا ہے،
 میں مسکراتا ہوں، میں جانتا ہوں یہ شراب سے سرخ ہے۔

(۱۱)

ایک نغمہ
 شراب ہمارے سامنے ہے، گانا گاؤ۔
 زندگی کب ختم ہوگی؟

یہ سویر کی شبنم کی طرح ہے
یہ غم انگیز ہے کہ بہت دن گزر گئے ہیں۔

گاؤ لو، گاؤ ہو

دل کی گہرائیوں میں، میں ٹھل ٹھل کر مر رہا ہوں،
کوئی بھی میرے غم و الم کو پرے نہیں دھکیل سکتا
مجھے بچاؤ ایک رب انحر، ڈو کا ٹنگ؟

نیلگوں نیلگوں عالم کی عبا ہے،

میں مسلسل ورد محسوس کر رہا ہوں، یہ اس کے لیے لمبی لمبی ہے۔
اے میرے آقا، میں تو تمہاری سوچ میں غرق ہوں
تمہارے لیے بے شمار خیالات ہیں۔

ایک دوسرے کے لیے پیار چلاؤ،

میدان پر کتری ہوئی گھاس ہے

جب ایک اچھا دوست مجھے ملنے آئے گا

ہم ایک دفعہ پھر ربط بجا میں گئے۔

آسمان پر چاند روشن ہے

اس کے باوجود میں اس تک کبھی بھی پہنچ نہیں سکتا

میرے دل میں اس طرح کا رنج گھر بناتا ہے،

میرے ساتھ ہمیشہ رہنے کے لیے

کھیتوں میں، ہمارے راستے کی پگڈنڈیاں عبور کیے جاتے ہیں

آپ کی بہت مہربانی، آپ آئے۔

ہماری لمبی جدائی کے بعد، ایک ہی وقت میں

تمہاری مہربانیاں یاد آتی ہیں۔

چاند واضح ہے، ستارے کم ہیں

کوئے جنوب کی طرف پرواز کرتے ہیں۔

تینوں وقت درخت کے گرد جلتے بنارہے ہیں

کوئی شہنی نہیں ہے جہاں سے نیچے اتر جائے۔
 پہاڑ بلند ہیں تو کیہ،
 یہ ساگر کتنا گہرا ہے؟
 جب نہ ہو؟ کا نواب ایک مہمان کا استقبال کرتا ہے،
 اس کی خواہشات پوری کرنے کے لیے ہم حکم کے منتظر رہتے ہیں۔

(۱۲)

بستر پر سونے سے پہلے
 مگر چاندنی میں
 ایسا محسوس ہوتا ہے
 کہ زمین پر دھند ہو جیسے
 سر اٹھا کر اپنا
 میں منور چاند کو دیکھتا ہوں
 سر تھکا کر اپنا
 میں اپنے گھر کے خواب دیکھتا ہوں

(۱۳)

میں، ہنرے میں ملبوس پہاڑی کے، اس درخت پر چڑھتا ہوں
 اور اپنے والد کے گھر کی طرف دیکھتا ہوں۔
 میرے والد کہہ رہے ہیں کہ افسوس میرا بیٹا سرکاری نوکری پر ملک سے باہر ہے،
 وہ فجر کے وقت اور رات میں کبھی آرام نہیں کرتا۔
 اُسے فکر مند ہونا چاہیے
 کہ اُس نے واپس جانا ہے، یہاں ہمیشہ نہیں رہتا!
 میں اُس عریاں پہاڑی پر چڑھتا ہوں،
 اور اپنی والدہ کے گھر کی طرف دیکھتا ہوں۔
 میری والدہ کہہ رہی ہے کہ افسوس میرا بیٹا سرکاری نوکری پر ملک سے باہر ہے،

وہ فجر کے وقت اور رات میں سوتا نہیں ہے۔

اسے فکر مند ہونا چاہیے

کہ اس نے واپس آنا ہے اور اپنا بدن یہاں نہیں چھوڑنا ہے!

میں چٹان پہ چڑھتا ہوں،

اور اپنے بڑے بھیا کے گھر کی طرف دیکھتا ہوں۔

میرا بڑا بھائی کہہ رہا ہے کہ افسوس میرا بھائی سرکاری نوکری پر ملک سے باہر ہے،

اسے ضرور اپنے رفقاء کی ہمنوائی کرنی چاہیے۔

اسے فکر مند ہونا چاہیے،

کہ اسے ضرور واپس آنا ہے، مرنے نہیں ہے!



زخم بھرنے کو غزل چاہیے ہے

(غزلیں)

سحر انصاری

تھی دھوپ مری، سایہء دیوار سے پہلے
غم ہی مرا غم خوار تھا، غم خوار سے پہلے
کیا ان کے لیے جیت ہے کیا ان کے لیے ہار
دل ہار چکے ہوں، جو ہر اک ہار سے پہلے
موسم کا اک انعام ہے پھولوں کی نمائش
راس آئے اگر وادیء پُر خار سے پہلے
دشوار نہیں اپنے لیے نقل مکانی
مل جائے اجازت درودیوار سے پہلے
ہر شہر میں ہر ملک میں ہر صحن گلستاں
تھا دشت ہی شاید گل و گلزار سے پہلے
ہیں خوب اُن آنکھوں کے بدلتے ہوئے انداز
اقرار کا ہر اک رنگ تھا انکار سے پہلے
یوں ہی نہیں مہتل میں چلے آئے اچانک
گزرے ہیں سحر گوچہ دلدار سے پہلے

افتخار عارف

مہک رہے ہیں جو یہ پھول لب بہ لب مری جان!
 جو تم نہیں ہو تو پھر کون ہے سبب مری جان!
 اداسیوں بھری شامیں جہاں سے آتی ہیں
 وہیں سے آتی ہے یہ ساعتِ طرب مری جان!
 ہری کتابیں، ہری خوشبوئیں، ہری آنکھیں
 تمہارے ہجر میں جاگے ہیں سب کے سب مری جان!
 تمہارے ساتھ، جو گزرے تمہاری یاد کے ساتھ
 نہ ویسے دن کبھی گزرے نہ ویسی شب مری جان!
 بہم ہوئے ہیں ذرا دیر کو تو خوش ہو لیں
 کسے خبر کہ چھڑ جائے کون کب مری جان!
 کوئی دن اور کہ ہو جائیں گے نسانہ ہم
 ہماری یاد ستائے گی تم کو جب مری جان!
 بہت دنوں میں کبھی میں نے اس طرح کی غزل
 دگر نہ دل کی یہ حالت ہوئی تھی جب مری جان!

افتخار عارف

محفظِ روشِ رفتگان کوئی نہیں ہے
 جہاں کا میں ہوں مرا اب وہاں کوئی نہیں ہے
 محاذِ زیست کے ہر معرکے میں فتح کے بعد
 کھلا کہ حاصلِ عمر رواں کوئی نہیں ہے
 سترگاہ سے جو پوچھا کہ اس طرف کیا ہے
 چمک کے بولے کہ اے جانِ جاں کوئی نہیں ہے
 نگاہِ پر، نہ آب و ہوا، نہ دوست نہ دل
 یہ ملکِ عشق ہے یاں مہرباں کوئی نہیں ہے
 فلک پہ چاند ستارے، زمیں پہ لالہ و گل
 بس ایک میں ہوں کہ نام و نشان کوئی نہیں ہے
 کچھ اعتبار اگر ہے تو حرفِ خیر کا ہے
 بھو اس کے اور سخنِ جاوداں کوئی نہیں ہے
 گزشتگانِ محبت کے خواب لکھنے کو
 ابھی تو میں ہوں مگر بعد ازاں کوئی نہیں ہے

توصیف تبسم

دشتِ غم! ہے کوئی رہگیر یہاں
 حادثے ہو گئے، زنجیر یہاں
 کون تھے بزم میں ہم سے پہلے
 درد ہوتا نہیں تحریر یہاں
 کوئی منزل نہیں جو دل کی لگن
 کون رہگیر ہے، رہگیر یہاں
 ہائے بیدردی دنیا کہ ہمیں،
 خواب سے کرتے ہیں تعبیر یہاں
 گرچہ ہر اشک ہے اک شیش محل
 ہر تمنا نہیں تصویر یہاں
 مجھ کو دیوانہ بنانے والے
 تو پس پردہ تصویر یہاں!
 دل خرابہ ہے، تمناؤں کا،
 تھی کبھی حسرتِ تعمیر یہاں

خورشید رضوی

نگاہ سے نہیں بنتے ترے درد و دیوار
 یہ میرے ساتھ کہاں چل پڑے درد و دیوار
 نہ منہ سے بول سکیں کچھ نہ سر سے کھیل سکیں
 ہمیں گواہ بھی کیسے ملے، درد و دیوار
 پھر اس دیارِ محبت میں جا کے لوٹ آئے
 نہ تھے مکین تو کیا دیکھتے درد و دیوار
 اسی کی نو سے فروزاں تھے خال و خدان کے
 بجھا چراغ تو لگل ہو گئے درد و دیوار
 زمیں لرزنے لگی روشنی سے ٹکرا کر
 ستارہ آ کے گرا، بج اُٹھے درد و دیوار
 کہاں سے مل گئی انجام کی خبر ان کو
 کہ وہ گئے ہیں کھڑے کے کھڑے درد و دیوار

جلیل عالی

زُتوں کی رو میں گزر ہوئے آشیاں ہمارے
 لگی ہے اک اُس کی نو تو کیا گیا جہاں ہمارے
 لئے ہیں دنیا نے گو بہت امتحاں ہمارے
 پر آسکی ہے کہاں کبھی درمیاں ہمارے
 دیئے شتی موسموں نے کیا گیا عذاب، پھر بھی
 جیے ہیں اک خواب، شہر، قصبے، گراں ہمارے
 عدو ہوائیں بھی حیرتوں کے حصار میں ہیں
 گھسے ہیں کن حکمتوں کے رُخ بادباں ہمارے
 کسی پہ کیا گھل سکیں ہمارے لہو کی لہریں
 کچھ اور ڈھب کے یقین ہمارے، گماں ہمارے
 یہ سوئے ظن کب ہے یار عمروں کا تجربہ ہے
 ہم اُن کے کتنے بھی ہوں مگر وہ کہاں ہمارے
 کتھا ہماری ہمارے الفاظ مانگتی ہے
 کسی سے کیا راحت و الم ہوں بیاں ہمارے

جلیل عالی

کچھ خیر آمدِ ہجراں کی تو تھی پہلے سے
 دل نے لیکن کوئی تدبیر نہ کی پہلے سے
 عشق میں اُس کے توفل نے عجب کام کیا
 آگ یہ اور بھی کچھ تیز ہوئی پہلے سے
 اتنا روکھا تو نہیں تھا کبھی لہجہ اُس کا
 جانے دل بچ تھی کیا بات دھری پہلے سے
 جا کے بھی اپنے حجابوں کے سبب لوٹ آئے
 ہم نے دیکھی جو بھری اُس کی گلی پہلے سے
 کسی منظر پہ نگاہیں نہیں رکنے دیتیں
 ایک حیرت کہ ہے آنکھوں میں بسی پہلے سے
 جا نکلتا ہوں میں اک بارہ دری میں اور ادھر
 رقص کرتے ہوئے پاتا ہوں پری پہلے سے
 آج پھر گردِ رو عمر ہٹا کر عالی
 اُس کے چہرے پہ کھلے عکس کئی پہلے سے

سلیم کوثر

مجھ میں آ بیٹھتا ہے جلوہ نمائی کے لیے
اور پھر عشق بناتا ہے ترا عشق مجھے
جانے کیا بھول گیا ہوں مجھے معلوم نہیں
جانے کیا یاد دلاتا ہے ترا عشق مجھے
پہلے تو صرف یہ محسوس ہوا کرتا تھا
اب تو جیسے نظر آتا ہے ترا عشق مجھے

وصل کے خواب دکھاتا ہے ترا عشق مجھے
ہجر تعبیر بناتا ہے ترا عشق مجھے
کبھی زنداں سے رہائی کا سبب بنتا ہے
کبھی قتل لیے جاتا ہے ترا عشق مجھے
ٹھوکریں کھاتا ہوا دیکھتا رہتا ہے کبھی
کبھی سینے سے لگاتا ہے ترا عشق مجھے
ایک عالم کو تماشائی بنا کر میرا
سر بازار نچاتا ہے ترا عشق مجھے
مجھ میں خود مجھ کو جدا کرتا ہے مجھ سے مل کر
جانے پھر کس سے ملتا ہے ترا عشق مجھے
پاپہ زنجیر کبھی لاتا ہے درباروں میں
کبھی مسند پہ بٹھاتا ہے ترا عشق مجھے
پاؤں سے باندھ کے رکھتا ہے زمیں کی گردش
اور ہواؤں میں اڑاتا ہے ترا عشق مجھے
پہلے گم کرتا ہے افلاک کی وسعت میں کہیں
اور پھر ڈھونڈ کے لاتا ہے ترا عشق مجھے
کھینچ کے رکھتا ہے زنجیر جنوں کی کڑیاں
اور گلیوں میں گھماتا ہے ترا عشق مجھے
جب بھی سُنا ہوں ازاں خود میں لرز اٹھتا ہوں
پھر جو سجدوں میں رلاتا ہے ترا عشق مجھے

احمد صغیر صدیقی

پردہ جو اٹھا دیا گیا ہے
 کیا تھا کہ چھپا دیا گیا ہے
 کیوں اتنے مطالبے ہیں ہم سے
 آخر ہمیں کیا دیا گیا ہے
 کچھ اور تھے اور اسی لیے بس
 کچھ اور بنا دیا گیا ہے
 اب اور نہ ہو گا کوئی اعلان
 اعلان کرا دیا گیا ہے
 جی بھر کے ستارے جگمگائیں
 مہتاب بچھا دیا گیا ہے

سید انور جاوید ہاشمی

خوشی آئے گی پھر علم آئیں گے
 زیادہ نہ آئے تو کم آئیں گے
 قیامت کے آثار سننے ہیں ہم
 سنے جائے ایک دم آئیں گے
 قد و قامت و خال و خط آ چکے
 غزل دُلف میں بیچ و خم آئیں گے
 ادھر سے ادھر چشمِ نم جائے گی
 لیے وہ ادھر چشمِ نم آئیں گے
 ذرا سوچ کر پیش کرنا غزل
 وہاں ناقدِ محترم آئیں گے
 وہاں آئیتے دل کے مت لے کے جا
 جہاں پتھروں کے صنم آئیں گے

ابراہیم احمد

قصبے سے ترے ، میری کہانی سے زیادہ
پانی میں ہے کیا اور بھی پانی سے زیادہ
اس خاک میں پنہاں ہے کوئی خواب مسلسل
ہے جس میں کشش عالم قافی سے زیادہ
نخل گل ہستی کے گل و برگ عجب ہیں
اڑتے ہیں یہ اوراق خزانہ سے زیادہ
ہر رخ ہے کہیں اپنے خد و خال سے باہر
ہر لفظ ہے کچھ اپنے معانی سے زیادہ
وہ حسن ہے کچھ حسن کے آزار سے بڑھ کر
وہ رنگ ہے کچھ اپنی نشانی سے زیادہ
ہم پاس سے تیرے کہاں اٹھ آئے ہیں یہ دیکھ
اب اور ہو کیا نقل مکانی سے زیادہ
اس شب میں ہو گریہ کوئی تاریکی سے گہرا
ہو کوئی مہک رات کی رانی سے زیادہ
ہم کنج تمنا میں رہیں گے کہ ابھی تک
ہے یاد تری ، یاد وہابی سے زیادہ
اب ایسا دیوں بھی تو نہیں حال ہمارا
ہے زخم حیاں ، درد نہانی سے زیادہ

ابراہیم احمد

جوار خواب سے ، اس رنج رانگ سے نکل
بہت خراب ہوا ہے ، سو اب یہاں سے نکل
وہ حسرتی ہے کہ اب تاب آرزو بھی نہیں
اے میری جان! ثواب میرے جسم و جاں سے نکل
کہ آشنا ہے میرا ہی نہ جانتا ہے اسے
ٹو درمیں کا نہیں ہے تو درمیں سے نکل
نکل کہ اور کہیں کوئی منتظر ہے ترا
مرے یقیں سے گزر جا، مرے گماں سے نکل
عدو کی خیر ہو، گرچہ کہاں یہ ممکن ہے
کہ تیرا اب تو گیا ہے مری کد سے نکل
تیرے سوا بھی ہے کہنے کو میرے پاس بہت
سو میری عرض تمنا میرے بیاں سے نکل

باصر سلطان کاظمی

دل لگا لیتے ہیں اہل دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو
صورتِ حالات ہی پر بات کرنی ہے اگر
پھر مخاطب ہو کوئی بھی انجمن کوئی بھی ہو
تار گیسو یا رگ گل سے ہوئے ہم بے نیاز
دار تک جب آ گئے عاشقِ دین کوئی بھی ہو
ہے وہی لا حاصلِ دستِ ہنر کی منتظر
آخرش سر پھوڑتا ہے کوہکن کوئی بھی ہو
ہیں جو پُر از آرزو ہوتے نہیں محتاج سے
رات دن محمور رکھتی ہے لگن کوئی بھی ہو
ہے کسی محبوب کی مانند اُس کا انتظار
دیدہ و دل فرش رہ مشتاقِ فن کوئی بھی ہو
شاعری میں آج بھی ملتا ہے ناصر کا نشان
ڈھونڈتے ہیں ہم اُسے، بزمِ سخن کوئی بھی ہو
عادتیں اور حاجتیں باصرِ بدلتی ہیں کہاں
رقصِ بن رہتا نہیں طاؤس، بن کوئی بھی ہو

باصر سلطان کاظمی

یہ نہیں ہے کہ تجھے میں نے پکارا کم ہے
میرے نادوں کو ہواؤں کا سہارا کم ہے
اس قدر ہجر میں کی تجمِ شماری ہم نے
جان لیتے ہیں کہاں کوئی ستارا کم ہے
دوستی میں تو کوئی شک نہیں اُس کی پر وہ
دوست دشمن کا زیادہ ہے ہمارا کم ہے
صاف اظہار ہو اور وہ بھی کم از کم دو بار
ہم وہ عاقل ہیں جنہیں ایک اشارا کم ہے
ایک رخسار پہ دیکھا ہے وہ تِل ہم نے بھی
ہو سمرقندِ مقابل کہ بخارا کم ہے
اتنی جلدی نہ بنا رائے مرے بارے میں
ہم نے ہمراہ ابھی وقت گزارا کم ہے
باغِ اک ہم کو ملا تھا مگر اس کو افسوس
ہم نے جی بھر کے بگاڑا ہے سنوارا کم ہے
آج تک اپنی سمجھ میں نہیں آیا باصر
کونسا کام ہے وہ جس میں خسارا کم ہے

سجاد بابر

کوئی نہ ہو تو گھر جائیں ہم
کچھ رکھوالی کر جائیں ہم
جالے کون بلا گزری ہے
سونا شہر جدھر جائیں ہم
خبر تمہارے آنے کی ہو
تم جو نہ آؤ۔۔۔ مر جائیں ہم
جب کاریز کا پانی گزرے
خالی کوزے بھر جائیں ہم
یہ پتا جو سبز بہت ہے
اس پر پھول نگر جائیں ہم
یہ دلیز ہے کوری، آئیں
اس پر پاؤں دھر جائیں ہم

اجمل سراج

کسی کے بھر میں بیٹا محال ہو گیا ہے
کسے بتائیں ہمارا جو حال ہو گیا ہے
کہیں گرا ہے نہ روندنا گیا ہے دل، پھر بھی
شکستہ ہو گیا ہے پامال ہو گیا ہے
سحر جو آئی ہے شب کے تمام ہونے پر
تو اس میں کون سا ایسا کمال ہو گیا ہے
کوئی بھی چیز سلامت نہیں مگر یہ دل
شکستگی میں جو اپنی مٹاں ہو گیا ہے
ادھر چراغ جلے ہیں کسی درجے میں
ادھر وحیفہ دل بھی بھاں ہو گیا ہے
حیا کا رنگ جو آیا ہے اس کے چہرے پر
یہ رنگ حاصلِ شامِ وصال ہو گیا ہے
مسافتِ شبِ ہجراں میں چاند بھی اجمل
تھکن سے چور غموں سے ٹھہال ہو گیا ہے

حسن عباس رضا

قرض پر نیند لیے کل سے جو سویا ہوا ہے
 نو برس تک یہ ترے ہجر میں رویا ہوا ہے
 میں تجھے چھو کے ترا ورد کیا کرتا ہوں
 تجھ کو تسبیح کے دھاگے میں پرویا ہوا ہے
 رنجوں سے بھی کبھی اُس کی شناسائی تھی
 اب جو خوابوں کے مضافات میں کھویا ہوا ہے
 جانے کتنی ہی دلیلوں سے منایا تھا اُسے
 جب کہیں جا کے مرے حق میں وہ گویا ہوا ہے
 رنج کے پھول ہی کھتے ہیں مرے آگن میں
 ایسا لگتا ہے کہ دل خاک میں بویا ہوا ہے
 اُس کی یادوں سے حسن بامدھ کے بھاری پتھر
 درد کی گاسنی جھیلوں میں ڈبویا ہوا ہے

حسن عباس رضا

عشق، دُل کبھی اس دل سے نہیں نکلے گا
 یہ تری روز کی کل کل سے نہیں نکلے گا
 اب جو آبیٹھا ہے آسیبِ محبت مجھ میں
 کسی مرشد، کسی عامل سے نہیں نکلے گا
 جتنی آسانیاں ممکن تھیں، فراہم کی ہیں
 پھر بھی یہ دل کبھی مشکل سے نہیں نکلے گا
 میں سمرقند و بخارا بھی اگر دے دوں اسے
 ایسا کم بخت ہے اُس تل سے نہیں نکلے گا
 کل بڑے کرب سے کہنے لگا آئینہ مجھے
 کُو حسنِ غم کے مراحل سے نہیں نکلے گا

لیاقت علی عاصم

ان مچے سنان دنوں سے وہ دن اچھے تھے
 جھوٹے تھے وہ ملنے والے لیکن اچھے تھے
 سوچ رہا ہوں تجھ سے مٹنے اور پھٹنے تک
 کیا ساری راتیں تھیں پیاری سب دن اچھے تھے
 کیا آنکھیں کیا ہونٹ ہمارے کیا دل کیا بازو
 تجھ سے مل کر خوار ہوئے سب تجھ بن اچھے تھے
 بستی کی تو بات ہی کیا ہے جب ہم جائیں گے
 دیرانے بھی یاد کریں گے ساکن اچھے تھے
 حرف کن پر حرف نہ آئے تو اک بات کہوں
 ظاہر کے اظہار سے پہلے باطن اچھے تھے
 عاصم نامی دیوانہ تھا کہتا جاتا تھا
 دشت امکاں کے نخل ناممکن اچھے تھے

لیاقت علی عاصم

مڑا تر گے سہارے سے اٹھا سکتا ہوں
 میں سمندر کو کنارے سے اٹھا سکتا ہوں
 دیکھ سکتا ہوں ترے خواب ترے جانے پر
 فائدہ اپنے خسارے سے اٹھا سکتا ہوں
 یہ اداسی کی چمک روز کہاں ملتی ہے
 آنکھ میں کیسے ستارے سے اٹھا سکتا ہوں
 مری جانب تری نظریں نہیں اٹھتی ہیں تو کیا
 خود کو تو ایسے نظارے سے اٹھا سکتا ہوں
 ناتوانی نے سنبھالا ہے کچھ ایسے عاصم
 ہاتھ ہر ایک سہارے سے اٹھا سکتا ہوں

سعود عثمانی

اپنا سمجھیں نہ پرانا سمجھیں
دل کو دنیا کی طرح کا سمجھیں
دل کی اپنی ہی سمجھ ہوتی ہے
جو فقط ذہن ہیں، وہ کیا سمجھیں
اتنے ناداں بھی نہیں ہیں ہم لوگ
دھوپ ہو اور اسے سایا سمجھیں
اتنے سادہ بھی نہیں ہیں ہم لوگ
کسی دیوار کو رستا سمجھیں
اتنے تشنہ بھی نہیں ہیں ہم لوگ
غیر کے جام کو اپنا سمجھیں
ہم تو وہ لوگ ہیں، انداز شناس
بات کم ہو تو زیادہ سمجھیں
ہم تو وہ لوگ ہیں، اسے قریہ حرف
جو ہر اک رمز و کنایہ سمجھیں
بات کرتے ہوئے رک جاتا ہوں
آپ اس بات کو پورا سمجھیں
دل کو اک عمر سمجھتے رہے ہم
پھر بھی اک عمر میں کتنا سمجھیں

مقصود وفا

کار بے کار سے آگے کا قدم لیتا ہوں
جو بناتا ہوں اسے توڑ کے دم لیتا ہوں
خاک میں ملتا ہوا، دایہ فنا دیتا ہوا
بعض اوقات تو میں راہِ عدم لیتا ہوں
اس محبت کو بہت دیر سہا ہے میں نے
اب اسے دے کے کوئی دوسرا غم لیتا ہوں
بے قراری ہی کچھ ایسی ہے مری مٹی میں
جب بھی مرتا ہوں، کوئی اور جنم لیتا ہوں
تجھ کو کیا علم مری ترسی ہوئی خواہش کا
میں ہواؤں سے ترے ہونٹ کا نم لیتا ہوں
ایک دیوار سے لگی ہوئی تصویروں کو
ایسے تکتا ہوں کہ پھر سانس بھی کسم لیتا ہوں

قمر رضا شہزاد

اپنے ہاتھوں میں ہوں تختہ سنا اٹھایا ہوا میں
 وار کر دوں نہ کہیں طیش میں آیا ہوا میں
 یہ ترے کون و مکاں ہیں مری وسعت سے بھی کم
 اور ہوں آنکھ کی پتلی میں سمایا ہوا میں
 مل ہی جائے گا مجھے کوئی پرکھنے والا
 لعل ہوں اور کسی گدڑی میں چھپایا ہوا میں
 کب مجھے اور کوئی شکل و شباہت درکار
 اپنے جیسا تو لگوں پارا بنایا ہوا میں
 لے گئے لوگ مجھے جھولیوں بھر بھر کے یہاں
 اپنے حصے میں بھی آیا نہ بچایا ہوا میں
 رات دن دیکھتا رہتا ہے مجھے عرش نشیں
 اک تماشا ہوں سر فرش لگایا ہوا میں
 آگ کو روکنے والا نہیں کوئی شہزاد
 ہر طرف پھیلتا جاتا ہوں جلایا ہوا میں

قمر رضا شہزاد

نہ اپنے آپ کو اس طرح در بدر رکھتے
 پلٹ کے آتے اگر ہم بھی کوئی گھر رکھتے
 عجیب وحشت شب تھی کہ شام ڈھلتے ہی
 تمام لوگ منڈیروں پہ اپنے سر رکھتے
 جو اپنی فتح کے نقشے میں چورتے وہ بھلا
 سٹلجے شہر کے منظر پہ کیا نظر رکھتے
 یہ اور بات کہ سر ہزرتے بہت لیکن
 ہم ایسے بیڑ نہ بن پائے جو ٹر رکھتے
 جنہیں ہوا کی رفاقت عزیز تھی شہزاد
 وہ اپنے پاؤں بھلا کیا زمین پر رکھتے

نوشی گیلانی

عشق دربار سجاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں
 پھر سردار نکلاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں
 ایک لہجہ کسی بھیگی ہوئی خوشبو کی طرح
 صبح کے ساتھ جگاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں
 آخرِ شام کوئی عشق کا پاگل لمحہ
 جب ہمیں پاس نکلاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں
 دور تک پھیلی ہوئی برف کا شفاف بدن
 دل میں اک آگ لگاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں
 شب کی پازیب سے اُلجھا ہوا تنہا گھنگھرو
 وصل کے گیت سناتا ہے تو ہم ناچتے ہیں
 گرمی لمس کی شدت سے دکھتا آنچل
 ایک دیوار اٹھاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں

سعید خان

رنگِ وحشت سے نہ ادراک سے وابستہ ہے
 عاشقی اب ہی عشق سے وابستہ ہے
 یہ تو اندر کا کرشمہ ہے جو سو جانا ہے
 کب فقیری کسی پوشاک سے وابستہ ہے
 سانس رکتی ہے نہ زخموں کو شفا ملتی ہے
 دل بھی کس سینہ صد چاک سے وابستہ ہے
 ایسا جنگل ہے جہاں، صرف شکاری ہی نہیں
 ہر مسیحا کسی فتراک سے وابستہ ہے
 راس آیا ہے تونس تونس میں رواں ہے، جیسے
 زہرِ غم بھی کسی تریاق سے وابستہ ہے
 دکھ تو یہ ہے اے مری خلقتِ رنجیدہ تو
 خاک ہو کر بھی کہاں خاک سے وابستہ ہے
 کوئی زرخِ دیکھ لو مہر و مہ و انجم کا سعید
 روشنی اُس شہِ لولاک سے وابستہ ہے

جاوید احمد

رکھا گیا جو خاک میں جا اُس یقیں سے پوچھ
سورج سے کیوں جدا ہوئی یہ تو زمیں سے پوچھ
کیوں دُکھ بھری خلا میں کھلتی رہی ہے خاک
کس درد کا دُھواں ہے تن آتشیں سے پوچھ
وہ لفظ ہے کہ معنی ہے کہ معنی آشنا
اندراُتر کے روح میں رُوح الالمیں سے پوچھ
بُج میرے اور کچھ نہیں اسرار کائنات
نکتہ درانِ دہر و خدایان دیں سے پوچھ
ملا ہے جا کے خاک میں چدار ہو کہ بجز
جدے سے جب اُنھیں تو یہ اپنی جہیں سے پوچھ

حسن عباسی

جب کوئی شخص پریشان بہت ہوتا ہے
پیار ہو جانے کا امکان بہت ہوتا ہے
یہ ضروری تو نہیں ہاتھ پکڑ لو دُکھ میں
ہاتھ رکھنا بھی مری جان بہت ہوتا ہے
میرے دشمن کو محبت نہیں آتی درندہ
قتل کر دینا تو آسان بہت ہوتا ہے
چھوٹ جاتی ہے مری گاڑی مدد کرنے میں
دوسرے لوگوں کا سامان بہت ہوتا ہے
ایک ہی لہر گزر جاتی ہے سب آنکھوں سے
سُر کے دریاؤں میں طوفان بہت ہوتا ہے
اس لیے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈرتا ہوں حسن
دوست بن جانے میں نقصان بہت ہوتا ہے

رحمان حفیظ

سب کا پیرایہ اظہار بدل جاتا ہے
منہ میں لقمہ ہو تو پندار بدل جاتا ہے
گام دو گام پہ ہوتی ہے جب اپنی نصرت
تو ہمارا سپہ سالار بدل جاتا ہے
جب کبھی ہم کسی معیار پہ پورے اتریں
ایسا ہوتا ہے وہ معیار بدل جاتا ہے
اتنے یکساں ہیں مری قوم کے سب معمولات
صرف تاریخ سے اخبار بدل جاتا ہے
میں سمجھتا ہوں شغلیاب ہوا ہوں لیکن
چارہ گر بس مرا آزار بدل جاتا ہے

فاضل جمیلی

ملنے کا بھی آخر کوئی امکان بناتے
مشکل تھی اگر کوئی تو آسان بناتے
رکتے کہیں کھڑکی، کہیں گلدان بناتے
دیوار جہاں ہے وہاں دالان بناتے
تھوڑی ہے بہت ایک مسافت کو یہ دنیا
کچھ اور سفر کا سرد سامان بناتے
کرتے کہیں احساس کے پھولوں کی نمائش
خوابوں سے نکلتے کوئی وجدان بناتے
تصویر بناتے جو ہم اُس شوخ ادا کی
لازم تھا کہ مکان ہی مکان بناتے
اُس جسم کو کچھ اور سمیٹا ہوا رکھتے
زلفوں کو ڈرا اور پریشان بناتے
کچھ دن کے لیے کام سے فرصت ہمیں ملتی
کچھ دن کے لیے خود کو بھی مہمان بناتے
دو جسم کبھی ایک بدن ہو نہیں سکتے
ملتی جو کوئی رُوح تو یک جان بناتے

نزدہت عباسی

لفظ چنتے ہوئے ترتیب نئی لگتی ہے
دل دکھانے کی یہ ترکیب نئی لگتی ہے
میری تحسین سے کیا آپ نے دانستہ گریز
کیوں قصیدے میں یہ تشبیہ نئی لگتی ہے
کچھ نئے خواب نئی خواہشیں دامن میں لیے
ہر نئے سال کی ترقیب نئی لگتی ہے
اب حقیقت کی طرح اس کو بھی تسلیم کریں
زندگی کی کوئی تادیب نئی لگتی ہے
ان کے لمحے پہ سیاست کا اثر ہے گویا
ان کی ہر بات میں تکذیب نئی لگتی ہے
آج آئے ہیں بھد شوق جنازے پہ سبھی
آج گھر میں مرے تقریب نئی لگتی ہے
وقت کے ساتھ بدل ڈالے ہیں آدابِ وفا
آپ کے عشق کی تہذیب نئی لگتی ہے
ہر تغیر نہیں تعمیر کا مظہرِ نزہت
مجھے اغیار کی تخریب نئی لگتی ہے

شہناز منزل

زندگی تیرے سواوات سے ڈر لگتا ہے
چشمِ پرُغم تری برسات سے ڈر لگتا ہے
مسئلے سے کسے نکل آتا ہے دن کا سورج
لوگ کہتے ہیں انہیں بات سے ڈر لگتا ہے
رات جگے کات کے کچھ خواب بئے ہیں میں نے
اُدھ کھلی آنکھوں کو خیرات سے ڈر لگتا ہے
جس کو خود سے بھی چھپایا یہ بتاتا نہ پھرے
جانے کیوں اس دلِ بیتاب سے ڈر لگتا ہے
اس نے پہلے بھی خطا اپنی کہاں مانی ہے
پھر مگر جائے گا اس بات سے ڈر لگتا ہے
گہرا سناٹا ہو تاریکی ہو تنہائی ہو
زخم بننے ہوئے لحات سے ڈر لگتا ہے
سب نے اجداد کو معبود بنا رکھا ہے
ہم کو ورثے میں ملی ذات سے ڈر لگتا ہے
وقت پڑنے پر کوئی ساتھ کہاں دیتا ہے
ہو کے سادات بھی سادات سے ڈر لگتا ہے
اپنے اندر کی ہی دُئی میں بسا کرتے ہیں
کیا کریں گردشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

شکیل جاذب

سب خواب ہیں اشکوں کی روانی کے حوالے
 لو، ہم نے کیا پیاس کو پانی کے حوالے
 تو زود قراموش نہیں پر یہ بتا دے
 کیا عشق بھی ہے یاد وہابی کے حوالے
 اسے عمر رواں! اب تری رفتار کا ڈر کیا
 میں خود کو ریا اس کی جوانی کے حوالے
 ہر شب میں وہی ایک ملاقات بسی ہے
 جو کی تھی کبھی رات کی رانی کے حوالے
 پیغام سنایا ہے یہی صبح سفر نے
 اسباب کرو نقل مکانی کے حوالے
 اب تک تو کہانی کو چلاتے رہے کردار
 کردار مگر اب ہیں کہانی کے حوالے
 اشعار میں ڈھتی گئی کیفیت ہستی
 لفظوں کو کیا جب سے معانی کے حوالے
 جاذب میں پچاتا یہ نشانے سے کہاں تک
 اک جان تھی سو کی ہے نشانی کے حوالے

خالد ملک ساحل

کھڑکیاں کھول دو احساسِ نریاں اُڑنے دو
 خاک اُڑتی ہے تو پھر سارا جہاں اُڑنے دو
 بادباں اُڑنے دو یہ آب رواں اُڑنے دو
 جب نہیں ہوں تو زمانے کا نشان اُڑنے دو
 میرے بستر میں شبِ ہجر نے اب سونا ہے
 خند اُڑتی ہے یہاں اور وہاں اُڑنے دو
 حشر کے ڈر سے نہیں ڈر کے سینے والے
 جب نہیں یار تو پھر کون و مکاں اُڑنے دو
 ایک لمحے سے زیادہ کا تمنا ہی نہیں
 ان ستاروں کی لکیروں سے دھواں اُڑنے دو
 لوگ واقف نہیں موسم کی ادا سے ساحل
 رنگ مرجائیں گے شاخوں سے خزاں اُڑنے دو

سلمان باسط

تخیر کا سمندر ہر طرف ہے
 نہیں کھلتا چو منظر ہر طرف ہے
 سبھی اس سمت چلتے جا رہے ہیں
 اگرچہ موت کا ڈر ہر طرف ہے
 مفر ممکن نہیں اک پل بھی اس سے
 جدھر جاؤں تنگ ہر طرف ہے
 میں اک چا مستفل رہتا نہیں ہوں
 مری منزل، مرا گھر ہر طرف ہے
 رہو اک گنبد بے در میں باسط
 مگر ایسے لگے در ہر طرف ہے

جاوید صبا

کیا خاک سمیٹیں کہ سمیٹتے ہیں کہیں ہم
 آندھی میں کسی یاد کی کھڑے ہیں کہیں ہم
 گزرو جو ادھر سے تو ہمیں بھول نہ جانا
 پڑتے ہیں میاں آپ کے رستے میں کہیں ہم
 ہیں آپ کسی سوچ میں سرگرداں و رقصاں
 گم اپنے ہی احوال میں بیٹھے ہیں کہیں ہم
 اک شہر ہے دل نام کا، اس شہر کے اندر
 بس اپنے ہی اطراف میں رہتے ہیں کہیں ہم
 آواز لگاتے ہیں صدا گزرے زمانے
 دیتے ہیں صدا ایسے کہ جیسے ہیں کہیں ہم
 رک رک کے سنائی پڑی اپنی ہی کہانی
 کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ بھولے ہیں کہیں ہم

ڈاکٹر جاوید منظر

نصرت صدیقی

ہم نے سوچا ہے کہ لحوں کی نوا لے جائیں
تیری معصوم نگاہوں کی ادا لے جائیں
آہ کہ لے جائیں تری آنکھ کا کاجل اب کے
ہم، وہ گم گشتہ خزانے کا پتہ لے جائیں
کوئی آواز سنوں، کوئی تصور ابھرے
ایک خواہش کہ وہی دستِ حنا لے جائیں
جو تجھے دیکھ نہ پائیں ہیں، سو وہ بھی تجھ سے
ایک بے نام کی چاہت کا مزا لے جائیں
ہم سے جو لوگ سنورنے کا سبب پوچھتے ہیں
یوں کریں، آئیں، ترا نام و پتہ لے جائیں
بھول جاؤں گا میں پھر راہِ نوردی منظر
وہ جو اک بار مجھے آبلہ پا لے جائیں

ادب کی کوئی بھی پوری نہ کی کہی میں نے
تو پھر فضول ہی کی ہے سخنوری میں نے
وہیں تلک مجھے انسانیت نظر آئی
مٹھائے رکھی جہاں تک درندگی میں نے
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آتی
بہت دنوں سے غزل بھی نہیں کہی میں نے
کہیں فرشتہ کہیں بھیڑیا کہیں یزداں
ہزار شکل میں دیکھا ہے آدمی میں نے
جلا جلا کے دیے آنسوؤں کے پلکوں پر
اتار دی شبِ ظلمت میں روشنی میں نے
مجھے عزیز بہت ہے یہ دیدہ بیبا
اس لیے تجھے دیکھا نہیں کبھی میں نے
کبھی خلا میں کبھی دشت میں کبھی گھر میں
کئی طرح سے گزاری ہے زندگی میں نے
نملاؤں گا نہ ملوں گا نہ تجھ کو چاہوں گا
کبھی ارادوں میں بھری ہے چٹنگی میں نے
کبھی خیال کبھی خواب کے دیسے سے
کسی سے ملنے کی صورت نکال لی میں نے
مگل شگفتہ کا انجام دیکھ کر نصرت
لیوں پہ آئی ہوئی روک لی ہنسی میں نے

فہم شناس کاظمی

بدل گیا ہے بہت دیرے عشق کا انداز
لہو میں جاری ہے رقصِ قلندرانہ وہی
اگرچہ چھین لیا ہے جہان نے سب کچھ
ہے پھر بھی لہجہ و کردار باغیانہ وہی
شناس جس کے لیے چھوڑ آئے ہم دنیا
ہزار لوگ ملے ایک بس ملا نہ وہی
(۲)

کر بلا بھی فرات ہم نے کی
دیکھیے کیا حیات ہم نے کی
کیسی یہ کائنات ہم کو ملی
کیسی یہ کائنات ہم نے کی
گفتگو اس سے اور گرتی تھی
اس سے کچھ اور بات ہم نے کی
وصل کی ایک شب تھی ایک ہی شب
بس اسی میں حیات ہم نے کی
اور بھی کچھ بکھر گئے ہیں شناس
جب سمیٹنے کی بات ہم نے کی

ہر ایک سمت ہے ٹو اور نگار خانہ وہی
جنوں وہی تری یادوں کا کارخانہ وہی
وہی ہماری ہے شوریدگی و بے تابی
سلوک ہم سے تمھارا مسافرانہ وہی
سوائے عشق ہمارا شریک کوئی نہیں
بس ایک تعلق بے نام و غائبانہ وہی
بس ایک پل تری قربت کا زندگی جیسا
پھر اس کے بعد وہی میں ہوں اور زمانہ وہی
پھر اس کے بعد ترا وصل بھی خیال و خواب
پھر اس کے بعد ہر ایک رات بیکرانہ وہی
ہزار بدلا زمانہ ہزار بدلا جہاں
مگر نصیب ہے اپنا پیہرانہ وہی
وہی ہے جبر زمانہ وہی خدا کے لوگ
وہی ہے آگ، سلکتا ہوا گھرانہ وہی
ہر اختیار پہ بے اختیار قابض ہیں
ہر اقتدار پہ قبضہ ہے غاصبانہ وہی
وہی ہے طوق وہی قافلہ وہی دربار
وہی ہے رستہ ہمارا ہے تازیانہ وہی

نازبٹ

کچھ اس ادا سے ہمیں غم گسار ملتے ہیں
ہزار زخم پس اعتبار ملتے ہیں
یہ شہر زخم فروشاں ہے ہائے کیا کیجئے
کہ پائے گل بھی یہاں خار خار ملتے ہیں
وہ جن کی کوکھ میں شوق خرد پہنتا ہے
وہ ولولے بھی جنوں کا شکار ملتے ہیں
شب فراق کی وحشت نہ پوچھئے ہم سے
ہم اپنے بھر سے دیوانہ وار ملتے ہیں
ہمیں انہیں سے توقع ہے ناز منزل کی
جو راستے ہمیں بن کر عمار ملتے ہیں

آ سنا تھ کنول

پہلے اپنی چاہتوں سے دل کا دامن بھر گیا
دفعاً کچھ یاد آیا مجھ کو خالی کر گیا
دھول میں پاؤں آٹے اور ہاتھ مٹی ہو گئے
راستہ تو جن لیا پھر راستے سے ڈر گیا
اپنے ہوئے کے خیر سے کبھی نکلا نہیں
کتنا زندہ شخص تھا اک آئو میں مر گیا
کیا گیا نیلا سمندر ساتھ اپنے لے گیا
پتلیوں میں ریت پھیلی ہاتھ سے گوہر گیا
چھوٹے چھوٹے ٹوک تو خود کو ٹھکا کر بیچ گئے
جس پہ رکھی تھی بڑی، دستار وہ ہی سر گیا
میں نے اب کے دل بنایا آئینہ خانہ کنول
ایک پتھر پھر ہرے سینے پہ کوئی دھر گیا

ممتاز احمد شیخ

ہرچند سمندر مری آنکھوں میں چھپا ہے
 صحرا کا بھی منظر میری آنکھوں میں چھپا ہے
 میں ڈھونڈتا رہتا ہوں جسے ارض و سما میں
 وہ شخص سراسر میری آنکھوں میں چھپا ہے
 شب گھومتا رہتا ہوں ستاروں کے نگر میں
 اک خواب منور میری آنکھوں میں چھپا ہے
 اک صبح میرے خواب سے آتی ہے نکل کر
 اک شام کا منظر میری آنکھوں میں چھپا ہے
 اک جشن تجارت ہے بپا شہر میں ہر نو
 اک اشک گداگر مری آنکھوں میں چھپا ہے
 اک ابر برستا ہے میرے دل کی زمیں پر
 اک نیل گوانبر میری آنکھوں میں چھپا ہے
 اک عکس بناتا ہے کئی آئینے ممتاز
 اک نور سا پیکر میری آنکھوں میں چھپا ہے

ممتاز احمد شیخ

کیا خبر کون، کہاں، کیا ہوتا
 ہم نہ ہوتے تو جہاں کیا ہوتا
 جن مکانوں میں مکین کوئی نہیں
 ان مکانوں میں مکاں کیا ہوتا
 روشنی کا یہ شجر چھوٹا سا
 سایہ شب میں جواں کیا ہوتا
 وہ یقین ہے اگر اتنا مبہم
 سوچتا ہوں کہ گماں کیا ہوتا
 کہہ بھی دیتے فقط لفظوں میں
 دکھ زہانوں کا بیاں کیا ہوتا
 جو کمایا تھا دی صرف کیا
 زیست میں سود و زیاں کیا ہوتا
 دل کسی بھر میں جلتا نہ اگر
 آگ کیا ہوتی دھواں کیا ہوتا
 وہ نہ ملتا تو بتا اے ممتاز
 حاصلِ عمر رواں کیا ہوتا

اب دو عالم سے صدائے ساز آتی ہے مجھے

(ڈرامہ، موسیقی)

اوس گلی نہ جاویں

(ڈرامہ)

تحریر و ہدایات: سرمد صہبائی

سیٹ خالی سیج، صرف پچھلی طرف ایک دیوار ہے جس میں کہیں کہیں سوراخ ہیں۔

کردار: ایک ستر ساندہ بوڑھا۔ نیم پگل۔

آوازیں: لڑکی کی آواز۔ بہت سے لوگوں کی آوازیں۔ پرندوں کی آوازیں۔ بچے کی آواز۔

نوٹ: یہ مونیو، گ سب سے پہلے انگلستان میں ہونے والی ایک ورکشاپ میں انگلش زبان میں (Don't go down that street) کے نام سے پیش کیا گیا۔ پھر پاکستان میں یہ اسلام آباد ہنر کدہ میں اسی نام سے دوبارہ پیش کیا گیا۔ اس میں سمان شاہد نے مرکزی کردار ادا کیا اور کلیئر جینٹ نے اس کو ڈائریکٹ کیا۔ بعد میں یہ کراچی، ر ہور، اسلام آباد اور فیصل آباد میں اردو زبان میں سیج کیا گیا جس میں اداکار شکیل نے مرکزی رول ادا کیا اور اسے سرمد صہبائی نے ڈائریکٹ کیا۔

فیضان

(سے پرندوں کی آوازیں)

بوڑھا O/S

آ آ آ (خیالی پرندوں کو بلانے کی آواز)

(بوڑھا ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ہانڈی ہے سیج پر داخل ہوتا ہے۔ وہ اس ہانڈی سے پرندوں کو دانہ

ڈال رہا ہے اور ساتھ ساتھ ان سے باتیں بھی کرتا ہے)

بوڑھا: آ آ (پر دیکھتا ہے) وہ کیوں چڑھا ہے، ہوا ایسے چل رہی ہے کہ میرا دل بھی اڑنے کو چاہ

رہا ہے۔ واہ (خیالی پرندے سے) ادے بس کر۔ یہ کیا خالی ہاتھ کو چونچیں مار رہا ہے۔ (ہانڈی سے

دانہ نکالتا ہے) یہ لے، کھا آ آ لگتا ہے پہاڑوں پر برک چھل رہی ہے۔ یہ ہوا شمال سے

آ رہی ہے۔ عجیب خوشبو ہے اس کی ہلکی سی خنکی میں، مگرمی کی ٹکڑ، ملی جلی۔ واہ اس کی تولدت ہی اور ہے۔

سلس لو تو سمجھو پور آسمان سینے میں اتر گیا۔ (ایک پرندے کو آسمان سے تر تے ہوئے دیکھتا ہے)

آ چیتو آ جا آ جا۔ ادے لگتا ہے تو تو ہمالیہ کی چوٹی چھو کر آ رہا ہے۔ پر تیرے منہ ہو رہے ہیں۔

تو جا آسمان پہ تھلگی لگا لیکن بچو آنا تو نے میرے پاس ہی ہے۔ کھاے۔ کھا لے۔ شیو مہاراج نے ہمالیہ کی

چوٹی پر ہزار ساں، ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر چدہ کاٹا تھا اور تو اسے مل جھپک میں چھو آیا ہے۔

آ آ (ایک اور پرندے سے) وہ رانجھو میں۔ رات نیند آگئی تھی تجھے؟ اچھا خواب دیکھ رہا تھا، اوئے کب تک خواب دیکھے گا۔ خواب بندے کو بھوتوں کی طرح چٹ جاتے ہیں۔ بہت تنگ کرتے ہیں ہمارا رب بھی لگتا ہے خواب ہی دیکھ رہا ہے۔ اس پوری دنیا کا خواب۔ جاگ گیا تو کیا حشر ہوگا ہمارے۔ (ہنستا ہے) واہ یہ پچھتم کی ہوا بھی کیا چیز ہے۔ کیسے اڑاتی ہے تم کو۔ بالکل جیسے بندے کو جوانی اڑاتی ہے۔ اندھ دھند، آپ ہی آپ کی لاڈ سے اپنی گود میں جھلٹی ہوئی مست کرتی ہوئی۔ بندہ پیسے چڑھی ہوئی چنگ کی طرح بے سہارا ڈولتا رہتا ہے۔

(یکدم کسی اور پرندے سے) اوئے تو کیوں چپ بیٹھا ہے، ویسے تو روز شرارتیں کرتا پھرتا ہے۔ کوڈو گردن تو پروں میں، ایسے کھینچی ہوئی ہے جیسے سرے سے ہے ہی نہیں۔ اوئے کچی تو نکال اپنی باہر۔ لگتا ہے کوئی فلاسفر بیٹھا ہوا ہے۔ پھر وہی مسئلہ فیث غورث، وہی مای خویا۔ پروفیسر نہ ہو کہیں کا۔ حال دیکھا ہے پروفیسروں کا تو نے آج کل پکوزوں کی دکان لگاتے پھر رہے ہیں۔ ہوش کر، کچھ مت لے۔ یہ جو کیزا تیری کن پنی کے اندر ریگ رہا ہے نا۔ اسے فلٹ کر دے، تھوک دے یہ بیماری سوچنے کی۔ جتنا سوچے گا تا ہی غم کرے گا۔ سوچ سوچ بھیجے میں پڑی سوچ آ آ (دوسرے پرندوں سے) اوئے تم دونوں آپس میں کیوں لڑ رہے ہو، بند کرو۔ جھگڑا۔ ذرا سی بات پر یہاں مہا بھارت کھڑی ہو جاتی ہے کسی کو چین ہی نہیں، جسے دیکھو دندنا تا پھرتا ہے کبھی پانی پہ جنگ، کبھی تیل پہ جنگ، کبھی مذہب پہ جنگ، جنگ جنگ۔ پھر بھوک اور تنگ۔ لگتا ہے اللہ کی مخلوق ہر وقت خود کشی کے موڈ میں رہتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں قصے ہیں۔ کبھی زر کبھی ر میں، کبھی دوت کبھی طاقت۔ ادب کی کس سے انتقام لے رہے ہو تم؟ اب بندہ کدھر جائے، کبھی کبھی دونوں سے بھردی ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے ان کا کام ہی یہ ہے۔ من ہمارے نصیب میں نہیں۔ ادب کرویہ مار دھاڑ۔ بہت کچھ ہے کھانے کو۔ چلو دونوں مل کر کھاؤ۔ سب کھا رہے ہیں تم بھی کھاؤ آ آ (اپنے آپ سے) مجھے سب کہانی پتہ ہے۔ انگریز کا زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی۔ انگریز کے لیے ہندوستان سے دس لاکھ فوجیوں کی بھرتی ہوئی تھی۔ جنگ میں اس کا شوہر مارا گیا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ سکتے میں چلی گئی تھی۔ اس کی لاش تک نہیں ملی ہے چاری کو لیکن سونے کا میڈل مل گیا۔ اب وہ ہر روز میڈل کو بانڈھ کر سوتی تھی۔ بندہ کدھر جائے ہزار کہانیاں ہیں۔ آ آ (بیٹھ جاتا ہے) چلو چلو، بہت کچھ کھا پی سہا ہے تم نے۔ آرم سے بیٹھ جاؤ۔ چپ چاپ۔ اب میں تمہیں کہانی سناتا ہوں۔ کہانی ہے ایک ایسے پرندے کی جس نے نیا نیا اڑنا سیکھا تھا، اس کی خوشی تھی کہ وہ ساتویں آسمان تک پرواز کرے لیکن... وہ ابھی بچہ تھا۔

(یکدم خاموش ہو جاتا ہے، پرندوں کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے پرندوں کو سنتا ہے۔ پھر گھبرا کر دوبارہ اونچی آواز میں گنتا ہے)

چیتو کیسری رانجھو کوڈو مہرہ موہنی (یکدم رک جاتا ہے) نکو نکو کدھر ہے۔ (گھبرا جاتا ہے) مجھے نکو نظر نہیں آ رہا۔ (پرندوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا نکو کوڈو ہونڈتا ہے) نکو کہا ہے۔ ابھی تک پہنچ کیوں نہیں۔ تم سب کو پتہ ہے کہ نکو تم سب سے چھوٹا ہے اور مجھے تم سب سے زیادہ پتا

ہے۔ تم نے دیکھا ہے اسے..... تم نے..... تم نے؟

(مختلف پرندوں سے پوچھتا ہے) میں نے تم سب کو مر رہا سمجھا ہے کہ، سے اکیلا مت چھوڑا کرو۔ وہ ابھی کسن ہے، معصوم ہے مگر تم لوگ سنتے ہی نہیں۔ تم لوگوں کو اپنے آپ سے ہی فرصت نہیں۔ کسی اور کا کوئی خیال ہی نہیں تم کو۔

(اپنے آپ سے) میں نے تو اسے بڑے نازخروں سے پالا ہے، لڈلا ہے میرا۔ مجھے پتہ ہے وہ راتے میں کہیں ٹھہر جاتا ہے کوئی پیر سے بلائے تو اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ ہے بہادر، لیکن جونی اسے بھنکاتی رہتی ہے۔ پتہ نہیں وہ رستہ نہ بھول گیا ہو۔ اسے تو سارے رستے بھی یاد نہیں۔ (پرندوں سے) تمہیں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہیے، اسے کبھی اکیسے نہیں چھوڑنا، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

(اونچی آواز میں) بکو..... بکو..... بکو

(خاموشی پھر دیوار کے پیچھے سے کسی بچے کے ہنسنے کی آواز سنی ہے) بکو؟

(دیوار کے پاس جاتا ہے) تو تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔ دی پرانی شررتیں تمہاری۔

(خاموشی) آ جاؤ پیچھے۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میرا وعدہ۔ شاہشاہ جاؤ۔

مت تنگ کر مجھے۔ میں نے ہاناں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ چلو آؤ کچھ کھاؤ۔ (خاموشی)

او، چھوڑ دے یہ عادتیں چھپنے چھپانے کی مجھے پتہ ہے تو کبھی پہاڑوں کے پیچھے کبھی بادلوں کے پیچھے کبھی گلیوں گھلوں کے اندر چھپتا چھپتا پھرتا ہے۔ چل مت منتظر کر اچھا بڑھے کو۔ دیکھ تجھے بھوک لگی ہوگی۔ آ جا کچھ کھالے۔

(پرندوں سے) دوئے چیتو موتی رانجھو جگہ بناؤ میرے نلو کے لئے بنو بنو

(خاموشی۔ دیوار پر کان لگاتا ہے۔ دل کے دھڑکنے کی آواز اور پھر یکدم بہت سی گھڑیوں کے الارم۔ بوڑھا گھبرا کر چلا جاتا ہے) اوہ وقت ہو گیا۔ لگتا ہے وقت ہو گیا ہے۔ نائم چیک کرو۔ نائم۔ تم نے نائم چیک کیا ہے۔ جلدی کرو نائم چیک۔ او میرے خدایا۔ کیا نائم ہوا ہے۔ چیک کرو۔ نو کیو نائم۔ نیو یارک نائم۔ اسکو نائم۔ لندن نائم۔ ساری گھڑیاں چیک کرو۔ جلدی کرو وہ کسی وقت بھی آ سکتے ہیں بکو بکو؟ نلو

(جانے لگتا ہے کہ بچے کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ رک جاتا ہے۔ خوش ہو کر دیوار کی طرف آتا ہے)

نکو؟ دیکھو مجھے سب پتہ ہے تم یہیں چھپے ہو۔ مجھے تمہاری آواز آرہی ہے۔ میں سن رہا ہوں۔ مجھے تو تم نے خود بخود ڈر دیا۔ چلو اب اس کرو اپنی ضد۔ باہر آ جاؤ۔ ہمارے ساتھ بیٹھو۔ ہم سے باتیں کرو۔ ہمیں بتاؤ آج تم کہاں کہاں گئے۔ کس سے ملے۔ کدھر گھومے۔ کیا کیا شراقتیں کیں۔ کیا کھا پیا۔

(دور ہوتے ہوئے قدموں کی آواز) تم جا رہے ہو۔ ہم کو چھوڑ کر (یکدم پرندوں سے) او میں نے تمہیں کہا تھا جگہ بناؤ نلو کیلئے۔ بنو بنو (دور سے ہنسنے کی آواز) تم مجھ پر ہنس رہے ہو۔ یہ نہ کرنا میرے بچے یہ نہ کرنا۔ مجھے چھوڑ کے نہیں جاتا تم ہی تو ہو جس کے لیے میں ابھی تک زندہ ہوں۔ مجھے پتہ ہے تم ایسے نہیں، نو گے۔ ضدی ہونا۔ چلو میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ (آنکھیں بند کرتا ہے) نہیں نہیں میں بالکل سی طرح آنکھیں بند رکھوں گا۔ (وقفہ) کیا؟ تمہیں یقین نہیں رہا۔ اچھا یہ لو میں اپنی

آنکھوں پر کپڑا باندھ لیتا ہوں۔ (اپنے کندھے سے چادر نکھوں پر باندھ لیتا ہے) لوجی ب میں بالکل ریڈی ہوں۔ مجھے پتہ ہے تمہیں لکھن چھپی پسند ہے۔

لک چھپ جانا۔ لک کا دانہ..... راجے کا بیٹا..... آتا ہے..... آتا ہے۔

(گاتے ہوئے ادھر ادھر گھومتا ہے جیسے نکو کو تلاش کر رہا ہو۔ یکدم قدموں کی آواز تیز

ہو جاتی ہے۔ دو جوتے دیوار کی منڈیر پر آتے ہیں۔ جوتوں کو چھوتے ہوئے)

او۔ تو تم دیوار پر چڑھ گئے ہو۔

(جوتے ہوا میں اڑ کر واپس سٹیج کے فرش پر ادھر ادھر گھومتے ہیں۔ بوڑھا ان کی آواز کے پیچھے

بھاگتا ہے۔ بوٹ اس کے قریب آ کر پھر دور ہو جاتے ہیں۔ یکدم بوٹ رک جاتے ہیں۔ بوڑھا

انہیں چھوٹا ہے اور اوپر جسم کو تلاش کرتا ہے)

نکو۔ یہ تمہارے جوتے ہیں انہیں تو یہ تمہارے جوتے نہیں۔ تم کہاں ہو؟

میں تمہیں چھو کیوں نہیں سکتا؟

(یکدم کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ انٹرنیشنل ایئر پورٹ کی آوازیں ایچی گریشن

کے کاؤنٹر پر ملی جلی آوازیں۔ فڈنٹ اناؤنسمنٹ۔ تلاشی اور سیکیورٹی سے گزرنے کے الارم۔ سٹیج

سے بوٹ غائب ہو جاتے ہیں۔ بوڑھا گھبرا کر آنکھوں سے کپڑا اٹھاتا ہے۔ آوازیں بہت تیز ہو

جاتی ہیں)

ادھر میرے خدا یا، نکو تو دوسری طرف تو نہیں چلا گیا۔ تجھے انہوں نے ضرور روک دیا ہوگا۔ ورنہ کیا ضرورت

بوڑھا:

ہے تجھے وطن چھوڑنے کی، مجھے پتہ ہے بہت سے پرندے ہجرت کر جاتے ہیں جب ان کا دانہ پانی ختم ہو

جاتا ہے لیکن تجھے تو کھانے کو بہت ہے۔ واپس آ جا۔ لگتا ہے انہوں نے تمہیں روک لیا ہے۔ انہوں

نے ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں۔

تم دھیان سے چننا وہ کسی وقت بھی کہیں سے بھی آ سکتے ہیں۔ ان کی آنکھیں سرچ لاسٹ کی طرح گھوم

جاتی ہیں۔ وہ ہر قدم پر تلاشی لیتے ہیں پوچھ چکھ کرتے ہیں اور پھر دن رات ٹی وی ریڈیو چلتے ہیں۔ ہر دو

منٹ کے بعد فوری خبر۔

Breaking News. Breaking News لیکن انہوں نے تمہاری کوئی خبر ہی نہیں دی۔

(فڈنٹ اناؤنسمنٹ) یہ اتنی فائنل کہ ہر جا رہی ہیں۔ سیدھے کھڑے ہو جائیں۔ دتی سامان ایک طرف

رکھ دیں۔ جوتے اتار دیں۔ چابیاں، کسی قسم کے سکے، کسی قسم کی دھاتی چیز آپ کے بدن پر نہیں ہونی

چاہیے۔ سیدھے کھڑے رہیں۔ اف۔ اتنے جہاز، اڑتے چھ جاتے ہیں۔ پائلٹ کے ساتھ اور پائلٹ

کے بغیر۔ گھبرانا نہیں میرے بچے، بس ڈنارہ۔ یاد رہے نابودگی کا درخت۔ وہی جس کے نیچے نانی اماں

تمہیں کہانیاں سناتی تھیں۔ اگر تھک جاؤ تو اس کے نیچے پناہ لے لینا۔ واہ وہ زمانہ ہی اور تھا، کھرا اور سچا

زمانہ، خاندانی لوگ تھے، ایک دوسرے کا لحاظ کرتے تھے، دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ نکو اگر راستہ

بھوں جائے تو پیچھے کی طرف مڑ جانا اور پھر واپس لوٹ کر پنی راہ دوبارہ تلاش کرنا۔ پرانے رستوں پر جاؤ،

اپنے آباء اجداد کے راستوں پر اور وہاں درختوں کی آڑ لے کر چلتے رہو۔ ہاں ہاں درختوں کے پاس پاس۔ (یکدم) میں کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ لگتا ہے میں خود رستہ بھول گیا ہوں۔ پتہ نہیں لگو کو تلاش کرتے ہوئے کدھر نکل گیا ہوں۔ (اوپنی آواز میں) کوئی ہے جو مجھے تنہا ہی بتا دے کہ میں کہاں ہوں۔ کس جگہ ہوں۔ کوئی ہے۔ (دیوار کے پار آدرو دیتا ہے) کوئی ہے؟

آواز

(آف سٹیج) آپ اس وقت مرکز سے دس ہزار قدم دور ہیں۔ مرکز تک پہنچنے کے لیے فلیش اور بینک کا طریقہ استعمال کریں۔ اپنے دائیں بائیں سات چکر گائیں اور پانچ سیکنڈ تک گولہ پھینکنے کا انتظار کریں۔ ایک سٹاپ وائچ ہاتھ میں رکھیں اور اسٹاپ وائچ نہ ملے تو اپنی نبض کی رفتار پر گنتی کرتے جائیں۔ پھر گنتی کو گنتی سے ضرب دیتے جائیں اور چلتے جائیں۔ کسی چوراہے پر مت کھڑے ہوں بلکہ چوراہے پر کھڑے ہو کر منہ سورج کی طرف کر لیں، اگر آپ رات کو سفر کر رہے ہوں تو آپ کا منہ قطبی ستارے کی طرف ہونا چاہیے۔ اگر آپ گم ہو جائیں تو دس قدم اگلے چل کر دوبارہ چن شروع کریں۔

(نقشہ اٹھاتا ہے۔ نقشے کے درمیان ایک بڑا سوراخ ہے۔ بوڑھا اس میں سے جھانکتا ہے)

(تیر قدموں کی آواز)

بوڑھا

(دیوار کی طرف) کون ہے؟ مجھے بتاؤ۔ سب کچھ بتاؤ میں سب کچھ جانتا چاہتا ہوں۔ آخر کیا ہوا۔ وہ دن کا وقت تھا یا رات کا، وقت کا کونسا پہر تھا۔ لوگ کہتے ہیں کوئی ایسویٹنس نہیں تھی جو اسے ہسپتال لے جاتی۔ کیا وہ کرفیو کا دن تھا؟ ساری سڑکیں بند، دکانیں بند، شہر سنسن گھر میں بھی کچھ نہیں۔ مجھے پتہ ہے اسے جاننے کی بیماری تھی وہ اپنی آنکھیں نہیں جھپک سکتی تھی، سوئی نہیں تھی، اسے خوابوں سے ڈر لگتا تھا، ہر وقت سکتے میں رہتی تھی، آنکھیں پٹی ہوئی۔ حیران، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کا کیا مرض ہے اور اس کی دوا کیا ہے۔ لیکن یہ سب اسی دن ہوا۔ ہاں اسی دن تو ہوا تھا۔ شہر کو بندوز کر دیا گیا تھا۔ آسمان پر چیلیں اور کوئے منڈلا رہے تھے۔ کوئی دوا کام نہ آئی۔ جو کھلا ڈوہ اسے امٹ دیتی اور دور دور تک کوئی ایسویٹنس نہیں تھی۔ سب لوگ مردوں کو دفنارے تھے۔ کسی پرندے کا نام دنشان نہیں تھا۔ کچھ ہجرت کر گئے تھے، جو پاتی بچے تھے انہیں شکاریوں نے مار دیا تھا اور جو تھوڑے بچ گئے تھے انہیں پنجرہوں میں بند کر کے مارکیٹ میں بیچ دیا گیا تھا۔ (دیوار پر کے مارتا ہے)

بوڑھا

تم وہاں گئے تھے یا نہیں سچ سچ بتاؤ۔ چیتو اس کو بتا دو یہ مجھے زیادہ تنگ نہ کرے۔ میرے پیسے ہی ہوش و حواس ختم ہو رہے ہیں۔ میں نے شاید سب کچھ غلط کر دیا۔ خواجواہ اسے ڈانٹا ڈنڈا۔ یہ بچے ایک قدم میں ساری زمین تاپنا چاہتے ہیں۔ ایک ہی اڑان میں آسمان تک پہنچنا چاہتے ہیں لیکس میں نے تو اس کا بہت خیال رکھا، بڑے پیار سے لڈتے اسے پالا پوسا تھا۔ دس رات محنت کر کے خوں پسینہ کر کے۔ مجھ سے کیا غلطی ہو گئی۔ کیا گناہ ہو گیا۔

بس یہ نسل ہی انوکھی ہے۔ آج کل کے بچے کہاں مانتے ہیں۔ لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہے اسے۔ تو بہت بگڑ گیا ہے۔ ضدی کہیں کا۔ مجھ بڑھے سے مشکریاں کرتا ہے۔ تجھے میں نے کئی بار کہا ہے مت جیا کرو ہاں اب تمہاری کوئی خبر نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ تم کہاں ہو۔ سب ریڈیوئی دی خاموش ہیں۔ کسی کو کچھ پتہ

نہیں۔ کہاں غائب ہو گیا ہے یہ نکلے۔

(ایک اخبار زمین پر گر رہا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے)

ہیروشیما کا دن منایا گیا۔ سب کو دوساں کی بچی تھی جب ہیروشیما پر بم گرایا گیا۔ وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوں جو آہستہ آہستہ بندے کو موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔ اس کے مرض کا کوئی علاج نہیں تھا لیکن پھر اسے ایک راز کا پتا چلا اگر وہ ایک ہزار پرندے بنائے گی تو اس کی ہر خواہش پوری ہوگی۔ ایک ہزار پرندے؟ (اخبار پھاڑنے لگتا ہے)

نرکی کی آواز: کاند کو فرش پر سیدھا بچھالیں۔ دونوں کونوں کو آپس میں مد کر کاغذ کی ایک وادی بنائیں۔ پھر ایک پہاڑی سی بنے گی۔ نچلے حصے کو بل دے کر اسے تہہ کرتے جائیں وادی کو دہرا کر کے پہاڑی تک لے جائیں۔ نہایت احتیاط سے پھر دونوں سروں کو آپس میں ملا کر پر پیدا کریں۔ واہ لیجئے آپ کا پرندہ تیار۔ اسے دھکا باندھے اور جتن جی چاہے اڑائیے۔

(بوڑھا کاغذ کے پرندے کو ایک دھماکے سے باندھ کر دیکھتا ہے۔ بہت خوش ہوتا ہے)

میں نے پرندہ بنایا ۲ پرندہ۔

بوڑھا:

نکو یہ دیکھ میں نے پرندہ بنایا۔ بلبل کا بچہ۔ پیتا تھا پانی کھاتا تھا دانہ (میوزک) (بوڑھا پرندے کے ساتھ رقص کرتا ہے۔ یوں لگتا ہے وہ پرندے کے ساتھ اڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کوشش میں وہ اچھلتا ہے اور نیچے گر پڑتا ہے۔ پرندہ بھی گر پڑتا ہے۔ ٹھننے کی کوشش کرتا ہے، نہیں اٹھ جاتا)

تو بہ تو بہ اڑنا تو بہت مشکل ہے، مشکل نہیں خطرناک بھی ہے۔ جو زمینی زمین سے اوپر اٹھو کوشش ثقل ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جتن اوپر جاؤ زمین سے رشتہ ختم ہو جاتا ہے اور بندہ ہواؤں میں ادھر ادھر ڈولتا رہتا ہے۔ نہ کوئی سنبھالنے والا ناں کوئی راستہ بتانے والا۔ یاد ہے اس بچے کی کہانی جو بہت اونچا اڑنا چاہتا تھا ”بابا مجھے پرنگا دو۔ میں آسمانوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں“

بوڑھا:

باپ نے دو پر بنائے، دو اسے موم سے جوڑ کر اس کے کندھوں پر لگا دیئے اور کہا ”بیٹا سورج کے نزدیک نہ جانا“ لیکن بندہ جب ہوا میں اڑنے لگتا ہے تو اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں رہتی۔ اڑا ریاں، ڈبکیاں، ہوا میں چھٹکلیں، یہ سب کچھ بندے کو پاگل کر دیتا ہے۔ ہوا سے اپنے بازوؤں میں لے کر جھلکتی ہے اور آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاتی ہے۔ بے چارہ بچہ نادان، نا سمجھ۔ اپنی اسی مستی میں سورج سے جانکرایا، موم کے پر پھل گئے اور وہ معصوم دھم سے زمین پر آگرا۔ آسمان پر صرف اس کے پروں کی ایک دھنک سی رہ گئی۔ یہی میں تم لوگوں کو سمجھاتا ہوں۔ جوانی بندے کو بے پرواہ کر دیتی ہے اور وہ زمین سے اپنا رشتہ بھول کر آسمان سے ٹکراتا ہے۔ اپنی حد سے گزرنا چاہتا ہے۔ اپنی ہی خواہش میں جل کر مر جانا چاہتا ہے۔ یہ خطرناک محبت ہوتا ہے۔ اس لمحے سے ڈرنا چاہیے۔

چل بیٹ! تو تو کاغذی پرندہ ہے۔ حقیقت کا کوئی خواب، جن سے لوگ اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔

بوڑھا:

(پرندہ کھولتا ہے۔)

یہ معطل کیجئے۔ صحیح لفظ تلاش کیجئے اور کروڑوں روپوں کے حقدار بنئے۔

آواز:

لندن میں پولیس نے ایک لڑکے کو خودکش حملہ آور کے شبے میں گولی مار دی۔
اس سال 70 لاکھ بے گھر ہو گئے۔ دوسو نے خودکشی کر لی۔ دوسو جہاز کے حادثے میں مارے گئے۔
ایک ہزار گمشدہ۔۔۔ گم ہو گئے۔

ایک رکشہ ڈرائیور نے بھوک اور قدس سے تنگ آ کر اپنے بچوں کو فراغت کر دیا۔

(کاغذ پھاڑ دیتا ہے)

(یوٹوں کی آواز)

شش۔ بکو شکاری آرہے ہیں۔ رانجھو بکو کو بتا دو وہ واپس آ جائے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ بکو میں نے
تمہیں پہلے بھی کئی بار وارننگ دی ہے۔ وہ ایک چورا چکوں ٹنگوں کا ٹولہ ہے ان کے ساتھ مت کھیلا کر۔
ان کے مقاصد کچھ اور ہیں وہ تم جیسے معصوم لوگوں کو درغہ دیتے ہیں۔ تم وہاں ان کے پاس تو نہیں ٹھہر گئے،
وہ اپنی کہانیوں سے افواہوں سے بندے کو رام کر لیتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے پاس
خفیہ ہتھیار ہیں وہ تمہیں اپنی میٹھی گویوں میں زہر بھی دے سکتے ہیں۔ تم نے ان کے ہاں سے کوئی چیز تو
نہیں کھائی۔ نہ نہ کبھی نہ کھانا۔ حرم ہے حرام۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کیا ہوا۔ آج اتوار ہے یا جمعہ۔ وہ تو سارے
پکنک منا رہے ہیں۔ اپنی اڑان جاری رکھو بکو وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اوپر ناؤں پر بیٹھ کر۔ ان کی
آنکھیں واضح پوسٹ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ (میوزک)

بوڑھا

چھٹیوں منا رہے ہیں لندن میں۔ پیرس میں۔ اف گلیاں اور بازار لوگوں سے اٹے ہوئے ہیں اتنی
خلقت۔ اف میرے خدایا یہاں تو کسی کو اٹھنے بیٹھنے کے لیے زمیں نہیں مل رہی ہے۔ ناؤں اور اونچے ہوتے
چارہ ہیں۔ آسمان تک۔ ان کی جندی آسمان تک ہے۔ وہ بڑے بڑے ناؤں میں بیٹھ کر ہمیں دیکھ رہے
ہیں۔ تم جندی سے کہیں چھپ جاؤ۔ وہ آرہے ہیں۔ چاروں طرف سے سب بوگ ان کے زونے میں۔ تم
بودھی کے درخت کے نیچے چھپ جاؤ۔ جندی کرو۔ تھکنا نہیں میرے بچے، روتے رہو۔ لگتا ہے آسمان ابھی
زمین پر آن گراے گا۔ اف ہوا دم توڑ رہی ہے۔ اس ہو میں، رونا بھی مشکل ہے۔ اندھیرا بھی بڑھ رہا ہے،
لگتا ہے تو رستہ بھول گیا ہے۔

(یکدم) یہ آسمان اتنا سرخ کیسے ہو رہا ہے۔ ویسے تو پہلے کبھی نہیں تھا۔ لگتا ہے لداوا پکھل رہا ہے۔ یہ اتنا
دھواں۔ یہ دھواں کہاں سے اٹھ رہا ہے۔ آگ۔ آسمان تک پھیلتی آگ۔

ادہ میرے خدایا بکو؟ بکو! میرے بچے، تو... تو آسمان سے ٹکرا گیا؟

(میوزک۔ نائن ایون کی خبروں کے ساتھ میوزک کس ہوتا ہے اور آخر تک چلتا رہتا ہے)

(بوڑھا آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ سے ہانڈی میں ہاتھ ڈالتا ہے اور مٹھی بھر کر ہاتھ بند کرتا ہے)

آہستہ سے مٹھی کھلتی ہے جس میں سے بہت سے سفید پراہتہ ہوا میں بکھرتے ہیں)

فیڈ آؤٹ

☆ ☆ ☆

موسیقار نوشاد علی

(گلوکار، دکن ری، ڈاکٹر امجد پرویز سے موسیقار نوشاد علی کے بارے میں لیا گیا انٹرویو)

علی عثمان باجوہ

س موسیقار نوشاد علی کا نام لیں تو سب سے پہلی بات کیا ذہن میں آتی ہے؟
ج اول یہ کہ موسیقار نوشاد علی مسلمان تھے۔ دوئم یہ کہ وہ بھارت کے مہان موسیقار تھے۔ سوئم یہ کہ انہوں نے سب سے بڑی کاسیٹوم فلم ”مغل اعظم“ کے لیے موسیقی تجویز دی اور اس فلم کے تمام گانے راتوں رات شہرت کی بند یوں کو چھو گئے تھے۔

س اگرچہ نوشاد صاحب کی فلمی موسیقی کا احاطہ کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے لیکن سب سے پہلے ان کی فلم مغل اعظم پر روشنی ڈالیں۔

ج مغل اعظم، نوشاد علی کی سب سے بڑی اور شاندار فلم، ہدایتکار کے۔ آصف کا شاہکار تھی۔ اس فلم کے بارہ گیت شاعر کھلیل بدایونی کے قلم کا نتیجہ تھے انڈین فلم انڈسٹری کے سب سے خوبصورت جوزے، مدھوبان، اور دیپ کمار کی یہ باکس آفس پر سب سے بڑی کامیابی تھی۔ اس فلم کی کہانی ور پلاٹ معروف مصنف سید امتیاز علی تاج کے ڈراما ”انارکلی“ سے ماخوذ تھی اگرچہ مغل اعظم کے ختمائی سین ردوبدل کے ساتھ انارکلی کی جان بخشی پر پیش کیے گئے۔ انارکلی، شہنشاہ اکبر کے دربار سے منسلک ایک رقصہ تھی جو فلم کا مرکزی کردار ہے، شہنشاہ ہند، عظیم فاتح کبر اور اس کی رچوت رانی مریم الزمانی کے آسائش پرست فرزند سلیم کو انارکلی سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے والدین کی تجویز کردہ بڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے بجائے وہ انارکلی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے شہنشاہ اکبر سخت ناراض ہو کر انارکلی کو قید کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے زنداں میں ڈال دیتا ہے اور خاص طور پر جب انارکلی شہنشاہ کے سامنے شاہی رقص کے دوران اپنی محبت کا اظہار بھی کر چکی ہوتی ہے۔

گانا۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا (لٹا میٹشکر) فلم مغل اعظم۔

س جہاں تک مجھے یاد ہے اس فلم میں نوشاد صاحب نے ایک دلکش نعت بھی کہی تھی۔
ج جی ہاں قید میں زنجیروں میں بندھی، انارکلی خدا سے رحم کی بھیک مانگتی ہے اور اس کے لبوں سے فریاد نکلتی ہے۔
بے کس پہ کرم کیجئے سرکار مدینہ (لٹا) مغل اعظم

در اصل اس وجہ سے شہنشاہ اکبر سخت ناراض ہو کر انارکلی کو قید میں ڈال دیتا ہے۔ سلیم بغاوت کر دیتا ہے۔ ایک جنگ میں سلیم کو شکست کے بعد موت کی سزا کا اعدن کر دیا جاتا ہے۔ دونوں کی لار وال محبت تاریخ کا دھارا بدل دیتی ہے جب انارکلی سلیم کی جان بچانے کی خاطر سلیم کی محبت سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ اسی دوران انارکلی کی ماں کبر اعظم سے انارکلی کی جان بخشی کی استدعا کرتی ہے اور اسے اس بات پر رضا مند کر لیتی ہے،

لہذا انارکلی کو ایک خفیہ راستے سے دور دراز بھجوا دیا جاتا ہے اور سلیم شکست خوردہ دکھی، ورنہ نئے ہوئے دل کو تھم کر رہ جاتا ہے (یہ فلم کی کہانی کا انجم ہے جو اصل کہانی سے مختلف ہے) نوشاد علی کی شاندار موسیقی نے فلم کی کہانی کے عروج میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک دلچسپی کی بات یہ ہے کہ سچ کے دور کی ایک اداکارہ سونم کپور نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ فلم ”مغل اعظم“ اس کی پسندیدہ ترین فلم ہونے کی وجہ سے وہ یہ چاہتی ہیں کہ وہ خود انارکلی کا کردار ادا کریں جبکہ ایتنا بھ بطور اکبر اور اس کا بیٹا بھی شکستہ شہزادہ سلیم کا کردار ادا کر سکے۔

کیا اس دور میں یہ تجربہ کامیاب ہو سکتا ہے؟

س

ج

لیکن میرا سوال تو یہ ہے کہ نوشاد جیسا میوزک کون تخلیق کر سکتے گا۔ اگر نوشاد جیسا میوزک تخلیق نہ ہو سکا تو ایسی فلم کا وہی حال ہو گا جوئی ”دیو داس“ کا ہوا تھا کیونکہ منظر سی ڈائریکٹر میسر نہ ہو سکا تھا خیم جیسا میوزک ڈائریکٹر اور ریکھا جیسی اداکارہ۔ ریکھا جیسی اداکاری اشور یہ (نئی فلم میں) نہیں کر سکی۔ بہر حال سونم کے وائس اٹل کپور اس فلم کی دوبارہ فلم سازی کے لیے بڑے بخت اور سرمایہ کاری کی، استعداد تو رکھتے ہیں۔ ”مغل اعظم“ کی شاندار کامیابی کی ایک وجہ فلم کی موسیقی تھی۔ خاص طور پر دو گیت جو مشہور و معروف کلاسیکی موسیقی کے گائیک بڑے غلام علی خان نے گائے ”شہد دن آئیو“ اور ”پریم جوگن“۔ اس کے علاوہ مہمان گلوکارہ لتا کی آواز سے تراشے ہوئے نعل وجواہر جیسے آبدار گیت ”محبت کی جھوٹی کہانی پر روئے“، ”پیار کیا تو ڈرنا کیا“، ”ہمیں کاش تم سے محبت نہ ہوتی“۔ ”یہ راگ ایمن کلیان کی بندشیں ہیں اور“ اے عشق یہ سب دنیا والے“ اور محمد رفیع کا گایا یہ گیت ”اے محبت زندہ باد“۔ یہ گیت سو سے زائد گلوکاروں کی آواز میں ایک کورس کی صورت میں تھا۔ ایسا کورس اس وقت کے اعتبار سے ایک بڑی نئی بات اور اہم اختراع تھی لیکن یہ ایک افسوسناک مرتبہ تھا کہ اس سال نوشاد کو فلم فیئر ایوارڈ سے محروم رکھا گیا اور اس کی بجائے فلم ”دس اپنا اور پریت پرائی“ کے لیے شکر جے کشن کو یہ ایوارڈ دیا گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نا انصافی پر مبنی فیصلہ تھا کیونکہ دونوں فلموں کی موسیقی کا کوئی موازنہ ہی نہیں بنتا تھا۔ ہر لحاظ سے نوشاد علی کی موسیقی بہترین تھی۔

س

پڑا؟

ج

برصغیر میں لکھنؤ شہر کو یہ اعزاز اور مقام حاصل ہے کہ یہ تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کا حامل شہر ہے۔ اسی تہذیبی اور ثقافتی مرکز میں 25 دسمبر 1919ء میں نوشاد پیدا ہوئے۔ ان کے والد، واحد علی غنشی (کورٹ کلرک) تھے۔ نوشاد کے فن میں قوالوں اور دیگر موسیقاروں کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ یہ قوال اور موسیقار لکھنؤ کے قریب بارہ بنگل کے مقام پر واقع دیو اشرف کی درگاہ پر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نوشاد علی کے چند شاہکار گیتوں میں قوالی بیت (Beat) کا اثر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ”میرے محبوب میں کی نہیں“ (تو اور آشا) یہ فلم ”میرے محبوب“ کا گیت ہے۔ اپنی جوانی کے دور میں نوشاد علی خاموش فلموں کے پیچھے بچائے جانے والے فوری ریکسٹرا (Live Orchestra) کو بڑے غور سے سنا کرتے تھے۔ بعد ازاں نوشاد علی نے کلاسیکی موسیقی سیکھے میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ کلاسیکی موسیقی کا علم حاصل کرنے کے لیے انہوں نے استاد غربت علی، استاد یوسف علی، استاد ہیں صاحب اور دیگر اساتذہ سے رابطہ کیا۔ زندگی کی

جدوجہد کے ابتدائی دور میں روزی روٹی کمانے کی خاطر انہوں نے ہارمونیم مرمت کرنے اور غیر پیشہ ورانہ تھیٹروں (کتر درجہ کے نانک گھروں) کے لیے میوزک کمپوزیشنز دینے جیسے کاموں کو بھی کبھی اپنے مقام سے کتر درجہ کا کام نہیں سمجھا، لہذا وہ ونڈ سر میوزک انٹرنیٹز کے لیے کام کرتے رہے۔

نوشاد کی فیملی اُن کے لیے موسیقی کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے خلاف تھی۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ نوشاد کی شادی کے موقع پر بیٹا بچے والے ان کی فلم ”رتن“ کے سپر ہٹ نغمے گارے تھے۔ نوشاد کے والد اور سر یہ نغمے س کر اس میوزک کمپوزر پر لعن طعن کر رہے تھے جس نے ان نغموں کی دھنیں بنائیں۔ وہ ان گیتوں کو غیر معیاری اور کتر قرار دے رہے تھے لیکن نوشاد انہیں یہ بتانے کی جرأت نہ کر سکے کہ یہ دھنیں انہوں نے ہی کمپوز کی ہیں۔

ایسے لوگ جو خوددار ہوتے ہیں اور جو بغیر کسی کی مدد کے اپنا مستقبل خود ہی بناتے ہیں ان کی ابتدائی زندگی جدوجہد اور مشکلات سے بھرپور ہوتی ہے۔ پچھلی صدی کی تیسری دہائی نوشاد کی بھئی میں ابتدائی مشکلات اور بھرپور جدوجہد سے معمور تھی۔ انہوں نے ان تکلیفوں اور مشکلات پر خودداری ور بڑے صبر و تحمل سے قابو پایا۔ 1937ء میں آ خرکار نہیں مشتاق حسین کے ”کسٹرا گروپ“ میں پیانو بجانے کے لیے ملازمت مل گئی۔ بعد ازاں انہیں کھیم چند پرکاش (میوزک ڈائریکٹر فلم ”محل“) کے معاون کے طور پر ملازمت ملی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ نوشاد علی کہا کرتے تھے کہ کھیم چند پرکاش اُن کے استاد ہیں۔

بحیثیت انفرادی موسیقار، نوشاد علی کی کون کون سی فلمیں پسند کی گئیں۔ ابتدائی جدوجہد کے دور میں ”نوشاد علی کی سخت جدوجہد آ خرکار 1940ء میں شر آ ور ہوئی جبکہ اس کو فلم ”پریم نگر“ کے لیے انفرادی طور پر میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ پھر ایک سال بعد راج کپور ور ثریا کی فلم ”دشمن“ کے لیے میوزک دیا۔ 1941ء میں فلم ”مالا“ کی کاسٹ میں اداکار بے انت درد، بے راج اور نندہ شامل تھے۔ اس کے بعد کی فلمیں یہ تھیں۔ ”نئی دنیا“، ”شاردا“، ”سٹیشن ماسٹر“، ”قانون“، ”نمستے“، ”خج“ اور ”گیت“۔ یہ 1942-43ء کی سلور جوبلی فلمیں تھیں، سوائے ”سٹیشن ماسٹر“ کے۔ انہیں پہلی مرتبہ آ ر کاردار کی فلم ”شاردا“ کے ایک گیت ”پنچھی جا“ جو تیرہ سالہ ثریا نے فلم کی ہیروئن مہتاب کے لیے بطور پہلے بیک سگر کے گایا تھا، کے حوالے سے سراہا گیا تھا۔ 1944ء میں نوشاد کی فلموں میں ”جیون“ اور اسے آ رکاردار کی فلم ”پہلے آپ“ شامل تھیں جس میں شمیم اور واسطی نے اداکاری کی تھی۔

ہم سے پہلی نسل نوشاد علی کی ”رتن“، ”انمول گھڑی“ اور ”درد“ کے اعلی گیتوں کو بہت یاد کرتی ہے۔ ان پر روشنی ڈالیے۔

اس کے بعد سورن لٹا کرن دیوان اور امیر بانو کی فلم ”رتن“ تھی جس کے لیے نوشاد علی نے پچیس ہزار روپے معاوضہ وصول کیا جو ن دنوں میں بہت بڑا معاوضہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ڈائمنڈ جوبلی فلم تھی۔ ”اکھیاں ملا کے“ اور ”سون کے بادلوں سے یہ جا کہو“ بہت ہی مقبول گیت تھے۔ اس کے بعد ”سنیاسی“ اور ڈائریکٹر محبوب خان کی فلم ”انمول گھڑی“ 1946ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ نور جہاں، سریندر اور ثریا کی فلم تھی اور یہ بھی ڈائمنڈ جوبلی فلم تھی جس کے خوبصورت گانوں میں ”آ جا مری برباد محبت کے سہارے“، ”کیا مل گیا بھگوان“، ”جواں ہے

محبت حسین ہے زمانہ“ شامل ہیں۔ نور جہاں کے ان گیتوں کے علاوہ ثریا کا ”سوچا تھا کیا“ شامل تھا۔ ان میں سب سے بہترین، ریڈیو گارڈو گانہ تھا۔ ”آوارے کہاں ہے“ (نور جہاں اور سریندر) یہ گیت نور جہاں بعد میں ہمیشہ کسی بھی میوزک پروگرام کے آغاز میں گایا کرتی تھیں۔ اس کے بعد نذیرا جمیری کی فلم ”قیمت“ ریمیز ہوئی تھی۔ پھر نوشاد کی ”شاہجہاں“ (1946ء) اے آر کاردار کی ہٹ فلم تھی اور فلم ”درد“ (1947ء) اور ”اعلان“ (1947ء) ان فلموں کے بعد محبوب خان کی ”انوکھی ادا“ اور بیس یوسی کی ”میلہ“ دونوں 1948ء میں ریمیز ہوئیں۔ فلم ”انداز“ محبوب خان کی فلم 1949ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ تینوں گورڈن جوہلی فلمیں تھیں۔ گانا: جواں ہے محبت (نور جہاں) فلم ”انمول گھڑی“

س فلم ”انداز“ ایک خوبصورت فلم تھی اور اس کا ایک گیت درد و سوز سے بھرپور تھا۔ ”توڑ دیا دل میرا، تو نے ارے بے وفا۔“ اس کے شاعر مجروح سلطان پوری تھے۔

ج مشہور ہدایتکار محبوب خان کی اس 1949ء فلم کے نمایاں ستارے نرگس اور دیپ کمار تھے۔ یہ فلم یکم جنوری 1949ء کو ریلیز ہوئی۔ رقصہ ککو اور راج کپور معاون کرداروں میں جلوہ گر ہوئے تھے۔ اس فلم کے دس گانے تھے۔ تن منگی شکر کا گیت ”اٹھائے جان کے ستم اور جنے جا“ درد بھرا گیت تھا۔ اور ”کوئی میرے دل میں خوشی بن کے آیا“ طر بیہ گیت تھا۔

س موسیقار نوش دہلی نے گلوکار مکیش کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں۔
ج دراصل بچہ س کی دہائی میں طلعت محمود کے بعد نوشاد ہی، محمد رفیع کی ریشمی آواز جو باجے کی دواڑھا کی سہقتوں کو آسانی سے چھو لیتی تھیں، ترجیح دیتے تھے۔ لیکن مکیش کے گائے ہوئے کم از کم چار میں سے تین گیت ”فلم انداز“ سے بہت مقبول ہوئے تھے۔

۱۔ تو کہے اگر جیون بھر میں گیت سنا تا جاؤں

۲۔ جھوم جھوم کے ناچو آج، گاؤ خوشی کے گیت

۳۔ ہم آج کہیں دل کھو بیٹھے، یوں سمجھو کسی کے ہو بیٹھے

گانا: جھوم جھوم کے ناچو آج (مکیش) فلم انداز

نوشاد دہلی کے بحیثیت موسیقار، سفر کو آگے بڑھائیے؟

ج مجھے ابھی تک یاد ہے کہ بچپن میں میں صرف خوبصورت ”پری چہرہ نسیم“ ہمرہ ہیروشیم کے بے فلم ”چاندنی رات“ (1949ء) دیکھنے گیا تھا۔ اے آر کاردار کی فلم ”دس لگی“ شیا، ثریا مرکزی اداکار اور فلم ”دلاری“ (1949ء) جس میں مہدوبالا، گیتا بالی اور سریش مرکزی اداکار تھے، بہت ہی خوبصورت فلمیں تھیں۔ پہلی نگر فلم ”آن“ تھی جس میں دیپ کمار اور نادر امرتسری، اداکار تھے جبکہ نئی کی اداکاری سب کو مات دے گئی تھی۔ اس فلم کی موسیقی سپر ہٹ تھی اور یہ خوبصورت یادگار گیت ”آج میرے من میں سکھی بانسری بجائے کوئی“ (راگ بھیم پلاسی) یہ میرے بچپن کی یادگار ہے جبکہ فلم ”دلاری“ کا شاندار گیت ”سہانی رات ڈھل چکی“ جو سریش پر فلما یا گیا تھا، اس زمانے کا مقبول ترین سپر ہٹ تھا۔ آج بھی سوچتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس گیت کو گانا بہت مشکل کام ہے۔ خاص طور پر دوسرا انترا۔ کوئی بھی گلوکار گیت کی طرز (Tune) سے ہٹ کر غلطی کر سکتا

ہے جبکہ وہ گیت کے اس مصرع کو گاتا ہے ”خزاں کا رنگ آچلا ہے موسم بہار میں۔“
گانا سہانی رات ڈھل چکی (محمد رفیع) فلم، دلاری

س کیا یہ بات درست ہے کہ نوشاد علی کالت منٹیشکر کے فلمی سفر کو کامیابی سے آگے بڑھانے میں بہت ہاتھ ہے؟
جی ہاں! اگرچہ موسیقار انیل بسواس اور ماہر غلام حیدر لٹا منٹیشکر کے لیے خوبصورت گانے کمپوز کر کے اور ان سے گوا کر ان کے فلمی سفر کو بہت آگے بڑھایا لیکن موسیقار نوشاد علی کی کاوشیں بھی کم نہ تھیں۔ ان دنوں فلموں میں نفسی سے بھرپور گیتوں اور رومانس اور ان سے جڑی ہوئی محبت کی المیہ (ٹریجڈی) کہانیوں کا چلن عام تھا۔ نوشاد ان ابتدائی میوزک کمپوزرز میں سے ایک ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ لٹا منٹیشکر کو فلم ”انداز“ اور ”دلاری“ میں گلوکاری کا موقع فراہم کیا اور اس سے پہلے اُن کی پسندیدہ گلوکارائیں شمشاد بیگم اور زہرہ بانگی تھیں۔ ان فلموں کے علاوہ اُسی سال میں فلم ”محل“ (کھیم چند پرکاش)، اور فلم ”برسات“ (شکر بے کشن) کے خوبصورت گیتوں کی وجہ سے لٹا منٹیشکر بے بیک سنگرز میں صف اوس کی گلوکارہ بن گئیں۔ 1940ء کے اوائل میں گانوں وغیرہ کی ریکارڈنگ نصف شب کے بعد خاموش اور پرسکون پارکوں یا باغات میں کی جاتی تھی کیونکہ سٹوڈیوز میں ساؤنڈ پروف ریکارڈنگ کمرے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ان باغات میں شد تو گرغ وغیرہ کا کوئی مسئلہ ہوتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی مداخلت ہوتی تھی جبکہ سٹوڈیوز میں ٹین کی چھتوں کی وجہ سے ارتعاش پیدا ہوتا تھا۔
نوشاد صاحب نے اپنی فلموں ”زن کھٹورہ“ اور ”امر“ کے لیے اپنے آرٹسٹوں کی آدیں نوے ڈگری پر ریکارڈ کیں، پھر 70 سکیل اور 50 سکیل پر۔ اس تجربے کے بعد جب وہ آوازیں پردہ سکرین پر منتقل کی گئیں تو بہت ہی شاندار نتائج حاصل ہوئے۔

س گانا: انصاف کا مندر ہے (رفیع) امر
اس فلم میں اداکارہ ٹی کی لا جواب ایکٹنگ تھی۔

ج یہ دیکھئے کہ انہوں نے گانے ”نہ ملتا غم تو بربادی کے افسانے کہاں جاتے“ پکچرائز کرتے ہوئے کیا جذبات نگاری سے کام لیا ہے۔

س گانا نہ ملتا غم تو بربادی کے افسانے کہہ جاتے (لٹا)، فلم، امر
موسیقار نوشاد علی کی ایک خوبصورت فلم تھی ”دل دیا درد لیا“ اس فلم پر روشنی ڈالنے کے نغے درد و سوز سے بھرپور تھے۔ یہ Emile Bronte کے مشہور ناول Wuthering Heights پر مبنی تھی۔ اگرچہ آجکل بھی انگریزی فلموں کے پلاٹ لے کر فلمیں بنائی جاتی ہیں لیکن ”دل دیا درد لیا“ کی نمایاں خصوصیات کیا تھیں؟
ج یہ فلم 1965ء میں بنی تھی۔ اس کے ہدایتکار اے آرہ کردار تھے ولیپ کمار اپنے جذباتی کردار میں فلم کے اختتام تک چھانے رہے۔ دیگر نمایاں کردار وحیدہ رحمان، پران، شیاہ اور رحمان نے ادا کیے پران ایک ظالم اور حسد شخص کے کردار میں بہت نمایاں رہے۔ حالانکہ یہ فلم بہترین ہدایتکاری Locations کے بہترین استعمال اور کردار نگاری کا ایک حسین مرقع تھی لیکن تب تک مزید فلموں کا دور آٹھل تھا اس لیے یہ کمرشل فداپ فلم ثابت ہوئی جس کا مجھے اور Sendus فلم بینوں کو بہت افسوس ہوا۔

س اس فلم کی موسیقی پر روشنی ڈالئے۔

ج راگ کلاوتی میں بنایا گیا گیت 'کوئی سا غر دل کو بہلاتا نہیں' اس فلم کی Rich موسیقی کا نمائندہ گیت ہے۔ اگرچہ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ راگ جانا ساموئیل اشیکا کلین میں ہے۔ اس فلم کے دیگر خوبصورت نغمے یہ تھے 'پھر تیری کہانی یاد آئی' (لتا) 'ساون آئے یا نہ آئے' (رفیع، آشا) 'دربار میں نے تیرے پیار میں کیا کیا نہ کیا' (رفیع) 'مگر رے ہیں آج عشق میں ہم' اس مقام سے 'محمد رفیع' ایک اور خوبصورت گیت جدید رنگ میں 'کیا رنگ محفل ہے دل دارم' (لتا)

س 1960ء کی دہائی میں نوشاد علی نے کچھ مسلم سوشل فلموں میں بھی موسیقی دی تھی۔

ج ان فلموں کے تذکرے سے پہلے میں فلم ساز اور آواز کا ذکر کروں گا۔
اگلی فلم 'ساز اور آواز' (1966ء) تھی۔ اگرچہ یہ فلم پذیرائی حاصل کرنے میں ناکام رہی مگر اس میں کچھ نغمے اچھے تھے۔ مثلاً 'ساز ہو تم آواز ہو میں' (آشا رفیع)

س 1967ء میں ایک اور مسلم تہذیب و تمدن اور مسلم سماجی روایات پر مبنی فلم 'پاکلی' منظر عام پر آئی جس میں مرکزی کردار وحیدہ رحمان اور راجندر کمار اور رحمان نے ادا کیا۔ یہ ایک خوبصورت فلم تھی۔ فلم کے ڈائریکٹر ایس۔ یو۔ منی تھے۔ اس سے پہلے میرے محبوب، ایک اعلیٰ فلم بنی تھی۔
لیکن فلم رام اور شیا متو کمرشائی بہت کامیاب فلم تھی، اس کی کیا وجہ تھی۔

ج اس کی وجہ دلپ کمار کا ڈبل رول تھا اور فلم کے کئی Scenes میں کامیڈی ڈالی گئی تھی۔ یہ ایک Hit فلم تھی۔
فلم 'بیڈر' بھی اسی زمرے میں آتی ہے جس میں محمد رفیع کا نغمہ 'مجھے دنیا والو شرابی نہ سمجھو' پردیپ کمار کا Fake شرابی role بہت پسند کیا گیا تھا اور دلپ کمار اور دھنتی،، پر فلما دیا گیا گیت 'تیرے حسن کی کیا تعریف کروں' ایک خوبصورت روحانی گیت تھا۔

س دھنتی مالا کی راجندر کمار کے ساتھ بھی جوڑی مشہور رہی۔ کیا یہ جوڑی نوشاد علی کی کسی فلم میں جلوہ گر ہوئی۔
ج پھر اس کے بعد دھنتی مالا اور راجندر کمار کی فلم 'ساتھی' اس فلم کی تقسیم شاید عوام الناس اور فلمی شائقین کی ذہنی سطح سے ذرا بلند تھی۔ فلم کی کہانی ایک ریسرچ کرنے والے سائنس دان اور اس کی بیوی کی کہانی ہے۔ سائنسدان اپنی بھرپور مصروفیات کی وجہ سے بیوی کو زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ بیوی یہ کرب خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے۔ اس فلم میں گلوکار مکیش کی آواز کو کافی عرصہ کے بعد استہساں کیا گیا۔ مکیش کے اس گیت کو بے حد پسند کیا گیا۔ 'حسن جاناں ادھر آ آئینہ ہوں میں تیرا' سیکی گریوال کی سنجیدہ اداکاری فلم کے لیے ایک اور مثبت پہلو تھا جس پر خوبصورت گیت 'یہ کون آیا' اور 'میں تو پیار میں تیرے' فلما دئے گئے۔

س فلم آدمی میں ایک دفعہ دلپ کمار اور وحیدہ رحمان جلوہ گر ہوئے تھے۔

ج 1968ء میں دلپ کمار کی فلم 'دمی' ریلیز ہوئی۔ دلپ کمار شہنشاہ راجندر اور اداکاری، منوج کمار اور وحیدہ کی عمدہ اداکاری اور نفسی اور ترنم سے رچے بسے گیتوں کے باوجود فلم تجارتی نقطہ نظر سے ناکام ثابت ہوئی۔ اسی سال میں ڈائریکٹر بیج۔ ایس روہیل کی فلم 'سنگھرش' ریلیز ہوئی۔ ایک یہ بڑی مضبوط کاسٹ دھنتی مالا، ہراج سانی اور دلپ کمار پر مشتمل تھی لیکن یہ فلم بھی کمرشل اعتبار سے ناکام ہوئی۔ باوجود اس کے کہ فلم کی کہانی کا پلٹ اور موسیقی بہت زوردار تھی۔ ان فلموں کی ناکامی کے ساتھ ہی انڈین فلمی دنیا میں نوشاد علی اور دلپ

کمار کا مرحلہ وار زوال شروع ہو گیا۔

س کیا یہ بات درست ہے کہ کمرشل فلموں میں کلاسیک موسیقی کے استعمال کا چھن موسیقار نوشاد علی نے شروع کیا؟
ج کلاسیک موسیقی کو دافر مقدار میں استعمال نوشاد علی نے ہی کیا، مگر چہ ان سے پہلے اور بعد میں دیگر موسیقار بھی کلاسیک موسیقی کو اپنی دھنوں میں استعمال کرتے رہے ہیں۔

پہلی مرتبہ کمرشل فلموں میں کلاسیک موسیقی کے استعمال کا چھن نوشاد علی نے شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب فلم ”بجو باورا“ ریلیز ہوئی تھی تو اس کی وجہ سے انڈین فلموں کی موسیقی میں بڑی مثبت تبدیلی رونما ہوئی۔ 1952ء میں اس فلم میں نوشاد نے کلاسیک موسیقی پر مبنی گیت کے مقابلہ کے لیے استاد امیر خان اور ڈی وی پل سکر جیسے کلاسیک موسیقی کے ماردوں کو منتخب کیا تھا۔ کئی لوگوں نے یہ بات کہی ہے کہ ڈی وی پل سکر استاد امیر خان کے ساتھ دو گانے کے لیے جھجک محسوس کر رہے تھے لیکن جب استاد امیر خان نے پل سکر کو یہ بتایا کہ فلمی بہانی کی ضرورت کے مطابق مقابلہ میں امیر خان ہار جائیں گے تب وہ رضامند ہو گئے، لہذا یہ دو گانہ ایک بہت اعلیٰ اور شاندار گیت ثابت ہوا۔ ”آج کاوت من میر د“ اس گیت کا راہم ”تین تال“ تھا اور یہ ”راگ دلی“ پر مبنی تھا۔ دے بہت کی ڈائریکشن میں بننے والی اس فلم کے سارے گیت کلاسیک راگوں پر مبنی تھے۔ تاہم اور رقیع کا دو گانہ ”تو گنج کی موج میں جہنا کا دھارا“ راگنی بھیرویں میں کمپوز کیا گیا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نوشاد علی نے اپنے بیشتر گیتوں کے لیے اسی راگنی کو استعمال کیا ہے۔ اس فلم کے بعد کی فلموں میں اس کا یہ رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً ”اے دل تجھے قسم ہے“ (تا، فلم دزری) ”کیا رنگ محفل ہے“ (تا، فلم دس دیا در دیا) ”اللہ پچائے لوجوانوں سے“ (تا، فلم میرے محبوب) ”انصاف کا مندر ہے یہ“ (محمد رقیع، فلم امر) ”نہ طوفان سے کھیلو“ (رقیع، فلم ژن کھنور) ”ہوئے ہم جن کے لیے برباد“ (رقیع، فلم دیدار) ”دیکھ لیا میں نے“ (تا، رقیع، فلم دیدار) ”نے والوں کو آتا ہوگا“ (رقیع، تا، فلم سونی مینیوال) ”خاموش ہیں کھيون“ (تا، فلم امر) ”جادو گر قاتل“ (آش، فلم کوہ نور) ”چاند چھپا اور تارے ڈوبے“ (مہندر کپور، فلم سونی مینیوال) ”آئی ساون رت آئی“ (شمشاد بیگم، فلم میلہ) ”گاؤ ترانے“ (کورس: شمشاد، تا، رقیع، فلم آن) ”ذو با تارا امیدوں کا سہارا“ (تا، فلم اژن خنور) ”دوہنوں کا جوڑا“ (تا، فلم گنگا جمن) ”میں تو پیار سے تیری پیا“ (تا، فلم: ساتھی) ”تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی“ (تا، فلم: سونی مینیوال) ”ٹوٹے نہ دل ٹوٹے نہ“ (مکیش، فلم انداز) ”یہ زندگی کے میسے“ (رقیع، فلم میلہ) ”میرے پاس آؤ نظر تو ملاؤ“ (تا، فلم سنگھرش) فلم ”بجو باورا“ سے لے کر ایک اور گیت ”بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا“ یہ گیت راگ، مانڈ پر مبنی تھا۔ یہ راگ عموماً راجستھان، انڈیا میں گایا جاتا ہے۔ اس راگ پر نوشاد کا فنی کنٹرول ان کی علم موسیقی پر قدرت، وسعت اور رنگارنگی کا ثبوت ہے۔ اگر کوئی شخص راگ، مانڈ کوٹس اور ٹوڈی کی جانکاری اور سوچہ بوجھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو بالترتیب یہ گیت سننا چاہئیں۔

”من تڑپ ہری درشن کو آج“ اور ”انسان سٹو“ دونوں کے رکھوالے (درہاری کانٹر)

موہے بھول گئے سا نوری (کالنگہ ابھیروں)، 1954ء، میں نوشاد علی کو اس فلم پر فلم میرا یو، روڈیا گیا۔

س نوشاد علی کی کوئی فلمیں ایسی ہیں جن کی موسیقی نے آپ کو بہت متاثر کیا ہے؟

دو عدد فلموں کا تذکرہ لازمی ہے۔ اول ”انداز“ اور دوم ”بابل“

فلم ”انداز“ یادگار اور شادمانہ نگہی کے گیتوں پر مشتمل فلم تھی۔ اس کا یہ گیت دیکھئے ”اٹھئے جان کے ستم اور جنے جا“ اس فلم کی کہانی کے مطابق راج کپور اور نرگس آپس میں محبت کرتے ہیں جبکہ شکستہ دل اور ٹھکرایا ہوا دلپ کمار بھی نرگس سے محبت کرتا ہے۔ مکیش کا یہ گیت دلپ کمار پر فلمایا گیا جو وہ پیانو پر گاتا ہے ”ٹوٹے نہ دل ٹوٹے نہ“ اور پھر دلپ کمار فلم میں مکیش کا گایا ہوا گیت گاتا ہے۔ ”تو کہے اگر“ گیت کے دوران میں ڈانسنگ گلو کا جھولنا ہوا رقص بہت خوب تھا۔ مکیش کے یہ دونوں گیت اور ن گیتوں کی سریلی جھومتی ہوئی ڈھنیں اور میوزک بے حد پسندیدہ اور مقبول ہو۔ فلم میں نرگس راج کپور کے لیے یہ گیت گاتی ہے ”کوئی میرے دل میں خوشی بن کے آیا“ جبکہ دلپ کمار نرگس کے اس گیت کو اس کی طرف سے اپنے لیے پیغام محبت سمجھتا ہے ”توڑ دیا دل میرا“ بہت ہی خوبصورت، درد و غم سے بھرا گیت۔ جو نرگس اس وقت گاتی ہے جب راج کپور اس کا دل توڑ کر اور اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ شمشاد بیگم اور لٹا کا دو گانہ ”اے نہ محبت کر لے“ جو نرگس اور گلو اور دلپ کمار (پیارے بجاتے ہوئے) پر فلمایا گیا۔ اگرچہ اس فلم کا ہیرو راج کپور تھا مگر دلپ کمار کی زبردست ورثہ انداز اداکاری اور چہرے کے تاثرات کی وجہ سے فتح و نصرت اس کے حصے میں آئی۔

وہ فلم جس نے مجھے بے حد متاثر کیا اور جو دل پر نقش ہوئی، وہ تھی ایس یوسنی کی ”بابل“ جس کی کاسٹ تھی دلپ کمار، نرگس اور منور سلطانہ۔ فلم کی کہانی میں دلپ کمار، منور سلطانہ سے محبت کرتا ہے۔ (”میتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ کسی کا“) لیکن ادھر نرگس نے دلپ کو اپنے خوابوں میں بس رکھا ہے۔ نرگس شادی کے منظر کو دیکھتے ہوئے درخت سے رُج جاتی ہے۔ فلم میں لٹا اور شمشاد کے بے مثال گیت شامل ہیں۔ مثلاً ”پنچھی بن میں پیہ پیہا گانے گا“ اور ”چھوڑ بابل کا گھر“۔ یہ تمام گیت نرگس کی باکمال کردار نگاری کی وجہ سے اب تک لوگوں کے دل پر گھر کیے ہوئے ہیں۔

نوٹادہ کی موسیقی نے فلم انڈسٹری پر کیا اثرات ترتیب دیئے؟

انڈین فلم انڈسٹری میں اپنے باسٹھ سالہ قیام کے دوران میں نوٹادہ نے صرف چھپ سٹھ فلموں کے لیے میوزک دیا۔ انہوں نے ہمیشہ فن کی پختگی اور کامیت کے لیے سخت محنت کی۔ وہ سنو ری لائن اور کہانی کے واقعات اور مختلف موڑوں کو سمجھنے کے لیے کئی کئی دن صرف کر دیا کرتے تھے۔ نوٹادہ دلی کا میوزک اور ڈھنیں بے مثال اور زوال ہونے کی دیگر وجوہات کے علاوہ یہ بھی ایک وجہ تھی۔ اگرچہ نوٹادہ نے کبھی بھی موسیقی میں نئے رجحانات کی سوچ سے گریز تو نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے کئی گیتوں میں جدید رجحانات کی طرز موسیقی کو شامل بھی کیا لیکن وہ اپنی بنیادوں سے سمجھوتہ کرنے پر کبھی بھی یقین نہیں رکھتے تھے۔

☆ ☆ ☆

یہی تو ٹوٹے دلوں کا علاج ہے.....

(طنز و مزاح)

گھر بیٹھے دانشور بنے

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ویسے تو دورِ حاضر میں ہر شخص ”حسبِ توفیق“ فکر مند ہے۔ جسے کوئی فکر نہیں اسے یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ اسے کوئی فکر کیوں نہیں؟ یہ دانشوروں کا طبقہ ہے جو بزمِ علم خود پوری انسانیت کا غم خوار اور نجات دہندہ ہے۔ مندرجہ ذیل دو اشعار (جو بالترتیب امیر مینائی اور محسن بھوپالی کے ہیں) اس مخصوص دانشور نے سوچ کے عکاس ہیں۔

۔۔۔ ہنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
۔۔۔ ہماری جان پہ دہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

آج کل ہم بھی پوری سنجیدگی سے دانشور بننے کی تگ و دو میں مصروف ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سمت میں ہماری پیش قدمی کو گھر میں پذیرائی نہیں مل رہی تو باہر کیا خاک ملے گی۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم اپنی سرگرم کوششوں سے دست بردار ہو جائیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ گھر میں تو سقراط کو بھی ”کھنڈرات“ سے زیادہ ہیبت حاصل نہیں تھی۔ اس کی بیوی سے پوچھا گیا کہ تُو نے اپنے شوہر کو زہر کیوں دیا تھا

کیا وہ بوڑھا تھا؟

کیا وہ بد صورت تھا؟

کیا وہ کمائی نہیں کرتا تھا؟

کیا وہ تیرے مذہبی عقائد کا مخالف تھا؟

کیا وہ شہرِ ایتھنز میں بد امنی پھیلا رہا تھا؟

سقراط کی بیوی نے جواب دیا کہ یہ سب ہو یا نہ ہو، لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سخت احمق تھا۔ ہر وقت فلسفہ ہی تراشتا رہتا تھا۔ کبھی مجھ پر مسکرایا نہیں۔ میرے لباس کی کبھی داد نہیں دی اور مجھے کہیں سیر و سیاحت کیے نہیں لے گیا۔ لیجئے، باتوں باتوں میں ہم نے اپنے ”مردانہ قارئین“ کو سقراط بننے کا ”فول پروف“ طریقہ بتا دیا ہے۔ یہ اتنا ہی ”فول پروف“ ہے جتنا ہمارے وزیریو اخلاص چوہدری ثار نے اسلام آباد کی سکیورٹی کو یقینی بنانے کیلئے اختیار کیا تھا۔ اب اگر

ڈسٹرکٹ کورٹ کی عدالت دہشت گردوں کی زد میں آگئی تو اس میں بے چارے چوہدری صاحب کا کیا قصور؟ انہیں تھوڑی پتا تھا کہ طالبان جتنے ہتھیار رکھے رکھے ہیں اتنے ہی اعتبار کے کچے ہیں۔ دونوں ”فوں پر فوں“ انتظامات کر کے بے فکر ہو گئے تھے۔ اس بات کا خیال نہ رہا کہ۔

جانے کب طوفان بنے اور رستہ رستہ بچھ جائے
 بند بنا کر ہو مت جانا دریا آخر دریا ہے
 (امید فاضلی)

ہماری ”دانشوری“ نے ہمیں سکھایا کہ ہر چیز کے مثبت پہلو پر نظر رکھو لیکن پریشان کن صورت حال کیسے بھی تیار رہو۔ ہمارے قنوطی دوست حضرت دلگیر ایک دن بہت دل گرفتہ حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا ”حضرت، کون سے مسائل تصوف زیر غور ہیں؟“ بولے ”عمر کا تیزی سے ختم ہوتا ہوا کوڑا۔ سوچتا ہوں دنیا سے سب ہی کچھ لے لیا ہے۔ بہت سے ہم جولی داغ مفارقت دے چکے ہیں۔ اب میں بھی اسی کشتی پر ہوں۔ آپ نے وہ شعر تو سنایا ہوگا۔

اگرچہ عمر بڑھتی جا رہی ہے
 مگر نظروں میں گھٹتے جا رہے ہیں“
 (رسا چغتائی)

”ایسا نہ کہیے“ ہم نے انہیں تسلی دی ”آپ کی بڑھتی ہوئی عمر میں بھی ایک خیر کا پہلو ہے۔“ ”وہ کیسے؟“ انہوں نے بے یقینی کی کیفیت میں سوال کیا۔ ”وہ ایسے“ ہم نے وضاحت کی ”کہ آپ لمحہ بہ لمحہ بوڑھے نہیں ہو رہے بلکہ ہر لمحہ موجود میں آپ آگے آنے والے لمحے کے مقابلے میں جوان تر ہوتے جا رہے ہیں۔“ ہم نے انہیں ایک نیکی کا واقعہ سنایا جو ناشتے کی میز پر اپنی ماں سے شکایت کر رہی تھی ”مائی یہ بڑی نا انصافی ہے۔ آپ رات کو مجھے یہ کہہ کر بستر پر جلد بھیج دیتی ہیں کہ میں ابھی چھوٹی ہوں، رات دیر تک جاگنا میرے لئے مناسب نہیں اور صبح یہ کہہ کر جلدی اٹھا دیتی ہیں کہ اب میری عمر صبح دیر تک سونے کی نہیں رہی۔“ انسان کی عمر بھی ع اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

نرگسیت (خود سے پیار) وہ دھوکا ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک خود فراموشی بھی زہر قاتل سے کم نہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر وہ دن یا مقصد و بامراد ہے جس میں آپ سے خلق خدا کو کچھ فیض پہنچے لیکن دل میں یہ خیال نہ ہو کہ جس کے ساتھ میں نے بھلائی کی ہے وہ بھی ایک نہ ایک دن میرے ساتھ بھلائی کرے گا۔ یہ طرز فکر تاجرانہ ہے۔ اگر آپ اس سے بچ گئے تو آپ کے فلاحی کاموں سے آپ کی روح کو کچی خوشی ملے گی جیسا کہ انور شہزاد نے کہا۔

کسی کے کام آؤ زندگی میں
 خوشی ہو گی کسی کے کام آ کے

ہم نے بعض پیشوں میں عظمت و تقدس کے تیل بونے لگا دیے ہیں جبکہ بعض کی ہماری نظر میں صرف اتنی اہمیت

ہے کہ لوگ ہمارے لئے کام کرتے ہیں، ہم انہیں اس کام کی اجرت دیتے ہیں۔ اول الذکر میں ڈکٹر، مدرس، انجینئر اور وکیل وغیرہ شامل ہیں حالانکہ یہ بھی ہمارے لئے، جرت کے عوض خدمات انجام دیتے ہیں۔ جو معاشرہ کسی پمپر کے کام کو حقیر گردانتا ہے اور فلسفی کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے اس میں نہ اچھے پمپر پیدا ہو سکتے ہیں نہ اچھے فلسفی۔ پولیس والوں کو عموماً تحقیر، تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے اگرچہ یہ ہماری جان و مال کو لاحق خطرات و خدشات اپنے سر لے کر ہمیں احساس تحفظ فراہم کرتے ہیں جو معاشرتی ترقی کی شرط اولین ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مسہم حقیقت ہے کہ پولیس اہلکار خود اپنی بے توقیری میں ”داسے، درے، قدے، غنے“ حصہ ڈال رہے ہیں۔ جن ملکوں میں پولیس اپنے فرائض عہدگی سے ادا کرتی ہے وہاں وہ شہریوں پر اپنی قانونی حیثیت و اہمیت ”نافذ“ کر سکتی ہے۔ کینیڈا میں قیام پذیر ایک دوست نے (جو اس ملک کے محکمہ محنت سے وابستہ ہیں) بتایا کہ ایک روز انہیں ایک فیکٹری کے معائنے کیلئے جانا تھا چونکہ فیکٹری کی پارکنگ فل تھی لہذا انہوں نے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے پر کھڑی کر دی۔ پھر انہوں نے ونڈ شیلڈ واپہر کے نیچے اپنا وزینگ کارڈ لکھ کر لگا دیا کہ "I am on Duty" (میں ڈیوٹی پر ہوں)۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ٹریفک سار جنٹ گاڑی کو غلط جگہ کھڑی دیکھ لے تو اسے میرے عہدے کا اندازہ بھی ہو جائے، ورنہ یہ علم بھی ہو جائے کہ میں سرکاری فرائض کی انجام دہی پر ہوں۔ موصوف جب واپس ہوئے تو ونڈ اسکرین پر چالان کا ٹکٹ لگا ہوا تھا جس پر تحریر تھی "I am also on Duty" (میں بھی ڈیوٹی پر ہوں)۔

سوچ کا ایک اور رنگ دیکھئے۔ ہر شخص ایک جیسے حارث و واقعات کا اثر اپنے مخصوص علمی، سماجی، معاشی اور اخلاقی پس منظر میں قبول کرتا ہے۔ یادش بخیر، ہمارے سکول کے زمانے میں یعنی آج سے لگ بھگ نصف صدی قبل ”اٹن ٹشٹریوں“ کا بڑا زور تھا۔ لوگ خوفزدہ بھی تھے اور متحسب بھی۔ ایک روز سب لڑکوں نے فیصلہ کیا کہ ہر استاد سے اس مسئلے پر رائے میں گئے کہ اٹن ٹشٹریاں کیا ہیں؟ ان میں سے کچھ آرا و ہندلی ی یادداشت میں محفوظ ہیں۔

سب سے پہلا پیریڈارد کا تھا۔ ہمارے، نیئر نے استاد سے درخواست کی ”سر، اٹن ٹشٹریوں کے بارے میں کچھ بتائیں۔“ ان کا کہنا تھا کہ ادب میں جو شے ایک تخیل لگتی ہے وہ ایک نہ ایک دن حقیقت بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ انہوں نے ہوائی جہاز کو انف لیمہ کے اٹن قالین کی ایک ترقی یافتہ شکل قرار دیا۔ ”یکسرے“ کی بنیاد انہوں نے غالب کے اس مصرعے پر رکھ دی کہ ”ع قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔“ غرض اس دور کی ہشتر ایجادات کا تعلق ادب میں پیش کئے گئے کسی نہ کسی نظریے سے جوڑ دیا۔ اس کے بعد حساب کا پیریڈ تھا۔ استاد نے جو، بر علم الاعداد بھی تھے مختلف مظاہر فطرت کا ریاضیاتی تجزیہ کر کے بتایا کہ اٹن ٹشٹری کائنات کے کروڑ ہا پوشیدہ رازوں میں سے ایک راز ہے جو خالق حقیقی نے ہم پر آشکار کیا ہے۔ اٹن ٹشٹری کو یک صفر سمجھئے (شکل) بھی وہ صفر سے مشابہ ہے۔ (فرق یہ ہے کہ صفر باقاعدہ ایجا ہوا تھا اور یہ زخود ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آئی ہے۔ پس، جس طرح صفر اپنی ایجا کے وقت مجر د تھا اور بعد ازاں اس کی مدد سے عدد کی قیمت بڑھتی رہی اس طرح اٹن ٹشٹریاں جو آج ایک منظر سے زیادہ کچھ نہیں مستقبل میں قدرت کے مزید رازوں کے افش کا پیش خیمہ ہو سکتی ہیں۔ سائنس کے استاد نے نہیں گیسوں کے اخراج اور اتصال کا

نتیجہ قرار دیا۔ جعفر فیہ کے استاد کے مطابق یہ ارضیاتی تبدیلیوں کے باعث نمودار ہوئی تھیں۔ وغیرہ۔

اس روز ہم نے کسی بھی استاد کو ان ٹشٹریوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات نہیں کرنے دی۔ ہر استاد نے پونے گھنٹے کی بھرپور تقریر کی۔ آخری پیریڈ دینیات کا تھا۔ مولوی صاحب جوں ہی کلاس میں وارد ہوئے سب لڑکے ان کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔ پھر ان کے بیٹھ جانے پر لڑکوں نے دوبارہ پٹی، پٹی، پٹی، پٹی سنجال لیں۔ اس مرتبہ پروگرام کے مطابق ہم کھڑے رہے۔ مولوی صاحب نے اپنے روایتی تند لہجے میں کہا ”کیوں، آج آپ پر کچھ زیادہ احترامی کیفیت طاری ہے؟“ ”یہ بات نہیں ہے سر“ ہم نے گزارش کی ”در اصل آج تمام کلاس کا آپ سے مطالبہ ہے کہ ان ٹشٹریوں کے بارے میں اپنے قیمتی نظریات سے آگاہ فرمائیں۔“ مولوی صاحب نے سرسری اور بات لپیٹ دینے والے انداز میں کہا ”میں، یہ سب قیامت کی نشانیں ہیں۔ تم لوگ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ اپنی اپنی کتابیں نکالو۔“



دیرآید.....

اُردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب ولہجہ

(تحقیقی و تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر نزہت عباسی)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

”اُردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب ولہجہ“ ڈاکٹر نزہت عباسی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں جناح یونیورسٹی برائے خواتین سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نزہت عباسی آج کل کراچی کے عبداللہ کالج برائے خواتین کراچی میں شعبہ اردو کی سربراہ کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ یہ تحقیقی مقالہ ”انجمن ترقی اردو کراچی“ سے حال ہی میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر نزہت عباسی چونکہ فکشن سے گہرا جگاؤ رکھتی تھیں اس لیے انہوں نے اپنی پسند کے موضوع کا انتخاب کیا۔ حاصی محنت کی، زیادہ سے زیادہ فکشنیاتی مواد کا مطالعہ کیا کوشش کی کہ تمام ہم افسانہ نگاروں اور ناویں نویسوں کی تحریروں سے استفادہ کیا جائے اور اپنے تحقیقی خاکے Synopsis کے لوازمات کو جامع شکل دی جائے تاکہ اس سے دیگر اسکالرز نہ صرف استفادہ کر سکیں بلکہ کتاب کے بطن سے پھوٹنے والی دیگر قیر در یافت شدہ جہات پر بھی تحقیقی مواد وجود میں آجائے۔ جہاں تک اس کتاب کے خاکے کا تعلق ہے تو عرض یہ کرنا ہے کہ انہوں نے حتیٰ اور مکان یہ کوشش کی کہ اس مقالے کو استوار کرنے کے لیے ابواب میں وہ نکات ضرور شامل کیے جائیں جو افسانوں اور ناویں میں نسائی سبجے کی بازیافت کر سکیں۔ یہ ابواب کچھ یوں ہیں:

باب اول میں اردو کے افسانوی ادب کا سیاسی و سماجی پس منظر۔ افسانوی ادب پر تشیل و داستان کے اثرات۔ باب دوم میں ابتدائی دور کے افسانوی ادب میں نسائی لب ولہجہ کے آثار۔ مردوں کے افسانوی ادب میں نسائی کردار اور لب ولہجہ۔ باب سوم میں افسانوی ادب میں خواتین کا حصہ، عصمت چغتائی اور ان کی ہم عصر خواتین فنکاروں کے ربان و بیان کا جائزہ۔ ”باب چہارم“ میں افسانوی ادب میں مردوں اور عورتوں کے لہجوں کا فرق و امتیاز (ناول و افسانہ) ”باب پنجم“ میں قیام پاکستان کے بعد افسانوی ادب (فکشن) اور مردانہ، نسائی لب ولہجہ (ہر صنف کے جائزے کے طور پر) ”باب ششم“ جو کما حقہ مہیہ ہے اس میں نسائی لب ولہجہ کا زبان و بیان میں حصہ۔

اگر ن نکات پر نگاہ ڈالیں تو انہیں اندازہ ہوگا کہ تشیل و داستان میں جونسائی لہجہ موجود ہے وہ بعد کے عہد میں بھی منتقل ہوا ہے اور وہ بھی تھوڑی بہت وسعت کے ساتھ۔ سی طرح ابتدائی ادوار کے سبجے کو بھی ہم بعد کے دور میں دیکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نزہت عباسی نے اچھا کیا کہ مردوں کے افسانوی ادب میں بھی نسائی لہجہ کا سراغ لگایا ہے تاکہ تقابلی مطالعے میں آسانی رہے اور وہ امتیازات واضح ہو سکیں جن کا یہ مقالہ مطالبہ کرتا ہے، جہاں تک ترقی پسند دور کا تعلق ہے اور عصمت چغتائی جیسی چٹخ رے دار زبان و بیان کی خالق کے نسائی سبجے کی شناخت میں حصہ۔ تو پتہ چلے گا کہ یہاں سے لہجہ توانا ہونا شروع ہوا اور وہ ایسی مثال قائم کر گیا کہ جس سے روگردانی کرنا ممکن نہیں۔ ویسے بھی روایت سے چھٹکارہ حاصل کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ چند خواتین فکشن نگاروں مثلاً خدیجہ مستور، خمدہ حسین، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر،

ہاجرہ سرور، الطاف فاطمہ وغیرہ کی قائم کردہ روایات نے نہ صرف دیگر خواتین فکشن نگاروں کو متاثر کیا ہوگا بلکہ مرد افسانہ نگاروں کے یہاں بھی اس لہجے کے فرق و امتیاز کے ساتھ جھمکیاں ہمیں نظر آتی ہوں گی۔ اب چونکہ تائیدیت کا زور بندھا ہوا ہے اس لیے نسائی لب و لہجہ پر بات کرنا از بس ضروری ہو گیا ہے۔ کچھ ادبی رسائل کے تنقیدی مضامین میں نسائی لب و لہجہ کی بارگشت سنائی دے رہی ہے۔ ڈاکٹر نزہت عباسی کا چونکہ یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اس لیے اس کو وسیع و عریض تحقیقی پیمانے پر برتا گیا ہے اور مذکورہ فن کاروں کے عدوہ شاعر عزیز بٹ، رضیہ فصیح احمد، واجدہ تبسم، زہدہ حنا، رشیدہ رضویہ گلنر آفرین، سائرہ ہاشمی، شہناز پروین کے افسانوی ادب کو کھنگالا گیا ہے اور مردوں میں ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، انور سجاد، اشفاق احمد وغیرہ کو زیر بحث لیا گیا ہے اور جس نقادوں کے تنقیدی و تحقیقی خیالات، فکر اور تجزیات کو حوالہ جاتی طور پر بنایا گیا ہے ان میں ڈاکٹر انوار احمد، عتیق احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، نذیر احمد، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نسیم فرزانه، ڈاکٹر ریحانہ خان وغیرہ شامل ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو ڈاکٹر نزہت عباسی نے اپنے اس مقالے کو حوالہ جاتی قدر کا حل بنانے کیلئے بہت زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ اس کا احساس ہمیں کتابت و روایات کی فہرست دیکھ کر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ افسانہ نگاروں کی اس مقالے میں شمولیت نہ ہوئی ہو اور کچھ نقادوں کی کتابوں اور مضامین سے استفادہ نہ کیا گیا ہو لیکن اس کے باوجود چھ سو بہتر صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں قابل ذکر مواد اپنی جگہ بنا گیا ہے۔ واضح رہے کہ فکشن کا مطالعہ کرنا اس سے حوالے اخذ کرنا، اس کی ترتیب اور پھر مقالہ نگاری اپنی آراء۔ یہ سب عمل خاص وقت طلب مراحل پر مشتمل ریاضت ہے جس میں خاصا وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر نزہت عباسی، بچے تئیں اس مقالے کو لکھنے اور پیش کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے اگلے ایڈیشن میں وہ ضروری قسم کے اضافوں کا اہتمام بھی کریں اس لیے کہ وقت کے سفر میں کچھ اور فن کار نئے نسائی لب و لہجہ کے ساتھ یقیناً منظر عام پر آئیں گے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اکثر مقالہ نگار اپنے تحقیقی کام کو آگے بڑھانے میں سائل سے کام لیتے ہیں، نئے فن کاروں اور تازہ رجحانات کا مطالعہ ترک کر دیتے ہیں۔ نئے ایڈیشن میں نہ صرف پرانی کیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے بلکہ تازہ مواد کے اضافے سے کتاب کے وقار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی کی رہنمائی میں اس مقالے کا خیر مقدم کیا جانا ضروری ہے۔

☆ ☆ ☆

پاکستانی زبانیں اور موجودہ تقاضے

ڈاکٹر عظمیٰ سلیم

پاکستان دنیا بھر میں اپنی ہمہ گیریت کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔ خواہ مختلف موسموں کا ذکر ہو۔ جغرافیائی تنوع کا، اس کی ذریعہ زمین سے اگنے والے پھلوں اور سبزیوں کے ذائقے کا، منفرد ثقافت کا یا پھر متنوع زبانوں کا، ہر لحاظ سے پاکستان ایک قابل توجہ خطہ ہے۔ دنیا بھر میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں، اس کے باوجود پاکستان لسانی اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ دنیا بھر کے محققین پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب سے متعلق اپنی دس چھٹی کا وقت تو مٹا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسبتاً ایک چھوٹا خطہ ہونے کے باوجود زبانوں کے اعتبار سے اس میں وسیع و راکھی موجود ہے۔ مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو ان زبانوں کے تین مدارج ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ انگریزی جو مختلف اداروں، محکموں، ذریعہ تعلیم اور ایک مخصوص طبقے کی جد تک اپنا حاکم تسلط

بجائے ہوئے ہے۔

۲۔ اردو جو پاکستان کی قومی زبان قرار دی گئی و قومی وحدت کی علامت اور رابطے کی زبان کی

حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ پاکستان کی دیگر تمام زبانیں جو نسلی اور ثقافتی تشخص کی علامت ہیں۔ مختلف علاقوں میں بسنے والی اقوام اپنی شناخت کی غرض سے ان زبانوں کا سہارا لیتی ہیں اور یہ ان کی بڑی پہچان ہیں۔

زیر نظر مضمون میں انہی پاکستانی (یا علاقائی) زبانوں کی ہیئت، زبانوں کے جدید رجحانات کی روشنی میں جانچی جائے گی۔

لسانیات کے مسلمہ اصولوں کی جانب نگاہ دوڑائی جائے تو زبان اور بولی کا دائرہ قدیم زمانوں سے مختلف زبانوں کی تشکیلات میں اہم کردار ادا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ زبان میں ٹوٹنے اور بکھرنے کے عمل سے گزرتی ہیں اور بار بار گزرتی ہیں۔ شوکت ہزاروی کے مطابق

زبان خلا میں پیدا نہیں ہوتی، زبان کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔^(۱)

ہر زبان اپنی مکمل تشکیل سے قبل مختلف لہجوں اور بولیوں میں بنی ہوتی ہے۔ انہی بولیوں میں سے کچھ توانائی پا کر ایک مستحکم درجہ اختیار کر لیتی ہیں اور آخر کار ایک نظام کے تحت زبان کے درجے پر جا پہنچتی ہیں۔ جہاں وہ زبان اپنے اصول و ضوابط اور قواعد مقرر کرتی ہے اور تحریری حیثیت پاتی و ادب کی تخلیق کے فرائض انجام دیتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد، یہ زبان کے مزید حصے بنتے اور ان سے مختلف بھجے اور بولیاں تشکیل پاتی ہیں اور ایک نئی زبان کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی مثال خواہ ہم ایک تنے سے وابستہ ٹہنیوں اور شاخوں کے ساتھ پھول پتوں کے ذریعے دیں، خواہ ایک دریا کے ساتھ جڑنے والے ندی نالوں سے، جو اپنا پانی بڑے دریا میں شامل کرتے اور پھر اس دریا سے کچھ ندی نالے بننے کے عمل سے،^(۲) دراصل زبانوں کی اسی ٹوٹ پھوٹ میں ہی زبانوں کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ جامد زبان کبھی ترقی

نہیں کر سکتی۔

پاکستان کے سانی منظر نامے پر غور کیا جائے تو اس کا پس منظر مختلف النوع ثقافتی منظر نامہ ہے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں جو اقوام بستی ہیں، ان میں سے ہر ایک کی ایک منفرد ثقافت ہے۔ اور اس ثقافت سے جڑی، ایک ایک مخصوص زبان بھی۔ ان تمام اقوام کے درمیان اردو رابطے کی ضرورت کو پورا ضرور کرتی ہے۔ جسے اردو کی مقبولیت اور ناگزیر وسیلے کے طور پر ایک دلیل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن پنجاب میں پنجابی کے ساتھ ساتھ سرائیکی اور پوٹھوہاری، سندھ میں سندھی، خیبر پختونخوا میں پشتو، بلوچستان میں بلوچی اور براہوی، اور گلگت بلتستان میں بلتھی، شینا اور بروشسکی، بڑے پیمانے پر کجھی، بولی اور لکھئی جاری ہیں۔ اور یہ ان تمام اقوام کی ایک ناگزیر ضرورت ہیں۔ یہ ضرورت ان کے تاریخی ورثے کی حفاظت ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول

زبان یک سماج میں، ایک معاشرے میں تاریخی ضرورتوں سے عمل میں آتی ہے۔ (۳)

اس لحاظ سے دنیا کے کسی خطے میں لسانی سماج کی تشکیل میں زبانوں کی ہمیت ناگزیر ہے۔ اس اصول کے تحت پاکستان میں موجود لسانی نظام کا جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر علم ہوتا ہے کہ یہاں سماج و زبان مل کر ایک سماج کی تشکیل کرتے ہیں، اور یہ اس معاشرے کی اولین ضرورت ہے۔ اس تشکیل میں لسانی لین دین اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یاد رہے کہ لسانی لین دین کا یہ اصول نہ صرف بین الاقوامی، بلکہ قومی اور علاقائی زبانوں کے لیے بھی پسندیدہ ہے۔

درج بالا منتخب جائزے کے لیے پاکستان کی نمائندہ چند زبانوں کا ذکر کیا گیا لیکن لسانی صورت حال محض ان زبانوں تک ہی محدود نہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں کل تیس سے زائد زبانیں اور ان کے چالیس سے زائد لہجے موجود ہیں۔ (۴) اور ان میں سے بیشتر اب بول چال کے مرحلے سے آگے نکل گئے ہیں۔ سروے آف پاکستان اور یڈیو کی نشریات کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر عطش درانی ان زبانوں کی تعداد اٹھارہ قرار دیتے ہیں، جن میں بروشسکی، شینا، ہتھی، چترالی، کافرہ، کوہستانی، پشتو، ہمدکو، پہاڑی، کشمیری، پوٹھوہاری، گوجری، پنجابی، سریکی، بلوچی، براہوی، سندھی، گجراتی شامل ہیں۔ (۵) اور اس کی دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ چونکہ میڈیا نے ان زبانوں میں پروگراموں کا آغاز کر رکھا ہے، لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان میں موجود ہے۔ اس دلیل کے پس منظر پر غور کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ ایک ہی زبان کے مختلف لہجوں نے آگے جا کے نئی زبانوں کی شکل اختیار کی ہے۔ مثلاً پنجابی کا پوٹھوہاری اور پہاڑی یا ہندکو سے تعلق۔ یا پھر بلوچی اور براہوی کا تعلق۔ اسی طرح شینا اور کوہستانی کا آپسی تعلق۔ یہ تمام تر تعلقات مختلف اقوام کے شخص اور پہچان کے حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعلقات کے نتیجے میں ترقی بھی کر رہے ہیں۔

اب موجودہ صورت حال کا مطالعہ آج کی گلوبل دنیا کے تناظر میں کیا جائے تو شخصی آزادی اور ثقافت و شخص سے مخصوص حق سے محرومی کسی شخص کو بھی گوارا نہیں، چہ جائیکہ ایک قوم یا قبیلہ اس سے دستبردار ہو جائے۔ ہذا ثقافت، نسل اور شخص کی پہچان کے ذریعہ کے طور پر اپنائی جانے والی زبانوں کو توجہ دینا وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔ اور یہ بے جا تقاضا نہیں، اس کی باقاعدہ مختلف توجہات موجود ہیں۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں

۱۔ پاکستان کی مختلف علاقائی زبانوں نے اپنے حروف تہجی ترتیب دینے کے بعد صرف انہو اور قواعد کی ترتیب کا مرحلہ مکمل کر لیا ہے جو زبانوں کا مرتبہ متعین کرنے کے سلسلے میں اہم قرار دیا جاتا ہے لہذا سہولیات کے عالمی

اصول کے عین مطابق ان زبانوں کے درجات متعین ہونا ضروری ہیں۔

۲۔ پاکستانی زبانوں کے تعلق نے، سب محدودیت کے دائرے سے نکل کر روابط کے ایک واضح رجحان کی شکل اختیار کر لی ہے، جس کے نتیجے میں یہ زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اور یہی اثر اندازی ان کو بڑھادے کر ترقی کی جانب لے جا رہی ہے۔ تمام دنیا میں زبانوں کے مابین یہ ربط خوشگوار سمجھا جاتا ہے۔ جی لانا اس ضمن میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

زبانوں کے باہمی اثرات کا دوسرا کارن قوموں اور ہادیوں کا میل جول ہے۔ جب بھی کسی ایسے ملک میں دو زبانیں رائج ہو جاتی ہیں، جہاں ایک ہی سیاسی نظام رائج ہوتا ہے، تو دونوں زبانیں باہمی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو کچھ دیتی اور ایک دوسرے سے کچھ حاصل کر لیتی ہیں۔ (۶)

پاکستان میں تو دو سے کہیں زیادہ زبانیں موجود ہیں اور مختلف علاقوں میں رائج بھی۔ لہذا ان کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا لازمی امر ہے۔ یہ صورت حال ان زبانوں کی وسعت کی عکاس ہے، زبانوں کی وسعت کے اس رجحان کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔

۳۔ درج بالا وسعت کے نتیجے میں پاکستانی زبانوں میں جو ادب تخلیق پارہا ہے، وہ ادب کے مختلف وضعیات کو اپنے اندر سمورہا ہے۔ ان زبانوں میں تخلیق شدہ ادب میں موجود مقامی اور عالمی مسائل کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔

۴۔ قومی اور بین الاقوامی ادب سے تعلق کے نتیجے میں ادب کی مختلف اصناف کا لین دین بھی زبانوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ مثلاً علاقائی زبانوں میں نہ صرف افسانے، انشائیے اور ڈرامے جیسی اصناف کو مقبولیت مل رہی ہے بلکہ شاعری کی مختلف صناف کو بھی متعارف کرایا جا رہا ہے۔ ہائیکو جیسی نئی صنف میں علاقائی زبانوں میں سیاسی حالات کا بیان بھی موجود ہے۔ جو ایک دل چسپ مخلوط لسانی سماج کی خوب صورت تصویر پیش کرتا ہے۔

۵۔ درج بالا حقائق کی روشنی میں پاکستانی زبانوں میں ترقی کی واضح طور پر گنجائش موجود ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ان زبانوں کا درجہ متعین کر کے ان کا رشتہ قومی زبان اردو سے جوڑ جائے۔ اور اسی قومی زبان کے ذریعے نہیں ایک ثقافتی وحدت میں پرویا جائے۔ تاکہ یہ ثقافتی وحدت، پی پوری توانائی سمیت عالمی سانی منظر نامے کی توجہ کا مرکز بن سکے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آج اردو کو قومی اور ثقافتی وحدت ٹھہرایا گیا ہے۔ جب تک اردو مختلف ثقافتوں سے اپنا رشتہ استوار نہیں کرے گی، اس میں ثقافتی وحدت کی شان کیسے پیدا ہوگی؟ یہی وہ فریضہ ہے جو اردو اور پاکستانی زبانوں میں مضبوط ثقافتی رشتے قائم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں، دنیا کی ہر قومی زبان اپنی ترقی کے لیے دوسری موجود علاقائی زبانوں اور بولیوں سے استفادہ کرتی ہے۔ اس امر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ اردو کی وسعت کا پاکستانی زبانوں کا کیا کردار ہے؟ کیونکہ اردو مزاجا دوسری زبانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند کرتی ہے۔ اپنی تشکیل میں س نے قبل ازیں عربی، فارسی، ہندی اور ترکی سے استفادہ کیا ہے، اور اب اس استفادے کی ایک شکل پنجابی، سرائیکی، سندھی، پوچی، پشتو، برہوشکی، شین اور ہٹی کے الفاظ کی ہو سکتی ہے۔ اہل ذاکر عطش درانی

اردو کو جب ضرورت ہوتی ہے، یہ دیگر زبانوں سے الفاظ مستعار لے لیتی ہے۔ (۶)

اب اردو کو اپنی ثقافتی وحدت والی حیثیت متعین کرنے کے لیے مقامی زبانوں کے الفاظ کی ضرورت ہے تاکہ یہ ایک مکمل نمائندہ زبان کا کردار ادا کر سکے، اور ہم خواہ تسلیم نہ کریں، یہ عمل اردو زبان میں شروع ہے۔ ہمارے آنکھیں بند کر پینے سے رک نہیں جائے گا۔

اس ضمن میں دنیا کی مختلف زبانوں کا جائزہ لیا جائے ہم بات سانی یہ نتیجہ خذ کر سکتے ہیں کہ زبانیں تقویت پا کر علاقائی سے قومی اور پھر بین الاقوامی سطح پر مستعمل ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر عطش درانی کا موقف اس بارے میں درست سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

بعض مقامی و علاقائی بولیاں مقامی سطح سے بڑھ کر جب دوسرے علاقوں میں بھی اثر انداز ہونے لگتی ہیں تو انہیں مشترکہ قومی خصوصیت ظاہر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔۔۔ ہر قومی زبان کی تشکیل اور ترقی کے لیے جہاں ان کے سابقہ ذخیرہ ادبیات اور موجودہ علاقائی زبانوں اور بولیوں سے استفادے کی ضرورت ہوتی ہے، وہیں انہیں ابدانیت، سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ضروریات کے لیے جدید ترقی یافتہ زبانوں سے خوشہ چینی اور تکنیکی ترقی کے پہلوؤں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (۷)

پاکستان کی مختلف زبانوں کے تعمیر کردار کو اچا گر کرنے کے لیے اب ہمیں تعصب کی عینک اتار کر ان زبانوں کی جانب توجہ کرنی ہوگی، تاکہ ہم ایک مناسب لسانی سماج کی ایک ایسی تعمیر کر سکیں، جس میں پاکستان میں بسنے والی تمام اقوام کا مناسب حصہ نظر آئے اور اردو ان سب کی نمائندہ زبان ہو اور ایک سرپرست کی صورت میں ان کے ساتھ ہمیشہ موجود رہے۔ یہی پاکستان کے سانی منظر نامے کا بنیادی تقاضا ہے بقیہ تمام تقاضے اس کے ساتھ جڑے ہیں اور یہی اس کا ممکنہ اور خوب صورت مستقبل، جس کی جانب سنجیدگی سے توجہ کی ضرورت ہے۔

☆.....☆.....☆

ہوا میں گرہ

حیام قیوم

صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اردو زبان میں شاعرات کا نقد و بدعت قائم و دائم ہے۔ شاعری مرد کی میراث بن گئی اور عورت متکلف شغف سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہی ایک ایسا شعبہ ہے جس میں خواتین نے دانستہ ترقی نہیں کی۔ یہ بعید از قیاس ہے کہ خواتین نے اس شگفتگی پر کس طرح اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ حالانکہ عورت کے غیر میں یہ بات گندمی ہوئی ہے کہ وہ شگفتگی کی لوحِ تربت کو آخری دم تک پوچھتی ہے۔ وہ بظاہر تو ہار مان لیتی ہے لیکن اس بات کو تسلیم کبھی نہیں کرتی۔ نئی داغ کہ ایسے کونسے عواطف ہیں جن کی بدوست شاعری کا سہر مردوں کے سر بندھ گیا اور وہ زور و شور سے ترقی فرمانے لگے اور خواتین نے بہت کریم انفسی سے خاموشی اختیار کر لی۔ اس طرح شاعرات کی تعداد شعراء کی نسبت نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔ سیاست پر نظر دوڑاؤ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ہی تصویر کے در رخ ہیں۔ سیاست میں رنج فیوڈل لارڈ کا ہوتا ہے اسی طرح شاعری بھی مردوں کے حصے میں آنے کے بعد چند حضرات کی اجارہ داری کی مہر اس پر ثبت ہو گئی اور وہ شاعری کے گاؤں درہوائے وراکی چھتر چھاؤں میں فطین کے ساتھ کین بھی پٹے لگے۔ شعراء میں بھی بہت سے دھڑے بن گئے کچھ شعراء غزل کے شاعر کہلائے کچھ نے آزاد اور نثری شاعری میں لٹیا ڈبوئی اور چند نے گیت لکھے اور چند فلمی گانے لکھ کر کوچ کر گئے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک لفظ کا بوجھ بھی نہ ٹھہر سکا لیکن شاعر کہو یا۔ حیرت آفریں بات یہ ہے کہ معیار کے لحاظ سے اس گروہ بندی میں بھی شاعرات نا پید رہیں۔ اور نظر بھی آئیں تو ایک دہائی میں ایک شاعرہ، اور یہ ایسی شاعرہ ہوتی جو تخیل اور غلط کا تار و پود کچھ یوں بنتی کہ پڑھے والا اس تخیل تک خود پہنچ جاتا۔

تعداد کے لحاظ سے سیاست اور شاعر میں نجی نے کیوں بے انتہا مماثلت ہے۔ سینٹ کے اجداس میں مردوں کے جہوم میں اکا دکا خاتون کا سر نظر آ رہا ہوتا ہے۔ یہاں خواتین کا ایک خاص قبیضہ نت نئے فیشن، بھاری وجود، بڑے بڑے ایپورنڈ ہینڈ بیگ، اونچی اینٹھی، بے تحاشا لپ اسٹک تھوپے ملک میں انقلاب لانے کے وجدان سے زیادہ فقدان میں نظر آتی ہیں۔ یہ اکا دکا اندھی بہری گوئی خاتون جس کا جینی ارتقاء سے کوئی اتھارہ رشتہ بھی نہیں ہوتا جو خود اپنی قسمت سنوارنے کے لیے دوسروں کا کاندھا استعمال کرتی ہے۔ جو خود طاسب استمداد ہو اس سے انقلاب کی امید کوئی نامعقول ہی کر سکتا ہے۔ یہ قبیلہ جو سیاسی جوتوز کا آسہ کار کا کردار ادا کرتا ہے نیلی وژن پر آ کر اپنے سیاسی رہنماؤں کی ایسی صفات بیان کرتا ہے جو بیڈ ران میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ اس قبیلے کی اپنی کوئی سوچ اور زبان نہیں ہوتی۔ جو پڑھا دیا جاتا ہے وہی بول دیا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ پنا آپ اسی طرح منوا کر شاد ہو جاتا ہے۔ سیاست کی طرح شاعری میں بھی خواتین نے گونگے کا گڑ کھایا ہو ہے۔ یہاں خواتین یا تو تماشا ٹی ہیں یا پھر خود تماشا۔ برصغیر پاک و ہند میں خواتین بہت عرصے تک تنہا کامیاب ناچتی رہی ہیں۔ خواتین کو نصیب آتی اور معاشرتی قواعد و ضوابط کی رنجیروں نے صدیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں خاتون کا تحریر کردہ لفظ بس اوقات اس کے سنگسار کا سامان بن جاتا تھا۔ ملک بدلا، وقت بدلا، رہن سہن بدلا، لباس بدلا، تھکنے بھی بدل گئے لیکن ذہن نہیں بدلا۔ ذہن آج بھی کہنہ صدیوں کی دیواروں میں چننا ہوا ہے۔ سی سی بیسیوں

شعراء کے درمیان دوش عرات، تخیل کی بندی سے ناہد، صرف اپنے دکھوں پر آنسو بہاتی، مردوں کی بیوہائی کا گلہ کرتی، رمانے کی بے اعتنائی پر بین کرتی، لفظوں سے کھیلتی اور بہرہ دیاں سمیٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور شاعر حضرات مرہم بر کفر رکھتے ہیں۔ جہاں زخم رسنے لگا، وہیں سر کے بل ٹھیب حاضری۔

اور اس طرح وہ ”رختی عورت“ دنیا کی حسین ترین عورت کا خطاب حاصل کر لیتی ہے۔ یعنی سیم کی انارکلی یا پھر میزہ کی قلو پٹھرہ اور وقت آنے پر شاعرہ بھی کہلا سکتی ہے۔

مردوں کے مطابق دنیا میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی شرح میں دگنا اضافہ ہو ہے۔ اور ۲۰۲۰ میں یہ اضافہ سہ چند ہو جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تعداد میں گنا بڑھ گئی تو کیا مرد حضرات تمام شعبہ ہائے زندگی سے دستبردار ہو جائیں گے۔ یعنی شاعری کے اس پر بھی شاعرات کا راج۔ خود ہی مرکز اور از خود ہی مدد۔ مختلف مکاتب ہائے فکر کے مطابق خواتین نے شاعری میں اپنا آپ منوانے میں بہت کامیابی سے کام لیا۔ جن خواتین کو گاؤں و دیہات کی چھتر چھاؤں مل گئی وہ شاعری کا چھلکا سا غریب گئیں اور باقی نے نفی سے دلبرداشتہ ہو کر خاموشی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دوسرا مکتبہ فکر یہ کہتا ہے چونکہ خواتین میں چاہے جانے کا عنصر مردوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اور اسی خواہش نے خواتین کو جامع اور عمیق شاعرات بننے نہیں دیا۔ وہ شعراء کی نگاہ کا مرکز تو بن گئیں لیکن خود اس صنف سے محروم ہو گئیں۔

حاصل بحث یہ کہ مرد حضرات نے معاشرے میں ہمیشہ غالبانہ اور غاصبانہ رویہ رکھا۔ اور یہ تفریق شاعری میں بھی چھلکتی ہے۔ انہیں آزادانہ پھرنے، دس بارہ عشق کرنے اور ایک سرے کی نگاہ رکھنے کا پورا اختیار اور حق حاصل ہے اسی وجہ سے ان کا مشاہدہ، جواب اور تخیل با کمال ہوتا ہے۔ دوسری طرف شاعرات شاعری میں ایک ہی عشق کی لکیر پھینکتی نظر آتی ہیں۔ الفاظ کا چٹاؤ بھی اس طرح سے کرتی ہیں۔ جس سے بے وفائی کا شبہ تک نہ ہو۔ اپنی یاد فانی کا وصف اور بار بار ہونے کا سرٹیفکیٹ شاعری میں بھی سجاتی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے دوسرے عشق کو بیان کرنا گنہ کبیرہ سمجھتی ہیں۔ دراصل نفسیاتی طور پر خواتین ابھی تک صدیوں پرانی جکڑن اپنے ذہن سے نہیں نکال سکیں۔ اب آزادانہ رویہ اس کا وصف نہیں رہا۔

اس لیے آج بھی سہارے ڈھونڈتی نظر آتی ہیں۔ کسی چھتر چھاؤں میں ٹھننا کسی پناہ کے سائے میں لکھنا اور پیچن بنانا، شاعرات کا مزاج بن گیا ہے۔ اور شعر نے بھی اس بے یقینی کا خوب فائدہ اٹھایا۔

میرے خیال میں عورت ابھی تک اپنے ہی حسن و جمال سے آرزو نہیں ہو سکی۔ زکسیت اس کا مزاج بن چکا ہے۔ وہ صدیوں کی محرومی کو اس طرح پورا کر رہی ہے کہ کوئی اس کے لہجہ، زلفوں، اور خال و خد پر اپنے غلط پنچاؤں کو تار ہے اور وہ مرکز نگاہ بنی رہے دوسری بات یہ کہ توجہ حاصل کرنے کے لیے شاعرات نے اپنی تصانیف اور شاعری میں جنسیت کو بھی موضوع بنایا اور ادنیٰ کا آرٹ کی طرح اسے خوب استعمال کیا اس کے دو فائدے ہوئے۔ پہلا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ایک بہادر، معاشرے سے ٹکر لینے والی، عمیق مشاہدے کی روشن خیال شاعرات گردانی جانے لگیں اور دوسرے یہ کہ مردوں کی دنیا میں انہیں بے اعتبار پذیر کی گئی۔ کیوں کہ جو مرد سننا چاہتا ہے وہ انہوں نے اسے سنا دیا، اور داد پائی لیکس کسی جرات بہت کم کرنے کی۔ اور جو شاعرات باقی بچ گئیں۔ انہوں نے یا تو شاعری چھوڑ دی یا پھر ایک آدھ کتاب سے آگے نہ بڑھ سکیں اور نہ ہی پذیرائی ان کے حصے میں آئی۔

شاعرات کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو تنہا جاں جو کھوں میں ڈال کر نہایت خلوص کیساتھ مسلسل مشق کرتی رہیں اور اپنے تخیل کو لفظ میں پردہ نہیں دیتی، بصدافسوس جنہیں یہ مدد کہ اس آدھ مثل حساب ٹھیکس انہیں قضا نے آں بیا پھر نہیں

بائیس سال بعد از خود شاعری چھوڑ کر پتھر ویدی بن گئیں۔

شاعری کا المیہ یہ ہے کہ اس میں کہیں کوئی ڈگری یا سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کر سکتا ناں ہی اسکا کوئی اسکول ہے، یہ علم لدنی ہے جو کسی مشق سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے بغیر استاد کے حاصل ہوتا ہے، یہ نہ تو دراست ہے اور نہ ہی ودیعت۔ میری رائے کے مطابق شاعری ایک دنیا کے کمال و معجزات ہے، شاعر بنایا نہیں جاسکتا، یہ پیشہ نہیں جو اختیار کر لیا جائے، شاعری ہنر نہیں، گھر نہیں، جو چند دن جوتیاں چٹائی چٹائی سے حاصل ہو جائے، شاعری کی نہیں جاتی بلکہ اس کا مزاج عشق جیسا ہے۔ جس طرح عشق خاص لمحے میں، خاص تعداد کے ساتھ اور خاص ذہنی کیفیت میں ہوتا ہے اسی طرح شاعری کا عمل بہائی ہے، جیسے عشق کے لیے لوگ جن لیے جاتے ہیں اسی طرح شاعری بھی چند ہی کے نصیب میں لکھی جاتی ہے، اور جس کا یہ طابع خوبیدہ جاگ جائے، وہاں تاحیات وجد طاری رہتا ہے، اس کے تعلق کی دنیا، ورائی ہے، یعنی تخیل، اس پر کمال یہ کہ تخیل خود ایک کائنات ہے، لامحدود کائنات، ہر ذہن کا تخیل مختلف ہوتا ہے اور ہر ذہن کے تخیل کی اڑن بھی مختلف ہوتی ہے، تخیل کو الفاظ کی قشوں میں تراشنا، پھر انہی لفظوں میں آمد کی دنیا کشید کرنا اور مشق مسلسل سے متواتر شعر کی شکل نکالنا قصداً ہی نہیں، اور نہ ہی یہ وہ حواسی کام ہر ایک کے بس میں جاسکتا، اس موقع پر استدہائی رہنمائی اشد ضروری ہے، غرضیکہ یہ گل شب افروز صرف شائق کی جھولی میں گرتا ہے۔

موجودہ دور کا جائزہ یہ جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دور لو نے ہر صنف و فن کی بنیت ہی بدل ڈالی۔ یعنی شاعرہ، مستور کم اور منظور زیادہ لگتے لگی، ناں تخیل ناں استاد، ناں گاؤں در ناں الفاظ اور ناں ہی پیشتر ناں سوچ ناں معیار، پھر بھی ہر لفظ شائع سو رہا ہے۔ دراصل ہر گام پر شعراء کا ہجوم بیکراں آنکھوں کو چندھی رہا ہے اور ہر جاہلیں بائیں کرتا، درو دیوار پر نوشتے لکھ کر شور و غوغا سے اپنا آپ منوار رہا ہے، نئے دور کی کرامت یعنی سوشل میڈیا پر بے وزن و بے ربط، منتشر خیال اشعار پر داد وصول کرنے والی یہ رائیاں اور مہاراجے بکھنہ مشقی، تخیل لم یزل اور بھوکے کی سر سے گریزاں، شاعری کے خن کو کچلتے جا رہے ہیں۔ اس تخلیقی عمل کی اس سے زیادہ تضحیک اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہر فرد پہلے ایک شعر کہتا ہے اور ایک ہی سال میں دس بارہ کتابیں لکھ ڈالتا ہے ہر کتاب پہلی کتاب کی دوسری قسط لگتی ہے۔ اور سوشل میڈیا پر ہی فروخت بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی شاعری نہ ہوئی بندر یا کی ڈگڈگی ہو گئی۔

وہ دن دور نہیں جب شعراء و شاعرات یا وہ خواتین جو شاعری کی طرف دل سے راغب ہیں، تمام تر سوانگلوں سے تنگ آ کر اس فن میں طبع آزمائی کے بجائے کسی دوسرے فن یا کو ہنا کر معاشرے میں مقام پیدا کریں گی۔ یعنی کمال و معجزات کے جاری سوتوں پر حد لگ جائے گی اور یہ فن بدل جائے گا اور اس کے اظہار کا ذریعہ بھی بدل جائے گا۔ وہ اچھی بیوی کا کردار نبھائیں گی یا بوتیک کا کام شروع کر دیں گی یا اچھی معطلہ بن جائیں گی، یا پھر کسی این جی او کی مالک بن کر قوم اور ملک کی تقدیر سنواریں گی، یا پھر گجرا، پازیب، کھالکی سے اسٹیج کی زینت بنیں گی، یا اپنی نخر و ملی انگلیوں سے کیبنس پر بیکریں کھینچتی رہیں گی، یا پھر خود کشی کی تھاپ پر ناتج تاج کر ہوا میں گرہ لگاتی رہیں گی۔

☆.....☆.....☆

نکتہ ور

(غفنفر ہاشمی)

سلمان باسط

مجھے خوشی ہے آج میں جس شخص کا خاکہ پیش کر رہا ہوں وہ ایک نکتہ ور شخص ہے۔ آپ مجھ سے اختلاف کریں نہیں سکتے۔ یقین نہیں آتا تو غفنفر کے اوپر پڑے ہوئے چار نکتوں کو غور سے پڑھ لیجیے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ غفنفر کا تمام خاندان ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہے۔

غفنفر چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے مگر نکتہ وری میں سب سے آگے ہے۔ ذرا غور کیجیے سب سے بڑے بھائی منور میں ایک نکتہ، پھر مظفر میں دو نکتے، خیر میں تین نکتے اور ہمارے شیر غفنفر میں چار نکتے ہیں۔ ویسے ان کے والد محترم نے یہ دس نکات پیش کر کے شیخ مجیب الرحمن کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ غفنفر کی نکتہ وری کے بارے میں آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔

میں نے جو غفنفر کو شیر کہا ہے تو اس کی وجہ بھی اس کا نام ہے جس کے معنی ہی شیر کے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غفنفر ہاشمی کا سرکاری کاغذات میں جو نام درج ہے وہ غفنفر شاہ ہے۔ دوسرے انقاط میں ہم اسے شیر شاہ بھی کہہ سکتے ہیں حالانکہ جی ٹی روڈ سے اس کا تناہی تعلق ہے کہ وہ اس پر تعداد دفعہ سفر کر چکا ہے۔ شیر شاہ اصل میں اس کے دادا محترم کا نام تھا۔ اب شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ غفنفر نکتہ وری نہیں نکتہ رس بھی ہے۔

راوی کا بیان ہے (اور یہ راوی غفنفر کے علاوہ اور کوئی نہیں بہذا دروغ برگردن راوی) کہ جب غفنفر پیدا ہوا تو دادا محترم نے پہلی نظر اسے ہی کہا کہ یہ بچہ بہت شہرت پائے گا۔ آج جب اس کی شہرت چہار جانب پھیل رہی ہے تو اس کے عابد و اہل دادا کی بات کا یقین سا ہونے لگتا ہے۔

راوی کا ایک اور بیان بھی ہے کہ وہ دس ستمبر 1966 کو پیدا ہوا۔ اس کے آبائی قبے کا نام قبول ہے جو دراصل ہماری بھ بھی کا نام ہونا چاہیے تھا جنہوں نے کمال ہمت سے ایک قابل شخص اور مقبول شاعر کو قبول کر رکھا ہے۔ غفنفر ہاشمی اونڈراوین ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں حصول تعلیم کے دوران وہ کالج کے شہرہ آفاق مجھے راوی کی مجلس ادرت کے ساتھ بھی مسلک رہا اور نیو ہاسٹل کے پرنسپل کی ادارت بھی کرتا رہا۔

غفنفر ہاشمی کا ذریعہ معاش پبلک ریلیشننگ ہے۔ وہ سال بزنس کے محکمے میں پبلک ریلیشنز مینیجر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ریلیشننگ میں پبلک کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور وہ ریلیشننگ ریلیشننگ کہلاتا ہوا بہت آگے نکل جاتا ہے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ مجھ میں اور غفنفر میں بہت سی باتیں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً "ہم

دونوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پروردہ ہیں۔ میں راوی کا ایڈیٹر رہا اور وہ بھی راوی سے منسلک رہا۔ گورنمنٹ کالج کے نیو ہاسٹل کے کمرہ نمبر 215 میں وہ بھی مقیم رہا اور میں نے بھی چند روز اس میں قیام کیا۔ اس کے بیٹے کا نام بھی فاران ہے اور یہی نام میرے بیٹے کا بھی ہے۔ مجھے بھی غففر کی طرح بارش اور سردی پسند ہے۔ وہ شاعر اور کام نگار ہے اور میں بھی ”پھول پھول“ بنانے کے چکر میں یہ دونوں کام کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں غففر ہاشمی نہیں بن سکتا کیونکہ غففر ہاشمی بننا بہت مشکل کام ہے۔ واقعتاً حال جانتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔

غففر ہاشمی کی شہرت کی ایک وجہ پی ٹی وی کے مختلف پروگراموں میں اس کی کمپیننگ بھی ہے۔ یوں تو وہ بڑی جاندار کمپیننگ کرتا ہے مگر ایسے مواقع پر وہ ہمیشہ سیاہ دھاری دار شرٹ جانے کیوں زیب تن کر لیتا ہے۔ عوام انسان کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہوئے وہ اکثر اسی شرٹ کا اہتمام کرتا ہے۔ ثبوت کے طور پر اس کے شعری مجموعے کے بیک ٹائٹل پر اس کی تصویر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ وہی دھاری دار شرٹ پہنے، ہاتھ میں سرخ پینسل تھامے، ماتھے پر تیوری چڑھائے وہ بظاہر کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔۔۔ یہ تیوری صرف تصویر میں ہی نہیں، وہ کچھ بھی لکھتے وقت، سوچتے وقت یا معزز اور دانشور نظر آنے کی کوشش میں اسی طرح، ماتھے پر تیوری چڑھالیتا ہے۔

”محبت خواب ہے“ اس کی شاعری کا اولین مجموعہ ہے۔ کتاب کے ٹائٹل پر لفظ ”محبت“ کی ”م“ پر بڑی ہوئی ”پیش“ کی واحد توجیہ میری سمجھ میں یہی آتی ہے کہ یہ سب خطے پوٹھوہار میں طویل قیام کے اثرات ہیں۔ اب اگر غففر نے بھی محبت کو ”محبت“ لکھ ہی دیا ہے تو جوں چاہ کس بات کی۔۔۔ ایسے مجھے تو یہ کمپوزر کا کمال دکھائی دیتا ہے۔ یوں بھی کتاب پر ”دوست“ جلی جروف میں لکھا ہوا ہے لہذا یہ کام یقیناً کسی دوست کا ہی ہو سکتا ہے۔

جب غففر ہاشمی کے دوستوں کا ذکر ہوتا ہے تو جانے کیوں مجھے فوراً محبوب غفراپے مشہور شعر سمیت یاد آ جاتا ہے۔ ”دشمن نے مری پشت پہ کیوں وار کیا ہے یہ رسم نبھانے کو مرے یا بہت ہیں“ خیال رہے کہ اس شعر کا سیاق و سباق سے کوئی تعلق نہیں۔ غففر ہاشمی کا حلقہء احباب بہت وسیع ہے۔ ان میں شاعروں کے علاوہ دیگر لوگ بھی شامل ہیں۔ کچھ دوستوں کے کہنا یہ ہے کہ اس علاوہ کا مطلب شاعرات ہیں۔ یوں بھی وہ خواتین میں خاصی دلچسپی رکھتا ہے۔ اس بارے میں خواتین کا نقطہ نظر مجھے معلوم نہیں۔ ہاں غففر خاصاً پر امید اور خوش گمان ہے۔ وہ ایک ہمدرد اور ”محبت“ کرنے والی آدمی ہے اور اسے ہمدرد اور محبت کرنے والے لوگ ہی اچھے لگتے ہیں۔ بس بات اتنی سی ہے۔ اب اگر مردوں میں ہمدردی اور محبت سرے سے موجود ہی نہیں تو اس میں غففر کا کیا قصور۔۔۔۔۔ خلقت شہر تو کہنے کو فنا نے مانگے خلق خدا کی بھلائی کے خیال سے عرض کر دوں کہ غففر ایک شادی شدہ شخص ہے اور اس کے دو بیٹے بھی ہیں۔ بیٹوں کے نام ہم قافیہ بھی ہیں اور ہم نسبت بھی۔ حنان احمد اور فاران احمد۔ اب حنان اور فاران کی نسبت سے غففر خود کتنا ذیشان ہو گیا ہے اس کا اندازہ کوئی ذی شعور انسان ہی کر سکتا ہے۔

یہاں ایک بات بہت دلچسپ ہے کہ اس کے بڑے بیٹے نے اپنے والد محترم کو اپنا آئیڈیل مان کر ابھی سے

شاعر بننے کا اعلان کر دیا ہے۔ غففر ایک کامیاب شخص ہے۔ شاعری میں، کمپزنگ میں، کالم نگاری میں، خانگی زندگی میں حتیٰ کہ نوکری میں بھی کامیاب ہے۔ اس کے ادارے کے سربراہ ایک باذوق آدمی ہیں اور یہیں سے غففر کی خوش بختی اور کامیابی کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔ دعا کیجیے کہ باس کا ذوق قائم رہے تاکہ ہمارے دوست کی نوکری قائم رہ سکے۔ غففر ہاشمی بہت سے عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زیادہ تر عالمی مشاعرے پاکستان میں ہی منعقد ہوتے رہے۔ ہاں چند مشاعرے انڈیا میں بھی ہوئے اور وہ ان میں شریک بھی ہوا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ صرف ہندوستان ہی کیوں گیا تو جناب یہ جوان دو ممالک کے درمیان اتنے ڈھیر سارے مسائل ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ، ایٹمی دھڑکا مسئلہ، سیاحت کا مسئلہ، ایٹوریا رائے کا مسئلہ، کترینہ کیف کا مسئلہ، کرینہ کپور کا مسئلہ..... تو جناب اگر ان دونوں ممالک کی حکومتوں کو فرصت نہیں یا اس طرف توجہ نہیں تو کوئی تو ہو جو درومندی سے آگے بڑھے اور ان تمام بالخصوص آخری تین مسائل کے حل کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھائے۔

میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ ایک ہمدرد اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسے ابھی تک صرف انڈیا جانے کا موقع مل سکا ہے ورنہ وہ تو انجلینا جولی، شکیرا اور جیفر لو پاز جیسے بین الاقوامی مسائل کے بارے میں بھی خاصا متفکر رہتا ہے اور ان کے حل کے لیے شب و روز سوچتا رہتا ہے۔ خدا غففر کو زندگی دے تو دنیا کے کسی کو نے میں اس طرح کا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ بان کی مون صاحبہ خواجواہ جوتیاں گھساتے پھر رہے ہیں۔ ایماندارانہ بات تو یہ ہے کہ غففر بہت پیارا آدمی ہے۔ لوگوں کے کام آنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہے۔ لوگوں پر اعتبار بھی کرتا ہے پھر نقصان بھی اٹھاتا ہے مگر وہ نہ تو اپنی کوشش پر نادم ہوتا ہے اور نہ ہی پچھتا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کام فریق ثانی انجام دیتا ہو لیکن ہمیں فریق ثانی سے کیا لینا دینا۔ ہمیں تو یقیناً ثانی سے غرض ہے جس کی گائیکی غففر کو بہت پسند ہے۔ وہ کلاسیکی موسیقی بالخصوص غزل کی گائیکی کا رسیا ہے۔ یاد رہے کہ وہ یہ تمام نعمات کیسٹ پلیئر پر سنتا ہے اور اس کیسٹ پلیئر کو اپنی الماری کے درمیان والے خانے میں رکھ کر سنتا ہے۔ بالا خانے اور تہ خانے والی موسیقی سے اسے (بقول اس کے) مکمل پرہیز ہے۔

غففر کی محبوب غذا بریانی، کباب اور چنے ہیں۔ اس سے زیادہ پسندیدگی وہ اس لیے انورڈ نہیں کر سکتا کہ کھانا پکانے میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے اور پھر اسے دفتر بھی جانا ہوتا ہے۔ برتن و رتن تو خیر دفتر سے واپس آ کر بھی دھوئے جا سکتے ہیں۔ ویسے اس کی ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار ہے۔ آپ چاہیں تو اس کے نسخے پر عمل کر کے خاصی خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں۔

کوٹ پینٹ غففر کا پسندیدہ لباس ہے۔ شلوار قمیص میں ملبوس آپ اسے شاذ و نادر ہی دیکھیں گے۔ بہر حال وہ ہولناک سے جوان رعنا ہے اور اس پر ہر لباس چلتا ہے بس رنگت میں ذرا مار کھا گیا ہے لیکن اس کی یہ سائنولی رنگت بھی اپنے گھر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر تمام ہاشمی برادران کو ساتھ ساتھ بٹھا کر دیکھا جائے تو غففر کو بٹ صاحب کہ کر پکارنے کو

جی چاہتا ہے۔

آپ گواہ رہیں کہ میں نے اس نکتہ ور کا خاکہ لکھتے ہوئے نکتہ گیر بننے سے گریز کیا ہے۔ بس آپ جیسے نکتہ شناسوں کے سامنے نکتے کی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ دھیسے لہجے میں بولنے والا، آداب کو ملحوظ خاطر رکھنے والا اور محبت کے سروں میں بات کرنے والا غضنفر ہاشمی میرے دل میں رہتا ہے۔ میں اس کے لہجے کی مٹھاس کو حلق میں اتارتا ہوں تو قدرتی چشموں کے ٹھنڈے پانیوں کی تازگی میری شریانوں میں دوڑنے لگتی ہے۔ کبھی وہ میرا شاگرد ہوا کرتا تھا، آج وہ میرا دوست ہے۔ کبھی میں اسے ایم اے میں شاعری پڑھایا کرتا تھا، آج اس کی شاعری سے حظ کشید کر رہا ہوں۔۔۔ اور یہ کیسے نہ ہو۔ اتنے نکتوں والا شخص تو نکتی بن ہی جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ نکتی بیسن سے بنی ہوئی موتیوں کے برابر مٹھائی کو کہتے ہیں۔ آپ اس کے لہجے کی مٹھاس کو محسوس کریں، اس کی شاعری کا ذائقہ چکھ کر دیکھیں، اس کی شخصیت کے گنوں پر نظر ڈالیں، آپ کو بھی وہ میری طرح نکتی ہی لگے گا۔

☆.....☆.....☆

آخر شب

نینا عادل

کوئی دستک مسلسل ہے، کہیں ہے مستقل آہٹ

ہوا کا شور ہے شاید

کبھی محسوس ہوتا ہے سنہرے خشک پتوں میں سے گزرا سانپ کا جوڑا

پرندہ کوئی سہا ہے

فضا میں سرسراہٹ ہے

مرے اندر بھٹکتی ہے کوئی آواز یا! شاید

بلا تیں ہیں مجھے اس دم پھڑسنے والوں کی یادیں

وہ جن پر زندگی اک خوف کی صورت مسلط ہے

کبھی کے ہمارے یا زندگی سے روٹھے بیٹھے جو!

کبھی یوں لگتا ہے جیسے کسی تاریک بستی میں

چلی آندھی!

قضا آئی

اجل شاید مری کھڑی تلک... بستر تلک آئی

ستارے ڈوبنے کو ہیں

اندھیرا بین کرتا ہے

خدا برا... نیند کا غلبہ

دیے کی لو بھڑکتی ہے

بجھا کر آخری لمحہ!

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے ویس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پبلسٹ

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسین سہاوی : 03056406067

DOLLAR EAST

EXCHANGE COMPANY

BRINGING SMILES FROM MILES



Send & Receive Instant





MoneyGram.

money transfer

Payments Through

DOLLAR EAST

UAN: 111-900-200 www.dollareast.com  /dollareast  /dollareast